فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (القرآن)
فانما شفاء العی السؤال (الحدیث)

نجم الفتاویٰ

جدید

جلد ثاني

کتاب الطہارۃ والصلوٰۃ

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً ساڑھے سات سو
اہم فتاوی جات کا مدلل و مفصل مجموعہ



تألیف:

حضرت شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم

رئیس دار الافتاء و مہتمم دار العلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

جدید ترتیب و تبویب: مفتی فرحان حسن عفی عنہ

نگران شعبہ تصنیف و استاذ دار العلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

ناشر
شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم یاسین القرآن

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (القرآن) فَاِنَّمَا شِفَآءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ (الحديث)

نجم الفتاویٰ

جلد ثانی

کتاب الطہارۃ والصلوٰۃ

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً ساڑھے سات سو
اہم فتاوی جات کا مدلل و مفصل مجموعہ

تألیف: حضرت شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
رئیس دارالافتاء و مہتمم دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

جدید ترتیب و تبویب: مفتی فرحان حسن
نگران شعبۂ تصنیف و استاذ دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

ناشر
شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم یاسین القرآن

کتاب کا نام	:	نجم الفتاویٰ
مؤلف	:	حضرت شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم رئیس دارالافتاء ومہتمم دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)
جدید ترتیب وتبویب	:	مفتی فرحان حسن (استاذ دارالعلوم یاسین القرآن)
کمپوزنگ	:	بھائی شکیل احمد صدیقی صاحب
سن اشاعت	:	1437ھ بمطابق 2016ء
مطبع	:	ادارۂ طباعت 0333-2136180
ناشر	:	شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی) 0301-2113944, 0334-3957443

ملنے کے پتے:

ملک کے مشہور اسلامی کتب خانوں سے طلب فرمائیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجمالی فہرست (نجم الفتاوی جلد ثانی)

کتاب الطهارة

کتاب الصلوۃ

آئینہ عناوین

نجم الفتاوی جلد ۲

کتاب الطھارۃ

کتاب الصلوۃ

۱۵۹۲۰۱

كتاب الطهارة

فصل فی الوضوء

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

(۱) مسواک کی مقدار اور برش کے استعمال کا حکم

سوال...... مسواک کرنا مسنون ہے، لیکن کیا ہر چھوٹی بڑی شاخ کے استعمال سے مسواک کی سنت ادا ہو جائے گی؟ یا اس کی لمبائی وموٹائی متعین ہے؟ اگر اس میں اس طرح کی تعیین ہو تو تفصیل سے بتلا دیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسواک کی مقدار متعین ہے یعنی ایک بالشت لمبی اور ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے، اسی طرح سب سے افضل مسواک پیلو کے درخت کی ہے اس کے بعد زیتون کے درخت کی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر درخت کی شاخ کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال کی جائے جیسے برش، کپڑا یا انگلی وغیرہ تو اس سے صفائی کی سنت تو ادا ہو جائے گی لیکن مسواک کی سنت ادا نہ ہوگی۔

لما فی الکبیری (ص۳۱۔۳۲): ثم المستحب ان یکون السواك من شجرة مرّة لزیادة ازالة تغیر الفم قالوا: ویستاك بکل عود الا الرمان والقصب وافضله الاراك ثم الزیتون وان یکون طول شبر فی غلظ الخنصر...

وفی الھندیة (۱/۷): ومنها السواك وینبغی ان یکون السواك من اشجار مرة لانه یطیب نکھة الفم ویشد الاسنان ویقوی المعدة ولیکن رطبا فی غلظ الخنصر وطول الشبر ولا یقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحینئذ یقوم الاصبع من یمینه مقام الخشبة۔

وفی الدر المختار (۱/۱۱۴۔۱۱۵): (و) ندب امساکه (بیمناه) وکونه لینا مستویا بلا عقد فی غلظ الخنصر وطول شبر ...وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلك مقامه للمرأة مع القدرة علیه۔

(۲) ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت کا حکم

سوال......اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو اور اس کے پاس ٹوتھ برش ہو تو کیا وہ مسواک کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس سے مسواک کی سنت ادا ہو جاتی ہے از راہِ کرم تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مسواک کا استعمال سنت موکدہ ہے شرعی نقطہ نظر سے مسواک کا اطلاق اس لکڑی پر ہوتا ہے جس کو دانتوں کی صفائی کیلئے استعمال کیا جائے اور مستحب یہ ہے کہ مسواک کسی کڑوے درخت مثلاً زیتون، پیلو وغیرہ کی ہو، البتہ اگر مسواک دستیاب نہ ہو تو انگلی سے بھی یہ سنت ادا ہو سکتی ہے اور یہی حکم ٹوتھ پیسٹ کا بھی ہے البتہ مسواک شرعی میں دو مستقل سنتیں ہیں (۱) لکڑی کا استعمال (۲) انقاء (منہ کی صفائی) تو ٹوتھ برش کے استعمال سے صرف انقاء کی سنت ادا ہو جائے گی البتہ لکڑی کی سنت اس سے ادا نہیں ہوگی۔

لمافی الهندية(۷/۱): (منها السواك) وينبغى ان يكون السواك من اشجار مرة لانه يطيب نكهة الفم ويشد الاسنان ويقوى المعدة وليكن رطبا فى غلظ الخنصر وطول الشبرولا يقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحينئذ يقوم الاصبع من يمينه مقام الخشبة۔

وفى المغنى(۷۹/۱): ويستحب ان يكون السواك عودا لينا ينقى الفم ولايجرحه ولايضره ولا يتفتت فيه كالاراك والعرجون ولايستاك بعود الرمان ولا الآس ولا الاعواد الذكية...

وان استاك باصبعه او خرقة فقد قيل لايصيب السنة لان الشرع لم يرد به ولا يحصل الانقاء به حصوله بالعود والصحيح انه يصيب بقدر مايحصل من الانقاء ولا يترك القليل من السنة للعجز عن كثيرها۔

(۳) ٹوتھ برش یا انگلی کا مسواک کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی لیکن میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو تو وہ انگلی کو ہی دانتوں پر مل لے یہ مسواک کے قائم مقام ہو جائے گی۔ آیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر ٹوتھ برش کو مسواک کے قائم مقام کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ حالانکہ اس سے دانتوں کی صفائی وغیرہ انگلی کے مقابلے میں بہر حال زیادہ اچھی ہوتی ہے؟ براہ کرم جواب آسان الفاظ میں لکھ کر عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مسواک کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے جو صورت ثابت ہے وہ یہی ہے کہ لکڑی سے مسواک کی جائے اور لکڑیوں میں بھی پیلو کے درخت کی لکڑی زیادہ پسندیدہ ہے لیکن اگر لکڑی کی مسواک اتفاقاً موجود نہ ہو، تو انگلی وغیرہ سے دانت صاف کر لینا مسواک کے قائم مقام ہو سکتا ہے اور برش کا اصل حکم بھی یہی ہے کہ اگر اتفاقاً مسواک موجود نہ ہو تو اس کا استعمال

قائم مقام مسواک کے ہوجائے گا۔اورلکڑی کی مسواک کی موجودگی میں انگلی اور برش وغیرہ مسواک کے قائم مقام نہیں بنیں گے۔

لمافی سنن النسائی(۳/۱): سمعت عائشة رضی الله عنها عن النبی ﷺ قال:" السواك مطهرة للفم مرضاة للرب"۔

وفی کنز العمال(۳۱۱/۹): الاصابع تجری مجری السواك اذا لم یکن مسواك (ابو نعیم فی کتاب السواك عن عمرو بن عوف المزنی)۔

وفی اعلاء السنن(۷۳/۱): ثم اعلم ان الاصابع تقوم مقام السواك عند فقدانه... الخ۔

وفی الفقه علی المذاهب الاربعة(۶۸/۱): ومن السنن المؤكدة السواك ولا يشترط ان يكون من شجر الاراك المعروف بل الافضل ان يكون من اشجار مرةٍ لانه يساعد على تطييب الفم وله فوائد معروفة فهو يقوى اللثة... فاذا لم يجد سواكاً فان الفرشة تقوم مقامه واذا لم يجدها استاك باصبعه ويقوم مقام السواك العلك اللبان... واذا كان لا يطيقه فانه يتركه للضرورة...

وفی المفصل فی احکام المرأة والبيت المسلم(۵۴/۱): يستحب أن يستاك المسلم او المسلمة بعود من اراك فان لم يوجد او وجده واستعمل شيئاً آخر غيره جاز ذالك بشرط ان يكون هذا الشئ تحصل به تنقية فمه وتنظيف أسنانه كالخرقة الخشنة والاشنان وقياساً على هذا القول يجوز استعمال فرشة تنظيف الاسنان مع المعجون الخاص للتنظيف... واذا لم يجد مايستاك به من عود السواك وغيره استعمل اصابعه فی استياكه للحديث الذی رواه البيهقی عن رسول الله ﷺ تجزی فی السواك الأصابع۔

وفی الشامية(۱۶۸/۲): (واستياكه) لانه مندوب اليه فی سائر الصلوات اختيار، ومفاده ان المراد به الاستياك عند القيام الى الصلوة فانه مستحب كما قدمناه فی سنن الوضوء وكذا عند الاجتماع بالناس وعليه فيستحب قبل التوجه اليها ايضاً واما السواك فی الوضوء فانه سنة موكدة ولا خصوصية للعيد فيه۔

(۴) مسواک سنتِ صلوٰۃ ہے یا سنتِ وضو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ہر وضو کے وقت مسواک کرنا چاہیے اور بعض کہتے ہیں کہ نماز کے وقت مسواک کرنا مسنون ہے ان میں سے صحیح اور افضل بات کون سی ہے؟ نیز آپ ﷺ کا معمول

کیا تھا؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... وضو کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ اور جن احادیث میں یہ آتا ہے کہ آپ ﷺ نماز کے وقت مسواک فرماتے تھے تو ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت جب وضو فرماتے تھے اس میں مسواک فرمایا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص اتباع کی نیت سے نماز کے وقت بھی مسواک کرلے تو درست ہے۔ بشرطیکہ اس کے مسوڑھے مضبوط ہوں اور بوقتِ نماز مسواک کی وجہ سے خون وغیرہ نہ نکلے۔

لمافی فتح الملهم (۶۸۸/۲): وقد صرح كثير من الشافعية والحنفية باستحباب السواك عند الوضوء وعند القيام الى الصلوة كليهما۔ فمن نقل الخلاف فى انه من سنن الوضوء او من سنن الصلوة فلعل مراده ان الكلام فى تعيين الموضع الذى كان قصد النبى ﷺ ايجاب السواك فيه لولا ان يشق على امته فان ذلك الموضع ينبغى ان يكون محلا لمزيد تاكد الاستياك بالنسبة الى سائر المواضع وهذا البحث انما يدور على الفاظ حديث الباب۔ ...

...... وقدصرح العلامة الرضى فى شرح الكافية ان معنى ''عند'' القرب حسا او معنى وأما لفظة (مع) فيقال جئنا معاً اى فى زمان واحد وكنا معاً، اى فى مكان واحد على الظرفية... فعلى هذا ''عند'' اعم من ''مع'' فالمعية تستلزم العندية ولا عكس۔ فالذى يظهر من مجموع الروايات المعروفة انه كان قصد النبى ﷺ ايجاب السواك عند كل صلوة اى قريبا منها مشروعا لاجلها كا لوضوء مع كل وضوء متصلا وملتصقا بها واقعا فى زمان يقع فيه الوضوء۔ واصرح شئ فى هذا المعنى ماروى ابن حبان فى صحيحه من حديث عائشة أن رسول الله ﷺ قال ''لولا ان اشق على امتى لامرتهم بالسواك مع الوضوء عند كل صلوة''

وفى البحر الرائق(۴۳/۱): واما ماورد من افضلية الصلوة التى بسواك على غيرها فيدل على الاستحباب وهو الحق ... لكن قولهم يستحب عند القيام الى الصلوة ينافى مانقلوه من انه عندنا للوضوء لا للصلاة خلافا للشافعى۔

وفى الشامية(۱۱۳/۱): ... يظهر لى التوفيق بان معنى قولهم هو للوضوء عندنا بيان ماتحصل به الفضيلة الواردة فيما رواه احمد من قوله ﷺ صلاة بسواك افضل من سبعين صلاة بغير سواك اى انها تحصل بالاتيان به عند الوضوء وعند الشافعى لاتحصل الابا لاتيان به عند الصلوة فعندنا كل صلوٰة صلاها بذلك الوضوء لها هذه الفضيلة خلافا له ولا يلزم من هذا نفى استحبابه عندنا لكل صلوٰة۔

(۵) مسنون مسواک کون سی ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی کیا ہونی چاہیے؟ اگر اس بارے میں کوئی حدیث ہوتو حوالہ ضرور دیجئے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہر نرم لکڑی سے مسواک کرنا سنت ہے۔ نیز مسواک کی لمبائی ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہو۔ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زید بن خالد جب مسجد میں تشریف لاتے تو مسواک ان کے کان پر ایسے ہوتی جیسے قلم کاتب کے کان پر ہوتا ہے اور قلم کی لمبائی تقریباً ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہوتی ہے۔

لمافی جامع الترمذی (۱/۱۲): عن زید بن خالد الجهنی رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواك عند كل صلوة ولأخرت صلوة العشاء الى ثلث الليل قال: فكان زيد بن خالد يشهد الصلوات فى المسجد وسواكه على اذنه موضع القلم من أذن الكاتب لا يقوم الى الصلوة الا استن ثم رده الى موضعه۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۹۔۴۵۷): والافضل ان يكون من اراك ثم من النخل ثم ذوالريح الطيب ثم اليابس المندى بالماء۔۔۔۔ويكره ان يزيد طول السواك على شبر. فى البيهقى عن جابر رضى الله عنه قال''كان موضع سواك رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم موضع القلم من اذن الكاتب''...

(۶) مسوڑھوں پر مسواک پھیرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو مسوڑھوں پر مسواک کرنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کسی کے دانت نہ ہوں، تو اس کو چاہیئے کہ مسواک کے بجائے انگلی یا کسی اور نرم چیز کو سنت کی نیت سے اپنے مسوڑھوں پر پھیر لے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔

لمافی البحر الرائق (۱/۴۳): وتقوم الاصبع او الخرقة الخشنة مقامه عند فقده اوعدم اسنانه فى تحصيل الثواب الخ۔

وفی الدر المختار(۱/۱۱۵): وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه كما يقوم العلك مقامه للمرأة مع القدرة عليه۔

(۷) مسواک کو پکڑنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ مسواک کو پکڑنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے اسی طریقہ سے مسواک پکڑ کر استعمال کرنا چاہیئے اگر کوئی مخصوص طریقہ ہے تو اس کو مدلل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسواک کو دائیں ہاتھ میں پکڑنا مستحب ہے اور پکڑنے کا طریقہ فقہاء کرام نے یہ بتایا ہے کہ مسواک کو ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے پوروں سے اس طرح پکڑا جائے کہ چھوٹی انگلی (چھنگلی) اور انگوٹھا نیچے کی جانب رہے اور بقیہ انگلیاں اُوپر کی طرف ہوں، اور انگوٹھے کو مسواک کے برش والے حصے کی جانب رکھے اور چھنگلی کی پشت کو دوسری جانب کے آخر میں اور دوسری انگلیاں ان کے درمیان میں اُوپر کی جانب رہیں۔

لمافی الهندية (۱/۷): ويندب امساكه بيمينه بأن يجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه۔

وفي الشامية(۱/۱۱۴): والسنة في كيفية أخذه أن يجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه۔

(۸) دورانِ وضو اذکار کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران وضو جو مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہیں، بحوالہ نقل کریں، میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی عبارتوں میں تو ان کا ذکر ملتا ہے، احادیث میں نہیں ملتا، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... وضو میں دو طرح کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں، اول جو دعائیں دوران وضو پڑھی جاتی ہیں، دوم جو وضو کے بعد پڑھی جاتی ہیں، وضو کے بعد پڑھی جانے والی دعائیں شہادتین وغیرہ تو احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہیں، البتہ جو دعائیں یا اذکار دوران وضو پڑھے جاتے ہیں، یہ روایات سے ثابت تو ہیں لیکن ضعیف ہیں اسی ضعف کی وجہ سے بعض حضرات جیسے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں کہ ان اذکار کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جبکہ شوافع ہی کے دوسرے فقہاء جیسے علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اور خاص طور پر فقہاء احناف نے ان کا استحباب نقل کیا ہے، لہٰذا ان اذکار کا پڑھ لینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۹): وتسمية الله تعالى عند غسل كل عضو وليقل عند المضمضة اللهم اعني على تلاوة القرآن وذكرك وشكرك وحسن عبادتك وعند الاستنشاق اللهم ارحني رائحة الجنة ولا ترحني رائحة النار وعند غسل الوجه اللهم بيض وجهي يوم تبيض وجوه وتسود وجوه وعند

غسل يده اليمنى اللهم اعطني كتابي بيميني وحاسبني حسابا يسيرا وعند غسل اليسرى اللهم لا تعطني كتابي بشمالي ولا من وراء ظهري وعند مسح رأسه اللهم اظلني تحت ظل عرشك يوم لا ظل الا ظل عرشك وعند مسح اذنيه اللهم اجعلني من الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه وعند مسح عنقه اللهم اعتق رقبتي من النار وعند غسل رجله اليمنى اللهم ثبت قدمي على الصراط يوم تزل الاقدام وعند غسل رجله اليسرى اللهم اجعل ذنبي مغفورا وسعي مشكورا وتجارتي لن تبور ويصلي على النبي صلى الله عليه وسلم بعد غسل كل عضو۔

وفي تنوير الأبصار مع الدر المختار (۱/۱۲۴): (ومن آدابه استقبال القبلة) ...وفي (ص۱۲۷) (والدعاء بالوارد عنده) اى عند كل عضو وقد رواه ابن حبان وغيره عنه عليه الصلاة والسلام من طرق قال محقق الشافعية الرملي فيعمل به في فضائل الاعمال وان انكره النووي

وفي (ص۱۲۸) (فائدة) شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه وان يدخل تحت أصل عام وان لا يعتقد سنية ذلك الحديث۔

(۹) وضو اور غسل کیلئے پانی کی شرعی مقدار

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو اور غسل میں کتنا پانی استعمال کرنا چاہیئے نیز صاع اور مد کی موجودہ مقدار کتنی بنتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......لوگوں کے احوال اور طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے وضو اور غسل کیلئے پانی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں کہ جسے معیار بنایا جائے، البتہ وضو اور غسل میں پانی کا استعمال اس قدر ہو کہ نہ تو اتنی کمی کی جائے کہ اعضاءِ وضو سے پانی کا تقاطر ہی نہ ہو، اور نہ ہی اتنی زیادتی کی جائے کہ اسراف لازم آئے جو کہ حرام ہے۔ لہٰذا راہِ اعتدال کو اپنانا چاہیئے جو کہ شرعاً محمود ومطلوب ہے۔

البتہ روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ منقول ہے کہ آپ وضو ایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے فرماتے تھے۔ ایک مد کا وزن آدھ سیر ساڑھے پانچ چھٹانک ہے جو کہ عام طور پر ایک لوٹا پانی کے برابر ہوتا ہے، اور ایک صاع کا وزن تین سیر چھ چھٹانک جو کہ عام طور پر ایک درمیانی بالٹی کے پانی کے برابر ہوتا ہے جو معتدل طبیعت وجسم والے شخص کے وضو اور غسل کیلئے بآسانی کافی ہو جاتا ہے، اس لئے کہ حضور اکرم علیہ السلام کی ایک ایک سنت اعتدال پر مبنی ہے۔ بصورت دیگر زائد پانی بھی استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے، البتہ پانی کی مذکورہ مقدار سے کمی نہ کرنا اولیٰ ہے۔

لما في الهندية (۱/۹): ولا ينقص ماء وضوئه عن مد ، كذا في التبيين۔

وفيه ايضاً(۱/۱۶): ذكر في ظاهر الرواية وادنى مايكفى من الماء للاغتسال صاع وللتوضؤ مد قال بعض مشايخنا رحمهم الله كفاه صاع اذا ترك الوضوء واما اذا جمع بين الوضوء والغسل فانه يتوضأ بالمد من غير الصاع ويغتسل بالصاع وقال عامة مشايخنا رحمهم الله الصاع كاف للغسل والوضوء جميعا وهو الاصح. قال مشايخنا هذا بيان مقدار ادنى الكفاية وليس بتقدير لازم بل ان كفاه اقل من ذلك نقص منه وان لم يكفه زاد عليه بقدر مالا اسراف ولا تقتير كذا في محيط السرخسي وكذلك لوتوضأ بدون المد واسبغ وضوءه جاز هكذا في شرح الطحاوى... وكل هذا غير لازم لاختلاف طباع الناس كذا في شرح المبسوط۔

وفي رد المحتار (۱/۱۵۸): (قوله وقيل المقصود) الاصوب حذف قيل لما في الحلية انه نقل غير واحد اجماع المسلمين على ان ما يجزئ في الوضوء والغسل غير مقدر بمقدار وما في ظاهر الرواية من أن أدنى مايكفى في الغسل صاع وفي الوضوء مد للحديث المتفق عليه. كان ﷺ يتوضأ بالمد ويغتسل بالصاع الى خمسة امداد ليس بتقدير لازم بل هو بيان أدنى القدر المسنون اهـ قال في البحر حتى أن من أسبغ بدون ذلك اجزأه وان لم يكفه زاد عليه لان طباع الناس وأحوالهم مختلفة كذا في البدائع اهـ وبه جزم في الامداد وغيره۔

وفي الفقه الاسلامي(۱/۱۴۳): وعند ابي حنيفة وفقهاء العراق ثمانية ارطال باعتبار ان المد رطلان، فيكون (۳۸۰۰ غم) وفي تقرير آخر وهو الشائع ان الصاع (۲۷۵۱ غم)

(۱۰) ہاتھ کی انگلیوں کا خلال ہاتھ دھونے سے پہلے ہوگا یا بعد میں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو میں ہاتھ کی انگلیوں کا خلال سنت ہے یہ کس وقت ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہاتھ کی انگلیوں کا خلال وضو کے اندر ہاتھوں کو دھونے کے بعد ہوگا اس لئے کہ ہاتھوں کا دھونا فرض ہے اور تخلیلِ یدین سنت ہے اور سنت تکمیل فرض کے لئے ہوتی ہے اس لئے انگلیوں کا خلال فرض کے بعد ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں: پھر تین بار داہنا ہاتھ کہنی سمیت دھوئے پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین دفعہ دھوئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کرے اور انگوٹھے چھلا چوڑی جو کچھ ہاتھ میں پہنے ہوئے ہلا لیوے کہ کہیں سوکھا نہ رہ جاوے۔ پھر ایک مرتبہ سارے سر کا مسح کرے پھر کان کا مسح کرے۔

لمافي البناية(۱/۱۱۲۔۱۱۳): (ولأنه) اى ولأن تخليل الأصابع (اكمال الفرض في محله) اى في محل

الفرض... وهذا ايضاً فيه نظر لأن في حديث وائل بن حجر رضي الله عنه رواه البزار في مسنده قال شهدت النبي صلى الله عليه وسلم واتى بماءٍ فاكفأ على يمينه ثلاثا... الحديث، وفيه ثم غسل بيده اليمنى قدمه اليمنى وفصل بين اصابعه أوقال خلل بين اصابعه اهـ

وفى الشامية(۱/۱۱۷): اقول قدعلمت من الحديث المار التقييد فى تخليل اللحية بأخذ كف من ماء وفى البحر ويقوم مقامه أي تخليل الأصابع الادخال فى الماء ولو لم يكن جاريا، وفيه عن الظهيرية ان التخليل انما يكون بعد التثليث لانه سنة التثليث۔

(۱۱) بیت الخلاء میں وضو کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے مدرسے میں غسل خانے موجود ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر کہ لیٹرین اور غسل خانہ ساتھ ہیں ہمارے طلباء اسی میں فراغت حاصل کرتے ہیں اور غسل بھی کرتے ہیں اب بعض طلباء اسی کے اندر جا کر وضو کرتے ہیں تو کیا ان کا وضو صحیح ہوجائے گا یا دوبارہ باہر وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں وضو درست ہے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا لہٰذا وضو کی دعائیں جہراً نہ پڑھی جائیں۔

لمافى بذل المجهود(۱/۳): (اذا دخل الخلاء) أى اذا اراد دخول مكان الخلوة عند قضاء الحاجة الخ إلى ان قال وهذا مذهب الجمهور وقالوا: من نسى يستعيذ بقلبه لا بلسانه الخ۔

وفى الهندية(۱/۶): ويسمى قبل استنجاء... ولا يسمى فى حال الانكشاف ولافى محل النجاسة هكذا فى فتح القدير۔

وفى الشامية(۱/۱۰۹): الظاهر أن المراد أنه يسمى قبل رفع ثيابه إن كان فى غير المكان المعد لقضاء الحاجة والا فقبل دخوله فلو نسى فيهما سمى بقلبه ولا يحرك لسانه تعظيماً لاسم الله تعالىٰ۔

وفى الدرالمختار(۱/۱۳۲): ومن منهياته التوضوء... فى موضع نجس، لان لماءِ الوضوء حرمة۔

(۱۲) آبِ زم زم سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی نہ ہو اور اس کے پاس آبِ زم زم موجود ہو، اور نماز کا وقت ہوجائے تو کیا یہ شخص آبِ زم زم سے وضو کرسکتا ہے یا تیمم کرکے نماز پڑھے؟

الجواب بعون الملك الوهاب......آبِ زمزم کا پانی وضو کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کیلئے آب زم زم سے ہی وضو کرنا ضروری ہے، تیمم کرنا جائز نہیں البتہ اگر آبِ زم زم کم ہے اور پانی پینے کی بھی شدید ضرورت ہو، تو اس کو پینے کیلئے رکھ لے اور نماز کیلئے تیمم کرلے۔

لمافی الخانیة(۲۷/۱): ولو كان فی رحله ماء زمزم و قد رصّص رأس القمقمة يحمله للهدية أوما أشبه ذلك وهو لايخاف على نفسه العطش لايجوز له التيمم۔

وفی الدّر المختار (۱۷۹/۱): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق)...(وماء زمزم) بلاكراهة۔

(۱۳) آب زم زم سے وضو یا غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آبِ زم زم کو اگر استنجاء، وضو یا غسل کیلئے استعمال کیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک صاحب حج کر کے آئے اور اپنے ساتھ آب زم زم بھی لائے، اب جو آبِ زم زم لائے تھے اس کو کنویں میں ڈال دیا تا کہ یہ پانی ہمیشہ کے لئے آبِ زم زم بن جائے، اب استعمال کیلئے یہی کنواں ہے تو کیا اس پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے؟

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں زم زم کے پانی سے وضو اور غسل کرنا جائز ہے، البتہ زم زم کے پانی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے۔ نیز کنویں میں آب زم زم ڈالنے سے کنویں کا پانی آب زم زم کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ ماء مطلق کے حکم میں رہیگا۔ ان صاحب کی سوچ غلط ہے لہٰذا اس کنویں کے پانی سے بلا کراہت استنجاء وغیرہ کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الهندية (۳۱/۱): رجل فی البادية معه ماء زمزم فی القمقمة وقد رصّص رأسها لا يجوز التيمم كذا فی الخلاصة۔

وفی الدر المختار (۱۷۹/۱۔۱۸۰): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق...وماء زمزم)بلاكراهة۔

وفی الشامية (۶۲۵/۲): (قوله يكره الاستنجاء بماء زمزم) وكذا ازالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه، حتى ذكر بعض العلماء تحريم ذلك۔

(۱۴) سبیل وغیرہ کے پانی سے وضو کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض جگہوں پر لوگوں کے پینے کیلئے جو پانی رکھا ہوتا ہے، جیسے سبیل وغیرہ، کیا اس سے وضو اور غسل کرنا درست ہے؟

الجواب بعون الملك الوهاب......اگر سبیل وغیرہ میں رکھا ہوا پانی کم ہو تو وضو کرنا درست نہیں ہے، وہ پانی صرف پینے کیلئے ہوتا

ہے۔ہاں اگر پانی زیادہ ہوتو اس سے وضو کرنا بھی درست ہے،البتہ ایسے پانی سے غسل کرنا درست نہیں ہے۔

لمافی رد المحتار (۲۵۳/۱) (قوله المسبل) ای الموضوع فی الحباب لأبناء السبیل۔ (قوله لایمنع التیمم۔) لانه لم یوضع للوضوء بل للشرب فلا یجوز الوضوء به وان صح۔ (قوله مالم یکن کثیرا۔) قال فی شرح المنیة۔ الاولیٰ الاعتبار بالعرف لا بالکثرۃ. الا اذا اشتبه.

(۱۵)بارش کے قطرات سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص راستے میں جارہا ہو اور وہاں بارش ہونے لگ جائے اور بارش کے پانی سے اس کے اعضاء وضو بھیگ جائیں تو کیا اس سے وضو ہوجائے گا یا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بارش کے قطرات سے اگر اعضاء وضو مکمل بھیگ جائیں تو اس سے وضو ہوجائے گا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الدر المختار (۱۵۶/۱): لومکث فی ماء جار او حوض کبیر او مطر قدر الوضوء والغسل فقد اکمل السنة۔

وفی الشامیة تحته : (قوله قدر الوضوء والغسل) انظر هل المراد قدر زمنهما لو کان یصیب الماء علیه بنفسه او مقدار مایتحقق فیه جریان الماء علی الاعضاء بلحظات یسیرۃ۔ یتحقق فیها غسل اعضاء الوضوء مرتبة ثلاثا مع غسل باقی الجسد کذالك؟ لم اره لائمتنا۔

(۱۶)بارش میں بھیگنے یا برف کو اعضاء پر ملنے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص بارش میں بھیگ جائے تو وضو ہوجاتا ہے۔کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ بعض دفعہ گرمی کی شدت میں برف جسم کے مختلف اعضاء پر ملی جاتی ہے تو اگر وضو کے اعضاء پر برف مل لی جائے تو وضو ہوجانا چاہیے،کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کوئی شخص بارش میں اس طرح بھیگ جائے کہ اعضاء وضو میں کوئی جگہ خشک نہ رہے تو وضو ہوجائے گا۔اسی طرح اگر برف اعضاء وضو پر اس طرح مل لی جائے کہ اعضاء سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگیں اور کوئی بھی جگہ خشک نہ رہے تو وضو ہوجائے گا،ورنہ نہیں۔

لمافی الدر المختار (۱۵۶/۱): وقالوا لو مکث فی ماءٍ جار أوحوض کبیر او مطر قدر الوضوء والغسل فقد أکمل السنة۔

وفی الهندية (۳/۱): ففی مسئلة الثلج اذا توضأ به ان قطر قطرتان فصاعداً يجوز اجماعا وان كان بخلافه فهو على قول ابي حنيفة ومحمد رحمهما الله لايجوز وعلى قول ابي يوسف رحمه الله يجوز كذا فی الذخيرة والصحيح قولهما كذا فی المضمرات۔

(۱۷) برفانی علاقوں میں برف سے وضو کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھی سفر کے دوران بعض ایسے علاقوں میں جانا ہوتا ہے کہ وہاں برف ہی برف ہوتی ہے۔ پانی بالکل نہیں ملتا تو ایسی صورت حال میں وضو کا کیا حکم ہے؟ آیا تیمم کرے یا برف سے وضو کرے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اس صورت میں اگر برف پگھلانے کا آلہ موجود ہو (مثلاً چولہا، برتن وغیرہ) تو اس سے برف کو پگھلا کر وضو کرے اگر یہ سہولت میسر ہو تو تیمم کرنا جائز نہیں، بلکہ اس پانی سے وضو کرنا واجب ہے۔ اور اگر میسر نہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔ اور اگر مٹی وغیرہ بھی دستیاب نہ ہو تو پھر تشبّہ بالمصلین کرے۔

لمافی الهندية (۲۸/۱): وفی جمد أو ثلج ومعه آلة الذوب لايتيمم وقيل يتيمم والظاهر الاوّل منهما كما لايخفى۔

وفی الدر المختار (۲۵۲/۱): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورين) بأن حبس فی مكان نجس لايمكنه اخراج تراب مطهر وكذا العاجز عنهما لمرض (يؤخرها عنده وقالا يتشبّه) بالمصلين وجوبا۔

(۱۸) گرم پانی سے اور دھوپ کی شدت سے گرم ہونے والے پانی سے وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو اور غسل کرنا کیسا ہے؟ نیز آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے غسل اور وضو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو وغسل کرنا کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز ہے، البتہ آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے وضو اور غسل بلا کراہت جائز ہے۔

لمافی الشامية (۱۷۹/۱): (قوله مطلقا) ای سواء كان اكبر او اصغر (قوله هو ما يتبادر عند الاطلاق) ای ما يسبق الى الفهم بمطلق قولنا ماء، ولم يقم به خبث ولا معنى يمنع جواز الصلاة فخرج الماء المقيد والماء المتنجس والماء المستعمل ------- ولذا قيد بعض العلماء التبادر بقوله بالنسبة للعالم بحاله۔ وفيه ايضا (۱-۱۸۰) منها ان لايكون بماء مشمس وبه صرح فی

الحلية مستدلا بما صح عن عمر رضی اللہ عنہ من النهی عنه ولذا صرّح فی الفتح بکراهته ،ومثله فی البحر.وقال فی معراج الدراية وفی القنية ، وتکره الطهارة بالمشمس لقوله صلی اللہ علیہ وسلم لعائشة رضی الله عنها حين سخنت الماء بالشمس ((لاتفعلی يا حميراء ، فانه يورث البرص)) وعن عمر مثله. . .فقد علمت ان المعتمد الکراهة عندنا لصحة الاثر وأن عدمها رواية، والظاهر انها تنزيهية عندنا أيضا۔

(۱۹) بلّی کے جھوٹے پانی سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص وضو کیلئے پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دے اور بلی آ کر اس سے پی لے تو کیا باقی پانی سے وضو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر اِس پانی کے علاوہ پاک پانی موجود ہو تو پاک پانی سے وضو کرنا بہتر ہے اور اگر اِس پانی کے علاوہ دوسرا پانی موجود نہیں تو پھر اِس پانی سے وضو کرنا بلا کراہت درست ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۴): فان اکلت فارة وشربت الماء فی فورها يتنجس وان مکثت ساعة اوساعتين ثم شربت لايتنجس هو الصحيح کذا فی الظهيرية۔

وفی الشامية (۱/۲۲۴): (قوله طاهر للضرورة) بيان ذلك ان القياس فی الهرة نجاسة سؤرها لانه مختلط بلعابها المتولد من لحمها النجس لکن سقط حکم النجاسة اتفاقاً بعلة الطواف المنصوصة بقوله صلی اللہ علیہ وسلم انها ليست بنجسة انها من الطوافين عليکم والطوافات اخرجه اصحاب السنن الاربعة وغيرهم۔

(۲۰) پرنالے کے پانی سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی اور ہمارے گھر کا پانی ختم ہو چکا تھا تو نماز کے وقت میں نے پرنالے والے پانی سے وضو کر لیا اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ پرنالے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پرنالے سے آنے والے پانی کا رنگ، بو، مزہ کسی نجاست وغیرہ سے بدلا نہ ہو تو اس سے وضو وغسل درست ہے۔

وفی الهندية(۱/۱۷): وفی بعض الفتاوی قال مشائخنا:المطر مادام يمطر فله حکم الجريان حتی

لو أصاب العذرات على السطح ثم أصاب ثوبا لايتنجس الا أن يتغير۔

وفی الشامية (۱/۱۸۸۔۱۸۹): وعلى هذا ماء المطر اذا جرى فی الميزاب وعلى السطح عذرات فالماء طاهر وان كانت العذرة عند الميزاب أو كان الماء كله أو نصفه أكثره يلاقی العذرة فهو نجس والا فطاهر وعلى مارجحه الكمال قال فی الحلية ينبغی أن لايعتبر فی مسألة السطح سوى تغير أحد الاوصاف اهـ۔

(۲۱) حقے کے پانی سے وضواور غسل کرنا

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک دن میں وضوکررہاتھا کہ پانی ختم ہوگیااور کوئی پانی نہیں تھاصرف حقے میں پانی موجودتھاتوباقی وضومیں نے اس پانی سے کرلیاتو کیاحقے والے پانی سے وضویاغسل کرناصحیح ہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... حقے کے پانی سے وضواور غسل جائز ہے۔کیونکہ حقے کاپانی ماء مطلق کی طبعیت پر برقرار رہتا ہے۔اگرچہ حقے کے پانی کے اوصاف دھوئیں کی وجہ سے تبدیل ہوجاتے ہیں، چونکہ دھواں پاک ہے اور پاک چیز کی آمیزش پانی کی طہارت پراس وقت تک اثرانداز نہیں ہوتی جب تک پانی اپنی طبیعت (رقت اور سیلان) پر باقی ہو۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۱۹): (ولا) يجوز الوضوء (بما زال طبعه) وهو الرقة والسيلان والارواء والانبات (بالطبخ ...أو بغلبة غيره)... (عليه... والغلبة... فی مخالطة) الماء لشئ من (الجامدات) الطاهرات (باخراج الماء عن رقته) فلا ينعصر عن الثوب (و) إخراجه عن (سيلانه) فلا يسيل على الأعضاء سيلان الماء (و) أما اذا بقی على رقته وسيلانه فانه (لايضر)۔۔۔۔۔۔ تغير أوصافه كلها بجامد) خالطه بدون طبخ (كزعفران وفاكهة وورق شجرة)۔

وفی الفقه الاسلامی(۱/۲٦۷): والخلاصة ان خالط الماء شئی طاهر ولم يغير لونه أوطعمه أو ريحه فهو ماء مطلق طهور وان غير احد هذه الاوصاف الثلاثه ...عند الحنفية طاهر مطهر، مالم يطبخ أويغلب على أجزائه۔

(۲۲) گنے کے رس سے وضو کاحکم

سوال.....کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرکوئی شخص ایسے مقام پرہو جہاں پانی کانام ونشان نہ ہو،اوراسکے پاس گنے کارس موجودہوتونماز کاوقت ہونے پر یہ شخص اس رس سے وضوکرسکتاہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... گنے کے رس سے وضوکرناجائزنہیں،اس لئے کہ وضوکیلئے ماءمطلق ہوناشرط ہےاور یہ ماءمطلق

نہیں ہے۔لہٰذا یہ شخص تیمم کر کے نماز ادا کرے۔

لمافی الهندية(۲۱/۱): لايجوز التوضؤ بماء البطيخ والقثاء والقتد ولا بماء الورد ولابشئ من الاشربة ولا بغيرها من المائعات نحو الخل۔

وفی الدرالمختار(۱۸۰/۱): (و) لا (بعصير نبات) أی معتصر من شجر اوثمر لانه مقيد۔

(۲۳)گندگی والے جوہڑ اور ڈیم سے وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں بارش کے موسم میں بڑے بڑے ڈیموں یا جوہڑوں میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ کچرا اور گندی چیزیں بھی جمع ہوجاتی ہیں تو کیا اس پانی سے وضو کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....اگر جوہڑ اتنے بڑے ہوں جو شرعاً ''غدیر عظیم'' کے حکم میں آتے ہوں یعنی دہ دردہ ہوں اوران میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہو تو چونکہ یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے اس لئے ان جوہڑوں اور ڈیموں کے ان اطراف سے وضو کرنا جائز ہے جہاں نجاست اورگندی چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہوا ہو۔

لمافی الهندية (۱۸/۱): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجاری لايتنجس جميعه بوقوع النجاسة فی طرف منه الا ان يتغير لونه أو طعمه أو ريحه وعلى هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشايخ رحمهم الله كذا فی المحيط۔

وفی الدرالمختار(۱۹۰/۱): (وكذا) يجوز (براكد) كثير (كذلك) أی وقع فيه نجس لم ير أثره ولو فی موضع وقوع المرئية ، به يفتى بحر۔

وفی الشامية (۱۹۱/۱): (قوله به يفتى) أی بعدم الفرق بين المرئية وغيرها۔

(۲۴)ناپاک ٹینک سے کئے گئے وضو اور طہارت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فائزہ ہائیٹس میں ایک پانی کا بہت بڑا ٹینک ہے جو دہ در دہ سے بڑا ہے۔حالیہ بارشوں میں گٹر اور سڑک کا پانی ٹینک میں چلا گیا جس کے بعد پانی میں بدبو آ گئی اور رنگ بھی بدل گیا پھر تقریباً تین دن تک اسی پانی کی سپلائی کی گئی اور پانی میں حسب معمول بدبو تھی۔پھر تین دن کے بعد بدبو تو ختم ہوگئی لیکن پانی پھر بھی گدلا ہی آرہا تھا اور اب کیفیت یہ ہے کہ پانی آہستہ آہستہ صاف ہوتا جارہا ہے مگر بالکل صاف بھی نہیں اور ٹینک کو اب تک صاف نہیں کیا گیا ہے بعض لوگ اسی پانی کو استعمال کررہے ہیں اور بعض نہیں استعمال کررہے ہیں تو جن لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا اور کپڑے وغیرہ دھوئے ان کا کیا

حکم ہے؟اور ٹینک کا پانی پاک ہوگیا یا ٹینک کی صفائی کرنی پڑے گی؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جب پانی کے اوصاف ثلثہ (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک کسی نجاست وغیرہ کے گرنے سے متغیر ہوجائے تو یہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے۔خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔صورت مسئولہ میں جب گٹر یا سڑک وغیرہ کا پانی ٹینک میں داخل ہوگیا اور پانی میں بدبو وغیرہ پیدا ہوگئی اور اس کا رنگ بھی بدل گیا تو یہ پانی ناپاک ہوگیا ہے۔اس سے جن حضرات نے وضو وغیرہ کرکے نماز ادا کی وہ اپنی نمازوں کا اعادہ کریں گے یا اسی طرح اگر کپڑے وغیرہ دھوئے ہوں تو وہ انہیں دوبارہ دھوئیں گے اور جب تک ٹینک کے پانی سے بدبو ختم نہ ہوجائے اور اس کا رنگ صاف نہ ہو،اس وقت تک یہ پانی طہارت کیلئے استعمال کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر ٹینک سے پانی نکال کر اسے دھولیا گیا اور خوب صاف کرنے کے باوجود کچھ بدبو وغیرہ باقی ہے یا رنگت متغیر ہے تو وہ طہارت کیلئے مضر نہ ہوگا۔

لما فی الھندیة(۱۸/۱): الماء الجاری بعد ما تغیر أحد أو صافه وحکم بنجاسته لایحکم بطهارته مالم یزل ذلك التغیر بأن یرد علیه ماء طاهر حتی یزیل ذلك التغیر۔

وفی الدرالمختار(۱۸۵/۱): (وبتغیر احد اوصافه) من لون اوطعم او ریح (ینجس) الکثیر ولو جاریاً اجماعاً۔

وفی الفقه الاسلامی(۲۸۸/۱): واتفق الحنفیة مع الجمهور علی أن الماء الکثیر (وهو عشر فی عشر) لا ینجس الا بظهور اثر النجاسة فیه۔

(۲۵) سیاہ خضاب لگائے ہوئے شخص کے وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا کیسا ہے؟اور اگر لگایا ہو تو وضو اور غسل جنابت صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا مطلقاً ناجائز ہے۔اور ہر وہ خضاب جس سے سر کے بالوں کو یا داڑھی کو رنگوایا گیا ہو اگر وہ ذی جسم ہو اور ذی جسم ہونے کی وجہ سے پانی بالوں تک اور بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت صحیح نہیں ہوگا۔اور اگر وہ ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک اور ان کی جڑوں تک پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافی الھندیة(۳۵۹/۵): واتفق المشایخ ان الخضاب فی حق الرجال بالحمرة سُنة وانه من سیماء المسلمین وعلاماتهم وأما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلك من الغزاة لیکون أهیب فی عین العدوّ فهو محمود منه اتفق علیه المشایخ ومن فعل ذلك لیزین نفسه للنسآء ولیحبب نفسه الیهن

فذلك مكروه وعليه عامة المشايخ۔

وفي الدر المختار(٦/٧٥٦): (اختضب لاجل التزين للنساء والجواري جاز) في الأصح ويكره بالسواد۔

وفي الهندية (١/٤): والخضاب اذا تجسد ويبس يمنع تمام الوضوء والغسل كذا في السراج الوهاج۔

(۲۶) ناخن میں خشک آٹے کے ہوتے ہوئے وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن میں آٹا لگ کر سوکھ گیا ہو، اور دورانِ وضو آٹے کی نیچے والی جگہ پر پانی نہ پہنچا ہو لیکن اس نے دس پندرہ منٹ کے بعد دیکھا کہ آٹا لگا ہوا ہے جو کہ خشک ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ پورا وضو کرے یا صرف آٹا کھرچ کر اس جگہ تک پانی پہنچائے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......وضو کے اندر موالاۃ یعنی (اعضاء کو پے در پے دھونا) اور ترتیب کی رعایت رکھنا سنت ہے اور صورت مسئولہ میں صرف موالاۃ اور ترتیب کی رعایت باقی نہیں رہی لہٰذا آٹا کھرچ کر صرف اس جگہ میں پانی پہنچا دینا کافی ہے۔

لما في الخانية(١/١٧): ولو كان على يديه خبز ممضوغ قد جف و يبس واغتسل لايخرج من الجنابة حتى يدلك ذالك الموضع ويجرى الماء تحته لانه لاحرج فيه۔

وفي الطحطاوي على الدر المختار(١/٨٧): (قوله حتى ماتحت الدرن) قال في البحر والدرن اليابس في الانف كالخبز الممضوغ والعجين يمنع تمام الاغتسال۔

(۲۷) وضوء کے لیے پانی کا عضو پر بہنا شرط ہے یا نہیں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہاتھ پر اگر میل لگ جائے تو وضو کے دوران وہاں پر پانی بہنے کی تعریف جو کہ الاسالہ مع التقاطر (یعنی پانی کا قطروں کی صورت میں بہنا) ہے بظاہر صادق نہیں آتی کیونکہ جس جگہ میل لگا ہے وہاں پر اصابہ (پانی کا پہنچ جانا) ہوا ہے اسالہ (بہنا) نہیں ہوا کیونکہ وہاں صرف پانی کی نمی پہنچی ہے تقاطر نہیں ہوا، لہٰذا برائے کرم اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں کہ آیا اس جگہ کا غسل ہوا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......واضح رہے کہ وضو کی تعریف (جو کہ الاسالۃ مع التقاطر ہے) اس سے یہ مراد نہیں کہ پورے عضو سے ہر ہر جگہ سے تقاطر ہو بلکہ اگر ایک یا دو قطرہ کی بقدر تقاطر ہو جائے تو اس سے بھی تعریف صادق آجائے گی۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جس جگہ میل لگا ہوا ہے اگر وہاں پانی پہنچا ہے اگرچہ تقاطر نہ ہوا ہو تو بھی وضو پر فرق نہیں پڑے گا۔ جبکہ اس عضو میں سے دوسری کسی جگہ سے ایک یا دو قطرہ کی بقدر تقاطر ہو چکا ہو۔

لمافی الهندية(۳/۱) كتاب الطهارة: الفصل الأول في فرائض الوضوء قال الله تبارك وتعالى يا أيها الذين آمنوا إذا قمتم إلى الصلاة فاغسلوا وجوهكم وأيديكم إلى المرافق وامسحوا برءوسكم وأرجلكم إلى الكعبين وهي أربع الأول غسل الوجه الغسل هو الاسالة والمسح هو الإصابة كذا في الهداية وفي شرح الطحاوي أن تسييل الماء شرط في الوضوء في ظاهر الرواية فلا يجوز الوضوء ما لم يتقاطر الماء وعن أبي يوسف رحمه الله أن التقاطر ليس بشرط ففي مسألة الثلج إذا توضأ به ان قطر قطرتان فصاعدا يجوز اجماعا وان كان بخلافه فهو على قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى لا يجوز وعلى قول أبي يوسف رحمه الله تعالى يجوز كذا في الذخيرة والصحيح قولهما كذا في المضمرات۔

وفی الشامية (۹۵/۱) كتاب الطهارة: قوله (أي إسالة الماء الخ) قال في البحر واختلف في معناه الشرعي فقال أبو حنيفة ومحمد هو الإسالة مع التقاطر ولو قطرة حتى لو لم يسل الماء بأن استعمله استعمال الدهن لم يجز في ظاهر الرواية وكذا لو توضأ بالثلج ولم يقطر منه شيء لم يجز

وعن أبي يوسف هو مجرد بل المحل بالماء سال أو لم يسل اهـ

(۲۸) ناخنوں کے اندر میل وضواور غسل میں حائل نہیں ہوتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے ناخن بڑے بڑے ہوتے ہیں اوران کے اندر میل خوب ہوتا ہے بظاہر اس میل کے اندر پانی کا جانا بھی مشکل ہے جب یہ لوگ وضو یا غسل کریں گے تو ان کے وضواور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملك الوهاب...... ناخنوں کے اندر صرف میل کا ہونا وضواور غسل میں حائل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا وضو وغسل درست ہوجائے گا۔ ناخنوں کو چالیس دن سے زیادہ نہ کاٹنا مکروہ ہے اس لئے چالیس دن گزرنے سے قبل ہی ناخن کاٹ لینے چاہیئے۔

وفی خلاصة الفتاوىٰ(۲۲/۱): وما تحت الاظافير من اعضاء الوضوء حتى لو كان فيه عجين يجب ايصال الماء الى ما تحته وفى الوسخ لا ، وكذا الطين القروى و المصرىّ سواء۔

وفى التاتارخانية(۱۵۱/۱): وفى الخانية وما يكون على البدن يقال بالفارسية فلماخ (كذا) لا يمنع عن تمام الغسل لانه يتولد من البدن بمنزلة الدرن۔

وفی الهندیة(۴/۱): وفی الجامع الصغیر سئل ابو القاسم عن وافر الظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین اوالمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء او الصرام او الصباغ قال کل ذلک سواء یجزیهم وضوء هم اذلا یستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوی علی الجواز من غیر فصل بین المدنی والقروی۔

وفی الشامیة(۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به یفتی (ودرن ووسخ) عطف تفسیر، وکذا دهن و دسومة (وتراب) وطین ولوفی ظفر مطلقاً) ای قرویاً او مدنیاً فی الاصح بخلاف نحو عجین۔

وفی الهندیة (۵/۳۵۷): وقلم الاظفار سنة الا فی دارالحرب فان ترکها مندوب الیه کذا فی محیط السرخسی۔

(۲۹) ناخن پالش اور مہندی لگا کر وضو اور غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناخنوں پر مہندی یا ناخن پالش لگی ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اگر کسی کے سر پر مہندی لگی ہو تو غسل میں اس کو اتارنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......مذکورہ بالا صورت میں اگر ناخنوں پر ناخن پالش لگی ہوئی ہو، یا ان اعضاء پر جن کا دھونا وضو میں فرض ہے کوئی ایسی چیز لگی ہوئی ہو جس کی وجہ سے بدن تک پانی نہیں پہنچتا ہو تو وضو صحیح نہیں ہوگا یا بدن کے کسی حصے پر بھی ایسی چیز لگی ہو تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ اور اگر ہاتھ یا سر پر مہندی لگی ہو اور وہ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتی تو وضو اور غسل دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۸۸): (قوله ولوجرمه) الحناء لکن لابد ان یصل الماء تحته واما اذا لم یصل لاتصح الطهارة و لذا قال فی البحر ولو الزقت المرأة راسها بالطیب بحیث لایصل الماء الی اصول الشعر وجب علیها ازالته...(قوله بخلاف نحوعجین) من خبز ممضوغ ودرن یابس فی الأنف وجلد سمك کما فی البحر(قوله ولا یمنع ماعلی ظفر صباغ) للضرورة قال فی المضمرات وعلیه الفتویٰ والقول الثانی انه یمنع وبه صدر فی البحر والظاهر ان هذا الخلاف یجری فی الحناء۔

وفی الدر المختار(۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) أی خرء ذباب وبر غوث لم یصل الماء تحته (وحناء) ولوجرمه به یفتی (ودرن ووسخ)...وکذا دهن ودسومة (وتراب) وطین ولو(فی الظفر مطلقا)...فی الاصح بخلاف نحو عجین (و)لا یمنع (ماعلی ظفر صباغ)۔

وفی ردالمحتار(۱/۱۵۴): (قوله لم یصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غیر ممکن حلیة،(قوله به یفتی)صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسئالة الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورة قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته والمعتبر فی جمیع ذالك نفوذ الماء و وصوله الی البدن ...... (قوله وکذادهن) أی کزیت وشیرج بخلاف نحوشحم وسمن جامد... (قوله بخلاف نحوعجین) ای کعلك وشمع وقشرسمك وخبز ممضوغ متلبد ...(قوله ان صلباً)... ای ان کان ممضوغاً مضغاً متأکدا بحیث تداخلت اجزاء ه وصارله لزوجة وعلاکة کالعجین الخ۔

(۳۰) ہاتھوں پر رنگ لگ جانے کی صورت میں وضو اور غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رنگ سازی کا کام کرتا ہوں تو میرے ہاتھوں پر رنگ لگ جاتا ہے جب نماز کا وقت آ جاتا ہے تو میں وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں تو کیا رنگ کے لگ جانے کی صورت میں وضو اور غسل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر رنگ ایسا ہے کہ اعضاء وضوء یا جسم پر اس کی تہہ جم جاتی ہے۔ جیسے گوندھے ہوئے آٹے کی تہہ اور اس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ پاتا تو وضو اور غسل کی صحت کیلئے ایسے رنگ کا ہر حال میں جسم سے صاف کرنا ضروری ہوگا اور اگر رنگ پانی کے ساتھ مل جاتا ہے اور وہ پانی کو جسم تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تو ایسے رنگ کو اگر صاف نہ بھی کیا جائے تو بھی وضو اور غسل درست ہو جائے گا۔اور اگر رنگ ناخن میں سرایت کر چکا ہے اور اس کو صاف کرنا اذیت سے خالی نہیں اور اچھی طرح صفائی کے باوجود بھی رنگ ناخنوں میں برقرار ہے، تو حرج و اذیت کی وجہ سے وضو اور غسل درست ہو جائیں گے اور اگر ناخن طویل ہیں تو ان کو لازمی طور پر کاٹ لیا جائے۔

لمافی الهندیة(۱/۴): وما تحت الاظافیر من اعضاء الوضوء حتی لوکان فیه عجین یجب ایصال الماء الی ماتحته کذا فی الخلاصة واکثر المعتبرات۔۔۔۔۔ سئل ابوالقاسم عن وافرالظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین والمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء أوالصرام أو الصباغ قال کل ذالك سواء یجزیهم وضوء هم اذ لایستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوی علی الجواز من غیر فصل بین المدنی والقروی کذا فی الذخیره۔

وفی الدرالمختار(۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطهارة... (وتراب) وطین ولو(فی ظفر مطلقاً) ای قرویاً او مدنیا فی الاصح بخلاف نحوعجین

(وفی الشامیۃ تحتہ) : (قولہ بخلاف نحو عجین) أی کعلک وشمع وقشر وسمک وخبز ممضوغ متلبد جوھرۃ ...... نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیۃ فی العجین واستظھر المنع لان فیہ لزوجۃ وصلابۃ تمنع نفوذ الماء۔

(۳۱) پاؤں کی پھٹن پر دوا لگانے کے بعد وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سردیوں میں عام طور پر پاؤں پھٹ جاتے ہیں اگران پر کوئی کریم یا کوئی اور ایسی چیز لگادی جائے کہ اسکی تہہ جم جائے جسکی وجہ سے پانی بظاہر نیچے نہیں پہنچتا، اب ایسی صورت میں پریشانی یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت ایسی کسی بھی چیز کا ہٹانا مشکل ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں اس کریم لگے رہنے کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے یا پھر چند دن تیمم کیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب پاؤں پر کوئی ایسی دوا لگادی جائے جس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ سکے تو حرج کی بناء پر صرف پانی بہادینا کافی ہے، اور اگر دوا ایسی ہے کہ پانی بہانے میں بھی تکلیف ہو تو صرف مسح کرنا کافی ہے ، اور اگر مسح کرنے میں بھی تکلیف ہو تو مسح بھی چھوڑ دیا جائے اور صرف آس پاس کی جگہ دھودی جائے ، البتہ ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار (۱۰۲/۱): فی اعضائہ شقاق غسلہ ان قدر والا مسحہ والا ترکہ۔

وفی الشامیۃ (والا ترکہ) أی وان لم یمسحہ بأن لم یقدر علی المسح ترکہ...ولو کان فی رجلہ فجعل فیہ الدواء یکفیہ امرار الماء فوقہ ولا یکفیہ المسح۔

(۳۲) ہونٹ بند ہونے کے بعد جو حصہ دکھائی دے، وضو میں اس کے دھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہونٹ کا وہ حصہ جو ہونٹ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے کیا اُس کا دھونا بھی فرض ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ہونٹ کا جو حصہ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے وضو اور غسل میں اس کا دھونا بھی فرض ہے۔

لمافی الھندیۃ (۴/۱): واما الشفۃ فما یظھر منھا عند الانضمام فھو من الوجہ وما ینکتم عند الانضمام فھو تبع الفم ھو الصحیح کذا فی الخلاصۃ۔

وفی الدر المختار مع ردالمحتار (۹۷/۱): (یجب غسل المیاق) وما یظھر من الشفۃ عند انضمامھا

قال فی الشامية تحت (قوله عند انضمامها) اشار بصيغة الانفعال الی ان المراد ما يظهرعند انضمامها الطبيعی لاعند انضمامها بشدة وتكلف۔

(۳۳) دانت پر سونے یا چاندی کا خول چڑھانے یا دوا بھروانے کے بعد وضوو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنے دانتوں میں دواوغیرہ بھروالے، یا سونے یا چاندی کا خول چڑھالے تو اس کے وضو یا غسل کی صورت کیا ہوگی؟ اسی طرح سونے یا چاندی کا خول چڑھانا جائز بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض لوگ صرف خوبصورتی کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں اگر دانتوں پر سونے یا چاندی کا خول صرف خوبصورتی کیلئے چڑھایا جارہا ہے تو یہ جائز نہیں لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ہو تو جائز ہے۔

اب اگر دانت میں دواوغیرہ بھری ہے تو اس پر پانی کا گزر جانا کافی ہے اسی سے وضوو غسل میں سنت وفرض ادا ہو جائے گا۔اور سونے یا چاندی کا خول ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس خول کو بلا مشقت نکالا جاسکتا ہے یا نہیں اگر نکالا جاسکتا ہے تو نکالنا ضروری ہوگا بغیر نکالے وضو تو ہو جائے گا لیکن غسل درست نہ ہوگا اور اگر بلا مشقت نہیں نکالا جاسکتا تو پھر نکالنا ضروری نہیں بلکہ اوپر سے پانی کا گزر جانا کافی ہے۔

لمافی الهندية (۳۵/۱): ولو انكسر ظفره فجعل عليه دواء او علكا فان كان يضره نزعه مسح عليه وان ضره المسح تركه۔

وفيه ايضاً (۳۳۶/۵): قال محمد فی الجامع الصغير ولا يشد الأسنان بالذهب ويشدها بالفضة يريد به اذا تحركت الاسنان وخيف سقوطها فاراد صاحبها ان يشدها بالفضة ولا يشدها بالذهب وهذا قول أبي حنيفة وقال محمد يشدها بالذهب ايضا،

وفی الدر المختار (۳۶۱/۶): (ولا يشد سنه)المتحرك (بذهب بل بفضة)وجوزهما محمد (ويتخذ انفاً منه)لان الفضة تنتنه۔

وفی الشامية (لان الفضة تنتنه)الاولی تنتن بلا ضمير واشار الی الفرق للامام بين شد السن واتخاذ الانف فجوز الانف من الذهب لضرورة نتن الفضة لان المحرم لا يباح الا لضرورة وقد اندفعت فی السن بالفضة فلا حاجة الی الاعلی وهو الذهب...

(۳۴) وضو میں زائد انگلیوں کے دھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں پانچ سے زائد انگلیاں ہوتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کے پاؤں کے ساتھ چھوٹے سے پاؤں کی شکل ہوتی ہے، کیا وضو کے فرائض میں ان زائد اعضاء کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟ اگر کسی نے ان اعضاء کو نہیں دھویا تو اسکی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر زائد انگلی یا پیر وغیرہ میں عضو اصلی کی طرح حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت موجود ہو تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر اس میں حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت نہ ہو تو یہ زائد عضو شمار ہوگا، اب یہ عضو اگر محل فرض وضو میں نکل آیا تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر غیر محل فرض وضو میں نکل آیا تو پھر دیکھا جائے گا کہ عضو اصلی کے محاذات میں ہے یا نہیں اگر عضو اصلی کے محاذات میں ہو تو دھونا لازم ہے، اور اگر عضو اصلی کے محاذات میں نہ ہو تو دھونا لازم نہیں البتہ مستحب ضرور ہے۔

لمافی الھندیة (۴/۱): ویجب غسل کل ماکان مرکبًا علی اعضاء الوضو من الاصبع الزائدة والکف الزائدة کذا فی السراج الوھاج۔

وفی الدرالمختار (۱۰۲/۱): ولو خلق له یدان ورجلان فلو یبطش بھما غسلھما ولو باحداھما فھی الاصلیة فیغسلھا وکذا الزائدة إن نبتت من محل الفرض کاصبع وکف زائدین والا فما حاذی منھما محل الفرض غسله ومالا فلا لکن یندب مجتبی۔

وفی الشامیة (ولو خلق له) ای من جانب واحد ... (ولو باحداھما) ای ولو یبطش باحداھما فھی الاصلیة والاخری زائدة لا یجب غسلھا وظاھره ولوکانت تامة وفی النھرولم ار حکم مالو کانتا تامتین متصلتین اومنفصلتین والظاھر وجوب غسلھمافی الاول وغسل واحدة فی الثانی فلم یعتبر البطش والظاھر انه یعتبر البطش اولا فان بطش بھما وجب غسلھما والا فان کانتا تامتین متصلتین وجب غسلھما وان کانتا منفصلتین لا یجب الا غسل الاصلیة التی یبطش بھا وھو حسن جمعابین العبارتین۔

(۳۵) مہندی لگے بالوں کے ساتھ وضو اور غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں میں نے ان پر مہندی لگادی تا کہ زیادہ عمر معلوم نہ ہو، ہمارے ایک عزیز نے دیکھا تو فرمانے لگے اگر جسم پر رنگ وغیرہ لگا ہو تو وضو اور غسل صحیح نہیں ہوتا

آپ فوراً یہ مہندی کا رنگ اتار دیں، کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟ مہندی کے رنگ کے ہوتے ہوئے غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... سُرخ مہندی کا بالوں پر لگانا مردوں کیلئے سنت ہے۔ اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل کرنا احادیث سے ثابت ہے اس لئے آپ کا یہ عمل درست ہے۔ اس کے رنگ کے ہوتے ہوئے وضو اور غسل صحیح ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کا رنگ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتا۔ البتہ اگر کوئی شخص مہندی لگائے اور اس کا جرم بدن یا بالوں پر جما ہوا ہو، اس حال میں وضو یا غسل کرے تو پانی کا اس جرم سے گزر کر بدن تک پہنچ جانا ضروری ہے۔ اگر پانی بدن تک نہ پہنچے اور بال برابر جگہ بھی خشک رہ جائے تو وضو اور غسل صحیح نہیں ہوگا۔

لمافی المسلم (۱۹۹/۲): عن جابر بن عبدالله قال اتی بابي قحافة يوم فتح مكة وراسه ولحيته كالثغامة بياضا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم غيروا هذا بشئ واجتنبوا السواد۔

وفی الدرالمختار(۱۵۱/۱۔۱۵۲): (وفرض الغسل)... (غسل) كل (فمه)... (وانفه) حتى ماتحت الدرن (وبدنه)۔

وقال ابن عابدين تحته : (قوله حتى ماتحت الدرن) قال فی الفتح والدرن اليابس فی الانف كالخبز الممضوغ والعجين يمنع اهـ وهذا غير الدرن الآتي متنا، وقيد باليابس لما فی شرح الشيخ اسمعيل ان فی الرطب اختلاف المشايخ كمافی القنية عن المحيط۔(الشامية ،صـ۱۵۲)

(قوله لم يصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غير ممكن حلية۔(قوله به يفتى) صرح به فی المنية عن الذخيرة فی مسألة الحناء والطين والدرن معللا بالضرورة۔ قال فی شرحها ولان الماء ينفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته، والمعتبر فی جميع ذلك نفوذ الماء ووصوله الى البدن اهـ لكن يرد عليه ان الواجب الغسل وهو اسالة الماء مع التقاطر كمامر فی اركان الوضوء والظاهر ان هذه الاشياء تمنع الاسالة فالاظهر التعليل بالضرورة، ولكن قد يقال ايضاً ان الضرورة فی درن الانف اشد منها فی الحناء والطين لندورهما بالنسبة اليه مع انه تقدم انه يجب ((ا)))غسل ماتحته فينبغی عدم الوجوب فيه ايضا تامل... الدرن الوسخ، واشار بهذا الى ان المراد بالدرن هنا المتولد من الجسد وهو ما يذهب بالدلك فی الحمام بخلاف الدرن الذی يكون من مخاط الانف فانه لو يابسا يجب ايصال الماء الى ماتحته كمامر... (قوله بخلاف نحو عجين) ای كعلك وشمع وقشر سمك وخبز ممضوغ متلبد جوهرة، لكن فی النهر ولو فی اظفاره طين او عجين فالفتوى على انه مغتفر قرويا كان او مدنيا اهـ نعم ذكر الخلاف فی شرح المنية فی العجين واستظهر المنع لان فيه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء (قوله به يفتى) صرح به فی

الخلاصة وقال لان الماء شئ لطيف يصل تحته غالبا اھ ويرد عليه ماقد مناه آنفا ومفاده عدم الجواز اذا علم انه لم يصل الماء تحته، قال فى الحلية وهو اثبت۔ (الشامية ص۱۵۴)

وتحته فى الحاشية(((۱))) (قوله انه يجب غسل الخ) فيه انه لا يقال ذلك مع وجود النص بخلافه وانما يلزم التامل فى وجه الفرق، ويظهر ان علة عدم منع الطهارة فى هده الاشياء الضرورة مع وجود وصول الماء ولو بغير التقاطر، بخلاف درن الانف فان الضرورة وجدت فيه الا ان الوصول لم يوجد، وهذا هو الفرق، ويؤيده اكتفاؤهم بتحريك الخاتم الضيق مع انه يمنع الاسالة تامل اھ۔

(۳۶)وضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ کے دھونے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جہاد افغانستان میں شریک ہوا پانچ چھ ماہ لڑائی کے بعد میرے پاؤں میں گولی لگ گئی جس کی وجہ سے کینسر ہوگیا۔ڈاکٹروں نے میری ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی،اب میں نے اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگوائی ہےتو آیاوضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری ہوگا یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......وضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری نہیں۔البتہ غسل میں مصنوعی ٹانگ کو نکال کر باقی بدن کا دھونا فرض ہے۔

لمافى البحر الرائق (۱/۸۷): الا ما يتعذر ايصال الماء اليه خارج من قضية النص وكذا ما يتعسر لان المتعسر منفى كالمتعذر كداخل العينين فان فى غسلهما من الحرج مالا يخفى۔

وفى الهندية(۱/۱۳۔۱۴): والصرام والصباغ مافى ظفرهما يمنع تمام الاغتسال وقيل كل ذلك يجزيهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع كذا فى الظهيرية۔ وجب تحريك القرط والخاتم الضيقين ولو لم يكن قرط فدخل الماء الثقب عند مروره أجزأه والا أدخله ولا يتكلف فى ادخال شئ سوى الماء من خشب ونحو۔ كذا فى البحر الرائق۔

وفى الدر المختار مع ردالمحتار(۱/۱۵۲۔۱۵۳): (لا) يجب (غسل مافيه حرج كعين) وان اكتحل بكحل نجس (وثقب انضم و) لا (داخل قلفة) يندب هو الاصح قاله الكمال وعلله بالحرج فسقط الاشكال۔

قال الشامى تحت(قوله وثقب انضم) قال فى شرح المنية وإن انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال إن امر عليه الماء يدخله وإن غفل لا فلا بد من امراره ولا يتكلف لغير الامرار من

ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع (قوله وداخل قلفة... وفيه ايضاً(قوله فسقط الاشكال) . . .
ووجه السقوط أن علة عدم وجوب غسلها الحرج۔

(۳۷) ناخنوں پر مہندی لگی ہو تو وضو و غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہاتھ میں اور ناخنوں میں مہندی لگا کر وضو و غسل کرنے سے وضو و غسل ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر کسی کے ہاتھ یا ناخنوں پر مہندی لگی ہو تو یہ وضو و غسل کے صحیح ہونے سے مانع نہیں ہوگی۔ مہندی کے ہوتے ہوئے وضو اور غسل ہو جائے گا جبکہ یقین ہو کہ پانی نیچے تک پہنچ گیا ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) ای خرء ذباب وبرغوث لم يصل المآء تحته (وحناء) ولو جرمه، وبه يفتى۔

وفی الهندية (۱/۴): اوالمرأة صبغت اصبعها بالحنآء اوالصباغ قال كل ذالك سواء يجز يهم وضوٴهم۔

(۳۸) ریل کے دوسرے درجے کے مسافر کیلئے پہلے درجے میں جا کر وضو و غسل کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ ریل سفر کرتے ہوئے، اکانومی درجے میں سفر کرنے والے مسافر کیلئے اکانومی ڈبے میں پانی ختم ہونے کی صورت میں وضو کرنے کیلئے یا بوقت حاجت غسل کرنے کیلئے، اے سی، لوئر بس، ریل کار وغیرہ میں جا کر وضو یا غسل کرنا شرعاً کیسا ہے؟ واضح رہے کہ (۱)۔ اکانومی ڈبے کی ٹکٹ اور دوسرے درجات کی ٹکٹوں میں فرق ہوتا ہے، (۲)۔ ایک درجے والا دوسرے درجے میں سفر نہیں کرسکتا۔ نیز اس صورت میں اگر اجازت نہیں ہے تو نماز کیلئے تیمم کرنا درست ہوگا؟ اس حال میں کہ وقت کے اندر اندر گاڑی رکنے کا امکان نہیں یا پھر اگر رکے تو اسٹیشن پر غسل کا انتظام نہیں اور اگر ہو بھی تو گاڑی رکنے کا وقت اتنا قلیل ہے کہ غسل ممکن نہیں۔ اور اندر بھی کسی اکانومی ڈبے میں پانی نہیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر ریلوے انتظامیہ والوں کی طرف سے ہر خاص و عام ڈبے کو برابر طور پر پانی پہنچانا اُن کی ذمہ داری ہو چاہے اکانومی درجے کے ڈبے ہوں یا اے سی کے ڈبے ہوں، اُن کی طرف سے پانی وغیرہ کے استعمال پر کوئی پابندی نہ ہو، اکانومی درجے کے ڈبے میں پانی ختم ہوگیا، تو اس صورت میں اے سی والے ڈبے میں جا کر وہاں وضو بنانا یا وہاں سے پانی لانا یہ جائز ہوگا، تیمم کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر ہر خاص و عام ڈبے میں انتظامیہ والوں کی طرف سے جانے پر یا پانی کے استعمال پر پابندی ہو، تو اس صورت میں یہ مسافر اکانومی والے ڈبے میں حتی الامکان پانی تلاش کرے، اگرچہ مناسب پیسوں پر کیوں نہ ہو، اگر

پانی اکانومی درجے کے ڈبے میں نہ ہو اور گاڑی کے رُکنے کا امکان بھی نہ ہو یا گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہو لیکن وہاں پانی موجود نہ ہو تو یہ شخص تیمم کر سکتا ہے چاہے وضو کیلئے ہو یا جنابت کیلئے ہو۔ اس شخص کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اے سی یا لوئر بس وغیرہ میں جا کر بغیر اجازت کے وہاں کے پانی سے وضو بنائے یا غسل کرے۔ کیونکہ کسی مسلمان کے مال کو بغیر اُس کی رضامندی کے استعمال کرنا یہ غصب میں آتا ہے، اور مغصوبہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الشامية(١/٢٣٢): (قوله من عجز) العجز على نوعين: عجز من حيث الصورة والمعنى، وعجز من حيث المعنى فقط. فأشار الى الاول بقوله لبعده، وإلى الثانى بقوله (أو المرض)... وأيضاً(صـ٢٣٣)(قوله ولو مقيما) لأن الشرط هو العدم فأينما تحقق جاز التيمم. نص عليه فى الأسرار بحر... وأيضاً فى تنوير الابصار مع شرحه(صـ٢٤٧،٢٤٦)(ويجب) أى يفترض (طلبه) ولو برسوله (قدر غلوة) ثلثمائة ذراع من كل جانب. ذكره الحلبى. وفى البدائع: الأصح طلبه قدر مالايضر بنفسه ورفقته بالانتظار (إن ظن) ظنا قوياً (قربه) دون ميل بأمارة أو اخبار عدل (وألا) يغلب على ظنه قربه (لا) يجب بل يندب إن رجا وإلا لا. ولو صلى بتيمم وثمه من يسأله ثم اخبره بالماء أعاد وإلا لا۔

وفى الفقه الاسلامى(١/٥٩٥) ويلزمه شراء الماء بثمن معتاد لم يحتج له. نقداً أو ديناً فى الذمة. فإن زاد على الثمن المعتاد، ولو درهماً على الراجح. فى ذلك المحل وما قاربه. فلا يلزمه الشراء۔

(٣٩) غسل سے پہلے یا غسل کے بعد وضو کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ غسل کرتے ہیں تو غسل کے بعد مکمل وضو کرتے ہیں کیا ان کا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو اس کیلئے غسل کے بعد وضو کرنا ضروری ہوگا یا غسل ہی کافی ہے؟

الجواب بعون الملك الوهاب: غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے غسل کے بعد وضو کرنا حدیث پاک کی رو سے مکروہ ہے۔ اگر کوئی غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے غسل کرنا کافی ہوگا۔ البتہ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے۔

لمافى الفتاوى السراجية(ص٢): اذا اصاب الرجل المطر اووقع فى نهر جاز وضوءه وغسله ايضاً ان اصاب جميع بدنه وعليه المضمضة والاستنشاق

وفى التاتارخانية(١/١٥١) وتقديم الوضوء على الاغتسال فى الجنابة سنة وليس بفرض عند علمائنا

رحمهم الله۔ حتى انّه لولم يتوضأ وافاض الماء على رأسه وسائر جسده ثلاثا أجزاه اذا كان قد تمضمض واستنشق۔

وفى الدر المختار(١/١٥٨): لو توضأ أوّلاً لا ياتى به ثانياً لأنّه لا يستحب وضوء ان للغسل اتفاقاً، اما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس على مذهبنا الخ۔

وقال ابن عابدين رحمه الله تحته: (قوله لانه لا يستحب) ...... أخرج الطبرانى فى الأوسط عن ابن عباس رضى الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من توضا بعد الغسل فليس منا والظاهر أن عدم استحباب لو بقى متوضأ الى فراغ الغسل فلو أحدث قبله ينبغى اعادته۔

(۴۰) اعضاءِ وضو کٹے ہوئے ہوں تو وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں، جسکی وجہ سے وضو نہ کرسکتا ہو یا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو کہ وضو کرنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں وضو ساقط ہوگا یا نہیں، اسی طرح نماز پڑھنی ضروری ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جس شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور وضو پر قادر نہ ہو تو اس صورت میں اگر خادم وغیرہ ہو تو وہی وضو کرائے، اگر خادم وغیرہ نہ ہو تو کسی کو اجرت پر مزدور رکھ لیں، لیکن اگر نہ تو خادم وغیرہ ہو، اور نہ ہی مزدور رکھنے کی استطاعت ہو تو ایسے شخص سے وضو ساقط ہوجائے گا، لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لے، اور تیمم کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے چہرے اور کٹے ہوئے ہاتھوں سے جو حصہ باقی ہوا سے دیوار سے مل لے۔

اور جس شخص کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو تو وہ عام طور پر وضو پر قادر ہوتا ہے، لہٰذا اس سے وضو ساقط نہیں ہوگا، البتہ جو ہاتھ کٹا ہوا ہے اگر وہ کہنی سے اوپر تک کٹا ہوا ہو تو اس ہاتھ کو نہیں دھوئے گا اور اگر وہ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا ہو تو باقی ماندہ ہاتھ کو دھونا لازم ہوگا۔

لما فى الهنديه (١/٢٨): أو كان لا يجد من يوضيه ولا يقدر بنفسه فان وجد خادماً أوما يستأجر به اجيراً أو عنده من لواستعان به اعانه فعلى ظاهر المذهب انه لا يتيمم لانه قادر۔

وفيه ايضاً(١/٥): ولوقطعت يده اورجله فلم يبق من المرفق والكعب شئى سقط الغسل ولوبقى وجب وكذا غسل موضع القطع۔

وفى ردالمحتار (٢/١٠٢): وقيل لاصلوة عليه اختاره صاحب الدرر فى متنه وشرحه فقال قطعت يداه ورجلاه من المرفق والكعب لا صلوة عليه كذافى الكافى وقيل ان وجد من يوضيه يامره ليغسل وجهه وموضع القطع ويمسح راسه والاوضع وجهه ورأسه فى الماء اويمسح وجهه وموضع

القطع على جدار فيصلى كذا فى التاتارخانية۔

(۴۱) وضو میں اکثر شک ہو تو نیا وضو کرے یا نہ کرے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو اکثر وضو میں شک ہوتا ہو تو کیا وہ ہر نماز کیلئے وضو کرے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے ایسے شخص کو ہر نماز کے لئے نئے سرے سے وضو کرنا ضروری نہیں، اور اگر کسی کو اس طرح کے شک کی عادت ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کو چاہیئے کہ اس کی طرف بالکل التفات نہ کرے کیونکہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور حدیث شریف میں اس سے بچنے کی تلقین آئی ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۳): فی الاصل من شك فی بعض وضوئه وهو اول ماشك غسل الموضع الذی شك فيه فان وقع ذلك كثيراً لم يلتفت اليه هذا اذا كان الشك فی خلال الوضوء فان كان بعد الفراغ من الوضوء لم يلتفت الی ذلك ومن شك فی الحدث فهو علی وضوئه ولو كان محدثا فشك فی الطهارة فهو علی حدثه ولا يعمل بالتحری كذا فی الخلاصة۔

وفی الدر المختار (۱/۱۵۰): شك فی بعض وضوئه أعادماشك فيه لوفی خلاله ولم يكن الشك عادة له والا لا۔

وفی الشامية تحته : (قوله والالا) أی وان لم يكن فی خلاله بل كان بعد الفراغ منه وان كان أول ماعرض له الشك أو كان الشك عادة له وان كان فی خلاله فلا يعيد شيئا قطعاً للوسوسة عنه كما فی التاتارخانية وغيرها۔

(۴۲) وضو کے بعد اگر وضو میں شک پڑ گیا تو......

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی گھر سے وضو کر کے مسجد جائے اور وہاں جا کر کسی عضو کے بارے میں شک پڑ جائے کہ یہ دھویا بھی ہے یا نہیں؟ ایسی صورت میں وضو دوبارہ کرے یا کوئی اور صورت اختیار کرے؟ نیز اگر یہی شک نماز کے بعد ہو جائے تو پھر کیا کرے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں وضو سے فراغت کے بعد اگر شک ہو جائے، چاہے یہ شک وضو کے بعد ہو یا نماز کے بعد تو ایسے شک کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا ایسے وضو سے نماز کی ادائیگی صحیح ہے، دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۱۳): من شك فی بعض وضوئه ...فان وقع ذلك كثيرا لم يلتفت اليه هذا اذا

كان الشك فى خلال الوضوء فان كان بعد الفراغ من الوضوء لم يلتفت الى ذلك۔

(۴۳) گرمی دانوں کے پانی سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے بدن پر گرمی دانے ہوں اوران سے پانی نکل آئے تو کیا وضوٹوٹ جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں صرف گرمی دانوں سے پانی نکلنے سے وضونہیں ٹوٹتا البتہ جب پانی نکل کر بہہ جائے تو وضوٹوٹ جائے گا۔

وفى الهندية(۱/۱۰): مايخرج من غير السبيلين ويسيل الى مايظهر من الدم والقيح والصديد والماء لعلة وحد السيلان أن يعلو فينحدر عن رأس الجرح۔

وفى الدر المختار(۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج(نجس) بالفتح وبكسر (منه) أى من المتوضئ الحى معتادا أولا من السبيلين أولا (إلى مايطهر) بالبناء للمفعول أى يلحقه حكم التطهير ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفى غيرهما عين السيلان ولو بالقوة لماقالوا۔

(۴۴) کلّی کرتے وقت دانتوں سے خون آنے کی صورت میں وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب کلّی کرتا ہوں تو میرے دانتوں سے تھوڑا بہت خون نکل آتا ہے۔ایسی صورت میں میراوضوصحیح ہوگا یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......دوران وضوکلی کرتے ہوئے اگر منہ سے تھوڑا بہت خون نکلتا ہو،تواس صورت میں وضوجاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں البتہ وضوکر لینے کے بعد یاویسے ہی کلی کرتے وقت اگر منہ سے خون نکلے اور خون تھوک پر غالب یا مساوی ہو (اس طور پر کہ تھوک میں سرخی آگئی ہو) تو وضوٹوٹ جائے گااور اگرتھوک غالب اورخون مغلوب ہو(اس طور پر کہ تھوک زردی مائل ہے) تو پھر وضونہیں ٹوٹے گا۔

لمافى الهندية(۱/۱۱): ان خرج من نفس الفم تعتبر الغلبة بينه وبين الريق فان تساويا انتقض الوضوء ويعتبر ذالك من حيث اللون فان كان احمر انتقض وان كان اصفر لا ينتقض كذا فى التبيين المتوضئ اذا عض شيئاً فوجد فيه اثر الدم او استاك بسواك فوجد فيه اثر الدم لاينتقض مالم يعرف السيلان۔

وفى الدر المختار(۱/۱۳۸-۱۳۹): (و)ينقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب على بزاق) حكماً

للغالب (اوساواه) احتیاطاً (لا) ینقضه (المغلوب بالبزاق)۔

وفی الشامیة تحته : (قوله غلب علی بزاق)۔۔۔۔۔۔۔ وعلامة کون الدم غالباً او مساویاً ان یکون البزاق احمر وعلامة کونه مغلوباً ان یکون اصفر۔

(۴۵) دوران وضو کوئی ناقض وضو پایا جائے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو وضو کرتے ہوئے کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو دوبارہ از سر نو وضو کرنا پڑے گا یا جو ہو چکا وہی کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اس صورت میں از سر نو وضو کرنا ضروری ہے۔

لمافی الهندیة (۲۶/۱): لو ضرب یدیه فقبل أن یمسح أحدث لا یجوز المسح بتلك الضربة کمالو أحدث فی الوضوء بعد غسل بعض الأعضاء۔

(۴۶) اگر دانتوں سے خون آجائے تو وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ باوضو ہوتے ہوئے جب دوسری نماز کا وقت آجائے تو میں صرف مسواک استعمال کرتا ہوں، اب اس میں بعض دفعہ خون کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں، کیا منہ سے تھوڑا سا بھی خون نکل آئے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر خون کے بارے میں معلوم ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو دیکھا جائے گا، اگر بہہ رہا ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نہ بہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو تھوک کو دیکھیں گے اگر خون کی سرخی تھوک کے برابر ہو یا تھوک سے زیادہ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا لیکن اگر خون کی سرخی تھوک سے کم ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الهندیة (۱۱/۱): المتوضئی اذا عض شیئاًفوجد فیه أثرالدم او استاك بسواك فوجد فیه أثرالدم لا ینتقض مالم یعرف السیلان کذا فی الظهیریة۔

وفی الشامیة (۱۳۹/۱): (غلب علی البزاق)...علامة کون الدم غالباً او مساویاً ان یکون البزاق احمر وعلامة کونه مغلوباًان یکون اصفر بحر ط۔

(احتیاطاً)ای لاحتمال السیلان وعدمه فرجح الوجود احتیاطا بخلاف ما اذا شك فی الحدث لانه لم یوجد الا مجردالشك ولا عبرة له مع الیقین۔

(۴۷) کیا تھوڑا سا خون نکلنا بھی ناقض وضو ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے جسم پر پھوڑا نکل آئے اور وہ اسے دبادے جس سے کچھ خون بھی نکل آئے تو کیا اس طرح تھوڑا سا خون نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر خون اتنا نکلا کہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا یعنی بہنا شروع کر دیا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): خرج دم من القرحة بالعصر ولولاه ماخرج نقض فی المختار کذا فی الوجيز لکردری۔

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۵): المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفی غيرهما عين السيلان ولو بالقوة۔

وفی الشامية (عين السيلان) اختلف فی تفسيره.ففی المحيط عن ابی يوسف ان يعلو وينحدر،وعن محمد اذا انتفخ علی رأس الجرح وصار اکثر من رأسه نقض،والصحيح لا ينقض ـقال فی الفتح بعد نقله ذلك وفی الدراية جعل قول محمد أصح ومختار السرخسی الاول وهوالاولی اقول کذا صححه قاضی خان وغيره۔

(۴۸) دودھ پلانے سے وضو کا نہ ٹوٹنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو دو سال ہونے والے ہیں اللہ پاک نے اپنے کرم سے ایک بیٹا دیا ہے جو مجھے بہت ہی پیارا ہے ایک دن میں نے نماز کیلئے وضو کیا وضو کے بعد میرا بیٹا رونے لگا تو میں نے اس کو دودھ پلانا شروع کیا اس وقت مجھے شوہر نے منع کیا کہ وضو کے بعد نماز سے پہلے دودھ نہ پلایا کرو بچہ کو دودھ پلانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا میرے شوہر کی بات صحیح ہے؟ یا اس سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جو چیزیں وضوء کو توڑتی ہیں ان میں یہ بات ہے کہ نجس چیز کا خروج پایا جائے یا اگر کوئی پاک چیز بھی موضع نجاست یعنی سبیلین سے نکلے تو وضوء ٹوٹ جاتا ہے چونکہ دودھ بذات خود پاک ہے اور اس کا خروج بھی موضع نجاست سے نہیں ہے اس لئے وضوء نہیں ٹوٹے گا کیونکہ نجس چیز کے نکلنے سے وضوء ٹوٹتا ہے اور دودھ پاک ہے نجس نہیں ہے، اس لئے آپ کے دودھ پلانے سے وضوء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لمافی تبيين الحقائق(۱/۴۵ـ۴۷ـ۴۸): (وينقضه خروج نجس منه) ای وينقض الوضوء خروج نجس

فدخل تحت هذه الكلمة جميع النواقض الحقيقية وان كان طاهرا فی نفسه كالدودة من الدبر لانها تستصحب شيئا من النجاسة وتلك هی الناقضة للوضوء فصدق قوله خروج نجس وهو مجمل فيحتاج فيه الٰی التفاصيل من بيان المخرج وما يخرج منه اعلم ان المخرج علی نوعين سبيلين وغيرهما اما السبيلان فخروج كل شئ منهما ناقض للوضوء... ... وأما غيرهما ای غير السبيلين اذا خرج منه شئ ووصل الی موضع يجب تطهيره فی الجنابة ونحوه ينقض الوضوء .... ولا فرق بين الصديد والدم والقيح والماء خلافا للحسن فی غير الدم هو يجعله كالعرق واللبن والمخاط۔

وفی الشامية مع الدر(۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس)... (منه) ای من المتوضی حاصله ان الطهارة ترتفع بضدها وهی النجاسة القائمة بالخارج لان الضد هو المؤثر فی رفع ضده۔

وفی الدر مع الشامية(۱/۱۳۵): وخروج غير نجس مثل ريح(قوله مثل ريح) فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لان عينها نجسة لان الصحيح ان عينها طاهرة حتی لو لبس سراويل مبتلة او ابتل من اليتيه الموضع الذی تمربه الريح فخرج الريح لا يتنجس۔

وفی الدرالمختار(۱/۱۴۷): (كما) لا ينقض (لو خرج من اذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لا بوجع) وان خرج به ای بوجع نقض۔

(۴۹) متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی قے آنے سے وضو کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے کرنا اگر اس کو جمع کیا جائے تو منہ بھر کر ہو، کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے ہوئی ہو جو منہ بھر کر ہو اور اس کا سبب (متلی وغیرہ) ایک ہی ہو اگر چہ یہ قے وقفہ کے ساتھ مختلف مجالس میں ہو تو اصح قول کے مطابق اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): وان قاء قليلا قليلا لوجمع يبلغ ملٔ الفم قال محمد رحمه الله تعالیٰ ان اتحد السبب جمع والا فلا وهذا اصح۔

وفی الدرالمختار(۱/۱۴۰): (ويجمع متفرق القئ) ويجعل كقئ واحد(لاتحاد السبب) وهو الغثيان عند محمد وهوالاصح۔

(۵۰) بیٹھے بیٹھے سوجانے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت یہ ہے کہ میں فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہوں البتہ کبھی کبھی سوجاتا ہوں جس میں، میں نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا ہوتا ہے، اس طرح بعض دفعہ گر بھی جاتا ہوں، کیا اس طرح سونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اگر بیٹھے بیٹھے سوجائیں یا سونے کی وجہ سے گر جائیں اور گرتے ہی فوراً جاگ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر گرنے کے بعد فوراً نہ جاگیں بلکہ کچھ دیر بعد جاگیں تو وضوٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (۱۲/۱): ولو نام قاعداً فسقط على وجهه أو جنبه ان انتبه قبل سقوطه أو حالة سقوطه أو سقط نائماً وانتبه من ساعته لا ينتقض وان استقر نائماً ثم انتبه ينتقض۔

لمافی الدر المختار (۱۴۲/۱): ولو نام قاعداً يتمايل فسقط، ان انتبه حين سقط فلا نقض به يفتى۔

وفی الشامية (حين سقط) اى عند اصابة الارض بلا فصل شرح منية، وكذا قبل السقوط او فى حال السقوط، اما لو استقر ثم انتبه نقض لأنه وجد النوم مضطجعاً حلية۔

(۵۱) حالت نماز میں نیند آجانے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کی حالت میں تھا کہ اس کو نیند آ گئی تو کیا نماز کی حالت میں سوجانے سے وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... نیند کی ہر وہ حالت جو استرخائے مفاصل (اعضاء کے ڈھیلے ہوجانے) کا سبب بنے وہ ناقض وضو ہے خواہ نماز کی حالت میں ہو یا خارج از صلوۃ ہو۔ لہٰذا نماز میں مطلقاً نیند آجانے سے وضو نہیں ٹوٹے گا خواہ قیام کی حالت میں ہو یا رکوع وسجود کی حالت میں، چاہے جان بوجھ کر سوجائے۔ لیکن اگر سجدہ کو غیر مسنون طریقہ سے ادا کرتے ہوئے سوگیا تو چونکہ اس صورت میں استرخائے مفاصل ہوجاتا ہے اس لئے اس صورت میں وضوٹوٹ جائے گا اور نماز فاسد ہوجائے گی۔

لمافی الهندية(۱۲/۱): (ومنها النوم) ينقضه النوم مضطجعا فى الصلوة وفى غيرها بلاخلاف بين الفقهاء... ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولوفى السرج او المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقا ان كان فى الصلوة وان كان خارجها فكذالك الافى السجود فانه يشترط ان يكون على الهيئة المسنونة له بان يكون رافعاً بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه و ان سجد على غير هذه الهيئة انتقض وضوئه۔

وفي الدرالمختار(۱/۱۴۱):(و) ينقضه حكما (نوم يزيل مسكته) اى قوته الما سكة بحيث تزول مقعدته من الارض وهو نوم على احد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه(والا) يزل مسكته (لا)ينقض وان تعمده فى الصلوة أو غيرها على المختار كالنوم۔

وفى الشامية تحته : ظاهر الرواية ان النوم فى الصلوة قائما أو قاعدا او ساجدا لايكون حدثا سواء غلبه النوم أو تعمده۔

(۵۲)انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص انجکشن کے ذریعے سے خون نکلوائے جیسے کہ کسی ٹیسٹ وغیرہ کیلئے نکالتے ہیں،تو کیا اس سے وضوٹوٹ جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں انجکشن کے ذریعے خون نکلوانے سے وضوٹوٹ جائے گا۔کیونکہ خون سے وضوکے ٹوٹ جانے کیلئے ''بہنا'' ضروری ہے،وہ اگرچہ یہاں بالفعل نہیں پایا جارہا لیکن بالقوۃ پایا جارہا ہے یعنی اس میں بہنے کی صلاحیت موجود ہے۔لہٰذا اس سے وضوٹوٹ جائے گا۔

لمافى الهندية (۱/۱۱):القراد اذا مص عضو انسان فامتلأ دماً ان كان صغيراً لا ينقض وضوئه كما لو مصت الذباب او البعوض وان كان كبيراً ينقض۔

وفى الدرالمختار (۱/۱۳۵):ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفى غيرهما عين السيلان ولو بالقوة لما قالوالو مسح الدم كلما خرج ولو تركه لسال نقض والا لا۔

وفى الشامية (۱/۱۳۴):فالاحسن ماً فى النهر عن بعض المتاخرين من ان المراد السيلان ولو بالقوة اى فان دم الفصد ونحوه سائل الى ما يلحقه حكم التطهير حكما . . .

(۵۳)انجکشن کے ذریعہ مریض کے پیٹ سے پیشاب نکالنے پروضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بیمار ہے ہسپتال میں پڑا ہوا ہے دونوں راستوں سے پیشاب بند ہے ڈاکٹروں نے اس کا پیشاب انجکشن کے ذریعے پیٹ میں سوراخ کرکے نکال دیا۔مطلوبہ امر یہ ہے کہ اس مریض کا وضوء ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ کیونکہ فقہاء نے صرف احدالسبیلین کی شرط لگائی ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر انجکشن کے ذریعے ڈاکٹروں نے پیشاب نکالا ہے تو مریض کا وضو ٹوٹ جائے گا کیونکہ احناف کے ہاں احدالسبلین (پیشاب وپائخانہ کے مقام) کے علاوہ سے بھی اگر نجاست نکل آئے تو وضوٹوٹ جاتا

ہے نیز اگر چہ یہاں خروج نجس نہیں ہے بلکہ اخراج (نکالنا) ہے لیکن اخراج سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی البزازیة علی ھامش الھندیة (۱۲/۴): خرج دم من القرحة بالعصر ولولاہ ماخرج نقض فی المختار لان فی الاخراج خروجاً۔

وفی الدر المختار (۱/۱۳۶ـ۱۳۷): (والخارج) بنفسه (سیان) فی حکم النقض علی المختار کمافی البزازیة: قال لان فی الاخراج خروجاً فصار کالفصد وفی الفتح عن الکافی انه الاصح، واعتمد القهستانی، وفی القنیة وجامع الفتاوی إنه الاشبه ومعناہ انه الاشبه بالنصوص روایة والراجح درایة فیکون الفتوی علیه۔

وفی الشامیة تحته: (قوله لان فی الاخراج خروجاً)...وفیه انه لاتأثیر یظهر للاخراج وعدمه بل لکونه خارجاً نجسا وذلك یتحقق مع الاخراج کما یتحقق مع عدمه فصار کالفصد الخ۔

(۵۴) کھانسی میں بلغم کے ساتھ خون آئے تو وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے بعض اوقات جب اس کو کھانسی آتی ہے تو بلغم کے ساتھ خون بھی نکلتا ہے، تو کیا اس سے وضو پر کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کھانسی کے ساتھ جو بلغم آئے وہ فی نفسہ پاک ہے۔ لیکن اگر اس بلغم میں خون کی آمیزش ہوجائے تو دیکھا جائے گا کہ خون غالب ہے یا بلغم، اگر خون غالب ہے تو وضوٹوٹ جائیگا اور اگر بلغم غالب ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا البتہ خون اور بلغم کے برابر ہونے کی صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ دوبارہ وضو کرے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۸۰): (قوله علی بزاق) هو بالزای والسین والصاد کما فی شرح المنیة۔ (قوله حکما للغالب) علة للنقض (قوله او ساواہ) علامة کون الدم غالبا او مساویاً أن یکون البزاق احمر و علامة کونه مغلوبا أن یکون اصفر(قوله احتیاطاً) علة للنقض حال المساواة وذلك لانه یحتمل أن یکون سیلانه بنفسه او أساله غیرہ فوجد الحدث من وجه فرجحنا جانب الوجود احتیاطاً ...(قوله لاینقضه المغلوب) لان الغالب البزاق والحکم له فکأن کله بزاق۔

وفی الدر المختار (۱/۱۳۸): (و)ینقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب علی بزاق) حکما للغالب (اوساواہ) احتیاطاً (لا) ینقضه (المغلوب بالبزاق) والقیح کالدم والاختلاط بالمخاط کالبزاق۔

(۵۵) آنکھوں سے بہنے والے پانی سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کی آنکھوں میں تکلیف ہو اور اس تکلیف کی بناء پر آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا ہو تو کیا اس پانی کے نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا یا اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا؟

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں اگر پانی چندھیا، پھنسی یا آشوب چشم کی وجہ سے ہو اور اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ ایک نماز کے وقت میں صرف فرض کی ادائیگی بھی دشوار ہو (کہ وضو کے بعد پانی بہنے سے پہلے پہلے نماز ادا نہ کی جا سکتی ہو) تو وہ معذور ہے، ہر نماز کیلئے وضو کر لیا کرے، اور اگر اس قدر مسلسل نہ ہو بلکہ کبھی کبھار نکل آتا ہو تو چونکہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا وہ دوبارہ وضو کیا کرے اور یہ پانی کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ صرف آنسوں بہہ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا لہٰذا دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية (۱۱/۱): والغرب في العين بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضوء كذا في فتاوى قاضيخان ، ولو كان في عينيه رمد أو عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال أن يكون صديداً او قيحاً۔

وفي رد المحتار (۱۴۸/۱): وعن محمد رحمه الله اذا كان في عينيه رمد و تسيل الدموع منها امره بالوضوء لوقت كل صلاة لاني اخاف أن يكون مايسيل منها صديداً فيكون صا حب العذر۔

(۵۶) سوزش آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا ہو تو وضو ونماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی آدمی کی آنکھ میں سوزش ہو رہی ہو، اور اس کی وجہ سے آنکھ سے پانی نکل رہا ہو، کیا از روئے شرع وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہے تو نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہوگا، جبکہ پانی مسلسل بہہ رہا ہو؟

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں ذکر کردہ مرض میں مبتلا آدمی کا وضو ٹوٹ جاتا ہے اگر ایک وقت نماز کے بقدر بھی پانی بہنے کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا ہو تو اس کو شرعاً معذور شمار کیا جاتا ہے جس کے لئے نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز کیلئے علیحدہ وضو کرے، اس سے وہ فرض اور نوافل اسی وقت کے اندر اندر جتنا ہو سکے پڑھتا رہے پھر دوسرے وقت کے فرض کے لئے دوسرا وضو کرے۔

لمافي الهندية(۱۱/۱): والغرب في العين بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضوء... ولو كان في عينه رمد او عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال ان يكون صديدا او قيحا۔ كذا في التبيين۔

وفى الدر المختار(١/١٤٧-١٤٨): فدمع من بعينه رمد او عمش ناقض فان استمرصار ذا عذر "مجتبى" والناس عنه غافلون۔

وفى الدر المختار (١/٣٠٥):(صاحب عذر من به سلس) بول لايمكنه امساكه... او بعينه رمد او عمش او غرب وكذا كل مايخرج بوجع ... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) الى ان قال... (وحكمه، الوضوء)... (لكل فرض) ثم يصلى فيه فرضا ونفلا فاذاخرج الوقت بطل) الخ۔

(۵۷) شرمگاہ سے رطوبت خارج ہونے سے وضوو غسل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو بیٹھے بیٹھے کسی لڑکی کا خیال آیا، یا اس نے کسی لڑکی کو دیکھا اور اسی وقت شرمگاہ سے رطوبت خارج ہوئی تو اس سے غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... مذکورہ بالا صورت میں اگر رطوبت شرمگاہ سے خارج ہوئی تو یہ چار حالت سے خالی نہیں ہوگی پیشاب ہوگا یا مذی ہوگی یا ودی ہوگی یا منی ہوگی۔ پہلی تین صورتوں میں غسل واجب نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف وضو کرے گا اور اگر منی ہو تو اگر دفق یعنی کود کر شہوت کے ساتھ نکلی ہو تو غسل کرنا واجب ہے اور اگر دفق وشہوت کے ساتھ نہ ہو تو غسل واجب نہ ہوگا اور اگر منی کے اپنی جگہ سے جدا ہوتے وقت شہوت موجود تھی اگر چہ شرمگاہ سے نکلتے وقت شہوت نہ ہو پھر بھی غسل کرنا واجب ہے۔ منی...... وہ گاڑھا پانی ہے جو شدت شہوت کے وقت کود کر نکلتا ہے اور اس میں چکناہٹ ہوتی ہے اور اس سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نکلنے کے بعد ذکر منتشر نہیں رہتا ہے اور شہوت ختم ہوجاتی ہے۔ <u>مذی...... وہ سفید گاڑھا پانی ہے جو شہوت کے وقت نکلتا ہے اور عام طور پر اپنی بیوی کے ساتھ</u> ملاعبت کے وقت نکلتا ہے۔ ودی...... وہ گاڑھا پانی ہے جو دودھ کی طرح سفید ہوتا ہے اور پیشاب کے بعد نکلتا ہے جو ایک طرح سے گاڑھا پیشاب ہوتا ہے۔ [illegible]

لمافى الشامية (١/١٦٠):(قوله بشهوة)متعلق بقوله منفصل احترز به عمالو انفصل بضرب اوحمل ثقيل على ظهره فلا غسل عندنا... (قوله وشرطه ابويوسف) اى شرط الدفق واثره الخلاف يظهر فيما لو احتلم او نظر بشهوة فامسك ذكره حتى سكنت شهوته ثم ارسله فانزل وجب عندهما لاعنده... (قوله وبقول ابى يوسف ناخذ) اى فى الضيف وغيره... (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار مافى النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر (الا)سيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط۔ فينبغى الافتاء بقوله فى مواضع الضرورة: فقط تأمل...

وفی الدر المختار(۱/۱۶۵): (لا) عند (مذی اوودی) بل الوضوء منه ومن البول جمیعاً علی الظاھر

وفی رد المحتار تحته: (قوله لا عند مذی) ای لا یفرض الغسل عند خروج مذی... ماء رقیق ابیض یخرج عند الشھوة لابھا وھو فی النساء اغلب ... (قوله او ودی)... ماء ثخین ابیض کدر یخرج عقب البول نھر (قوله بل الوضوء منه الخ) ای بل یجب الوضوء منه ای من الودی ومن البول جمیعاً۔ وھذا جواب عما یقال ان الوجوب بالبول السابق... وبیان الجواب ان وجوبه بالبول لاینافی الوجوب بالودی بعده ... الخ۔

(۵۸)خون دینے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مریض کو خون دے تو کیا خون دینے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ جبکہ خون نکالتے وقت سوائے سرنج کے اِدھر اُدھر نہ پھیلے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......خون دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ خون بدن پر بالکل نہ پھیلے۔

لمافی الهندیة (۱/۱۱): القراد إذا مص عضو إنسان فامتلأ دما إن کان صغیرا لا ینقض وضوءه کما لو مصت الذباب أو البعوض، وإن کان کبیرا ینقض وکذا العلقة إذا مصت عضو إنسان حتی امتلأت من دمه انتقض وضوءه۔

وفی الدر المختار(۱/۱۳۴): (وینقضه خروج) کل خارج (نجس)۔۔۔۔۔۔(إلی مایطهر۔

وفی الشامیة تحته: والمراد بالتطهیر مایعم الغسل والمسح فی الغسل أو فی الوضوء کما ذکره ابن الکمال... زاد فی ''شرح المنیة الکبیر'' بعد قوله ''فی الغسل أو فی الوضوء قوله أو فی إزالة النجاسة الحقیقیة لئلا یرد مالو افتصد وخرج منه دم کثیر ولم یتلطخ رأس الجرح فانه ناقض مع أنه لم یسل إلی ما یلحقه حکم التطهیر لأنه سال إلی المکان دون البدن......

أقول: یردعلیه مالو سال إلی نهر ونحوه ممالا یصلی علیه ومالومص العلق أو القراد الکبیر وامتلأ دما فانه ناقض۔۔۔۔۔ فالأحسن مافی النهر عن بعض المتأخرین من أن المراد السیلان ولوبالقوة، أی فإن دم الفصد ونحوه سائل إلی مایلحقه حکم التطهیر حکما۔ تأمل۔ والله اعلم بالصواب۔

(۵۹) ناخن کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن بڑے ہوجائیں وہ وضو کی حالت میں کاٹ لے تو کیا ناخن کاٹنے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب……ناخنوں کے کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ انگلیوں کے پوروں پر پانی بہادینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۴/۱) وان امرالماء علی شعر الذقن ثم حلقه لایجب علیه غسل الذقن وکذالو حلق الحاجب والشارب اومسح رأسه ثم حلق او قلم اظافیره لاتلزمه الاعادة کذا فی فتاویٰ قاضی خان۔

وفی الدر المختار(۱۰۱/۱): (ولا یعاد الوضوء)...(بحلق رأسه ولحیته کما لا یعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره) وکشط جلده۔

(۶۰) ناخن یابال کاٹنے سے وضو کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن یابال کاٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ یاناخن اور بال کاٹنے سے وضو برقرار رہتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب……ناخن یابال کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔

وفی البزازية علی هامش الهندية (۱۳/۴): حلق لحیته أو رأسه أوشاربه، أوقلم أظافره بعد الوضوء لایعید ولا یجب امرار الماء أیضاً۔

وفی الدرالمختار(۱۰۱/۱): (ولا یعاد الوضوء) بل ولا بل المحل (بحلق رأسه ولحیته کمالا یعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء(بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره)

(۶۱) اگر ستر کھل جائے یا ناخن کاٹ لے تو دوبارہ وضو کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی باوضو شخص کسی ضرورت سے کپڑے اتاردے اور بالکل برہنہ ہوجائے یا پھر ناخن یابال کٹوادے تو ان صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب……باوضو ہونے کی حالت میں کپڑے اتاردینے یاناخن یابال کٹوانے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اسی وضو سے نماز وغیرہ کی ادائیگی صحیح ہے۔

لمافي الدرالمختار (۱/۱۰۱):(ولا يعاد الوضوء)بل ولا بل المحل(بحلق رأسه ولحيته كمالا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره)۔

(۶۲) مچھر اگر زیادہ مقدار میں خون چوس لے تو وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھار مچھر اس طرح کاٹتا ہے کہ سارا مچھر خون سے بھر جاتا ہے،اور ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اگر اس پر ہاتھ لگ جائے تو وہیں مر جاتا ہے اور اس کا سارا خون جسم پر لگ جاتا ہے،اب بعض دفعہ یہ خون کافی زیادہ ہوتا ہے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اس طرح مچھر کے کاٹنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا،اسی طرح وہ مقدار جو مچھر کے مرنے سے جسم یا کپڑوں پر لگتی ہے،وہ معاف ہے۔

لمافي الحلبي (ص۱۳۶):(واما الذباب أو البعوض) أو البراغيث ونحوها(فانه اذا مص وامتلأ دما (لا ينقض) لانه غير سائل۔

وفي الدرالمختار (۱/۱۳۹):(والا)... (لا) ينقض(كبعوض وذباب) كما في الخانية لعدم الدم المسفوح۔

(۶۳) کھانے پینے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد کچھ کھانے پینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں،اس وضو سے فرائض پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا،وضو اس وقت ٹوٹتا ہے جب نواقض وضو میں سے کوئی سبب پایا جائے جیسا کہ سبیلین سے کسی چیز کا خارج ہونا یا خون کا نکل کر بہہ جانا وغیرہ وغیرہ۔لہٰذا صورت مسئولہ میں ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد یا اسی طرح کسی نماز کے بعد یا پہلے کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔اور ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں اگرچہ درمیان میں کچھ کھاپی لیں۔البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ اگر کچھ کھاپی لے تو نماز شروع کرنے سے پہلے کلی کر لی جائے۔

لمافي المشكوة(۱/۴۱): عن ابي رافع قال اشهد لقد كنت أشوى لرسول الله ﷺ بطن الشاة ثم صلى ولم يتوضأ، رواه مسلم۔

وفي عمدة القارى(۳/۱۰۶): قوله فمضمض)) اى قبل الدخول في الصلاة۔

بيان استنباط الاحكام: الاول ان فيه استحباب المضمضة بعد الطعام... وقال بعضهم

استدل به البخاری علی جواز صلاتین فاکثر بوضوء واحد... الثانی فیه دلالة علی عدم وجوب الوضوء مما مسته النار۔

وفی الدر المختار(۱/۱۳۴): (وینقضه خروج) کل خارج (نجس)... (منه) أی من المتوضئ الحی معتاداً أولا من السبیلین أولا (إلی ما یطهر)... أی یلحقه حکم التطهیر(ص۱۳۵۔۱۳۶) (وریح او دودة او حصاة من دبر لا)... (ریح من قبل) غیر مفضاة اما هی فیندب لها الوضوء وقیل یجب (و) (ص۱۳۷۔۱۳۸) ینقضه (قئی ملأ فاه) بان یضبط بتکلف (من مرة)... (او علق)... (او طعام او ماءٍ) اذا وصل الی معدته وان لم یستقر وهو نجس مغلّظ۔

(۶۴) معصیت اور گناہ سے وضو یا تیمم ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں گستاخی کرنا بہت بڑا جرم ہے، اگر کوئی شخص شان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں گستاخی کرے تو کیا اس سے وضو یا تیمم ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......شان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں گستاخی کرنا واقعی بہت بڑا جرم ہے، لیکن اس سے وضو یا تیمم نہیں ٹوٹتا۔

لما فی رد المحتار(۱/۲۵۶): (قوله لاتنقضه ردة) ای فیصلی به اذا أسلم. لان الحاصل بالتیمم صفة الطهارة والکفر لاینافیها کالوضوء والردة تبطل ثواب العمل لازوال الحدث شرح النقایة۔

(۶۵) تیمم کے بعد ارتداد سے تیمم کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے ایک کتاب میں یہ مسئلہ پڑھا ہے کہ ایک شخص اگر تیمم کر کے مرتد ہو جائے اور پھر اسلام لے آئے تو امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تیمم باطل ہو جائے گا لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک باطل نہ ہوگا۔ مفتی صاحب ایسا کیوں ہے؟ اس اختلاف کی عقلی وجہ بیان فرمادیں، نیز فتویٰ کس قول پر ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں امام زفرؒ کے نزدیک تیمم کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کفر تیمم کے منافی ہے جیسا کہ کوئی شخص تیمم کر کے مسلمان ہو جائے تو اس کا تیمم باطل ہوتا ہے ایسے ہی اگر کوئی مسلمان شخص مرتد ہو جائے تو اس کا بھی تیمم باطل ہو جائے گا جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کے (نعوذ باللہ) مرتد ہو جانے سے عبادات مقصودہ باطل ہوتی ہیں وضو اور تیمم عبادات مقصودہ میں داخل نہیں ہیں بلکہ طہارت اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ اور آلہ ہیں۔ مرتد ہونے سے صفت طہوریت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ایسا شخص اگر مسلمان ہو جائے تو اس تیمم سے نماز وغیرہ پڑھ سکتا ہے اور فتویٰ بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور

صاحبینؒ کے قول پر ہے۔

لما في الهندية. كتاب الطهارة (۱/۳۰) مكتبه حقانيه: واعتراض الردة على التيمم لا يبطل التيمم حتى لو اسلم وصلى بذلك التيمم يجوز عندنا۔

وفي الشامية. باب التيمم (۱/۲۵۶) قوله (ولا تنقضه ردة) أي فيصلي به إذا أسلم لأن الحاصل بالتيمم صفة الطهارة والكفر لا ينافيها كالوضوء والردة تبطل ثواب العمل لا زوال الحدث۔

(۶۶) غیر تحریف شدہ آسمانی کتابوں کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن مجید کے سوا اور آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو بے وضو چھونا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......قرآن مجید کے سوا بقیہ آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو محرف ہو جانے کی وجہ سے بغیر وضو چھونا جائز ہے البتہ اگر کسی زمانے میں یہ کتابیں غیر محرف حالت میں ہوں تو ان کو بے وضو چھونا مکروہ ہوگا۔

وفي حاشية الطحطاوي على الدر (۱/۱۵۱): يكره مس كتب التفسير والفقه والسنن لانها لاتخلو عن آيات القرآن وهذا التعليل يفيد كراهة... مثل القرآن مالم يبدل من التوراة والإنجيل والزبور نهر۔

وفي الهندية(۱/۳۸): ويكره للحائض والجنب قراءة التوراة والانجيل والزبور۔

(۶۷) بغیر طہارت اخبارات میں لکھی آیات کو ہاتھ لگانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبارات میں بعض دفعہ آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ لکھی ہوتی ہیں، کیا اخبارات میں ان کا شائع کرنا صحیح ہے؟ جبکہ اس میں بے حرمتی کا شائبہ ہے نیز ایسے اخبار کو بغیر وضو چھونا جائز ہوگا یا نہیں، جس میں آیات لکھی ہوئی ہوں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اس بات میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا اور پریس کے عام رواج کی بناء پر قرآنی آیات وغیرہ کا احترام باقی نہیں رہا، اور آیات واحادیث لکھے ہوئے اوراق ردی اور کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں، ایسی صورت میں اخبارات واشتہارات میں آیات واحادیث لکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ آیات واحادیث کی بے حرمتی ہے اور اگر یہ مفاسد نہ ہوں بایں طور کہ تعظیم کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر جائز ہوگا۔ نیز جہاں اخبارات وغیرہ میں آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہوں بغیر وضو صرف اس جگہ پر ہاتھ لگانا منع ہے اس کے علاوہ اخبار کے باقی حصہ میں ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

لمافی الهندية (٣٢٢/٥):ويكره ان يجعل شيئاً فی كاغذة فيها اسم الله تعالى كانت الكتابة على ظاهرها او باطنها بخلاف الكيس عليه اسم الله تعالى فانه لايكره...

وفی الدرالمختار (١٤٦/١):(والتفسير كمصحف لا الكتب الشرعية) فانه رخص مسها باليد لاالتفسير كما فی الدرر عن مجمع الفتاوى۔

وفی الشامية (والتفسير كمصحف)ظاهره حرمة المس كما هو مقتضى التشبيه وفيه نظر اذ لا نص فيه بخلاف المصحف فالمناسب التعبير بالكراهة...والحاصل انه لا فرق بين التفسيروغيره من الكتب الشرعية على القول بالكراهة وعدمه ولهذا قال فی النهر ولايخفى ان مقتضى ما فی الخلاصة عدم الكراهة مطلقا لان من أثبتها حتى فی التفسير نظر الى ما فيها من الايات ومن نفاها نظر الى ان الاكثر ليس كذلك وهذا يعم التفسير ايضا الا ان يقال ان القران فيه اكثر من غيره اى فيكره مسه دون غيره من الكتب الشرعية ۔۔اقول: الاظهر والاحوط القول الثالث اى كراهته فی التفسير دون غيره لظهور الفرق فان القران فی التفسير اكثر منه فی غيره وذكره فيه مقصوداستقلالا لاتبعا فشبهه بالمصحف اقرب من شبهه ببقية الكتب۔

(٦٨)اخبار کے قرآنی آیت والے صفحے کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبار کے جس صفحہ پر قرآنی آیت لکھی ہو، اس کو بے وضو چھونا جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اخبار کا وہ صفحہ جس پر قرآنی آیات لکھی ہوں اس کو چھونا جائز ہے۔البتہ قرآنی آیت کو بلاوضو چھونا جائز نہیں۔

لمافی الشامية (١٤٦/١-١٤٧): (قوله لا الكتب الشرعية) قال فی الخلاصة ويكره مس المحدث المصحف كما يكره للجنب وكذا كتب الأحاديث والفقه عندهما والأصح أنه لا يكره عنده اهـ قال فی شرح المنية: وجه قوله أنه لايسمى ماسا للقرآن لأن مافيها منه بمنزلة التابع۔ ومشى فی الفتح على الكراهة فقال: قالوا يكره مس كتب التفسير والفقه والسنن لأنها لا تخلو عن ايات القرآن وهذا التعليل يمنع من شروح النحو۔اهـ۔ الى ان قال اقول: الأظهر والأحوط القول الثالث أی كراهته فی التفسير دون غيره لظهور الفرق الخ۔ هكذا فی حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح (ص٦٦) وفی مجمع الانهر(٤٠/١) وفی حلبی كبير (ص٥٩)۔

(۶۹) ائمہ اربعہ کے نزدیک قرآن کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا بغیر وضو قرآن کریم کو ہاتھ لگانا ائمہ میں سے کسی کے نزدیک جائز ہے۔ اگر ہے تو کیا وجوہات ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بغیر وضو کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ داؤد ظاہری کے ہاں بغیر وضو کے ہاتھ لگانا درست ہے۔

لمافی الهندية (۳۸/۱): لا يجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف۔

وفي الفقه الحنفي وادلته (۱/۱۰۶): لايجوز لمحدث مس المصحف۔

وفي الفقه الاسلامي(۱/۴۵۰): واتفق الفقهاء على أن غير المتوضي يجوز له تلاوة القرآن او النظر اليه دون لمسه ......وفي(ص۴۵۳) والخلاصة انه وقع الاجماع ماعدا داؤد أنه لايجوز للمحدث حدثا اكبر أن يمس المصحف وأما المحدث حدثا اصغر فلم تدل الأدلة قطعا على منعه من مس القرآن لكن اكثر الفقهاء على انه لا يجوز له۔

(۷۰) تین انگلیوں سے سر کا مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین انگلیاں سر پر رکھنے سے سر کا مسح ہو جاتا ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر تین انگلیوں کے بجائے صرف انگلیوں کے تین پورے رکھے جائیں تو بھی مسح ہو جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مسئولہ صورتوں کی پہلی صورت میں اگر تین انگلیوں سے چوتھائی سر کا مسح کر لیا تو مسح ہو جائے گا اور تین انگلیوں سے کم سے مسح نہیں ہوگا۔

(۲) انگلیوں کے پوروں سے پانی ٹپک رہا ہو اور پورے سر کے چوتھائی کے بقدر مسح کیا جائے تو مسح ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية (۵/۱): المفروض في مسح الرأس مقدار الناصية كذا في الهداية والمختار في مقدار الناصية ربع الرأس كذا في الاختيار شرح المختار الواجب أن يستعمل فيه ثلاث أصابع اليد على الأصح كذافي الكفاية۔

وفي الدر المختار (۹۹/۱): ولو مداصبعًا أواصبعين لم يجز الا ان يكون مع الكف أو بالابهام والسبابة۔

وفي الشامية (۱/۱۰۰): (قوله الا ان يكون مع الكف الخ) لانهما مع الكف او مع مابين الابهام

والسبابة يصيران مقدار ثلاث أصابع او اكثر فاذا مدهما وبلغ قدر الربع جاز۔

وفی الهندية (۱/۵): اذا مسح رأسه برؤس اصابعه فان كان الماء متقاطرا يجوز وان لم يكن متقاطرًا لا يجوز كذا فی الذخيرة۔

وفی رد المحتار(۱/۹۹): لو مسح بأطراف أصابعه والماء متقاطر جاز والا فلا لأنه اذا كان متقاطرا فالماء ينزل من أصابعه الی اطرافها فاذا مده صار كأنه أخذ ماءً جديداً۔

(۷۱) سر کے مسح کی ایک صورت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب ہیں جنہوں نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں، آجکل سردی کا زمانہ ہے جسمیں وہ گرم ٹوپی پہنتے ہیں جو پیچھے سے کانوں سے ذرا نیچے تک یا کانوں تک ہوتی ہے، اب اگر وہ ٹوپی اتارے بغیر صرف پیچھے کے بالوں پر وضو میں مسح کرلیں تو جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر مسح سر پر ہو تو جائز ہے، اور اگر مسح سر پر نہ ہو بلکہ صرف سر سے نیچے کی طرف لٹکے ہوئے بالوں پر ہو تو ناجائز ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۹۹): (ومسح ربع الرأس مرةً) فوق الاذنين ولو باصابة مطر۔

وفی الشامية (فوق الاذنين) فلو مسح علی طرف ذؤابة شدت علی راسه لم يجز۔

(۷۲) مسح کیلئے نیا پانی لینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سر پر صرف مسح کیا جاتا ہے تو کیا اس مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص نیا پانی نہ لے اور بازو یا داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسح کرلے تو مسح ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سر پر مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری نہیں ہے بلکہ ہتھیلیوں کی تری سے ہی مسح کرسکتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ بازو یا داڑھی کی تری سے مسح کرنا جائز ہے یا نہیں تو اس سے پہلے یہ سمجھئے کہ فقہاء کے ہاں پانی مستعمل کب بنتا ہے (یعنی جو پانی ایک مرتبہ استعمال ہوگیا ہو اور اسے دوبارہ استعمال کرنا درست نہ ہو) اکثر فقہاء کے ہاں پانی مستعمل اس وقت بنتا ہے جب استعمال کے بعد پانی بدن سے جدا ہوجائے اور بعض فقہاء کے نزدیک جب بدن سے جدا ہوکر کسی جگہ یا برتن میں جمع ہوجائے اس وقت مستعمل بنے گا۔

اب اس کے بعد سمجھئے کہ جن فقہاء کے ہاں پانی بدن سے جدا ہوتے ہی مستعمل ہوجاتا ہے ان کے ہاں داڑھی یا دوسرے اعضاء کی تری پر ہاتھ پھیر کر مسح کرنا درست نہیں ہوگا البتہ اگر ایک ہی عضو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی لے جائیں (مثلاً سر کے مسح

میں ہتھیلیوں پر جوتری ہوتی ہے اس کو سر کے آگے والے حصہ سے پیچھے اور پیچھے سے آگے لیکر آنا) درست ہوگا، اور جن فقہاء کرام کے ہاں پانی مستعمل بننے کیلئے کسی جگہ یا برتن میں جمع ہونا ضروری ہے ان کے نزدیک داڑھی کی تری سے سر کا مسح کرنا درست ہوگا۔ احتیاط اکثر حضرات کے قول میں ہے، اور آسانی دوسرے قول میں ہے۔

لمافی الهندية (۲۲/۱): الماء الذی أزيل به حدث او استعمل علی وجه القربة فالصحيح أنه كما زايل العضو صار مستعملا هكذا فی الهداية۔

وفی ردالمحتار (۹۹/۱): (قوله او بلل باق الخ) هذا اذا لم ياخذه من عضوآخر مقدسی. فلو اخذه من عضو آخر لم يجز مطلقابحر ای سواء كان ذلك العضو مغسولًا او ممسوحاً۔

وفيه ايضاً(۲۰۰/۱): (قوله وقيل اذااستقر)ای بشرط ان يستقر فی مكان من ارض او كف او ثوب ويسكن عن التحرك وحذفه لانه اراد بالاستقرار التام منه وهذا قول طائفة من مشايخ بلخ واختاره فخرالاسلام وغيره وفی الخلاصة وغيرهاانه المختار الا ان العامة على الاول وهو الاصح واثر الخلاف يظهر فيما لو انفصل فسقط على انسان فأجراه عليه صح على الثانی لا الاول نهر۔ قلت وقد مرّأن اعضاء الغسل كعضو واحد فلوانفصل منه فسقط علی عضو آخر من اعضاء المغتسل فأجراه عليه صح على القولين۔ (قوله ورجح للحرج)لانه لوقيل باستعماله بالانفصال فقط لتنجس ثوب المتوضئی على القول بنجاسة الماء المستعمل وفيه حرج عظيم كما فی غاية البيان۔

رسالة

حفر البئر فی وصل الشعر

مصنوعی بال بذریعہ آپریشن لگوانے یا وگ وغیرہ کا استعمال اور مذکورہ صورتوں میں وضو اور غسل کا حکم

(۷۳) مصنوعی بالوں پر مسح اور غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی عرصہ پہلے میرے سر کے بال گر گئے تھے لوگ مجھے گنجا کہتے تھے جس کی وجہ سے مجھے پریشانی ہوتی، تو مجبوراً میں نے مصنوعی بال لگوالئے ہیں جو کافی خوبصورت لگتے ہیں اب ان بالوں کا وضو اور غسل میں کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں اگر مصنوعی بال وگ کی شکل میں لگائے گئے ہوں، تو وضو میں اس پر مسح کرنا اور غسل میں اس کا دھونا جائز نہیں ہوگا بلکہ اس وگ کو اُتارنا ضروری ہوگا اور اگر مصنوعی بال آپریشن کے ذریعے لگائے گئے ہوں تو ایسا کرنا اگرچہ ناجائز اور گناہ ہے۔ایسا کرنے والا توبہ واستغفار کرے۔ البتہ اگر کسی نے لگوالئے تو جسم کا جزء بننے کی وجہ سے اس پر مسح کرنا اور غسل میں دھونا کافی ہوگا۔

لمافی الخانیة (۳۷۱/۴): ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواءٌ کان شعرها أو شعر غیرها، ولا بأس للمرأة أن یجعل فی قرونها وذوائبها شیئا من الوبر ویکره ان تصل شعرها غیرها۔ ولا بأس للتاجر حلق شعر جبهة الغلام لانه یزید فی الثمن فان کان العبد للخدمة ولا یرید به التجارة لایستحب ان یفعل ذلك۔

وفی فتح القدیر مع شرح العنایة (۱/۱۵۷-۱۵۸): (ویجوز المسح علی الجبائر الخ) قال قاضیخان: هذا إذا کان یضره المسح علی الجراحة، وأما إذا لم یضره فلا یمسح علی الجبائر، والجبائر جمع جبیرة وهی العیدان التی تجبربها العظام، وإنما قال (وإن شدها علی غیر وضوء) لأنها إنما تربط حالة الضرورة، واشتراط الطهارة فی تلك الحالة یفضی إلی الحرج فلا یعتبر۔

وفی مبسوط السرخسی (۶/۱): قال لأن البشرة التی نبت علیها الشعر لایجب ایصال الماء الیها فما هو أبعد أولیٰ لکن الصحیح من المذهب أنه یجب امرار الماء علی ذلك الموضع لأن الموضع

الذی نبت علیه الشعر قد استتر بالشعر فانتقل الفرض منه الی ظاهر الشعر الخ...... وأیضاً (ص۴۵) فالحاصل أن امرار الماء علی جمیع البدن فرض لقوله ﷺ تحت کل شعرة جنابة الافبلوا الشعر وأنقوا البشرة......وأیضاً(ص۶۴) لان المسح علی الشعر بمنزلة المسح علی البشرة التی تحته الخ... وأیضاً (ص۶۵،۶۶) قال (ثم المسح علی الشعر مثل المسح علی البشرة التی تحته) لا أنه بدل عنه بدلیل أن الاصبع اذا مسح علی الشعر جاز ولا یجوز المصیر الی البدل مع القدرة علی الأصل فکان جز الشعر بعد المسح کتقشیر الجلد عن العضو المغسول بعد الغسل فکما لا یلزمه امرار الماء ثمة فکذلك هنا... وأیضاً(ص۷۴) فأما اذا سقط عن غیر برء فالمسح علی الجبائر کالغسل لما تحته مادامت العلة باقیة ولهذا لا یتوقف بخلاف المسح بالخف۔

(۷۴) مذکورہ فتوے پر ایک استدراک اور اس کا جواب

سوال......مفتی صاحب! مجھے نجم الفتاویٰ جلد ثانی میں طبع ایک فتویٰ سے متعلق استفسار کرنا ہے۔مسئلہ مسح سے متعلق ہے۔وہ یہ کہ مصنوعی بالوں کا لگوانا جائز ہے یا ناجائز؟ بظاہر فقہ کے حوالہ جات سے تو جانوروں کے بال لگوانا جائز معلوم ہوتا ہے لیکن نجم الفتاویٰ میں اسے ناجائز اور گناہ قرار دیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ سے درج ذیل باتوں کے جواب مطلوب ہیں:

(۱)۔کیا ہر قسم کے بال لگوانا مطلقاً ناجائز ہے؟

(۲)۔جانوروں کے بال سوائے خنزیر کے لگوانا بظاہر جائز ہیں پھر ناجائز کیوں لکھا گیا؟

(۳)۔نیز نجم الفتاویٰ میں ذکر کردہ مسئلے کے مطابق اگر خنزیر کے بال لگوا لیے جائیں تو اگرچہ یہ ناجائز ہے لیکن مسح ان پر ہو جائے گا کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ وہ تو نجس العین ہیں ان کی طہارت چہ معنی دارد؟

لہٰذا آپ سے درج بالا ابہامات سے متعلق استفسار مقصود ہے امید ہے تشفی بخش جوابات عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آپ کے سوالوں کے جوابات سے قبل چند باتیں بطورِ اصول ذہن نشین رکھنا ضروری ہیں۔

(۱)۔بالوں کو بذریعہ آپریشن لگوانے اور چھوٹے بالوں میں دوسرے بالوں کو جڑوانے دونوں میں فرق ہے۔اس فرق کا لحاظ نہ رکھنے کے باعث سائل کو تردد ہوا ہے۔دونوں صورتوں میں مصنوعی بال پیوست کرائے جا رہے ہیں لیکن پہلی صورت میں بذریعہ آپریشن کھال کے اندر جڑ سے ان بالوں کو لگایا جا رہا ہے اور دوسری صورت میں پہلے سے قدرتی بال موجود ہیں لیکن چھوٹے ہیں اس میں مصنوعی بال پیوست یعنی جڑوائے جا رہے ہیں لہٰذا دونوں کے احکامات میں بھی فرق ہے۔

(۲)۔ دونوں صورتوں کے احکامات میں درج ذیل فرق ہے۔ آپریشن کے ذریعے کسی بھی عضو کا الحاق اگر ضرورتاً ہو تو اس کا جواز ہوتا ہے لیکن بطورِ زینت جسم کے اندر ایسا کوئی تصرف تغییر لخلق اللہ ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ بذریعہ آپریشن بال لگوانا بھی چونکہ زینت ہے لہٰذا کسی بھی قسم کے بال چاہے وہ آدمی کے ہوں یا خنزیر کے یا کسی حلال جانور کے ان کا بذریعہ آپریشن کھال کے اندر لگوانا ناجائز اور حرام ہوگا البتہ اگر کسی نے لگوا لئے ہیں تو اولاً اگر خنزیر اور انسان کے بال کے علاوہ کوئی بال لگوائے ہیں تو چونکہ وہ پاک ہیں لہٰذا ان پر مسح کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ ثانیاً خنزیر اور انسان کے بالوں میں سے خنزیر کے بال تو نجس العین اور انسان کے بال جزء آدمی ہونے کی بناء پر ان سے انتفاع حرام ہے لیکن اگر بذریعہ آپریشن ان دونوں میں سے کسی قسم کے بال لگوا لئے ہیں تو اب یہ بال استرے یا مشین وغیرہ کے ذریعے حتی المقدور کٹوانا ضروری ہیں باقی جو اجزاء سر پر بچ جائیں چونکہ وہ الحاق کی وجہ سے اس انسان کا جزء بن گئے ہیں لہٰذا ضرورتاً ان پر مسح کرنے سے مسح ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی انسان اپنے جسم پر ناپاک چیز گودوالے (ٹیٹو بنوالے) تو چونکہ اس کا ہٹانا متعذر رہتا ہے لہٰذا اس کو دھونا وضو اور غسل کے صحیح ہونے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ شامیہ میں ہے:

مطلب فی حکم الوشم: تنبیه مهم یستفاد مما مر حکم الوشم فی نحو الید وهو أنه كالاختضاب أو الصبغ بالمتنجس لأنه إذا غرزت الید أو الشفة مثلا بإبرة ثم حشی محلها بکحل أو نیلة لیخضر تنجس الكحل بالدم فإذا جمد الدم والتأم الجرح بقی محله أخضر فإذا غسل طهر لأنه أثر یشق زواله لأنه لا یزول إلا بسلخ الجلد أو جرحه فإذا كان لا یکلف بإزالة الأثر الذی یزول بماء حار أو صابون فعدم التكلیف هنا أولی. (شامیة ۳۳۰/۱ مطلب فی حکم الوشم)

شامیہ کی اس عبارت میں واضح طور پر سرمہ سے ہاتھ وغیرہ پر کچھ گودوانے کے بعد سرمہ کے خون وغیرہ سے مل کر نجس ہونے کے باوجود اس پر غسل وغیرہ کو جائز قرار دیا گیا ہے اور وجہ "لانه اثر یشق زواله" کہ یہ ایک ایسا اثر ہے جس کو زائل کرنا مشکل ہے کیونکہ کھال کو اکھاڑنے یا چیرنے کے علاوہ یہ اثر ختم نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس نجس چیز پر بھی ضرورتاً جزء بن جانے کی بناء پر غسل اور وضو وغیرہ جائز ہوں گے۔ اسی طرح جو بال بذریعہ آپریشن لگوائے جائیں ان کا جڑ سے اکھاڑنا مشکل ہے لہٰذا اگر وہ انسان یا خنزیر کے بھی ہوں تو نجس ہونے کے باوجود ان پر مسح جائز ہوگا۔ یہاں یہ بات ایک بار پھر یاد رہے کہ بذریعہ آپریشن بال لگوانا (چاہے کسی بھی جانور یا انسان کے بال ہوں) ناجائز اور حرام ہے اسی طرح ہاتھ وغیرہ پر ٹیٹو گودوانا بھی حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص لاعلمی میں ایسا کر لے تو ضرورتاً اس کے مسح اور غسل (دھونے) کے جواز کا قول کیا گیا ہے۔ اس سے بذریعہ آپریشن بال لگوانے یا ٹیٹو گودوانے کو جائز نہ سمجھا جائے وہ حرام اور گناہ ہی ہے۔

یہاں تک تو ہم نے بذریعہ آپریشن بال لگوانے کا حکم ذکر کر دیا دوسری صورت (کہ پہلے سے قدرتی بال موجود ہوں ان کے ساتھ مصنوعی بال جڑوائے جائیں اس کے) اندر تفصیل ہے۔ کتب فقہ میں ذکر "وصل" (جوڑنا) کی تفصیلات اسی صورت سے متعلق ہیں۔ آپریشن کی صورت علی الاطلاق ممنوع ہے جیسا کہ ذکر کر دیا گیا۔ اس وصل (جوڑنے) کی صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر انسان اور خنزیر

کے علاوہ کے بالوں کو جوڑا جائے تو یہ جائز ہے اگر چہ بطور زینت ہو عورت اسے اختیار کر سکتی ہے البتہ خنزیر کے بال نجس اور انسان کے بال جُزء آدمی کی حرمت کی بناء پر جڑوانا ممنوع ہیں گناہ کا کام ہے احادیث میں لعنت تک وارد ہوئی ہے۔لہٰذا اس سے پرہیز کیا جائے۔ البتہ اس صورت میں اگر خنزیر اور انسان کے علاوہ کے بال ہیں تو ان پر مسح یا غسل کے جواز میں کوئی اشکال ہی نہیں البتہ خنزیر اور انسان کے بالوں کا لگوانا جائز ہی نہ تھا لہٰذا انہیں کٹوا دیا جائے اور فقط اپنے قدرتی بالوں کو ہی چھوڑ دیا جائے اور اگر بالوں کے چھوٹے ہونے کی بناء پر وصل کرنا ہی ہو تو خنزیر اور انسان کے علاوہ کے بالوں کو استعمال کرے البتہ وصل کی صورت میں بھی ہر قسم کے بال جزء انسان بن جانے کی بناء پر اس پر مسح اور غسل درست ہوگا۔ وصل (جوڑنے) سے متعلق ہندیہ میں ہے:

"ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام سواء کان شعرها او شعر غیرها کذا فی الاختیار شرح المختار، ولا بأس للمرأة ان تجعل فی قرونها وذوائبها شیئا من الوبر. کذا فی فتاویٰ قاضی خان" (الهندیة ۲۵۸/۵)

لہٰذا درج بالا تفصیلات سے یہ امور ثابت ہوئے کہ اولاً آپریشن سے تو کسی قسم کے بال لگوانا جائز نہیں یہ تغییر لخلق اللہ اور حرام ہے، ثانیاً اگر بذریعہ آپریشن لگوا لئے تو ان پر مسح اور غسل ہو جائے گا۔خنزیر یا انسان کے علاوہ کے بال تو پاک ہیں کوئی شبہ نہیں اور خنزیر یا انسان کے بالوں میں بھی جزء انسان بن جانے کی بناء پر ضرورتاً مسح اور غسل جائز ہوگا البتہ ان دونوں کو حتی المقدور مشین وغیرہ سے کٹوانا ضروری ہوگا۔ ثالثاً یہ کہ پہلے سے موجود قدرتی بالوں کے ساتھ مصنوعی بالوں کا وصل (جوڑنا) جائز ہے لیکن خنزیر یا انسان کے بالوں کے علاوہ کو جوڑا جائے نیز ان دونوں کے بال جوڑنا ناجائز نہیں اگر جوڑ لئے تو کٹوا دیئے جائیں۔البتہ یہ بھی جزء انسان بن جائیں گے۔

یہاں ایک صورت وگ (مصنوعی بال کی ٹوپی) کی بھی ہے اس میں بھی وصل والی تفصیل ہے یعنی غیر خنزیر اور انسان کے بالوں کی وگ کا استعمال جائز ہے اور انسان یا خنزیر کے بالوں کی وگ کا استعمال جائز نہیں البتہ وضو یا غسل کیلئے بہرحال اسے اتارنا ضروری ہوگا ان کے اوپر وضو یا غسل درست نہ ہوگا۔ یہ کسی صورت میں جزءِ انسان نہیں بنتی بلکہ بسہولت اسے اتارا جا سکتا ہے لہٰذا وگ پر وضوء یا غسل کسی بھی صورت میں درست نہ ہوگا ان تمام معروضات کی روشنی میں آپ کے سوالوں کے بالترتیب جوابات یہ ہیں:

(۱)۔ بذریعہ آپریشن مطلقاً ہر قسم کے بال لگوانا ناجائز ہے البتہ وصل (جوڑنے) میں خنزیر اور انسان کے بالوں اور ان کے علاوہ کے بالوں میں فرق ہے جو تحریر کر دیا گیا۔

(۲)۔ بذریعہ آپریشن چونکہ ہر قسم کے بال لگوانا ناجائز ہے اس لیے نجم الفتاویٰ میں مطلقاً ناجائز لکھا گیا۔نجم الفتاویٰ میں دوسری صورت یعنی وصل بال جوڑنے کا ذکر نہیں۔

(۳)۔جی ہاں! بذریعہ آپریشن ہر قسم کے بال لگوانا ناجائز ہیں لیکن اگر لگوا لئے تو چاہے خنزیر کے بال ہی ہوں، جزء انسان بن جانے کی بناء پر ان پر مسح اور غسل درست ہوگا۔ یہ حکم ضرورتاً ہے نیز حتی المقدور خنزیر یا انسان کے بالوں کا کٹوانا ضروری ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں امید ہے آپ کے اشکالات رفع ہو گئے ہوں گے اور نجم الفتاویٰ میں طبع شدہ فتوے پر شرح صدر کا

حصول ہوگیا ہوگا۔

لمافی صحیح مسلم (۲/۲۰۴) کتاب اللباس والزینة: فقال ﷺ لعن الله الواصلة والمستوصلة۔

وفی الشامیة (۶/۳۷۶) کتاب الحظر والاباحة: قوله (سواء كان شعرها أو شعر غيرها) لما فيه من التزوير كما يظهر مما يأتي وفي شعر غيرها انتفاء بجزء الآدمي أيضا لكن في التاترخانية وإذا وصلت المرأة شعر غيرها بشعرها فهو مكروه وإنما الرخصة في غير شعر بني آدم تتخذه المرأة لتزيد في قرونها وهو مروي عن أبي يوسف وفي الخانية ولا بأس للمرأة أن تجعل في قرونها وذوائبها شيئا من الوبر . قوله (لعن الله الواصلة إلخ) الواصلة التي تصل الشعر بشعر الغير والتي يوصل شعرها بشعر آخر زورا والمستوصلة التي يوصل لها ذلك بطلبها والواشمة التي تشم في الوجه والذراع وهو أن تغرز الجلد بإبرة ثم يحشى بكحل أو نيل فيزرق والمستوشمة التي يفعل بها ذلك بطلبها۔

(۷۵)دو پٹہ پرمسح کرنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ سفر میں گھر کی خواتین ساتھ ہوتی ہیں اور نماز کے اوقات میں ایک طرف بیٹھ کر وضو کیا جاسکتا ہے لیکن مسح کیلئے دوپٹہ یا چادر اتارنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی عورت دوپٹے کے اوپر سے مسح کرے تو اس ضرورت کی بناء پر جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر کوئی عورت ایسے دوپٹے پر مسح کرے کہ جس سے تری بالوں تک پہنچ جاتی ہو تو ایسے دوپٹے پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر دوپٹے پر مسح کرنے سے تری بالوں تک نہ پہنچتی ہو تو مسح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر مسح کرنا ضروری ہوگا۔

لمافی الخلاصة (۲۶/۱): ولا یجوز المسح علی القلنسوة والعمامة وکذالو مسحت المرأة علی الخمار الا اذا کان الماء متقاطراً بحیث یصل الی الشعر فحینئذ جاز۔

وفی الھندیة(۶/۱): ولا یجوز المسح علی القلنسوة والعمامة وکذا لو مسحت المرأة علی الخمار الا انه اذا کان الماء متقاطراً بحیث یصل الی الشعر فحینئذ یجوز ذلك عن الشعر کذا فی الخلاصة هذا اذا لم یتلون الماء هکذا فی الظهیریة والأفضل أن تمسح تحت الخمار کذا فی فتاوی قاضی خان۔

(۷۶)کان کے نیچے لمبے بالوں پرمسح کرنے سے مسح کی ادائیگی کا حکم

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ لمبے بال جو کان کے نیچے تک ہوتے ہیں اگر ان پر کوئی شخص کان کے نیچے والے حصہ پر مسح کرلے تو مسح ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مسح ادا نہ ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی(ص۴۷): قال فی الخانیة: فلو مسح علی شعره ان وقع علی شعر تحته رأس جاز وان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز۔

وفی الھندیة(۵/۱): ان وقع علی شعر تحته رأس یجوز عن مسح الرأس و ان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لایجوز۔

(۷۷) کنپٹی پر لگے پلاسٹر پر مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر میں شدید درد رہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف محسوس ہوتی تھی ڈاکٹر نے مجھے ایسا پلاسٹر تجویز کیا کہ جس کے لگانے کے بعد مجھے کافی آرام محسوس ہوتا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میں نے پلاسٹر کو پیشانی سے ذرا سائڈ میں لگایا ہوا ہے یعنی کنپٹی پر تو آیا وضو کرتے وقت مجھے اس پلاسٹر کو ہٹانا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر پلاسٹر ایسا ہو کہ اس کے ہٹانے سے تکلیف کے بڑھنے کا خوف ہو یا ہٹانے کے بعد خود لگا نہ سکتا ہو،تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست ہے اور اگر تکلیف کے بڑھنے کا خوف نہ ہو،اور ہٹانے کے بعد خود لگا سکتا ہو،تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست نہیں۔ بلکہ وضو کرتے وقت اس کو اتارنا ضروری ہوگا۔

لمافی الدر المختار(۱/۲۸۰۔۲۸۱): (ويمسح) نحو (مفتصد وجريح على كل عصابة) مع فرجتها فی الاصح (ان ضره) الماء (او حلها) ومنه أن لا يمكنه ربطها بنفسه ولا يجد من يربطها.

وفی الشامية تحته: (قوله على كل عصابة) ای على كل فرد من أفرادها سواء كانت عصابة تحتها جراحة وهی بقدرها او زائدة عليها كعصابة المفتصد. او لم يكن تحتهاجراحة اصلا بل كسر اوكی. وهذا معنى قول الكنز كان تحتها جراحة اولا لكن اذا كانت زائدة على قدر الجراحة فإن ضره الحل والغسل مسح الكل تبعا والافلا۔ بل يغسل ماحول الجراحة ويمسح عليها لاعلى الخرقة۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۰۲):شرائط المسح على الجبيرة... ألا يمكن نزع الجبيرة او يخاف من نزعها بسبب الغسل حدوث مرض او زيادته او تأخر البرء۔

(۷۸) گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گردن کا مسح مسنون ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں ایک غیر مقلد کا کہنا ہے کہ گردن کا مسح احادیث سے ثابت نہیں بلکہ یہ صرف احناف کی من گھڑت سنت ہے،کیا یہ بات صحیح ہے؟ براہ کرم احادیث کا حوالہ ضرور دیں اور یہ بتائیں کہ یہ احادیث کس درجہ کی ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... گردن کا مسح حضراتِ احناف کے ہاں مستحب ہے اور ایسی احادیث اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے جن کو حسن کا درجہ حاصل ہے،لہٰذا اسے احناف کی من گھڑت سنت کہنا محض تعصب اور عناد ہے،جبکہ بعض

دوسرے علماء نے انہی احادیث وآثار کی وجہ سے اسے سنت کہا ہے۔ چنانچہ علامہ رویانی رحمۃ اللہ علیہ (جو اصحاب شوافع میں سے ہیں) نے اپنی کتاب میں صراحت کی ہے کہ گردن کا مسح ہمارے اصحاب کے نزدیک سنت ہے، ''علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ'' (جو ائمہ احادیث میں سے ہیں) نے اسکے ''استحباب'' کا قول کیا ہے، اسی طرح علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نیل الاوطار'' (یہ کتاب غیر مقلدین کے ہاں معتبر ہے اور انکے مدارس میں داخلِ درس ہے) میں گردن کے مسح پر کافی وشافی بحث کی ہے، اور ایسے افراد (جنہوں نے گردن کے مسح کو بدعت اور اسکی احادیث کو موضوع کہا ہے) پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایسی روایات کی موجودگی میں انہوں نے اس کو کیسے بدعت کہا۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۱): حدثنا عبد الله بن یوسف ...ان رجلاً قال لعبد الله بن زید وھو جد عمرو بن یحیٰ أتستطیع أن ترینی کیف کان رسول الله ﷺ یتوضأ فقال عبدالله بن زید نعم فدعا بماء فأفرغ علی یده ... ثم مسح رأسه بیدیه فأقبل بهما وأدبر بدأ بمقدم رأسه حتی ذهب بهما الی قفاه ثم ردهما إلی المکان الذی بدأمنه۔

وفی الهندیة (۱/۸): الفصل الثالث فی المستحبات۔۔۔والثانی مسح الرقبة هو بظهر الیدین۔

وفی الدرالمختار (۱/۱۲۴): (ومستحبه) ... (مسح الرقبة)... (لا الحلقوم)۔

وفی الشامیة (قوله مسح الرقبة) هو الصحیح وقیل انه سنة کما فی البحر۔

وفی نیل الاوطار(۱/۱۹۵): وبجمیع هذا تعلم أن قول النووی مسح الرقبة بدعة وأن حدیثه موضوع مجازفة. وأعجب من هذا قوله ولم یذکره الشافعی ولا جمهور الأصحاب وإنما قاله ابن القاص وطائفة یسیرة. فإنه قال الرویانی من أصحاب الشافعی فی کتابه المعروف بالبحر ما لفظه: قال أصحابنا هو سنة. وتعقب النووی أیضاً ابن الرفعة بأن البغوی وهو من ائمة الحدیث قد قال باستحبابه قال: ولا مأخذ لاستحبابه الاخبر أو أثر لأن هذا لا مجال للقیاس فیه۔ قال الحافظ: ولعل مستند البغوی فی استحباب مسح القفا ما رواه أحمد وأبو داؤد وذکر حدیث الباب الخ۔

رسالة

بروز السَدَفَة بتحقيق مسئلة مسح الرَّقَبَة

وضوء میں گردن کے مسح کا ثبوت اور مصداق سے متعلق مفصل فتوی

(۷۹) گردن کے مسح میں گردن کی حدود کی تعیین

سوال......حضرت مفتی صاحب! آپ سے اس مسئلے کی تحقیق مطلوب ہے کہ گردن کا اطلاق گدی پر ہوتا ہے یا اطراف پر؟ گدی پچھلا حصہ تو بظاہر سر کا جزء ہے اسے گردن کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آپ سے درخواست ہے کہ مسح الرقبہ میں وارد الفاظ اور مصداق سے متعلق مفصل تحقیق تحریر فرمادیں۔ نیز گلا اس میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کی وجہ بھی تحریر فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جن احادیث کو "مسح الرقبہ" کے ثبوت میں بطورِ استدلال پیش کیا جاتا ہے ان میں مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں سے اہم الفاظ یہ ہیں:

(۱)عنق (۲)رقبہ (۳)قفا (۴)سالفہ (۵)قذال (۶)تحت اذنیہ

وغیرہ الفاظ اس سلسلے میں مستدل ہیں۔ اولاً احقر ان الفاظ کی لغوی تحقیق ذکر کرے گا کیونکہ وضوء کے اندر "مسح الرقبہ" میں رقبہ یعنی گردن کا مصداق تب ہی معین ہو سکے گا۔

رقبہ اور عنق سے متعلق لغت کی مشہور کتاب "المعجم الوسیط" میں ہے:

"الرقبة والعنق: الوصلة بين الرأس والجسد"

یعنی رقبہ اور عنق سے مراد سر اور جسم کو ملانے والا واسطہ اور ذریعہ ہے۔

نیز قذال سے متعلق المعجم الوسیط میں یہ تحقیق نقل ہے:

"جماع مؤخر الرأس من الانسان والفرس فوق قفا "القذالان" ما اكتنفا القفا عن اليمين والشمال"

مصباح اللغات میں ان الفاظ سے متعلق نقل ہے:

رقبة: گردن یا پسِ گردن

عنق: گلا۔ العنیق: گردن

قفا: سر کا پچھلا حصہ، گدی

سالفہ: گزری ہوئی، گردن کا وہ حصہ جو بال لٹکنے کی جگہ ہے

قذال: گدی، سر کا پچھلا حصہ

حلقوم عربی میں گلے یعنی اگلے حصے کو (جو ٹھوڑی کے نیچے ہے) کہا جاتا ہے حلقوم سے متعلق المعجم الوسیط میں ہے:

''الحلقوم تجویف خلف تجویف الفم وفیه ست فتحات: فتحة الفم الخلفة فتحتا المنخرين وفتحتا الاذنين وفتحة الحنجرة وهی مجری الطعام والشراب والنفس (ج) حلاقيم''

الحلق: مساغ الطعام والشراب الی المرئ (ج) احلاق وحلوق وحلق، وحرف الحلق حروف الهجاء التی تخرج منه عند النطق''

نیز حلقوم سے متعلق مصباح اللغات میں ہے:

الحلقوم: گلا (ج) حلاقیم

الحلق: گلا (ج) احلاق، حلوق، حلق

یہاں تک ذکر لغوی تحقیق سے ثابت ہوا کہ عنق اور رقبہ کے مصداق میں گلا بھی شامل ہے یعنی "الوصلة بين الرأس والجسد" کا مصداق مکمل چاروں اطراف (گدی، گلا اور دونوں اطراف) ہیں لیکن احادیث میں ذکر دیگر الفاظ "قذال، قفا، سالفہ" وغیرہ اس بات پر دال ہیں کہ حلقوم یعنی گلے پر مسح نہ ہو نیز "تحت اذنیه" یعنی کان کے نیچے کے الفاظ تو صریح دال ہیں کہ مسح الرقبہ گدی اور طرفین کا ہوگا گلا اس میں داخل نہیں اسی لئے فقہاء نے مسح الرقبہ میں حلقوم کے مسح کو بدعت قرار دیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حلقوم یعنی گلے پر مسح بغیر تکلف کے ممکن نہیں کیونکہ جب گدی پر ہاتھ رکھ کر اطراف کی طرف کھینچا جائے گا تو سیدھا حلقوم تک نہیں لایا جا سکتا بلکہ ہاتھوں کو پلٹنا پڑے گا جس سے دو دفعہ مسح کرنا بھی لازم آئے گا اور تکلف و مشقت میں ابتلاء بھی ہوگا۔

لہٰذا گردن کے مسح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کی پشت کو گدی پر رکھ کر نیچے اطراف کی جانب کھینچا جائے اور کانوں کے نیچے پہنچ کر اٹھا لیا جائے۔ یہ مسح الرقبہ کا صحیح طریقہ ہے۔ اس طریقے کا ثبوت "اعلاء السنن" اور "نیل الاوطار" میں ذکر اس روایت سے صراحۃً ہوتا ہے:

''من توضأ ومسح سالفتيه وقفاه امن من الغل يوم القيامة'' (اعلاء السنن ۱/۱۲۳ باب مسح الرقبة)

نیز اعلاء السنن کے حاشیے پر خود علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے یہی طریقہ بیان فرمایا ہے:

''فلوثبت الحديث دل على مسح العنق من قبل القفامع جانبيه والحلقوم خارج عنهما (از مؤلف)''

اس طریقے کی مزید تائید ابو داؤد کی اس روایت سے ہوتی ہے:

''ومسح راسه من مقدمه الی مؤخره حتی خرج یدیه من تحت اذنیہ۔''

اس روایت پر بذل المجہود کے محشی نے تحریر فرمایا ہے:

''ھذا لازم لمسح الرقبة''

نیز مبسوطِ سرخسی میں ''ماتحت الاذنین ''کو عنق قرار دیا گیا ہے یعنی عنق سے مراد کانوں کے نچلے اطراف ہیں اسی طرح بذل المجہود میں حضرت طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ روایت ہے:

''رایت رسول اللہ ﷺ یتوضأ فامر یدہ علی سالفتیہ'' (بذل المجھود ۷۸/۱)

اس کے علاوہ ''تحفہ الطلبة فی تحقیق مسح الرقبہ ''میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے:

''مسح الرقبة امان من الغل یوم القیامة'' (تحفة الطلبة۔ بحواله احسن الفتاوی ۱۲/۲)

نیز اسی تحفۃ الطلبہ میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''وظاھر اذنیہ وظاھر رقبتہ الخ ''کے الفاظ بھی ہیں لہٰذا گردن پر مسح سے مراد صرف گدی نہیں بلکہ گدی پر ہاتھ کی پشت رکھ کر طرفین سمیت مسح کرنا ہے۔ یہی راجح ہے اور تحقیق کے مطابق گردن کے مسح میں ہاتھوں کی پشت کو گدی پر رکھ کر طرفین تک کھینچنا اصل مسح ہے۔ یہی احادیث کے نصوص، فقہ کی عبارات اور لغت کی نقول سے قریب تر اور مطابق ہے۔

لمافی سنن ابی داود (کتاب الطھارة) باب صفة الوضوء: حدثنا محمد بن عیسی ...... عن طلحة بن مصرف عن ابیه عن جده قال رأیت رسول اللهﷺ یمسح رأسه مرة واحدة حتی بلغ القذال وهو اول القفا وقال مسدد: ومسح رأسه من مقدمه الی مؤخره حتی خرج یده من تحت اذنیه''

وفی تحفة الطلبة فی تحقیق مسح الرقبة (بحواله احسن الفتاوی ۱۲/۲): حدیث ابن عمر ان النبی ﷺ قال من توضا ومسح عنقه وقی الغل یوم القیامة (رواه ابو نعیم فی تاریخ اصبهان) ...... حکی ابن همام عن حدیث وائل فی صفة وضوء رسول الله ﷺ ثم مسح علی رأسه ثلاثا و ظاهر اذنیه ثلاثا وظاهر رقبته الخ۔

وفی اعلاء السنن (۱۲۳/۱): قال الشوکانی فی النیل ...... بلفظ ''من توضأ ومسح سالفتیه وقفاه امن من الغل یوم القیامة۔قلت ولکن مرسل موسی بن طلحه سالم عنهما وفیه لفظ القفا موضع العنق فظهر ان المراد بالعنق لیس ما یعم الحلقوم بل المراد به ظهر الرقبة۔

وفی حاشیته: ''فلو ثبت الحدیث دل علی مسح العنق من قبل القفا مع جانبیه والحلقوم خارج عنهما (از مؤلف)

(۸۰) داڑھی کے خلال اور گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (ا)۔داڑھی کو وضو میں دھونا ضروری ہے یا اسکا خلال کیا جائے گا چاہے داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی اور گھنی ہو یا نہ ہو؟ برائے مہربانی تمام صورتیں مفصل بیان کریں۔

(۲)۔مسح الرقبہ کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے یا نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مسح الرقبہ کیا ہے یا نہیں؟ بعض علماء اس کا انکار کرتے ہیں کہ مسح الرقبہ کرنا درست نہیں ہے۔مسح الرقبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی نہ کرے تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز رقبہ کا اطلاق کہاں تک ہوتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......داڑھی کا وہ حصہ جو کہ چہرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس کا دھونا وضو میں فرض ہے۔البتہ اگر داڑھی اتنی گھنی ہو کہ چہرے کی جلد کو بالکل ڈھانپ لیتی ہو تو اس صورت میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔اگر داڑھی گھنی نہیں ہے اور چہرے کی جلد اس میں سے نظر آتی ہے۔تو اس صورت میں اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔جبکہ داڑھی کا وہ حصہ جو چہرے کی حدود سے باہر ہو۔اس کا خلال کرنا سنت ہے۔

(۲)۔اور رہی بات مسح الرقبہ (گردن کے مسح) کی تو یہ مستحب ہے۔اس کا ثبوت روایات میں موجود ہے۔اس لئے اس کا انکار کرنا درست نہیں۔ہاں البتہ گلے کا مسح بدعت ہے۔اور رقبہ کا اطلاق گردن کے پچھلے حصے (گدی) اور دونوں طرف کے حصوں پر ہوتا ہے۔

لمافی الدرالمختار(۱/۱۰۰۔۱۰۱): (وغسل جمیع اللحیة فرض) یعنی عملیاً (ایضا) علی المذھب الصحیح المفتی به المرجوع الیه، وما عدا هذه الروایة مرجوع عنه کما فی البدائع۔ ثم لا خلاف أن المسترسل لایجب غسله ولا مسحه بل یسن، وان الخفیفة التی تری بشرتها یجب غسل ماتحتها کذا فی النھر۔

وفیه ایضاً(۱/۱۲۴): (ومسح الرقبة) بظھر یدیه (لاالحلقوم) لانه بدعة۔

وفی الشامیة تحته: (قوله ومسح الرقبة) ھو الصحیح۔ وقیل انه سنة کما فی البحر وغیره۔

وفی اعلاء السنن(۱/۱۲۱): تحقیق معنی الرقبة والحلقوم... والذی ظھرلنا من تتبع اللغة والاحادیث۔ ان مقدم العنق وموخره کلاھما فی جانب الرأس۔ فمقدمه ای مبتداء ھو ما یلی القذال ای موخر الراس... فجعل مقدم العنق بیاناً للقذال وھو موخر الراس کما فی القاموس۔

وفیه ایضا(۱/۱۲۰): باب استحباب مسح الرقبة۔عن فلیح بن سلیمان عن نافع عن ابن عمر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ''من توضأ و مسح بیدیه علی عنقه وقی الغل یوم القیامة'' رواه ابوا لحسن بن فارس باسناد وقال: ھذا ان شاء الله۔ حدیث صحیح۔(التلخیص الحبیر ۱/۳۴)

(۸۱) اعضاء وضوکوتولیہ یارومال وغیرہ سے خشک کرنے کاحکم

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضوکرنے کے بعداعضاء وضوکوتولیہ یارومال سے خشک کرنا جائز ہے یانہیں؟ نیزاس کاثبوت قرآن وسنت سے ملتاہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... وضوکرنے کے بعداعضاء وضوکوتولیہ یارومال وغیرہ سے خشک کرنا جائز ہے اوراسکا ثبوت احادیث طیبہ سے ملتاہے۔

لمافی الترمذی(۱/۱۸): عن عائشة رضی الله عنهاقالت کانت لرسول الله ﷺ خرقة يتنشف بها بعد الوضوء۔

وفی الشامية (۱/۱۳۱): (قوله والتمسح بمنديل)۔۔۔۔۔۔ ففی الخانية: ولا بأس للمتوضئ والمغتسل روی عن رسول الله ﷺ انه كان يفعله۔

وفی الفقه الاسلامی (۱/۴۰۷)؛ وقال المالكية المسح بالمنديل جائز لحديث قيس بن سعد قال ''زارنا رسول الله ﷺ فی منزلنا فأمرله سعد بغسل فوضع له فاغتسل ثم ناوله ملحفة مصبوغة بزعفران او ورس فاشتمل بها''

(۸۲) وضوکے استعمال شدہ پانی کوکھانے پینے وغیرہ کے استعمال میں لینے کاحکم

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرکسی کے پاس صرف تھوڑاساپانی ہواوروہ اس امید پرکہ بعدمیں پانی مل جائے گااس سے وضوکرلےاوربعدمیں پانی نہ ملے توکیااس پانی کودوبارہ استعمال کرسکتاہے، جیسے پینے کیلئے یاکھاناپکانے وغیرہ کے لئے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... وضومیں استعمال شدہ پانی ضرورت کے موقع پرکھانے یاپینے وغیرہ میں استعمال کرسکتے ہیں لیکن بلاضرورت یہ استعمال کراہت سے خالی نہیں، اس لئے احتیاط بہترہے۔

لما فی الدرالمختار (۱/۲۰۰۔۲۰۱): (اذا انفصل عن عضو وان لم يستقر... وهو طاهر) ولو من جنب وهو الظاهر لكن يكره شربه والعجن به تنزيها للاستقذار وعلى رواية نجاسته تحريما۔

وفی الشامية (تحريما)قال فی البحر ولا يخفى ان الكراهة على رواية الطهارة أما على رواية النجاسة فحرام لقوله تعالى ويحرم عليهم الخبائث والنجس منها۔

(۸۳) اٹیچ باتھ روم میں ادعیۂ وضو پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک ایسی جگہ وضو بناتا ہے جہاں غسل خانے کے ساتھ بیت الخلاء بھی ہے۔ اب زید وضو کے دوران کچھ دعائیں پڑھنا چاہتا ہے تو کیا زید ایسی جگہ میں دورانِ وضو دعاؤں کا اہتمام کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ کے نام کی تعظیم کی وجہ سے زید ایسی جگہ پر وضو کرتے وقت وضو کی دعائیں جہراً یعنی زبان سے نہ پڑھے بلکہ دل میں پڑھنے کا اہتمام کرے۔

لمافی الهندية(۱/۶): ويسمی قبل الاستنجاء وبعده هو الصحيح كذا فی الهداية، ولا يسمی فی حال الانكشاف ولا فی محل النجاسة۔

وفی الدر المختار (۱/۱۰۹): (قبل الاستنجاء وبعده) الاحال انكشاف وفی محل نجاسة فيسمی بقلبه۔

(الشامية) (قوله الاحال انكشاف الخ) الظاهر ان المراد أنه يسمی قبل رفع ثيابه ان كان فی غير المكان المعدّ لقضاء الحاجة، والافقبل دخوله، فلو نسی فيهما سمی بقلبه، ولا يحرك لسانه تعظيماً لاسم الله تعالیٰ۔

(۸۴) عورتوں کا ننگے سر وضو کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض خواتین جب وضو کرتی ہیں تو اپنے سر سے دوپٹہ اتار لیتی ہیں وضو کے بعد پھر پہن لیتی ہیں آیا یہ فعل خواتین کا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز عورتوں کیلئے ننگے سر وضو کرنا کیسا ہے اور ان کا وضو درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......عورتوں کا دوران وضو سر سے دوپٹہ اتارنا جائز ہے جبکہ وہاں پر کوئی نامحرم موجود نہ ہو کیونکہ سر کے بالوں کا نامحرم سے چھپانا ضروری ہے۔ نیز ننگے سر وضو کرنے سے وضو پر کوئی اثر نہ پڑے گا وضو درست ہو جائے گا۔

لمافی الدرالمختار(۶/۳۶۷): (ومن محرمه) هی لا يحل له نكاحها ابداً بنسب اوسبب ولوبزناً (الی الرأس والوجه والصدر والساق والعضد) ان أمن شهوته۔

وفی فتاوىٰ اللجنة(۵/۲۳۵): س: عورة الرجل من السرة الی الركبة فما حكم وضوئه عارياً؟ لابساً سروالاً قصيراً لا يستر ركبته؟

ج: الحمد لله وحده والصلوة والسلام علی رسوله وآله وصحبه وبعد يصح وضوء ه لان كشف

العورة ولبس السروال القصير لا يمنعان من صحة الوضوء ولكن يحرم عليه كشف عورته بحضرة غير زوجته او سريته وهی الامة المملوكة له التی يباح له الاستمتاع بها۔

(۸۵)وضو کے بعد شہادتین پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا وضو کرنے کے بعد شہادتین پڑھنا اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنا مسنون ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......وضو کے بعد شہادتین پڑھنے کو تمام فقہاء کرام نے سنت وآداب میں سے شمار کیا ہے۔اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو بعض فقہاء نے ادب قرار دیا ہے۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص۷۷):(والاتيان بالشهادتين بعده) وذكر الغزنوی انه يشير بسبابته حين النظر الی السمآء۔

وفی الهندية (۸/۱): وان يقول بعد الفراغ من الوضوء سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله إلا أنت أستغفرك وأتوب إليك وأشهد أن لا إله الا الله واشهد أن محمداً عبده ورسوله۔

فصل فی الغسل

(غسل کے مسائل کا بیان)

(۸۶) کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوجاتا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوتا ہے اگر کوئی شخص عورت سے ہمبستری کرے لیکن منی خارج نہ ہوتو کیا اس پر غسل فرض ہوجائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مندرجہ ذیل صورتوں میں غسل فرض ہوجاتا ہے۔

(۱)......جوش کے ساتھ منی کا نکلنا۔
(۲)......مرد کی سپاری کا اندر چلا جانا چاہے انزال ہو یا نہ ہو۔
(۳)......حیض کے خون کا بند ہوجانا۔
(۴)......نفاس کے خون کا بند ہوجانا۔

لمافی الفتاوی التاتارخانیة (۱/۱۵۲): أسباب الغسل ثلاثة الجنابة والحیض والنفاس۔

وفی الهندیة(۱/۱۵): الإیلاج فی أحد السبیلین اذا تواترت الحشفة یوجب الغسل علی الفاعل والمفعول به أنزل أولم ینزل۔

(۸۷) جنّ (ناری مخلوق) کے جماع سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر جن عاشق ہوگیا ہے اور وہ اس عورت سے جماع بھی کرتا ہے آیا جن کا عورت سے جماع کرنے کی وجہ سے عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر جن کے جماع کرنے کی وجہ سے عورت کو انزال ہوجائے تو پھر انزال کی وجہ سے غسل فرض ہوگا ورنہ محض جن کے جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوگا البتہ اگر جن آدمی کی صورت میں آکر جماع کرتا ہوتو پھر بغیر انزال کے بھی غسل واجب ہوجائے گا۔

لمافی الهندیة:(۱/۱۵): لو قالت امرأة معی جنی یأتینی وأجد فی نفسی ما أجد اذا جامعنی زوجی لا غسل علیها۔

وفی الدر المختار(۱/۱۶۱): احتراز عن الجنی یعنی اذا لم تنزل واذا لم یظهر لها فی صورة الآدمی۔

وفی الشامیة تحته : ففی المحیط لوقالت معی جنی یأ تینی مرارا وأجد ماأجد اذا جا معنی زوجی لاغسل علیها لانعدام سببه وهو الایلاج أوالاحتلام... أما اذا ظهر فی صورة آدمی وکذ اذا ظهر للرجل جنیة فی صورة آدمیة فو طئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصوریة۔

(۸۸) جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد نے جانور کے ساتھ بدفعلی کی صرف دخول ہوا، منی خارج نہیں ہوئی تو آیا اس پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا ایک گھناؤنی اور قبیح حرکت ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح کی حرکت کرتا ہے اوراس کی منی خارج نہیں ہوئی تو پھر اس پر غسل فرض نہیں۔

لمافی الهندیة: (۱/۱۵): والایلاج فی البهیمة والمیتة والصغیرة التی لایجامع مثلها لایوجب الغسل بدون الانزال۔

وفی الدر المختار(۱/۱۶۶): (و) لا عند (وطء بهیمة أومیتة أوصغیرة غیر مشتهاة)...(بلاانزال)۔

(۸۹) احتلام میں غسل کب واجب ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی نیند سے بیدار ہونے پر کپڑوں پر احتلام کے اثرات محسوس کرے، حالانکہ نہ تو اسے احتلام یاد ہے اور نہ ہی خواب یاد ہے کیا ایسی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں غسل واجب ہوگا۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۶۳): عند(رؤیة مستیقظ) ...(وان لم یتذکر الاحتلام)

وفی الشامیة: ای والحال أنه ان لم یتذکر الاحتلام یجب الغسل...

(۹۰) احتلام کے بعد خواب یاد نہ ہو تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے ساتھ ایک عرصہ سے یہ مسئلہ پیش آرہا ہے کہ جب بھی سوتا ہے تو بے خبری میں احتلام ہوتا ہے۔ خواب وغیرہ کچھ بھی یاد نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے ہروقت شلوار دھونا اور غسل کرنا بہت تنگی کا باعث ہے۔ آیا اس کو بیماری شمار کیا جائے گا یا احتلام ہی ہے۔ جو بھی صورت ہو میرے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ جبکہ ہر وقت غسل کرنا

بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ حکم تحریر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر سونے کی حالت میں کسی کو احتلام ہو جائے اور جاگنے کے بعد تری دیکھے اور اس کو یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو اس پر غسل واجب ہوگا اگرچہ خواب یاد نہ ہو۔ پس صورت مسئولہ میں اگر یقین یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو غسل واجب ہوگا اگرچہ خواب یاد نہ ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۱۴-۱۵): وان استیقظ الرجل ووجد علی فراشه او فخذه بللا وهو یتذکر احتلاما ان تیقن انه منی أو تیقن أنه مذی أو شك انه منی أو مذی فعلیه الغسل وان تیقن انه ودی لاغسل علیه وان رأی بللا الا انه لم یتذکر الاحتلام فان تیقن انه ودی لا یجب الغسل وان تیقن أنه منی یجب الغسل۔

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۱۶۳): فی الدر المختار(و)عند (رؤیة مستیقظ) ... وإن لم یتذکر الاحتلام وفی الشامیة فیجب الغسل اتفاقا فی سبع صور منها...(إلی قوله) او علم انه منی مطلقا۔

(۹۱) بدفعلی کی وجہ سے غسل کتنی بار کیا جائے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں کہیں سفر پر جا رہا تھا تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو شکل وصورت سے عالم لگ رہا تھا ان سے مختلف باتیں ہوتی رہیں، ایک بات انہوں نے بیان کی جس پر میرا دل مطمئن نہیں ہوا، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکے کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کو ہر نماز کے وقت غسل کرنا ضروری ہوگا بغیر غسل کئے اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی کیا یہ بات قرآن وحدیث یا فقہ وغیرہ میں ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......بدفعلی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اس فعل بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر پتھروں کی بارش برسائی اور ان کو نشان عبرت بنا دیا اور شریعتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں بھی اس فعل سے روکا گیا ہے اگر خدانخواستہ کسی مکلف سے یہ فعل صادر ہو جائے تو ایک ہی دفعہ غسل کرنے سے پاکی حاصل ہو جائے گی کیونکہ جو حدیثیں بدفعلی کرنے والے کی عدم طہارت کے بارے میں آئی ہیں، ان کو علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے باطل اور من گھڑت کہا ہے۔

لما فی المقاصد الحسنة (۳۴۵): ۸۸۷ حدیث: لو اغتسل اللوطی بماء البحر لم یجئ یوم القیامة الاجنبا اسنده الدیلمی عن انس به مرفوعا، وهو عنده ایضا من حدیث ابی هریرة رفعه بلفظ: المتلوط لواغتسل بکل قطرة تنزل من السماء علی وجه الارض الی ان تقوم الساعة لما طهره الله من نجاسته او یتوب، وکل مافی معناه باطل۔

وفی الولوالجیۃ(۱/۵۰):الایلاج فی الآدمی یوجب الغسل علی الفاعل والمفعول انزل اولم ینزل لانہ ایلاج فی الفرج۔

وفی الدرالمختار(۱/۱۶۲):(فی أحد سبیلی آدمی) حی (یجامع مثلہ) سیجئ محترزہ (علیھما) أی الفاعل والمفعول (لو کانا (مکلفین) ولو أحدھما مکلفا فعلیہ فقط دون المراھق۔

(۹۲) بدفعلی سے فاعل ومفعول پر غسل کا حکم نیز جس جانور کے ساتھ بدفعلی ہوئی ہو اسکا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وطی فی الدبر سے فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہوگا یا صرف فاعل پر؟ نیز کیا جانور کے ساتھ وطی سے غسل واجب ہوگا جبکہ انزال نہ ہوا ہو، اور ایسے جانور کا کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......وطی فی الدبر حرام ہے اور اس فعل خبیث پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں صورت مسئولہ میں فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہوجائے گا خواہ انزال ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو۔ جانور کے ساتھ وطی کی صورت میں فاعل پر انزال کی صورت میں غسل واجب ہوجائے گا جبکہ عدم انزال کی صورت میں غسل واجب نہیں ہوگا، پھر اگر جانور اپنا ہے اور غیر ماکول اللحم ہے (ایسا جانور ہے کہ جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا ہو) تو اُس کو ذبح کر کے جلا دیا جائے گا اور اگر ماکول اللحم ہے (جس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے) تو اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔ اگر جانور کسی دوسرے شخص کا ہو تو ایسی صورت میں واطی پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا مستحب ہے، لازم نہیں لہٰذا اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لمافی الشامیۃ (۱/۱۶۱): (قولہ وعند ایلاج) ای ادخال وھذا أعم من التعبیر بالتقاء الختانین لشمولہ الدبر أیضاً(قولہ ھی مافوق الختان) کذا فی القاموس زاد الزیلعی من رأس الذکر

وفیہ ایضاً (۱/۱۶۲) (قولہ آدمی) احتراز عن البھیمۃ کما یأتی وعن الجنیۃ کما مر... (قولہ بالاجماع) لما فی الصحیحین من حدیث ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا جلس بین شعبھا الاربع ثم جھدھا فقدوجب الغسل انزل او لم ینزل ...ووجوبہ علی المفعول بہ فی الدبر بالقیاس احتیاطاً۔

وفیہ ایضاً(۱/۱۶۶): (قولہ ولاعندوطء بھیمۃ الخ) محترزات قولہ فی أحد سبیلی آدمی حی یجامع مثلہ وفی القنیۃ برمز اجناس الناطفی فرج البھیمۃ کفیھا لاغسل فیہ بغیر انزال ویعزر وتذبح البھیمۃ وتحرق علی وجہ الاستحباب ولایحرم اکل لحمھا بہ۔

وفیہ ایضاً(۴/۲۶):(قولہ وتذبح ثم تحرق) أی لقطع امتداد التحدث بہ کلما رؤیت ولیس بواجب کما فی الھدایۃ وغیرھا وھذا اذا کانت مما لا یؤکل فإن کانت تؤکل جاز أکلھا عندہ وقالا: تحرق

أيضاً فان كانت الدابة لغير الواطئ يطالب صاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة ثم تذبح هكذا قالوا ولا يعرف ذلك الاسماعاً فيحمل عليه زيلعي ونهر (قوله الظاهر أنه يطالب ندبا الخ) أى قولهم يطالب صاحبها أن يدفعها الى الواطئ ليس على طريق الجبر وعبارة النهر: والظاهر أنه يطالب على وجه الندب ولذا قال فى الخانية كان لصاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة وعبارة البحر: والظاهر لايجبر على دفعها۔

(۹۳) غسل کے دوران ناف میں پانی پہنچانے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ ماہ میرا سہ روزہ کی جماعت میں جانا ہوا، وہاں اتفاق سے مجھے احتلام ہوگیا، چونکہ نماز میں وقت کم تھا اس لئے میں جلد از جلد نہا کر نکل آیا اور نماز پڑھ لی ،لیکن نماز کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے نہاتے وقت ناف میں انگلی نہیں ڈالی، اور صرف ویسے ہی پورے بدن پر پانی بہا کر باہر آ گیا۔کیا اب مجھے اس نماز کا اعادہ کرنا ہوگا؟ اور کیا دورانِ غسل ناف میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......غسل میں پورے بدن پر پانی بہانا فرض ہے دورانِ غسل ناف میں انگلی ڈالنا فرض نہیں البتہ ناف میں پانی پہنچانے کا مناسب طریقہ انگلی ڈالنا ہے۔صورتِ مسئولہ میں اگر یقین ہے کہ ناف میں بھی پانی پہنچ گیا ہے تو غسل ہو جائے گا ورنہ غسل نہیں ہوگا اور نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافى التاتارخانية (۱/۱۵۰): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغى ان يدخل اصبعه فيها للمبالغة وفى الخانيه وان علم انه يصل الماء اليه من غير إدخال الاصبع أجزاه۔

وفى الهندية(۱/۱۴): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغى أن يدخل اصبعه فيها للمبالغة۔

وفى الدر المختار:(۱۵۲/): (ويجب) أى يفرض(غسل)كل مايمكن من البدن بلا حرج مرة كاذن (وسرة وشارب وحاجب) واثناء (لحية)۔

(۹۴) غسل میں غرغرہ کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج رات میرے اوپر غسل فرض ہوگیا صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا اس میں کلی وغیرہ تو کی لیکن غرغرہ کرنا بھول گیا تو کیا میرا غسل صحیح ہوا یا دوبارہ غسل کرنا پڑے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......غسل میں مضمضۃ اور استنشاق فرض ہیں اور غرغرہ سنت ہے اور صورت مسئولہ میں چونکہ مضمضہ اور استنشاق ہوا ہے۔لہٰذا آپ کا غسل صحیح ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لمافی الفتاویٰ التاتارخانیة(۱/۱۵۱): فالفرض ان یغسل جمیع بدنه ... ویتمضمض ویستنشق فالمضمضة والاستنشاق فرضان فی الغسل نفلان فی الوضوء۔

وفی البزازیة (۱/۱۱): ترك المضمضة فی الغسل ثم شرب الماء علی وجه السنة لا ینوب ولو علی غیر وجهها ینوب لانه مص فی الاول وعب فی الثانی والاحوط ان لا یخرج مالم یمج الماء۔

وفی الشامیة(۱/۱۵۱): (وفرض الغسل) ... الفرض بمعنی المفروض...(مایعم العملی) ای لیشمل المضمضمة والاستنشاق... (غسل کل فمه الخ) عبر عن المضمضة والاستنشاق بالغسل لإفادة الاستیعاب أو للاختصار۔

(۹۵)فِلنگ شده (بھرائی کئے ہوئے)دانت کے ساتھ وضواور غسل کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرکسی کے دانت میں کیڑا لگ جائے اوروہ اس دانت میں بھرائی کرالےتووضواور غسل کا کیاحکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کیڑا لگنے کی وجہ سے دانت کی بھرائی کودانت کا حصہ تصور کیا جائے گا لہٰذا وضو میں تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ وضو میں کلی سنت ہے فرض نہیں۔البتہ غسل میں کلی فرض تو ہے لیکن بھرائی کے نیچے تک پانی کا پہنچانا ناممکن ہے اوراس میں حرج عظیم لازم آتا ہے لہٰذا صرف کلی کر لینے سے وضوء میں سنت اور غسل میں فرض ادا ہوجائے گا۔

لمافی الهندیة (۱/۵): وفی مجموع النوازل اذا کان برجله شقاق فجعل فیه الشحم وغسل الرجلین ولم یصل الماء الی ماتحته ینظر ان کان یضره ایصال الماء الی ماتحته یجوز وان کان لایضره لایجوز... اذا کان فی اعضائه شقاق وقد عجز عن غسله سقط عنه فرض الغسل ویلزم امرار الماء علیه فان عجز عن امرار الماء یکفیه المسح فان عجز عن المسح سقط عن المسح ایضاً فیغسل ماحوله ویترك ذالك الموضع۔

وفی الدر المختار(۱/۱۵۲):(ویجب) ای یفرض (غسل) کل مایمکن من البدن بلاحرج مرة کأذن و(سرة وشارب وحاجب و)اثناء (لحیة) وشعر الرأس ولو متلبداً...(وفرج خارج)...(لا) یجب (غسل مافیه حرج کعین)وان اکتحل بکحل نجس (وثقب انضم و)لا(داخل قلفة)بل یندب وهو الاصح۔

وفی ردالمحتار (۱/۱۵۲):(قوله وثقب انضم) قال فی شرح المنیة:وان انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال ان امرّ علیه الماء یدخل وان غفل لافلابدمن امراره ولا یتکلف لغیر

الامرار من ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع۔

(۹۶) رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ غسل وغیرہ کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں سر کے بال مختلف قسم کے رنگ سے رنگنے کا فیشن ہے تو ایسی حالت میں فرض غسل ان کا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر وہ رنگ جس سے بالوں کو رنگوایا گیا ہے ذی جسم ہو اور پانی بالوں تک نہ پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح نہیں ہوگا اور اگر ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح ہوگا۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۸۱): ولا بدمن زوال مایمنع وصول الماء للجسد کشمع وعجین لا اصبغ بظفر صباغ ولامابین الاظفار۔

وفی الدرالمختار (۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطھارۃ (ونیم... وحناء) ولوجرمه وبه یفتی۔

وفی الشامیۃ تحته: (قوله وبه یفتی) صرح به فی المنیۃ عن الذخیرۃ فی مسألۃ الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورۃ۔ قال فی شرحها ولان الماء ینفذہ لتخلله وعدم لزوجته وصلابته۔ والمعتبر فی جمیع ذالک نفوذ الماء ووصوله الی البدن۔

(۹۷) نابالغ پر جماع کے سبب غسل کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابالغ لڑکا ولڑکی اور مراہق ومراہقہ پر جماع کی وجہ سے غسل کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نابالغ یا قریب البلوغ لڑکا یا لڑکی پر جماع کی وجہ سے شرعاً غسل واجب نہیں البتہ عادت ڈالنے کیلئے غسل کا حکم دیا جائے گا اور بغیر غسل وطہارت کے نماز سے بھی روکا جائے گا، غفلت کی صورت میں تھوڑی بہت مار پیٹ کی بھی گنجائش ہے۔ البتہ اگر نابالغ بہت چھوٹا بچہ یا بچی ہے تو اس پر اس معاملے میں سختی نہیں کی جائے گی۔

لمافی الھندیۃ (۱/۱۵): غلام ابن عشر سنین جامع امرأۃ بالغۃ فعلیھا الغسل ولاغسل علی الغلام إلّا أنه یؤمر بالغسل تخلّقا واعتیاداً کما یؤمر بالصلوۃ تخلّقا واعتیاداً ولو کان الرجل بالغا والمرأۃ صغیرۃ یجامع مثلھا فعلی الرجل الغسل ولا غسل علیھا۔

وفی الدر المختار (۱/۱۶۲): أی الفاعل والمفعول(لو) کانا(مکلفین) ولو أحدھما مکلفاً فعلیه فقط دون المراھق لکن یمنع من الصلوۃ حتی یغتسل ویؤمر به ابن عشر تا دیباً۔

وفى الشامية تحته: (قوله تاديبا) فى الخانية وغيرها يؤمر به اعتيادا وتخلّقا كما يؤمر بالصلوة والطهارة وفى القنية: قال محمد وطى صبية يجامع مثلها يستحب لها أن تغتسل كانّه لم يرجبرها وتأديبها على ذلك وقال أبو على الرازى: تضرب على الاغتسال وبه نقول وكذا الغلام المراهق يضرب على الصلوة والطهارة۔

(۹۸) عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج کے ظاہری حصے کا دھونا ضروری ہے اس میں انگلی داخل کرنا ضروری نہیں۔

لمافى الهندية(١/١٤): ويجب على المرأة غسل فرجها الخارج فى الجنابة والحيض والنفاس... لاتدخل المرأة اصبعها فى فرجها عند الغسل۔

وفى الدر المختار مع تنوير الابصار(١/١٥٢): (ويجب) اى يفرض(غسل) كل مايمكن من البدن بلا حرج مرة كأذن و(سرة وشارب وحاجب-------- وفرج خارج) لانه كالفم لاداخل لأنه باطن۔ ولاتدخل اصبعها فى قبلها به يفتى۔

وفى الشامية تحته:(قوله لاداخل) اى لايجب غسل فرج داخل (قوله ولاتدخل اصبعها) اى لايجب ذلك كما فى الشرنبلالية... لايجب ادخالها الأصبع فى قبلها وبه يفتى فافهم۔

(۹۹) دورانِ غسل عورت کا سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جی ہاں! عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔

لمافى الهندية(١/١٣): وليس على المرأة ان تنقض ضفائرها فى الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر ...ولو الزقت المرأة رأسها بطيب بحيث لايصل الماء الى اصول الشعر وجب عليها ازالته ليصل الماء الى اصوله۔

وفی الشامیة(۱/۱۵۳): لکن فی المبسوط: وانما شرط تبلیغ الماء اصول الشعر لحدیث حذیفة فانه کان یجلس الی جنب امرأته اذا اغتسلت فیقول یاهذه ابلغی الماء اصول شعرك وشئوون رأسك۔

(۱۰۰) غسل جنابت میں اگر کلی بھول جائیں تو پانی پینے سے ادائیگی فرض کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نے صبح غسل جنابت کیا، وہ کلی کرنا بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھ لی، انہوں نے دوسنتوں کے بعد پانی پیا تھا، ہمارے محلے میں ایک صاحب کا کہنا ہے، اس طرح کلی ہوجاتی ہے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ کلی میں منہ کے تمام اطراف میں پانی پہنچانا ضروری ہے، اگر کوئی ایک حصہ بھی خشک رہ گیا تو اس صورت میں غسل نہیں ہوگا، اب اگر ان صاحب نے فرض کی ادائیگی سے پہلے جو پانی پیا اگر وہ پانی انہوں نے ایک ہی سانس میں غیر مسنون طریقے سے (منہ بھر کر) پیا تو ان کی نماز ہوجائے گی اور اگر مسنون طریقے سے ایک ایک گھونٹ پیا تو غسل نہیں ہوا، لہٰذا نماز بھی نہیں ہوئی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ منہ بھر کر پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک گھونٹ پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں نہیں پہنچتا۔

لمافی الهندیة (۱/۱۳): الجنب اذا شرب الماء ولم یمجه لم یضره ویجزیه عن المضمضة اذا أصاب جمیع فمه۔

وفی الدرالمختار (۱/۱۵۱): (فرض الغسل)...(غسل) کل (فمه) ویکفی الشرب عباً۔

وفی الشامیة: (ویکفی الشرب عبا)...والمراد به هنا الشرب بجمیع الفم وهذا هو المراد بما فی الخلاصة ان شرب علی غیر وجه السنة یخرج عن الجنابة والا فلا. وبما قیل ان کان جاهلا جاز وان کان عالماً فلا'' ای لان الجاهل یعب والعالم یشرب مصاً کما هو السنة''۔

(۱۰۱) غسل جنابت سے پہلے پانی میں ہاتھ ڈالنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو رات میں احتلام ہوجائے، اب صبح غسل کے وقت یہ دیکھنے کیلئے کہ پانی زیادہ گرم تو نہیں وہ بالٹی میں ہاتھ ڈال دے تو کیا اس سے وہ پانی ناپاک ہوجائے گا جبکہ اس نے وہ ہاتھ ابھی تک دھوئے نہیں تھے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر اس کے پاس پانی نکالنے کیلئے کوئی دوسرا برتن نہیں تھا اور ہاتھ پر کوئی

نجاست بھی لگی ہوئی نہیں تھی تو ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک نہیں ہوا بلکہ اس سے غسل کرنا بالکل صحیح ہے۔

لمافی الھندیة (۲۲/۱): اذا ادخل المحدث اوالجنب اوالحائض التی طھرت یدہ فی الماء للاغتراف لا یصیر مستعملا۔

وفی ردالمحتار (۲۰۰/۱): (لغیر اغتراف)...فلو قصد الاغتراف ونحوہ کاستخراج کوز لم یصر مستعملا للضرورۃ۔

(۱۰۲) غسل کرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ خشک رہ جائے تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی پر غسل واجب ہوا جب اس نے غسل کیا تو بدن کا کچھ حصہ پانی کے ختم ہونے کی وجہ سے خشک رہ گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ غسل اس کا پورا سمجھا جائے گا کیونکہ اکثر حصہ دھل چکا ہے یا اس کو کچھ اور کرنا پڑے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......غسل فرض ہونے کے بعد ضروری ہے کہ تمام بدن کے ہر حصے کو دھویا جائے اگر بال برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر غسل کرتے ہوئے پانی ختم ہوگیا اور پانی تک رسائی بھی ممکن نہیں تو پھر باقی ماندہ غسل کے لئے تیمم کرلے اور اگر پانی تک رسائی ممکن ہو تو پھر باقی ماندہ اعضاء کو دھولے۔

لمافی الھندیة(۲۹/۱): جنبٌ اغتسل وبقی لمعة وفنی ماء ہ یتیمم لبقاء الجنابة فان أحدث تیمم للحدث فان وجد ماء یکفیھما صرفه الیھما۔

وفی الشامیة(۲۵۶/۱): (قوله ولمعة و جنابة) أی لواغتسل وبقیت علی بدنه لمعة لم یصبھا الماء فتیمم لھا۔

(۱۰۳) غسل کے بعد منی نکلنے سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے خاص حصے سے کچھ منی نکلی اور اس نے غسل کرلیا، بعد غسل کے دوبارہ کچھ بغیر شہوت کے نکلی تو کیا دوبارہ پھر غسل کرنا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر سونے، پیشاب کرنے اور کچھ قدم چلنے سے پہلے غسل کیا گیا اور پھر منی نکلی ہو تو راجح قول کے مطابق احتیاطاً غسل کرنا ضروری ہے اور اگر سونے یا پیشاب کرنے یا کچھ قدم چلنے کے بعد غسل کیا گیا اور پھر بقایا منی کا خروج ہوا تو بالاتفاق غسل کرنا ضروری نہیں۔

لمافی الھندیة(۱۴/۱): ولو خرج بعدما بال أو نام أو مشی لا یجب علیه الغسل اتفاقا۔

وفی رد المحتار(١/١٦٠): وكذا لوخرج منه بقية المنی بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشی الكثير نهر أی لابعده لان النوم والبول والمشی يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثانی زائلا عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقا۔

(۱۰۴) غسل کے بعد اگر منی کے قطرے آجائیں تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وظیفہ زوجیت ادا کیا، صبح غسل کرنے کے بعد چند قطرے منی کے آگئے، کیا ایسی صورت میں دوبارہ غسل واجب ہوتا ہے، جبکہ ان قطروں کے وقت شہوت بالکل نہ تھی؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص ہمبستری سے فارغ ہونے کے بعد سو گیا تھا یا اس نے پیشاب کیا اس کے بعد غسل کیا تھا تو اب جو قطرات بغیر شہوت کے نکل گئے ان سے غسل واجب نہیں ہوتا، اور اگر فراغت کے فوراً بعد غسل کرلیا اور غسل کے بعد چند قطرے آگئے تو اس سے دوبارہ غسل واجب ہو جائے گا۔

لمافی الهندية (١/١٤): لو اغتسل من الجنابة قبل أن يبول أو ينام وصلى ثم خرج بقية المنی فعليه أن يغتسل عندهما خلافا لأبی يوسف رحمه الله تعالىٰ . . . ولو خرج بعد ما بال أو نام أو مشی لا يجب عليه الغسل اتفاقاً۔

وفی ردالمحتار (١/١٦٠): لو خرج منه بقية المنی بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشی الكثير نهر ای لا بعده لان النوم والبول والمشی يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثانی زائلاً عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقاً . . .

(۱۰۵) انجکشن کے ذریعے سے مادۂ منویہ رحم میں پہنچانے سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے ہر کام جدید طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کیا جاتا، اسی طرح عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعہ مادۂ منویہ پہنچایا گیا تو عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچانے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غسل خروج منی بالدفق سے یا دخول حشفہ سے واجب ہوتا ہے اور یہاں ایک بھی نہیں پایا جاتا۔

لمافی المحيط البرهانی(١/٢٢٧): وقال محمد فی البكر: إذا جو معت فيما دون الفرج فدخل من مائه فرجها فلا غسل عليها۔ لأن الغسل إنما يجب بالتقاء الختانين أو بنزول الماء ولم يوجد

واحد منهما۔ حتی لوحبلت یجب الغسل علیها لنزول ماءها۔

وفی الخانیة (۲۱/۱): الجنابة تثبت بسببین احدهما انفصال المنی عن شهوة والثانی الایلاج فی الآدمی الخ۔

(۱۰۶) ”غیر معتاد راستے سے خروج منی“ کے متعلق ایک فتویٰ پر استدراک

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احتلام کے بعد کسی خرابی کی بنا پر منی مثانے سے ہوکر پیشاب کے ساتھ نکلے تو غسل وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ اس سے متعلق فتویٰ میرے ایک عزیز نے ایک مفتی صاحب سے لیا تھا، لیکن ان کے جواب سے مجھے کچھ بے اطمینانی ہے۔ براہ کرم آنجناب اس سوال کا مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ: وہ فتویٰ مع سوال وجواب کے اس سوالنامے کے ساتھ منسلک ہے۔

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو احتلام ہوتا ہے اور بوقت احتلام لذت بھی محسوس کرتا ہے مگر منی باہر نہیں نکلتی اور یہ آپریشن کے بعد ہوا پہلے ایسا نہ تھا اور ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے دوران گوشت کا ٹکڑا لاپرواہی یا کوتاہی سے کٹ گیا ہے جس کی وجہ سے منی معتاد راستے سے آنے کے بجائے پہلے مثانے میں جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ نکلتی ہے کیا اس آدمی پر غسل واجب ہے یا نہیں جواب سے نواز کر مشکور فرمائیں۔ سائل: محمد اسماعیل ڈیروی

جواب......صورت مسئولہ میں لذت شہوت کا قرینہ قویہ ہے اور منی کا اپنی جگہ سے شہوت کے ساتھ جدا ہونے کا بھی اور خروج منی شہوت کے ساتھ متحقق اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ آپریشن میں غلطی سے گوشت کا ٹکڑا کٹ گیا جس کی وجہ سے منی پہلے مثانے میں چلی جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ معتاد راستے سے نکلتی ہے اور آپریشن کے باب میں سرجن کا قول معتمد ہے چنانچہ صورت مسئولہ میں اس آدمی پر غسل واجب ہوگا۔ قال فی الهداية يقال اجنب الرجل اذا قضى شهوته من المرأة والحديث (اى الماء من الماء) محمول على الخروج عن شهوة ثم المعتبر عند ابی حنیفة رحمه الله ومحمد رحمه الله انفصاله عن مكانه على وجه الشهوة وعند ابی یوسف رحمه الله ظهوره ایضاً اعتبار للخروج بالمزايلة اذ الغسل يتعلق بهما ولهما (ای الطرفین) انه متى وجب من وجه فالاحتياط فى الايجاب، (ج ۱ ص ۳۱) اور مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب سوال نمبر ۱۱۷ کے جواب میں چند سطور لکھنے کے بعد لکھتے ہیں وجوب غسل کیلئے انفصال بشہوۃ شرط ہے، اگرچہ خروج بشہوۃ نہ ہو مگر مواقع ضرورت میں خروج بشہوۃ پر فتویٰ ہے جو امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے پس ماسوائے ضرورت کے انفصال بشہوۃ پر فتویٰ ہے كذا فى الدر المختار والشامی وغیرهما۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل صفحہ ۱۳۹، فصل فی موجبات الغسل۔ بندہ نورمحمد عفی عنہ

اصل اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں۔ آخری صورت چونکہ نزاعی ہے اور وہ انفصال کے وقت شہوت ہو، اور ظہور کے وقت نہ ہو۔ تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غسل واجب نہیں طرفین کے نزدیک واجب ہے، عدم وجوب مبنی برقیاس ہے اور وجوب مبنی براحتیاط ہے لہٰذا احتیاطاً غسل کرے واجب نہیں ہے۔ معدن الحقائق شرح کنز الدقائق (کتاب الطہارۃ، صفحہ ۱۰۰)

المجیب

حسین عرفان ابن شیخ الحدیث مولانا علاؤالدین صاحب

الجواب بعون الملک الوهاب...... اصحاب المذہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب منی اپنے مقر سے شہوت کے ساتھ جدا ہوجائے تو جب تک اس کا خروج وظہور من الذکر نہ ہوگا اس وقت تک اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، خروج من الذکر شہوت کے ساتھ ہونا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شرط ہے جبکہ طرفین رحمہا اللہ کے نزدیک شرط نہیں بغیر شہوت کے خروج ہوجائے تب بھی غسل واجب ہوگا اور اسی قول کو اکثر فقہاء نے ترجیح دی ہے، البتہ مہمان کے حق میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو لیا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ شخص پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا اور سوالنامے کے ساتھ منسلکہ فتویٰ میں مذکورہ جواب میں جو معدن الحقائق کی عبارت نقل کی گئی ہے اسی عبارت کے آگے یہ عبارت بھی مذکور ہے۔

تنبیہ: فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ تاج الشریعۃ وغیرہ محققین نے جو طرفین کے مذہب کو متون میں ذکر کیا ہے وہی ظاہر، اصح اور احوط ہے اس بارے میں درمختار کا قول (جو انہوں نے بحوالہ قہستانی وفتاوی تاتارخانیہ، نوازل سے نقل کیا ہے کہ "وبقول ابی یوسف ناخذ لانہ ایسر علی المسلمین" قلت ولا سیما فی الشتاء والسفر) لائق التفات نہیں اور نہ اس پر فتویٰ دینا جائز ہے الا یہ کہ حرج اور ضرورت ہو۔

منسلکہ فتویٰ کے مجیب سے دو غلطیاں ہوگئی ہیں، پہلی غلطی یہ کہ اردو شرح سے فتویٰ دیا ہے، دوسری غلطی یہ کہ شارح اور فقہاء کی عبارت میں تحریف کرکے ان کی طرف غلط نسبت کی ہے، اصل عبارت چھوڑ دی ہے جس کو وہ احتیاطاً واجب کہہ رہے ہیں یہ اس کو واجب نہیں سمجھتے، شارح جس پر فتویٰ دینے کو ناجائز کہہ رہے ہیں یہ اس کو جائز اور اس پر فتویٰ دے رہے ہیں۔

لما فی البحر الرائق (۱/۱۰۳-۱۰۴): والاحتیاط واجب وهو العمل بالاقوی من الوجهین فوجب . . . وفی المستصفی یعمل بقول ابی یوسف اذا کان فی بیت انسان واحتلم مثلا ویستحی من اهل البیت او خاف ان یقع فی قلبهم ریبة بان طاف حول اهل بیتهم وفی السراج الوهاج والفتوی علی قول ابی یوسف فی الضیف وعلی قولهما فی غیره۔

وفی البنایة (۱/۱۸۸): (فی الایجاب) أی الاحتیاط واجب فی ایجاب الغسل ترجیحا لجانبه وقال

الاترازی قال بعض الشارحین الخروج علی وجه الشهوة قد وجد وانما عدم الدفق لاغیر فباعتبار ماوجد یجب الاغتسال وباعتبار ماعدم لا یجب فیرجع حال الوجود احتیاطاً۔

وفی بدائع الصنائع(۱/۳۷): (ومنها) ان ینفصل المنی عن شهوة ویخرج لا عن شهوة وانه یوجب الغسل فی قول ابی حنیفة ومحمد وعند ابی یوسف لایوجب فالمعتبر عندهما الانفصال عن شهوة و عنده المعتبر هو الانفصال مع الخروج عن شهوة وفائدته تظهر فی موضعین احدهما اذا احتلم الرجل فانتبه وقبض علی عورته حتی سکنت شهوته ثم خرج المنی بلا شهوة والثانی اذا جامع فاغتسل قبل ان یبول ثم خرج منه بقیة المنی وجه قول ابی یوسف ان جانب الانفصال یوجب الغسل وجانب الخروج ینفیه فلا یجب مع الشك ولهما انه اذا احتمل الوجوب والعدم فالقول بالوجوب اولی احتیاطاً۔

وفی الشامیة(۱/۱۶۰): (قوله وبقول ابی یوسف ناخذ) أی فی الضیف وغیره وفی الذخیرة ان الفقیه ابا اللیث وخلف بن ایوب اخذا بقول ابی یوسف وفی جامع الفتاوی ان الفتوی علی قوله اسماعیل: (قوله قلت الخ) ظاهره المیل الی اختیار مافی النوازل ولکن اکثر الکتب علی خلافه حتی البحر والنهر ولا سیما قد ذکروا ان قوله قیاس وقولهما استحسان وانه الاحوط فینبغی الافتاء بقوله فی مواضع الضرورة فقط تأمل۔

وفی الفقه الاسلامی(۱/۵۱۵): واتفق أئمة الحنفیة علی انه لا یجب الغسل اذا انفصل المنی عن مقره من الصلب بشهوة الا اذا خرج علی راس الذکر وهناك خلاف بینهم فی انه هل تشترط مقارنة الشهوة للخروج؟ فعندابی حنیفة ومحمد: لاتشترط وعند ابی یوسف تشترط وثمرة الخلاف تظهر فیما لو احتلم فوجد اللذة ولم ینزل حتی توضا وصلی ثم انزل۔ اغتسل ولا یعید الصلاة فی رأیهما ولا یغتسل فی رأیه ولو اغتسل بعد الجماع قبل النوم او البول او المشی ثم خرج منه المنی بلا شهوة یجب اعادة الغسل عندهما لا عنده وقولهما احوط لان الجنابة قضاء الشهوة فاذا وجدت مع الانفصال تحقق اسمها۔

(۱۰۷) ضرورت کی وجہ سے غسلِ جنابت کو مؤخر کرنے کا حکم

سوال:.....کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غسل جنابت کوضرورت کی بناپر مؤخر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جنبی کیلئے غسل کرنا فی الفور ضروری نہیں، تاخیر کی گنجائش ہے، البتہ اتنی تاخیر کرنا کہ جس سے نماز کا وقت نکل جائے باعثِ گناہ ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶): الجنب إذا أخر الاغتسال إلى وقت الصلاة لايأثم كذا فى المحيط قد نقل الشيخ سراج الدين الهندى الاجماع على انه لايجب الوضوء على المحدث والغسل على الجنب والحائض والنفساء قبل وجوب الصلاة أو ارادة مالا يحل إلابه۔

وفى رد المحتار(۱/۱۶۵): قال فى الشرنبلالية: واختلف فى سبب وجوب الغسل۔ وعند عامة المشايخ ارادة فعل ما لايحل فعله مع الجنابة وقيل وجوب مالا يحل معها، والذى يظهر انه ارادة فعل مالا يحل إلابه عند عدم ضيق الوقت أوعند ـو وب مالا يصح معها، وذلك عند ضيق الوقت لما قال فى الكافى ان سبب وجوب الغسل الصلاة أو ارادة مالا يحل فعله مع الجنابة والانزال والالتقاء شرط اھ۔

(۱۰۸) مرتد کا دوبارہ اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص پہلے کافر ہو بعد میں اسلام لائے تو اس کو غسل کرنا چاہیے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہو جائے اور بعد میں پھر اسلام لائے تو اس پر غسل کرنا لازم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... کافر کا اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے بشرطیکہ حالت کفر میں جنابت لاحق نہ ہوئی ہو۔ اگر حالت کفر میں جنابت لاحق ہوئی تھی اور غسل نہیں کیا تھا تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔ مرتد کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ یعنی مرتد کا دوبارہ اسلام لانے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے لیکن اگر حالت ارتداد میں جنابت لاحق ہوئی تھی اور غسل نہیں کیا تھا تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۲۷۲): أما المستحب فهو غسل الكافر اذا اسلم لما روى ان رسول الله ﷺ كان يأمر بالغسل من جاء ه يريد الاسلام، وادنى درجات الامر الندب والاستحباب، هذا اذا لم يعرف انه جنب فاسلم، فأما اذا علم كونه جنبا فاسلم قبل الاغتسال اختلف المشايخ فيه قال بعضهم: لا يلزمه الاغتسال أيضا لان الكفار غير مخاطبين بشرائع هى من القربات والغسل يصير قربة بالنية فلا يلزمه وقال بعضهم: يلزمه لان الاسلام لاينافى بقاء الجنابة بدليل انه لا ينافى بقاء الحدث حتى يلزمه الوضوء بعد الاسلام كذا الجنابة، الخ۔

وفى الهندية(۱/۱۶): الكافر اذا أجنب ثم اسلم يجب عليه الغسل فى ظاهر الرواية(إلى قوله) وواحد

مستحب وھو غسل الکافر اذا أسلم ولم یکن جنبا کذا فی محیط السرخسی۔

(۱۰۹) غسل خانے میں باتیں کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص غسل کررہا تھا کہ باہر سے دوسرے آدمی نے آواز دی تو وہ غسل خانے میں بولنا شروع ہوگیا جب اس کو کہا گیا کہ غسل خانے میں باتیں کرنا منع ہے تو اس نے کہا بیت الخلاء میں باتیں کرنا منع ہے غسل خانے میں اجازت ہے تو کیا اس کی بات درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... چونکہ بیت الخلاء میں گندگی اور ستر کے کھلے ہونے کی حالت ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دیگر دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا غسل خانے میں بھی اگر دورانِ غسل ستر کھلا ہوا ہو تو باتیں کرنا مکروہ ہوگا، تاہم اگر ستر کھلا ہوا نہیں ہے، تب بھی غیر ضروری باتیں کرنا ادب کے خلاف ہے۔

لمافی الشامیۃ (۱/۱۵۶): قال الشر نبلالی۔ ویستحب أن لایتکلم بکلام مطلقا أما کلام الناس فلکراھتہ حال الکشف۔ وأما الدعاء فلأنہ فی مصبّ المستعمل ومحل الأقذار والأوحال۔

(۱۱۰) غسل مسنون کی اقسام اور جمعہ کے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا سنت ہے؟ اگر کوئی شخص جمعہ کے دن غسل نہ کرے تو کیا وہ گنہگار ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... چار صورتوں میں غسل کرنا مسنون ہے۔ (۱)...... جمعہ کے دن، (۲)......عید الفطر وعید الاضحیٰ کے دن، (۳)......حج وعمرہ کا احرام باندھنے سے پہلے، (۴)......عرفہ کے دن زوال کے بعد۔

چونکہ جمعہ کے دن غسل کرنا مسنون ومستحب ہے اس لئے اگر کبھی کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے جمعہ کا غسل نہ کرسکے تو کوئی حرج نہیں لیکن بغیر کسی عذر کے اس کی عادت بنالینے میں گناہ کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ بغیر عذر کے جمعہ کے دن کا غسل ترک کرنے سے بچنا چاہیئے۔

لمافی الھندیۃ (۱/۱۶): واربعۃ سنۃ وھی غسل یوم الجمعۃ ویوم العیدین ویوم عرفۃ وعند الاحرام۔

وفی الدر المختار (۱/۱۶۸): (وسن لصلوٰۃ جمعۃ و)لصلوۃ (عید) ھو الصحیح کما فی غرر الاذکار وغیرہ۔۔۔ (و) لاجل (احرام و) فی جبل (عرفۃ) بعد الزوال۔

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وسن الخ) ھو من سنن الزوائد، فلا عتاب بترکہ کما فی القھستانی۔

فصل فی التیمم

(تیمم کے مسائل کا بیان)

(۱۱۱) تیمم کی حکمت ومصلحت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک خطیب صاحب مسئلہ بیان فرما رہے تھے کہ اگر کسی کو پانی نہ ملے یا کوئی عذر ہو تو وہ تیمم کر کے نماز ادا کرے نماز معاف نہیں ہے مسئلہ تو میں نے سمجھ لیا لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تیمم کرنے میں کیا مصلحت ہے جبکہ ظاہری کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آ رہا، براہ کرم آپ حضرات تیمم کی مصلحت اور فوائد بیان فرما کر میری الجھن دور فرمادیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حکیم ذات کا کوئی حکم، حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا چاہے کسی کو بظاہر اس کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔لیکن ہر حکم کی حکمت ومصلحت ڈھونڈنا بندے کیلئے مناسب نہیں کہ حکمت سمجھے بغیر عمل پیرا ہونا کامل اطاعت ہے۔ہاں! کوئی اس درجہ پر پہنچا ہو کہ مصلحت معلوم کرنے سے اطاعت میں مزید اضافہ ہو تو اس وجہ سے اس کیلئے حکمت ومصلحت معلوم کرنا الگ بات ہے۔

تیمم کی مشروعیت، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ہے جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطا نہیں ہوئیں اور اس میں مصلحت لوگوں کے لئے آسانی کا پیدا کرنا اور تنگی کو دفع کرنا ہے کہ جہاں پانی موجود نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن استعمال کرنے میں کوئی عذر ہو تو تیمم کیا جائے اور جس طرح تمام مائعات میں سے پانی کو طہارت کیلئے خاص کیا گیا ہے اسی طرح تیمم کیلئے مٹی کو خاص کیا گیا اور اس میں بنی آدم کی کرامت کا اظہار ہے کہ اس کی تخلیق بھی مٹی اور پانی سے ہوئی ہے۔تو ان دونوں کو اس کی پاکی کیلئے خاص کر دیا گیا۔

لمافی القرآن الکریم : وَاِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (المائدۃ:۶)

وفی التفسیر المنیر(۶/۱۱۱): ثم ذکر تعالیٰ حکمة مشروعیة التیمم وهی التیسیر علی الناس ودفع الحرج عنهم، فابان انه تعالیٰ ما یرید لیجعل علیکم فیما شرعه من احکام الوضوء والغسل والتیمم فی هذه الآیة وغیرها حرجا ای ادنی ضیق واقل مشقة، لانه تعالیٰ غنی عنکم، رحیم بکم، فلا یشرع لکم الاما فیه الخیر والنفع لکم، ولکن یرید لیطهرکم من الدنس والرجس المادی بازالة الاقذار، والرجس المعنوی بطرد الکسل والفتور الحاصل عقب الجنابة، وبعث النشاط، لتکون النفس صافیة مرتاحة فی مناجاة ربها، ویرید ایضا ان یتم نعمته علیکم بالجمع بین طهارة الا بدان وطهارة الارواح، وتبیان طریق العبادة الافضل، لتؤد و الشکر الواجب علیکم، ولتداوموا شکر النعم التی انعمها الله علیکم۔

وفی مبسوط السرخسی(۱/۱۰۸): وما شرع التیمم الا لدفع الحرج قال الله تعالیٰ ما یرید الله لیجعل علیکم من حرج...... فکما یختص الوضوء بالماء دون سائر المائعات فکذلك التیمم وفیه اظهار کرامة الادمی فانه مخلوق من التراب والماء فخصا بکونهما طهورا لهذا۔

(۱۱۲) کیا ہر وہ چیز جو جلانے سے خاک نہ ہو اس سے تیمم درست ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے پوچھا کہ تیمم کس کس چیز سے جائز ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہر وہ چیز جو جلانے سے خاک میں تبدیل نہ ہو تو اس اعتبار سے کافی چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں کیا سب سے تیمم کرنا جائز ہوگا جیسے نمک، مرچ اور گھر میں دیواروں پر لگا ہوا چونا وغیرہ؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں یہ جواب مکمل نہیں بلکہ اس کے دو جز ہیں، اول زمین کی جنس میں سے ہر اس چیز سے تیمم جائز ہے جو جلانے سے نہ جلے، دوم پگھلانے سے نہ پگھلے، لہٰذا دونوں اصولوں کی روشنی میں گھر کی دیواروں کے چونے سے تیمم درست ہے، اور جہاں تک نمک کا تعلق ہے تو نمک کی دو قسمیں ہوتی ہیں اول سمندری، دوم پہاڑی، اگر نمک سمندری ہے تو اس سے تیمم درست نہیں کیونکہ یہ جنس ارض میں سے نہیں اور اگر نمک پہاڑی ہے تو اس سے تیمم درست ہے کیونکہ یہ جنس ارض میں سے ہے۔ اور مرچ چونکہ جلانے سے جل جاتی ہے لہٰذا اس سے بھی تیمم درست نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۲۶): وکل مایحترق فیصیر رماداً کالحطب والحشیش ونحوهماأو ماینطبع ویلین کالحدید والصفر... فلیس من جنس الارض وما کان بخلاف ذلك فهو من جنسها ...

وفیه ایضاً (ص۲۷): أماالملح فان کان مائیاً فلا یجوز به اتفاقاًوان کان جبلیاً ففیه روایتان وصحح کل منهما ولکن الفتوی علی الجواز۔

وفي رد المحتار (۲۳۹/۱): الفارق بين جنس الارض وغيره أن كل ما يحترق بالنار فيصير رماداً كالشجر والحشيش أو ينطبع ويلين كالحديد والصفر والذهب والزجاج ونحوها فليس من جنس الارض ابن كمال عن التحفة۔

(۱۱۳) تیمم کن کن چیزوں سے جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن چیزوں پر تیمم کرنا صحیح ہے؟ اگر پاک کپڑے پر گرد ہوتو اس پر تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہر وہ چیز جو پاک ہو اور جنس الارض سے ہو یعنی جلانے سے راکھ نہ ہو، اور پگھلانے سے پگھلتی نہ ہو تو اس پر تیمم کرنا صحیح ہے مثلاً مٹی، پتھر، چونا اور گچ وغیرہ۔ اگر پاک کپڑے پر گرد وغبار ہو تو اس پر تیمم کرنا درست ہے۔

لما في الهندية (۲۶/۱۔۲۷): (ومنها الصعيد الطيب) يتيمم بطاهر من جنس الارض... فيجوز التيمم بالتراب والرمل و السبخة المنعقدة من الأرض دون الماء والجص والنورة والكحل والزرنيخ والمغرة والكبريت والفيروزج والعقيق والبلخش والزمرد والزبرجد ... وصورة التيمم بالغبار أن يضرب بيديه ثوباً أو لبدا أو وسادة أوما اشبهها من الأعيان الطاهرة التي عليها غبار فإذا وقع الغبار على يديه تيمم۔

وفي الشامية (۲۳۹/۱): (قوله من جنس الارض) الفارق بين جنس الارض وغيره ان كل ما يحترق بالنار فيصير رماداً كالشجروالحشيش أو ينطبع ويلين كالحديد والصفر والذهب والزجاج ونحوها فليس من جنس الارض۔

(۱۱۴) مسجد کے فرش و دیواروں سے تیمم کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں گرمیوں میں چلہ لگانے گیا تو میری تشکیل ایسی جماعت کے ساتھ ہوئی جس میں تین عالم حضرات تھے رات کے وقت ہم سونے لگے تو ایک عالم صاحب نے کہا اگر کسی کو احتلام ہو جائے تو مسجد کی دیوار یا فرش پر ہاتھ مار کر تیمم کرلے اس کے بعد مسجد سے باہر جائے دوسرے نے کہا کہ مسجد کی مٹی سے تیمم کرنا جائز نہیں کافی بحث ومباحثہ ہوا لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا، میرے دل میں خیال آیا کہ کسی دارالافتاء سے معلوم کیا جائے اب میں آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مسجد کی مٹی سے تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسجد کی حرمت کے پیش نظر عام حالات میں مسجد کے درودیوار سے تیمم کرنا مکروہ ہے البتہ

موجودہ دور میں چونکہ مساجد پختہ ہوتی ہیں اس لئے مسجد کے اندر حالت جنابت میں مسجد کی درودیوار سے تیمم کرنے کی گنجائش ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمل (بوجہ جنابت اور خوفِ مال وجان کے تیمم) مستحب ہے اسلیے کہ جنابت وخوف مال اور جان کے وقتی طور پر تیمم کرنا اس کی وجہ سے بحث ومباحثہ کرنا مناسب نہیں۔

لمافی الولوالجیة(۱/۵۳): النائم اذا احتلم وهو فی المسجد ان امکنه ان یخرج من ساعته واغتسل حتی لا یبقی فی المسجد جنبا وان لم یمکن بان کان فی وسط اللیل ولم یقدر علی الخروج یستحب له التیمم حتی لا یبقی فی المسجد جنبا۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۴۶): لو احتلم فی المسجد، وجب علیه الخروج منه الا ان یعجز عن الخروج لإغلاق المسجد ونحوه، أوخاف علی نفسه أو ماله. فان عجز او خاف جاز ان یقیم للضرورة ولا یتیمم بتراب المسجد فیحرم ذالك فان خالف وتیمم صح الخ۔

وفی البحر الرائق(۵/۴۱۹): لاحرمة لتراب المسجد اذا جمع وله حرمة اذا بسط۔

وفی الشامیة(۱/۲۴۳): لکن لقائل ان یقول: ان مراد المبتغی ان الجنب اذا وجد ماء فی المسجد واراد دخوله للاغتسال یتیمم ویدخل، ولو کان نائما فیه فاحتلم والماء خارجه وخشی من الخروج یتیمم وینام فیه الی ان یمکنه الخروج

قال فی المنیة: وان احتلم فی المسجد تیمم للخروج اذا لم یخف، وان خاف یجلس مع التیمم ولا یصلی ولا یقرأ اهـ۔ویؤید ما قلناه ان نفس النوم من المسجد لیس عبادة حتی یتیمم له وانما هو لأجل مکثه فی المسجد او لأجل مشیه فیه للخروج۔

رسالة

أريج الترنم

فی الجمع بین الوضوء والتیمم

معذور شخص کیلئے وضو اور تیمم کو جمع کرنے کا حکم

جو شخص چہرے پر غَسل اور مسح دونوں نہ کرسکتا ہو وہ تیمم کرے گا یا نہیں؟

ایک تسامح اور اس کا استدراک

(۱۱۵) تیمم اور وضو کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چہرے سے داڑھی کے بال تھوڑی سی جگہ سے یکدم سے گرنے لگے اور وہ جگہ خالی ہوگئی، ایک ڈاکٹر نے علاج کی حامی بھری ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ تک اس جگہ کو پانی نہیں لگنا چاہیے، یہاں تک کہ اس پر مسح بھی نہیں کرسکتے، اب آپ بتائیں کہ میں تیمم کرکے نماز پڑھ لوں یا باقی اعضاء کو دھولوں اور چہرے کا تیمم کرلوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جو بات ہو آپ مجھے بتلادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر ڈاکٹر مسلمان اور شریعت کا پابند ہے، تو آپ کیلئے اس کا قول معتبر ہے، لہٰذا آپ کیلئے تیمم کرنا درست ہے البتہ یہ تیمم صرف چہرے کا نہیں ہوگا بلکہ پورے اعضاء کا ہوگا اور اس کے ساتھ وضو نہیں ہوگا کیونکہ تیمم اور وضو دونوں کو جمع نہیں کرسکتے بلکہ دونوں میں سے صرف ایک پر عمل کرسکتے ہیں۔

لمافی الهندية (۲۸/۱):ويعرف ذلك الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او اخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق . . . يغسل الصحيح ويمسح على الجريح ان امكنه وان لم يمكنه المسح يمسح على الجبائر او فوق الخرقة ولا يجمع بين الغسل والتيمم۔

وفی الشامیة (۲۳۲/۱): (اوقول حاذق مسلم) ای اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاهر الفسق ... وفی البحر ولا فرق عندنا بین ان یشتد بالتحرك كالمبطون او بالاستعمال كالجدری۔[1]

(۱۱۶) مذکورہ فتوے پر استدراک اور رجوع

سوال......عرض ہے کہ بندہ دار العلوم سرحد پشاور سے فارغ ہے زمانہ طالب علمی میں چہرہ پر ایک زخم لگ گیا تھا جس کے بارے میں ڈاکٹروں نے دھونے اور پانی لگنے سے منع کیا تھا۔ چند علماء کرام سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس جگہ کو چھوڑ دو باقی وضو کرلو۔ بعد میں احسن الفتاوی جلد ۲ باب التیمم میں اور ھندیہ وغیرہ کتب میں یہی لکھا ہوا پایا، اسی کو معمول بہ بنایا اور لوگوں کو بھی بتا رہا تھا۔

کچھ دن پہلے نجم الفتاوی کا مطالعہ کر رہا تھا جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ پر اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا ہے کہ اگر چہرے کے اس جگہ پر مسح بھی نہیں کر سکتے تو آپ کیلئے تیمم کرنا درست ہے، بظاہر دونوں جوابوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اور سمجھ نہیں آرہا کہ کس پر عمل کریں۔ برائے مہربانی جو جواب درست ہو اس کو واضح فرمائیں۔ مشکور عند الناس ماجور عند اللہ۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اصل مسئلہ سے قبل چند بنیادی باتیں جاننا ضروری ہیں:

(۱) فقہائے کرام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص کے اعضاء وضو میں سے اکثر زخمی ہوں (یعنی چار میں سے تین اعضاء مثلاً ہاتھ، منہ اور سر تینوں زخمی ہوں) تو وہ شخص تیمم کرے گا [غسل میں اعضاء کی تعداد کا اعتبار نہیں بلکہ مساحت کے اعتبار سے اکثر بدن کا اعتبار ہے] اور اگر اکثر اعضاء صحیح ہوں اور اقل زخمی ہوں مثلاً صرف ہاتھ یا صرف چہرہ زخمی ہو تو اس صورت میں اس شخص کیلئے تیمم کرنا درست نہیں بلکہ وہ شخص صحیح اعضاء کو دھوئے گا اور زخمی حصے پر مسح کرے گا۔

(۲) اگر زخم ایسا ہو کہ اس پر مسح نہ کر سکتا ہو تو اس پر پٹی، جبیرہ وغیرہ کچھ نہ کچھ باندھ لے اور اس پر مسح کرے۔

(۳) اگر زخم یا پٹی پر بھی مسح نہ کر سکتا ہو تو اب کیا کرے؟ وضو چھوڑ کر تیمم کرے یا اس عضو کو چھوڑ کر باقی وضو مکمل کرے؟ اس سے متعلق ھندیہ میں ہے:

وان كان به جدري أو جراحات يعتبر الأكثر محدثا كان أو جنبا ففي الجنابة يعتبر اكثر البدن وفي الحدث يعتبر اكثر أعضاء الوضوء فإن كان الأكثر صحيحا والاقل جريحا يغسل الصحيح ويمسح على الجريح ان امكنه وان لم يمكنه المسح يمسح على الجبائر أو فوق الخرقة ولا يجمع بين الغسل والتيمم۔ (الھندیة ۲۸/۱)

---

[1] اس مسئلے میں تسامح ہوا ہے اس پر استدراک اور رجوع اگلے فتوے میں ملاحظہ ہو۔ از مرتب فرحان حسن عفی عنہ

اور شامیہ میں ہے:

قوله (ويمسح الجريح) أي إن لم يضره وإلا عصبها بخرقة ومسح فوقها خانية وغيرها ومفاده كما قال ط إنه يلزمه شد الخرقة إن لم تكن موضوعة۔ (شامية ۲۵۷/۱)

ان عبارات سے بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ [اولاً تو زخمی جگہ پر یا اس کی پٹی وغیرہ پر مسح کرنا ضروری ہے اور] مسح کے متعذر ہونے کی صورت میں وہ شخص تیمم کرے گا، چنانچہ ان جیسی عبارات کی وجہ سے ہم سے اس مسئلے میں تسامح ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص تیمم نہیں کرے گا بلکہ اس عضو کو چھوڑ کر بقیہ اعضاء پر وضو کرے گا۔ یہ تسامح ہم سے ہی نہیں ہوا بلکہ بعض اکابرین سے بھی ان ہی عبارات کی بناء پر یہ تسامح ہوا ہے مثلاً فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

''اگر زخم یا پٹی پر مسح نہیں ہو سکتا تو پھر تیمم درست ہے فقط'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۹۰/۱)

اور ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں ہے:

س: میری عمر ۱۸ سال ہے اور میرے چہرے پر مہاسے ہیں جن میں خون اور پیپ ہے جب میں وضو کرتا ہوں تو چہرے پر پانی لگنے سے مہاسوں سے خون نکلنے لگتا ہے۔۔۔۔۔؟

ج: اگر تکلیف واقعی اتنی سخت ہے جتنی آپ نے لکھی ہے اور مسح بھی نہیں کر سکتے تو تیمم جائز ہے۔

(آپ کے مسائل اور ان کا حل، مکتبہ لدھیانوی ۹۰/۲)

ان حضرات نے بھی اقل اعضاء مجروح اور اس پر مسح کے متعذر ہونے کی صورت میں تیمم کا قول کیا ہے۔

صاحب بحر نے اس شبہ کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

وبه اندفع ماكان قد توهم قبل الوقوف على هذا النقل إنه يتيمم لعجزه عن استعمال الماء وليس بعد النقل إلا الرجوع إليه''

''یعنی نقلِ صریح پر مطلع ہونے سے پہلے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ مذکورہ شخص (جو زخم وغیرہ پر مسح بھی نہ کر سکتا ہو) پانی کے استعمال سے عاجز ہونے کی وجہ سے تیمم کریگا لیکن نقلِ صریح ملنے کے بعد تو اسی کی طرف رجوع کیا جائے گا''

بہر حال دوسری طرف فقہاء کرام کی صریح عبارتیں موجود ہیں کہ اقل اعضاء کے مجروح ہونے کی صورت میں اگر زخم یا پٹی پر مسح کرنا متعذر اور مشکل ہو تو اس صورت میں اس عذر کی وجہ سے وہ شخص تیمم نہیں کر سکتا بلکہ اس شخص سے اس عضو کا مسح ساقط اور معاف ہو جائے گا جیسا کہ عذر کی وجہ سے غسل (دھونا) ساقط ہوا تھا نیز اس کی وجہ سے وضو کو چھوڑ کر تیمم کی طرف نہیں جایا جائے گا۔

(۱) جیسا کہ البحر الرائق میں ہے:

ولم يذكر المصنف رحمه الله صفة المسح على الجبيرة والملحق بها لوجود الاختلاف في نقل

المذهب فاعلم أنه لا خلاف في أنه إذا كان المسح على الجبيرة يضره أنه يسقط عنه المسح لأن الغسل يسقط بالعذر فالمسح أولى وإنما الخلاف فيما إذا كان لا يضره۔
(البحر الرائق ١/٣٢١)

(٢) بحر کے حاشیہ منحۃ الخالق میں ہے:

وإن كان أكثر أعضائه صحيحا بأن كانت الجراحة على رأسه وسائر جسده صحيح فإنه يدع الرأس ويغسل سائر الاعضاء۔ (منحة الخالق ١/٢٨٥)

(٣) امداد الفتاح میں ہے:

(وإن كان أكثره صحيحا غسله) أى الاكثر الصحيح (و مسح الجريح) مسحا على الجسد إن استطاع وإلا على خرقة ونحوها وإن أضر تركه۔ (امداد الفتاح ١٢٩)

(٤) مجمع الانہر میں ہے:

وفي مختارات النوازل وإنما يجوز المسح عليها إذا كان الماء يضر الجراحة إذا غسلها فإذا أضر يمسح على الجراحة وإن أضر يمسح على الجبيرة وإن أضر المسح على الجبيرة سقط المسح وكذا الحكم في موضع الفصد والزيادة على موضع الجراحة تبع لها وخرقة القرحة وهي ما يوضع على القرحة ونحوها كالجرح والكي والكسر۔ (مجمع الانهر ١/٤٥)

(٥) المحیط البرہانی میں ہے:

وإن كانت الجراحة بحالة لا يقدر المسح عليها وعلى ربط الخرق والجبائر فغسل الرجل الصحيحة ولبس الخف عليها ثم أحدث و توضأ جاز المسح على الخف فى الرجل الصحيحة لأن الجراحة إذا كانت بهذه الصفة لا يلزمه فى الرجل المجروحة فرض الغسل ولا فرض المسح فجعلت كالذاهبة أصلاً وكأن له رجل واحدة وهى الصحيحة لا غير فيمسح عليها إذا المسح لا يؤدى إلى الجمع بين البدل والمبدل۔ (المحيط البرهانى ١/٣٨٥)

(٦) الفقہ الاسلامی میں ہے:

"قال المالكية والارمد الذي لا يستطيع المسح على عينه أو جبهته إن خاف الضرر، يضع خرقة على العين أو الجبهة ويمسح عليها. وقال الحنفية: يترك المسح كالغسل إن ضر وإلا لا يترك"

(الفقه الاسلامى ١/٣٢٨)

(۷)ھندیہ میں ہے:

'' وشقوق أعضائه يمر عليها الماء إن قدر وإلا مسح عليها إن قدر وإلا تركه وغسل ما حولها كذا في التبيين'' (الهندية ۱/۳۵)

(۸)شامیہ میں ہے:

''قوله (ويترك المسح كالغسل) أي يترك المسح على الجبيرة كما يترك الغسل لما تحتها وهذا هو الرابع ح قوله (إن ضر) المراد الضرر المعتبر لا مطلقة لأن العمل لا يخلو عن أدنى ضرر وذلك لا يبيح الترك ط عن شرح المجمع قوله (وإلا لا يترك) أي على الصحيح المفتى به كما مر'' (الشامية ۱/۲۸۰)

ان تمام عبارات سے معلوم ہورہا ہے کہ عضوِ مجروح پر اگر مسح بھی متعذر ہو تو مسح بھی معاف ہوجائے گا گویا وہ عضو کالعدم ہے مگر وضو کو چھوڑ کر تیمم کی طرف نہیں جایا جائے گا۔ بہرحال ہمارے نزدیک بھی صحیح قول یہی ہے کہ اگر اقل اعضاء کے مجروح ہونے کی صورت میں زخم وغیرہ پر مسح بھی نہ کرسکتا ہو تو اس عضو کا مسح اس کیلئے معاف ہوجائے گا اس جگہ کو چھوڑ کر باقی وضو مکمل کرے مگر اس عذر کی وجہ سے اس کیلئے تیمم کرنا درست نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے ہماری توجہ اس مسئلے کی طرف کرائی نیز بندہ امید کرتا ہے کہ آئندہ بھی آنجناب بندے کو ایسے مسائل سے آگاہ فرماتے رہیں گے۔ شکریہ۔

(۱۱۷) وضو کی اجازت نہ ہونے پر تیمم جائز ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہے جہاں پانی نہیں یا پانی تو ہے لیکن وضو کیلئے جگہ نہیں اور وضو کی اجازت بھی نہیں تو کیا ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے؟ نیز ایسی جگہ اگر تیمم کیلئے بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پانی نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ ایک میل شرعی (جو کلومیٹر کے حساب سے 1.609 ہوتا ہے) کی مسافت تک پانی ہے یا نہیں اگر ایک میل تک پانی مل سکتا ہو تو پانی حاصل کر کے وضو کرے گا، اور اگر ایک میل تک پانی نہیں یا اسے پانی کا ہونا یا نہ ہونا معلوم نہ ہو تو اگر ظن غالب یہی ہے کہ پانی نہیں ہوگا، تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا لیکن اگر پانی کے موجود ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو تو تلاش کرنا ضروری ہوگا، تلاش کے بعد اگر مل جائے تو ٹھیک ورنہ تیمم کرلے۔ اور اگر پانی تو ہے لیکن وضو کی جگہ نہیں تو تیمم جائز نہیں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر پانی موجود ہے لیکن وضو کی اجازت نہیں تو دیکھا جائے گا کہ اگر وضو کرنے سے شدید مشقت کا اندیشہ ہے مثلاً منع کرنے والا قید میں ڈال دے گا یا قتل کردے گا تو بھی تیمم کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں اور ایسے نماز پڑھنے کی صورت میں بعد میں جب یہ عذر ختم ہو جائے تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ اور اگر پانی اور تیمم کیلئے کوئی چیز نہ پائے تو اگر نماز کا وقت فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں تشبہ بالمصلین کرے گا یعنی جیسے نماز میں حرکات وسکنات ہوتی ہیں خاموشی (بغیر قراءت کے) کے ساتھ ویسے ہی کرے گا اور بعد میں جب پانی وغیرہ مل جائے تو دوبارہ ان نمازوں کی قضاء کرلے۔

لمافی الھندیة (۱/۲۷): یجوز التیمم لمن کان بعیداً من الماء میلاًھو المختار فی المقدار سواء کان خارج المصر أو فیه وھو الصحیح۔

وفی الدر المختار (۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب(الطھورین) بان حبس فی مکان نجس ولا یمکنه اخراج تراب مطھر . . . (یؤخرھا عنده : وقالا یتشبه) بالمصلین وجوباً

وفی الشامیة تحته (وقالا یتشبه بالمصلین) ای احتراما للوقت۔قال ط ولا یقرأ کما فی أبی مسعود سواء کان حدثه أصغر أو أکبر اھ قلت: وظاھره أنه لاینوی أیضاً لأنه تشبه لاصلاة حقیقیة تأمل۔

وفی الشامیة (۱/۲۳۵): اعلم ان المانع من الوضوء ان کان من قبل العباد کأسیر منعه الکفار من الوضوء ومحبوس فی السجن ومن قیل له ان توضأت قتلتك جاز له التیمم ویعید الصلاۃ اذا زال المانع۔

(۱۱۸) معذوری میں تیمم کی مشروعیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو سخت بیمار ہے اور بستر پر پڑا ہوا ہے، طہارت وغیرہ کا انتظام مشکل ہے، بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا لہٰذا وضو بھی نہیں کرایا جاسکتا نہ ہی خود کرسکتا ہے کیونکہ سارا پانی بستر پر گرتا ہے، جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے، تو کیا ایسی حالت میں نماز معاف نہیں ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں جب مریض خود وضو نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے کرایا جاسکتا ہے تو ایسی صورت میں تیمم کرکے نماز پڑھے گا، نماز معاف نہیں ہوگی۔

لما في الدر المختار (۲۲۲/۱-۲۲۳): (من عجز)... (عن استعمال الماء)... (لبعده)... (او لمرض) يشتد او يمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرك، او لم يجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلك لايتيمم في ظاهر المذهب كما في البحر۔

(۱۱۹) نزلے کے مریض کیلئے حالت جنابت میں تیمم کا حکم نیز ٹریننگ کے دوران تیمم کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نزلے کا مریض ہوں جب سردی آجاتی ہے تو میری حالت مزید خراب ہوجاتی ہے جب غسل کرتا ہوں تو سخت سردی لگتی ہے اور مرض بڑھ جانے کا یقین ہوتا ہے تو اگر مجھے غسل جنابت کی حاجت ہو تو کیا تیمم کرکے میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟

نیز میرا ایک دوست پاکستان آرمی میں ہے، ان کی ٹریننگ بعض دفعہ ایسے صحراؤں میں ہوتی ہے جہاں پانی کا نام ونشان نہیں ہوتا اور کئی کئی دن وہاں گزارنے پڑتے ہیں، تھوڑا سا پانی صرف پینے کیلئے ملتا ہے اس کے علاوہ پانی موجود تو ہوتا ہے لیکن افسران بالا کے قبضے میں ہوتا ہے سوائے پینے کے نہیں ملتا، ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر تیمم جائز نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... مریض اس وقت تیمم کرسکتا ہے جب اس کو خود ظن غالب ہو یا کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب اس کو یہ بتائے کہ پانی کے استعمال سے مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور صورت مسئولہ میں اگر گرم پانی کے استعمال پر بھی قدرت نہ ہو یا اس سے بھی مرض بڑھنے کا ظن غالب یا یقین ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنے کی گنجائش ہے۔

نیز جو پانی آپ کے دوست کو ملتا ہے اگر وہ اتنا کم ہو کہ وضو میں استعمال کیا جائے تو ختم ہوجائے گا اور شدت پیاس کی وجہ سے

ہلاکت کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں افسران بالا سے وضو کیلئے پانی مانگنا ضروری ہے، اگر وہ دینے سے انکار کر دیں تو پھر تیمم کرنا جائز ہے۔

لمافی الھندیۃ (۲۸/۱): ولو کان یجد الماء الا انہ مریض یخاف ان استعمل الماء اشتد مرضہ أو أبطأبرؤہ یتیمم ... ویعرف ذلک الخوف اما بغلبۃ الظن عن امارۃ أو تجربۃ أو اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاھر الفسق۔

وفی الدر المختار(۲۳۳/۱): (أولمرض) یشتد أو یمتد بغلبۃ ظن أوقول حاذق مسلم ولو بتحرك أو لم یجد من توضئہ۔

وفی الھندیۃ (۲۸/۱):وکذا اذا خاف العطش علی نفسہ أو رفیقہ المخالط لہ أو آخر من اھل القافلۃ...

وفی الدر المختار (۲۳۲/۱):(من عجز)... (عن استعمال الماء)... (لبعدہ) ...ص۲۳۴(او خوف عدو) (اوعطش) ...ص۲۳۶(تیمم)

وفی الشامیۃ (اوعطش)معطوف علی عدو۔ای لانہ مشغول بحاجتہ والمشغول بالحاجۃ کالمعدوم۔

وفی الدرالمختار (۲۵۰/۱): (ویطلبہ) وجوبا علی الظاھر من رفیقہ (ممن ھو معہ فان منعہ) ولو دلالۃ بأن استھلکہ (تیمم) لتحقق عجزہ۔

وفی الشامیۃ (ص۲۵۱):(من رفیقہ)...ذکر الرفیق جری مجری العادۃ،والا فکل من حضر وقت الصلاۃ فحکمہ کذلك رفیقا کان او غیرہ۔

(۱۲۰)ٹرین میں پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کا حکم نیز کپڑوں پر تیمم کرنا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ٹرین میں سفر کر رہا ہو، ٹرین میں پانی نہ ہو، اور نماز کے وقت میں رکنے کا امکان بھی نہ ہو، یہ شخص ٹرین میں تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے؟ نیز یہ شخص تیمم کپڑے پر کر سکتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پانی ایک میل سے زیادہ دور ہو، اور ٹرین میں نہ ہی کسی سے اتنا پانی ملنے کی امید ہو، جس سے وضو ہو سکے تو یہ شخص ٹرین میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے ورنہ بیٹھ کر پڑھ لے۔

لیکن پانی اگر ایک میل سے کم دور ہو، اور ٹرین کا وہاں پہنچنے تک نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو پھر بھی تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ البتہ اس صورت میں نماز کی قضاء بھی ضروری ہے۔ نیز کپڑے پر اگر تھوڑا بہت غبار ہو تو اس پر تیمم کرنا درست ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۷): وصورة التيمم بالغبار ان يضرب بيديه ثوبا أو لبدا او وسادة او ما اشبهها من الاعيان الطاهرة التى عليها غبار فاذا وقع الغبار على يديه تيمم أو ينفض ثوبه حتى يرتفع غباره فيرفع يديه فى الغبار فى الهواء فاذا وقع الغبار على يديه تيمم كذا فى المحيط...

ومنها عدم القدرة على الماء...

وفيه ايضاً(۱/۱۴۳): أما الصلاة فى السفينة فالمستحب أن يخرج من السفينة للفريضة اذا قدر عليه كذا فى المحيط السرخسى۔

وفى الدر المختار(۱/۲۴۱): (و) جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)... (أو) فوت (عيد) ... (صـ۲۴۶) (لا) يتيمم (لفوت جمعة ووقت)... وقيل يتيمم لفوات الوقت قال الحلبى: فالأحوط ان يتيمم ويصلى ثم يعيده۔

وفى الشامية تحته: (قوله وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) اى ولو كان الماء قريبا۔

وتحت(قوله قال الحلبى)... ثم قال ماحاصله: ولعل هذا من هؤلاء المشايخ اختيار لقول زفر لقوة دليله وهو ان التيمم انما شرع للحاجة الى اداء الصلاة فى الوقت فيتيمم عند خوف فوته...

قلت: وهذا قول متوسط بين القولين، وفيه الخروج عن العهدة بيقين فلذا اقره الشارح...

بل قد علمت من كلام القنية انه رواية عن مشايخنا الثلاثة۔ ونظير هذا مسألة الضيف الذى خاف ريبة فانهم قالوا يصلى ثم يعيد والله تعالىٰ اعلم۔

(۱۲۱) سردی کی وجہ سے تیمم کرنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو غسل کی ضرورت ہے لیکن پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہے جبکہ وہ وضو کرسکتا ہے تو کیا اس کیلئے شرعاً جائز ہے کہ وہ غسل کیلئے تیمم کرے اور وضو کر کے نماز پڑھ لے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر غسل کی ضرورت کے وقت سخت سردی کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہو بایں معنیٰ کہ بیمار ہوجانے یا سخت نقصان کا خطرہ ہو اور گرم پانی یا گرم کمرہ بھی میسر نہ ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔اور جائز ہونے کی صورت میں صرف تیمم کرے گا بعد میں وضو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وضو اور تیمم دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

لمافی خلاصة الفتاوى (۱/۳۸): فى الأصل الجنب والحائض والمحدث فى التيمم سوآء ويجوز للمريض ان يتيمم فى المصر اذا لم يستطع الوضوء او الغسل للمرض او يخاف على نفسه

الهلاك بسبب استعمال الماء او يخاف تلف عضومن اعضائه وان كان لا يخاف الهلاك ولا تلف العضوولكن يخاف زيادة المرض او ابطاء البرء يجوز التيمم عندنا ولو كان الماء لايضره ولكن لايمكنه استعمال الماء جاز له التيمم عندنا۔

وفى الهندية (۲۸/۱): ويجوز التيمم إذا خاف الجنب إذا اغتسل بالماء أن يقتله البرد أو يمرضه هذا إذا كان خارج المصر إجماعا فإن كان في المصر فكذا عند أبي حنيفة خلافا لهما والخلاف فيما إذا لم يجد ما يدخل به الحمام فان وجد لم يجز إجماعا وفيما إذا لم يقدر على تسخين الماء فإن قدر لم يجز هكذا في السراج الوهاج وإذا خاف المحدث أن توضا أن يقتله البرد أو يمرضه يتيمم هكذا في الكافي واختاره في الأسرار لكن الأصح عدم جوازه إجماعا كذا في النهر الفائق والصحيح انه لا يباح له التيمم كذا في الخلاصة وفتاوى قاضي خان۔

وفى الدرالمختار (۲۳۲/۱):(من عجز)... (عن استعمال الماء)... (لبعده)... (أو برد) يهلك الجنب أو يمرضه ولو فى المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه

وفى الشامية (ولا ما يدفئه)...قال فى البحر:فصار الأصل أنه متى قدر على الاغتسال بوجه من الوجوه لا يباح له التيمم اجماعا۔

(۱۲۲)سخت سردی کی حالت میں تیمم کا شرعی حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایسی سخت سردی ہوجس میں پانی استعمال کرنے سے نقصان کااندیشہ ہوتواس میں تیمم کرنے کاشرعاً کیاحکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سخت سردی کی حالت میں اگر ہلاکت یاعضو کے تلف ہونے کا، یابیماری کی زیادتی کاقوی اندیشہ ہواورگرم پانی یاایسی کوئی چیزجس سے گرمی حاصل کرسکے بھی نہ ملے،توتیمم کرناجائز ہے۔

لمافى الهندية(۲۸/۱): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد أو يمرضه۔

وفى الدر المختار (۲۳۴/۱) : أوبرد يهلك الجنب اويمرضه ولو فى المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه۔

وفى الشامية (۲۳۴/۱): نعم مفاد التعليل بعدم تحقق الضرر فى الوضوء عادة أنه لو تحقق جاز فيه ايضاً اتفاقاً، ولذا مشى عليه فى الامداد لان الحرج مدفوع بالنص۔

(۱۲۳) نمازِ جنازہ کے فوت ہونے کے خوف سے تیمم کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ ہو رہا ہے اگر وضو کرے تو نماز جنازہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے اب وضو کرے یا تیمم؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں نماز جنازہ نہ ملنے کے خوف سے وہ تیمم کر سکتا ہے جبکہ امام یا ولی نہ ہو۔

لمافی الهندية(۱/۳۱): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة ان تفوته الصلاة ولا يجوز للولي وهو الصحيح هكذا في الهداية۔

وفي الشامية(۱/۲۴۵): قوله بخلاف صلاة جنازة اى فان تيمما تجوز به سائر الصلوات لكن عند فقد الماء وا ما عند وجوده اذا خاف فوتها فانما تجوز به الصلاة على جنازة اخرى اذا لم يكن بينهما فاصل كما مر ولا يجوز به غيرها من الصلوات أفاده ح۔

(۱۲۴) نماز جنازہ کیلئے تیمم کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک دم سے جنازہ سامنے آجائے یا کہیں جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو کی فرصت نہ ہو یعنی وضو میں مشغولیت کی وجہ سے نماز جنازہ نکل جانے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اگر بلا وضو جنازہ پڑھ لیں تو کیسا ہے؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بلا وضو اگر کوئی سجدہ کرے تو کافر ہو جاتا ہے جبکہ نماز جنازہ میں سجدہ نہیں ہوتا، یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......بغیر وضو نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں، جس طرح اور نمازوں کیلئے طہارت شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی طہارت شرط ہے، البتہ اگر اچانک جنازہ سامنے آجائے یا جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو میں مشغول ہونے سے نماز جنازہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر کے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ تیمم کرنے والا امام یا میت کا ولی نہ ہو کیونکہ ان دونوں کیلئے ہر صورت میں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر کسی نے بغیر وضو نماز (چاہے پنج وقتی نماز ہو، نفل ہوں یا نماز جنازہ) کی ادائیگی کی تو اگر مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کیا یا لوگوں سے شرم کی وجہ سے تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا جس پر اسے توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے اور اگر کسی نے یہ فعل جان بوجھ کر اسے جائز وحلال سمجھتے ہوئے کیا تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

لمافي الروض الازهر(ص۴۶۸): وفي الفتاوى الصغرى والجواهر :ومن صلى مع الإمام بجماعة بغير طهارة عمدا كفر، وفيه ان قيد الجماعة مع الامام لا يظهر وجهه ثم الصلوة بغير طهارة معصية فلا ينبغي ان يقال بكفره الا إذا استحلها...(وفي ص۴۶۹) وفي التتمة من سجد أو صلى

محدثا رياء كفر، فيه أن قيد الرياء يفيد أنه إن صلى جياء لا يكفر واما اذا جمع بين الرياء وترك الطهارة فكانه غلظ المعصية ومع هذا لا يخلوا عن الشبهة لا سيما فى السجدة المفردة حيث يتوهم كثيرون أنها تجوز من غير طهارة ...كذا إذا صلى بغير طهارة أو مع الثوب النجس يعنى مع القدرة على الثوب الطاهر كفر يعنى اذا استحل والا فلا شك انها معصية وانه كأنه ترك تلك الصلوة وبمجرد تركها لا يكفر۔

وفى الهندية (۱/۳۱): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولى غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة أن تفوته الصلاة ولايجوز للولى هو الصحيح۔

وفى الدر المختار (۱/۲۴۱): (و)جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)

وفى الشامية تحته ولو كان الماء قريبا۔

(۱۲۵) عید کی نماز کیلئے تیمم کی ایک صورت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب عید کی نماز پڑھنے عید گاہ گئے نماز سے ذرا پہلے ان کا وضو ٹوٹ گیا، وہاں وضو کا کوئی انتظام نہیں، اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ تیمم کر کے نماز پڑھ لیں یا وضو کرنے کیلئے گھر جائیں، گھر جانے کی صورت میں نماز نکلنے کا اندیشہ ہے، یا عید گاہ کے قریب جو گھر ہیں وہاں سے پانی مانگ کر وضو کر لے لیکن اس صورت میں غیر محرم سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور اس سے پانی لینا پڑتا ہے کیونکہ سب لوگ یہاں تک کہ بچے بھی نماز کیلئے عید گاہ جاتے ہیں اور عید گاہ میں یہ پوچھنا کہ قریب میں کس کا گھر ہے، جو وضو کیلئے پانی دے دے، یہ مشکل ہے؟ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں؟۔

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں جب عید گاہ میں پانی موجود نہ ہو تو اگر نماز میں اتنا وقت باقی ہو کہ پانی کے انتظام اور وضو سے فراغت تک نماز ملنے کی اُمید ہو تو پانی کے انتظام کی کوشش کرنی ضروری ہے، اور اگر پانی کا انتظام کر کے وضو کرنے میں نماز فوت ہونے یا نہ ملنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لیں۔

لمافى الدرالمختار (۱/۲۴۱): (و)جاز (لخوف فوت صلاة الجنازة) ... (أو) فوت (عيد) بفراغ امام اوزوال شمس (ولو) كان يبنى (بناء) بعد شروعه متوضأ وسبق حدثه (بلا فرق بين كونه اماما اولا) فى الاصح لان المناط خوف الفوت لا الى بدل۔

وفى الشامية: (لان المناط) اى الذى تعلق به الحكم المذكور و هو التيمم لخوف فوت الصلاة بلا بعد عن الماء۔

وفی الخیریة(ص۵): فلا یجوز التیمم له مع وجود الماء الا فی موضع یخشی الفوات لا إلی خلف کصلوٰة الجنازة والعید۔

(۱۲۶)پانی کی موجودگی میں تلاوت کیلئے تیمم کرنے کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانی کی موجودگی میں قرآن کریم کی تلاوت کیلئے تیمم کرنے سے متعلق شرعاً کیاحکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بے وضو ہونے کی حالت میں قرآن کریم کو چھوئے بغیر صرف تلاوت کیلئے تیمم کرنا جائز ہے،اگرچہ پانی موجود ہو کیونکہ قرآن کریم کو ہاتھ لگائے بغیر تلاوت کرنا ان عبادات میں سے ہے کہ جن کیلئے اگر جنابت نہ ہو تو طہارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔البتہ قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر،چھو کر تلاوت کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے۔

لمافی الهندیة(۲۶/۱): و لو تیمم لقراء ة القرآن عن ظهر القلب أو عن المصحف أو لزیارة القبور أو لدفن المیت أو للأذان أو للإقامة أولدخول المسجد أو لخروجه بأن دخل المسجد وهو متوضئ ثم أحدث أو لمس المصحف وصلی بذلك التیمم قال عامة العلماء لایجوز۔

وفی الدر المختار(۲۴۵/۱): أنه یجوز لکل مالا تشترط الطهارة له ولو مع وجود الماء وأما ماتشترط له فیشترط فقد الماء کتیمم لمس مصحف فلا یجوز لواجد الماء وأما للقراء ة فان محدثا فکالأول أوجنبا فکالثانی۔

(۱۲۷)پانی نہ ہونے کی صورت میں مشروبات سے وضو کرے یا تیمم؟

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بسااوقات دوران سفر ٹرین میں پانی نہیں ہوتا اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہوتا ہے اور اسٹیشن پر بھی بسااوقات ٹرین بہت کم وقت کیلئے رُکتی ہے جس میں پانی حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اور بعض اوقات بڑے اسٹیشن بہت دور ہوتے ہیں اور عام پانی میسر نہیں ہوتا البتہ بوتل والا گھوم رہا ہوتا ہے،تو کیا ایسی حالت میں بوتل (پیپسی وغیرہ) سے وضو کرنا جائز ہوگا یا تیمم کرنا چاہیئے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں جب ٹرین کے کسی بھی ڈبے میں بالکل پانی نہ مل رہا ہو اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو تو تیمم کر کے نماز ادا کی جائے گی،اسی طرح جب پانی کے ایک میل تک ملنے کی امید نہ ہو تو اس وقت بھی تیمم کر کے نماز ادا کی جائے گی۔باقی پیپسی وغیرہ جو مشروبات فروخت ہوتے ہیں یہ چونکہ ماء مطلق نہیں ہیں اس لئے ان سے وضو نہیں کیا جائے گا بلکہ تیمم کیا جائے گا ہاں اگر یہ امید ہو کہ مستحب وقت کے اندر اندر کسی اسٹیشن پر پہنچ کر پانی مل جائے تو اس وقت تک تاخیر کر لینا مستحب ہے۔

لما فی الدرالمختار (۲۳۲/۱): (من عجز) مبتداء خبره تیمم (عن استعمال الماء) المطلق الکافی لطهارته لصلاة تفوت الی خلف (لبعده) ولو مقیما فی المصر (میلاً)۔۔۔۔۔ (أولمرض)

وفی الشامیة (۲۴۹/۱): والحاصل انه اذا رجا الماء یؤخر الی آخر الوقت المستحب بحیث لایقع فی کراهة وان کان لایرجو الماء یصلی فی الوقت المستحب کوقت الاسفار فی الفجر والابرادفی ظهر الصیف ونحو ذلك۔

(۱۲۸) چلتی ہوئی ریل سے چشمے تالاب وغیرہ دکھائی دینے سے تیمم نہیں ٹوٹتا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ریل میں سفر کر رہا ہو، اوراس نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا ہواور اثناء راہ میں چلتی ہوئی ریل سے اُسے پانی کا چشمہ یا تالاب وغیرہ دکھائی دیں تو کیا اس کا تیمم باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں چلتی ہوئی ریل سے چشمہ یا تالاب وغیرہ صرف دکھائی دینے سے تیمم نہیں ٹوٹے گا، جب تک کہ اس پانی کے استعمال پر قدرت حاصل نہ ہو۔

لمافی الھندیة (۳۰/۱): وأن مرعلی الماء وھو فی موضع لایستطیع النزول الیه لخوف عدو أوسبع لم ینتقض ھکذا فی السراج الوھاج۔۔۔۔۔ المسافر اذا مرفی الفلاة بماء موضوع فی حب أونحوه لا ینتقض تیممه۔

وفی الدر المختار (۲۵۶/۱): والحاصل أن کل مایمنع وجوده التیمم نقض وجوده التیمم (ومالا) یمنع وجوده التیمم فی الابتداء (فلا) ینقض وجوده بعد ذلك التیمم

وفی الشامیة تحته: (قوله والحاصل) اراد به التنبیه علی أن ذلك قاعدة کلیة تغنی عن ذکرقدرة الماء الکافی فافھم۔

(۱۲۹) مقتدیوں کا امام سے بغیر کسی عذر شرعی کے ناراض ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کا ایک امام ہے جس کی عمر تقریباً پچاس سال ہے وہ اکثر بیمار رہتا ہے اس کی اولاد بھی صحیح نہیں ہے لوگ اس کو کہتے ہیں اپنی اولاد کو سمجھاؤ تو وہ کہتا ہے میرے سے زیادہ ہیں لوگ اس کو امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ امامت چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے اب بعض لوگ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے آیا ایسے امام کی امامت صحیح ہے؟ اوراس کا روکنے کے باوجود امامت کرانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... امامت ایک عظیم الشان منصب ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے امام کو ہر اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے جو فتنہ وفساد اور مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب بنے لہٰذا اپنے گھر والوں اور اولاد کی بھی نگرانی رکھے اور ان کی اصلاح کرتا رہے کہیں وہ گناہوں میں مبتلا اور نافرمان نہ ہو جائیں، لقولہ تعالیٰ "قوا انفسکم واھلیکم نارا" یعنی خود بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچاؤ، صورت مسئولہ میں امام صاحب کو اپنی اولاد کی فکر کرنی چاہیے اگر وہ سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں تو ان سے قطع تعلق کرنا (بشرطیکہ ان کے اس طرح سدھرنے کی امید ہو) بھی جائز ہے لیکن امام صاحب کا اکثر بیمار رہنا اور ان کی اولاد کا صحیح نہ ہونا، اگرچہ اس سے ان کی ذات میں شرعاً قباحت لازم نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کو امامت سے ہٹایا جائے اگر مقتدی ان افعال کی وجہ سے امام کو ہٹانا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کیلئے ناجائز ہے اجتناب کرنا چاہیے البتہ امام کو اس منصب کا لحاظ کرتے ہوئے خود استعفیٰ دیدینا چاہیے کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اگر وہ امامت سے استعفیٰ نہ دیں پھر بھی ان کے پیچھے نماز درست ہے۔

لمافی مرقاۃ المفاتیح (۸۴/۳): (وامام قوم) أی الامامة الکبریٰ أو امامة الصلاة (وهم له) وفی نسخة لها أی الإمامة (کارهون) أی لمعنی مذموم فی الشرع وإن کرهوا لخلاف ذلك فالعیب علیهم ولا کراهته قال ابن الملك أی کارهون لبدعته أو فسقه أو جهله اما اذا کان بینه وبینهم کراهة وعداوة بسبب أمر دنیوی فلا یکون له هذا الحکم۔

وفی التجنیس والمزید (۷/۲): رجل أمّ قوماً وهم له کارهون فهذا علی ثلاثة أوجه اما اذا کانت الکراهیة لفساد فیه أو کانوا احق بالامامة منه أو هو احق بالامامة منهم ولا فساد فیه ومع هذا کرهوا فالاول والثانی مکروه هکذا روی الحسن البصری رحمه الله عن اصحاب رسول الله ﷺ والثالث لا، لأن الجاهل والفاسق یکره العالم والصحیح، وهو الصحیح۔

وفی الدر المختار (۵۵۹/۱): (ولو أمّ قوماً وهم له کارهون، إن) الکراهة (لفساد فیه أو لأنهم أحق بالامامة منه کره) له ذلك تحریماً لحدیث أبي داؤد "لایقبل الله صلاة من تقدم قوماً وهم له کارهون" (وإن هو أحق لا) والکراهة علیهم۔

وفی فتح الملهم (۵۲۸/۳): تأدیب الرجل ولده وإن کان کبیراً اذا تکلم بما لا ینبغی له وجواز التأدیب بالهجران۔

(۱۳۰) غسل خانے کی عدم موجودگی میں تیمم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کو غسل کی حاجت ہو اور وہ ایسے مقام پر ہو جہاں غسل کرنے کیلئے غسل خانے کا انتظام نہ ہو تو کیا وہ تیمم کر سکتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون پر غسل واجب رہے گا لہٰذا اس کو چاہیئے کہ پردہ لٹکا کر یا انہی کپڑوں میں یا کوئی اور مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے غسل کرلے اور اگر غسل کرنے کی صورت میں بدن ضروری طور پر دوسرے کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور پردے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تو اگر اس خاتون کے اردگرد خواتین ہیں تو غسل کرلے اور اگر اس کے اردگرد صرف مرد یا مرد اور خواتین دونوں ہیں تو مناسب انتظام نہ ہونے تک غسل میں تاخیر کرے۔

نیز غسل نہ کرنے کی صورت میں مناسب یہ ہے کہ تیمم کرکے نماز ادا کرلے اور غسل کرنے کے بعد احتیاطاً نماز لوٹالے۔

لمافی سنن النسائی(۱/۴۶): عن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلا یغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد اللہ واثنی علیہ وقال ان اللہ عزوجل حلیم حیی ستیر یحب الحیاء والستر فاذا اغتسل احدکم فلیستتر۔

وفی الدر المختار(۱/۱۵۵): والمرأة بین رجال أو رجال ونساء تؤخره لا بین نساء فقط... وینبغی لها أن تتیمم وتصلی لعجزها شرعا عن الماء۔

وفی الشامیة (۱/۱۵۵): والأشبه الإعادة تفریعا علی ظاهر المذهب فی الممنوع من إزالة الحدث بصنع العباد إذا تیمم وصلی اھ...... واستظهر الرحمتی عدم الإعادة، قال لأن العذر لم یأت من قبل المخلوق، فإن المانع لها الشرع والحیاء وهما من اللہ تعالی۔

فصل فی النجاسات واحکام التطہیر

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

(۱۳۱) چوتھائی کپڑے کے بقدر نجاست کا حکم اور چوتھائی سے مراد کیا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے سنا ہے کہ اگر کسی جانور کے پیشاب کی چھینٹیں کپڑوں پر لگ جائیں تو اگر وہ نجاست ایک چوتھائی حصہ سے کم ہو تو وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوگا اور ان کپڑوں میں پڑھی گئی نماز درست سمجھی جائیگی۔ اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک چوتھائی کی مقدار کیا ہے؟ اگر جانوروں کے بیچ میں کوئی شخص کھڑا ہو، اس دوران کسی جانور نے پیشاب کیا اور چھینٹیں اس کے پائنچوں پر لگ گئیں تو کیا وہ پاک ہے جبکہ وہ کم بھی ہیں؟ اور اگر وہ پاک ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مفہوم ہوگا جس میں جانوروں کے پیشاب سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ((عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال استنزھوا من البول فان عامۃ عذاب القبر منہ)) (دار قطنی ۱/۱۳۶)۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزاء خیر دے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب کسی حلال جانور کے پیشاب کی چھینٹیں چوتھائی کپڑوں سے کم پر لگ جائیں۔ (اور وہ کسی عذر کی بنا پر دھوئی نہ جاسکتی ہوں یا پھر نماز شروع کرنے کے بعد اس پر نظر پڑی ہو اور باجماعت نماز ملنے کی کہیں بھی امید نہ ہو یا اسی طرح نماز کا وقت نکل رہا ہو) تو ان کپڑوں میں نماز ہوجائے گی۔ (اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی عذر نہ ہو اور مقدار ربع سے کم ہو تو اس کو دھونا افضل ہے۔ چاہے نماز توڑ کر ہی کیوں نہ ہو) (۲) چوتھائی کپڑے سے وہ حصہ مراد ہوگا کہ جہاں پر یہ نجاست لگی ہوئی ہو۔ مثلاً آستین پر اگر لگی ہوگی تو اسی کا چوتھائی مراد ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پائنچے کا چوتھائی مراد ہے۔ (۳) قابل معافی سے مراد پاک ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہے تو یہ نجاست ہی، مگر مذکورہ مسئلے میں نجاست وطہارت دونوں طرح کی احادیث آنے سے اس میں خفت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سوال مذکور میں اس کی نجاست کی حدیث پیش کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ اس کے (حلال جانور کا پیشاب) پینے تک کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا فقہاء کرام کے قاعدے کے مطابق جب کسی شئی کی نجاست اور طہارت دونوں پر احادیث وارد ہوں تو پھر اس صورت میں اس شئی کی نجاست میں تخفیف آجاتی ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلے میں ہوا۔

لما فی الصحیح للبخاری(۱/۳۵): (باب ماجاء فی غسل البول وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لصاحب القبر کان لا یستتر من بولہ ولم یذکر سوی بول الناس) ۔۔۔۔۔ عن ابن عباس قال مر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقبرین

فقال انهما ليعذبان وما يعذبان فی كبير۔ اما أحدهما فكان لا يستتر من البول الخ۔۔۔۔

وفيه ايضاً (۱/۳۶): (باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، وصلى ابو موسىٰ فی دار البريد والسرقين والبرية إلى جنبه۔ فقال ههنا وثم سواءٌ)۔۔۔۔۔۔ عن انس رضی الله عنه قال قدم اناس من عكل أوعرينة، فاجتوو المدينة، فأمرهم النبی صلى الله عليه وسلم بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها۔ الخ

وفی البحر الرائق(۱/۳۹۶): ومراده من العفوصحة الصلوة بدون ازالته لاعدم الكراهة... وإن كانت اقل وقددخل فی الصلوة نظر ان كان فی الوقت سعة فالأفضل ازالتها... وان كان فی آخر الوقت ... يمضی على صلاته ولا يقطعها۔

وفيه ايضاً(۱/۳۹۸): قال فی الكافی ولا يظهر الاختلاف فی غير الروث والخثی لثبوت الخلاف المذكور مع فقد تعارض النصين ثم على طرد أنه يثبت التخفيف عندهما بالتعارض، كما باختلاف المجتهدين تقع الحاجة الى الاعتذار لمحمد عن قوله بطهارة بول الحيوان الماكول، ثم لا يخفى أن المراد باختلاف العلماء المقتضی للتخفيف۔

وفيه ايضاً(۱/۳۹۷): وحاصله، انه ان وردنص واحد بنجاسة شئ فهومغلظ۔ وان تعارض نصان فی طهارته ونجاسته فهو مخفف عنده۔ و عندهما۔ ان اتفق العلماء على النجاسة فهو مغلظ، وإن اختلفوا فهو مخفف۔

وفی الدرالمختار(۱/۳۲۱):(وعفی دون ربع)جميع بدن و(ثوب) ولوكبيرا هو المختار ذكر الحلبی، ورجحه فی النهر على التقدير بربع المصاب كيد وكم، وان قال فی الحقائق وعليه الفتوىٰ۔ (من) نجاسة (مخففة كبول مأكول)ومنه الفرس وطهره محمد۔

(۱۳۲) نجاست کتنی مقدار میں معاف ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں بھینسوں کے باڑے میں ملازمت کرتا ہوں چونکہ ہمیں ہروقت باڑے میں آنا جانا ہوتا ہے بعض اوقات کوئی بھینس پیشاب کردیتی ہے جس کے چھینٹے میرے کپڑوں پر بھی پڑ جاتے ہیں تو کیا میں انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ بار بار کپڑے تبدیل کرنے میں دشواری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حلال جانوروں کا پیشاب نجاست خفیفہ ہے اور نجاست خفیفہ اگر جسم یا کپڑے کے کسی حصے پر چوتھائی یا اس سے کم مقدار میں لگ جائے تو وہ معاف ہے اگر اس سے بڑھ جائے تو پھر معاف نہیں ہے تو اسی اصول کے تحت صورت

مسئولہ میں دیکھا جائیگا کہ اگر چھینٹے کپڑوں کے چوتھائی حصے یا اس سے کم پر ہیں تو پھر گنجائش ہوگی کہ انہی کپڑوں میں نماز پڑھ لیں، لیکن اگر چھینٹے اتنی کثیر مقدار میں ہوں کہ چوتھائی حصے سے بڑھ جائیں تو پھر اس صورت میں ان کپڑوں میں نماز جائز نہیں ہے۔

لمافی السراجیة(ص۱۲): اذا اصابت النجاسة الغليظة الثوب أوالبدن اكثر من قدر الدرهم الذى هو مثل الكف لايجوز وقدر الدرهم لا يضره بول ما يوكل لحمه لايضر مالم يفحش۔

وفي الهندية(۱/۴۶): والثانى المخففة وعفى منها مادون ربع الثوب...وبول كبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف هكذا فى الكنز۔

وفى الدر المختار(۱/۲۱۰): (وبول ماكول) اللحم (نجس) اى نجاسة مخففة وطهره عند محمد (ولايشرب) بوله (اصلا)۔

(۱۳۳) سوئے ہوئے آدمی کے لعاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سونے کی حالت میں جو لعاب منہ سے نکلتا ہے وہ پاک ہے یا ناپاک؟ اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کیا کپڑے اس سے ناپاک ہوجائیں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سونے کی حالت میں جو منہ سے لعاب نکلتا ہے وہ پاک ہے، اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

وفى الهندية(۱/۴۶): لعاب النائم طاهر سواء كان من الفم اومنبعثا من الجوف عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله وعليه الفتوىٰ۔

وفى الدرالمختار مع رد المحتار(۱/۱۳۸): كماء فم النائم فانه طاهر مطلقا به يفتى۔

وفى الشامية تحته(۱/۱۳۸): (قوله مطلقاً) سواء كان من الرأس او من الجوف أصفر منتناً أولا۔

(۱۳۴) پرندوں کی بیٹ، مکھی اور مچھر کے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پرندے کی بیٹ، مکھی ومچھر کا خون کپڑوں پر لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مکھی اور مچھر اور اس طرح ہر وہ چیز جس میں دم سائل (بہنے والا خون) نہ ہو، اس کا خون پاک ہے اگر کپڑوں پر لگ جائے تو اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے، اور وہ پرندے جو ماکول اللحم ہیں ان کی بیٹ پاک ہے سوائے مرغی، بطخ، مرغابی کی بیٹ کے کیونکہ وہ ناپاک ہے اور جو پرندے غیر ماکول اللحم ہیں اصح قول کے مطابق ان کی بیٹ نجاست خفیفہ ہے۔

لہٰذا اگر ربعِ ثوب (چوتھائی کپڑے) سے کم مقدار میں ہوتو معاف ہے اور اگر ربعِ ثوب سے زائد مقدار میں ہوتو اس کا دھونا ضروری ہے۔

وفی الخانية علی هامش الهندية (۱/۱۹): (خرء) مايؤكل لحمه من الطيور طاهر الاماله رائحة كريهة كخرء الدجاج والبط والاوز فهو نجس نجاسة غليظة۔

وفی الهندية (۱/۴۶): وبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف...... وذرق مايوكل لحمه من الطير طاهر عندنا مثل الحمام والعصافير... ودم البق والبراغيث والقمل والكتان طاهر وان كثر۔

وفی الدر المختار (۱/۳۱۹-۳۲۰): ودم سمك وقمل وبرغوث وبق وزاد فی السراج وكتان۔

(۱۳۵) چمگادڑ کے بول و براز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چمگادڑ کے بول و براز کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ چمگادڑ کا بول و براز پاک ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ چمگادڑ کا بول و براز ضرورت کی وجہ سے پاک ہے۔

وفی التاتارخانية (۱/۲۹۰): وبول الخفاش وخرء ه ليس بشئی لانه لايستطاع الامتناع عنه۔

وفی الدر علی هامش الطحطاوی (۱/۱۵۹): بول الخفاش وخرء ه فطاهر۔

وفی الشامية (۱/۳۱۸): بول الخفافيش وخرء ها ليس بنجس لتعذر صيانة الثوب والاوانی عنها۔

(۱۳۶) پرندوں کی بیٹ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن قبل میں گلی سے گزر رہا تھا، کہ بجلی کے تار پر بیٹھے کوے نے میرے کپڑوں پر بیٹ کردی جس کا کچھ حصہ میرے سر پر بھی آیا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا میرے کپڑے اور سر ناپاک ہو گئے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......کوے کی بیٹ نجاست خفیفہ میں سے ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر چوتھائی کپڑے یا جس عضو پر لگی ہے اس کے چوتھائی سے کم ہو اور اسی حالت میں نماز پڑھ لی جائے تو یہ نماز صحیح ہو جائے گی، اور اگر چوتھائی سے زیادہ ہو تو ان کپڑوں میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے چونکہ بیٹ وغیرہ عام طور پر ایک چوتھائی سے کم ہی ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ نے اسی حالت میں نماز پڑھ لی تو لوٹانے کی ضرورت نہیں، البتہ نماز سے پہلے موقع ملنے کی صورت میں چوتھائی سے کم ہونے کے باوجود دھولینا چاہیے۔

لمافی الهندية (۱/۴۶): (والثانی المخففة) وعفی منها مادون ربع الثوب كذافی اكثر المتون،

اختلفوا فی کیفیة اعتبار الربع قیل المعتبر ربع طرف اصابته النجاسة کالذیل والکم والدخریص ان کان المصاب ثوباً وربع العضو المصاب کالید والرجل ان کان بدناً وصححه صاحب التحفة والمحیط والبدائع والمجتبی والسراج الوهاج وفی الحقائق وعلیه الفتوی کذا فی البحرالرائق۔ وبول مایوکل لحمه والفرس وخرء طیر لایوکل مخفف هکذا فی الکنز۔

(١٣٧) مکھی نجاست پر بیٹھ کر کپڑوں پر بیٹھے تو کپڑے ناپاک ہوں گے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے تو وہاں پر موجود مکھیاں غلاظت پر بیٹھ کر انسان پر بیٹھتی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ اس غلاظت کی تھوڑی سی مقدار بھی معاف نہیں اب کیا کیا جائے، میں تو اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مکھی بیٹھ ہی جاتی ہے، تو کیا اس سے میرے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بچنے کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جس نجاست کا آپ نے ذکر کیا یہ نجاست غلیظہ کہلاتی ہے، اور اس کی تھوڑی سی مقدار جو درہم کے برابر ہو (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر) معاف ہے، اس سے زائد معاف نہیں، اور مکھیوں کے ذریعے جو نجاستِ انسان کے جسم پر لگتی ہے وہ اس سے کم ہوتی ہے لہٰذا اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

لما فی الهندیة (١/٤٧): ذباب المستراح اذا جلس علی ثوب لایفسده الا ان یغلب ویکثر۔

(١٣٨) ناپاک صابن کے استعمال کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل مشہور ہے کہ بعض وہ صابن جو غیر ملکی کمپنیاں بناتی ہیں، ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے تو کیا ایسے صابن کا استعمال کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں عام استعمال کی اشیاء میں صرف سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر واقعی یہ بات تحقیق سے ثابت ہو تو بھی صابن میں انقلاب حقیقت کی بناء پر اس کا استعمال جائز لیکن خلاف اولی ہے لہٰذا اگر کوئی ضرورت شدیدہ نہ ہو تو استعمال سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

وفی الدر المختار (١/٣١٥): (و) یطهر (زیت) تنجس (بجعله صابونا) به یفتی للبلوی کتنور رش بماء نجس لا بأس بالخبز فیه۔

وفی الشامیة (١/٣١٦): جعل الدهن النجس فی صابون یفتی بطهارته لانه تغیر والتغیر یطهر عند

محمد ویفتی به للبلوی۔

(۱۳۹) ٹینکی میں مینڈک گرنے سے ٹینکی ناپاک نہیں ہوگی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھروں میں جو ٹینکی وغیرہ بنائی جاتی ہے، اس میں بعض دفعہ مینڈک وغیرہ گر جاتے ہیں اور اس پانی میں زندہ رہتے ہیں، کیا اس سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے؟ اور اگر ناپاک ہوجائے تو پاکی کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ٹینکی میں مینڈک گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس پر کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو۔

لمافی الهندية (۲۴/۱): وموت مايعيش فى الماء فيه لا يفسده كا لسمك والضفدع والسرطان وفى غير الماء قيل غير السمك يفسده وقيل لا وهوالاصح والضفدع البحرى والبرى سواء كذا فى الهداية ... ولا فرق فى الصحيح بين ان يموت فى الماء اوخارج الماء ثم يلقى فيه كذا فى التبيين ويستوى الجواب بين المتفسخ وغيره الاانه يكره شرب الماء لانه لا يخلو عن اجزائه وهو غير ماكول كذا فى محيط السرخسى۔

وفى الدرالمختار (۱۸۴/۱-۱۸۵): (ومائى مولد) ولو كلب الماء وخنزيره (كسمك وسرطان وضفدع الا بريا له دم سائل وهو مالا سترة له بين اصابعه فيفسد فى الاصح كحية برية ان لها دم والا لا۔

وفى الشامية (فيفسد فى الاصح)وعليه فما جزم به فى الهداية من عدم الافساد بالضفدع البرى وصححه فى السراج محمول على ما لادم له سائل كما فى البحر والنهر۔

(۱۴۰) قربانی کی کھالوں پر لگے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے بعد کھالوں پر جو خون لگا ہوا ہوتا ہے اس میں بعض تو گوشت کا خون ہوتا ہے اور بعض دم مسفوح ہوتا ہے ان دونوں کا حکم ایک ہے یا الگ الگ، برتقدیر ثانی وجہ فرق کیا ہے؟ حالانکہ خون تو نجس ہوتا ہے، اور علماء کرام دم مسفوح کے علاوہ مثلاً گوشت کے خون کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر کپڑوں کو لگ جائے تو اسی میں نماز ادا کرلو نماز ہوجاتی ہے اور یہ قول بقرعید کے موقع پر فرمایا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... ان دونوں خونوں کا حکم الگ الگ ہے ہر خون نجس نہیں، نجس خون صرف دم مسفوح ہے جیسا

کہ منصوص ہے دمامسفوحا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جودم مسفوح نہیں وہ نجس نہیں۔ حدیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''احلّت لنا میتتان و دمان المیتتان الحوت والجراد والدمان الکبد والطحال '' کہ ہمارے لئے دو مردہ اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، مچھلی اور ٹڈی، جگر اور تلی۔ یہ دونوں خون جامد ہیں، دم مسفوح نہیں ہیں۔ ان کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر خون نجس نہیں بلکہ دم مسفوح نجس ہے لہٰذا جو گوشت کا خون ہے یا ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ نجس نہیں لیکن احتراز اس سے بھی بہتر ہے۔

لمافی الکلام المجید(الانعام:۱٤٥): قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

وفی مشكاة المصابيح(۳۱٦): عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم احلت لنا ميتتان ودمان الميتتان، الحوت والجراد والدمان الكبد والطحال۔

وفی الهندية (۱/۴٦): وما يبقى من الدم فی عروق المذكاة بعد الذبح لا يفسد الثوب وان فحش كذا فی فتاوی قاضيخان، وكذا الدم الذی يبقى فی اللحم لانه ليس بمسفوح هكذا فی محيط السرخسی۔

وفی الدر المختار(۱/۳۱۹): (ودم) مسفوح من سائر الحيوانات الادم شهيد مادام عليه وما بقی فی لحم مهزول وعروق وكبد وطحال وقلب ومالم يسل ودم سمك۔

(۱۴۱) کھانے پینے کی چیز میں ناک کا پانی گر جائے تو اس کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل سردی کا زمانہ ہے نزلہ کھانسی معمول بن چکا ہے مجھے بھی تین چار روز سے زکام ہے آج صبح میں ناشتہ کر رہا تھا چائے کا کپ میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا تو ایک قطرہ کپ میں گر گیا، میں نے وہ چائے گرادی تو بھائی نے کہا اس سے چائے ناپاک نہیں ہوتی تو کیا ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے اگر یہ کسی چیز میں شامل ہو جائے تو اس کا پینا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے۔ اگر کسی کھانے یا پینے والی چیز میں گر جائے تو اس سے کھانے یا پینے کی چیز ناپاک نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی کا پاک بتلانا درست ہے البتہ طبعاً ناپسند ہونے کی وجہ سے اس کا نہ پینا علیحدہ بات ہے۔

لمافی الهندية(۵/۳۳۹): ويجوز اكل مرقة يقع فيها عرق الادمی او نخامته او دمعه وكذا الماء اذا غلب

وصار مستقذرا طبعا۔ کذا فی القنیة۔

وفی الشامیة(۳۰۵/۱): (قوله وکذا کل ما یخرج لوجع الخ) ظاهره یعم الانف اذا زکم لکن صرحوا بأن ماء فم النائم طاهر ولو منتنا فتأمل۔

(۱۴۲) بلی کا کسی برتن وغیرہ میں پاؤں ڈالنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں ایک دن بالٹی میں دودھ رکھا ہوا تھا بلی نے پینے کی کوشش کی لیکن منہ دودھ تک نہیں پہنچ رہا تھا تو اس نے ایک تدبیر اختیار کی کہ اپنا پاؤں دودھ میں ڈبوکر اس کو چاٹ لیتی پھر دوبارہ داخل کر کے چاٹ لیتی اب اس دودھ کا کیا حکم ہوگا اس کو پینے یا کسی دوسرے استعمال میں لانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مذکورہ مسئلہ میں اگر کسی کو یقینی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ بلی کے منہ میں یا پاؤں پر ظاہری نجاست لگی ہوئی ہے، اور وہ اپنے پاؤں کو دودھ کی بالٹی میں ڈبوکر پھر اپنے پاؤں کو چاٹتی ہے تو اس سے بالٹی میں موجود دودھ سب نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے، اُس کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کو نجاست کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، بلکہ شک ہو، اگر اس دودھ کے مقابلے میں کوئی اور دودھ موجود ہو، تو اُس کا استعمال نہ کرنا افضل ہے اگر کسی نے استعمال کرلیا تو یہ جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۲۸۲/۱): سور طاهر مکروه تنزیهاً استعماله مع وجود غیره۔ وهو سؤر الهرة والدجاجة المخلاة الخ۔ مالم تر النجاسة فی فمها، لأنها تلازم التطواف فی المنازل، أو للضرورة وعدم إمكان الاحتراز منها۔

وفیه ایضاً(۲۸۵/۱): وسؤر ما یستعمل النجاسة: کالهرة والفأرة، فإن رئی فی أفواهها نجاسة كان كالماء الذی خالطته النجاسة، فإن تحقق طهارة أفواهها، فطاهر۔ وإن لم یعلم فیغتفر ما یعسر التحرز عنه، لکنه مکروه، وفی تنجیس مایتحرز منه قولان ارجحهما: القول بالطهارة۔

(۱۴۳) وضو کے پانی میں چیونٹی کا مرجانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے وضو کرنے کیلئے لوٹا بھر کر رکھا اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی میں ادھر چلا گیا واپس آیا تو اس پانی میں چیونٹیاں مری ہوئی تھیں میں نے ان کو نکال کر اسی پانی سے وضو کر لیا بعد میں ایک صاحب سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ فرمانے لگے جس پانی میں کوئی چیز مرجائے وہ ناپاک ہوجاتا ہے اس سے وضو کرنا

جائز نہیں۔تو کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟اور کیا میرا وضو صحیح ہو گیا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... پانی یا دیگر مائعات میں اگر کوئی ایسی چیز گر کر مرجائے جس میں بہنے والا خون نہ ہو تو اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔اس سے وضو وغیرہ کرنا صحیح ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا وضو درست ہے۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی الدر(۱/۱۰۴): اذا ثبت الحکم فی الذباب ثبت فی غیره مما هو بمعناه کالبق والزنابیر... والنمل۔

وفی الدر المختار(۱/۱۸۳): (ویجوز) رفع الحدث (بما ذکر وان مات فیه) ای الماء ولو قلیلا (غیر دموی کزنبور) وعقرب۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۲۸۹): لاینجس البئر بموت حیوان لادم له سائل کذباب وصرصور ونحوه۔

(۱۴۴) گھی میں مینگنیاں گر جانے سے گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک دن گھی کا ڈبہ کمرے میں رکھا لیکن ڈھکن بند کرنا بھول گیا ایک دو دن بعد میں نے دیکھا تو اس میں چوہے کی دو تین مینگنیاں گری ہوئی تھیں۔میں نے ان کو اسی وقت نکال دیا۔آیا یہ گھی نجس ہے یا نہیں؟اس کا کھانا اور دیگر ضروریات کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد تھا تو مینگنیاں نکال کر اور اس کے اردگرد موجود گھی نکال لینے کے بعد اس بقیہ گھی کا استعمال درست ہے۔اور اگر گھی سیال (بہنے والا) تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔البتہ بعض اہل فتویٰ نے ضرورت کی بنا پر اس کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے۔بشرطیکہ گھی کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو۔

لمافی الدر (۱/۳۱۸۔۳۱۹):وبول غیر مأکول ولو من صغیر لم یطعم إلا بول الخفاش وخرأه فطاهر وکذا بول الفأرة لتعذر التحرز عنه وعلیه الفتویٰ،

وفی الرد تحته: مبحث في بول الفارة وبعرها وبول الهرة قوله (وکذا بول الفأرة اعلم أنه ذکر في الخانیة أن بول الهرة والفأرة وخرأها نجس في أظهر الروایات یفسد الماء والثوب. ولو طحن بعر الفأرة مع الحنطة ولم یظهر أثره یعفی عنه للضرورة. وفي الخلاصة إذا بالت الهرة في الإناء أو علی الثوب تنجس وکذا بول الفأرة وقال الفقیه أبو جعفر ینجس الإناء دون الثوب اهـ

قال في الفتح وهو حسن لعادة تخمیر الأواني وبول الفأرة في روایة لا بأس به والمشایخ علی أنه نجس لخفة الضرورة بخلاف خرئها فإن فیه ضرورة في الحنطة اهـ والحاصل أن ظاهر الروایة

نجاسة الكل لكن الضرورة متحققة في بول الهرة في غيز المائعات كالثياب وكذا في خرء الفأرة في نحو الحنطة دون الثياب والمائعات . وأما بول الفأرة فالضرورة في غير متحققة إلا على تلك الرواية المارة التي ذكر الشارح أن عليها الفتوى لكن عبارة التاترخانية بول الفأرة وخرؤها نجس وقيل بولها معفو عنه وعليه الفتوى . وفي الحجة الصحيح أنه نجس ا هـ ولفظ الفتوى وإن كان آكد من لفظ الصحيح إلا أن القول الثاني هنا تأيد بكون ظاهر الرواية فافهم لكن تقدم في فصل البئر أن الأصح أنه لا ينجسه۔

وفيه ايضاً(صـ٢٢٠) فى فصل البئر فى الدر: ولا نزح فى بول الفأرة فى الاصح فيض،

فى الرد: قوله فى بول الفأرة فى الاصح وسيذكر فى الانجاس أن عليه الفتوى، وأن خرأها لا يفسد مالم يظهر أثره... أقول وفى الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأهما نجس فى أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولعلهم رجحوا القول بالعفو للضرورة۔

(۱۴۵) خنزیر کی چربی سے بنے ہوئے صابن کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو صابن یورپ سے آتے ہیں تو ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہوتی ہے تو ایسے صابن سے غسل کرنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، ان کا استعمال غسل میں جائز ہے، کیونکہ جب ایک چیز کی حقیقت بدل جائے تو اُس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔ تاہم ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔لیکن اس میں ظن یا گمان کا اعتبار نہیں اگر یقین یا ظن غالب ہے کہ خنزیر کی چربی ملی ہے تو اس کا استعمال نہ کرنا بہتر ہے ورنہ استعمال کرسکتا ہے۔

وفى رد المحتار (٣١٦/١): جعل الدهن النجس فى الصابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمد رحمه الله ويفتى به للبلوى۔ وظاهره أن دهن الميتة كذلك... ثم اعلم ان العلة عند محمد رحمه الله هى التغير وانقلاب الحقيقة وأنه يفتى به للبلوى۔

وفى الدر المختار (٣٢٦/١): (و) لا (ملح كان حمارا) أو خنزيرا ولا قذر وقع فى بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى۔

وفى الشامية تحته: (قوله لانقلاب العين) علة للكل وهذا قول محمد... وكثير من المشايخ اختاروه ، وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفى الحقيقة

بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فكيف بالكل؟ فان الملح غير العظم واللحم، فاذا صار ملحا ترتب حكم الملح، ونظيره فی الشرع النطفة نجسة وتصير علقة وهی نجسة وتصير مضغة فتطهر، والعصير طاهر، فيصير خمراً فينجس ويصير خلا فيطهر، فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها۔

(۱۴۶) نجاست کے اوپر پڑی گرد وغبار اگر کپڑوں پر لگ جائے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نجاست کے اوپر جو گرد وغبار ہے اگر وہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے تو کیا اس سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر اس گرد وغبار کے کپڑوں پر لگنے سے کپڑوں میں اس نجاست کا اثر وغیرہ ظاہر ہو جائے تو پھر کپڑے ناپاک ہوں گے ورنہ نہیں۔

لمافی قاضی خان(۱۳/۱): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم ير فيه أثر النجاسة ولو مرّ الريح على النجاسات وثمه ثوب مبلول معلق يصيبه الرّيح قيل بأنه يتنجس۔

وفی الهندية(۴۷/۱): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم يرفيه اثر النجاسة هكذا فی فتاوىٰ قاضی خان: إذا مرت الريح بالعذرات وأصابت الثوب المبلول يتنجس إن وجدت رائحة النجاسة وما يصيب الثوب من بخارات النجاسات لايتنجس بها وهو الصحيح۔

(۱۴۷) بھنگی کے ساتھ کھانے پینے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عیسائی غیر مذہب کے بھنگی کے ساتھ کھانا پینا کیسا ہے۔ بھنگی تو نجس ہوتے ہیں اور عموماً نجاست سے ان کا واسطہ رہتا ہے۔ ایک پلیٹ میں ان کے ساتھ کھانا اور اسے تواضع سمجھنا کیسا ہے؟ ہمارا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ بھی انسان ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ طہارت بھی جزء ایمان ہے لہذا اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس سوال کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں اور ہمارے درمیان موجود اختلاف کو قرآن وسنت کی روشنی میں دور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... انسان چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم اس کا بدن پاک ہے، اس میں بھنگی یا کسی اور انسان

میں کوئی فرق نہیں۔اگر بھنگی کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا کرکے ایک برتن میں اس کے ساتھ کھایا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔صرف غیر مسلم ہونے یا بھنگی ہونے کی بناء پر وہ کھانا نجس یا حرام نہ ہوگا۔کیونکہ وہ نہا،دھوکے پاک ہو چکا ہے۔البتہ مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو ہے وہ یہ کہ بلاوجہ غیر مسلموں کے ساتھ مخالطت اور کھانا پینا خدشے کا باعث ہے اور اس کے عقائد بھی متاثر ہو سکتے ہیں لہذا اگر کوئی معقول وجہ ہو اور اس کے اپنے عقائد متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو،تو اس بھنگی کو صاف ستھرا کرکے اس کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا ہے بصورت دیگر کھانے کی اجازت نہیں۔

لما فی الهندية(۵/۳۴۷):إن ابتلي به المسلم مرة أو مرتين فلا بأس به وأما الدوام عليه فيكره كذا في المحيط ۔۔۔وفي التفاريق لا بأس بأن يضيف كافرا لقرابة أو لحاجة كذا في التمرتاشي۔

وفی الدر المختار(۱/۲۲۲) (فسؤر آدمي مطلقا) ولو جنبا أو كافرا أو امرأة نعم يكره سؤرها للرجل كعكسه للاستلذاذ واستعمال ريق الغير وهو لا يجوز۔

وفی الشامية تحته: قوله (أو كافرا) لأن عليه الصلاة والسلام أنزل بعض المشركين في المسجد على ما في الصحيحين فالمراد بقوله تعالى { إنما المشركون نجس } النجاسة في اعتقادهم بحر۔ ولا يشكل نزح البئر به لو أخرج حيا لأن ذلك لما عليه في الغالب من النجاسة الحقيقية أو الحكمية كما قدمناه۔

(۱۴۸) کتے اور گدھے کا گوشت کپڑے پر لگ جانے اور اس کی خرید وفروخت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک غیر مقلد نے ہندیہ کی عبارت پیش کی اور کہا کہ حنفی مذہب میں کتے اور گدھے کا گوشت بیچنا بھی جائز ہے اور یہ ہے اس کے باطل مذہب ہونے کی دلیل وغیرہ وغیرہ۔میں نے ہندیہ کھولی اور اس میں تلاش کیا تو یہ عبارت پائی (۳/۱۱۵) وفی فتاویٰ اهل سمر قند اذا ذبح كلبه وباع لحمه جاز وكذا اذا ذبح حماره وباع لحمه......اھ تو مفتی صاحب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ آیا کتے اور گدھے کا گوشت بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ پاک ہے یا نہیں؟اس کے لگے ہونے کی صورت میں نماز کا کیا حکم ہوگا؟اگر جائز ہے تو کیا بیع کی تعریف مبادلة المال بالمال بالتراضی اس پر صادق آتی ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز نہیں تو ہندیہ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ازراہِ کرم تشفی بخش جواب قرآن وسنت کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں اولاً یہ بات ملحوظ رہے کہ بعض جانوروں کا گوشت کھانا شرعاً حلال ہے اور بعض جانوروں کا گوشت کھانا شرعاً حرام ہے بکری،گائے اور اونٹ وغیرہ حلال جانور ہیں ان کا گوشت ذبح شرعی کے بعد کھانا حلال ہے جبکہ گدھا،شیر اور کتا وغیرہ حرام جانور ہیں ان کا گوشت کھانا شرعاً حرام ہے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین رہے کہ کسی بھی جانور یا اس کے گوشت کی خرید وفروخت کے جواز کا اس جانور کے گوشت کھانے کی

حلت وحرمت سے کوئی تعلق نہیں۔ خرید وفروخت کے جواز کا تعلق اس گوشت کے پاک یا ناپاک ہونے سے ہے لہٰذا گوشت کی خرید و فروخت میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ گوشت پاک ہے یا ناپاک؟

جانور کے گوشت کے پاک ہونے کے بارے میں اصول یہ ہے کہ کسی بھی جانور میں موجود دم مسفوح (بہنے والا خون) نجس ہوتا ہے اگر اس خون کو ذبح کر کے یعنی وہ مخصوص رگیں کاٹ دی جائیں جن سے دم مسفوح (بہنے والا خون) نکل جاتا ہے تو اس جانور کا گوشت پاک ہو جاتا ہے اور اگر دم مسفوح نہ نکل سکے مثلاً گولی لگنے سے جانور مر گیا یا طبعی موت مر گیا تو پھر اس جانور کا گوشت پاک نہ ہوگا بلکہ دم مسفوح اس جانور کے گوشت میں سرایت کر جائے گا اور اسے ناپاک کر دے گا۔ بکری، گائے، گدھے وغیرہ سب کے گوشت کی پاکی یا ناپاکی میں اصول یہی ہے جو ذکر ہوا باقی بکری وغیرہ حلال جانور کے گوشت کو کھانا اس وقت حلال ہوگا جب ذبح ہو اور شرعی طریقے پر بسم اللہ پڑھ کر ہو تب وہ گوشت کھانا حلال ہوگا بصورت دیگر اگر صرف ذبح کیا گیا اور بسم اللہ پڑھ کر شرعی طریقے پر ذبح نہ کیا تو گوشت پاک ہو جائے گا لیکن کھانا حلال نہ ہوگا۔

گویا جانور کے گوشت کی پاکی یا ناپاکی کا تعلق اس میں موجود دم مسفوح کے نکلنے پر ہے اگر وہ نکل گیا تو ہر جانور کا گوشت پاک ہے اس کی خرید وفروخت جائز ہے باقی اگر کھانے کیلئے استعمال نہ ہوسکتا ہو تو دیگر فوائد اس سے حاصل کئے جاسکتے ہیں مثلاً بلیوں کو کھلانا، درندوں کو کھلانا وغیرہ، یہی ہندیہ میں لکھا ہے:

"(واما حكمه) فطهارة المذبوح وحل اكله عن الماكول وطهارة غير الماكول للانتفاء لا بجهة الاكل كذا فى محيط السرخسى" (هندية ۵/۴۸۶)

(ذبح کا حکم یہ ہے کہ) مذبوح جانور پاک ہو جاتا ہے اور ماکول جانوروں میں ان کا کھانا بھی حلال ہو جاتا ہے اور غیر ماکول جانور دیگر انتفاع کیلئے پاک ہو جاتا ہے نہ کہ کھانے کیلئے، یہ ہی محیط سرخسی میں ہے"

البتہ خنزیر اس اصول سے خارج ہے خنزیر مکمل طور پر نجس ہے اس کے کسی بھی عضو کی خرید وفروخت جائز نہیں چاہے دم مسفوح نکال لیا جائے لہٰذا صورت مسئولہ میں ذکر کردہ اصول کے مطابق کتا اور گدھا اگر ذبح کے ذریعے ان کا دم مسفوح (بہنے والا خون) نکال دیا جائے تو ان کا گوشت پاک ہے اس کا کھانا اگرچہ حلال نہیں لیکن دیگر فوائد مثلاً بلیوں کو کھلانا، درندوں کو دینا وغیرہ کیلئے اس کا استعمال اور خرید وفروخت درست ہے۔ نیز بیع کی تعریف مبادلة المال بالمال اس پر صادق آتی ہے کیونکہ یہ گوشت مال ہے نیز کسی بھی جانور کا گوشت جب ذبح سے پاک ہو جائے تو اس کا حکم پاک چیز کا ہوگا اور کپڑے یا جسم پر لگے ہونے کی صورت میں مطلقاً نماز درست ہو جائے گی اور اگر ذبح نہ کرنے کے باعث وہ گوشت ناپاک ہو جائے تو اس کا حکم نجاست کا ہوگا۔ اس کے کپڑوں وغیرہ پر لگے ہونے کی صورت میں نجاست کے احکام جاری ہوں گے اور ایک درہم سے زیادہ ہونے کی صورت میں نماز درست نہ ہوگی۔

ان صاحب کا فقہی مسائل میں یہ طرز فکر اختیار کرنا درست نہیں، اولاً مسئلے کی حقیقت اور صحیح صورت حال کا ادراک ضروری ہے اگر مسئلے پر بظاہر اشکال معلوم ہو رہا ہو تو مفتیان کرام سے دریافت کر لیا جائے وہ مسائل کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں ان معاملات

میں احتیاط سے کام لینا چاہیے کسی بھی مسئلے پر سطحی نظر کر کے اشکال بنالینا اور پھر پورے مذہب کے باطل ہونے پر استدلال کر لینا جہل مرکب اور خطرناک طرز فکر ہے مسئلے کی تفصیل ہم نے تحریر کردی کوئی اشکال کی بات ہی نہیں ہے کہ اتنی بڑی عمارت اس پر کھڑی کی جائے اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، آمین۔

لمافی التاتارخانية (۳۴۰/۸) كتاب البيوع (بيع المحرمات) "ط فاروقية": وفی فتاویٰ اهل سمرقند: اذا ذبح كلبه وباع لحمه جاز، وكذا اذا ذبح حماره و باع لحمه جاز وهذا فصل اختلف المشائخ فيه بناء على اختلافهم فی طهارة هذا اللحم بعد الذبح واختار الصدر الشهيد طهارته۔

وفی الشامية (۵۰۱/۴) كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم: قوله (مالا أو لا) المرادبالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم والتقوم يثبت بها بإباحة الانتفاع به شرعا فما يباح بلا تمول لا يكون مالا كحبة حنطة وما يتمول بلا إباحة انتفاع لا يكون متقوما كالخمر وإذا عدم الأمران لم يثبت واحد منهما كالدم بحر ملخصا عن الكشف الكبير . وحاصله أن المال اعم من المتمول لأن المال ما يمكن ادخاره ولو غير مباح كالخمر والمتقوم ما يمكن ادخاره مع الإباحة فالخمر مال لا متقوم فلذا فسد البيع بجعلها ثمنا وإنما لم ينعقد أصلا بجعلها مبيعا لأن الثمن غير مقصود بل وسيلة إلى المقصود إذ الانتفاع بالأعيان لا بالأثمان ولهذا اشترط وجود المبيع دون الثمن۔

(۱۴۹) غلہ گاہتے وقت بیلوں کے پیشاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلہ گاہنے کے وقت یعنی جب اس پر بیلوں کو چلاتے ہیں اگر بیل غلہ پر پیشاب کردے تو کیا وہ معاف ہے یعنی غلہ اس سے ناپاک ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......دیکھا جائے گا کہ اگر گندم کو تقسیم کرلیا گیا یا گندم کسی کو ہبہ کردی گئی یا گندم کی بیع کردی گئی یا اس کو کھالیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں گندم کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا اور اگر گندم کے بعض حصہ کو اندازے سے دھولیا گیا تو بھی کل گندم کی ضرورت اور رفع حاجت کو ملحوظ رکھتے ہوئے طہارت کا حکم لگایا جائے گا البتہ احوط یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو تمام گندم کو دھولیا جائے یا معین جگہ پر پیشاب نظر آئے تو اس کو دھولیا جائے۔

وفی التاتارخانية(۳۲۱/۱۔۳۲۲): ونقل عن الشيخ المعروف بخواهرزاده اذا غسل موضعا بلا تحرى يطهر وفی الخلاصة والنصاب هو المختار وفی الذخيره ونظير هذه المسئلة الحنطة التی تداس بالحمر فتبول وتروث ويصب بعض الحنطة ويختلط مااصيب منها بغيرها۔ قالوا: لوعزل بعضها

وغسل ثم خلط الکل ابیح تناولها وکذالك لوعزل بعضها ووهبها من انسان او تصدق به حل له تناول البقیة۔

وفی الدر المختار(۱/۳۲۸):(کمالوبال حمر)خصها لتغلیظ بولها اتفاقا(علی)نحو (حنطة تدوسهافقسم وغسل بعضه) او ذهب بهبة اواکل اوبیع (حیث یطهرالباق وکذا الذاهب لاحتمال وقوع النجاسةفی کل طرف۔

(۱۵۰)ناپاک چیز پانی میں گرنے کے بعداس پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناپاک چیز پانی میں گرے اوراس کے گرنے سے چھینٹیں اُڑکرکسی پرجاپڑیں توکیاوہ پاک ہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب.....صورت مسئولہ میں اگرنجاست کااثر چھینٹوں میں ظاہر ہوجائے،تو وہ ناپاک ہوجائیں گی ورنہ پاک رہیں گی۔

لمافی الهندیة(۱/۴۷): حمار بال فی الماء فأصاب من ذلك الرشاش ثوب انسان لا یمنع جواز الصلاة وان کثر حتی یستیقن انه بول وکذا لو رمیت العذرة فی الماء فخرج منها رشاش فأصاب ثوبا ان ظهر أثرها فیه یتنجس والا فلا هذا هو المختار وبه أخذ الفقیه ابو اللیث سواء کان الماء جاریا أو راکداً۔

وفی ردالمحتار(۱/۳۲۵): وفی الخانیة ماء الطابق نجس قیاساً لا استحسانا: وصورته: اذا أحرقت العذرة فی بیت فأصاب ماء الطابق ثوب انسان لا یفسده استحسانا مالم یظهر أثر النجاسة فیه۔

(۱۵۱)راستوں کی کیچڑاورناپاک پانی کی چھینٹوں کاحکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ راستوں کی کیچڑاورناپاک پانی کی چھینٹوں کا کپڑے اور بدن پر لگنے سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب.....راستوں میں چلتے ہوئے عموماً جوناپاک پانی کے چھینٹے اورکیچڑوغیرہ کپڑوں یابدن پرلگ جاتے ہیں اس میں بوجہ عموم بلوی اوردفع حرج کے حضرات فقہاء کرام نے گنجائش لکھی ہے کہ ان سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے البتہ اگر کوئی ایسی نجاست لگ جائے جونظرآرہی ہو یاظن غالب ہوکہ اس کونجاست لگی ہےتوایسی صورت میں دھوناضروری ہوگا۔نیزیادرہے کہ

یہ جواز کی صورت اس وقت ہے جب ضرورت شدیدہ ہو ورنہ عدم ضرورت شدیدہ کے وقت ایسا نہ کرنا چاہیئے بلکہ احتیاط کرنی چاہیئے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۲۸۸): روى المعلى عن محمد رحمه الله انه قال الروث لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا قيل هذا آخر أقواله ورجع الى هذا القول حين جاء مع الخليفة الى الرى ورأى اسواقهم وسككهم مملوءة من الأوراث فرجع إلى هذا القول دفعا للبلوى قال مشايخنا على قياس هذه الرواية طين بخارا لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا مع أن التراب مخلوطا بالعذرات دفعا للبلوى وفى الفتاوىٰ العتابيه مالم يرعين النجاسة۔

وفى الشامية(۱/۳۲۴) (قوله وطين شارع) مبتدأخبره قوله عفو والشارع الطريق ط وفى الفيض: طين الشوارع عفو وان ملأ الثوب للضرورة ولو مختلطا بالعذرات وتجوز الصلاة معه وقدمنا ان هذا قاسه المشايخ على قول محمد آخر بطهارة الروث والخثى ومقتضاه انه طاهر لكن لم يقبله الامام الحلوانى كما فى الخلاصة، قال فى الحلية اى لايقبل كونه طاهراً وهومتجه بل اشبه المنع بالقدر الفاحش منه الالمن ابتلى به بحيث يجئ ويذهب فى ايام الأوحال فى بلادنا الشامية لعدم انفكاك طرقها من النجاسة غالبا مع عسر الاحتراز بخلاف من لايمربها اصلا فى هذه الحالة فلا يعفى فى حقه حتى ان هذا لايصلى فى ثوب ذاك اهـ أقول والعفو مقيد بما اذا لم يظهر فيه أثر النجاسة كما نقله فى الفتح عن التجنيس ... (والحاصل ان الذى ينبغى انه حيث كان العفو للضرورة وعدم امكان الاحتراز ان يقال بالعفووان غلبت فيها النجاسة مالم يرعينها لواصابها بلا قصد وكان ممن يذهب ويجئ والافلاضرورة) وقد حكى فى القنية ايضا قولين فيما لوابتلت قدماه ممارش فى الاسواق الغالبة النجاسة ثم نقل انه لوأصاب ثوبه طين السوق أو السكة ثم وقع الثوب فى الماء تنجس۔

(۱۵۲) شیر خوار بچے کی قے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹے شیر خوار بچے کی قے پاک ہے یا ناپاک؟ اگر ناپاک ہے تو غلیظہ ہے یا خفیفہ؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر شیر خوار بچہ قے منہ بھر کر کرے تو وہ ناپاک ہوگی اور نجاست غلیظہ ہوگی اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو ناپاک نہیں ہوگی۔

وفى الهندية(۱/۴۵): الصبى اذا قاء على ثدى الام ثم مص الثدى مراراً يطهر۔

وفی تنویر الابصار مع الدر(۱/۱۳۷): (و) ينقضه (قیء ملأ فاه) ... (من مرة أوعلق أوطعام أوماء) اذا وصل الى معدته وإن لم يستقر وهو نجس مغلظ ولومن صبی ساعة ارتضاعه هو الصحيح لمخالطة النجاسة۔ذكره الحلبی۔

(۱۵۳)نجس گوشت کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کلو گوشت لے کر آیا کہ رات کے وقت پکا کر کھائیں گے میں نے اس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا تاکہ خراب نہ ہوجائے، ہوالگتی رہے چارپائی کے اوپر میرا ایک چھوٹا بچہ سورہا تھا اس نے پیشاب کردیا وہ نیچے گوشت میں گرا جس کی وجہ سے گوشت نجس ہوگیا اب اس گوشت کو پاک کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر پاک ہوسکتا ہے تو پاک کرنے کا طریقہ بیان فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......نجاست جو خشک ہونے کے بعد نظر نہ آتی ہو، جیسے پیشاب وغیرہ وہ نجاست غیر مرئی کہلاتی ہے اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا دل مطمئن ہوجائے اور یہ عموماً تین مرتبہ دھونے سے حاصل ہوجاتا ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں گوشت کو تین مرتبہ دھولیا جائے اور ہر مرتبہ اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ گوشت سے پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہوجائیں تو گوشت پاک ہوجائے گا۔

لمافی الفتاوىٰ الولوالجية(۱/۴۳): رجل على يده نجاسة رطبة فجعل يضع يده على عروة القمقمة كلماصبت الماء على اليد فاذا غسل ثلاث مرات طهرت العروة مع طهارة اليد لان نجاستها بنجاسة اليد فطهارتها بطهارة اليد۔

وفی التاتارخانية(۱/۳۰۶): (وان كانت غير مرئية) كالبول والخمر ذكر فی الاصل وقال: يغسلها ثلاث مرات ويعصر فی كل مرة فقد شرط الغسل ثلاث مرات وشرط العصر فی كل مرة... وفی القدوری ومالم يكن مرئية فالطهارة موكولة الى غلبة الظن وقدرنا بالثلاث ... الا قوله ثم التقدير ليس بلازم عندنا بالثلاث بل هو مفوض الى اجتهاده ان كان غالب ظنه انها تزول بما دون الثلاث يحكم بطهارته۔

وفی الدر المختار(۱/۳۳۴): ويطهر لبن وعسل ودبس ودهن يغلى ثلاثا ولحم طبخ بخمر يغلى وتبريد ثلاثا۔(قوله ولحم طبخ الخ) فی الظهيرية ولو صبت الخمرة فی قدر فيها لحم ان كان قبل الغليان يطهر اللحم بالغسل ثلاثا وان بعده فلا۔

(۱۵۴) بچوں کے پیشاب کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ چھوٹے بچوں کا پیشاب پاک ہے اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوتے انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے تو کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب……پیشاب علی الاطلاق نجاست مغلظہ میں سے ہے، چاہے بچوں کا ہو یا بڑوں کا ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ بقدر ایک درہم (ہتھیلی کی گہرائی کے بقدر) یا اس سے کم کپڑوں پر لگ جائے اور اس کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی البتہ معلوم ہو جانے پر اس کو بھی دھو کر نماز پڑھی جائے اور بقدر ایک درہم سے زیادہ کپڑوں پر لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز پڑھ لینے سے نماز ہی درست نہ ہوگی۔

لمافی الهندية (۴۶/۱): كل مايخرج من بدن الانسان مما يوجب خروجه الوضوء أو الغسل فهو مغلظ كالغائط والبول والمنى والمذى والودى والقيح والصديد والقى اذا ملأ الفم كذا فى البحر الرائق ــــــ وكذلك بول الصغير والصغيرة أكلا أولا كذا فى الاختيار۔

وفى المراقى الفلاح مع حاشية الطحطاوى(۱۲۳/۱): (قوله وبول مالا يؤكل لحمه) شمل بول الحية فانه مغلظ… (قوله ولو رضيعا) ولو رضيعاً لم يطعم سواء كان ذكراً أو انثى۔

(۱۵۵) ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر کی ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو کیا پانی ناپاک ہو جائے گا؟ نیز اگر گر کر مر بھی جائے تو پھر صفائی کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب……صورت مسئولہ میں چھپکلی کے ٹینکی میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ یہی حکم مرنے کی صورت میں بھی ہے۔

لمافی الهندية (۲۴/۱):وموت ما ليس له نفس سائلة فى الماء لا ينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها۔

وفى الدرالمختار (۱۸۳/۱):(ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) اى الماء ولو قليلا (غير دموى كزنبور) وعقرب وبق

وفى الشامية (غير دموى)المراد مالا دم له سائل لما فى القهستانى ان المعتبر عدم السيلان لا عدم اصله حتى لو وجد حيوان له دم جامد لا ينجس۔

(۱۵۶) اچار میں چوہیا مرجانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ گھروں میں اچار بناتے ہیں میرے گھر میں اچار کا ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا اس میں کسی طرح چوہیا چلی گئی وہ اس ڈبے کے اندر مرچکی ہے اب اس اچار کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ ہم نے اس پر کافی خرچہ کیا ہوا ہے اور محنت بھی خوب کی ہے اس کے کھانے کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سیال چیز میں اگر کوئی نجاست گر جائے تو وہ پورا کا پورا نجس ہوجاتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اچار بھی سیال چیز ہے اور اس میں چوہیا گر جانے کی صورت میں سارا اچار نجس ہوجائے گا۔ البتہ اگر اچار میں گھی جما ہوا ہے اس طور پر کہ گھی کی تہہ ہو تو پھر صرف اسکے اطراف کا نکال دینا کافی ہوگا سارا اچار نجس نہ ہوگا۔

لمافی فتح القدیر مع شرح العنایة (۸۴/۱): (ولانه لادم فیها) ای فی هذه الحیوانات اذا لدموی لا یسکن الماء والدم هو المنجس) واذا مات (فی غیر الماء) کالخل والعصیر والحلیب ونحوها۔

وفی فتح القدیر (۸۳/۱): وموت مالیس له نفس سائلة فی الماء لا ینجسه کالبق الخ ولان المنجس هو اختلاط الدم المسفوح باجزائه عند الموت الخ، کل طعام وشراب وقعت فیه دابة لیس لها دم فماتت فیه فهو حلال اکله وشربه ووضوءه۔

وفی الهندیة (۲۵/۱): فی جامع الجوامع اذا تنجس الماء القلیل بوقوع النجاسة فیه ان تغیرت اوصافه لا ینتفع به من کل وجه۔

وفی الدرالمختار (۱۸۵/۱): (وینجس) الماء القلیل (بموت مائی معاش بری مولد) فی الاصح (کبط واوز) الخ۔

(۱۵۷) گھی میں چوہا گرجائے تو گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں گھی کا ڈبہ پڑا ہوا تھا کہ رات کو کہیں سے چوہا آکر اس میں گر گیا اور چوہا بھی خاصا بڑا ہے اور گرنے کے بعد صبح کے وقت اس میں مرا ہوا تھا، اس نے اپنے طور پر نکلنے کی کوشش کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوا لہٰذا کچھ خون بھی گھی پر لگا ہوا ہے، کیا یہ سارا گھی ناپاک ہوگیا؟ اگر یہ ناپاک ہوگیا ہو تو اس کو کہاں استعمال کرسکتے ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد ہو تو چوہے کے اردگرد اور جہاں خون لگا ہوا ہو، اسے ہٹا کر باقی گھی کا استعمال جائز ہے، ہاں اگر گھی مائع (پگھلا ہوا) ہو تو پھر سارا گھی ناپاک ہوگیا، اور ایسے گھی کو کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات

میں لا سکتے ہیں جیسے چراغ جلانے کے لئے وغیرہ وغیرہ، الغرض کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات جائز ہیں۔

لمافی الهندية (۱/۴۵): الفارة لوماتت فی السمن ان کان جامدا قور ماحوله ورمی به والباقی طاهر یوکل وان کان مائعا لم یوکل وینتفع به من غیر جهة الاکل مثل الاستصباح ودبغ الجلد...

(۱۵۸) حلال جانوروں کے پیشاب کی کتنی مقدار معفو عنہ ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانور کا پیشاب کپڑوں پر لگ جائے تو کتنی مقدار سے کپڑے ناپاک شمار ہونگے؟ نیز اسی صورت میں حرام جانوروں کے پیشاب کا حکم بھی بیان فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... حلال جانوروں کا پیشاب (نجاست خفیفہ) کپڑوں پر لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی حصہ سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک شمار ہوگا، اور اگر حرام جانوروں کا پیشاب (نجاست غلیظہ) کپڑے پر لگ جائے تو اگر درہم کی مقدار (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر مقدار) سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہو گا اور اگر اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ نیز سوئی کے سرے (ناکے) کے برابر چھوٹی چھوٹی چھینٹیں کپڑے پر لگ جائیں تو اس سے کپڑا ناپاک نہیں ہوگا چاہے وہ چھینٹیں حرام جانور کے پیشاب کی ہوں یا حلال جانور کے پیشاب کی۔

لمافی الهندية (۱/۴۵-۴۶): الاول المغلظة وعفی منها قدرالدرهم ...وکذلك الخمر والدم المسفوح ولحم المیتة وبول مالا یؤکل والروث...نجاسة غلیظة ...(والثانی المخففة) وعفی منها مادون ربع الثوب ...وفی الحقائق وعلیه الفتوی...وبول ما یؤکل لحمه والفرس وخرء طیر لا یوکل مخفف۔

وفی الدر المختار (۱/۳۱۶-۳۱۸): (وعفا) الشارع (عن قدردرهم)... (وهو مثقال)... (فی)... (کثیف) له جرم (وعرض مقعر الکف)... (فی رقیق من مغلظة کعذرة)... (وبول غیر ماکول ولو من صغیر لم یطعم) الا بول خفاش وخرأه۔

(۱۵۹) دوران غسل پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جائیں تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ غسل کرتے ہوئے پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جاتی ہیں، اب اگر یہ غسل جنابت ہو تو کیا ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک ہو جائے گا؟ اگر مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق پڑتا ہو تو وہ بھی بیان فرما دیں، اللہ تعالی آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں بالٹی میں صرف چھینٹیں گرنے سے بالٹی کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن (۱/۲۵۲): ان ابن عمر رضی اللہ عنہ والبراء بن عازب رضی اللہ عنہ ادخل یده فی الطهور ولم یغسلها ثم توضأ ولم یر ابن عباس بأسا بما ینتضح من غسل الجنابة۔

وفیه ایضاً(ص۲۵۳): عن ابن عباس فی الرجل یغتسل من الجنابة فینتضح فی انائه من غسله فقال لا بأس به اخرجه ابن ابی شیبة فی المصنف۔

وفی الهندیة (۱/۲۲): جنب اغتسل فانتضح من غسله شیء فی انائه لم یفسد علیه الماء اما اذا کان یسیل منه سیلانا افسده وکذا حوض الحمام علی قول محمد لایفسده مالم یغلب علیه یعنی لا یخرجه من الطهوریة کذا فی الخلاصة۔

(۱۶۰) چائے یا پانی وغیرہ میں مکھی گرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چائے کے کپ میں مکھی گر جائے تو اس چائے کا پینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ مکھی کو غوطہ دے کر نکال دے اور چائے پی لے تو کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر چائے میں مکھی گر جائے اور اسے نکال کر پھینک دیا جائے تو چائے کا پینا درست ہے کیونکہ اس سے چائے ناپاک نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کے اندر دم مسفوح (بہنے والا خون) نہیں ہوتا اور جن اشیاء میں دم مسفوح نہیں ہو وہ ناپاک نہیں تو دوسری چیزوں میں گرنے سے ان کو ناپاک نہیں کرتیں، البتہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکھی کو چائے، سالن، پانی وغیرہ کے اندر ڈبو کر نکالنے کا حکم دیا ہے لیکن یہ آپ علیہ السلام کا اَمر ارشادی ہے، اَمر وجوبی نہیں یعنی بطور ترحم کے آپ علیہ السلام نے فرمایا اس لئے کہ کسی غریب آدمی کو دودھ ہر وقت میسر نہیں ہوتا کہیں وہ حرج میں مبتلا نہ ہوجائے لیکن اگر کسی کی طبیعت متنفر ہو رہی ہو تو وہ نہ پیئے اس لئے کہ یہ اَمر وجوبی نہیں اور نہ پینے سے وہ گنہگار نہ ہوگا اور یہی حکم تمام مشروبات کا ہے۔

وفی الهندیة(۱/۲۴): وموت مالیس له نفس سائلة فی الماء لاینجسه کالبق والذباب والزنابیر والعقارب ونحوها۔

وفی رد المحتار (۱/۲۲۲): (قوله ومثله ماء لادم له) ای سائل سواء کان یعیش فی الماء أو فی غیره عن البحر: (قوله قید للکل) أی للآدمی ومأکول اللحم ولادم له (قوله طاهر) أی فی ذاته طهور أی مطهر لغیره من الأحداث والأخباث۔

وفی أصول الشاشی(ص۲۷): وعلیٰ هذا قلنا فی قوله علیه السلام اذا وقع الذباب فی طعام أحدکم فامقلوه ثم انقلوه فان فی احدی جناحیه داء وفی الأخری دواء وإنه لیقدم الداء علی الدواء دل

سیاق الکلام علی أن المقل لدفع الأذی عنا، لا للأمر تعبدی حقا للشرع فلایکون للإیجاب۔

(۱۶۱) پکے، ناپاک فرش کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو کیا خشک ہونے سے وہ پاک ہوجائے گا یا پانی سے دھونا ضروری ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو اس کو پاک کرنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خشک ہونے سے وہ پاک ہوجائے گا بشرطیکہ نجاست کا اثر [رنگ اور بو وغیرہ] بھی زائل ہوجائے[1]، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پر پانی ڈال کر ملیں اور کپڑے سے خشک کیا جائے اس طرح تین مرتبہ کرنے سے وہ پاک ہوجائے گا، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت زیادہ پانی ڈال کر چھوڑ دیں یہاں تک کہ نجاست کی بو اور رنگ باقی نہ رہے پانی خشک ہوجائے تو زمین پاک ہوجائے گی۔

البتہ پہلے طریقے میں اس پر نماز پڑھنا تو جائز ہے لیکن تیمم کرنا جائز نہیں، اور خشک ہونے کے بعد اس پر دوبارہ پانی آنے کی صورت میں بھی نجاست لوٹ کر نہیں آئے گی۔

وفی الھندیة(۱/۴۳) : الارض اذا تنجست ببول واحتاج الناس الی غسلها فان کانت رخوة یصب الماء علیها ثلاثا فتطهر وان کانت صلبة قالوا یصب الماء علیها وتدلك ثم تنشف بصوف أوخرقة یفعل کذالك ثلاث مرات فتطهر وان صب علیها ماء کثیر حتی تفرقت النجاسة ولم یبق ریحها ولا لونها وترکت حتی جفت تطهر کذا فی فتاویٰ قاضی خان۔

وفی الدرالمختار(۱/۳۱۱).:(و) تطهر (أرض) بخلاف نحو بساط (بیبسها) أي جفافها ولو بریح (وذهاب أثرها کلون) وریح (ل) أجل (صلاة) علیها (لا لتیمم) بها لأن المشروط لها الطهارة وله الطهوریة۔

وفی الشامیة (۱/۳۱۱): (قوله بیبسها) لما فی سنن أبي داؤد باب طهور الارض اذا یبست وساق بسنده عن ابن عمر رضی اللہ عنہ " قال کنت أبیت فی المسجد فی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وکنت شابا عزبا وکانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد ولم یکونوا یرشون شیئا من ذلك" ولو أرید تطهیرها عاجلا یصب علیها الماء ثلاث مرات وتجفف فی کل مرة بخرقة طاهرة وکذا لوصب علیها الماء

[1] پچھلے ایڈیشن میں اس مقام پر تسامح ہوا تھا اور اثر زائل ہونے کی قید نہیں لگائی گئی تھی جبکہ یہ قید بھی مسئلہ میں ملحوظ ہے لہذا اس ایڈیشن میں تصحیح کردی گئی ہے۔ از مرتب

بكثرة حتى لا يظهر أثر النجاسة۔۔۔۔۔۔۔۔ يفهم من قول البحر صب عليها الماء كثيراً ثم تركها حتى نشفت طهرت أنه نجس۔

وفی الدر المختار(۱/۳۱۴):ثم هل يعود نجسا ببله بعد فركه؟ المعتمد لا، وكذا كل ما حكم بطهارته بغير مائع۔

وقال ابن عابدين رحمه الله تحته: (قوله بغير مائع) ای كالدلك فی الخف. والجفاف فی الارض...

... ومقتضاه أن الخف لو وقع فی ماء قليل لا ينجسه... وقدمنا أن الآجرة اذا تنجست فجفت ثم قلعت فالمختار عدم العود۔

(۱۶۲)کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے اور گھروں کے اردگرد فصلیں ہوتی ہیں ہم ان میں جا کر پیشاب کرتے ہیں ایک دن ایک مولانا صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے۔تو اب پوچھنا یہ ہے کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......قضاء حاجت کیلئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیئے جس میں ستر کا مکمل اہتمام ہو، اور کسی کی ایذا رسانی نہ ہوتی ہو، اور نہ ہی کسی محترم چیز کی بے حرمتی ہو، کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے، لیکن اگر کھیتوں میں کسی ایسی جگہ پر قضاء حاجت کی جائے جس میں ستر کا اہتمام ہو، اور فصل کی تلویث کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ ہی کسی کی ایذا رسانی کا سبب بنے تو اس صورت میں کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کی گنجائش ہے۔

لما فی الهندية (۱/۵۰): ويكره على طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين أو تحت شجرة مثمرة أو فی ذرع۔

وفی الدر المختار(۱/۳۴۲)): وعلى طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين او تحت شجرة مثمرة أو فی ذرع۔

(۱۶۳)استعمال شدہ کمبل، کپڑے وغیرہ کو بغیر دھوئے استعمال کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل لائٹ ہاؤس وغیرہ پر گرم کمبل سوئیٹر، جرسیاں وغیرہ جو ملتی ہیں انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... استعمال شدہ اشیاء (مثلاً گرم کمبل، سوئیٹر، جرسیاں اور کپڑے وغیرہ) جو مختلف جگہوں پر سستے داموں ملتی ہیں اگر یہ کفار کی استعمال کردہ ہوں تو جب تک ان کے ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب نہ ہو، انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا درست ہے تاہم دھو کر استعمال کرنا بہرحال اولیٰ اور بہتر ہے۔

لمافی الولوالجیة(۱/۴۶): لا بأس بلبس ثیاب اهل الذمة والصلوٰة فیها واما الازار والسراویل فانها تکره الصلوٰة فیهما مالم یغسلا فی قول ابی حنیفة و محمد وقال ابو یوسف اجزاه بلاکراهة امّا الجواز فی الکل فلان الطهارة فی الثیاب اصل ولیس فی حالة الکفر ما یوهم نجاسة ثیابهم فلهذه العلة لم یکره ابو یوسف فی الازار والسراویل وهما کرها۔

وفی الدر المختار(۱/۳۵۰): ثیاب الفسقة واهل الذمة طاهرة

(وفی الشامیة تحته) :الاصح انه لایکره لانه لم یکره من ثیاب اهل الذمة الاالسراویل مع استحلالهم الخمر، فهذا اولیٰ اھ۔

(۱۶۴) نجاست سے کپڑے کو پاک کرنے کے بعد اگر داغ رہ جائے تو کپڑے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو احتلام ہوا صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا اور شلوار کو تین بار دھویا لیکن اس سے منی کے داغ نہیں اترے آیا یہ شلوار پاک ہوگی؟ اس کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... کپڑوں پر اگر نجاست لگ جائے اور وہ نجاست ٹھوس ہو تو دھونے سے اگر اس کی عین زائل ہو جائے کپڑے پاک ہوں گے اگرچہ اس کا اثر (بو، رنگ) باقی رہ جائے جس کے دور کرنے میں مشقت ہو، اور بغیر صابن یا گرم پانی کے دور نہ ہوسکتا ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کپڑوں سے منی دھونے کے بعد اگر اس کا کوئی داغ یا اثر رہ جائے تو بھی کپڑے پاک ہوں گے اور اس میں نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۱۰): والمراد بالأثر اللون والریح فان شق إزالتهما سقطت وتفسیر المشقة أن یحتاج فی إزالته إلی استعمال غیر الماء کالصابون والأشنان أو الماء المغلی بالنار کذا فی السراج۔

وفی الدر المختار(۱/۳۱۲): (ویطهر منی) أی محله (یابس بفرك) ولا یضر بقاء اثره... (والا) یکن یابسا... (فیغسل)

وفی الشامیة تحته: (قوله ولا یضر بقاء اثره) أی کبقائه بعد الغسل بحر۔

(۱۶۵) ناپاک کپڑوں کو بالٹی وغیرہ میں ڈال کر ٹونٹی سے پانی جاری کر دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ اکثر اوقات گھر سے باہر سفر میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے کپڑے وغیرہ بندے کو خود دھونے پڑتے ہیں۔تو ایک دن میں کپڑے دھورہا تھا میری عادت یہ ہے کہ جو کپڑے ناپاک ہوں تو میں ان کو تین مرتبہ دھوتا ہوں اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑتا ہوں، میرا ایک طالبعلم ساتھی میرے پاس آیا، تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ خواہ مخواہ میں تین مرتبہ کپڑے دھونے میں اور ہر مرتبہ کپڑے نچوڑنے میں اپنے کو تھکاتے ہیں، ایسا کریں کہ کپڑے بالٹی میں ڈال کر اس پر ٹونٹی کھول دیا کریں۔ جب بالٹی بھر جائے اور پانی اس سے چھلکنے لگ جائے اور کچھ نہ کچھ پانی بہہ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی۔لیکن میں نے کہا اگرچہ میرا یہ ساتھی دین پڑھ رہا ہے لیکن ہے تو طالبعلم کوئی عالم مفتی تو نہیں، کیوں نہ میں تھوڑی تکلیف اٹھا کر مفتی صاحب سے معلوم کرلوں، تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے۔تو مفتی صاحب آپ بتائیں کہ واقعتا جب پانی تھوڑا سا بالٹی کے سائیڈوں (اطراف) سے گرنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے یا جو بھی صحیح صورتحال ہو اس کو واضح بیان فرمائیں، آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... کپڑوں کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ شرعاً یہ ہے کہ اگر نجاست مرئیہ ہو یعنی نظر آنے والی اور ذی جرم ہو (جس کا ٹھوس وجود ہو) تو اس عین نجاست کو زائل کرنے سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں خواہ ایک مرتبہ پانی بہانے سے زائل ہو جائے۔ کیونکہ پاکی سے مراد نجاست کو دور کرنا ہوتا ہے اور اس صورت میں یہ پایا جاتا ہے، اور اگر نجاست غیر مرئیہ ہو یعنی نظر نہ آنے والی ہو جیسے مائعات کی نجاستیں تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کپڑوں کو کسی برتن میں دھویا جائے تو یہ ضروری ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے اور نچوڑا جائے۔ البتہ اگر کپڑوں کو ماء جاری جیسے نہر وغیرہ کے پانی میں یا وہ پانی جو ماء جاری کے حکم میں ہو میں دھویا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے کہ بالٹی یا کسی اور برتن میں کپڑوں کو ڈال دیا جائے اور پھر یہاں تک پانی ڈالا جائے اور اتنا پانی بہہ جائے کہ دھونے والے کو غالب گمان ہو کہ اب نجاست نکل چکی ہے۔ اس صورت میں یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہو جائے گا اور کپڑوں کو نچوڑنا بھی ضروری نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے طالبعلم ساتھی کا یہ کہنا تو درست ہے کہ جب بالٹی وغیرہ سے پانی بہنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے اور نچوڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن یہ ضروری ہے کہ اتنا پانی بہہ جائے کہ نجاست نکل جانے کا ظن غالب ہو جائے۔

لما فی مراقی الفلاح (ص۱۲۹): (ویطهر) محل النجاسة (غیر المرئیة بغسلها ثلاثا) وجوبا وسبعاً مع التتریب ندباً فی نجاسة الکلب خروجاً من الخلاف (والعصر کل مرة) تقدیراً لغلبة الظن فی استخراجها فی ظاهر الروایة وفی روایة یکتفی بالعصر مرة وهو أوفق ووضعه فی الماء الجاری

يغني عن التثليث والعصر كالاناء اذا وضعه فيه فامتلأ وخرج منه طهر۔

وفى حاشية الطحطاوى على مراقي الفلاح: قوله ووضعه فى الماء الجارى الخ يعنى اشتراط الغسل والعصر ثلاثا انما هو اذا غمسه فى إجانة، اما اذا غمسه فى ماء جار حتى جرى عليه الماء او صب عليه ماء كثيراً بحيث يخرج ما أصابه من الماء ويخلفه غيره ثلاثا فقد طهر مطلقاً بلا اشتراط عصر وتجفيف، وتكرار غمس هو المختار والمعتبر فيه غلبة الظن هو الصحيح۔

وفى الشامية(١/٣٣٣): تحت قوله اما لو غسل الخ۔ أن المعتبر فى تطهير النجاسة المرئية زوال عينها ولو بغسلة واحدة ولو فى اجانة كمامر فلا يشترط فيها تثليث غسل ولا عصر، وأن المعتبر غلبة الظن فى تطهير غير المرئية بلا عدد على المفتىٰ به... ولا شك ان الغسل بالماء الجارى وما فى حكمه من الغدير أو الصب الكثير الذى يذهب بالنجاسة اصلاً ويخلفه غيره مراراً بالجريات اقوى من الغسل فى الاجانة التى على خلاف القياس، لأن النجاسة فيها تلاقى الماء وتسرى معه فى جميع اجزاء الثوب فيبعد كل البعد التسوية بينهما فى اشتراط التثليث۔

(قوله فى غدير) اى ماء كثير له حكم الجارى (قوله أو صب عليه ماء كثير) اى بحيث يخرج الماء ويخلفه غيره ثلاثاً لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر، هو الصحيح۔

(۱۶۶) نجس کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ نیز نجس کپڑے کو دھوپ سے خشک کرنے کے بعد پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، نیز اگر نجس کپڑے کو دھوپ میں سکھا دیا جائے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ نچوڑا جائے اس طور پر کہ پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہو جائیں نجس کپڑا دھوئے بغیر محض دھوپ میں سکھانے سے پاک نہیں ہوگا۔

لمافى بدائع الصنائع(١/٢٣٩): واما سائر النجاسات اذا اصابت الثوب أوالبدن و نحوهما فانها لا تزول الا بالغسل سواء كانت رطبة اويابسة وسواء كانت سائلة او لها جرم۔

وفى الهندية(١/٤٢): ان غسل ثلاثا فعصر فى كل مرة ثم تقاطرت منه قطرة فأصابت شيأ ان عصره فى المرة الثالثة وبالغ فيه بحيث لوعصره لايسيل منه الماء فالثوب واليد وما تقاطر طاهر

والا فالكل نجس۔

(۱۶۷) ناپاک جوتا پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر راستے میں چلتے ہوئے کسی کے جوتے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کیلئے دھونا ضروری ہے یا کپڑے سے صاف کر دینا کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جوتے پر لگنے والی نجاست خواہ جسم رکھنے والی ہو (مثلاً پاخانہ، خون، لید وغیرہ) یا جسم رکھنے والی نہ ہو (مثلاً شراب، پیشاب وغیرہ) اگر اسے زمین سے رگڑ دیا جائے یا کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کرلیا جائے اس طرح کہ نجاست کا اثر اور بدبو باقی نہ رہے تو وہ جوتا اصح قول کے مطابق پاک ہو جائے گا پھر اسے دھونا ضروری نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۴۴): الخف إذا أصابته النجاسة إن كانت متجسدة ...إذا مسحه على وجه المبالغة بحيث لايبقى لها أثر يطهر وعليه الفتوىٰ لعموم البلوىٰ كذا فى فتاوى قاضيخان وإن لم تكن النجاسة متجسدة ... إذا التصق بها مثل التراب أو ألقى عليها فمسحها يطهر وهو الصحيح هكذا فى التبيين وعليه الفتوىٰ للضرورة كذا فى معراج الدراية۔

وفى الدر المختار(۱/۳۰۹ـ۳۱۰): (ويطهر خف ونحوه) كنعل (تنجس بذى جرم) هو كل مايرى بعد الجفاف ولو من غيرها كخمر وبول أصابه تراب به يفتى بدلك يزول به أثرها۔

(۱۶۸) اسٹیل یا پلاسٹک کے نجس برتن پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل گھروں میں عام طور پر اسٹیل یا پلاسٹک کے برتن استعمال ہوتے ہیں بسا اوقات ان پر کوئی نجاست لگ جاتی ہے اور یہ ناپاک ہو جاتے ہیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اسٹیل اور پلاسٹک کے برتن اگر چکنے ہوں اور کھردرے نہ ہوں ان پر نجاست لگ جائے، تو وہ پانی، مٹی یا صاف کپڑے سے پونچھنے سے بھی پاک ہو جائیں گے جبکہ نجاست زائل ہو جائے اگر وہ برتن کھردرے یا اُبھرے ہوئے ہوں تو پانی سے دھوئے بغیر وہ پاک نہ ہوں گے۔

لمافى البحر الرائق(۱/۳۹۰ـ۳۹۱): (ونحو السيف بالمسح) اى يطهر كل جسم صقيل لامسام له بالمسح جديد اكان أو غيره فخرج الجديد إذا كان عليه صدأ أو منقوشا فانه لا يطهر الا بالغسل ... وزاد فى السراج الوهاج العظم والآبنوس وصفائح الذهب والفضة اذا لم تكن منقوشة...الخ۔

وفى الهندية(۱/۴۳): (ومنها المسح) اذا وقع على الحديد الصقيل الغير الخشن كالسيف والسكين

والمرآة ونحوها لنجاسة من غير أن يموه بها فكما يطهر بالغسل يطهر بالمسح بخرقة طاهرة...
ولا فرق بين الرطب واليابس ولا بين ماله جرم وما لا جرم له ... الخ۔
وفی الدر المختار(۱/۳۱۰): ویطهر (صقيل) لامسام له (كمرآة) وظفر وعظم وزجاج وآنية مدهونة أوخرّاطى وصفائح فضة غير منقوشة بمسح يزول به اثرها مطلقا وبه يفتى۔

(۱۶۹) کتاب کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن گھر میں مطالعہ کررہا تھا اچانک کسی کام کیلئے جانا ہوا تو کتاب تپائی پر چھوڑ کر چلا گیا ادھر کہیں سے گھومتا پھرتا میرا بیٹا اس کمرے میں آ پہنچا اس نے کتاب اٹھالی اس سے کھیلتا رہا آخر میں اس پر پیشاب کردیا اب اس کتاب کو کس طرح پاک کریں گے جبکہ دھونے کی صورت میں کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں چونکہ پانی سے دھونے سے کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے کسی اور ایسی پاک مائع چیز سے دھولیں جو نجاست کو دور کردے اور اس سے کتاب خراب نہ ہو، جیسے پیٹرول وغیرہ۔

وفی اعلاء السنن(طبع ادارة القرآن والعلوم)(۱/۴۰۶): كانت إحدانا تغسل دم الحيضة بريقها تقرضه بظفرها

وفی اعلاء السنن (۱/۴۰۵): قوله عن عائشة رضى الله عنها قلت يستنبط منه جواز ازالة النجاسة بغير الماء فان الدم نجس وهو اجماع المسلمين ويستنبط منه أن إزالة النجاسة لا يشترط فيها العدد بل المراد الإنقاء قاله العينى...

وأصرح منه مافى رواية عبدالرزاق...... جعلت رضى الله عنها ذالك غسلاً۔

وفی المختصر المقدوری(ص۲۶): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالتها به كالخل وماء الورد۔

وفی ملتقى الابحر(۱/۴۶): يطهر بدن المصلى... وبكل مائع طاهر مزيل كالخل وماء الورد...
وقال فی الحاشية المسماة بالتعليق الميسر ومثله البنزين والكاز لا نهما مزيلان الخ۔

وفی الشامية(۱/۳۰۹): (وبكل مائع) أى سائل فخرج الجامد الخ (قوله طاهر) فبول ما يوكل لا يطهر الخ قالع) أى مزيل الخ (قوله ينعصر بالعصر) تفسير لقالع الخ۔

(۱۷۰) ناپاک روئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں روئی رکھی ہوئی تھی کہ اس کے اوپر میرے بچے نے پیشاب کر دیا تو اب روئی کو کس طرح پاک کیا جائے جبکہ دھونے سے وہ خراب ہو جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نجس چیزوں کو پاک کرنے کا افضل طریقہ تو یہ ہے کہ ان کو پانی سے دھویا جائے، اور دھونے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، تو فقہاء کرام نے جو متبادل طریقے بتائے ہیں ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے، جیسا کہ روئی کے پاک کرنے میں فقہاء کرام نے متبادل طریقہ بتایا ہے کہ اس کو دھنوایا جائے۔ البتہ روئی کی اگر کل مقدار کا نصف یا نصف سے زیادہ حصہ ناپاک ہو جائے تو دھننے سے پاک نہیں ہوگا، اور اگر نصف سے کم حصہ ناپاک ہے تو دھننے سے پاک ہو جائے گا۔

لما فی الهندية(۱/۴۵): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجسا لا يطهر وان كان يسيرا بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارة كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته۔

وفی الشامية (۱/۳۱۴): وانما يجوز الانتفاء لو قوع الشك فی بقاء النجاسة فی الموجود، وكذا الندف ومن عده شرط كون النجس مقدارا قليلا يذهب بالندف والا فلا يطهر۔

(۱۷۱) روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم صاحب سے سنا ہے کہ روئی دھنوانے سے پاک ہو جاتی ہے؟ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس میں کچھ شرائط بھی ہیں یا بس مطلق دھنوانے سے پاک ہو جائے گی۔ اصل میں ہمارے گھر میں بھی کچھ روئی لحاف بنوانے کیلئے رکھی ہوئی تھی، اس پر میرے بھتیجے نے پیشاب کر دیا ہے۔ اب ہم پریشان ہیں کیا کریں؟ نیز ایک بات اپنی معلومات میں اضافے کیلئے پوچھنا ہے کہ آخر روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی کیا علت ہے؟ براہ کرم مدلل ومفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......ناپاک روئی کا حصہ اگر کل روئی کا آدھا یا اس سے زیادہ ہے تو دھنوانے سے پاک نہیں ہوگا البتہ اگر آدھے سے کم ہے اور یہ احتمال ہے کہ دھنوانے سے ناپاک حصہ اڑ جائے گا تو وہ روئی دھنوانے سے پاک ہو جائے گی لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھتیجے کے پیشاب کی وجہ سے روئی اگر آدھی سے کم ناپاک ہوئی ہے تو وہ دھنوانے سے پاک ہو جائے گی۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے صراحتاً اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی کہ روئی دھنوانے سے پاک کیوں ہوتی ہے البتہ ان کے اس قول کہ "اگر نجاست تھوڑی ہو، اور دھنوانے سے اس کے چلے جانے کا احتمال ہو، تو پاکی کا حکم لگایا جائے گا" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روئی کو جب دھنوایا

جائے گا تو اس کا کچھ حصہ اڑ جائے گا اور جو حصہ اڑا ہے احتمال ہے کہ اس میں نجاست ہو اور بقیہ روئی پاک ہو اسی احتمال کی بنا پر پاکی کا حکم لگایا جائے گا آجکل بھی روئی والوں سے معلوم کرنے پر یہ بات علم میں آئی کہ روئی دھنوانے سے اس کا کچھ حصہ اڑ جاتا ہے اور اس کو دھو کر پاک کرنے کی بھی صورت نہیں کیونکہ یہ دھونے سے خراب ہو جاتی ہے اس کی نظیر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر گندم کا ڈھیر نجس ہو جائے اور اس کو زمیندار اور کسان میں تقسیم کر دیا جائے تو سارے ڈھیر پر پاکی کا حکم لگایا جائے گا کیونکہ تقسیم کی بنا پر ہر حصہ میں یہ احتمال ہے کہ نجاست اس حصہ میں نہ ہو بلکہ دوسرے حصہ میں ہو، اسی احتمال کی وجہ سے ہر حصہ کی طہارت میں شک واقع ہو گیا لیکن چونکہ اشیاء میں اصل طہارت ہے اس لئے سارے ڈھیر پر طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح ناپاک روئی کو جب دھنوایا گیا تو بعض روئی کے اڑ جانے کی وجہ سے یہ احتمال واقع ہو گیا کہ بقیہ روئی پاک ہے یا نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ ناپاک روئی اڑی ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاک روئی اڑی ہو، اسی احتمال کی وجہ سے بقیہ روئی کی طہارت میں شک واقع ہو گیا لیکن چونکہ اکثر روئی پاک ہے اس لئے بقیہ روئی پر بھی پاکی کا حکم لگایا جائے گا۔

لمافی النهر الفائق(١/١٣٦): وأما القسمة وما بعدها فلأن النجاسة باقية ايضاً وانما جاز الانتفاع لوقوع الشك فى الموجود ابقيت النجاسة فيه أم لا ألا ترى أن الذاهب لو عاد عادت النجاسة وعلى هذا فلا ينبغى عد الندف ايضا ومن عده شرط ان يكون النجس مقداراً قليلاً يذهب بالندف أما لو كان كالنصف ونحوه فلا يطهر به۔

وفى خلاصة الفتاوى(١/٤٣): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر اما اذا كان النجس شيأ يسيراً بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارته كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهاقين والعامل يحكم بطهارته۔

وفى الهندية(١/٤٥): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر وإن كان يسيراً بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارته كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته كذا فى الخلاصة۔

(١٧٢) ڈبلیوسی کے اندر گھڑی گرنے کی صورت میں پاک کرنے کا طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری گھڑی بیت الخلاء کے ڈبلیوسی میں گر گئی تھی جسے میں نے تھیلی پہن کر نکال لیا ہے، اب میں اسے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے پاک کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ برائے کرم جلد از جلد رہنمائی فرماویں۔

الجواب بعون الملک الوھاب..... ڈبلیوسی کے اندر عام طور پر ناپاک پانی ہوتا ہے اسلئے چین والی گھڑی یا چمڑے کے پٹے والی گھڑی اس میں گرنے کی صورت میں صرف نجاست اور اس کے اثر کو دور کرنا کافی ہوگا اگر گھڑی ایسے پٹے والی ہے کہ جس میں نجاست کے

اثرات بیٹھ جاتے ہیں تو اسے تین مرتبہ دھونا ضروری ہوگا اور دونوں صورتوں میں اگر دھونے کی وجہ سے گھڑی کے خراب ہونے یا زنگ وغیرہ لگ جانے کا احتمال ہو تو کسی ایسی پاک مائع چیز جو نجاست کے اثر کو دور کردے اور اس سے یہ خرابی پیدا نہ ہو، مثلاً پٹرول وغیرہ سے بھی دھولینا کافی ہوگا۔

لمافی الهندية (١/٤١): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالتها به...... وان كانت مرئية بازالة عينها وأثرها ان كانت شيأ يزول اثره ولا يعتبرفيه العدد كذا فی المحيط فلو زالت عينها بمرة اكتفى بها۔(وفی ص٤٢): وإن كانت غير مرئية يغسلها ثلاث مرات۔

وفی الشامية (١/٣٠٩) : (قوله وبه يفتى) أى خلافا لمحمد لانه لايجيز ازالة النجاسة الحقيقية الابالماء المطلق۔بحر

(١٧٣) روئی اور فوم کے ناپاک گدے پاک کرنے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر گھروں میں لوگ روئی یا فوم والے گدے استعمال کرتے ہیں ہر گھر میں بچے بھی موجود ہوتے ہیں وہ ان کے اوپر پیشاب وغیرہ کرتے رہتے ہیں اگر یہ گدے ناپاک ہوجائیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جن چیزوں میں نجاست جذب ہوجاتی ہے ان کی دو صورتیں ہیں، ان کو نچوڑا جاسکتا ہوگا یا نہیں، اگر نچوڑا جاسکتا ہے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑا جائے اور جن چیزوں کو نچوڑا نہیں جاسکتا ان کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو بھی تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈال دیا جائے یہاں تک کہ اس سے قطرے ٹپکنا بند ہوجائیں، مذکورہ دونوں صورتوں میں اگر وہ چیز جس پر نجاست لگی ہوئی ہے، اگر اس کو بہتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے یہاں تک کہ غالب گمان اس کے پاک ہونے کا ہوجائے تو اس سے بھی وہ چیز پاک ہوجاتی ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں روئی اور فوم کے گدوں کا نچوڑنا اگر ممکن نہیں تو ان کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈالدیا جائے یہاں تک کہ قطرے ٹپکنا بند ہوجائیں یا پائپ وغیرہ سے ان پر اتنا پانی بہادیا جائے کہ پاک ہونے کا غالب گمان حاصل ہوجائے تو پاک ہوجائیں گے۔

لمافی البحر الرائق(١/٤١٣): قوله (وبتثليث الجفاف فيما لا ينعصر) اى مالا ينعصر فطهارته غسله ثلاثا وتجفيفه فی كل مرة لان للتجفيف اثرا فی استخراج النجاسة وهو ان يتركه حتى ينقطع التقاطر ولا يشترط فيه اليبس۔

وفی الشامية(١/٣٣٢): حاصله كما فی البدائع ان المتنجس اما ان لا يتشرب فيه اجزاء

النجاسة اصلا... او يتشرب فيه قليلا... او يتشرب كثيرا ففى الاول طهارته بزوال عين النجاسة المرئية او بالعدد على ما مرو فى الثانى كذالك... واما فى الثالث، فان كان مما يمكن عصره كالثياب فطهارته بالغسل والعصر الى زوال المرئية وفى غيرها بتثليثها وان كان ممالا ينعصر كالحصير المتخذ من البردى ونحوه ان علم أنه لم يتشرب فيه بل اصاب ظاهره يطهر بازالة العين او بالغسل ثلاثا بلا عصروان علم تشربه... فعند محمد لا يطهر ابدا وعند ابى يوسف ينقع فى الماء ثلاثا ويجفف كل مرة والاول اقيس والثانى اوسع اهـ وبه يفتى درر۔

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱/۳۳۵): واما ان كان مما لايعصر كالحصير والسجاد والخشب: فينقع فى الماء ثلاث مرات ويجفف فى كل مرة وهو قول ابى يوسف وهو الرأى الراجح وقال محمد لا يطهر ابداً۔

وفيه ايضاً(۱/۳۳۷): وقد اتفق الحنفية مع غيرهم على ان المتنجس اذا غسل فى ماء جار او غدير (اى ماء كثير له حكم الجارى) او صب عليه ماء كثير او جرى عليه الماء طهر مطلقا بلا شرط عصر وتجفيف وتكرار غمس لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر۔

(۱۷۴)ناپاک قالین کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو سلسل بول کی بیماری ہے ایک روز وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ قالین پر پیشاب کے قطرات گر گئے تو اس نے اس پر گیلا کپڑا لگا کر صاف کر دیا تو کیا اس طرح کرنے سے قالین پاک ہو گیا یا دھونا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......قالین چونکہ ایسی چیز ہے جو کہ نجاست کے اثرات کو جذب کر لیتی ہے اور اس کو عام طور پر نچوڑنا بھی ممکن نہیں ہوتا اس لئے یہ گیلا کپڑا پھیر دینے سے پاک نہ ہوگا بلکہ اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اتنے وقفے وقفے سے تین مرتبہ اسے اس طرح دھویا جائے گا کہ ہر مرتبہ اس سے قطرے گرنا بند ہو جائیں اور جب تین مرتبہ مذکورہ طریقے سے دھو لیا جائے گا تو پھر وہ پاک ہو جائے گا۔

لمافى الهندية(۱/۴۲): مالاينعصر يطهر بالغسل ثلاث مرات والتجفيف فى كل مرة لان للتجفيف أثرا فى استخراج النجاسة۔

وفى الدر المختار(۱/۳۳۱): (غيرها) أى غير مرئية(بغلبة ظن غاسل)۔۔۔۔۔۔ (طهارة محلها)بلا عدد به يفتى(وقدر)۔۔۔۔۔۔(بغسل وعصر ثلاثاً)أو سبعا(فيما ينعصر)۔۔۔۔۔۔ (و) قدر

(بتثليث جفاف) أى انقطاع تقاطر (في غيره) اى غير منعصر۔

(۱۷۵) دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنویں کی طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دریائی مینڈک کنویں میں گر جائے تو طہارت کا کیا حکم ہے؟ کیا دریائی مینڈک کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک ہوجاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ اس پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو، اور اگر اس پر نجاست لگی ہو تو کنواں ناپاک ہوجائے گا اور سارے پانی کا نکالنا ضروری ہوگا اور کنویں کے چشمہ دار ہونے کی صورت میں جب سارا پانی نکالنا ناممکن ہو، تو تین سو ڈول نکال لیے جائیں تو وہ کنواں پاک ہوجائے گا۔

لما في الهندية (۱/۱۹): واذا وجب نزح جميع الماء ولم يمكن فراغها لكونها معينا ينزح مائتا دلو كذا في التبيين وهذا أيسر كذا في الاختيار شرح المختار والأصح أن يؤخذ بقول رجلين لهما بصارة في أمر الماء فاى مقدار قالا انه في البئر ينزح ذلك القدر وهو أشبه بالفقه۔

وفي الدر المختار (۱/۲۱۱): (اذا وقعت نجاسة) ليست بحيوان ولو مخففة أو قطرة بول اودم -------(ينزح كل مائها)۔

وفيه ايضا (۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر مافيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى۔ وقيل يفتى بمائة الى ثلاث مائة وهذا أيسر وذالك أحوط۔

(۱۷۶) دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہوں، کیا دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پاک ہوتے ہیں؟ اور اگر کپڑے گھر میں دھوئے جائیں تو ان میں سے بعض پاک اور بعض ناپاک ہوتے ہیں اب جب انہیں ایک ساتھ دھویا جائے گا تو دھونے کے بعد ہر کپڑے کو تین دفعہ دھونا ضروری ہے؟ اگر تین دفعہ دھونا ضروری ہو تو جب ایک کپڑے کو پانی میں ڈال دیا تو اسے نکالنے کے بعد دوسرے کپڑے کو اسی پانی میں دھو سکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......کپڑے دھونے کی دو صورتیں ہیں، پہلی یہ کہ کپڑے کسی بڑے حوض یا بہتے ہوئے پانی میں دھوئے جائیں یا ان کے اوپر سے پانی بہایا جائے تو ایسی صورت میں اگر نجاست دکھائی دینے والی ہے تو نجاست کے زائل ہونے سے

کپڑا پاک ہوجائے گا چاہے ایک مرتبہ دھونے سے ہو یا ایک سے زیادہ مرتبہ دھونے سے، اور اگر نجاست دکھائی دینے والی نہیں ہے تو تین دفعہ دھونے سے کپڑا پاک ہوجائے گا، ہاں اگر تین دفعہ سے پہلے پاکی کا ظن غالب ہوجائے تو بھی کپڑا پاک ہوجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کپڑے بالٹی، ٹب یا واشنگ مشین وغیرہ میں دھوئے جائیں تو اس میں پاک کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک دفعہ نکال کر انہیں نچوڑ لیا جائے اور جو پانی بالٹی یا مشین وغیرہ میں ہو وہ گرا دیا جائے اور مشین وغیرہ کو کھنگال لیا جائے، اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ یہ عمل کیا جائے یا مشین وغیرہ سے نکال کر صاف پانی میں تین دفعہ ڈال کر نچوڑ لیے جائیں تو کپڑے پاک ہوجائیں گے۔
یاد رہے کہ جب پاک اور ناپاک کپڑوں کو ایک ساتھ پانی میں ڈال دیا تو اب کپڑوں کو پاک کرنے کیلئے سب کو تین دفعہ دھونا پڑے گا کیونکہ ایک ساتھ دھونے سے سب ہی ناپاک ہوگئے۔ دھوبی اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرتا ہے تو کپڑے پاک ہوں گے ورنہ نہیں۔ نیز مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ اگر ناپاک کپڑے کسی بالٹی وغیرہ میں ڈالے جائیں گے تو وہ پانی بھی ناپاک ہوجائے گا لہٰذا دوسرے کپڑے اس میں نہیں ڈال سکتے البتہ اگر تین دفعہ دھونے کے بعد ڈالے جائیں تو کپڑے پاک ہونے کی وجہ سے پانی ناپاک نہیں ہوگا لہٰذا اس میں دوسرے کپڑے ڈال سکتے ہیں۔

لما فی الدرالمختار (۳۲۸/۱): (وکذا یطهر محل نجاسة ...مرئیة) بعد جفاف کدم (بقلعها) ای بزوال عینها واثرها ولو بمرة او بما فوق ثلاث فی الاصح۔

وفی الشامیة (۳۲۸/۱): (ولو بمرة) یعنی ان زال عین النجاسة بمرة واحدة تطهر سواء کانت تلك الغسلة الواحدة فی ماء جار او راکد کثیر او بالصب او فی اجانة اما الثلاثة الاول فظاهر واما الاجانة فقد نص علیها فی الدرر حیث قال غسل المرئیة عن الثوب فی اجانة حتی زالت طهر۔

(۱۷۷) ٹوائلٹ پیپر کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جو ٹوائلٹ پیپر استعمال ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے کہ اگر کوئی یہ استعمال کرلے تو پانی استعمال کیے بغیر اس کی نماز درست ہوجائے گی؟ نیز عذر اور غیر عذر کی صورت میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں صورتیں برابر ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں ٹوائلٹ پیپر کا استعمال جائز ہے، اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز نہ کرے تو یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے لہٰذا اگر پانی نہ بھی استعمال کیا جائے تو بھی نماز صحیح ہوجائے گی، البتہ اگر نجاست اپنے مخرج سے تجاوز کرگئی ہو تو پانی کا استعمال ضروری ہوگا صرف پیپر کا استعمال کافی نہ ہوگا۔ نیز عذر اور غیر عذر میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ دونوں صورتیں برابر ہیں۔

لما فی الهندیة (۴۸/۱): یجوز الاستنجاء بنحو حجر منق کالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد

وماأشبهها. . .ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ما جاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدر الدرهم يفترض غسلها بالماء۔

وفی الدر المختار (۳۳۸/۱۔۳۴۰):(ويجب) ای يفرض غسله (ان جاوز المخرج نجس) مائع ويعتبر القدر المانع لصلاة (فيما وراء موضع الاستنجاء . . .وكره) تحريما (بعظم وطعام وروث . . . و) شئی محترم. . .

(۱۷۸)مردہ جانور کی کھال کے استعمال کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی مردہ جانور کی کھال اتار کر فروخت کرنا کیسا ہے کیونکہ گوشت وغیرہ تو استعمال نہیں کر سکتے ،لیکن میں نے سنا ہے کہ کھال استعمال کر سکتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مردہ جانور کی کھال کو دباغت (دھوپ ،مٹی یا نمک وغیرہ سے بدبو اور خون وغیرہ دور کرنا) کے بعد فروخت کر سکتے ہیں اور استعمال بھی کر سکتے ہیں البتہ دباغت سے پہلے فروخت نہیں کر سکتے۔

لمافی الهندية (۱۱۵/۳):واما جلود السباع والحمر والبغال فما كانت مذبوحة او مدبوغة جاز بيعها ومالا فلا وهذا بناء على ان الجلود كلها تطهر بالذكاة او بالدباغ الا جلد الانسان والخنزير واذاطهرت بالذكاة جاز الانتفاع بها فتكون محلا للبيع۔

وفی الدر المختار (۲۰۳/۱): (وكل اهاب) . . . (دبغ) ولو بشمس . . .(طهر)۔

وفيه ايضاً (۷۳/۵):(وجلد الميتة قبل الدبغ) لو بالعرض ولو بالثمن فباطل . . .(وبعده)ای الدبغ (يباع)الا جلد الانسان وخنزير وحية (وينتفع به)لطهارته حينئذ۔

(۱۷۹) اُکھڑے ہوئے بالوں کی طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر کا اس بات میں اختلاف ہوا کہ داڑھی کے وہ بال پاک ہیں یا نہیں جو داڑھی سے الگ ہو جائیں؟ زید کا کہنا ہے کہ بال کا وہ سرا جو گال سے ملا ہوتا ہے وہ ناپاک ہے اس لئے کہ انسان کا جسم اور گوشت ناپاک ہے۔لہٰذا بال کا وہ حصہ جو گال سے ملا ہوتا ہے ناپاک ہے۔جبکہ بکر کا کہنا اس کے خلاف ہے کہ بال پاک ہیں اگر یہ مسجد میں گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔درست مدلل جواب عنایت فرما کر دونوں کے اختلاف کو ختم فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کے موقع پر حلق فرما کر اپنے بال مبارک صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین میں تقسیم فرمانا بالوں کے پاک ہونے کی صریح دلیل ہے۔اسی طرح فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ہر وہ عضوِ حیوانی جس میں خون نہ ہو پاک ہے، بالوں میں بھی خون نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی پاک ہیں البتہ وہ بال جن کو اکھیڑا جائے اور ان کے سروں پر جسم کی رطوبت پائی جائے تو ان بالوں کے سرے رطوبت کی وجہ سے ناپاک ہوں گے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں داڑھی کے وہ بال جن کو اکھیڑا گیا ہو، اور ان کے ساتھ جسم کی رطوبت بھی موجود ہو تو ان کے رطوبت والے سرے ناپاک ہوں گے اور ان کو مسجد میں گرنے سے بچایا جائے اگر گر جائیں تو ان کو اٹھا کر کسی محترم جگہ ڈال دیا جائے تا کہ انسان کے بالوں کی بے احترامی لازم نہ آئے۔

لما فی ابي داؤد(۱/۲۷۲): عن انس بن مالك رضي الله عنه قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم رمى جمرة العقبة يوم النحر ثم رجع الى منزله بمنى فدعا بذبح فذبح ثم دعا بالحلاق فأخذ بشق رأسه الايمن فحلقه فجعل يقسم بين من يليه الشعرة والشعرتين ثم أخذ بشق رأسه الأيسر فحلقه ثم قال ههنا ابو طلحة فدفعه إلى أبي طلحة۔

وفى الهداية(۱/۴۰): وشعر الإنسان وعظمه طاهر وقال الشافعي نجس لأنه لا ينتفع به ولا يجوز بيعه ولنا أن عدم الانتفاع والبيع لكرامته فلا يدل على نجاسته۔

وفى قاضي خان(۱/۳۲):وان كان فى المسجد عش خطاف لا بأس بأن يرمى بها تنزيهاً للمسجد۔

وفى الشامية(۱/۲۰۷):(قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والا فطهارة ما على الانسان مستغنية عن البيان... والأولى اسقاط حياً وعن محمد فى نجاسة شعر الآدمي وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التي فيها الدسومة۔ اقول وعليه فما يبقى بين اسنان المشط ينجس الماء القليل اذا بل فيه وقت التسريح لكن يؤخذ من المسألة الاتية كما قال ط ان ماخرج من الجلد مع الشعر ان لم يبلغ مقدار الظفر لا يفسد الماء تأمل۔

(۱۸۰) بالوں کے ساتھ نکلنے والی دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء کل ما ليس بحدث ليس بنجس کا قاعدہ ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کی رُو سے وہ خون جو بدن سے نکلا تو ہو لیکن اس میں سیلان نہ ہو، وہ پاک ہے۔لہٰذا اس قاعدہ کے تحت بدن سے بال اکھیڑنے کی صورت میں جو دسومت بال کے ساتھ نکلتی ہے اس کو بھی پاک ہونا چاہیے حالانکہ فقہاء کرام نے اس کو ناپاک قرار دیا ہے۔اور اس کے ذریعہ سے پانی کو ناپاک قرار دینے کیلئے مقدار ظفر بیان فرماتے ہیں۔مہربانی فرما کر دسومت کے ناپاک

ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین کی وجہ عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... بالوں کے ساتھ لگی ہوئی دسومت بھی اس قاعدہ ''کل ما لیس بحدث لیس بنجس'' کے تحت داخل ہے کیونکہ اس قاعدہ کی رُو سے جس طرح خون کے نجس ہونے کیلئے سیلان ضروری ہے اسی طرح دسومت کے نجس ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حد سیلان کو پہنچ جائے۔ اور اس دسومت سے پانی نجس ہونے کیلئے فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے مقدار ظفر بیان فرمائی ہے کیونکہ جب یہ مقدار ظفر کے برابر ہوگی تو اس میں کثیر ہونے کی وجہ سے سیلان بھی متحقق ہوجائے گا اور جب یہ سیلان کی صورت میں پانی میں گرے گی تو پانی نجس کردے گی۔ نیز فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس مسئلہ میں مقدار ظفر کو کثیر کا معیار قرار دیا ہے یہ معیار صرف اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر کھال اور گوشت بھی مقدار ظفر کے برابر پانی میں گر جائیں تو بھی پانی ناپاک ہوجائے گا۔

لما فی الشامية(١/٢٠٧): (قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والا فطهارة ماعلى الانسان مستغنية عن البيان... والأولیٰ اسقاط حياًوعن محمد فی نجاسة شعر الآدمی وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التی فيها الدسومة ... قال ط ان ما خرج من الجلد مع الشعر إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء۔

وفی تقريرات الرافعی(١/٢٦): (قوله وظاهره أنه لو كان فيه دسومة الخ) وقال السندی نقلا عن الرحمتی ولم يحترز عن رطوبة فی الظفر لأنها اذا لم تبلغ حد السيلان فليس بنجس علی الأصح، ويظهر أن ما افسد الماء من الشعر المنتوف ونحوه لابد أن يكون ما فيه من النجاسة يبلغ حد السيلان ولذا قالوا إن الذی مع الشعر المنتوف إن لم يبلغ قدر الظفر لا يفسد الماء تأمل۔

وفی الطحطاوی علی الدر(١/١١٤): (قوله بوقوع قدر الظفر من جلده) أی قشره ويعدّ كثيراً لأن الجلد والقشر من جملة لحم الآدمی ويفهم منه أن الذی خرج من الجلد مع الشعر المنتوف منه إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء۔

(١٨١) برساتی پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ ہوتی ہے اگر وہ کپڑوں کو لگ جائے اور اسی کے ساتھ نماز ادا کرلی جائے تو اس نماز کا کیا حکم ہوگا؟ کیچڑ کے مرئی اور غیر مرئی ہونے میں فرق ہے یا دونوں مساوی حکم رکھتی ہیں؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... بارش وغیرہ کے پانی کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ پیدا ہوجاتی ہے اگر نجاست کا اثر اس میں محسوس نہ ہو تو ضرورت اور عموم بلوی کی وجہ سے پاک ہے، لہٰذا ایسے کپڑوں کے ساتھ پڑھی گئی نماز درست ہے، البتہ احتیاطاً ایسے کپڑوں کو دھو کر نماز پڑھنا چاہیئے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۶۱): وطین شارع... لو اصاب الثوب ما سال من الکنیف فالاحب ان یغسله ولا یجب مالم یکن اکبر رایه انه نجس (الی ان قال) والطین المسرقن والردغة فی الطریق فیها نجاسة طاهرة الا اذا رای عین النجاسة۔بحر۔

(۱۸۲) خروج ریح سے کپڑے ناپاک نہ ہونے کی وجہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احناف کے ہاں جو چیز ناقض وضو ہو وہ نجس بھی ہوتی ہے۔اب مسئلہ یہ ہے کہ خروج ریح سے وضو تو ٹوٹ جاتا ہے لیکن شلوار وغیرہ کے پاک کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ یہ ضابطہ کہ جو چیز ناقض وضو ہے وہ نجس بھی ہے سبیلین کے علاوہ میں ہے اور سبیلین میں عموم ہے چاہے خارج نجس ہو یا پاک ہر صورت میں خروج ناقض وضو ہے، لہٰذا ریح کے خارج ہونے میں اصل علت خروج نجس نہیں ہے بلکہ ریح فی نفسہ پاک ہے، لیکن خروج چونکہ سبیلین سے پایا جارہا ہے اس لئے ناقض وضو ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر سبیلین سے کنکری کا خروج ہو تو یہ ناقض وضو ہے حالانکہ یہ نجس نہیں ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا مرور نجاست سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس نجاست کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں لیکن ان اثرات کا اعتبار اگر کپڑے کی طہارت وعدم طہارت کے اعتبار سے کیا جائے تو اس میں حرج بھی ہے لہٰذا ان اثرات کا اعتبار نقض وضو اور عدم نقض وضو میں تو کیا جاتا ہے لیکن کپڑوں کی طہارت وعدم طہارت میں نہیں کیا جاتا۔اسی وجہ سے خروج ریح اگرچہ ناقض وضو ہے لیکن اس کی وجہ سے کپڑوں کی پاکی کا حکم نہیں دیا جاتا۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۱۱۴): وکذلك الریح الخارجة من الدبر واختلف المشایخ رحمهم الله أن عین الریح نجسة أوهی طاهرة الا انها تتنجس بمرورها علی النجاسة قالوا: وفائدة هذا الخلاف فیما اذا خرج منه الریح وعلیه بسراویل مبتلة هل یتنجس سراویله؟ فمن قال عینها نجسة یقول یتنجس و من قال عینها لیست بنجسة یقول لایتنجس۔

وفی الدر المختار(۱/۱۴۰): (و) کل (مالیس بحدث) أصلا بقرینة زیادة الباء کقئ قلیل ودم لو ترك لم یسل (لیس بنجس)۔۔۔۔وقال الشامی رحمه الله تعالی تحته: (قوله لیس بنجس) أی لا یعرض له وصف النجاسة بسبب خروجه بخلاف القلیل من قئ عین الخمر أو البول فإنه وان لم یکن

حدثاً لقلته لكنه نجس بالإصالة لا بالخروج هذا ما ظهر لی تأمل۔

وفی الشامية (١/١٣٥): (مثل ريح)فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لأن عينها نجسة لأن الصحيح أن عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة أو ابتل من اليتيه الموضع الذی تمر به الريح فخرج الريح لايتنجس وهو قول العامة وما نقل عن الحلوانی من أنه كان لا يصلی بسراويله فورع منه بحر۔

فصل فی احکام المیاہ

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

(۱۸۳) مروجہ ٹینکیوں کا پانی ماء جاری شمار ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے جامعہ کے پانی کی ٹینکی جبکہ اس میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل رہا ہوتا ہے۔ نجاست گرنے کی صورت میں اس کا حکم ماء جاری کا ہوگا یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ عثمانی میں ٹینکی کو ماء جاری میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی ٹینکی ہوگی جو ہمارے جامعہ کی ہے یا کسی اور نوعیت کی ٹینکی مراد ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... پانی کی ٹینکی ایسی ہو کہ ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف سے نکاسی کا سلسلہ ہو تو یہ ماء جاری کے حکم میں ہے نجاست گرنے کی صورت میں رنگ، بو اور مزہ میں تغیر نہ آئے تو ہر طرح اس کا استعمال درست ہے۔ اگر ٹینکی ایسی نہ ہو بلکہ ایک طرف سے بند ہو، صرف پانی کی آمد یا صرف نکاسی کا سلسلہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ ''دہ دردہ'' ہے یا عرض میں تو ''دہ دردہ'' نہیں ہے لیکن طول (لمبائی) اتنی ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو وہ دہ دردہ ہوسکتا ہے تو یہ ماء کثیر ہے، نجاست گرنے کی صورت میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو پاک ہے، اگر نجاست کا اثر ظاہر ہو جائے تو ناپاک۔ **ولہ طول لا عرض لکنہ یبلغ عشرا فی عشر، جاز تیسیرا (الدر المختار، ۱/۱۹۳)**

اگر ٹینکی مقدار میں چھوٹی ہو اور پانی کی آمد و رفت کا تسلسل بھی نہ ہو اور لمبائی بھی اتنی نہیں ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو وہ دردہ ہو سکے تو تھوڑی سی نجاست گرنے سے بھی ناپاک ہو جائے گی۔

نظیر ان ساری صورتوں کی حوض صغیر اور حوض الحمام ہے، حوض صغیر کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ حوض صغیر میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہو اور دوسری طرف سے نکل رہا ہو تو اس میں ہر طرف سے وضو جائز ہے۔ **اذا کان الحوض صغیر أیدخل فیہ الماء من جانب ویخرج من جانب آخر یجوز الوضوء فی جمیع جوانبہ وعلیہ الفتویٰ۔ من غیر تفصیل بین ان یکون اربعا فی اربع او اقل یجوز او اکثر فلا یجوز۔ (شرح الوقایۃ اولین ص ۷۸)**

حوض کا پانی ساکن ہو پائپ وغیرہ کے ذریعے داخل نہ ہو رہا ہے نہ کوئی آدمی چلو بھر رہا ہے اس میں کوئی شخص اپنا ہاتھ ڈالے جبکہ ہاتھوں

میں نجاست لگی ہو، تو وہ پانی ناپاک ہوجائے گا۔

فان ادخل رجل يده في الحوض وعليها نجاسة وان كان الماء ساكنا لايدخل فيه شيئ من انبوبه ولايغترف منه انسان بالقصعة يتنجس۔ (هندية ١/١٨)

اگر لوگ چلو بھر بھر کرلے رہے ہوں لیکن پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل نہیں ہورہا ہو یا اس کا عکس ہو کہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہورہا ہے لیکن لوگ چلو بھر بھر کر نہیں لے رہے ہیں تو اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے ناپاک ہوجائے گا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولايدخل من الانبوب ماء اوعلى العكس فاكثرهم على انه يتنجس۔ (هندية ١/١٨)

اگر لوگ چلو بھر بھر کرلے رہے ہوں اور پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی بھی داخل ہورہا ہے تو اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہ ہوگا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ويدخل الماء من الانبوب فاكثرهم على انه لايتنجس هكذا في فتاوئ قاضي خان وعليه الفتوئ۔ (هنديه ١/١٨)

حمام کے حوض کے بارے میں بعض متاخرین احناف فرماتے ہیں کہ ماء حمام امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر حال میں ماء جاری کی طرح ہے چاہے لوگ چلو بھر بھر کرلے رہے ہوں یا نہ لے رہے ہوں جبکہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہورہا ہو۔

(ومنهم) اى من المتاخرين (من قال هو) اى ماء الحمام (عنده) أي عند ابي يوسف (بمنزلة الماء الجارى على كل حال تدارك) الاغتراف مع دخول الماء من الانبوب (اولا لاجل الضرورة)۔ (كبيرى ص ١٠٠)

مذکورہ عبارات کی رو سے اگر آپ کے جامعہ کی ٹینکی ایسی ہو جیسا کہ سوال میں مذکور ہے یعنی ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف نکاسی کا تسلسل ہو تو ماء جاری کے حکم میں ہے، اگر نکاسی کا سلسلہ نہیں ہے تو دیکھیں گے کہ وہ دہ در دہ یا اس کے حکم میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو بھی ماء کثیر شمار ہوگا نجاست گرنے کی صورت میں ناپاک نہ ہوگا بشرطیکہ نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، اگر دہ در دہ نہیں تو نجاست گرنے سے ناپاک ہوجائے گا کیونکہ وہ ماء قلیل ہوگا۔

لمافي الهندية (١/١٧): اذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز فيه الوضوء من جميع جوانبه وعليه الفتوى من غير تفصيل۔

وفي الدر المختار (١/١٨٧): (و) يجوز (بجار وقعت فيه نجاسة و) الجارى (هومايعد جارياً) عرفا وقيل مايذهب بتبنة والاول اظهر والثاني اشهر،

وفي الشامية تحته : العرف الان انه متى كان الماء داخلاً من جانب وخارجاً من جانب آخر

يسمى جاريا وان قل الداخل۔

وفيه ايضاً (۱/۱۹۰): والحقوا بالجارى حوض الحمام لوالماء نازلاً والغرف متدارك كحوض صغيريد خله الماء من جانب ويخرج من آخر يجوز التوضى من كل الجوانب مطلقاً به يفتى۔

وفی الشامية تحت: (قوله والحقوا بالجارى حوض الحمام) اى فی انه لاينجس الابظهور اثر النجاسة. أقول: وكذا حوض غير الحمام لانه فی الظهيرية ذكر هذا الحكم فی حوض اقل من عشر فی عشر ثم قال وكذالك حوض الحمام۔۔۔۔۔۔(قوله ويخرج من آخر) أى بنفسه او بغيره لما فی التاتارخانية لوكان يدخله الماء ولايخرج منه لكن فيه انسان يغتسل ويخرج الماء باغتساله من الجانب الاخر متداركاً لاينجس۔

وفی الدر المختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام

وفی الشامية تحته: (قوله بمجرد جريانه) اى بأن يدخل من جانب ويخرج من آخر حال دخوله وان قل الخارج، بحر۔ قال ابن الشحنة لانه صار جارياً حقيقةً وبخروج بعضه رفع الشك فی بقاء النجاسة فلا تبقى مع الشك۔

وفی الشامية(۱/۱۹۳): لم يذكر مقدار العمق إشارة إلى أنه لاتقدير فيه فی ظاهر الرواية وهو الصحيح بدائع وصحح فی الهداية أن يكون بحال لا ينحسر بالاغتراف أى لا ينكشف وعليه الفتوى۔

(۱۸۴) مخصوص وقت میں ٹینک میں پانی ایک جانب سے آ کر دوسری طرف جاتا ہوتو اس کے ماء جاری ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ٹینک جس میں نل وغیرہ کے ذریعے سے پانی آتا ہے۔ اور پھر آگے سپلائی بھی ہوتا ہے لیکن ہر وقت ایسا نہیں ہوتا کہ پانی ایک طرف سے آرہا ہو، اور دوسری طرف سے جارہا ہو، بلکہ مخصوص وقت میں پانی آتا ہے۔ اور مخصوص وقت کیلئے ہی پانی کی آگے سپلائی بھی کی جاتی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟ نیز اگر دہ دردہ ٹینک میں نجاست وغیرہ گر جائے اور اوصاف ثلثہ میں سے کوئی ایک متغیر ہو جائے تو اس ٹینک کی صفائی کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جس وقت ٹینک میں پانی داخل ہو رہا ہے اگر اسی وقت آگے سپلائی بھی ہو رہا ہے پھر تو یہ ماء

جاری کے حکم میں ہے لیکن اگر پانی ایک خاص وقت میں ٹینک میں داخل ہوتا ہے پھر بعد میں کسی وقت پانی آگے سپلائی ہوتا ہے جیسا کہ اوپر سوال میں مذکور ہے پھر یہ ماء جاری کے حکم میں نہیں ہے۔ دہ دردہ ٹینک میں نجاست گرنے سے پانی کے اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف متغیر ہوجائے تو پانی نجس ہوجاتا ہے۔ اوراس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس ٹینک کے تمام پانی کو نکال دیا جائے لہٰذا تمام پانی نکالنے کے بعد ٹینک پاک ہوجائے گا۔

لما فی الشامیة(۱/۱۸۹): واذا وصل إلى الحياض فى البيوت متغيرا ونزل فى حوض صغير أو كبير فهو نجس وإن زال تغيره بنفسه لان الماء النجس لا يطهر بتغيره بنفسه إلا اذا جرى بعد ذالك بماء صاف فانه حينئذ يطهر۔

وفى الدرالمختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام۔

وفى الشامية تحته: (قوله بمجرد جريانه) اى بأن يدخل من جانب ويخرج من آخر حال دخوله وان قل الخارج بحر قال ابن الشحنة: لانه صار جاريا حقيقةً، وبخروج بعضه رفع الشك فى بقاء النجاسة فلاتبقى مع الشك اهـ وقيل لايطهر حتى يخرج قدر مافيه، وقيل ثلاثة أمثاله بحر. فلو خرج بلا دخول كأن ثقب منه ثقب فليس بجارٍ۔

وفى الشامية (۱/۲۱۶): (قوله بخلاف نحو صهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس... واراد بذالك الرد على من أفتى بنزح عشرين فى فأرة وقعت فى صهريج... إن الفأرة لووقعت فى الحب يهراق الماء كله، قال: ووجهه أن الاكتفاء بنزح البعض فى الابار على خلاف القياس بالآثار فلا يلحق بها غيرها۔

(۱۸۵) چھوٹی ٹینکی میں چڑیا کے گرنے سے پانی نجس ہوجاتا ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک ٹینکی ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی وگہرائی چارفٹ ہے، اس کے اندر ایک چڑیا گرکر مرگئی ہے معلوم نہیں کہ کب سے گری ہے تو اب اس پانی کا کیا حکم ہے اور ہماری نمازوں کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہوگا نیز اس ٹینکی کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مذکورہ ٹینکی کا پانی نجس ہوگیا ہے چڑیا کے مرنے کی وجہ سے اور اگر یہ چڑیا پھول گئی یا پھٹ گئی ہے تو تین دن اور تین راتوں کی نمازوں کولوٹانا بھی ضروری ہوگا اور اگر چڑیا پھولی یا پھٹی نہیں ہے تو صرف ایک دن اور ایک رات کی نمازیں لوٹانا ضروری ہوں گی۔ ٹینکی کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اس کے پانی کو

نکالا جائے گا۔

لما فی نور الایضاح(ص۲۸۔۳۰): الرابع۔ ماء نجس وھو الذی حلت فیہ نجاسة وکان راکداً قلیلا والقلیل مادون عشر فی عشر۔ فینجس ووجود حیوان میت فیھا ینجسھا من یوم ولیلة ومنتفخ من ثلاثة ایام ولیالیھا ان لم یعلم وقت وقوعہ۔

وفی البحر الرائق(۲۱۴/۱): وفی الکافی، والمستصفی، والبدائع ان الفارة اذا وقعت فی الحب بالحاء المھملة، یھراق الماء کلہ ولم یعلل لہ، ووجھہ ان الاکتفاء بنزح البعض مخصوص بالآبار ثبت بالآثار علی خلاف القیاس فلا یلحق بہ غیرہ فعلی ھذا اذا وقعت الفارة فی الصھریج او فی الفسقیة ولم یکونا عشراً فی عشر فان الماء کلہ یھراق کما لایخفی۔

وفی الشامیة(۲۱۶/۱): (قولہ بخلاف نحو الصھریج وحب الخ) الصھریج الحوض الکبیر یجتمع فیہ الماء قاموس... واراد بذالك الردّ علی من افتی بنزح عشرین فی فأرة وقعت فی صھریج ... ان الفارة لووقعت فی الحب یھراق الماء کلہ قال ووجھہ ان الاکتفاء بنزح البعض فی الابار علی خلاف القیاس بالاثار فلا یلحق بھا غیرھا۔ انتھی قولہ۔

(قولہ یھراق الماء کلہ) اقول وھل یطھر بمجرد ذالك ام لابد من غسلہ بعدہ ثلاثا والظاھر الثانی ثم رایتہ فی التاتارخانیة قال مانصہ وفی فتاوی الحجة سئل عبداللہ بن المبارك عن الحب المرکب فی الارض تنجس قال یغسل ثلاثا ویخرج الماء منہ کل مرة فیطھر۔

(۱۸۶) کیا ٹینک میں جوتا گرنے سے پانی نجس ہوجاتا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک زمین دوز ٹینک ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی چارفٹ اور گہرائی آٹھ فٹ ہے ایک دن بچے کھیل رہے تھے تو ایک نے دوسرے کو جوتا مارا اور وہ جوتا ٹینکی میں گرگیا اب اس پانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جوتا اگر پاک ہے تو پانی نجس نہیں ہوگا اور اگر جوتا ناپاک ہے تو اس صورت میں پانی ناپاک ہوجائے گا اور اگر جوتے کا پتہ نہیں پاک ہے یا ناپاک تو با قاعدہ الأصل فی الأشیاء الاباحة کے تحت اس کو پاک سمجھا جائے گا اور پانی پاک ہوگا۔

لمافی بدائع الصنائع(۲۰۴/۱۔۲۰۵): وقال عامة العلماء: ان کان الماء قلیلا ینجس وان کان کثیراً لا ینجس لکنھم اختلفوا فی الحد الفاصل بین القلیل والکثیر... وقال اصحابنا ان

كان بحال يخلص بعضه الى بعض فهو قليل وان كان لا يخلص فهو كثير... فاتفقت الروايات عن اصحابنا انه يعتبر الخلوص بالتحريك وهو انه ان كان بحال لو حرك طرف منه يتحرك الطرف الاخر فهو مما يخلص وان كان لا يتحرك فهو ممالا يخلص ... وروى عن محمدرحمه الله انه قدره بمسجده فكان مسجده ثمانياً فى ثمان وبه اخذ محمد بن سلمة وقيل كان مسجده عشراً فى عشر: وقيل مسح مسجده فوجد داخله ثمانياً فى ثمان وخارجه عشرا فى عشر۔

وفى الدرالمختار (۱/۱۹۲): وانت خبير بأن اعتبار العشر اضبط ولا سيما فى حق من لا رأى له من العوام فلذا افتى به المتاخرون الأعلام۔

وفى الدر المختار مع الشامية (۱/۱۰۵): (قاعده) الأصل فى الأشياء الإباحة۔

(۱۸۷)کنویں میں اگر گمراہ عقائد رکھنے والا شخص اتر جائے تو پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کنویں کے کنارے بچے کھیل رہے تھے ایک بچے نے قیمتی گھڑی پہنی ہوئی تھی اس نے اتار کر رکھ دی تاکہ کھیل میں خراب نہ ہوجائے دوسرے بچے نے اٹھا کر گھڑی کنویں میں ڈال دی، گھڑی نکالنے کیلئے کوئی شخص کنویں میں نہیں اتر رہا تھا اتنے میں ایک شخص آ گیا جو اہل تشیع میں سے تھا اس نے کنویں میں جا کر گھڑی نکال لی اب بعض لوگ کہہ رہے ہیں چونکہ شیعہ بدترین کافر ہیں ان کا پانی میں جانا خنزیر کے جانے کے برابر ہے یہ سارا پانی نجس ہے جب تک نکالا نہ جائے کنواں پاک نہیں ہوگا۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی شیعہ عقائد والے شخص کے پانی میں داخل ہونے سے پانی ناپاک ہوجائے گا؟ اب اس کنویں کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نجاست کی دو قسمیں ہیں: ۱۔نجاست حقیقیہ (جیسے پیشاب پاخانہ خون وغیرہ)، ۲۔نجاست حکمیہ (جیسے بے وضو ہونا یا حالت جنابت میں ہونا)۔نجاست حقیقیہ کے گرنے سے کنواں ناپاک ہوجاتا ہے،نجاست حکمیہ سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں کنویں میں اترنے والے شخص کے بدن یا کپڑوں پر اگر نجاست لگی ہوئی تھی تو کنویں کا پانی نجس ہوگیا ہے، اگر اس کے بدن یا کپڑوں میں نجاست لگی ہوئی نہ تھی تو کنویں کا پانی پاک ہے البتہ احتیاطاً بیس ڈول پانی نکال دیا جائے۔

لمافی البحرالرائق(۱/۱۷۷): ثم رأيت بعد هذا العلامة ابن امير حاج فى شرح منية المصلى صرح بما ذكرته وقال: الماء المستعمل هوالماء الذى لاقى الرجل الذى زال حدثه فيجب نزح جميع الماء على رواية نجاسة الماء المستعمل ولا يجب نزح شئى منها على رواية طهارته بل هو باق على

طهوريته، وقد عرفت ان رواية الطهارة هى المختارة اهـ فعلى هذا قولهم صار الماء مستعملا معناه صار الماء الملاقي للبدن مستعملا لا أن جميع ماء البئر صار مستعملاً۔

وفي الشامية(۱/۲۱۳): (قوله كآدمي محدث) اى انه ينزح فيه أربعون كما عزاه في التتارخانية إلى فتاوى الحجة ... وفي شرح الوهبانية: والتحقيق النزح للجميع عند الامام والثاني على القول بنجاسة الماء المستعمل، وقيل أربعون عنده، ومذهب محمد أنه يسلبه الطهورية، وهو الصحيح عند الشيخين فينزح منه عشرون ليصير طهوراً وتمامه فيه، والمراد بالمحدث مايشمل الجنب۔

وفيه ايضاً(۱/۲۱۴): واستشكل في البدائع نزح العشرين بأن الماء المستعمل طاهر فلم يضر مالم يغلب على المطلق كسائر المائعات، ثم قال: ويحتمل ان يقال طهارته غير مقطوع بها للخلاف فيها، بخلاف سائر المائعات، فينزح أدنى ماورد به الشرع وذالك عشرون احتياطاً۔

(۱۸۸) کبوتر وغیرہ کے کنویں میں گرنے کے بعد نہ ملنے پر کنویں کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا ایک کنواں ہے جس سے ہم پانی لیتے رہتے ہیں اس کنویں میں دو کبوتر گر گئے باوجود تلاش کرنے کے وہ نہیں ملے تو اس کنویں سے پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کنویں کو کس طرح پاک کریں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کنویں میں اگر حیوان گر کر پھول جائے یا پھٹ جائے خواہ حیوان چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گری پڑی نجس چیز کو پہلے نکال لیا جائے پھر اس کے بعد کنویں میں موجود سارا پانی نکال لیا جائے اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو دو سو ڈول وجوباً نکالنے ہوں گے اور استحباباً تین سو تک نکال لیے جائیں اب مذکورہ بالا صورت میں یہ بات تو ظاہر ہے کہ کبوتر پھول و پھٹ گئے ہوں گے لیکن چونکہ تلاش کرنے کے بعد نہیں ملے جبکہ پاکی کیلئے نجس چیز کا پہلے، نکالنا ضروری ہے اس لئے فی الحال اس کنویں کو چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ پانی میں حلول کر کے کیچڑ بن گئے ہوں گے بعض فقہاء کرام نے اس مدت کا اندازہ چھ ماہ سے لگایا ہے لہٰذا اتنی مدت گزر جانے کے بعد اس کنویں کا سارا پانی اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو تین سو ڈول نکال لئے جائیں تو وہ کنواں پاک ہو جائے گا اس سے قبل اس کنویں سے پانی پینا جائز نہیں ہے۔

لمافي الشامية (۱/۲۱۲): أنه لابد من إخراج عين النجاسة كلحم ميتة وخنزير اهـ ح قلت فلو تعذر ايضاً ففي القهستاني عن الجواهر۔ لووقع عصفور فيها فعجزوا عن اخراجه فما دام فيها فنجسة فتترك البئر مدة يعلم انه استحال وصار حمأة وقيل مدة ستة اشهر۔

وفی الفقه الاسلامی(۱/۲۹۱): وینزح مابین اربعین دلواً الی ستین دلواً اذا کان الحیوان ذا حجم متوسط مثل الحمامة والدجاجة . . . وفی الاثنین من هذہ الحیوانات ینزح الماء کله۔

وفی الدر المختار(۱/۲۱۴۔۲۱۵): (وان تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (یؤخذ ذلك بقول رجلین عدلین لهما بصارة بالماء) به یفتی وقیل یفتی بمائة إلی ثلثمائة وهذا ایسر وذاك احوط۔

(۱۸۹) جوتے کنویں میں گرنے سے کنویں کی ناپاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے جوتے کنویں میں گر گئے جن کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں یہ کنواں ناپاک ہوگیا یا نہیں؟ کیا اس سے وضو وغیرہ کیلئے پانی لے سکتے ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر جوتوں کے بارے میں ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں ناپاک شمار ہوگا، اور اگر ان کے پاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں پاک شمار ہوگا، اور اگر دونوں جانب کسی بارے میں یقین یا ظن غالب نہ ہو تو یہ کنواں پاک شمار ہوگا اس کا پانی استعمال کرنا صحیح ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۲۵): ویجوز للرجل ان یتوضأ من الحوض الذی یخاف ان یکون فیه قذر ولا یتقین به ولیس علیه ان یسأل عنه ولا یدع التوضؤمنه حتی یتقین ان فیه قذراً للاثر۔

وفی ردالمحتار (۱/۱۵۱):فی التاتارخانیة من شك فی انائه او ثوبه او بدنه اصابته نجاسة اولا فهو طاهر مالم یستیقن ،وکذا الآبار والحیاض والحباب الموضوعة فی الطرقات ویستقی منها الصغار والکبار والمسلمون والکفار۔

(۱۹۰) کنویں میں نجاست گرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے قریب ایک کنواں ہے جس سے گاؤں کے لوگ پانی لیتے ہیں ایک دن اس کنویں میں ایک بکری گر گئی اس کو تو ہم نے زندہ نکال لیا لیکن نکالتے وقت اس نے کنویں میں پیشاب کردیا اب لوگ اس سے پانی نہیں لیتے اور دوسری جگہ سے پانی لانے میں دشواری بہت ہے سارے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفتی صاحب سے مسئلہ معلوم کرلیں جیسے وہ فرمائیں گے ویسے عمل کریں آپ بتائیں کہ یہ کنواں ناپاک ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ناپاک ہے تو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا جبکہ پانی نکالنا بہت ہی مشکل ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ بکری کا پیشاب نجس ہے، کنویں میں نجاست گرنے سے سارا پانی ناپاک ہوگا لہٰذا

صورت مسئولہ میں کنواں ناپاک ہو چکا ہے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سارا پانی نکالا جائے۔

(۲)۔اگر سارا پانی نہ نکل سکے تو پھر دو عادل آدمی جو پانی کے معاملے میں مہارت رکھتے ہوں، ان کو بلایا جائے، وہ جتنا اندازہ لگائیں اسی مقدار میں پانی نکالا جائے۔

(۳)۔البتہ اگر اس پر بھی عمل درآمد مشکل ہو مثلاً ماہرین ملتے نہیں یا ان کے قول پر عمل کرنے سے پانی نکلوانے پر زرِ کثیر لازم آئے گا تو ایسی صورت میں تین سو ڈول تک نکالنے سے کنواں پاک ہوگا۔لیکن احتیاط بہر حال دو ماہر عادل آدمیوں کے قول پر عمل کرنے کی صورت میں ہے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۰۱): قوله (وبول مايوكل نجس) انما ذكرها هنا وان كان محلها باب الانجاس لبيان أنّه اذا وقع فی البئر نجس ماء ها، وهذا عند ابی حنيفة وابي يوسف، و قال محمدرحمه الله طاهر، فلا ينزح الماء من وقوعه الا اذا غلب على الماء فيخرج من أن يكون طهوراً۔

وفيه ايضاً (۱/۲۱۶): وقوله (ومائتان لولم يمكن نزحها)......... وعن أبي نصر أنه يوتى برجلين لهما بصارة بأمر الماء فاذا قدراه بشئ وجب نزح ذالك القدر وهو الاصح والاشبه بالفقه... والافتاء بما عن محمد اسهل على الناس والعمل بما عن أبي نصر أحوط۔

وفی الدرالمختار(۱/۲۱۱): اذا وقعت نجاسة... ولو مخففة او قطرة بول... ينزح كل مائها۔

وفی الشامية تحته:(قوله او قطرة بول) أی ولو بول مأكول اللحم۔

وفی الدرالمختار(۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معيناً (فيقدر ما فيها) وقت النزح قاله الحلبی (يؤخذ ذالك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتی وقيل يفتی بمائة الی ثلثمائة وهذا أيسر وذاك احوط:

وفی الشامية تحته: (قوله به يفتی) وهو الاصح، كافی ودرر۔ وهو الصحيح، وعليه الفتوی۔ ابن كمال: وهو المختار: معراج۔ وهو الاشبه بالفقه: هداية:علی انهم قالوا ان محمداً أفتی بما شاهد فی ابار بغداد فانها كثيرة الماء وكذا ماروی عن الامام من نزح مائة فی مثل آبار الكوفة لقلة مائها فيرجع الی القول الأول لأنه تقدير ممن له بصارة وخبرة بالماء فی تلك النواحی لالكون ذالك لازماً فی ابار كل جهة۔

(۱۹۱) پاکی حاصل کرنے سے جھیل ناپاک نہیں ہوتی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک بڑی سی جھیل ہے جس میں ہم لوگ گرمیوں میں ظہر سے پہلے غسل کرتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں، چند دن پہلے ایک صاحب ہمارے علاقے میں آئے اور ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کا اس طرح غسل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ لوگ مٹی سے استنجاء کرتے ہیں جس کے بعد جھیل پر جا کر غسل کرتے ہیں جس سے سارا پانی ناپاک ہوجاتا ہے لہٰذا آپ لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوتی، کیا یہ بات صحیح ہے اگر صحیح ہے تو ہمیں کافی عرصہ ہوگیا اسی طرح نمازیں پڑھتے ہوئے، ہماری پہلی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیا انہیں دوبارہ ادا کرنا چاہیے؟ جلد از جلد جواب دے کر ہماری اس پریشانی کو دور فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں مٹی سے استنجاء کرنے کے بعد اگر دہ دردہ سے کم مقدار پانی میں غسل کیا جائے تو وہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے لیکن اگر پانی کی مقدار دہ دردہ سے زیادہ ہو جیسا کہ آپ کے سوال سے ظاہر ہو رہا ہے تو ایسا پانی ناپاک نہیں ہوتا جھیل میں غسل کرنے کے بعد آپ لوگوں کی نماز کی ادائیگی صحیح ہے لہٰذا نمازوں کے دوبارہ لوٹانے کی بھی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندية (۴۸/۱): ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ماجاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدر الدرهم يفترض غسلها۔

وفی ردالمحتار (۳۳۷/۱): السنة هو الاستنجاء بالاشياء الطاهرة من الاحجار والامداد والتراب والخرق البوالى... قال فی السراج ولم يرد به حقيقة الانقاء بل تقليل النجاسة اهـ ولذا يتنجس الماء القليل اذا دخله المستنجي۔

(۱۹۲) تالاب کا گندا پانی صاف کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک بڑا تالاب ہے جس میں پورے گاؤں کا گندا پانی جمع ہوتا ہے۔ اب حکومت نے اس پر مشینیں لگائی ہیں جو پانی کو صاف کرتی ہیں۔ پھر اس پانی کو ٹینکروں کے ذریعے دوسرے مقامات پر منتقل کیا جاتا ہے وہاں کے لوگ اس پانی کو استعمال کرتے ہیں آیا یہ پانی پاک ہے یا ناپاک اس کا استعمال کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نجاست کی ماہیت اگر تبدیل ہوجائے تو انقلاب ماہیت کی وجہ سے وہ پاک ہوجاتی ہے انقلاب ماہیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلی والی حقیقت معدوم ہو کر نئی حقیقت بن جائے، نہ پہلی حقیقت و ماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی

رہے نہ اس کی صورت و کیفیت اور نہ اس کے خواص و آثار باقی رہیں بلکہ سب چیزیں نئی ہو جائیں۔ جیسے گدھا وغیرہ نمک کی کان میں گر کر نمک بن جائے، اور شراب سے سرکہ بنالیا جائے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ انقلاب ماہیت کی کوئی صورت نہیں ہے بلکہ گندے پانی کے متعفن اور ضرر رساں اجزاء کو نکال کر پانی کو صاف کیا گیا ہے اور جو اجزاء بچے ہیں وہ اسی پانی کے اجزاء ہیں لہٰذا وہ بھی نجس اور ناپاک رہیں گے۔

لمافی الدر المختار(۳۱۵/۱): (و) يطهر (زيت) تنجس (بجعله صابونا) به يفتى للبلوى الخ الدر المختار

وقال ابن عابدين تحته: (قوله ويطهر زيت الخ) قد ذكر هذه المسئلة العلامة قاسم فى فتاواه ... ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذى عليه الفتوى واختاره اكثر المشائخ خلافا لابى يوسف كمافى شرح المنية والفتح وغيرهما۔ وعبارة المجتبى: جعل الدهن النجس فى صابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمد، ويفتى به للبلوى اهـ وظاهره ان دهن الميتة كذلك لتعبيره بالنجس دون المتنجس الا ان يقال هو خاص بالنجس لان العادة فى الصابون وضع الزيت دون بقية الادهان تأمل ثم رايت فى شرح المنية مايؤيد الاول حيث قال: وعليه يتفرع مالو وقع انسان او كلب فى قدر الصابون فصار صابونا يكون طاهرالتبدل الحقيقة اهـ۔

ثم اعلم ان العلة عند محمد هى التغير وانقلاب الحقيقة وانه يفتى به للبلوى كماعلم مامرّ، ومقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصابون، فيدخل فيه كل ما كان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوى عامة ......

قلت: لكن قد يقال: ان الدبس ليس فيه انقلاب حقيقة لانه عصير جمد بالطبخ، وكذا السمسم اذا درس واختلط دهنه باجزائه ففيه تغير وصف فقط، كلبن صارجبنا، وبرصار طحينا، وطحين صار خبزا، بخلاف نحو خمر صارخلا، وحمار وقع فى مملحة فصارَ ملحا، وكذا دردى خمر صار طرطيراً، وعذرة صارت رمادا او حمأة، فان ذلك كله انقلاب حقيقة الى حقيقة اخرى لامجرد انقلاب وصف كما سياتى، والله اعلم۔

وايضا فى الدر المختار(۳۲۶/۱): (لا) يكون نجسا (رما دقذر) والالزم نجاسة الخبز فى سائر الامصار (و) لا(ملح كان حمارا) او خنزيرا ولا قذر وقع فى بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى۔ وقال ابن عابدين الشامى رحمه الله تحته: (قوله كان حمارا او خنزيرا) افاد ان الحمار

مثال لا قیداحترازی، واشار باطلاقه الی انه لا یلزم وقوعه وهو حی، فانه لو وقع فی المملحة بعد موته فهو کذلك کمافی شرح المنیة الخ۔

وفی الدر المختار(۱/۱۸۰): (و) یرفع (بماء ینعقد به ملح لا بماء) حاصل بزوبان (ملح) لبقاء الاول علی طبیعته الاصلیة، وانقلاب الثانی الی طبیعة الملحیة۔ وقال ابن عابدین رحمه الله تحته (قوله لبقاء الاول الخ)... وقال الزیلعی : ولا یجوز بماء الملح، وهو ما یجمد فی الصیف ویذوب فی الشتاء عکس الماء، و اقره صاحب البحر والعلامة المقدسی، ومقتضاه انه لا یجوز بماء الملح مطلقا: ای سواء انعقد ملحا ثم ذاب ام لا؟ وهو الصواب عندی اھ ملخصا۔

(۱۹۳) نالے کے ذریعے نہر سے آنے والے صاف پانی کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک نالہ ہے جس میں شہر کا گندہ پانی آتا رہتا ہے اب کبھی کبھی اس کے ذریعے لوگ نہر کا پانی اپنے کھیتوں تک لے جاتے ہیں جب نہر والا پانی اس نالے میں آجاتا ہے تو یہ پانی بالکل صاف ہوتا ہے حالانکہ اس میں گٹروں والا پانی بھی مل رہا ہوتا ہے تو بعض لوگ اس پانی کو پیتے اور وضو کرتے ہیں تو کیا ایسے پانی سے وضو کرنا اور اس کو پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جس پانی کا ذکر ہے وہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے ماء جاری کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اس کے اوصاف ثلثہ یعنی رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی ایک تبدیل نہ ہوجائے تو وہ پاک ہے۔اس سے وضو کرنا اور اس کو استعمال میں لانا جائز ہے۔جیسا کہ عالمگیری میں اس کی صراحت ہے "ماء النھر او القناۃ اذا احتمل عذرۃ فاغترف انسان بقرب العذرۃ جاز والماء طاھر مالم یتغیر طعمه أو لونه أو ریحه"(عالمگیری، ۱/۱۷)

لمافی مجمع الانھر(۱/۴۸): فامّا أن یکون الماء جاریاً أو راکداً فان کان جاریاً إن کانت النجاسة غیر مرئیة فإنه لا یتنجس مالم یتغیر طعمه الخ۔

وفی قاضیخان (۱/۳): (ماء النهر أو القناة) اذا احتمل عذرةٌ فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم یتغیر طعمه أو لونه أو ریحه بالنجاسة۔

وفی الهندیة (۱/۱۷): وفی النصاب والفتوىٰ فی الماء الجاری أنه لا یتنجس مالم یتغیر طعمه أو لونه أو ریحه من النجاسة۔وإن کانت العذرة علی السطح فی مواضع متفرقة ولم تکن علی رأس المیزاب لا یکون نجسا وحکمه حکم الماء الجاری... ماء النهر أو القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم یتغیر طعمه أو لونه او ریحه...

(۱۹۴) ایسے تالاب سے وضو کرنا جس میں گندگی کے اثرات ظاہر ہوں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک تالاب ہے جس میں لوگ جانوروں کو پانی پلاتے ہیں، پانی پیتے وقت جانور اس میں پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن یہ سب ایک طرف ہوتا ہے دوسری طرف سے کوئی جانور نہ تو پانی پیتا ہے اور نہ پیشاب وغیرہ کرتا ہے البتہ اس طرف بھی گندگی کے اثرات پائے جاتے ہیں مثلاً پانی میں بدبو وغیرہ کیا ایسے تالاب سے وضو کرنا جائز ہے؟ اس تالاب کی لمبائی تقریباً چالیس فٹ اور چوڑائی بیس فٹ ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پانی کے تین اوصاف (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک وصف نجاست کی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک شمار ہوگا۔ اگرچہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، لہٰذا مذکورہ تالاب کا پانی ناپاک ہے اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الھندیة (۱/۱۸): الماء الراکد اذا کان کثیرا فھو بمنزلة الجاری لا یتنجس جمیعه بوقوع النجاسة فی طرف منه الا ان یتغیر لونه او طعمه اوریحه و علی ھذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشائخ کذا فی المحیط۔

وفی الدرالمختار (۱/۱۸۵): (وبتغیر احد اوصافه) من لون اوطعم اوریح (ینجس) الکثیرولو جاریاً اجماعاً، اما القلیل فینجس وان لم یتغیر۔

(۱۹۵) اگر لائن کے پانی میں سخت بدبو آرہی ہو، تو کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ روز ہمارے گھر جو لائن کا پانی آیا وہ دیکھنے میں تو صاف ہے لیکن اس میں سے گٹر کے پانی کی سخت بو آرہی ہے، ہمارے گھر گزشتہ ایک ہفتہ سے میٹھا پانی بالکل نہیں ہے، آیا اب ہم اس پانی کو کسی اور استعمال میں لاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر اس پانی کے بارے میں آپ کا غالب گمان یہ ہے کہ اس پانی میں گٹر کا پانی مل گیا ہے، جبکہ گٹر کے پانی کا پینے کے پانی کی لائن کے ساتھ مل جانا ممکن بھی ہو اور اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں تو پھر یہ پانی ناپاک ہے اس کا استعمال درست نہیں ہے، اور اگر اس پانی کے ساتھ گٹر کے پانی کے مل جانے کا غالب گمان نہیں ہے محض شک ہے تو پھر یہ پانی پاک ہے اور اس پانی کا استعمال کرنا ہر طرح سے درست ہے اور اس شک کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ پانی میں اصل طہارت ہے لہٰذا جب تک اس کے ناپاک ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو اسے ناپاک نہیں کہا جائے گا اور اس پانی کے بارے میں مزید تحقیق وجستجو کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لما فى الولوالجية(١/٣٩): الماء اذا انتن وهو كثير ان علم بوقوع النجاسة او جيفة فيه يتنجس الماء وفى ردالمحتار (١/١٨٦): (قوله لالو تغير الخ)أى لاينجس لو تغير فهو عطف على قوله وينجس لاعلى قوله بموت فتامل ممعنا۔ (قوله فلو علم الخ) صرح به لزيادة التوضيح والافهو داخل تحت قول المصنف وبتغير احد اوصافه بنجس۔ (قوله ولو شك الخ) اى ولايلزم السوال بحر. وفيه عن المبتغى بالغين وبرؤية آثار اقدام الوحوش عند الماء القليل لايتوضاء به ولو مرسبع بالركية وغلب على ظنه شربه منها تنجس والافلا اھ. وينبغى حمل الاول على ما اذا غلب على ظنه ان الوحوش شربت منه بدليل الفرع الثانى والافمجرد الشك لايمنع لما فيه الاصل انه يتوضأ من الحوض الذى يخاف قذرا ولا يتيقنه وينبغى حمل التيقن المذكور على غلبة الظن و الخوف على الشك أو الوهم كما لا يخفى اھ۔

فصل فی احکام الجنب والمعذور

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۹۶) حالت جنابت میں کھانے پینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو غسل جنابت کی حاجت ہو اور وہ غسل کو مؤخر کر کے اسی حالت میں کھاتا پیتا رہے تو کیا ایسی حالت میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جنابت کی حالت میں کھانا پینا جائز ہے۔البتہ مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے اور کلی کر لے۔

لمافی الھندیة (۱۶/۱): وان أراد أن یأکل اویشرب فینبغی أن یتمضمض ویغسل یدیه۔

وفی رد المحتار(۱/۱۷۵):(قوله بعد غسل ید وفم) اما قبله فلا ینبغی لانه یصیر شاربا للماء المستعمل وھو مکروہ تنزیھا ویدہ لاتخلو عن النجاسة فینبغی غسلھا ثم یأکل۔بدائع وفی الخزانة وان ترك لایضرہ۔

(۱۹۷) حالت ہمبستری میں بچے کو دودھ پلانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص عورت سے ہمبستری کر رہا تھا کہ اچانک بچے نے رونا شروع کر دیا عورت نے اسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا،تو کیا شرعاً جماع کی حالت میں بچے کو دودھ پلانا درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... درست ہے۔

لمافی المبسوط للسرخسی(۱/۷۰): (واذا عرق الجنب أوالحائض فی ثوب لم یضرہ)۔۔۔۔۔لانه لیس علی بدن الانسان الجنب والحائض نجاسة عینیة فھو وأعضاء المحدث سواءٌ۔

وفی ردالمحتار(۱/۲۹۲): ولایکرہ طبخھا ولااستعمال مامسته من عجین أوماء أونحوھما۔

(۱۹۸) جنبی کیلئے بال اور ناخن کاٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جس کے اوپر غسل فرض ہو، اس کو حالت جنابت میں ناخن اور بال نہیں کاٹنے چاہئیں، کیا یہ بات صحیح ہے یا اس حالت میں ناخن بال کاٹنے کی گنجائش ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جس آدمی پر غسل واجب ہو اس کیلئے ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے، البتہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں ان امور سے فارغ ہو جانا چاہیے۔

لما فی البخاری (۴۲/۱): قال عطاء: یحتجم الجنب ویقلم أظفاره ویحلق رأسه و ان لم یتوضأ

وفی الھندیة (۳۵۸/۵): حلق الشعر حالة الجنابة مکروہ وکذا قص الاظافیر کذا فی الغرائب۔

وفی معارف السنن (۴۰۰/۱): ویجوز للجنب جمیع المعاملات التی یفعلها الطاھر الغیر الجنب ... ماعدا دخول المسجد و الطواف وقرأة القرآن۔

(۱۹۹) مذکورہ فتوے پر ایک استدراک اور اس کا جواب

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فتاویٰ ہندیہ (۵ / ۳۵۸) پر جنبی کے بال یا ناخن کاٹنے سے متعلق یہ عبارت تحریر ہے:

"حلق الشعر حالة الجنابة مکروہ وکذا قص الاظافیر کذا فی الغرائب"

یہ عبارت صراحۃً اس عمل کے مکروہ ہونے پر دال ہے اور فقہاء کا اصول ہے کہ مطلقاً مکروہ کا اطلاق مکروہِ تحریمی پر ہوتا ہے لیکن آپ کے نجم الفتاویٰ جلد ثانی میں اسے جائز تک لکھا ہے کیا یہ تضاد نہیں؟ از راہِ کرم مسئلے کی مفصل تنقیح فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مسئلہ ہذا میں نجم الفتاویٰ میں شائع شدہ ہمارے فتوے کی عبارت یہ ہے:

"جس آدمی پر غسل واجب ہو اس کیلئے ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے البتہ اولی اور بہتر یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں ان امور سے فارغ ہوجانا چاہیئے۔ لما فی البخاری .... الخ

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ہم نے ناخن یا بال کاٹنے کو جنبی کیلئے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا بلکہ خلافِ اولیٰ یعنی مکروہ تنزیہی قرار دیا تھا۔ فتاویٰ ہندیہ کی عبارت کا بھی یہی مطلب ہے کہ حالتِ جنابت میں ناخن یا بال کاٹنا مکروہ تنزیہی ہے۔ وہ اس طرح کہ فقہاء نے جہاں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ کتبِ فقہ میں مطلقاً ذکرِ مکروہ سے کراہتِ تحریمی مراد ہوتی ہے وہاں یہ قید بھی ذکر ہے کہ کوئی صارف ایسا موجود نہ ہو جو اس مکروہ کے کراہتِ تنزیہی ہونے پر دال بن رہا ہو۔ شامیہ میں ہے:

"(قوله: والا فتنزيهية) راجع الى قوله فان لم يكن نهيا بل كان مفيدا للترك الغير الجازم والى قوله ولا صارف اى وان كان نهيا ولكن وجد الصارف له عن التحريم فهى فيهما تنزيهية"
(شامية: مطلب فى الكراهة التحريمية والتنزيهية ۶۳۹/۱)

اس عبارت میں علامہ شامی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر مکروہ کیلئے کوئی صارف موجود ہو یا نہی میں زیادہ جزم نہ ہو بلکہ کچھ سہولت سی ہو تو ایسی نہی مکروہ تحریمی نہیں بلکہ مکروہِ تنزیہی قرار دی جائے گی۔ نیز ہندیہ کی عبارت میں مطلقاً "حلق الشعر حالة الجنابة مكروه الخ" (ہندیہ ۵/ ۳۵۸) مکروہ ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن صارف کے پائے جانے کی وجہ سے یہاں مکروہ سے مکروہ تنزیہی مراد ہوگا اور مکروہِ تنزیہی اسی کو کہتے ہیں کہ اس کا کرنا جائز لیکن خلافِ اولیٰ ہو۔ صارف مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً...... اس کے متعلق بخاری شریف میں حضرت عطاء رحمہ اللہ سے تعلیقاً ذکر ہے:

وقال عطاء يحتجم الجنب ويقلم اظفاره ويحلق راسه وان لم يتوضا
"یعنی حالت جنابت میں جنبی شخص پچھنا لگوا سکتا ہے اور ناخن اور بال بھی کاٹ سکتا ہے اگرچہ وہ وضو بھی نہ کرے۔
(بخاری، ۱/ ۴۲)

اس تعلیق سے تو مطلقاً اباحت ثابت ہوتی ہے۔

ثانیاً...... فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عطاءؒ کی اسی تعلیق کے تحت مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول ذکر کیا ہے:

''يستحب له الوضوء'' (فتح البارى ۱/ ۳۱۱) "یعنی جنبی کیلئے (ان افعال سے قبل) وضوء کر لینا مستحب ہے۔"

یہاں بھی جنبی کیلئے غسل سے قبل فقط وضوء کر کے ان افعال کا جواز بیان کیا گیا ہے۔

ثالثاً...... معارف السنن وغیرہ میں جنبی کے لیے حرام کاموں کا ذکر ہے اس میں ناخن کاٹنے اور بال کاٹنے کا ذکر نہیں لہٰذا یہ بھی دال ہے کہ ان افعال کی کراہت اتنی سخت نہیں معارف السنن میں ہے:

"ويجوز للجنب جميع المعاملات التى يفعلها الطاهر الغير الجنب .... ماعدا دخول المسجد والطواف وقراءة القرآن (معارف السنن ۱/ ۴۰۰)
"اور جنبی کیلئے تمام وہ معاملات جو پاک غیر جنبی شخص کیلئے کرنا جائز ہیں وہ اس کے لیے بھی جائز ہیں .... سوائے مسجد میں دخول، طواف اور تلاوتِ قرآن"

رابعاً...... نجاست کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں جنبی کی جنابت باطنی ہے "ان المومن لا ينجس" "بے شک مومن ناپاک نہیں ہوتا لہٰذا یہ اعضاء (ناخن، بال وغیرہ) ناپاک نہیں تو ان کو کاٹنے میں کسی نجاست کا قبل از طہارت علیحدہ کر دینا بھی لازم نہیں آتا۔ یہ اصول بھی ان اعضاء کے کاٹنے کے جواز پر دال ہے۔

خامسا...... یہ ہندیہ کا تفرد ہے۔ کسی اور کتاب میں حالت جنابت کے اندران افعال کی کراہت ذکر نہیں۔ فقط ہندیہ میں غرائب کے حوالے سے انہیں مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ طرز بھی اس کراہت کی خفت پر صریح دال ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں بخاری شریف میں ذکر عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کی تعلیق، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا فتح الباری سے نقل شدہ قول، معارف السنن میں ذکر جنبی کے لیے ممنوع افعال میں ان افعال کا عدم ذکر، ان المؤمن لا ینجس یعنی مومن کے ناپاک نہ ہونے کا اصول اور پھر ہندیہ کا مسئلہ ہذا میں غرائب کے حوالے سے تفرد یہ سب باتیں صریح دال ہیں کہ ہندیہ میں ذکر کراہت کے قول سے مکروہ تنزیہی ہونا مراد ہے۔ نیز شامیہ کے حوالے کے مطابق مطلقاً ذکر کراہت کیلئے اگر کوئی صارف یا باعث خفت امر ہو تو مکروہ تنزیہی مراد ہوتی ہے اور یہاں یہ امور کراہت کی خفت اور صارفِ صریح ہیں لہٰذا ہندیہ میں ذکر جنبی کیلئے ناخن اور بال کاٹنے کے کراہت کے قول کو مکروہ تنزیہی ہونے پر حمل کیا جائے گا۔ نیز مکروہ تنزیہی کہتے ہی اس فعل کو ہیں جو جائز تو ہو لیکن اس کا کرنا خلاف اولیٰ ہو لہٰذا نجم الفتاویٰ میں طبع شدہ فتویٰ درست اور صائب ہے۔

لمافی البخاری (باب الجنب یخرج ویمشی فی السوق وغیرہ) (۱/۴۲): وقال عطاء: يحتجم الجنب ويقلم اظفاره ويحلق رأسه وان لم يتوضا۔

وفی فتح الباری (۱/۳۱۱): وقال عطاء هذا التعليق وصله عبد الرزاق عن بن جريج عنه وزاد ويطلى بالنورة ولعل هذه الأفعال هي المرادة بقوله وغيره بالرفع في الترجمة ـــــ قوله حدثنا سعيد هو بن أبي عروبة كذا لهم الا الأصيلي فقال شعبة قوله أن النبي وفي رواية الأصيلي وكريمة أن نبي الله صلى الله عليه وسلم وقد تقدم الكلام على هذا الحديث في باب إذا جامع ثم عاد وإيراده له في هذا الباب يقوي رواية وغيره بالجر لأن حجر أزواج النبي صلى الله عليه وسلم كانت متقاربة فهو محتاج في الدخول من هذه إلى هذه إلى المشي وعلى هذا فمناسبة إيراد أثر عطاء من جهة الاشتراك في جواز تشاغل الجنب بغير الغسل وقد خالف عطاء غيره كما رواه بن أبي شيبة عن الحسن البصري وغيره فقالوا يستحب له الوضوء وحديث أنس يقوي اختيار عطاء لأنه لم يذكر فيه أنه توضأ فكأن المصنف أورده ليستدل له لا ليستدل به ۔

وفی الشامیة: مطلب فی الكراهة التحريمية والتنزيهية (۱/۶۳۹): قلت ويعرف أيضا بلا دليل نهي خاص بأن تضمن ترك واجب أو ترك سنة فالأول مكروه تحريما والثاني تنزيها ولكن تتفاوت التنزيهية في الشدة والقرب من التحريمية بحسب تأكد السنة فإن مراتب الاستحباب متفاوتة كمراتب السنة والواجب والفرض فكذا أضدادها كما أفاده في شرح المنية وسيأتي في آخر المكروهات تمام ذلك قوله (وإلا فتنزيهية) راجع إلى قوله فإن نهيا أي وإن لم يكن

نهيا بل كان مفيدا للترك الغير الجازم وإلى قوله ولا صارف أي وإن كان نهيا ولكن وجد الصارف له عن التحريم فهي فيهما تنزيهية۔

(۲۰۰) ناپاکی کی حالت میں دعاوتسبیح کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو احتلام ہو جائے تو ناپاکی کی حالت میں نیند سے بیدار ہونے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... حالت جنابت (خواہ وہ احتلام کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے) میں ہر طرح کی دعا پڑھنا، ذکر کرنا تسبیح پڑھنا جائز ہے، البتہ باوضوء ہو کر ذکر و تسبیح کرنا افضل ہے خواہ حالت جنابت ہو یا نہ ہو۔

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۵۰): قال فی البحر وأما الاذكار فالمنقول اباحتها مطلقا ويدخل فيها اللهم اهدنا واللهم انا نستعينك على ماعليه الفتوى وفي الهداية وغيرها استحباب الوضوء لذكر الله تعالىٰ وتركه خلاف الاولى وهو مرجع كراهة التنزيه۔

وفي الدر المختار(۱/۲۹۳): (ولا باس) لحائض وجنب (بقراءة ادعية و مسها وحملها وذكر الله تعالىٰ و تسبيح)۔

(۲۰۱) ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو چھونا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک امام صاحب سے ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ناپاکی کی حالت میں قرآن پاک کے الفاظ کو ہاتھ لگانا جائز نہیں لیکن خالی جگہ اور جلد کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ کیا امام صاحب کی بات صحیح ہے؟ بصورت دیگر صحیح مسئلہ بتا کر میری رہنمائی فرمائیں میں کافی الجھن میں مبتلا ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... ناپاکی کی حالت میں، چاہے انسان حالت جنابت میں ہو یا حالت حدث اصغر (بے وضو حالت) میں یا حالت حیض میں ہو، ناپاکی کی ان تمام صورتوں میں مصحفِ قرآن کو یعنی قرآن مجید کے نسخے کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے چاہے اس کے الفاظ ہوں یا اس کی جلد یا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہے ہاں اگر قرآن کی آیات کسی دوسری چیز پر لکھی ہوئی ہیں مثلاً کاغذ وغیرہ پر، تو اس صورت میں الفاظ قرآن کو ہاتھ لگانا منع ہے باقی کاغذ وغیرہ کا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہوا ہے وہاں ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ناپاکی کی حالت میں مصحف قرآن کو بھی غلاف یا کسی کپڑے سے ہاتھ لگانا جائز ہے مگر غلاف یا کپڑا ایسا ہونا چاہیے جو کہ اس قرآن سے بالکل جدا ہو، اگر کوئی کپڑا وغیرہ قرآن کے ساتھ لگا ہوا ہے اور وہ جدا نہیں ہوتا تو اس کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں جہاں تک رہی اس مسئلہ میں

آپ کے امام صاحب کی بات توممکن ہے ان کی مراد مصحف قرآن نہ ہو بلکہ کاغذ وغیرہ پر لکھا ہوا مراد ہو، اور اگر ان کی مراد مصحف قرآن ہے تو ان کی بات ٹھیک نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر(۱/۱۶۹): (قوله وغلافه ما یکون متجافیا عنه) ای منفصلا وهو الخریطة خلافا لمن قال هو الجلد او الکم لان الجلد الملصق تابع له حتی یدخل فی بیعه بغیر شرط فلمسه حکم مسه۔

وفی الهندیة(۱/۳۸۔۳۹): (ومنها) حرمة مس المصحف لا یجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلافٍ متجاف عنه کالخریطة والجلد الغیر المشرز لا بما هو متصل به هو الصحیح هکذا فی الهدایة وعلیه الفتوی کذا فی الجوهرة النیرة والصحیح منع مس حواشی المصحف والبیاض الذی لا کتابة علیه هکذا فی التبیین۔

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۹۳): (ومسه) ولو مکتوبا بالفارسیة فی الاصح(الا بغلافه) المنفصل کمامر (قوله ومسه) أی القران ولو فی لوح او درهم او حائط لکن لا یمنع الامن مس المکتوب، بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه وقال بعضهم یجوز وهذا اقرب الی القیاس، والمنع اقرب الی التعظیم کما فی البحر أی والصحیح المنع کما نذکره...... (قوله الا بغلافه) المنفصل ای کالجراب والخریطة دون المتصل کالجلد المشرز هو الصحیح وعلیه الفتوی، لان الجلد تبع له سراج، وقدمنا ان الخریطة الکیس۔

(۲۰۲) جنبی میت کو غسل کتنی بار دیا جائے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت اگر جنبی ہو تو اس کو دو مرتبہ غسل دیا جائے گا یا ایک ہی غسل کافی ہے عام میت کی طرح۔ براہ مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......زندگی کی تمام عبادات ومعاملات موت کے آنے پر ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور میت اپنی بقاء والی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے اسی وجہ سے میت کو تکریم وتعظیم دینے کیلئے غسل اور صاف لباس دیا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں جنبی میت سے وجوب کا حکم ساقط ہو کر ایک یعنی میت والا غسل دیا جائے گا۔

لما فی المحیط البرهانی (۲/۵۵): هما یقولان: الغسل الواجب بالجنابة سقط بالموت، لأن الغسل کان واجب علیه فسقط بالموت لعجزه۔

وفی الدر المختار(۲/۱۹۷): (وان زاد علیها أو نقص جاز) اذ الواجب مرة (ولایعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه) لأن غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت

كسائر الحيوانات الدموية الا ان المسلم يطهر بالغسل كرامة۔

وفي الشامية تحته: (قوله وان زاد) أي عند الحاجة لكن ينبغي ان يكون وتراً۔ ذكره في شرح مختصر... (قوله جاز) أي صح وكره بلاحاجة لانه اسراف او تقتير۔

(۲۰۳) طہارت وغیرہ سے معذور شخص کے وضو اور نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک جاننے والے بہت زیادہ بیمار ہیں انہیں ہر وقت پیمپر لگا ہوا ہوتا ہے اور پیشاب کیلئے تھیلی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ کئی بیٹے ہیں جو کہ مالی لحاظ سے بہت بہتر ہیں، مگر خاص خیال نہیں رکھتے انہیں نماز پڑھنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ براہ کرم اس حالت میں ان کیلئے نماز پڑھنے کا طریقہ بتلا دیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورتِ مسئولہ میں دو شقیں ہیں:

پہلی شق معذور شخص کی نماز پڑھنے کے بیان میں ہے......ایسا شخص جسے پیشاب کے قطرے تسلسل کے ساتھ آتے ہوں کہ فرض نماز کا پورا وقت اس میں گزر جائے یا جس کا پیٹ جاری ہو جائے یا کوئی اور زخم جو مستقل رستا رہے۔ شریعت کی اصطلاح میں معذور کہلاتا ہے۔ اور صورت مسئولہ میں مریض شخص جسے پیشاب کی تھیلی لگی ہوئی ہے۔ شرعاً یہ بھی معذور ہی کے حکم میں ہے اور اس قسم کے معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کیلئے ابتداء دخول وقت میں وضو کرا دیا جائے اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیں۔ کپڑے وغیرہ دھونے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح اگر پیمپر دور کرنے میں مشقت زیادہ ہو تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے۔

دوسری شق نماز پڑھنے کے طریقے کے بیان میں ہے......اگر مریض وضو کرنے پر قادر ہو یا کوئی اور شخص معاونت کرنے والا موجود ہو جیسے خادم یا اس کی اولاد وغیرہ تو یہ لوگ مریض کو وضو کرائیں اور پھر مریض قبلہ رُخ بیٹھ کر کہ اس کے پاؤں قبلہ رُخ ہوں سر کے اشارے سے نماز پڑھ لے۔ اگر بیٹھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم تکیہ رکھ کر تھوڑا سا اونچا کر دیں۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دائیں کروٹ پر لیٹ کر کہ چہرہ قبلہ کی طرف ہو نماز پڑھ لے اور اگر زیادتی مرض کی وجہ سے مریض وضو پر قادر نہ ہو تو تیمم کرا کے نماز اسی مذکورہ بالا طریقے پر پڑھ لے۔ اور تیمم کی نیت مریض پر لازم ہوگی۔

لمافي الهندية(١٣٦/١): وان تعذر القعود أومأ بالركوع والسجود مستلقيا على ظهره وجعل رجليه الى القبلة، وينبغي ان يوضع تحت راسه وسادة حتى يكون شبيه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود، وان اضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة وأومأ جاز والأول اولى۔

وفيه ايضا(٤١/١): المستحاضة ومن به سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الريح او رعاف دائم او جرح لا يرقأ يتوضأون لوقت كل صلاة ويصلون بذلك الوضوء في الوقت ما شاؤوا من الفرائض والنوافل...ويبطل الوضوء عندخروج وقت المفروضة بالحدث السابق

هکذافی الهداية وهوالصحيح۔

وفی الدرالمختار(۲۳۳/۱): من عجز عن استعمال الماء... او لمرض يشتد او يمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرك اولم يجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلك لايتيمم فی ظاهر المذهب کمافی البحر۔

وفی الشامیه تحته :قوله ولو بتحرك الخ... ولا فرق عندنا بين ان يشتد بالتحرك كالمبطون او بالاستعمال كالجدری قوله او لم يجد الخ ای او كان لا يخاف الاشتداد ولا الامتداد لكنه لا يقدر بنفسه ولم يجد من يوضئه قوله كمافی البحر حاصل مافيه انه ان وجد خادماً ای من تلزمه طاعته كعبده وولده واجيره لايتيمم اتفاقاً، وان وجد غيره ممن لو استعان به اعانه ولو زوجته فظاهر المذهب انه لا يتيمم ايضاً بلا خلاف الخ۔

(۲۰۴) آپریشن کے بعد پیشاب کے قطرات کا آنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا پیشاب رک گیا تھا لہٰذا اس کا آپریشن کروایا ہے، آپریشن کو تقریباً پانچ چھ دن ہو گئے ہیں، اب میری حالت یہ ہے کہ پیشاب سے فارغ ہونے کے بعد بستر پر بیٹھتا ہوں یا پھر لیٹتا ہوں تو ایک دو قطرے نکل جاتے ہیں یا پھر سونے کی حالت میں نکل جاتے ہیں جس کا مجھے احساس نہیں ہوتا ابھی غبارہ بھی استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ ابھی زخم ہیں، لہٰذا آنجناب سے عرض ہے کہ بیٹھ کر نماز ادا کرنے اور کپڑوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ آپ معذور کب شمار ہو سکتے ہیں تو اس کیلئے ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ آپ کو وضو سے فراغت کے بعد پیشاب کے قطرات آنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ آپ فرض نماز پڑھ سکیں تو آپ معذور سمجھے جائیں گے، اور اس وقت تک معذور شمار کیے جائیں گے جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی آپ کا عذر پایا جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر آپ فی الحال معذور کے حکم میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کپڑوں میں نماز کی ادائیگی صحیح نہیں بلکہ پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھنا ضروری ہے، البتہ اگر کھڑے ہونے سے قطرات آتے ہوں یا کسی اور وجہ سے کھڑے نہ ہو سکتے ہوں تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الدر المختار (۳۰۶/۱):(وان سال على ثوبه)فوق الدرهم (جاز له ان لا يغسله ان كان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) أی الصلاة (وإلا) يتنجس قبل فراغه (فلا) يجوز ترك غسله هوالمختار للفتوى۔

•فی الدر المختار(۳۰۵/۱): (ان استوعب عذره تمام وقت صلوة مفروضة) ...(ولو حكما)

لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء كفی وجوده فی جزء من الوقت) ولو مرة (وفی) حق الزوال يشترط (استيعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقيقة) لأنه الانقطاع الكامل...

وفيه ايضا(۱/۳۰۷۔۳۰۸): يجب رد عذره. او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر۔

(۲۰۵) سجدہ کرنے سے اگر خون نکلے تو کیا ایسا شخص معذور ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے گھٹنے میں پھوڑا ہے وہ جب بھی سجدے کیلئے گھٹنہ نیچے لگاتا ہے اس پھوڑے سے خون نکلنا شروع ہوجاتا ہے ایسی حالت میں نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے، کیا ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل ہے کہ ایک وضو سے مکمل نماز پڑھ لے ورنہ تو نماز پڑھنا بہت مشکل ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں جیسا کہ سوال سے معلوم ہورہا ہے کہ خون صرف سجدے میں گھٹنا ٹیکنے سے نکلتا ہے ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل نہیں ہوتا بلکہ آپ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھیں اور اگر دوران نماز کسی وجہ سے خون جاری ہوگیا تو دوبارہ نئے سرے سے وضو کرنا ہوگا۔

لمافی الدر المختار(۱/۳۰۷۔۳۰۸): يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر۔

(۲۰۶) سلس البول (پیشاب کے قطرے) والے مریض کیلئے طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے پیشاب کرنے کے بعد وقفے وقفے سے قطرے آتے ہیں کیا میں ہر مرتبہ وضو کیا کروں اور کپڑوں کو پاک کروں یا شریعت کی طرف سے اس میں کچھ چھوٹ ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر آپ کو یہ قطرے اس تسلسل سے آرہے ہیں کہ درمیان میں اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ ایک وقت کی فرض نماز ادا کرسکیں تو اس صورت میں آپ معذورین میں شامل ہیں جن کا حکم یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت وضو کرلیا کریں اور پھر اس وضو سے اس ایک وقت میں جتنے چاہیں فرائض اور نوافل ادا کریں اور تلاوت قرآن کریم کرلیں (اس ایک وقت کے درمیان میں جتنے بھی قطرے آجائیں آپ پاک ہی رہیں گے بشرطیکہ کوئی اور سبب وضو توڑنے کا نہ پایا جائے) یہاں تک کہ وقت ختم ہوجائے، یعنی جیسے ہی اس فرض نماز کا وقت ختم ہوگا تو آپ کا وضو بھی ختم ہوجائے گا اور پھر اگلی نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

اور اگر یہ قطرے کپڑوں پر گرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس تسلسل سے نکل رہے ہیں اگر اتنا بھی وقت نہ

ملے کہ بالفرض نماز شروع کرنے سے پہلے کپڑے کو دھویا مگر دورانِ نماز وہ قطرے اسی طرح کپڑوں میں نکل آئیں تو اس صورت میں آپ پر ان قطروں کا دھونا واجب نہ ہوگا، اگرچہ یہ قطرے مقدارِ درہم سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں اور اگر آپ کو یہ گمان ہے کہ ان قطروں کو دھونے کے بعد یہ دورانِ نماز مزید نہ نکلیں گے تو اس صورت میں ان کا دھونا واجب ہے۔ اور اگر ان قطروں میں مقدارِ نماز کے برابر تسلسل نہیں ہے تو آپ معذورین میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کا وضو ان قطروں سے ٹوٹ جائے گا اور کپڑے بھی ناپاک ہوجائیں گے اور ان کا دھونا (جبکہ وہ مقدار درہم سے تجاوز کر جائیں) واجب ہوگا۔

لما فی الدرالمختار(۱/۳۰۵):(وصاحب عذر من به سلس البول)بول لايمكنه امساكه ---- (وان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة)بأن لايجد فی جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلی فيه خاليا عن الحدث (ولوحكماً) لان الانقطاع اليسير ملحق بالعدم-------(وحكمه الوضوء)لاغسل ثوبه ونحوه (لكل فرض)اللام للوقت كمافی لدلوك الشمس (ثم يصلی)به(فيه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولىٰ (فاذاخرج الوقت بطل) أی ظهر حدثه السابق -------(وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جازله أن لايغسله ان كان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) أی الصلاة (والا) يتنجس قبل فراغه (فلا) يجوز ترك غسله هو المختار للفتویٰ۔

وفی الهندية (۱/۴۱): المستحاضة ومن به سلس البول... يتوضؤن لوقت كل صلاة، ويصلون بذالك الوضوء فی الوقت ماشاؤا من الفرائض و النوافل... ويبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق... إذا كان به جرح سائل وقد شد عليه خرقة فأصابها الدم أكثر من قدر الدرهم أو أصاب ثوبه ان كان بحال لوغسله يتنجس ثانياً قبل الفراغ من الصلاة جاز أن لا يغسله وصلی قبل أن يغسله وإلا فلا هذا هو المختار۔

(۲۰۷) پیشاب کرنے کے آدھے گھنٹے بعد تک قطرے آنے والے مریض کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کے بعد آدھا پونا گھنٹہ قطرے آتے ہیں بسا اوقات نماز جماعت سے نکل جاتی ہے اور بسا اوقات نماز کا وقت بھی نکل جاتا ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟

(۲)......اسی طرح ایک دوسرے شخص کو ہر وقت پیشاب کے قطرے آتے ہیں جس کی وجہ سے شلوار وغیرہ خراب رہتی ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱)......اگر پیشاب کے قطرے اتنے وقفے سے آتے رہتے ہیں کہ آدمی کو اتنا وقت نہیں

ملتا کہ وضو کرکے فرض نماز پڑھ لے تو پھر یہ شخص معذور ہے، اور معذور ہر فرض نماز کے وقت نیا وضو کرے گا اور وقت نکلتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور بعد میں ہر فرض نماز کے وقت میں ایک دفعہ عذر کا پایا جانا ضروری ہے اگر مکمل وقت بغیر عذر کے گزر گیا تو پھر اس کا عذر بھی ختم ہوگیا۔ صورت مسئولہ میں یہ شخص آخری وقت تک انتظار کرے اگر پھر بھی قطرے ختم نہیں ہوئے تو وقت نکلنے سے پہلے وضو کرے اور نماز پڑھے اگر دوسرا پورا وقت بغیر عذر کے گزر گیا یعنی اس کو دوسرے پورے وقت میں قطرے نہیں آئے تو یہ شخص پڑھی ہوئی نماز اور وضو کا اعادہ کرے گا اور اگر دوسرے وقت میں بھی اس کو قطرے آگئے تو نماز صحیح ہوگئی اعادہ لازم نہیں۔

(۲)......اگر کسی شخص نے پیشاب کے قطروں سے ناپاک شلوار وغیرہ اس لئے نہیں دھوئی کہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک ہوجائے گی تو اگر اسی کپڑے/شلوار وغیرہ میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہوگی۔ اور اگر شلوار وغیرہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک نہ ہوتی ہو تو اس کو ہر نماز کیلئے دھونا ضروری ہے اور اگر نہیں دھوئی اور اسی ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح نہیں ہوگی، بشرطیکہ نجاست درہم کی مقدار سے زیادہ ہو۔

لمافی الدر المختار(۱/۳۰۵-۳۰۶): (وصاحب عذر من به سلس) بول لایمکنه امساکه... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث ... (وهذا شرط) العذر(فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت) ولومرة (وفی) حق الزوال یشترط (استیعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقیقة) لانه الانقطاع الکامل۔ (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض)... (ثم یصلی) به(فیه فرضا ونفلا) ... (فاذا خرج الوقت بطل) ای ظهر حدثه السابق، حتی لوتوضأ علی الانقطاع ودام الی خروجه لم یبطل بالخروج مالم یطرأ حدث آخر اویسیل (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لایغسله ان کان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه(فلا) یجوز ترك غسله، هو المختار۔

وفی الشامیة (۱/۳۰۵): (قوله فی حق الابتداء) ای فی حق ثبوته ابتداء (قوله فی جزء من الوقت) ای من کل وقت بعد ذالك الاستیعاب... (قوله وفی حق الزوال) أی زوال العذر وخروج صاحبه عن کونه معذوراً (قوله تمام الوقت حقیقة) ای بأن لایوجد العذر فی جزء منه اصلا فیسقط العذر من اول الانقطاع، حتی لو انقطع فی اثناء الوضوء او الصلاة ودام الانقطاع الی آخر الوقت الثانی یعید، ولو عرض بعد دخول وقت فرض انتظر الی آخره۔ فان لم ینقطع یتوضأ ویصلی ثم ان انقطع فی اثناء الوقت الثانی یعید تلك الصلاة، وان استوعب الوقت الثانی لایعید لثبوت العذر حینئذ من وقت العروض اهـ ... وذکر فی البحر عن السراج انه لوانقطع بعد

الفراغ من الصلاۃ او بعد القعود قدر التشہد لا یعید لزوال العذر بعد الفراغ۔

(۲۰۸) پیشاب کے بعد کچھ دیر تک قطرے آنے سے معذور شمار نہیں ہوتا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ کو پیشاب کے بعد قطرے آتے ہیں تقریباً آدھا گھنٹہ اُٹھوں یا بیٹھوں تو قطرے خارج ہوجاتے ہیں، علاج بھی کرایا ایک سال لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا لہٰذا شریعت میں میرے لئے اب کیا حکم ہے؟ یا کوئی وظیفہ وغیرہ بتادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جس شخص کو پیشاب کے قطرے آتے ہوں چاہے پیشاب کرنے سے پہلے ہوں یا پیشاب کے بعد ہوں، یہ پیشاب کی بیماری تصور کی جاتی ہے لیکن یہ شخص شرعاً معذور اس وقت شمار ہوگا جبکہ ایک مرتبہ فرض نماز پڑھنے کا وقت بھی اس عذر کے بغیر نہ گزرے۔اورصورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو تقریباً پیشاب کے بعد آدھا گھنٹے تک پیشاب کے قطرے آتے ہیں، اس کے بعد بند ہوجاتے ہیں، لہٰذا آپ شرعاً معذور نہیں ہیں۔آپ نماز سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پیشاب کے قطروں کے خارج ہونے تک انتظار کریں، جب قطرے بند ہوجائیں اور آپ کو اطمینان حاصل ہوجائے تو پھر اس کے بعد وضو کر کے نماز ادا کریں۔

لمافی الھندیۃ(۱/۴۰):شرط ثبوت العذر ابتداء ان یستوعب استمرارہ وقت الصلوۃ کاملا وھو الاظھر کالانقطاع لایثبت مالم یستوعب الوقت کلہ۔

وفیہ ایضاً(۱/۴۱): المستحاضۃ ومن بہ سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الریح او رعاف دائم او جرح لایرقأ یتوضؤن لوقت کل صلوۃ ویصلون بذالک الوضوء فی الوقت ماشاؤا من الفرائض والنوافل ھکذا فی البحر الرائق۔وإن توضا علی السیلان وصلی علی الانقطاع وتم الانقطاع باستیعاب الوقت الثانی اعاد کذا فی شرح منیۃ المصلی لابراھیم الحلبی وکذا اذا انقطع فی خلال الصلوۃ وتم الانقطاع ھکذا فی المضمرات۔ویبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضۃ بالحدث السابق ھکذا فی الھدایۃ وھو الصحیح ھکذا فی المحیط فی نواقض الوضوء...

متی قدر المعذور علی ردّ السیلان برباط أو حشوأو کان لو جلس لا یسیل ولو قام سال وجب ردہ ویخرج بردہ عن ان یکون صاحب العذر بخلاف الحائض اذا منعت الدرور فانھا حائض۔

فصل فی الحیض والنفاس

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۰۹) عادت سے پہلے ماہواری آنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت ہے کہ مجھے ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے جو بارہ تاریخ سے شروع ہوکر اٹھارہ تاریخ تک عام طور پر رہتا ہے لیکن اس مرتبہ آٹھ تاریخ سے شروع ہوگیا ہے تو کیا یہ ماہواری خون ہوگا اور ان دنوں میں نماز وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... یہ ماہواری خون ہی شمار کیا جائے گا بشرطیکہ وہ تین دن سے کم نہ ہو، کیونکہ ان دونوں ماہواری کے درمیان پندرہ دن سے زائد کا فاصلہ ہے، اور پاکی کی اقل مدت پندرہ دن ہے تو آٹھ تاریخ سے شروع ہونے والا خون بھی حیض کا خون ہی شمار کیا جائے گا ان دنوں میں نماز وغیرہ ذمہ سے ساقط ہوجائے گی۔

لما فی الھندیة(۱/۳۷): اذا کان الطھر خمسة عشر یوماً أو أکثر یعتبر فاصلا فیجعل کل واحد من الدمین او احدھما بانفرادہ حیضا حسب ما امکن من ذلك۔(ص۳۸): (منھا) ان یسقط عن الحائض والنفساء الصلوة فلا تقضی ھکذا فی الکفایة ۔۔۔۔۔۔۔۔ومنھا ان یحرم علیھما الصوم فتقضیانه ھکذا فی الکفایة۔

وفی الدر المختار(۱/۲۸۵): (واقل الطھر) بین الحیضتین أوالنفاس والحیض (خمسة عشر یوماً) ولیا لیھا اجماعا۔ (ص۲۸۴):فبه تترك الصلوة ولو مبتدأة فی الأصح، لان الاصل الصحة والحیض دم صحة شمنی۔

وفی الشامیة (۱/۲۸۴): (قوله فبه) ای فبا لبروز تترك الصلوة وتثبت بقیة الأحکام، ولکن ھذا مادام مستمرا لما سیأتی من انه لوانقطع لدون أقله تتوضا وتصلی۔

(۲۱۰) ''بلوغت کے بعد صرف ڈیڑھ دن خون آیا'' ایسی خاتون کی ماہواری کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ابھی تک صرف ایک دو دفعہ ایک ڈیڑھ دن تک کیلئے ماہواری کا خون آیا ہے جبکہ میری عمر تیس سال ہے، میرے لئے ماہواری کا کیا حکم ہے؟ اور جو دو دفعہ خون آیا تھا وہ ماہواری شمار ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر ماہواری کا خون تین دن سے کم ہو تو وہ حیض شمار نہیں ہوتا، لہٰذا آپ کو جو ایک دو دفعہ خون آیا ہے وہ تین دن سے کم ہے وہ حیض شمار نہیں ہوگا، اور جب تک خون نہ آئے آپ پاک ہیں اور پاکی کی حالت کے جو احکامات ہیں وہی سب آپ کے لئے ہوں گے۔

لمافی ردالمحتار (۲۸۵/۱): الأولی ان تبلغ بالسن وتبقی بلا دم طول عمرها فتصوم وتصلی ویاتیها زوجها وغیر ذلك ابداً...الثانیة ان تری الدم عند البلوغ او بعده أقل من ثلاثة ایام ثم یستمر انقطاعه وحکمها کالأولی۔

(۲۱۱) تین دن سے کم خون آنا حیض شمار نہیں ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت جسکی عمر تقریباً پینتیس (۳۵) سال ہے اور اسے ہر ماہ صرف دو دِن خون آتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ خون حیض شمار ہوگا یا نہیں؟ اور جن دنوں میں یہ خون آتا ہو، ان دنوں میں عورت کیلئے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح دیگر احکامات مثلاً تلاوت وغیرہ کرنا، قرآن پاک چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......شریعت میں حیض کی کم سے کم مدت تین دن تین رات اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن دس رات ہے جو خون تین دن تین رات سے کم یا دس دن دس رات سے زیادہ آئے تو وہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا وہ استحاضہ کا خون ہے اور استحاضہ کا حکم پاکی کا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ عورت جس کو ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے یہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا لہٰذا یہ عورت جس طرح پاکی کے ایام میں فرائض (نماز، روزہ وغیرہ) ادا کرتی ہے اسی طرح ان دنوں میں بھی فرائض ادا کرے گی اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا یا باوضو اسے چھونا سب اس کے لیے جائز ہوگا البتہ اس پر معذور کے احکامات آئیں گے۔

لمافی بدائع الصنائع(۲۸۸/۱): ولنا ماروی ابو امامة الباهلی۔ رضی الله عنه۔ عن النبی ﷺ انه قال ''اقل ما یکون الحیض للجاریة الثیب والبکر جمیعا ثلاثة ایام واکثرما یکون من الحیض عشرة ایام وما زاد علی العشرة فهو استحاضة'' وهذا حدیث مشهور، وروی عن جماعة من الصحابة رضی الله عنهم... واما الثانی فذکر ظاهر الروایة ان اقل الحیض ثلاثة ایام

ولیالیھا۔

وفی الدر المختار(۱/۲۸۴): و(اقله ثلاثة ایام ولیالیها) الثلاث، فالاضافة لبیان العدد المقدر بالساعات الفلکیة لا للاختصاص، فلا یلزم کونها لیالی تلك الایام وکذا قوله(واکثره عشرة) بعشر لیال کذا رواه الدار قطنی وغیره۔

(۲۱۲) ماہواری کے دنوں میں خون رکنے کا حکم اور اس وقت میں اعمال کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اٹھارہ تاریخ سے خون شروع ہوکر پچیس تاریخ تک جاری رہتا ہے لیکن درمیان میں کبھی ایک گھنٹے کیلئے کبھی دو گھنٹے اور کبھی ایک آدھ دن کیلئے رک کر پھر جاری ہوجاتا ہے جس وقت خون بند ہوجاتا ہے اتنا وقت پاک شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس وقت نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایام ماہواری کے جن اوقات میں خون آنا رک جاتا ہے وہ ایام ماہواری ہی کے شمار ہوتے ہیں اس لئے آپ کا ماہواری کے دنوں میں ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا تلاوت کرنا درست نہیں۔

لما فی البحر الرائق(۱/۳۵۸): وقال محمد رحمه الله: الطهر المتخلل ان نقص عن ثلاثة ایام ولو بساعة لا یفصل اعتباراً بالحیض فان کان ثلاثة فصاعداً فان کان مثل الدمین أو أقل فکذلك تغلیباً للمحرمات لان اعتبار الدم یوجب حرمتها واعتبار الطهر یوجب حلها فغلب الحرام الحلال وان کان اکثر فصل ثم ینظر ان کان فی احد الجانبین مایمکن أن یجعل حیضا فهو حیض والاخر استحاضة وان لم یکن فالکل استحاضة...

وفی الشامیة(۱/۲۸۹): ثم اعلم ان الطهر المتخلل بین الدمین اذا کان خمسة عشر یوماً فأکثر یکون فاصلا بین الدمین فی الحیض اتفاقا فما بلغ من کل من الدمین نصابا جعل حیضا۔وانه اذا کان أقل من ثلاثة أیام لایکون فاصلاً وان کان اکثر من الدمین اتفاقا۔فلو رأت مبتدأة یوما دماً ویومین طهرا ویوما دما فالأربعة حیض لان الطهر المتخلل دون ثلاث وهو لا یفصل اتفاقا۔

(۲۱۳) تین دن ماہواری آکر دس دن کے بعد پھر آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو رمضان المبارک میں حیض تین دن تک رہا پھر وہ پاک ہوگئی پھر اس نے دس روزے رکھے پھر حیض شروع ہوگیا اور ایک دن رہا۔اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ حیض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو

ایک مہینے میں دومرتبہ حیض کس طرح آیا؟ اگر استحاضہ ہے تو پھر جو روزے رکھے ہیں وہ ہو گئے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مذکورہ عورت کو جب مکمل تین دن ورات خون (حیض) آیا پھر وہ پاک ہوگئی تو اس کا حیض ختم ہوگیا۔ دس روزے رکھنے کے بعد جو خون آیا وہ حیض نہیں بلکہ استحاضہ ہے اور جو دس روزے اس نے رکھے ہیں وہ بھی ہو گئے ہیں لہٰذا عورت نے اگر استحاضہ کے دوران نمازیں نہیں پڑھیں تو روزہ کی قضا کے ساتھ ساتھ نمازوں کی قضا بھی کرے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۳۳): الفاصل بین الدمین الطھر اذا کان اقل من خمسة عشر یوما لا یعتبر ولا یصیر فاصلا بین الدمین ویصیر کالدم المتوالی عند ابی یوسف رحمه الله واذا کان خمسة عشر یوما او اکثر یعتبر فاصلا۔

وفی الھندیة(۱/۳۶): اقل الحیض ثلاثة ایام وثلاث لیال فی ظاھر الروایة ھکذا فی التبیین واکثرہ عشرة ایام و لیالیھا کذا فی الخلاصة...(۱/۳۷) روی ابو یوسف عن ابی حنیفة ان الطھر المتخلل بین الدمین اذا کان اقل من خمسة عشر یوما لم یفصل و کثیر من المتاخرین أفتوا بھذہ الروایة لانھا اسھل علی المفتی والمستفتی... والاخذ بھذا ایسر کذا فی الھدایة وعلیه استقر رأی الصدر الشھید حسام الدین وبه یفتی کذا فی المحیط۔

وفی الدر المختار(۱/۲۸۴۔۲۸۵): والحیض دم صحة شمنی و(اقله ثلاثة ایام بلیالیھا)... (واکثرہ عشرة) بعشر لیال ... (والناقص) عن اقله (والزائد) علی اکثرہ... (استحاضة واقل الطھر) بین الحیضتین او النفاس والحیض (خمسة عشر یوما) ولیالیھا اجماعا (ولا حدلاکثرہ)۔

وفی کتاب الفقه(۱/۱۲۹): فلو حاضت المرأة ثم انقطع حیضھا بعد ثلاثة ایام مثلا واستمر منقطعا الی اربعة عشر یوما او اقل ثم رأت الدم لا یکون حیضا۔

وفیه ایضاً(۱/۱۳۰): وحکم الاستحاضة انھا لا تمنع شیئاً من الاشیاء التی یمنعھا الحیض والنفاس الخ۔

(۲۱۴) ماہواری کے بعد سفیدی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون کو جب ماہواری آتی ہے تو سات دن سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے اس کے بعد سفیدی آتی ہے، آیا یہ سفیدی حیض شمار ہوگی اس کے ہوتے ہوئے نماز روزے کا کیا حکم ہوگا۔ نیز اگر یہ سفیدی کپڑوں پر لگ جائے یا بدن پر لگ جائے تو کپڑے یا بدن نجس ہوں گے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... سات دن جو سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے یہ حیض ہے اس کے بعد جو سفیدی آتی ہے یہ

حیض شمار نہیں ہوگی بلکہ یہ حیض ختم ہونے کی علامت ہے اس کے اندر نماز روزہ لازم ہے۔ البتہ اس سفیدی کے کپڑوں یا بدن پر لگ جانے سے کپڑے یا بدن ناپاک ہو جاتے ہیں ان کا دھونا ضروری ہے۔

لما فی المحیط البرهانی(۱/۴۱۰): واذا وضعت الکرسف فی اول اللیل وهی حائض، ونامت فنظرت الی الکرسف حین اصبحت، فرأت البیاض الخالص فعلیها قضاء العشاء للتیقن بطهرها من حیث وضعت الکرسف ...

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۶۱۳-۶۱۸): ورأی الحنفیة: ان الوان دم الحیض ستة: السواد، والحمرة والصفرة، والکدرة، والخضرة، والتربیة(ای علی لون التراب) علی الأصح: فکل ما یری فی ایام الحیض من هذه الدماء فهو حیض، حتی تری البیاض الخالص: وهو شیئ یشبه المخاط یخرج عند انتهاء الحیض أوهو القطن الذی تختبر به المرأة نفسها، اذا خرج أبیض، فقد طهرت

وفیه ایضاً(۱/۶۱۸): والمراد بالطهر: هو زمان نقاء المرأة من دم الحیض والنفاس وللطهر علامتان: جفاف الدم أو جفوفه والقصة البیضاء: هی ماء ابیض رقیق یأتی فی آخر الحیض۔

(۲۱۵) کافی عرصہ کے بعد خون کا قطرہ دیکھنے پر ماہواری کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج سے چند سال پہلے میرے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے مجھے ماہواری آنا بند ہو گئی۔ میں نے اس کا علاج کروایا تو مجھے ایک روز خون کا قطرہ دکھائی دیا، آیا یہ میری ماہواری شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......حیض کی کم سے کم مدت تین دن ہے اگر تین دن سے کم خون نظر آئے تو یہ حیض کا خون نہیں ہوتا بلکہ یہ استحاضہ کا خون ہوتا ہے لہٰذا جو آپ کو ایک روز خون کا قطرہ نظر آیا ہے یہ آپ کی ماہواری یعنی حیض کا خون نہیں ہے بلکہ استحاضہ کا خون ہے پس اس بناء پر اگر آپ نے فرض نماز چھوڑ دی ہے تو آپ پر اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لما فی سنن الدار قطنی (۱/۲۱۷): عن أنس رضی الله عنه قال ”أدنی الحیض ثلاثة واقصاه عشرة قال وکیع: ((الحیض ثلاث إلی عشر فما زاد فهی مستحاضة))۔“

وفی سنن الدار قطنی (۱/۲۱۷): عن سفیان رضی الله عنه قال: ((اقل الحیض ثلاث واکثره عشرة))۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۶۱۵): ... ان اقل الحیض: ثلاثة ایام ولیالیها وما نقص عن ذالك فلیس بحیض وانما هو استحاضة۔

(۲۱۶) طہر متخلل کا مسئلہ

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ہر ماہ دس تاریخ سے سولہ تک ماہواری کا لگا تار خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ دس گیارہ کو خون آیا پھر چار دن نہیں آیا اس کے بعد مسلسل چار دن خون آیا تو یہ درمیان میں جو دن گزرے ہیں ان میں نمازوں کا کیا حکم ہوگا اور بعد میں جو چار دن خون آیا ہے یہ حیض کا شمار ہوگا یا استحاضہ ہوگا۔ اس مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب……آپ کی ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معتادہ ہیں آپ کو ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ جو دو دن خون آیا اور چار دن نہیں آیا اور پھر چار دن خون آیا تو یہ تمام دن حیض کے شمار ہوں گے کیونکہ جو چار دن بیچ میں خون نہیں آیا یہ طہر متخلل ہے اور جب طہر متخلل پندرہ دن سے کم ہو تو وہ دم جاری کے حکم میں ہوتا ہے لہٰذا یہ تمام دس دن حیض کے شمار ہوں گے جن میں نماز معاف ہے۔

لما في الهندية(۱/۳۶-۳۷): الطهر المتخلل بين الدمين والدماء في مدة الحيض يكون حيضاً… وروى ابو يوسف عن ابي حنيفة ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان اقل من خمسة عشر يوماً لم يفصل وكثير من المتأخرين أفتوا بهذه الرواية لانها اسهل على المفتي والمستفتي۔

وفي الهندية(۱/۳۷): فان لم يجاوز العشرة فالطهر والدم كلاهما حيض سواء كانت مبتدأة او معتادة وان جاوز العشرة ففي المبتدأة حيضها عشرة ايام وفي المعتادة معروفتها في الحيض حيض والطهر طهر۔

وفيه ايضاً(۱/۳۸): (الاحكام التي يشترك فيها الحيض والنفاس ثمانية) (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضي۔

وفي الشامية(۱/۲۸۵): اما المعتادة فما زاد على عادتها ويجاوز العشرة في الحيض والاربعين في النفاس يكون استحاضة كما اشار اليه بقوله او على العادة الخ۔ اما اذا لم يتجاوز الأكثر فيهما فهو انتقال للعادة فيهما فيكون حيضا ونفاسا۔

(۲۱۷) دورانِ حمل آنے والے خون کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے پانچ سال کے بعد دوبارہ حمل ٹھہرا ہے ایک بیٹی ہے چار سال کی، رسولی بھی ہے اور خون کی شکایت بھی ہو جاتی ہے، درد بھی ہوتا ہے، تو میں ایسی صورت میں نماز اور قرآن پڑھ سکتی ہوں؟ اور کوئی دعا یا کچھ پڑھنے کو بتا دیں، اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ میرے بچے کے اعضاء پورے بنائے اور نیک بیٹا عطا کرے آپ بھی دعا

کروادیں۔ کسی حضرت نے بتایا ہے کہ دن میں کسی بھی وقت پانچ تسبیحات "لاحول ولاقوۃ" کی آدھے گلاس پانی پر دم کرکے پیور سولی وہیں ٹھہر جائے گی۔ آپ بھی کچھ وظائف بتادیں اور دعاؤں میں بھی یاد رکھئے۔ اور مجھے چلنے پھرنے سے خون کی شکایت ہوجاتی ہے؟ کوئی دعا بتائیں تاکہ یہ بند ہوجائے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... حمل کی حالت میں نکلنے والا خون استحاضہ یعنی بیماری کا خون کہلاتا ہے لہٰذا آپ کو خون حمل ٹھہرنے کے بعد آرہا ہے اس لئے یہ استحاضہ ہے استحاضہ والی عورت پاک ہوتی ہے لہٰذا آپ وضو کرکے اور خون سے صفائی حاصل کرکے نماز بھی پڑھ سکتی ہیں اور تلاوت بھی کرسکتی ہیں، لیکن اگر وضو کے بعد دوبارہ خون نکل آیا تو وضو ٹوٹ جائے گا اس لئے اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وضو کرکے آپ زیادہ نہ چلیں اور اگر کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی وجہ سے بھی خون جاری ہوجاتا ہے تو پھر بیٹھ کر نماز پڑھیں۔

سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ، اس کے اوّل وآخر سات سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر پانی پر دم کرکے پئیں اور شفایابی کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد صحت یابی عطا فرمائیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نیک صالح نرینہ اولاد عطا فرمائے، آمین۔

لمافی مشكوة المصابيح(۵۷/۱): عن النبی ﷺ أنه قال فی المستحاضة تدع الصلوة أيام اقرائها التی كانت تحيض فيها ثم تغتسل وتتوضأ عند كل صلوة وتصوم وتصلی۔

وفی الترمذی(۲۶/۲): عن ابی سعيد رضی الله عنه قال بعثنا رسول الله ﷺ فی سرية فنزلنا بقوم فسالناهم القرى فلم يقرونا فلدغ سيدهم فاتونا فقالوا هل فيكم من يرقی من العقرب قلت نعم انا ولكن لا ارقيه حتى تعطونا غنماً قالوا فانا نعطيكم ثلاثين شاة فقبلنا فقرأت عليه الحمد سبع مرات فبرأ وقبضنا الغنم قال فعرض فی انفسنا منها شئ فقلنا لا تعجلوا حتى تاتوا رسول الله ﷺ قال فلما قدمنا عليه ذكرت له الذی صنعت قال وما علمت أنها رقية اقبضوا الغنم واضربوا الى معكم بسهم۔

وفی الفتاوى الهندية(۳۷/۱-۳۸): لو رأت الدم بعد اكثر الحيض والنفاس فی أقل مدة الطهر فما رأت بعد الاكثر إن كانت مبتداة وبعد العادة ان كانت معتادة استحاضة... وكذا ما تراه الحامل ابتداءً أو حال ولادتها قبل خروج الولد كذا فی الهداية... (ص۳۹) (ودم الاستحاضة) كالرعاف الدائم لايمنع الصلاة ولا الصوم ولا الوطئ۔

وفی الشامية(۲۹۸/۱): (قوله وقتاً كاملاً) ظرف لقوله دائم، الأولى عدم ذكر هذا القيد: أی قيد الدوام لأنه فی حكمه فی الدوام وعدمه (قوله لا يمنع صوماً الخ) أی ولا قراءة ومس مصحف

ودخول مسجد، وكذا لا تمنع عن الطواف اذا امنت من اللوث۔

(۲۱۸) دورانِ حمل آنے والے خون اور اس حالت میں پڑھی جانے والی نمازوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ڈیڑھ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا ہے۔ بچے کے عضو نہیں بنے تھے، بس گوشت ہی گوشت تھا۔ اب چالیس دن تک یا اس سے کم جو خون آئے گا اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، اس مسئلے کا جواب لکھ دیں۔ اور جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آرہا تھا تو اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، دونوں کے جواب الگ الگ لکھ دیں، جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آنے لگا تھا تو میں نے لیٹے لیٹے نمازیں ادا کیں تھیں میری وہ نمازیں ہوئیں یا نہیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔صورت مسئولہ میں اگر خون ماہواری کی مقدار تک آیا ہو تو یہ ماہواری کا خون شمار ہوگا، اس دوران نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر خون مقدار حیض سے کم یا زیادہ آنے لگے، اسی طرح دوران حمل جو خون آتا رہا تو یہ سب خون استحاضہ کے حکم میں ہے، یعنی اس دوران آپ کو نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ضروری ہے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ اعمال بھی آپ کرسکتی ہیں۔

(۲) دوران حمل آنے والا خون چونکہ استحاضہ کا ہے لہٰذا جو نمازیں آپ نے لیٹے لیٹے ادا کی ہیں اگر آپ کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہیں تھیں تو وہ نمازیں ہوگئیں، ورنہ ان کا اعادہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

لما فی الهداية (۶۷/۱): (والدم الذی تراه الحامل ابتداء اوحال ولادتها قبل خروج الولد استحاضة) وان كان ممتدا۔

وفی الهندية (۳۷/۱): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر او شعر ولد فتصير به نفساء هكذا فی التبيين، وان لم يظهر شئ من خلقه فلا نفاس لها فان أمكن جعل المرئی حيضا يجعل حيضا وإلا فهو استحاضة۔

وفی الشامية (۹۷/۲): لوقدر علی بعض القيام دون تمامه أو كان يقدر علی القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ ماقدر عليه ثم يقعد إن عجز وهو مذهب الصحيح لايروی خلافه عن أصحابنا، ولو ترك هذا خفت ان لاتجوز صلاته۔

(۲۱۹) تین ماہ کا حمل ضائع ہونے کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کا حمل تین مہینے کے بعد ضائع ہوجائے یا

ضائع کر دیا جائے تو آیا اس کے بعد آنے والا خون حیض سے شمار ہوگا یا نفاس سے شمار کیا جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کسی عورت کا حمل تین ماہ کے بعد ضائع ہو جائے یا ضائع کر دیا جائے تو اگر اس حمل کے اعضاء (مثلاً ہاتھ، پیر وغیرہ) ظاہر ہو گئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون نفاس شمار ہوگا اور اگر اس حمل کے اعضاء وغیرہ کچھ ظاہر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون اگر کم از کم تین روز تک آیا ہو، اور اس سے پہلے ایک طہر تام (پندرہ دن کا دورانیہ) گزرا ہو تو پھر یہ حیض (ماہواری) ہے اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو پھر یہ خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض بلکہ استحاضہ (بیماری) کا خون ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۳۷): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر أو شعر ولد فتصيربه نفساء هكذا فی التبيين۔

و فی الدرالمختار (۱/۳۰۲):(وسقط) مثلث السين أی مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أورجل) أو اصبع أوظفر أو شعر ولا يستبين خلقه الا بعد مائة وعشرين يوما(ولد) حكما (فتصير) المرأة (به نفساء والامة ام ولد ويحنث به) فی تعليقه وتنقضی به العدة فان لم يظهرله شئ فليس بشئ والمرئی حيض ان دام ثلاثا وتقدمه طهر تام والا استحاضة۔

وفی الفقه الاسلامی (۱/۶۲۱): ويعد الدم عند هؤلاء دم النفاس بخروج اكثر الولد ولو متقطعاً عضواً عضواً ولو سقطاً استبان فيه بعض خلقة الانسان كاصبع أوظفر۔۔۔۔۔ فان رأت دما بعد القاء نطفة او علقة فليس بنفاس۔

(۲۲۰) ماہواری میں تعلیم قرآن کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنی ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اگر میں ماہواری کے ایام کی چھٹی کرتی ہوں تو بچوں کے سبق کا حرج ہوتا ہے اور اگر چھٹی نہ کروں تو دوران ماہواری تلاوت کا مسئلہ ہے ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل بتائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......عورت کا ماہواری کے ایام میں تلاوت کرنا ناجائز ہے، البتہ معلمہ ہونے کی صورت میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر آیت کے کلمات کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھائے، مثلاً ''الحمد للہ'' میں ''الحمد'' کو علیحدہ اور ''للہ'' کو علیحدہ پڑھائے تو پھر جائز ہے۔ البتہ قرآن مجید کو یاد رکھنے کے لئے دوسرے سے سننا جائز ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۷۲-۱۷۳):(و) يحرم به (تلاوة قرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو افتتاح أمر أو التعليم ولقن كلمة كلمة حل فی الأصح۔

(۲۲۱) ماہواری میں خواتین کیلئے تلاوت قرآن کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری چھوٹی بیٹی ماشاء اللہ اب سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔وہ پہلے آپ کے مدرسہ میں ہی حفظ کررہی تھی، اب گھر کے قریب ایک مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔اس کے متعلق مسئلہ یہ دریافت کرنا تھا کہ ماہواری کے دنوں میں وہ قرآن کریم کی تلاوت اور اسباق کی پابندی کیسے کرے گی؟ نیز کیا ان دنوں میں خواتین دل ہی دل میں قرآن پاک کی تلاوت کرسکتی ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عورتوں کا حالت حیض میں قرآن کریم کو چھونا اور زبان سے اس کی تلاوت کرنا جائز نہیں اور حدیث شریف میں حائضہ عورتوں کے لیے جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قرآن کریم کی تلاوت کے متعلق ہے کہ حائضہ عورت قرآن کریم نہ پڑھے اور چونکہ پڑھنے کا تعلق زبان سے ہے۔اس لئے اگر کوئی دل کے اندر پڑھنے کا تصور کرے تو اس کو تلاوت نہیں کہا جائے گا لہٰذا اگر کوئی عورت ماہواری کے دنوں میں قرآن کریم کی تلاوت کا دل ہی دل میں تصور کرے تو جائز ہے۔نیز اشد ضرورت کی بناء پر فقہاء کرام نے جواز کی یہ صورت بیان کی ہے کہ کلمات کو توڑ توڑ کر پڑھ سکتی ہے پوری آیت نہ پڑھے جیسا کہ معلمہ وغیرہ۔

لہٰذا آپ کی بیٹی کے لیے ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت زبان سے جائز نہیں ہے البتہ اسباق کی پابندی اس طور پر کرے کہ کلمات کو توڑ توڑ کر پڑھے یا کسی دوسرے سے سن لے یا پھر دل ہی دل میں تلاوت کا خیال کرلیا کرے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۳۴): عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن۔

وفی بدائع الصنائع(۱/۶۸۵): أن القراءة فعل اللسان وذلك بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص۔

وفی الهداية(۱/۳۵۲، جزء اوّل)مکتبة ادارة القرآن: وقال الكرخي أدنى الجهر ان يسمع نفسه وأدنى المخافتة تصحيح الحروف لان القراءة فعل اللسان۔

وفی الدر المختار (۱/۱۷۲): (و)يحرم به (تلاوة القرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو افتتاح أمر او التعليم ولقن كلمة كلمة حل في الأصح۔

وفی الشامية تحته: (قوله او التعليم) فرق بعضهم بين الحائض والجنب بأن الحائض مضطرة لأنها لا تقدر على رفع حدثها بخلاف الجنب والمختار انه لا فرق (قوله ولقن كلمة كلمة) هو المراد بقول المنية حرفا حرفا كما فسره به في شرحها، والمراد مع القطع بين كل كلمتين۔

(۲۲۲) حالت حیض میں وطی کرنے سے صرف توبہ واستغفار لازم ہے کوئی کفارہ واجب نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی کے ایک مدرسے میں پڑھاتا ہوں ہمارے مہتمم صاحب چھٹی کے معاملے میں بہت سخت ہیں سوائے عید کے ایام کے باقی ایام میں چھٹی کو گناہ کبیرہ تصور کرتے ہیں میری نئی نئی شادی ہوئی ہے بیوی کے بغیر چارہ نہیں ہوتا میں نے مشکل سے مہتمم صاحب سے ششماہی امتحان کے موقعہ پر ایک ہفتہ چھٹی لی، جب گھر آیا تو بیوی کے حیض کے ایام چل رہے تھے میرے سے برداشت نہ ہوسکا میں حیض کی حالت میں ہمبستری کرتا رہا چونکہ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں چھٹی نہیں ملے گی۔ یہ موقع بھی غنیمت ہے جب واپس آیا تو میں کافی پریشان رہا کہ میں نے حالت حیض میں ہمبستری کرکے غلط کام کیا ہے اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میرے اوپر کیا کفارہ ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حالت حیض میں وطی کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے اگر کسی سے غلطی سے یہ فعل سرزد ہوجائے تو اس پر توبہ واستغفار لازم ہے اس کے علاوہ کوئی کفارہ واجب نہیں۔ جب آپ سے یہ غلطی ہوگئی ہے تو اللہ کے حضور توبہ واستغفار کریں اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کریں اللہ بخشنے والا مہربان ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ اگر شروع ایام میں وطی کی ہو تو ایک دینار اور آخر ایام میں کی ہو تو نصف دینار کی بقدر قیمت صدقہ بھی کردیں۔

لمافی الدرالمختار مع الشامية (۱/۲۹۷۔۲۹۸): (و)وطؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد وكذا مستحل وطء الدبر عندالجمهور (وقيل لا يكفر) فى المسألتين وهو الصحيح خلاصة (وعليه المعول) لانه حرام لغيره (قوله ووطؤها) اى الحائض قال فى الشرنبلالية ولم ارحكم وطء النفساء من حيث التكفير اما الحرمة فمصرح بها... ثم هو كبيرة لو عامداً مختاراً عالماً بالحرمة لاجاهلاً او مكرهاً او ناسياً فتلزمه التوبة۔ ويندب تصدقه بدينار او نصفه، ومصرفه كزكاة وهل على المرأة تصدق قال فى الضياء: الظاهر لا۔ (قوله ثم هو) اى وطء الحائض (قوله لا جاهلاً الخ) هو على سبيل اللف والنشر... والظاهر ان الجهل انما ينفى كونه كبيرة لا اصل الحرمة اذ لا عذر بالجهل بالأحكام فى دارالاسلام ...(قوله ويندب الخ) لما رواه احمد وابو داؤد والترمذى والنسائى عن ابن عباس مرفوعاً، فى الذى ياتى امراته وهى حائض قال: يتصدق بدينار او نصف دينار'' ثم قيل ان كان الوطء فى اول الحيض فبدينار أو اخره فبنصفه۔

وفى سنن النسائى(۱/۴۳): عن ابن عباس عن النبى ﷺ فى الرجل ياتى امراته وهى حائض يتصدق بدينار او بنصف دينار۔

(۲۲۳) ماہواری کے دوران فضائل اعمال پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنے مخصوص ایام میں فضائل اعمال ہاتھ میں لیکر پڑھ سکتی ہے جبکہ اس میں بعض اوقات قرآن کی آیات یا ان کا ترجمہ اور عام طور پر احادیث مقدسہ ہوتی ہیں، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں عورت کا ماہواری کے ایام میں فضائل اعمال یا اس جیسی دوسری ایسی کتابوں کا ہاتھ میں لینا یا پڑھنا جائز ہے جن میں دوسرے کلام کے ساتھ قرآن کی آیات بھی ملی ہوئی ہوں، بشرطیکہ قرآن کی آیات پر ہاتھ نہ لگایا جائے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۲۹۱):(و)یمنع حل(دخول مسجد)...(۱/۲۹۳) (وقراءة قرآن) بقصده (ومسه)ولومکتوبا بالفارسیة فی الأصح (الا بغلافه) المنفصل۔

وفی الشامیة (۱/۲۹۳): (ومسه)ای القرآن ولو فی لوح أو درهم أو حائط لکن لایمنع الامن مس المکتوب بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه۔

(۲۲۴) گولیاں کھا کر ماہواری کا خون بند کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کو ہر ماہ آٹھ تاریخ سے سترہ (۱۷) تاریخ تک خون آتا ہے اور میں گھر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک اسکول میں ملازم ہوں ہفتے کے بعد گھر آتا ہوں دوراتیں ٹھہر کر واپس چلا جاتا ہوں اس مرتبہ جب آیا تو بیوی کو ماہواری کا خون آرہا تھا میں نے کہا چلو اگلے ہفتے ہمبستری کرلیں گے اس نے کہا معمول کو ترک کرنا اچھا نہیں ہے خواہ مخواہ یہ جمعرات بددعا دے گی میں ابھی بندوبست کرلیتی ہوں اس نے گولیاں کھالیں جن سے خون بند ہوگیا اب حیض کے ایام میں خون کو گولیوں کے ذریعے بند کر کے ہمبستری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......خون بند کرنے والی گولیاں اگر حیض شروع ہونے سے پہلے کھائی جائیں اور پھر مقررہ ایام میں خون جاری نہ ہو تو عورت کیلئے مقررہ ایام پاکی کے شمار ہوں گے اور اگر حیض ہونے کے بعد کھائی جائیں تو اگر تین دن سے پہلے پہلے خون بند ہو گیا ہے اور اس کے بعد دس دن تک دوبارہ خون نہیں آیا تو پاکی کے احکام جاری ہوں گے اور جماع کرنا بھی جائز ہوگا اور اگر تین دن کے بعد خون بند ہوا ہے تو عورت کی جو عادت ہوگی اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں ہوگا اور عادت کے بعد بھی اس وقت جائز ہوگا جب عورت غسل کرلے۔ بس صورت مسئولہ میں عورت نے حیض شروع ہونے کے بعد گولیاں کھائی تھیں پھر اگر تین دن خون جاری رہنے کے بعد کھائی تھیں تو اس پر خون بند ہونے کے باوجود پاکی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے اور جماع کرنا بھی جائز نہیں تھا لہٰذا

آپ دونوں نے جماع کر کے گناہ کا ارتکاب کیا، توبہ واستغفار لازم ہے۔

لمافی فتاوی اللجنة الدائمة(۴۰۰/۵): یجوز أن تستعمل المرأة أدویة فی رمضان لمنع الحیض اذا قرر أهل الخبرة الأمناء من الدکاترة ومن فی حکمهم أن ذلك لا یضرها ولا یؤثر علی جهاز حملها وخیرلها أن تکف عن ذلك وقد جعل الله لها رخصة فی الفطر اذا جاء ها الحیض فی رمضان۔

وفی اعلاء السنن(طبع بیروت)(۳۴۰/۱): وفی الثالث: وهو ما اذا انقطع لدون العادة لا یقربها وان اغتسلت مالم تمض عادتها... وفی الثالثة لا یجوز قربانها قبل الغسل وبعده مالم تمض عادتها وهذا باجماع۔

وفی الهندیة(۳۹/۱): لو انقطع دمها دون عادتها یکره قربانها وإن اغتسلت حتی تمضی عادتها وعلیها أن تصلی وتصوم للاحتیاط هکذا فی التبیین۔

(۲۲۵) اسقاط حمل کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک عزیزہ کا پانچ ماہ کا حمل خود بخود ساقط ہو گیا، ڈاکٹر نے حمل ساقط ہونے کے بعد صفائی وغیرہ کی اس کے بعد صرف دو دن خون آیا، اب یہ دو دن آنے والا خون نفاس شمار ہو گا؟ اور اس کی نماز معاف ہو گی یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں یہ خون نفاس کا ہے لہٰذا آپ کی عزیزہ پر ان دنوں کی نماز معاف ہے۔

لمافی الدرالمختار(۳۰۲/۱):(وسقط) مثلث السین ای مسقوط(ظهر بعض خلقه کید او رجل) او إصبع او ظفر او شعر ولا یستبین خلقه الا بعد مائة وعشرین یوماً (ولد) حکماً(فتصیر) المرأة(به نفساء والأمة ام ولد)

(۲۲۶) بذریعہ آپریشن ولادت ہو تو بعد میں آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر آپریشن کے ذریعے بچہ پیدا ہو تو بعد میں آنے والے خون کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں آپریشن کے بعد آنے والا خون، اگر زخم سے نہ رس رہا ہو بلکہ رحم سے آرہا ہو تو نفاس کا ہو گا، ورنہ نہیں۔

وفی الهندية(۱/۳۷): ولو ولدت من قبل سرتها بأن كان ببطنها جرح فانشقت وخرج الولد منها، تكون صاحبة جرح سائل لانفساء هكذا فی الظهيرية والتبيين إلا إذا خرج من الفرج دم عقيب خروج الولد من السرة فانه حينئذ يكون نفاساً هكذا فی التبيين۔

وفی الدرالمختار(۱/۲۹۹): فلو ولدته من سرتها، إن سال الدم من الرحم فنفساء. والا فذات جرح، وإن ثبت له احكام الولد۔۔۔۔۔۔ وحكمه كالحيض فی كل شيئ الافی سبعة ذكرتها فی الخزائن۔

وفی اللجنة الدائمة (۵/۴۱۹): سوال: بعض النسوة تعسر عليهن الولادة فيضطر إلى توليدهن بطريقة العملية الجراحية، ولربما يحصل من جراء ذالك خروج الولد عن طريق غير الفرج۔ فما حكم أمثال هولاء النسوة فی الشرع من ناحية دم النفاس؟ وما حكم غسلهن شرعاً؟

جواب: حكمها حكم النفساء، ان رأت دماً جلست حتى تطهر، وإن لم تردماً فانها تصوم وتصلی كسائر الطاهرات۔

(۲۲۷) معتادہ کا خون نفاس میں عادت سے تجاوز کر جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کی عادت ہو کہ اس کو نفاس کا خون پانچ دن آتا ہے لیکن اب اس کو بیس دن تک خون جاری رہا تو کیا یہ سارا خون نفاس کا شمار ہوگا یا پانچ دن نفاس کا شمار ہوگا اور باقی استحاضہ کا خون سمجھا جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر عورت معتادہ (جس کی عادت مقرر) ہو اس کا خون عادت (مثلاً پانچ دن) سے تجاوز کر کے چالیس دن کے اندر (مثلاً بیس دن پر) بند ہو جائے تو وہ نفاس کا خون شمار ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت بدل گئی ہے پہلے پانچ دن تھی اور اب بیس دن ہوگئی ہے اور اگر چالیس دن سے بھی تجاوز کر جائے تو اس کی عادت برقرار رہے گی اور اس کی عادت کے بعد جو خون آئے گا وہ استحاضہ کا شمار ہوگا یعنی پہلے پانچ دن صرف نفاس اور باقی دن استحاضہ کے ہوں گے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۳۹۱): ولوكانت المرأة لها عادة معروفة فی النفاس وهی التی ولدت غير مرة فكلما رأت من الدم ولم يجاوز الأربعين فذلك كله نفاس بالإجماع۔

وفی الهندية(۱/۴۰): وكذا النفاس فان رأت لاعلى العادة ولم يجاوز الاربعين انتقلت۔هكذا فی المحيط۔

وفی الشامية(۱/۳۰۱): فان جاوز الدم الأربعين فالعادة باقية تردّ اليها والباقی استحاضة وان

لم یجاوز انتقلت العادۃ الی مارأته والکل نفاس۔

(۲۲۸) جس عورت کے چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوئے اس کے نفاس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زبیدہ خاتون کے پیٹ میں دو بچے تھے اس نے ایک کو جنم دیا ہے دوسرا پیٹ میں موجود ہے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک ماہ بعد پیدا ہوگا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا نفاس کب سے سمجھا جائے گا؟ اگر پہلے بچے سے شروع ہے تو دوسرے بچے کے بعد آنے والا خون نفاس ہوگا یا استحاضہ؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کسی عورت کو چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوں تو شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عورت کا نفاس پہلے بچے کے پیدا ہونے کے بعد شمار ہوگا۔یہی قول راجح ہے پس اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے اندر مثلاً تیس دن بعد ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے تاکہ نفاس کی مدت چالیس دن پوری ہوجائے اور اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد آنے والا خون استحاضہ کا ہوگا۔لہٰذا زبیدہ خاتون کا نفاس پہلے بچے سے شروع ہوگیا ہے اگر دوسرا بچہ ایک ماہ بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے اور اس کے بعد والا خون استحاضہ ہوگا۔فقط، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۵۳۔۱۵۴): قوله من الاوّل لانه بالولد الاول ظهر انفتاح الرحم فکان المرئ عقبه نفاساً وهو المعتمد وافاد المصنف ان ماتراه عقب الثانی ان کان قبل الاربعین فهو نفاس للاول لتمامها واستحاضة بعد تمامها فتغتسل وتصلی مما وضعت الثانی وهو الصحیح کذا فی البحر۔

وفی الدر المختار مع شرحه (۱/۳۱۰): (والنفاس لام توأمین من الاول) هما ولد ان بینهما دون نصف حول وکذا الثلاثة ولو بین الاول والثالث اکثر منه فی الاصح (و) انقضاء (العدة من الاخیر وفاقاً) لتعلقه بالفراغ...

وفی الشامیة تحته: قوله من الاول والمرئی عقیب الثانی ان کان فی الاربعین فمن نفاس الاول والا فاستحاضة وقیل اذا کان بینهما اربعون یجب علیها نفاس من الثانی والصحیح هو الاول عنایة وبحر ثم ما ذکره المصنف قولهما وعند محمد وزفر النفاس من الثانی قوله لتعلقه بالفراغ)ای لتعلق انقضاء العدة بفراغ الرحم وهو لا یفرغ الابخروج کل مافیه...

(۲۲۹) نفاس کے بعد کب تک نماز معاف ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد جو خون آتا ہے اس میں کتنے دن

تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ چالیس دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر خون چالیس دن کے بعد بھی بند نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر خون چالیس دن تک بند نہ ہو تو چالیس دن تک نماز کی ادائیگی معاف ہے اور اگر چالیس دن سے پہلے بند ہو جائے، تو اسی دن سے نماز پڑھنی لازم ہو جاتی ہے چالیس دن کا انتظار نہیں کیا جائے گا، مثلاً پندرہ دن کے بعد ظہر کی ابتداء میں خون بند ہو گیا تو ظہر کے آخر وقت تک انتظار کر لیں اگر خون نہ آئے تو غسل کر کے نماز پڑھنی واجب ہو گی اور اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہے تو اس میں دو صورتیں ہیں، اول اس عورت کی پہلے سے کوئی عادت ہے یا نہیں اگر پہلے سے کوئی عادت ہے تو وہی نفاس ہو گا باقی استحاضہ (استحاضہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ خون کسی بیماری کی وجہ سے ہے، اس حالت کے سارے احکام ایسے ہوں گے جیسے پاکی کے ہوتے ہیں) شمار ہو گا، اور اگر پہلے سے کوئی عادت نہیں ہے تو چالیس روز تک نفاس ہو گا باقی استحاضہ شمار ہو گا۔

لمافی الدر المختار (۱/۳۰۰۔۳۰۱): (واکثرہ اربعون یوما) ... (والزائد) علی أکثرہ (استحاضة) لو مبتدأة أما المعتادة فترد لعادتها وکذا الحیض فان انقطع علی اکثرهما أو قبله فالکل نفاس۔

(۲۳۰) حیض ونفاس سے پاکی کب شمار ہوتی ہے؟ نیز ان ایام کے نماز اور روزوں کی قضاء

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیض ونفاس سے عورتیں کب پاک ہوتی ہیں، وہ کب سے نماز روزہ اور حقوق زوجیت کے قابل ہوتی ہیں؟ خاص طور پر وہ عورتیں جن کے ہاں بچے کی ولادت ہوتی ہے، وہ کب سے نماز روزہ شروع کریں گی؟ عام رواج کے اعتبار سے چالیس دن تک ایسی عورتیں ناپاک شمار ہوتی ہیں۔ نیز ان ایام کے روزے اور نمازیں قضاء ہوں گی، یا معاف ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں حیض کا حکم یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری رک جائے، یا دس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جاتی ہے، اور اس پر نماز وروزہ کی ادائیگی فرض ہو جاتی ہے اور حقوق زوجیت کے قابل ہونے کیلئے دیکھا جائے گا کہ اگر ماہواری دس دن سے پہلے ختم ہو گئی تھی تو عورت غسل کر لے یا ایک نماز کا وقت گزر جائے، اور اگر ماہواری دس دن تک رہے تو خون کے بند ہوتے ہی حقوق زوجیت ادا کر سکتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کر لیا جائے۔

اور نفاس کا حکم یہ ہے کہ جب اس کا خون عادت پر بند ہو جائے، یا چالیس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جائے گی اس پر تمام حقوق وفرائض لازم ہوں گے، یاد رہے کہ نفاس میں چالیس دن پورے کرنا لازم نہیں بلکہ اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہو جائے تو بھی اسی دن سے وہ پاک ہو جائے گی اس پر فرائض کی ادائیگی لازم ہو گی، ہاں اگر چالیس دن یا چالیس دن کے بعد بھی جاری ہو تو پھر چالیس دن کے بعد سے فرائض کی ادائیگی لازم ہو گی، ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ نفاس سے پاکی چالیس دن کے بعد ہوتی ہے چاہے خون پہلے

ہی کیوں نہ بند ہو جائے یہ صحیح نہیں ہے۔
اورنفاس کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی کیلئے دیکھا جائے گا کہ نفاس کا خون اس کی عادت کے موافق اور چالیس دنوں سے پہلے بند ہوا ہے یعنی عام طور پر جتنے دنوں میں خون بند ہوتا ہے اتنے ہی دنوں میں بند ہوا ہے، تو غسل کے بعد یا ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہوگی، اور اگر اس کی عادت سے پہلے خون بند ہو جائے تو جب تک عادت کے دن پورے نہ ہو جائیں اس وقت تک حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح نہیں، اور اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بند ہوا ہے تو پھر بغیر غسل کے حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہے البتہ غسل کر لینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۳۸): (منها) ... ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلاتقضى هكذا فی الكفاية ... (ومنها) ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا فی الكفاية۔

وفی الدر المختار (۱/۲۹۴۔۲۹۵): (ويحل وطؤها اذاانقطع حيضها لأكثره) بلا غسل وجوباً بل ندباً (وان)انقطع لدون اقله تتوضأ وتصلی فی آخر الوقت وان (لأقله) فان لدون عادتها لم يحل، وتغتسل وتصلی وتصوم احتياطا وان لعادتها فان كتابية حل فی الحال والا (لا) يحل (حتی تغتسل) ...(أو يمضی عليها زمن يسع الغسل)ولبس الثياب(والتحريمة)يعنی من آخر وقت الصلاة وفی الشامية(ص۲۹۴) :(اذا انقطع حيضها لأكثره) مثله النفاس۔

(۲۳۱) مستحاضہ کے کپڑوں اور بدن کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ماہواری کے ایام سات ہیں جو نو (۹) تاریخ سے شروع ہو کر سولہ (۱۶) تاریخ تک رہتے ہیں اب میرے ساتھ یہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ عام ایام میں بھی آگے کے راستہ سے پانی کی طرح ایک رطوبت بہتی رہتی ہے، اس رطوبت کا کیا حکم ہوگا اگر یہ کپڑے یا جسم پر لگ جائے تو ان کو دھونا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہر وہ عورت جس کو ایام مخصوصہ کے علاوہ بھی جریان اور سیلان الدم اور رطوبت کا سلسلہ لاحق ہو وہ عورت مستحاضہ کہلاتی ہے اور مستحاضہ معذور کے حکم میں ہوتی ہے اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے وضوء کرے گا اور جب نماز کا وقت نکل جائے تو خروج وقت سے خود بخود اس کا وضو ٹوٹ جائے گا البتہ اس کے بدن اور کپڑوں کی طہارت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ زخم اس طرح ہے کہ اگر اس کی نجاست کو دھولیا جائے اور پوری نماز طہارت کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہو، تو اس صورت میں اس خون اور رطوبت کو دھونا ضروری ہے اور اگر پوری نماز طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکتی ہو (یعنی دورانِ نماز دوبارہ وہ خون وغیرہ کپڑوں اور بدن کو لگے گا) تو اس صورت میں اس نجاست کو دھونا ضروری نہیں لہٰذا آپ مستحاضہ ہیں اور نماز آپ کے اوپر فرض ہے البتہ بہنے والی رطوبت کو کسی روئی یا کپڑے کے ذریعے روک دیں تا کہ دورانِ نماز آپ کے بدن اور کپڑے پاک رہیں اور اگر علاج اور تدبیر کے

باوجود بھی رطوبت کپڑوں یا بدن کو لگ جائے تو پھر اس کا دھونا ضروری نہیں۔

لما فی الفتاویٰ الولوالجیة(١/٣٢): کل ما یخرج من بدن الحیوان(الانسان) فھو نجس۔

وفی الشامیة(١/٢٩٨): بان رطوبة الفرج نجسة

وفیه ایضاً مع الدر(١/٣٠٥۔٣٠٦۔٣٠٧): (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض) اللام للوقت... (الی ان قال) (وان سال علی ثوبه) فوق الدرھم (جازله ان لایغسله ان کان لو غسله تنجس قبل الفراغ منھا) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترك غسله، ھو المختار للفتوی، (قوله وحکمه) ای العذرا وصاحبه (قوله الوضوء) ای مع القدرة علیه والافالتیمم (قوله لاغسل ثوبه) ای ان لم یفد کما یاتی متنا (قوله ونحوه) کالبدن والمکان ط... (الی ان قال) (قوله ھو المختار للفتوی) وقیل لایجب غسله اصلا، وقیل ان کان مقیدا بان لا یصیبه مرة اخری یجب، وان کان یصیبه المرة بعد الاخری فلا واختاره السرخسی بحر

قلت بل فی البدائع انه اختیار مشائخنا وھو الصحیح اھ فان لم یمکن التوفیق بحمله علی مافی المتن فھو اوسع علی المعذورین ویؤید التوفیق مافی الحلیة عن الزاھدی عن البقالی لو علمت المستحاضة انما لو غسلته یبقی طاھراً الی ان تصلی یجب بالاجماع وان علمت انه یعود نجساً غسلته عند ابی یوسف دون محمد ... (الی ان قال) لکن ھذا قول ابن مقاتل الرازی فانه یقول یجب غسله فی وقت کل صلاة قیاسا علی الوضوء۔

فصل فی المسح علی الخفین والجبیرة

(موزوں اور پٹی وغیرہ پرمسح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۳۲) موزے پہننے کی حالت میں دونوں پیروں میں سے ہرایک پرکم ازکم مسح کی مقدار کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے۔کیا اس طرح مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....مسح علی الخفین میں ہر پیر پر کم ازکم تین انگلیوں کے بقدر مسح کرنا ضروری ہے اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پیر پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اسکا مسح درست نہ ہوگا۔

لما فی الهندية(۳۲/۱): ولو مسح علی رجل قدر أصبعين وعلى أخرى قدر خمسة لم يجز۔

وفی الدرالمختار(۲۷۲/۱): (وفرضه) عملا(قدر ثلاث أصابع اليد) أصغرها طولاً وعرضاً من كل رجل۔

وفی الشامية تحته : (قوله من كل رجل) أى فرضه هذاالقدر كائنا من كل رجل على حدة قال فی الدرر: حتى لو مسح على احدى رجليه مقدار اصبعين وعلى الاخرى مقدار خمس أصابع لم يجز۔

(۲۳۳) عذر شرعی کی صورت میں موزوں پرمسح کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں ایک سال کیلئے نکلا ہوں۔ ہماری جماعت میں ایک بوڑھا شخص ہے جس کی ہر وقت ہوا خارج ہوتی رہتی ہے اور وہ موزوں پر مسح کرنا چاہتا ہے حالانکہ موزوں پر مسح کرنے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ کامل وضو پر پہنے ہوئے ہوں، لیکن یہ شخص اس شرط کو پورا نہیں کرسکتا کیونکہ چند سیکنڈ کے بعد فوراً ہوا خارج ہوتی ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ شخص ایسی حالت میں موزوں پر مسح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....بصحت واقعہ یہ بوڑھا شخص نمازوں کے اوقات کے اندر تو موزوں پر مسح کرسکتا ہے وقت

کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کرسکتا مثلاً ظہر کی نماز کیلئے وضوکر کے موزے پہن لیے، اب ظہر کے وقت کے اندراس کوحدث (اس حدث کے علاوہ جس میں یہ مبتلا ہے) لاحق ہوتا ہے تو یہ وضوکرتے وقت موزوں پرمسح کرسکتا ہے، ظہر کے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کرسکتا چنانچہ عصر کی نماز کیلئے وضوکرتے وقت پاؤں دھوئے گا۔

لمافي الهندية (۱/۳۴): المعذور اذا كان عذره غير موجود وقت الوضوء ولبس الخفين يجوز له المسح الى المدّة كالاصحاء بخلاف ما اذا وجد العذر مقارنا للوضوء اوللبس احدهما يجوز المسح في الوقت لاخارجه هكذا في البحر الرائق۔

وفي الشامية(۱/۲۷۱): ثم انه لا يخلواما ان يكون العذر منقطعاً وقت الوضوء واللبس معاً او موجوداً فيهما، او منقطعاً وقت الوضوء موجوداً وقت اللبس او بالعكس فهي رباعية، ففي الاوّل حكمه كالاصحاء لوجود اللبس على طهارة كاملة فمنع سراية الحدث للقدمين، وفي الثلاثة الباقية يمسح في الوقت فقط، فاذا خرج نزع وغسل كمافي البحر۔

(۲۳۴) جوتوں اور نائیلون کے موزوں پرمسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل موزہ زیادہ تر نائیلون کا ہوتا ہے کیا اس پرمسح جائز ہے؟ نیز کیا جوتے کے اوپر سے بھی مسح ہوسکتا ہے اگر اجازت ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟

الجواب بعون الملك الوهاب......شریعت مطہرہ میں ان موزوں پرمسح کرنا جائز ہے اُن میں مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ٹخنوں سمیت پاؤں کوڈھانپنے والے ہوں۔ اُن میں مسلسل چلا جاسکے، بغیر رکاوٹ کے پاؤں پر رُکے رہیں اور اُن میں سے پاؤں تک پانی نہ پہنچے۔ لہٰذا مروجہ نائیلون کے موزوں پر ان شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسح کرنا درست نہیں نیز جوتوں میں بھی اگر یہ شرائط پائی جائیں تو اِن پر بھی مسح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافي المحيط البرهاني(۱/۳۴۳): واما المسح على الجوارب فلا يخلو: إما ان كان الجوارب رقيقا غير منعل، وفي هذا الوجه لا يجوز المسح بلا خلاف، واما ان كان ثخينا منعلاً ففي هذا الوجه يجوز المسح بلا خلاف، لانه يمكن قطع السفر، وتتابع المشي عليه، فكان بمعنى الخف۔ والمراد من الثخين: أن [illegible] سك على الساق من غير أن يشد بشئ، ولا يسقط، فأما اذا كان لا يستمسك ويسترخي، فهذا ليس بثخين، ولا يجوز المسح عليه۔

وفي الشامية (۱/۲۶۱): (قوله شرط مسحه) اى مسح الخف المفهوم من الخفين، [illegible] فيه لد [illegible] الصادق بالواحد والاثنين، ولم يقل مسحهما لانه قد يكون واحد الذى [illegible]

ثلاثه امور الخ) زاد الشر نبلالی:لبسهما علی طهارة، وخلو کل منهما عن الخرق المانع، واستمساکهما علی الرجلین من غیرشد، ومنعهما وصول الماء الی الرجل، وأن یبقی من القدم قدر ثلاثة أصابع۔

(۲۳۵) کون سی جراب پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس بہت موٹی جرابیں ہیں جن میں ٹھنڈک بالکل محسوس نہیں ہوتی ،توکیا میں ان جرابوں پر مسح کرسکتا ہوں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر جرابیں ایسی ہوں کہ بغیر کسی چیز کے سہارے پنڈلی پر ٹھہری رہیں اوران کو پہن کر لگا تار چلا جاسکتا ہواور وہ اتنی موٹی ہوں کہ پانی قدم تک تجاوز نہ کرسکتا ہوتوان جرابوں پر مسح کرنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۳۲): ویمسح علی الجورب المجلد وهو الذی وضع الجلد علی اعلاه واسفله هکذا فی الکافی والمنعل وهو الذی وضع الجلد علی اسفله کالنعل للقدم هکذا فی السراج الوهاج۔ والثخین الذی لیس مجلدا ولامنعلا بشرط أن یستمسك علی الساق بلاربط ولایری ماتحته وعلیه الفتوی کذا فی النهر الفائق۔

وفی الشامیة (۱/۲۶۹): (قوله علی الثخینین) أی اللذین لیسامجلدین ولا منعلین نهر وهذا التقیید مستفاد من عطف ما بعده علیه وبه یعلم أنه نعت للجوربین فقط کما هو صریح عبارة الکنز...(قوله بحیث یمشی فرسخا) أی فأکثر کمامر وفاعل یمشی ضمیر یعود علی الجورب والاسناد الیه مجازی۔۔۔۔۔(قوله بنفسه)أی من غیر شد،ط (قوله ولا یشف) من شف الثوب رق......(قوله الا ان ینفذ) أی من البلل۔

(۲۳۶) گرم موسم میں موزوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موزوں پر مسح کرنا پہلے زمانے میں سخت حالات کیوجہ سے جائز تھا کہ سردی کے موسم میں گرم پانی نہیں ملتا تھا،وغیرہ وغیرہ لیکن آجکل یہ مشکلات ختم ہوگئی ہیں توکیا آجکل بھی موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ نیز اگر کوئی شخص کسی بیماری یا کسی اوروجہ سے گرم موسم میں بھی موزے استعمال کرے توکیا اس وقت بھی اس کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... اللہ تعالی نے اس دین کو قیامت تک کیلئے ضابطہ حیات بنا کر بھیجا ہے،لہٰذا احکامات بھی

الجواب

ایسے نازل کیے جو قیامت تک کیلئے نافذ العمل اور قابل عمل ہوں، صرف اس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر احکامات نازل نہیں کیے جو تھوڑے بہت ایسے احکامات نازل بھی ہوئے وہ بعد میں منسوخ کردیے گئے، اسی طرح مسح بھی انہی احکامات میں سے ہے جن کی مشروعیت قیامت تک کیلئے ہے لہٰذا موزوں پر مسح نہ صرف اس زمانے میں جائز تھا بلکہ اس کا جواز ابھی بھی باقی ہے۔ نیز موزوں پر مسح کرنا مطلقاً جائز ہے چاہے سردی کا موسم ہو یا گرمی کا، چاہے بیماری کی حالت میں ہو یا عام صحت کی حالت میں۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۲): عن عروۃ بن المغیرۃ عن ابیه المغیرۃ بن شعبة (رضی الله عنه) عن رسول الله ﷺ انه خرج لحاجته فاتبعه المغیرۃ بإداوۃ فیها ماء فصب علیه حین فرغ من حاجته فتوضأ ومسح علی الخفین۔

وفی الهندیة (۱/۳۲): المسح علی الخفین رخصة ولو اتی بالعزیمة بعد ما رأی جواز المسح کان اولی۔

(۲۳۷) تیمم کی حالت میں پہنے گئے موزوں پر مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے تیمم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں جب وہ وضو کرے تو کیا اُن موزوں پر مسح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جس نے تیمم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں پانی مل جائے اور پانی کے استعمال پر قدرت بھی ہو، تو اس کیلئے وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں بلکہ پاؤں دھونا ضروری ہے۔

لمافی الخانیة علی الهندیة (۱/۵۰): المحدث اذا تیمم عند عدم الماء ولبس الخف ثم وجد ماء فانه ینزع خفیه ویغسل رجلیه لان المتیمم عند وجود الماء یصیر محدثا بالحدث السابق۔

وفی الدر المختار (۱/۲۷۰): (ملبوسین علی طهر) فلو أحدث ومسح بخفیه أولم یمسح فلبس موقه لایمسح علیه (تام) خرج الناقص حقیقة کلمعة ،أومعنی کتیمم ومعذور۔

وفی الشامیة تحته: (قوله کتیمم) ای أن اللبس لوکان بعد التیمم فوجد بعده الماء لایجوز المسح علی الخف بل یجب الغسل۔

(۲۳۸) پھٹے ہوئے موزوں اور موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس موزے ہیں جو کچھ پھٹے ہوئے ہیں میں ان پر مسح کرسکتا ہوں یا نہیں؟ نیز آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر موزے پاؤں کی تین چھوٹی انگلیوں کے بقدر پھٹے ہوں تو ایسی صورت میں ان پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر اس سے کم پھٹے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

نیز یاد رہے کہ یہ مقدار ایک موزے کے اعتبار سے ہے یعنی اگر ایک موزہ اتنی مقدار میں پھٹا ہوا ہو تو مسح جائز نہیں ورنہ ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز نہیں اس لئے کہ ان میں پانی سرایت کر جاتا ہے۔

لمافی التاتارخانية(۲۷۱/۱): واذا كان فى الخف خرق فان كان يسيرا لايمنع جواز المسح، وان كان كثيراً يمنع... والحد الفاصل بين اليسير و الكثير أن الخرق اذا كان قدر اصبع او اصبعين فهو يسير وان كان قدر ثلاث أصابع فهو كثير۔۔۔۔۔۔ ثم على روايات الزيادات اعتبر ثلاث اصابع من اصغر اصابع الرجل وفى الهداية هو الصحيح...(فى ص۲۷۲) ويجمع الخروق فى خف واحد ولا يجمع فى خفين۔

وفى الشامية (۲۶۹/۱): (قوله أوجوربيه) الجورب لفافة الرجل... (قوله ولو من غزل أوشعر) دخل فيه الجوخ كما حققه فى شرح المنية وقال وخرج عنه ماكان من كرباس بالكسر وهو الثوب من القطن الأبيض ويلحق بالكرباس كل ما كان من نوع الخيط كالكتان والا بريسم ونحوهما وتوقف ح فى وجه عدم جواز المسح عليه اذا وجد فيه الشروط الاربعة التى ذكر ها الشارح... يدل عليه مافى كافى النسفى حيث علل عدم جواز المسح على الجورب من كرباس بأنه لايمكن تتابع المشى عليه فإنه يفيد انه لوأمكن جاز ويدل عليه أيضاً مافى ط عن الخانية ان كل ماكان فى معنى الخف فى ادمان المشى عليه وقطع السفر به ولو من لبد رومى يجوز المسح عليه (قوله على الثخينين) اى اللذين ليسا مجلدين ولامنعلين... (قوله بنفسه) أى من غير شد (قوله ولايشف) بتشديد الفاء من شف الثوب رق... (قوله الا ان ينفذ) أى من البلل...(وفى ص۲۷۰) واما الثخين فهوقولهما وعنه انه رجع اليه وعليها الفتوى۔

وفيه أيضا(ص۲۷۴): (وتجمع الخروق)... (قوله لافيهما) اى لوكان فى كل واحد من الخفين خروق غير مانعة لكن اذا جمعتها تكون مثل القدر المانع لا تمنع ويصح المسح۔

(۲۲۳۹) موزوں میں پانی چلے جانے سے مسح ٹوٹنے اور تھوڑی پھٹن سے مسح نہ ٹوٹنے میں فرق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں

ہو یا زیادہ مقدار میں ہو تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے، اور علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ جن موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم یا دو انگلیوں کی مقدار کے برابر پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے، اور اسی طرح اگر کم مقدار میں موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس میں بھی مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی روشنی میں ان دونوں کے مابین فرق اور تطبیق کو واضح فرمایئے، کہ موزے کے اندر پانی کے داخل ہونے سے مسح ٹوٹتا ہے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو اور موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو یا موزے کی کم مقدار پاؤں سے نکل جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے حالانکہ ان صورتوں میں بھی پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے چاہے کم ہو یا زیادہ لہٰذا واضح فرمایئے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں جو مسئلہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے یہ بات آپ کی درست نہیں ہے کیونکہ اکثر فقہاء کرام نے اس بات کو صراحتاً ذکر فرمایا ہے کہ اگر موزے میں پانی تین انگلیوں کی مقدار یا اس سے کم مقدار میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا۔ جیسا کہ اگر موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا اور اسی طرح اگر اکثر قدم سے کم موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس سے بھی مسح نہیں ٹوٹتا۔

پہلی دونوں صورتوں میں کم مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے البتہ تیسری صورت میں قدم کے اکثر حصے سے کم کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی اگر موزہ پاؤں کے اکثر حصے سے کم مقدار میں نکلتا ہے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔ اب اگر موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہے یا موزہ پاؤں سے کم مقدار میں نکل گیا تو اس میں اگر پانی چلا جائے تو کم مقدار میں ہی جائے گا جو کہ ناقضِ مسح نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تک اتنا پانی موزے میں نہ چلا جائے کہ اس سے ایک پاؤں کا اکثر حصہ تر نہ ہو جائے تب تک مسح نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا تین انگلیوں سے کم مقدار کی پھٹن اور کم مقدار میں موزے کا پاؤں سے نکلنے کی صورت میں اگرچہ پانی کے جانے کا امکان ہے لیکن وہ کم مقدار میں ہی جانے کا امکان ہے اور کم مقدار میں اگر پانی موزوں میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الشامیة(۲۷۲/۱): فلو اصاب موضع المسح ماء او مطر قدر ثلاث اصابع جاز. وكذا لو مشى فى حشيش مبتل بالمطر وكذا بالطل فى الاصح...

وفيه ايضاً(۲۷۳/۱): (قوله وهو قدر ثلاث اصابع) يعنى طولا وعرضا، بأن سقطت جلدة مقدار ثلاث اصابع وعرضها كذا فى حاشية يعقوب باشاعلى صدر الشريعة فليحفظ

(قوله اصابع القدم الاصاغر) صححه فى الهداية وفيرها واعتبر الاصاغر للاحتياط... (قوله بكمالها) هو الصحيح خلافاً لما رجحه السرخسى رحمه الله من المنع بظهور الانامل وحدها۔ شرح المنية۔ والانامل: رؤوس الاصابع، وهو صادق بما اذا كانت الاصابع تخرج منه بتمامها لكن لا يبلغ هو قدرها طولا وعرضا... (قوله اعتبرا لثلاث) اى التى وقعت فى مقابلة الخرق

لأن کل اصبع اصل فی موضعها فلا تعتبر بغیرها، حتی لو انکشف الابهام مع جارتها وهما قدر ثلاث اصابع من اصغرها یجوز المسح وان کان مع جارتیها لا یجوز۔

وفی الشامیة(۱/۲۷۶): (وخروج اکثر قدمیه) من الخف الشرعی... (قوله وکذا اخراجه) تصریح بما فهم من الخروج بالاولی، لانّ فی الاخراج خروجا مع زیادة وهی القصد (قولہ فی الاصح) صححه فی الهدایة وغیرها، وبه جزم فی الکنز والمنتقی۔

(۲۴۰) کیا عورتوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مردوں کیلئے تو موزوں پر مسح کرنا جائز ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے کچھ عزیز اسلام آباد اور مری میں رہتے ہیں جہاں ہمیں ابھی جانا ہے اور وہاں آج کل سخت سردی ہے، اگر میری اہلیہ موزے پہن لے تو اس کیلئے موزوں پر مسح جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے لئے اسلام آباد اور مری کی سردی برداشت کرنا کافی مشکل ہے؟ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری اس مشکل کو حل فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جس طرح مردوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح عورتوں کیلئے بھی جائز ہے، لہٰذا آپ کی اہلیہ موزوں پر مسح کرسکتی ہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۳۶):المرأة فی المسح علی الخفین بمنزلة الرجل لاستوائهما فی المعنی المجوّز للمسح۔

(۲۴۱) موزوں پر برائے تعلیم مسح کرنے سے مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا، بوقت مسح علی الخفین اس کی نیت موزوں پر مسح کی تعلیم دینا مقصود تھی نا کہ طہارت حاصل کرنا، آیا اس طرح مسح علی الخفین درست ہوگیا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب وضو کیا اور موزوں پر مسح کرلیا اور نیت تعلیم کی تھی نا کہ طہارت کی تب بھی مسح درست ہوگیا۔

لمافی الهندیة(۱/۳۳): فلو توضأ ومسح علی الخفین ونوی التعلیم دون الطهارة یصح الخ۔

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۸): ولو توضأ ومسح علی الخف ونوی به التعلیم دون الطهارة یصح بناء علی مسئلة النیة فی الوضوء اهـ

(۲۴۲) زخم کی پٹی پر مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جسم کا کوئی حصہ زخمی ہوجائے تو اس پر باندھی جانے والی پٹی عام طور پر زخم سے زائد ہوتی ہے، کیا اس ساری پٹی پر مسح کرنا صحیح ہے، یا پھر پٹی کھول کر زخمی حصہ پر مسح کرنا اور باقی حصہ کو دھونا ضروری ہے؟ نیز یہ مسح غسل کی ضرورت کے وقت بھی کافی ہوگا یا غسل میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پٹی زخم سے زائد ہو، اور زخم کا دھونا اور پٹی کا کھولنا زخم کیلئے نقصان دہ ہو تو اس صورت میں تمام پٹی پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر پٹی کا کھولنا اور زخم پر مسح کرنا زخم کیلئے نقصان دہ نہ ہو تو ایسی صورت میں پٹی پر مسح کافی نہ ہوگا بلکہ پٹی کھول کر زخم پر مسح کیا جائے گا اور اردگرد کے حصے کو دھویا جائے گا۔ نیز مسح کے اعتبار سے وضو اور غسل میں کوئی فرق نہیں بلکہ ضرورت کے وقت دونوں صورتوں میں مسح کافی ہوگا۔

لمافی رد المحتار (۲۸۰/۱): اذا كانت زائدة على قدر الجراحة فان ضره الحل والغسل مسح الكل تبعاً والا فلا، بل يغسل ما حول الجراحة ويمسح عليها لا على الخرقة ما لم يضره مسحها فيمسح على الخرقةالتي عليها ويغسل حواليها وما تحت الخرقة الزائدة لان الثابت بالضرورة يتقدر بقدرها۔

وفی الدرالمختار (۲۸۱/): والمحدث والجنب فی المسح عليها وعلى توابعها سواء۔

وفی الشامية تحته: (عليها) ای الجبيرة، وعلى توابعها: كخرقة القرحة، وموضع الفصد والكی۔

(۲۴۳) کیا وضوء میں ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے پٹی کھولنا ضروری ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے جراح نے اس کو مضبوط باندھ کر اس پر پٹی چڑھادی ہے تو آیا وضو کے وقت اس پٹی کو کھولنا ہوگا یا اوپر سے دھولینا کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں وضو کے وقت نہ پٹی کو کھولا جائے اور نہ اوپر سے دھویا جائے بلکہ پٹی پر مسح کرلینا کافی ہے۔ اور پٹی کھولنے اور دھونے کی ضرورت نہیں۔

لمافی التاتارخانية(۲۸٦/۱): واذا انكسر عضو من اعضائه وهو محدث فشد عليه العصابة ثم توضأومسح على العصابة جاز۔

وفی الدرالمختار (۲۸۰/۱):(ويجوز) أی يصح مسحها(ولوشدت بلاوضوء)وغسل دفعاً للحرج (ويترك) المسح كالغسل(إن ضروإلا لا)۔

فصل فی المسائل الجدیدۃ والمتفرقۃ المتعلقۃ بالطہارۃ

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

(۲۴۴) بیت الخلاء میں ایسی چیز لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں ایسی چیز ساتھ لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بیت الخلاء جاتے وقت افضل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا نام ہو، یا کوئی قرآنی آیت وغیرہ لکھی ہوئی ہو تو اس کو باہر رکھ کر اندر داخل ہو، تاہم اگر ایسی کوئی چیز کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی ہو تو اس کے اندر لے جانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر کوئی ایسی چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا کسی نبی یا قرآنی آیت یا اور کوئی معظم نام جیسے احمد، عزیز وغیرہ لکھا ہو، اور وہ کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی نہ ہو بلکہ ظاہر ہو تو اس کا بیت الخلاء وغیرہ کے اندر لے جانا مکروہ ہے۔

لما فی الھندیۃ(۱/۵۰):ویکرہ ان یدخل فی الخلاء ومعہ خاتم علیہ اسم اللہ تعالیٰ أو شیئ من القرآن۔

وفی رد المحتار(۱/۳۴۵): (تتمہ) إذا أراد أن یدخل الخلاء ینبغی أن یقوم قبل ان یغلبہ الخارج ولا یصحبہ شیئ علیہ اسم معظم ولا حاسر الرأس۔

(۲۴۵) قضائے حاجت کے وقت دعاء (تعوّذ) کا محل

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے جو تعوذ پڑھا جاتا ہے کیا وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھا جاتا ہے یا بیت الخلاء میں داخل ہونے کے بعد پڑھا جاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بیت الخلاء میں جاتے وقت جو دعا (تعوّذ) پڑھی جاتی ہے وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے

سے پہلے پڑھنی چاہیئے اگر صحراء یا کھلے میدان میں آبادی سے باہر قضائے حاجت کر رہا ہے تو ستر (شرمگاہ) کھولنے سے پہلے دعا پڑھے اور بھول جانے کی صورت میں صرف دل میں پڑھے زبان سے نہ کہے۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۴۰): (قبل دخوله) الأولیٰ التفصیل وهو ان کان المکان معدّا لذلك یقول قبل الدّخول وان کان غیر معد کالصحراء ففی أو ان الشروع کتشمیر الثیاب مثلاً قبل کشف العورة وان نسی ذلك أتی به فی نفسه لا بلسانه۔

(۲۴۶) وضو کے بعد انگلی اٹھا کر شہادت پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو کرنے والا جب وضو سے فارغ ہو جاتا ہے تو اپنی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور پھر دعا کرتا ہے۔کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......وضو سے فارغ ہو کر اس طرح اشارہ کرتے ہوئے دعا پڑھنے کا جواز ثابت ہے۔

لمافی المسلم(۱/۱۲۲): مامنکم من احد یتوضأ فیبلغ او فیسبغ الوضوء ثم یقول اشهد ان لا اله الا الله وان محمد اعبده ورسوله الافتحت له ابواب الجنة الثمانیة یدخل من ایهاشاء۔

وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۶۱): ذکر الغزنوی انه یشیر بسبابته حین النظر الی السماء۔

(۲۴۷) استنجاء کے پانی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب ہم لوگ استنجاء کرتے ہیں تو بعد میں استنجے والا پانی شلوار کو لگ جاتا ہے تو کیا اس سے شلوار ناپاک نہیں ہوتی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......استنجاء کا پانی شلوار پر لگ گیا تو دیکھا جائے گا، اگر یہ پانی پہلی، دوسری یا تیسری مرتبہ کے دھونے کا ہو (نجاست کے پاک ہونے کا ہے) تو شلوار ناپاک ہوگی۔اور اگر یہ پانی جو شلوار پر لگا ہے، چوتھی بار دھونے کا ہے، (یعنی پاکی کے بعد کا پانی لگا ہے) تو شلوار نجس نہ ہوگی۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۲۱۶): والمحدث اذا استنجی فاصاب الماء ذیله اوکمه ان اصابه الماء الاول او الثانی او الثالث یتنجس بنجاسة غلیظة وان اصابه الماء الرابع یتنجس بنجاسة الماء المستعمل۔

(۲۴۸) استنجاء کے وقت ضرورت سے زائد ستر کھولنے کا حکم

سوال...... مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق سوال کرنا تھا:

(۱)۔ ایک آدمی لوگوں کے مجمع کی وجہ سے پانی سے استنجاء چھوڑ دیتا ہے صرف ڈھیلہ اور کاغذ (ٹشو پیپر) پر اکتفاء کر لیتا ہے اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہے۔ آیا اس کی نماز درست ہوگئی یا نہیں؟

(۲)۔ نیز ایک شخص اپنی شرم گاہ کو بوقت استنجاء بقدر ضرورت سے زائد مقدار کھولتا ہے تو آیا یہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز درست ہوگئی۔

(۲)۔ کسی عذر کی وجہ سے استنجاء کے وقت اپنی شرم گاہ کو ضرورت سے زائد کھولنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندية (۴۸/۱): يجوز الاستنجاء بنحو حجر منق كالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد وما اشبهها۔......... والاستنجاء بالماء أفضل إن أمكنه ذلك من غير كشف العورة وان احتاج إلى كشف العورة يستنجي بالحجر ولا يستنجي بالماء كذا فى فتاوىٰ قاضيخان۔

وفيه ايضاً (۵۰/۱): ويكره ان يبول... او متجردا عن ثوبه من غير عذر فان كان بعذر فلا باس به۔

(۲۴۹) کشف عورۃ کا خطرہ ہو تو استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالاحجار

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالحجر افضل ہے، نیز اگر کشف عورۃ کا خطرہ ہو، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... کشف عورۃ کا خطرہ نہ ہو تو استنجاء بالماء افضل ہے اور اگر کشف عورۃ کا خطرہ ہو تو استنجاء بالحجر کرنا چاہیئے۔

لمافی الهندية (۴۸/۱): والاستنجاء بالماء أفضل إن أمكنه ذلك من غير كشف العورة وان احتاج إلى كشف العورة يستنجي بالحجر ولا يستنجي بالماء كذا فى فتاوىٰ قاضيخان۔

وفى الشامية (۳۳۸/۱): ثم اعلم أن الجمع بين الماء والحجر افضل ويليه فى الفضل الاقتصار على الماء اھ۔

(۲۵۰) رکعت چھوٹنے کا امکان ہوتو وضو میں مسواک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وضو شروع کرے اسی وقت جماعت کھڑی ہو جائے تو اب وہ مسواک کرے یا مسواک کو چھوڑ کر نماز میں داخل ہو جائے اگر تکبیر اولیٰ چھوٹ جانے کا خطرہ ہو یا نماز کی ایک یا دو رکعت چھوٹ جانے کا خوف ہو۔ مسئلہ ھذا کی مکمل وضاحت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......وضو میں مسواک کرنا سنت ہے اور اس کے استعمال سے نماز کے ثواب میں زیادتی ہوتی ہے اور تکبیر اولیٰ اور رکعت کا حصول اولیٰ یا مستحب ہے اور دونوں میں فی نفسہٖ فضیلت موجود ہے اور جب دو فضیلتوں کا حصول ممکن ہو تو اس میں جو ارجح ہو وہ مقدم ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مسواک کو ادا کرے گا اگر چہ تکبیر اولیٰ یا رکعت نکل جائے کیونکہ رکعت کے نکلنے سے جماعت کی فضیلت سے محروم نہیں ہوتا کیونکہ وہ قعدہ اخیرہ کے ملنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور تکبیر اولیٰ کے ترک سے سنت کا ترک ہونا لازم نہیں آتا۔ البتہ مسواک کے ترک سے مسواک کا ثواب نہیں ملتا اور سنت کا ترک ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے فعل مسواک کو حصول تکبیر اولیٰ اور رکعت پر مقدم کیا جائے گا البتہ کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ مسواک کے ساتھ وضوذرا پہلے کرلیا جائے اور مسواک کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائی جائے تاکہ دونوں فضیلتوں کا پانے والا ہو جائے۔

لما فی جامع الترمذی(۵۶/۱): عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ من صلی لله اربعين يوما فی جماعة يدرك التكبيرة الاولی كتب له براء تان براء ة من النار وبراء ة من النفاق۔

وفی اعلاء السنن(۴۴/۱۔۴۵۔۴۶): عن ابی هريرة رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ انه قال ''لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواك مع كل وضوء'' اخرجه مالك واحمد والنسائی وصححه ابن خزيمة وذكره البخاری تعليقاً۔

قوله عن ابی هريرة الخ، قال المؤلف: دلالته علی تاكيد السواك ظاهرة۔ نعم :لا يدل علی السنة الاصطلاحية، لانه ليس فيه لفظ دال علی مواظبته ﷺ علی السواك والحديث الذی بعده صريح فيه فان فيه لفظ''كان'' الدال علی المواظبة فصح قول صاحب الهداية (ص۵۰۶) وسنن الطهارة۔ الی ان قال۔ والسواك، لانه عليه السلام كان يواظب عليه۔

وفی الطحطاوی علی الدر (۳۰۰/۱): (قوله وقيل فی التشهد) قال فی الشرنبلالية الذی تحرر عندی انه ياتی بالسنة اذا كان يدركه ولو فی التشهد باتفاق بين محمد وشيخيه ولا يتقيد بادراك ركعة وتفريع الخلاف هنا علی خلافهم فی مدرك تشهد الجمعة غير ظاهر لان المدار هنا علی ادراك فضل الجماعة وهو يحصل بادراك التشهد بالاتفاق كما نص عليه الكمال فماظنه بعضهم من انه

لم يحرز فضلها عند محمد... غير ظاهر الخ۔

وفى الشامية(۱۶۸/۲):(قوله واستياكه) لانه مندوب اليه فى سائر الصلوات اختيار ومفاده ان المراد به الاستياك عند القيام الى الصلاة فانه مستحب... واما السواك فى الوضوء فانه سنة مؤكدة... الخ۔

(۲۵۱)وضو میں واجبات کے نہ ہونے کی وجہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ''آسان نماز'' کتاب دیکھ رہا تھا اس میں نماز کے واجبات تو لکھے ہیں لیکن وضو کے واجبات ذکر نہیں کیے گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ نیز اگر وضو میں واجبات ہیں تو کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... وضو کے اندر واجبات نہیں ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وضو عبادتِ مقصودہ نہیں ہے اگر اس میں بھی واجبات ہوتے تو پھر تابع اصل کے مساوی ہو جاتا جو کہ نماز ہے۔ نیز کسی چیز کے ثبوت یا وجود پر حکم اس کی دلیل کے اعتبار سے ہوتا ہے اور جو دلیل واجب کو ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو، یا اس کے مرتبے اور قوت میں ہو جیسے وہ اخبار احاد جن کے مفہوم قطعی الدلالۃ ہوں۔ اب وضو کے احکامات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو اس لئے وضو میں واجبات نہیں پائے جاتے۔

لمافى حلبى كبير(ص۱۴): وليس للغسل ولا للوضوء واجب فلذالم يذكره قيل لانه لوكان لساوى التبع الاصل اى الوضوء او الغسل الصلوة واعترض عليه بعدم لزوم المساواة لثبوت التفاوت بوجه آخر وهو انه لايلزم بالنذر بخلاف الصلاة۔

لمافى البحر الرائق (۳۴/۱): ان الوضوء لاواجب فيه لما ان ثبوت الحكم بقدر دليله والدليل المثبت وهو ماكان ظنى الثبوت قطعى الدلالة وما كان بمنزلته كأخبار الآحاد التى مفهومها قطعى الدلالة ولم يوجد فى الوضوء۔

(۲۵۲)الفَرَق کی موجودہ پیمانوں کے اعتبار سے تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے کسی کتاب میں الفرق کا لفظ پڑھا اس نے تحقیق کی تو معلوم نہ کر سکا تنگ آ کر میرے پاس آیا میں بھی اس کو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے مطمئن نہ کر سکا اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ الفرق موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے یہ کتنا ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... الفرَق را کے فتح کے ساتھ اور الفرْق را کے سکون کے ساتھ دو الگ الگ پیمانوں کے نام

ہیں۔الفرق راء کے فتح کے ساتھ قدیم پیمانوں کے حساب سے اس میں 16 رطل آتے ہیں اور رطل میں 130 دراہم آتے ہیں اور فی درہم 3.0618 گرام کا ہوتا ہے تو اب رطل کا وزن 130 درہم کو جب 3.0618 گرام سے ضرب دیا گیا تو 398.034 گرام جواب آیا پھر 16 رطل کا وزن معلوم کرنے کیلئے 16 کو 398.034 سے ضرب دیا تو 6368.544 گرام جواب آیا۔جو تقریبا ساڑھے چھ کلوگرام بنتے ہیں۔

الفرق راء کے سکون کے ساتھ قدیم پیمانوں کے اعتبار سے اس میں 120 رطل آتے ہیں۔مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق 120 کو 398.034 سے ضرب دیا تو 47764.08 گرام جواب آیا۔جن کا وزن ایک من 7 کلوگرام، 764 گرام اور 0.08 ملی گرام بنتے ہیں لہٰذا الفرق راء کے سکون کے ساتھ جدید پیمانوں کے مطابق ایک من 7 کلوگرام، 764 گرام اور 0.08 ملی گرام بنتا ہے۔

لمافی صحیح المسلم(۱/۱۴۸): عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان رسول اللہ ﷺ یغتسل فی القدح وھو الفرق وکنت اغتسل انا وھو فی الاناء الواحد وفی حدیث سفیان رضی اللہ عنہ من اناء واحد قال قتیبۃ قال سفیان والفرق ثلثۃ اٰصع۔

وفی الفتاوی الشامیۃ(۲/۳۶۵): اعلم ان الصاع اربعۃ امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن بالدراھم مائتان وستون درھما... ثم اعلم ان الدرھم الشرعی اربعۃ عشر قیراطا والمتعارف الآن ستۃ عشر فاذا کان الصاع الفاواربعین درھما شرعیا یکون بالدراھم المتعارف تسعمائۃ وعشرۃ۔

وفی مجمع بحار الانوار(۴/۱۳۱): (فرق) فیہ: کان یغتسل من الفرق، ھو بالحرکۃ مکیال یسع ستۃ عشر رطلا وھو اثنا عشر مدا وثلاثۃ اٰصع فی الحجاز، وقیل: الفرق خمسۃ اقساط، والقسط نصف صاع وھو بالسکون: مائۃ وعشرون رطلا۔

(۲۵۳) جس "فرق" سے آپ ﷺ غسل فرمایا کرتے تھے اس کی تعیین

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور ﷺ کے غسل کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔بعض میں ہے کہ آپ علیہ السلام صاع سے جو کچھ اوپر تین کلوگرام بنتا ہے غسل فرمایا کرتے تھے اور بعض میں ہے کہ فرق سے غسل فرمایا کرتے تھے پھر فرق کے بارے میں کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ فرق 16 رطل کا ہوتا ہے اور یہ بھی ملتا ہے کہ 120 رطل کا ہوتا ہے۔ 16 رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر 6 کلوگرام اور 120 رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر 47 کلوگرام بنتے ہیں۔اس اعتبار سے تو بہت بڑا تفاوت پیدا ہوجاتا ہے اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟ فرق سے مراد (جس سے آپ علیہ السلام غسل فرماتے تھے) 16 رطل والا ہے یا 120 رطل والا؟ مہربانی فرما کر تفصیلی ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملك الوهاب......فرق کی دو قسمیں ہیں، ایک فرق بفتح الراء اور دوسرا بسکون الراء۔ اوّل بفتح الراء 16 رطل اور دوسرا بسکون الراء 120 رطل کا ہوتا ہے لیکن جس فرق سے آپ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرماتے تھے وہ محدثین عظام وفقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق فرق بفتح الراء 3 صاع جو 16 رطل کا ہوتا تھا اور اسی پر علامہ ابو عبیدؒ نے اتفاق نقل فرمایا ہے پھر چونکہ جمہور علماء کے نزدیک ایک صاع پانچ رطل اور ثلث رطل اور احنافؒ کے نزدیک ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے اس لئے جمہور کے نزدیک ایک فرق تین صاع کے برابر ہوا اور احنافؒ کے نزدیک ایک فرق 2 صاع کے برابر ہوا، لہٰذا اس اعتبار سے اس کے مفہوم اور اس حدیث کے مفہوم جس میں فرمایا کہ آپ ﷺ ایک صاع سے غسل فرمایا کرتے تھے کوئی تضاد نہیں کیونکہ ایک صاع سے آپ ﷺ اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی تھیں۔

اسی طرح امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں صرف ''فرق'' کا ذکر ہے پانی کی مقدار مذکور نہیں کہ وہ بھرا ہوا ہوتا تھا یا کم لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کبھی وہ بھرا ہوا ہوتا ہو تو تین صاع پانی ہوتا ہو، اور جب کم ہوتا ہو تو 2 صاع پانی ہوتا ہو، اور اس دوسری صورت میں ایک صاع سے آپ ﷺ اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی ہوں لہٰذا یہ مفہوم اس حدیث کے مفہوم کے موافق ہے جس میں فرمایا کہ آپ ﷺ ایک صاع سے غسل فرماتے تھے۔

نیز جس فرق کو فقہاء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ وہ 3 صاع جو کہ 16 رطل کے برابر ہوتا تھا اس فرق سے حضور اکرم ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرب میں پانی کی قلت کی وجہ سے عام حالات میں غسل فرمایا کرتے تھے البتہ فرق بسکون الراء جو 120 رطل کا ہوتا ہے اور جس کی مقدار ایک بڑے ٹب کے برابر ہوتی ہے اس سے بھی کبھی پانی کی وافر مقدار موجود ہونے کی صورت میں غسل فرماتے ہوں تو کوئی بعید نہیں کیونکہ ایک صاع پانی کی مقدار کی کوئی تحدید نہیں لہٰذا اسراف سے بچتے ہوئے جتنے پانی سے بھی غسل کیا جائے جائز ہے۔

لمافي أبي داؤد(۳۱/۱): قال ابو داؤد وروى ابن عيينه نحو حديث مالك قال ابو داؤد سمعت احمد بن حنبل يقول الفرق ستة عشر رطلاً۔

وفي بذل المجهود(۱۴۶/۱): قال الطحاوي قالوا فلما ثبت بهذا الحديث الذي روي عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ كان يغتسل هو وهي من الفرق والفرق ثلثة اصع كان مايغتسل به كل واحد منهما صاعاً ونصفاً فإذا كان ذلك ثمانية ارطال كان الصاع ثلثيها وهو خمسة ارطال وثلث رطل وهذا قول اهل المدينة ثم اجاب الطحاوي عن هذا الاستدلال بأن حديث عروة عن عائشة رضي الله عنها انما فيه ذكر الفرق الذي كان يغتسل منه رسول الله ﷺ وهي لم تذكر مقدار الماء الذي يكون فيه هل هو ملؤه أو اقل من ذلك فقد يجوز أن يكون يغتسل هو وهي بملئه ويجوز أن يكون كان يغتسل هو وهي بأقل من ملئه مما هو صاعان فيكون كل واحد منهما مغتسلاً بصاع من ماء ويكون معنى هذا الحديث

موافقاً لمعنى الاحاديث التى رويت عن رسول الله ﷺ أنه كان يغتسل بصاع۔

وفى مجمع بحار الانوار(۱۳۱/۴): (فرق) فيه: كان يغتسل من الفرق، هو بالحركة مكيال يسع ستة عشر رطلاً وهو اثنا عشر مدّاً وثلاثة اصع فى الحجاز... وهو بالسكون: مائة وعشرون رطلاً۔

(۲۵۴)''مکوک'' کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں ایک لفظ آتا ہے اس کی صحیح مقدار بتادیں وہ لفظ مکوک ہے چونکہ موجودہ دور میں اس نام کا کوئی پیمانہ نہیں ہے تو موجودہ پیمانوں کلو، تولے اور گرام وغیرہ کے لحاظ سے ایک مکوک میں کتنے کلو، کتنے گرام اور کتنے تولے آئیں گے؟ لمافی السنن للنسائی (ص۱۱): انس بن مالک رضی اللہ عنہ یقول کان رسول اللہ ﷺ یتوضا بمکوک ویغتسل بخمسة مکاکی۔

الجواب بعون الملک الوهاب...... چونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مکوک سے وضو فرماتے تھے۔ اور یہ بات بھی مصرح ہے کہ مکوک سے مراد مد ہے۔ جبکہ ایک مد دو رطل کا ہوتا ہے۔ اور ایک رطل 130 درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم 14 قیراط کا ہوتا ہے لہٰذا ایک مکوک میں 796.068 گرام، 819 ماشے اور 68.25 تولے ہوتے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

گرام کی تفصیل......5 جو=0.2187 گرام...... قیراط=1.8 رتی

درہم=14 قیراط لہٰذا 3.0618=14×0.2187

درہم=3.0618 گرام لہٰذا 260 درہم=796.068=260×3.0618

مکوک=796.068

تولے وماشے کی تفصیل......

ایک قیراط میں رتی 1.8=0.1215÷0.2187

ایک درہم میں رتی 25.2=14×1.8

ایک درہم میں ماشہ 3.15=8÷25.2

ایک مکوک میں ماشے 819=260×3.15

ایک مکوک میں تولے 68.25=12÷819

لمافى معارف السنن المكتبة البنورية (۲۰۶/۱): اختلف الائمة فى مقدار مايسعه المد والصاع: فذهب ابو حنيفة ومحمد رحمهما الله وكذا ابو يوسف رحمه الله فى قوله القديم المرجوع عنه: إلى ان المد مايسعه الرطلان والصاع: ثمانية ارطال وهو مذهب فقهاء العراق۔ وذهب

مالك والشافعی واحمد وابو یوسف وفقهاء الحجاز رحمهم الله: الی ان المد رطل وثلثه، والصاع: خمسة ارطال وثلث رطل بعد اتفاقهم جميعا علی ان الصاع اربعة امداد وقال الفيروز آبادی فی القاموس: المد مكيال وهو رطلان او رطل وثلث او ملؤ كفی الانسان المعتدل إذا ملاهما ومد يده بهما وبه سمی مداً اھ۔

وفی فتح القدير(۲/۲۹۷): ولنا ماروی انه عليه الصلوة والسلام كان يتوضأ بالمد رطلين ويغتسل بالصاع ثمانية ارطال هكذا وقع مفسرا عن انس رضی اللہ عنہ وعائشة رضی الله عنها فی ثلاثة طرق۔

وفی الشامية(۱/۱۵۸): (قوله وهو ثمانية ارطال) ای بالبغدادی وهی صاع عراق وهو اربعة امداد كل مد رطلان وبه اخذ ابو حنيفة رحمه الله۔ والصاع الحجازی خمسة ارطال وثلث، وبه اخذ الصاحبان والائمة الثلاثة رحمهم الله فالمد حينئذ رطل وثلث والرطل مائة وثلاثون درهما وقيل مائة وثمانية وعشرون درهما واربعة اسباع درهم وتمامه فی الحلية۔قلت والصاع العراقی نحو نصف مد دمشقی فاذا توضأ واغتسل به فقد حصل السنة۔

(۲۵۵)''باع'' کی تحقیق

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ میرے مطالعہ میں ''الباع'' کا لفظ آیا جس کی موجودہ دور کے پیمانوں کے لحاظ سے کچھ تطبیق بھی دی تھی لیکن وہ میرے سے کہیں گم ہوگئی آپ حضرات میری رہنمائی فرمائیں کہ الباع کس پیمانے کا نام ہے؟اس میں کتنے میٹر اور کتنے سینٹی میٹر آئیں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک باع میں چار ذراع ہوتے ہیں اور ایک ذراع میں 18 انچ ہوتے ہیں اور ایک انچ میں 2.5 سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا 18 انچ میں 45 سینٹی میٹر ہوئے، لہٰذا ایک باع میں 180 سینٹی میٹر ہوئے اور چونکہ ایک میٹر میں تقریباً 97.5 سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا ایک باع میں 1.84 میٹر ہوئے۔

لما فی فتح القدير(۱/۱۲۳): إن البريد من الفراسخ أربع ولفرسخ فثلاث أميال ضعوا
والميل ألف ای من الباعات قل والباع أربع أذرع فتتبعوا
ثم الذراع من الاصابع أربع من بعدها عشرون ثم الاصبع
ست شعيرات فظهر شعيرة منها الی بطن لاخری توضع
ثم الشعيرة ست شعرات فقل من شعر بغل ليس فيها مدفع

وفی الهندية(۱/۱۸): والمعتبر ذراع الكرباس كذا فی الظهيرية وعليه الفتوی كذا فی الهداية وهو

ذراع العامة ست قبضات أربع وعشرون اصبعاً۔

وفی الشامية(۱/۱۹۶): (قوله والمختار ذراع الكرباس) وفی الهداية أن عليه الفتوی واختاره فی الدرر والظهيرية والخلاصة والخزانة... (قوله وهو سبع قبضات فقط) ای بلا اصبع قائمة وهذا ما فی الولوالجية وفی البحر أن فی كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة اصبع قائمة فهو اربع وعشرون اصبعاً بعدد حروف ''لا اله الا الله محمد رسول الله'' ... والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة... أقول وهو قريب من ذراع اليد لانه ست قبضات وشی وذالك شبران۔

(۲۵۶) گرام اورتولے کے اعتبار سے مُد کا وزن

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد سے وضو فرماتے تھے آجکل مدتو مفقود ہو چکے ہیں تو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے مد میں کتنے کلو کتنے گرام اور کتنے تولے وغیرہ ہوں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مد کی مقدار موجودہ پیمانے کے لحاظ سے 796.068 گرام ہے اور تولہ کے حساب سے 68.25 تولہ ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(گرام)

ایک مد...... دو رطل

ایک رطل...... 130 درہم

ایک درہم...... 14 قیراط

ایک قیراط...... 5 جو (0.2187 گرام)

(ایک درہم) چودہ قیراط...... 3.0618 گرام

260 دراہم...... 796.068=260×3.0618 گرام۔ ایک مد کا وزن

(تولہ)

ایک درہم...... چودہ قیراط

ایک قیراط...... 1.8 رتی

1.8 رتی×14 قیراط=25.2 رتی

6552=260×25.2 رتی (ایک مد)

ایک ماشہ...... 8رتی

6552÷8=819(ماشہ)

ایک تولہ......12ماشہ

819÷12=68.25 تولہ ایک مد میں

ایک مد	2رطل	819ماشہ	6552رتی	68.25تولہ	796.068 گرام

لمافی فتح الملھم(۳/۱۵۴): ان المدّین الحجازی والعراقی۔ وکذا الصاعین کانا مستعملین فی عھد النبی ﷺ الا ان الشائع الغالب فی الاستعمال فی عھدہ ﷺ کان العراقی من الامداد وھو رطلان۔

وفی عمدۃ القاری (۳/۹۴): والمدّ اختلفوا فیه ... وقیل ھو رطلان وبه یقول ابو حنیفة وفقھاء العراق رحمھم الله۔

وفی الشامیة(۲/۳۶۵): اعلم ان الصاع اربعة امداد و المدّ رطلان والرطل نصف من والمنّ بالدراھم مائتان وستون درھماً وبالاستار اربعون والاستار بکسر الھمزة بالدراھم ستة ونصف بالمثاقیل قیل اربعة ونصف ... فالمد والمنّ سواء کلّ منھما ربع صاع مائة و ثلاثون درھماً وفی الزیلعی والفتح اختلف فی الصاع فقال الطرفان رحمھما الله ثمانیة ارطال بالعراقی وقال الثانی رحمه الله خمسة ارطال وثلث قیل لاخلاف لانّ الثانی رحمه الله قدرہ برطل المدینة لانه ثلاثون استاراً والعراقی عشرون واذا قابلت ثمانیة بالعراقی بخمسة وثلث بالمدینی وجدتھما سواء وھذا ھو الاشبه...ثم اعلم ان الدرھم الشرعی اربعة عشر قیراطاً۔

(۲۵۷)''مرکن''جوکہ غسل کا برتن ہے یہ کیسا اور کتنا بڑا تھا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام اکٹھے ایک مرکن سے غسل فرماتے تھے۔ پوچھنا یہ ہے کہ مرکن کسے کہتے ہیں؟ نیز موجودہ دور میں اس کا اطلاق کس برتن وپیمانے پر ہوتا ہے اور اس کی کتنی مقدار ہے؟ یعنی اس میں کتنی مقدار پانی سماجاتا ہے۔ جواب مع حوالہ جات تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔المعجم الوسیط (صفحہ ۳۷۱) پر اور دیگر شروحات حدیث کی کتابوں میں ''مرکن'' کے

معنی یوں لکھے ہیں ''المركن: وعاء تغسل فیها الثیاب''یعنی''مرکن''وہ برتن ہے جس میں کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے ہیں۔موجودہ دور میں اس کا اطلاق فارسی زبان میں ''لگن'' جبکہ اردو زبان میں ''ٹب'' پر ہوتا ہے۔

(۲)۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اکیلے غسل فرماتے تھے تو عام عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ ایک صاع (یعنی 3.184272 کلوگرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے،اور جب کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرماتے تھے تو ایک ''فرق''یعنی دوصاع (6.368544 کلو گرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے۔

جن احادیث طیبہ میں ''مرکن'' (ٹب) یا ''اناء واحد'' (ایک برتن) سے کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرمانا آیا ہے تو ان دونوں برتنوں کی مقدار معلوم اور متعین نہیں ہے۔اب یہ ''مرکن'' یا تو ''فرق'' کے برابر تھا یا ''فرق'' سے بڑا تھا، بظاہر بڑا ہی معلوم ہوتا ہے،اب بڑا ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں آرہا کہ پانی سے بھی بھرا ہوا ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ پانی ''فرق'' ہی کی مقدار ہوتا ہوگا بوجہ عام عادتِ مبارکہ اور مدینہ طیبہ میں عموماً پانی کی قلت کے، ہاں اگر پانی وافر مقدار میں کبھی دستیاب ہوتا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ ''مرکن'' پانی سے بھی بھرا ہوا ہوتا ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وافر مقدار پانی سے غسل فرمایا کرتے ہوں گے اور یہی تفصیل ''اناء واحد'' میں بھی ہے۔

لما فی صحیح البخاری(۱۰۹۰/۲): ان عائشة رضی الله عنها قالت: قد كان يوضع لی ولرسول الله صلی الله علیہ وسلم هذا المركن فنشرع فيه جميعاً۔

وفی المعجم الوسيط(ص۳۷۱): المركن: وعاء تغسل فيه الثياب (ج) مراكن۔

وفی فتح الملهم (۱۸۱/۳): قوله ''فی مركن'' الخ: هو الاجانة التی تغسل فيها الثياب أی ''لكن''۔

وفی الديباج علی صحيح مسلم للسيوطی(۳۰۲/۱): مركن: بكسر الميم وفتح الكاف، الاجانة التی يغسل فيها الثياب۔

وفی صحيح البخاری(۳۹/۱): عن عائشة رضی الله عنهاقالت كنت اغتسل أنا والنبی صلی الله علیہ وسلم من اناء واحد من قدح يقال له الفرق... سمعت اباسلمة رضی اللہ عنہ يقول: دخلت أنا واخو عائشةرضی الله عنها علی عائشةرضی الله عنها فسألها اخوها عن غسل رسول الله صلی الله علیہ وسلم فدعت باناء نحو من صاع فاغتسلت وافاضت علی رأسها وبيننا وبينها حجاب... عن شعبة قدر صاع۔

وفی فتح الباری (۲۹۲/۱):وادعی بعض الشارحين ان حديث ميمونة رضی الله عنها هذا لا مناسبة له بالترجمة لانه لم يذكر فيه قدر الاناء والجواب ان ذالك يستفاد من مقدمة اخری وهی أن اوانيهم كانت صغاراً... فيدخل هذا الحديث تحت قوله ونحوه ای نحو الصاع۔ او يحمل المطلق فيه علی المقيد فی حديث عائشة وهو الفرق لكون كل منهما زوجة له۔

وفی فيض الباری(۳۴۸/۱):قوله: ''الفرق'' اناء يسع ثلاثة اصع فان كان ملآن يصير لكل

منهما صاع ونصف والمعروف فى عادته فى الغسل صاع وقد مرّ انه لا تحديد فيه والامر تقريبى، وان كان خالياً فالامر تحقيقى... فانه لا يلزم بكون الفرق هذا القدر ان يكون الماء فيه ايضاً كذالك فيمكن أن يكون الماء على قدر عادته۔

كتاب الصلوة

كتاب الصلوة

فصل فی المواقیت
(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱) تہجد اور ظہر کا وقت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ ظہر کی نماز سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے پڑھنی چاہیئے جبکہ آجکل یہاں کراچی میں یہ معمول ہے کہ ظہر کی نماز ڈیڑھ یا پونے دو بجے پڑھی جاتی ہے کیا اسطرح کرنا درست ہے؟ نیز تہجد کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ظہر کی نماز کا وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کے سایہ اصلی کے علاوہ جب اسکا سایہ دگنا ہو جائے اسوقت تک باقی رہتا ہے یہی احناف کا مشہور اور معمول بہا مذہب ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت میں جو بھی نماز ادا کرلے نماز ادا ہو جائیگی اگرچہ مستحب یہ ہے کہ سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے ادا کی جائے لیکن اگر ایک متعین وقت میں پڑھنے کی وجہ سے جماعت میں زیادہ افراد کی شرکت کا گمان ہو تو ایک وقت میں پڑھنا بھی بہتر ہے۔
نیز تہجد کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے البتہ افضل وقت آخری حصہ میں سو کر اٹھنے کے بعد کا ہے۔

لمافی الشامية (۳۵۹/۱): (قوله وعليه عمل الناس اليوم) أي في كثير من البلاد والاحسن مافي السراج عن شيخ الاسلام ان الاحتياط ان لايؤخر الظهر الى المثل وان لايصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلاتين في وقتهما بالاجماع۔

(۲) قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ کوئی ثبوت نہیں ہے صرف احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو پانچوں نمازوں کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں نمازوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ ان کی قرآن کریم سے لاعلمی ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا

ارشاد ہے:

(البقرة: ۴۳): وَأَقِيْمُوا الصَّلاَةَ۔ (الآية) (ترجمہ)''اور قائم کرو نماز کو'' (تفسیر طبری ۲:۷۷)

(النساء:۱۰۳): إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَوْقُوتًا۔

(ترجمہ)''یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔''

مذکورہ دونوں آیات کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر اجمالاً دلالت کرتی ہیں۔ (طبری ۱:۱۶۹)

(الروم:۱۷): فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۔

(ترجمہ)''سو تم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت اور صبح کے وقت۔''

مذکورہ آیت کریمہ فسبحان اللہ حین تمسون سے مغرب کی نماز اور وحین تصبحون سے فجر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الروم:۱۸): وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۔

(ترجمہ)''تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت''۔ مذکورہ آیت کریمہ میں وعشیا سے عصر کی نماز وحین تظهرون سے ظہر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الاسراء:۷۸): أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ

(ترجمہ)''آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے اور صبح کی نماز بھی۔

مذکورہ آیت کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر تفصیلاً دلالت کرتی ہے۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۴۵۵): أما فرضيتها فثابتة بالكتاب ، والسنة ، والاجماع ، والمعقول، أما الكتاب فقوله تعالىٰ فى غير موضع من القرآن ''اقيموا الصلاة'' وقوله ''ان الصلاة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتا......'' وقوله تعالىٰ ''حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطٰى''۔

ومطلق اسم الصلاة: ينصرف الى الصلوات المعهودة وهى التى تؤدى فى كل يوم و ليلة (وقوله تعالىٰ اقم الصلوة طرفى النهار الآية يجمع الصلوات الخمس لان صلاة الفجر تؤدى فى احد طرفى النهار، وصلاة الظهر والعصر يؤديان فى الطرف الآخر، اذالنهار قسمان، غداة وعشى والغداء اسم لاول النهار الى وقت الزوال، وما بعده العشى، حتى إن حلف لايأكل العشى فاكل بعد الزوال يحنث، فدخل فى طرفى النهار ثلاث صلوات ودخل فى قوله وزلفا من الليل المغرب والعشاء لانهما يؤديان فى زلف من الليل وهى ساعته۔

وفيه ايضاً(ص۴۵٦): وقوله تعالىٰ ''اقم الصلاة لدلوك الشمس......'' قيل دلوك الشمس زوالها،

’’غسق الليل‘‘ اوّل ظلمته فيدخل فيه صلاة الظهر والعصر وقوله تعالیٰ وقرآن الفجر وهو صلاة الفجر. فثبتت فرضية ثلاث صلوات بهذه الآية وفرضية صلاة المغرب والعشاء ثبتت بدليل اٰخر ... روى عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه قال حين تمسون المغرب والعشاء وحين تصبحون الفجر وعشيا العصر. وحين تظهرون الظهر. ذكر التسبيح واراد به الصلاة اى صلوا لله: إما لان التسبيح من لوازم الصلاة اولانه تنزيه والصلاة من اولها الى اخرها تنزيه الرب عزوجل لما فيها من اظهار الحاجات اليه، واظهار العجز والضعف وفيه وصف له بالجلال والعظمة والرفعة والتعالى عن الحاجة ...قوله تعالیٰ وسبح بحمد ربك الخ قيل فى تأويل قوله تعالیٰ فسبح اى فصل قبل طلوع الشمس هو صلاة الصبح. وقبل غروبها هو صلاة الظهر والعصر. ومن اٰناء الليل صلاة المغرب والعشاء، قوله واطراف النهار على التكرار والاعادة تاكيداً كما فى قوله تعالیٰ حافظوا على الصلوات والصلاة الوسطى الأيه ان ذكر الصلاة الوسطى على التاكيد لدخولها تحت اسم الصلوات كذا ههنا۔

وقوله تعالیٰ فى بيوت اذن الله الخ قيل الذكر والتسبيح ههناهما الصلاة وقيل الذكر سائر الاذكار والتسبيح الصلاة، وقوله تعالیٰ بالغدو صلاة الغداة وقوله تعالیٰ الأصال صلاة الظهر والعصر والمغرب و العشاء وقيل الآصال هو صلاة العصر ويحتمل العصر والظهر لانهما يؤديان فى الاصيل وهو العشى وفرضية المغرب والعشاء عرفت بدليل اٰخر۔

(۳) صبح کاذب کیا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ صبح کاذب جس کا احادیث میں ذکر ہے بروجی روشنی ہی ہے (جو سال بھر میں صرف دو ماہ وسط اگست سے وسط اکتوبر میں ہی نظر آ سکتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں رمضان المبارک میں آئی ہی نہیں) جبکہ دوسرا شخص اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح کاذب شامیؒ کے حوالہ کے مطابق وہ روشنی ہے جو صبح صادق شروع ہونے سے تین درجہ پہلے نمودار ہوتی ہے۔شرعی نقطہ نگاہ سے ان دونوں اقوال میں سے کون سا قول درست ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور درست قول ہے تو اس کو بتلا دیا جائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......واضح رہنا چاہیئے کہ شرعی احکامات کا تعلق مشاہدے سے ہے۔کسی سائنس یا ریاضی کے حسابات سے نہیں ہے۔اور چونکہ روزے کی ابتداء نماز فجر وغیرہ کے تمام شرعی احکامات کا تعلق صبح صادق سے ہے جو کہ ہر جگہ پورے سال نظر آتی ہے۔جبکہ صبح کاذب سے کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا اس لئے اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ہاں اتنا ضرور

ہے کہ جس جگہ یہ نظر آ جائے، اس کی وجہ سے صبح صادق کا دھوکہ نہ ہو جائے، اس لئے حدیث میں اس کی مخصوص نشانیاں بتلادی گئی ہیں، مثلاً

(۱)۔یہ صبح صادق سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے۔

(۲)۔اس کی روشنی صبح صادق کی طرح عرضاً نہیں بلکہ عموداً ہوتی ہے۔

(۳)۔اس کی مشابہت بھیڑیئے کی دم کی طرح ہوتی ہے۔

(۴)۔اوراس کے بعد صبح صادق سے قبل دوبارہ اندھیرا چھا جاتا ہے۔

(۵)۔اس کے طلوع ہونے کا وقت علامہ شامیؒ کے مطابق صبحِ صادق سے تین درجے پہلے کا ہے۔

لما فی الشامیة (۳۵۹/۱): (قوله من أول طلوع الخ) زاد لفظ أول اختیاراً لمادل علیه الحدیث کما قد مناه۔ (قوله۔ وهو البیاض الخ) لحدیث مسلم والترمذی۔ واللفظ له ''لایمنعنکم من سحورکم اذان بلال ولا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیر'' فالمعتبر الفجر الصادق وهو الفجر المستطیر فی الافق۔ أی الذی ینتشرضوئه فی اطراف السماء، لا الکاذب۔ وهو المستطیل الذی یبدو طویلاً فی السماء کذنب السرحان۔ أی الذئب ثم یعقبه ظلمة۔

(فائدة) ... ذکر العلامة المرحوم الشیخ خلیل الکاملی فی حاشیته علی رسالة الاسطرلاب لشیخ مشایخنا العلامة المحقق علی آفندی الداغستانی، أن التفاوت بین الفجرین وکذا بین الشفقین الأحمر والأبیض، إنما هو بثلاث درج۔ (قوله إلی قبیل) کذا أقحمه فی النهر. والظاهر أنه مبنی علی دخول الغایة، لکن التحقیق عدمه لکونها غایة مدّ کما سبق۔

وفی المعجم الوسیط(ص۶۷۵):(الفجر) انکشاف ظلمة اللیل عن نور الصبح وهما فجران، أحدهما المستطیل، وهو الکاذب ،والآخر، المستطیر المنتشر فی الافق۔

(۴) طلوع آفتاب کے بعد اشراق کا صحیح وقت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طلوع آفتاب سے کتنے منٹ بعد اشراق کا وقت شروع ہوتا ہے اور کتنے منٹ بعد پڑھنا افضل ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب ایک نیزہ کے برابر اوپر آ جائے۔ تو نماز پڑھنا جائز ہے جس کی مقدار 10 سے 20 منٹ ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اشراق کے نفل پڑھنے کا وقت طلوع آفتاب کے 10 منٹ بعد سے شروع ہوتا ہے اور افضل یہ ہے کہ 20 منٹ بعد ادا کی جائے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۴۴): وذکر فی الأصل مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهی فی حکم الطلوع واختار الفضلی رحمه الله ان الانسان مادام یقدر علی النظر الی قرص الشمس فی الطلوع فلا تحل الصلوة فاذا عجز عن النظر حلت۔

وفی الشامیة(۱/۳۷۱): (قوله مع شروق) ومادامت العین لاتحار فیها فهی فی حکم الشروق کما تقدم فی الغروب انه الأصح کمافی البحر، أقول ینبغی تصحیح ما نقلوه عن الأصل للامام محمد رحمه الله من انه مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهی فی حکم الطلوع لان اصحاب المتون مشوا علیه فی صلوة العید حیث جعلوا أول وقتها من الارتفاع ولذا جزم به هنا فی الفیض ونور الایضاح۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۶۷۷): فالاوقات الخمسة هی مایأتی، (۱) مابعد صلوة الصبح حتی ترتفع الشمس کرمح فی رأی العین ووقت طلوع الشمس حتی ترتفع قدر رمح ای بعد طلوعها بمقدار ثلث ساعة۔

(۵) وہ اوقات جن میں نفل پڑھنا مکروہ ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بزرگ نے مجھے صبح کی نماز کے وقت دو رکعت نفل پڑھنے کیلئے بتائے ہیں وہ میں دو سال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ پچھلے رمضان میں تبلیغ کیلئے عشرہ پر گیا چنانچہ وہاں جب میں نے معمول کے مطابق فجر کی سنتوں سے پہلے دو رکعت نفل پڑھی تو امیر صاحب نے بتایا کہ فجر میں دو رکعت سنت کے علاوہ نفل پڑھنا جائز نہیں۔ کیا امیر صاحب کی یہ بات درست ہے نیز کونسے اوقات میں نفل جائز نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں امیر صاحب کی بات درست ہے کہ طلوع فجر کے بعد سے لے کر سورج بلند ہونے تک فجر کی چار رکعتوں کے علاوہ کوئی دوسری نماز پڑھنا مکروہ ہے باقی جن اوقات میں نفل پڑھنا مکروہ ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۱)۔ طلوع فجر یعنی فجر کا وقت داخل ہونے کے بعد سورج نکلنے تک۔ (۲)۔ زوال کے وقت (۳)۔ عصر کی نماز کے بعد سے لے کر مغرب کی نماز تک۔ (۴)۔ اور جب فرض نماز کھڑی ہو جائے یا فرض نماز کا وقت تنگ ہو۔ (۵)۔ اور جب امام جمعہ کا خطبہ دینے کیلئے کھڑا ہو۔ (۶)۔ عید کی نماز سے پہلے مطلقاً یعنی گھر میں بھی اور مسجد میں بھی اور عید کی نماز کے بعد مسجد میں نفل پڑھنا مکروہ ہے نہ کہ گھر میں۔

لمافی الهندیة(۱/۵۲): تسعة أوقات یکره فیها النوافل وما فی معناها لا الفرائض هکذا فی النهایة والکفایة... منها ما بعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر کذا فی النهایة والکفایة، یکره فیه

التطوع بأكثر من سنة الفجر... ومنها مابعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس هكذا فی النهاية والكفاية ومنها ما بعد صلاة العصر قبل التغير... ومنها ما بعد غروب الشمس قبل صلاة المغرب وعند الاقامة يوم الجمعة وعند خطبة الجمعة والعيدين والكسوف والاستسقاء... ويكره التنفل عند خطبة الحج وخطبة النكاح... ويكره التطوع اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة... ويكره التنفل اذا أقيمت الصلاة الا سنة الفجر ان لم يخف فوت الجماعة وقبل صلاة العيد مطلقا وبعدها فی المسجد لافی البيت وبين صلاته الجمع بعرفة ومزدلفة...ويكره جميع الصلوة سوی الوقتية اذا ضاق وقت المكتوبة ... ويكره الصلاة وقت مدافعة البول أو الغائط ووقت حضور الطعام اذا كانت النفس تائقة اليه والوقت الذی يوجد فيه ما يشغل البال من افعال الصلاة ويخل بالخشوع كائنا ما كان الشاغل ويكره اداء العشاء ما بعد نصف الليل هكذا فی البحر الرائق۔

وفی الدر المختار(۳۷۵/۱): وكذا الحكم من كراهة نفل... بعد طلوع فجر سوی سنته۔

(۶)اوقاتِ مکروہہ میں تحیۃ المسجد ادا کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ان اوقات میں اگر کوئی مسجد میں آجائے تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟ ہمارے ہاں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ پڑھ سکتا ہے اور یہ حضرات دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمان کا مفہوم ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھے۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کونسی بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اوقاتِ مکروہہ(طلوع،غروب اورزوالِ آفتاب)میں نماز پڑھنا چاہے فرض ہو یا واجب؛ سنت ہو یا نفل ممنوع ہے۔اسی طرح صبحِ صادق سے طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی فرض نماز کے بعد سے مغرب تک صرف نوافل مکروہ ہیں فرائض ادا کئے جاسکتے ہیں۔اب ان پانچ اوقات میں مسجد میں آنیوالوں کیلئے تحیۃ المسجد جو نوافل کے قبیل سے ہے پڑھنا مکروہ ہے۔سوال میں ذکر کردہ روایت صحیح وثابت ہے چنانچہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہ میں معمولی اختلاف کیساتھ موجود ہے اور اسی روایت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وقت تحیۃ المسجد کے نفل پڑھے جاسکتے ہیں جبکہ دوسری روایات سے استدلال کرتے ہوئے احناف فرماتے ہیں کہ یہ روایات ان اوقات کیساتھ خاص ہیں جن میں نوافل پڑھنا جائز ہے۔نیز احناف کے مذہب پر عمل کرنے میں احتیاط بھی زیادہ ہے کیونکہ تحیۃ المسجد پڑھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے جبکہ ان اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔

لمافی الشامية(۱/۳۷۵): (قوله ولوتحية المسجد) اشارۃ الی انه لافرق بین ماله سبب اولاكمافی البحرخلافاللشافعی فیماله سبب كالرواتب وتحية المسجد۔

(۷)مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان کتنی دیر کاوقفہ ضروری ہے؟

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں صوبہ سرحد ضلع چترال کا رہنے والا ہوں، چترال شہر میں نمازوں کے اوقات کے لئے اور رمضان میں افطاری کے اوقات کی تعیین کے لئے کراچی سے ایک چارٹ بن کرآ گیا ہے اس میں مغرب اور عشاء کے درمیان کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بتایا ہے اس ڈیڑھ گھنٹے کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہم لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور ہم چونکہ دیہات میں رہتے ہیں وہاں غروب آفتاب جلدی ہوتا ہے، غروب آفتاب کے بعد اذان دے کر ہم مغرب کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن جون جولائی کے مہینے میں مغرب کے بعد عشاء کے لئے ڈیڑھ گھنٹے کا اعتبار کرنے سے پونے دو گھنٹہ یعنی ایک گھنٹہ ۴۷ منٹ تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے سے کافی رات گزر جاتی ہے اور لوگ حرج میں مبتلا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چارٹ شہر کے لئے ہے دیہات والوں کے لئے یہ نہیں ہے۔

(۱)۔اب پوچھنا یہی ہے کہ کیا ہم جون جولائی کے مہینے میں بھی دوسرے مہینوں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کر کے نماز عشاء ادا کریں گے یا مغرب کی نماز کے بعد سے حساب کر کے جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے عشاء کی نماز ادا کریں گے۔

(۲)۔مغرب اور عشاء کے درمیان کتنی دیر وقفہ کرنا ضروری ہے۔

(۳)۔آیا اس شہر والے نقشہ کی اتباع کرنا ہمارے لئے ضروری ہے یا دیہات کیلئے کوئی الگ حکم ہے۔

اس بارے میں ہمارے علاقے کے لوگوں میں بہت اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اس کشیدگی کی وجہ سے اکثر لوگ گھروں میں نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل اور تسلی بخش جواب دے کر لوگوں میں اس نزاع کو ختم فرما کر عنداللہ اجر عظیم کا مستحق ہو جائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت شفقِ ابیض کے غروب سے شروع ہوتا ہے یعنی جب افق پر موجود سرخی ختم ہو جائے اور پھر اس کے بعد پھیلنے والی سفیدی بھی ختم ہو جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔صورت مسئولہ میں جس چارٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں عشاء کا ذکر کردہ وقت اگر غروب شفق ابیض کے موافق ہے تو دیہات میں بھی اس چارٹ کا لحاظ کرنا ضروری ہے کیونکہ شہر کے مضافات میں بھی شہر کے اوقات کا اعتبار ہوتا ہے چونکہ عشاء کی نماز میں معیار غروب شفقِ ابیض ہے اور اس کی مقدار اہل تجربہ ڈیڑھ گھنٹہ بتاتے ہیں اور یہ مقدار بعض موسموں میں ۴، ۵ منٹ زیادہ یا کم ہوتی رہتی ہے۔لہٰذا مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹہ سے کم فاصلہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ احتیاطاً پونے دو گھنٹہ کا فاصلہ کرنا چاہیئے اور آپ کے مقامی علماء کرام کو چاہیئے کہ نمازی حضرات کو سمجھائیں کہ وقت ہونے پر ہی نماز ادا کریں تا کہ سب حضرات مسجد میں با جماعت نماز ادا کریں۔

لمافی البحرالرائق(۱/۴۲۷): قوله(وهوالبیاض) ای الشفق هو البیاض عند الامام... وعندهما وهو روایة عنه هو الحمرة... وصرح فی المجمع بان علیها الفتوی ورده المحقق فی فتح القدیر ... ورجحه ایضاً تلمیذه قاسم فی تصحیح القدوری۔ وقال فی آخره: فثبت ان قول الامام هو الاصح اهـ وبهذا ظهر انه لایفتی ویعمل الا بقول الامام الاعظم ولا یعدل عنه الی قولهما أو قول احدهما أو غیرهما الالضرورة... وفی السراج الوهاج: فقولهما اوسع للناس وقول ابی حنیفة احوط۔

وفی الهندیة(۱/۵۱): ووقت المغرب منه الی غیبوبة الشفق وهو الحمرة عندهما وبه یفتی هکذا فی شرح الوقایة وعند ابی حنیفة الشفق هو البیاض الذی یلی الحمرة هکذا فی القدوری وقولهما اوسع للناس وقول ابی حنیفة رحمه الله احوط لان الاصل فی باب الصلاة ان لایثبت فیها رکن ولا شرط الا بما فیه یقین کذا فی النهایة ناقلاً عن الاسرار۔ ومبسوط شیخ الاسلام۔

وفی الدرالمختار مع الشامیة(۱/۳۶۱): ووقت المغرب منه الی غروب الشفق وهو الحمرة عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها فکان هو المذهب وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح ومشی علیه فی البحر مؤیداً له بما قدمناه عنه... لکن تعامل الناس الیوم فی عامة البلاد علی قولهما وقد ایده فی النهر تبعاً للنقایة والوقایة والدرر والاصلاح ودرر البحار والامداد والمواهب وشرحه البرهان وغیرهم مصرحین بان علیه الفتوی وفی السراج: قولهما اوسع وقوله احوط۔

(۸) مغرب اور عشاء کا درمیانی وقفہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغ میں بھی وقت لگایا ہے، فرماتے ہیں کہ مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوتا ہے، تو اس کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ماہ بماہ کچھ کچھ دنوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہمارے شہر کی (مجوزہ نقشوں کے مطابق) ایک گھنٹہ انتیس منٹ ہوتا ہے (جولائی کے بعض دنوں میں) اور کم سے کم ایک گھنٹہ اکیس منٹ ہوتا ہے (نومبر کے بعض دنوں میں)، اس لئے آپ کے دوست کا مطلق یہ کہہ دینا مغرب و عشاء کے درمیان کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے درست نہیں، باقی ایام میں اس وقفہ کو معلوم کرنے کیلئے مساجد میں لگے مجوزہ نقشوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار مع الشامية (۳۶۱/۱): (و) وقت (المغرب منه الى) غروب (الشفق وهو الحمرة) عندهما وبه قالت الثلاثة واليه رجع الامام كما فی شروح المجمع وغيرها...

واذا تعارضت الأخبار والاثار فلا يخرج وقت المغرب بالشك كمافی الهداية وغيرها... لكن تعامل الناس اليوم فی عامة البلاد على قولهما... (تنبيه) قدمنا قريباً أن التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين فليحفظ۔

(۹) چھ ماہ دن، چھ ماہ رات رہنے والے ممالک میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی نماز دلوک شمس کے بعد واجب ہوتی ہے تو جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہو، وہاں ظہر کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ دلوک شمس تو نہیں پایا گیا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جن ممالک میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہو، وہاں کے لوگ اپنے قریبی معتدل ممالک کی نمازوں کے اوقات کے مطابق اندازاً اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کر کے پڑھیں گے۔

لما فی الدر المختار (۳۶۲/۱-۳۶۳): (وفاقد وقتهما) كبلغار فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق فی اربعينية الشتاء، (مكلف بهما فيقدر لهما) ولاينوی القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتى البرهان الكبير واختاره الكمال وتبعه ابن الشحنة فی الغازه فصححه فزعم المصنف انه المذهب،

وفی الشامية تحته: (قوله فيقدر لهما) هذا موجود فی نسخ المتن المجردة ساقط من المنح ولم أرمن سبقه اليه سوی صاحب الفيض حيث قال ولو كانوا فی بلدة يطلع فيها الفجر قبل غيبوبة الشفق لايجب عليهم صلاة العشاء لعدم السبب وقيل يجب ويقدر الوقت، بقی الكلام فی معنی التقدير والذی يظهر من عبارة الفيض ان المراد انه يجب قضاء العشاء بأن يقدر أن الوقت أعنی سبب الوجوب قد وجد كما يقدر وجوده فی ايام الدجال علی مايأتی لانه لايجب بدون السبب فيكون قوله ويقدر الوقت جواباً عن قوله فی الاول لعدم السبب وحاصله انا لانسلم لزوم وجود السبب حقيقة بل يكفی تقديره كما فی ايام الدجال، ويحتمل ان المراد بالتقدير المذكور هوما قاله الشافعية من انه يكون وقت العشاء فی حقهم بقدر مايغيب فيه الشفق فی اقرب البلاد اليهم۔

(۱۰)ضرورت کے وقت نمازِ عصر کو وقت سے پہلے پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فوج اگر محاذ جنگ میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھے،تو کیا اس طرح ان کی نماز درست ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ظاہر الروایہ اور مفتی بہ قول کے مطابق عصر کی نماز کو سایۂ اصلی کے علاوہ مثلین تک انتظار کر کے پڑھنا چاہیئے۔اس سے پہلے عام حالات میں نماز عصر پڑھنا درست نہیں تاہم اگر کسی ضرورت شدیدہ کی وجہ سے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے مثلین تک انتظار کرنے کی بجائے اوّل وقت یعنی ایک مثل کے بعد پڑھ لے تو اختلاف فقہاء کی وجہ سے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۴۰۳): واوّل وقت العصر عند أبي يوسف ومحمدرحمهما الله اذا صار الظل قامة وزاد عليها وذكر أبو سليمان عن أبي يوسف أنه يعتبر الزيادة قال أبو الحسن الخلاف فی آخر وقت الظهر هو خلاف فی اقل وقت العصر وفی الغياثية واوّل وقت العصر اذا صارظل كل شيئ مثليه۔ وهو المختار۔

وفی الدر المختار مع الشامية (۱/۳۵۹): وعنه مثله وهو قولهما وزفر والائمة الثلاثة قال الامام الطحاوی وبه نأخذ وفی غرر الاذكار وهو المأخوذ به وفی البرهان وهو الاظهر لبيان جبريل وهو نص فی الباب وفی الفيض وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتی (سوی فيئی)۔

(قوله الی بلوغ الظل مثليه) هذا ظاهر الرواية عن الامام نهاية وهو الصحيح بدائع ومحيط وينابيع وهو المختار غياثية واختاره الامام المحبوبي وعول عليه النسفی وصدر الشريعة تصحيح قاسم واختاره اصحاب المتون وارتضاه الشارحون فقول الطحاوی وبقولهما ناخذ لا يدل علی أنه المذهب وما فی الفيض من أنه يفتی بقولهما فی العصر والعشاء مسلم فی العشاء فقط علی مافيه وتمامه فی البحر... (قوله وعليه عمل الناس اليوم) أی فی كثير من البلاد والا حسن مافی السراج عن شيخ الاسلام أن الاحتياط أن لا يؤخر الظهر الی المثل وان لا يصلی العصر حتی يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلاتين فی وقتهما بالاجماع وانظر هل اذا لزم من تأخيره العصر الی المثلين فوت الجماعة يكون الاولی التاخير ام لا والظاهر الأول بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام تامل۔

(۱۱) نمازِ مغرب کو وقتِ عشاء سے پندرہ منٹ قبل ادا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مرتبہ کلفٹن اپنے گھر جارہا تھا کہ راستے میں مغرب کی نماز میں نے ادا نہیں کی۔ جب مقام پر پہنچا تو ابھی عشاء کا وقت (بمطابق کلینڈر) داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نماز مغرب ادا کرنے لگا تو میرے ساتھی نے کہا کہ مغرب کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب آپ قضاء نماز ادا کریں تو کیا یہ نمازِ مغرب قضاء وقت میں شمار ہوگی یا ادا وقت میں؟ سنا ہے کہ مغرب کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد شروع ہوجاتا ہے اور انتہاء وقتِ مغرب ''شفق ابیض'' (یعنی غروب آفتاب کے بعد مغربی جانب آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی) کے غائب ہونے پر ہے، اور نمازِ مغرب کے مجموعی وقت کا گھٹنا اور بڑھنا دنوں کے گھٹنے اور بڑھنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا گرمی کے موسم میں نمازِ مغرب کا مجموعی وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور سردی کے موسم میں سوا گھنٹہ ہے، لوگوں پر آسانی کے پیش نظر اسی پر فتویٰ ہے۔ ہماری مساجد میں عام طور پر آویزاں نمازوں کے نظام الاوقات کا دائمی نقشہ بھی مذکورہ وقت کے حساب سے مرتب ہے، اسی نقشہ کے نظام الاوقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمازوں کی ادائیگی کریں۔ آپ کی تحریر کردہ صورت کے مطابق کہ نماز عشاء کے وقت کے داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے، تو ایسی صورت میں آپ کی نماز ادا ہی شمار ہوگی، لیکن نمازِ مغرب کو بلا کسی عذر کے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الصحیح لمسلم (۲۲۳/۱): عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال وقت الظهر اذا زالت الشمس وكان ظل الرجل كطوله مالم تحضر العصر ووقت العصر مالم تصفر الشمس ووقت صلوة المغرب مالم يغب الشفق ووقت صلوة العشاء الى نصف الليل الاوسط ووقت صلوة الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت الشمس فامسك عن الصلوة فانها تطلع بين قرني الشيطان۔

وفی الهداية (۷۸/۱): وأول وقت المغرب اذا غربت الشمس وآخر وقتها مالم يغب الشفق ... ...ثم الشفق هو البياض الذى فى الأفق بعد الحمرة عند أبي حنيفة وعندهما هو الحمرة۔

وفی الشامية (۳۶۱/۱): (قوله واليه رجع الامام) اى الى قولهما الذى هو رواية عنه ايضا وصرح فى المجمع بأن عليها الفتوى، ورده المحقق فى الفتح بانه لايساعده رواية ولادراية الخ وقال تلميذه العلامة قاسم فى تصحيح القدورى، ان رجوعه لم يثبت، لما نقله الكافة من لدن الأئمة الثلاثة الى اليوم من حكاية القولين ودعوى عمل عامة الصحابة بخلافه خلاف المنقول قال فى الاختيار: الشفق البياض، وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل و عائشة رضى الله عنهم

قلت: ورواه عبدالرزاق عن ابي هريرة وعن عمر بن عبدالعزيز ولم يروالبيهقي الشفق الاحمر الاعن ابن عمر ... وتمامه فيه واذا تعارضت الأخبار والآثار فلا يخرج وقت المغرب بالشك كما في الهداية وغيرها قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح، ومشى عليه فى البحر مؤيد اله بما قدمناه عنه من انه لايعدل عن قول الامام الالضرورة من ضعف دليل اوتعامل...

(تنبيه) قدمنا قريبا ان التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين فليحفظ۔

(۱۲) سفر کی نمازوں کو پیشگی قصر کرنے کا حکم نیز کسی عذر کی وجہ سے دو وقتوں کی نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ سفر پر جانے سے پہلے ان وقتوں کی نمازوں کی قصر پیشگی گھر پر ادا کر لیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں اندیشہ ہے کہ وہ سفر میں ادا نہیں کر سکیں گے، مثلاً اگر سفر ظہر سے پہلے شروع کیا اور رات گئے اپنی منزل پر پہنچنے کا امکان ہے تو یہ لوگ ظہر، عصر، مغرب کی نماز قصر پیشگی ادا کر لیتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا؟

(۱) ائمہ اربعہ کا اس بارے میں مسلک ضرور بیان فرمائیں۔ (۲)......عرب ممالک میں بارش آندھی وغیرہ کے دن اکثر دو وقتوں کی نماز ایک ساتھ جمع کر لی جاتی ہے اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ (۳) یوم عرفات میں مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز جمع کی جاتی ہے سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص مسجد نہ جا سکا تو پھر وہ خیمہ میں نماز پڑھتا ہے چاہے تنہا یا مختصر جماعت کے ساتھ تو وہ نماز جمع کرے گا یا پھر دونوں نمازوں کو اپنے اپنے وقت پر پوری پڑھے گا یا قصر پڑھے گا حج میں لوگ قصر ہی پڑھتے ہیں؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ مطہرہ کو آسان بنایا ہے، اسلئے لوگوں کی آسانی کیلئے مختلف حالتوں میں مختلف احکام دیئے ہیں انہی احکام میں سے حالتِ سفر میں نمازوں کی قصر کا حکم ہے۔ البتہ نمازوں کی قصر کیلئے ضروری ہے کہ سفر کی حالت ہو، لہٰذا جب تک سفر شروع نہ ہوا ہو، ائمہ اربعہؒ میں سے کسی کے نزدیک قصر جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ سفر شروع کرنے سے پہلے گھروں ہی میں سفر میں آنے والی نمازوں کو قصر کرتے ہیں یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۲)......اور رہا مسئلہ حالتِ سفر میں نمازوں کو جمع کرنے کا تو ائمہ اربعہؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے، احنافؒ کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ لیکن یہ اختلاف جمع بین الصلاتین میں ہے یعنی دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں ہے اور وہ دو نمازیں یا تو ظہر وعصر

کی نمازیں ہیں یا مغرب وعشاء کی تقدیماً یا تاخیراً۔لیکن یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے کہ سب نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھا جائے پس صورت مسئولہ میں اگر سفر شروع کرنے سے پہلے نمازوں کو جمع کرتے ہیں تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر سفر شروع کرنے کے بعد جمع کرتے ہیں پھر اگر ساری ہی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں تو یہ بھی کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر دو نمازوں کو یعنی ظہر وعصر کو یا مغرب وعشاء کو جمع کرتے ہیں تو ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے لیکن احنافؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۳)......عرب ممالک میں چونکہ اکثر ائمہ ثلاثہؒ کے مقلدین رہتے ہیں اور ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک بارش وآندھی وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز ہے اس لئے وہ حضرات بارش وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرتے ہیں لیکن احنافؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

(۴)......یوم عرفات میں جمع بین الصلوتین کیلئے احنافؒ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق یہ شرط ہے کہ خلیفۂ وقت یا اس کے نائب کے پیچھے نماز باجماعت پڑھی جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا کسی اور امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو اُس کیلئے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہوگی بلکہ عصر کو اپنے وقت میں ہی پڑھے گا۔اور لوگ عموماً حج میں مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت کر لیتے ہیں تو مکہ مکرمہ میں نمازیں پوری پڑھی جائیں گی البتہ عرفات میں چونکہ تھوڑے وقت کیلئے آتے ہیں اور وہاں مسافر ہوتے ہیں اس لئے قصر کرنا لازم ہوگا۔

لما فی قوله تعالىٰ (النساء:۱۰۳): إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا

وفی الدر المختار (۲/۵۰۴): (صلى بهم الظهر والعصر باذان واقامتين) وقراءة سرية ولم يصل بينهما شيئاً على المذهب ولا بعد أداء العصر فى وقت الظهر(وشرط) لصحة هذا الجمع الامام الاعظم أو نائبه والا صلوا وحدانا اهـ۔

وفی الشامية تحته۔ (قوله والاصلوا وحدانا) يوهم جواز صلوة العصر فى وقت الظهر وعدم جواز الجماعة لوصليت العصر فى وقتها وليس بمراد فالاصوب قول الزيلعى رحمه الله صلوا كل واحدة منهما فى وقتها افاده ح اهـ۔

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۳۷۲): يجوز عند الجمهور غير الحنفية الجمع بين الظهر والعصر تقديما فى وقت الأولىٰ وتأخيراً فى وقت الثانية، والجمعة كالظهر الخ.......

وفی (صـ۱۳۷۴): اتفق مجيزو الجمع تقديما وتأخيراً على جوازه فى احوال ثلاثة هى السفر، والمطر ونحوه۔

(۱۳) رمضان میں افطاری کی خاطر نماز مغرب کو کچھ تاخیر سے پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں افطاری کے لئے نماز مغرب میں کچھ تاخیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کتب فقہ کی روشنی میں جواب دیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......افطار کیلئے جماعت مغرب میں پانچ دس منٹ تاخیر کی گنجائش ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۱۴۷): فکان تأخیرها مکروه الافی یوم غیم والا من عذر سفر او مرض وحضور مائدة والتاخیر قلیلالا یکره۔

وفی الشامیة(۱/۳۷۰): ای المذکور فی المبتغی بقوله یکره تاخیر المغرب فی روایة و فی اخری لامالم یغب الشفق والاصح الاول الالعذر اھ۔

(۱۴)عذر کی بنا پر نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک اکیڈمی میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں پڑھائی کا وقت تین سے سات تک ہے مسلسل اسباق ہوتے ہیں درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ نماز کا وقفہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے میری نماز رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے کیا تعلیم کی وجہ سے نماز چھوڑنا جائز ہے؟ نیز اس صورت کے پیش نظر میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اب میرے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز کی فرضیت اوقات مقررہ میں ہر عاقل بالغ مسلمان مرد وعورت پر ہے اور اس کا ثبوت آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مشہورہ سے ہے اور بلاکسی عذر شرعی کے اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔لہٰذا اپنی تعلیمی مصروفیات میں سے نماز کا وقت نکال کرادا کرنا ضروری ہے اور کسی بھی نماز کو اپنے وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں اگر پڑھ بھی لی تو فرض ادا نہ ہوگا اور قضاء لازم ہوگی۔

لمافی ردالمحتار علی الدر المختار(۱/۳۷۰):یشترط لصحة الصلاة دخول الوقت واعتماد دخوله کمافی نور الایضاح وغیره، فلو شك فی دخول وقت العبادة فاتی بها فبان انه فعلها فی الوقت لم یجزه۔

وفی الدر المختار(۱/۳۵۶): سببها ترادف النعم ثم الخطاب ثم الوقت الخ۔

وفی الشامیة: (قوله سببها ترادف النعم الخ) یعنی ان سبب الصلوة الحقیقی هو ترادف النعم علی العبد.... ولما کانت النعم واقعة فی الوقت جعل الوقت سببا بجعل الله تعالیٰ وخطابه حیث جعله سببا للوجوب لقوله تعالیٰ اقم الصلوة لدلوك الشمس فکان الوقت هو السبب المتاخر

وفی الشامیة أیضاً(ص۳۵۷): وفی البحر عن الخلاصة غلام صلی العشاء ثم احتلم ولم ینتبه حتی طلع الفجر علیه اعادة العشاء هو المختار... الی ان قال (قوله وانه الاصل) (قوله حتی یلزمهم)ای المجنون ومن ذکر بعده وکذا غیرهم ممن خرج علیه الوقت ولم یصل فیه قوله هو الصحیح۔

فصل فی الاذان والاقامة

(اذان واقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۵) اذان واقامت کے شرائط وآداب

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان واقامت کی شرائط کیا ہیں؟ اسی طرح انکے آداب بھی بیان فرمادیں تا کہ ہم انکی رعایت کرسکیں۔ نیز نابالغ بچہ یا عورت اذان دے سکتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کچھ شرائط مؤذن کیلئے ہیں اور کچھ اذان واقامت کیلئے، لہٰذا دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔

مؤذن کی شرائط......اول مسلمان ہونا، دوم مرد ہونا، سوم عاقل ہونا۔

اذان واقامت کی شرائط......وقت میں ہونا، عربی زبان میں ہونا، کلمات میں ترتیب کا پایا جانا، پے در پے ہونا یعنی درمیان میں بات چیت نہ کرنا۔

آداب......باآواز بلند ہونا، مؤذن کا نیک وصالح ہونا، اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں رکھنا، اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر جبکہ اقامت قدرِ عجلت سے ادا کرنا، قبلہ کی طرف منہ کرنا، حی علی الصلاۃ میں دائیں جانب اور حی علی الفلاح میں بائیں جانب منہ پھیرنا، اذان واقامت کہنے والے کا ایک ہونا۔

نیز عورت اور ناسمجھ بچے کی اذان درست نہیں لہٰذا اگر دونوں میں سے کسی نے بھی اذان دیدی تو اسکا اعادہ ضروری ہوگا البتہ اگر بچہ اتنا بڑا ہے کہ اسکو سمجھ بوجھ حاصل ہو تو اسکی اذان درست تو ہو جائیگی مگر بہتر یہ ہے کہ کوئی بالغ سمجھدار آدمی اذان دے۔

لمافی الشامیة (۱/۳۸۴): (قوله للرجال) اماالنساء فیکره لهن الاذان وکذاالاقامة لماروی عن انس رضی اللہ عنہ وابن عمر (رضی الله عنهما) من کراهتهمالهن ولأن مبنی حالهن علی السترورفع صوتهن حرام، امداد۔ ثم الظاهر انه یسن للصبی اذا اراد الصلاة کمایسن للبالغ وان کان فی کراهة اذانه لغیره کلام۔

وفی (ص۳۸۹): (قوله اعادماقدم فقط) کمالوقدم الفلاح علی الصلاة یعیده فقط ای ولایستأنف

الاذان من اوله ... (قوله ولورد سلام) اوتشميت عاطس اونحوهما الافی نفسه ولا بعدالفراغ علی الصحيح۔ (وفی صـ۳۹۳) (قوله وجزم المصنف) أی حيث قال فيما مرقيدنا بالمراهق لأن اذان الصبی الذی لايعقل غيرصحيح كالمجنون والمعتوه اهـ فافهم وهذاذكره فی البحربحثافترجح عندالمصنف فجزم به ويؤيده مافی شرح المنية من انه يجب اعادة اذان السكران والمجنون والصبی غيرالعاقل لعدم حصول المقصود.لعدم الاعتماد علی قولهم۔

(۱۶) حدود مسجد میں اذان نہ دینے کی وجہ کا بیان

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا کہ مسجد میں اذان نہیں دینی چاہیئے آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ صحیح ہونے کی صورت میں اذان نہ دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے حالانکہ اذان میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور نماز کی طرف دعوت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے ایک قاری صاحب فرما رہے تھے کہ مسجد میں ہوں تو حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ نہیں کہنا چاہیے مسجد سے باہر کہنا چاہیے، آیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان بلند آواز سے بلند جگہ پر دی جائے تا کہ زیادہ دور تک آواز پہنچے جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچے گی وہاں تک کی ہر چیز مؤذن کے حق میں گواہی دے گی مسجد کے اندر اذان نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سے آواز دور تک نہیں پہنچتی جس سے اذان کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا، اس لئے بلند جگہ اذان دینا مستحب ہے تا کہ آواز دور تک پہنچ جائے البتہ اگر مسجد کے اندر بھی ایسا انتظام ہو جس سے آواز دور تک پہنچے (جیسے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ) تو اس وقت مسجد کے اندر بھی اذان دے سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا مستحب ہے بعض علماء اذان کے جواب کو واجب کہتے ہیں مگر زیادہ معتمد یہی ہے کہ اجابت فعلی (اذان سن کر مسجد کی طرف جانا) واجب ہے اور اجابت قولی (اذان سن کر زبان سے جواب دینا) مستحب ہے حاضرین مسجد کیلئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ زبان سے جواب دیں۔ چنانچہ قاری صاحب کا یہ کہنا کہ ''مسجد کے اندر ''حی علی الصلاۃ'' اور ''حی علی الفلاح'' کے جواب میں ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' نہیں کہنا چاہیے'' صحیح نہیں اس لئے کہ حدیث میں اذان کے جواب دینے کے بارے میں مطلق آیا ہے اس میں مسجد کے اندر ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔

لمافی البخاری (۸۶/۱): عن ابی سعيد الخدری ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل مايقول المؤذن... قال يحيی وحدثنی بعض اخواننا انه قال لما قال حی علی الصلاة قال لاحول ولاقوة الا بالله وقال هكذا سمعنا نبيكم صلی اللہ علیہ وسلم يقول۔

وفيه أيضاً(۸۶/۱): ان ابا سعيد الخدری قال له انی اراك تحب الغنم والبادية فاذا كنت فی غنمك

او باديتك فاذنت للصلوة فارفع صوتك بالندآء فانه لا يسمع مدى صوت المؤذن جن ولا انس ولا شئ الاشهد له يوم القيمة قال ابوسعيدؓ سمعته من رسول اللهﷺ۔

وفی اعلاء السنن(۲/۱۴۰): ...... فالذی يظهر ان المقصود هو رفع الصوت والا علام التام اينما حصل فلا تعارض بينهما فان رفع الصوت قد حصل فی الموضعين.لعدم المانع فيهما بخلاف صحن المسجد۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۸۸): (قوله ولو كان بمسجد لا) فبه ان اجابة اللسان مندوبة عنده فالمانع من تحصيلها فی المسجد۔

وفی الدر المختار(۱/۳۹۸): (فيقطع قراء ة القرآن لو كان يقرأ (بمنزله، ويجيب) لو أذان مسجد كما ياتی (ولو بمسجد لا) لانه اجاب بالحضور وهذا متفرع علی قول الحلوانی، وأما عندنا فيقطع ويجيب بلسانه مطلقا والظاهر وجوبها باللسان لظاهر الأمر فی حديث اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مايقول۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷۰۴): اما رفع الصوت فليكون ابلغ فی اعلامه واعظم لثوابه كما ذكر حديث ابی سعيدؓ اذا كنت فی غنمك الخ ولما رواه الخمسة الا الترمذی عن ابی هريرة ان النبیﷺ قال المؤذن يغفر له مدّ صوته ويشهد له كل رطب ويابس الخ۔

وفی فتاوىٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء(۶/۶۵): ج: الاذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه لمافی ذلك من المصلحة العامة۔

(۱۷)ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو قریبی مساجد ہیں کیا دونوں میں اذان دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کسی مسجد میں اذان نہیں دی گئی تو کیا وہ گناہگار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔ اور ہر وہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے اس میں اذان مسنون ہے لہٰذا کہیں دو قریبی مسجد یں ہوں تو ہر مسجد میں اذان دینا ضروری ہے۔ ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں۔ اگر کسی مسجد میں اذان نہ دی گئی تو وہ گنہگار ہوں گے۔

لمافی الهندية(۱/۵۴): ويكره اداء المكتوبة بالجماعة فی المسجد بغير اذان وإقامة۔

وفی الدر المختار(۱/۳۹۴۔۳۹۵): (وكره تركهما) معا (لمسافر) ولو منفرداً (وكذا تركها) لاتركه

لحضور الرفقة (بخلاف مصل) ولو بجماعة (فی بیته بمصر) اوقریة لها مسجد

وفی الشامية تحته:(قوله ولو بجماعة) وعن ابی حنیفة رحمه الله: لو اکتفوا بأذان الناس اجزاء هم وقد أساءوا ففرق بین الواحد والجماعة فی هذه الروایة بحر

(۱۸) مختلف جگہوں پر اذان پوری کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن کا مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر اذان پوری کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان میں سنت یہ ہے کہ ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر دی جائے کہ چاروں طرف بآسانی آواز پہنچ جائے اور بہتر یہ ہے کہ حیعلتین پر بھی دائیں بائیں طرف منہ کرتے وقت قدم ایک ہی جگہ پر رہیں، تاہم ضرورت کی بنا پر تھوڑا بہت دائیں بائیں ہونے کی بھی گنجائش ہے جیسے منارہ پر بغیر آلۂ مکبر الصوت کے اذان دی جائے لیکن آج کل چونکہ آلہ مکبر الصوت پر دی جاتی ہے اس میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر اذان پوری کرنا ضروری ہے۔اور ایک ہی اذان کا مختلف جگہوں پر اس طور پر دینا کہ اس میں ٹھہراؤ نہ ہو اور چلنے کی سی صورت پیدا ہو جائے تو یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

لمافی الهندية (۵۶/۱): وان استدار فی صومعته عند اتساعها فحسن هكذا فی البدائع فیستدیر المؤذن فی المأذنة عند الحیعلتین ویخرج رأسه من الكوة الیمنی ویقول حیّ علی الصلوٰة مرّتین ثم من الكوّة الیسرٰی ویقول حیّ علی الفلاح مرّتین، وهذا اذا لم یتم الإعلام مع بقاء المؤذن فی مقامه۔

وفی اللجنة الدائمة(۵۸/۶): یشرع للمؤذن الذی یؤذن فی غیر مكرفون أن یلتفت یمینا وشمالا عند الحیعلة مع ثبوت قدمه لان ذالك ثبت من فصل مؤذن رسول الله ﷺ بحضرته ولأنه ابلغ فی اسماع النداء للصلواة لمن بعد عن المسجد۔

(۱۹) لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر اذان دینا کیسا ہے جبکہ مسجد کے آس پاس تھوڑے سے گھر ہوں اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز ان گھروں تک پہنچ سکتی ہو؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان سے مقصود اعلام ہوتا ہے لہٰذا اذان جتنی بلند آواز سے دی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔صورت مسئولہ میں اگرچہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بستی والوں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے لیکن اگر لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جائے تو اذان کی آواز علی

وجہ الکمال پہنچے گی۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز جائے گی تو وہاں تک کی ہر ہر چیز قیامت کے دن گواہی دے گی اس لئے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية(۵۵/۱): والسنة ان يؤذن فی موضع عال يكون اسمع لجيرانه ويرفع صوته ولا يجهد نفسه . . .

وفيه ايضاً(ص۵۶): ويجعل اصبعيه فی اذنيه وان لم يفعل فحسن لانه ليس بسنة اصلية وانما شرع لاجل المبالغة فی الاعلام۔

وفی الشامية(۳۸۸/۱): (ويجعل اصبعيه الخ) لقوله ﷺ لبلال رضی الله عنه اجعل اصبعيك فی اذنيك فانه ارفع لصوتك وان جعل يديه على اذنيه فحسن لأن أبا محذورة رضی اللہ عنہ ضم اصابعه الاربعة ووضعها على اذنيه . . . (قوله فاذانه الخ) تفريع على قوله ندبا قال فی البحر والامر ای فی الحديث المذكور للندب بقرينة التعليل فلذا لولم يفعل كان حسنا فان قيل: ترك السنة كيف يكون حسنا؟ قلنا ان الاذان معه احسن فاذا تركه بقی الاذان حسنا كذا فی الكافی۔

وفی اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء(۶۵/۶): الاذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه لما فی ذلك من المصلحة العامة۔

(۲۰) اَذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر پڑھنے کے طریقے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کو پڑھنے کے صحیح طریقے دو(۲) ہیں۔

(۱)...... پہلے اللہ اکبر کی راء کو ساکن پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط نہ ہوگا۔

(۲)...... پہلے اللہ اکبر کی راء کو فتحہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (بنیت وقف) پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا۔ نیز پہلے اللہ اکبر کی راء کو ضمہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (ہمزہ ساقط کرکے) پڑھنا خلاف سنت ہے۔

لمافی رد المحتار (۳۸۶/۱): والاصل فی اكبر تسكين الراء فحولت حركة الف اسم الله الى الراء كما فی ۔ آلم الله ۔ وفی المغنی حركة الراء فتحة وان وصل بنية الوقف ثم قيل هی حركة الساكنين ولم يكسر حفظا لتفخيم الله وقيل نقلت حركة الهمزة وكل هذا خروج عن الظاهر والصواب ان حركة الراء ضمة اعراب وليس لهمزة الوصل ثبوت فی الدرج فتنقل حركتها و

بالجملة الفرق بين الاذان وبين ۔ الٓم الله ۔ ظاهر فانه ليس لـ ۔ الٓم الله ۔ حركة اعراب اصلا وقد كانت لكلمات الاذان اعرابا الا انه سمعت موقوفة۔۔۔

وحاصلها ان السنة ان يسكن الراء من الله اكبر الاول اويصلها بالله اكبر الثانية فان سكنها كفى وان وصلها نوى السكون فحرك الراء بالفتحة فان ضمها خالف السنة لان طلب الوقف على اكبر الاول صيره كالساكن اصالة فحرك بالفتح۔

(۲۱) اذانِ فجر میں الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کا اضافہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کب ہوا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......احادیث مبارکہ کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ ہجرت کے پہلے سال اذان کی مشروعیت کے کچھ دنوں بعد ہوا ہے اس لئے کہ جن صحابی (حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ) کو اذان کا الہام کیا گیا ہے انہیں سے الصلوٰۃ خیر من النوم کے اضافے سے متعلق ایک حدیث مروی ہے جس میں انہوں نے اذان کی مشروعیت کا واقعہ یوں بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنا خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے پھر اذان کہنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کہا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کیلئے بلانے آیا کرتے تھے ایک دفعہ صبح کی نماز کیلئے بلانے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بآوازِ بلند الصلوٰۃ خیر من النوم کہا۔ اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلمات اس وقت سے صبح کی اذان میں داخل کئے گئے ہیں۔ پس حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ اذان کی مشروعیت کے کچھ ہی دنوں بعد ہوا ہے جبکہ اذان کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی ہے۔

لما في المسند الجامع(۳۰۳/۸): عن سعيد بن المسيب عن عبدالله بن زيد بن عبدربه قال لما اجمع رسول الله ﷺ ان يضرب بالناقوس يجمع للصلاة الناس وهو له كاره لموافقته النصارى طاف بي من الليل طائف وانا نائم رجل عليه ثوبان اخضران وفي يده ناقوس يحمله قال فقلت له يا عبدالله اتبيع الناقوس؟ قال وما تصنع به؟ قلت ندعوبه الى الصلوٰة قال افلا ادلك على خير من ذالك؟ قال قلت بلى قال تقول الله اكبر الله اكبر۔۔۔ (الى ان قال) فاخبرته بما رأيت قال فقال رسول الله ﷺ ان هذه لرؤياحق ان شاء الله ثم امر بالتاذين فكان بلال ''رضي الله عنه'' مولىٰ ابي بكر يوذن بذالك ويدعو رسول الله ﷺ الى الصلوٰة قال فجاء ه فدعاه ذات غد الى الفجر فقيل له ان رسول الله ﷺ نائم قال فصرخ بلال باعلىٰ صوته الصلاة خير من النوم قال سعيد بن المسيب فادخلت هذه الكلمة في التاذين الى صلاة الفجر''

وفی الدر المختار(۱/۳۸۳): (سببه ابتداء اذان جبرئیل) لیلة الاسراء وإقامته حین امامته علیه الصلوة والسلام ثم رؤیا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اذان الملك النازل من السماء فی السنة الاولیٰ من الهجرة۔

(۲۲) فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' رہ جائے تو کیا حکم ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذانِ فجر میں اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو کیا اذان کو دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' کہنا مستحب ہے۔ لہٰذا اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو اذان کو دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لمافی الدرالمختار(۱/۳۸۷): (ویقول) ندبا (بعد فلاح اذان الفجر الصلوۃ خیر من النوم مرتین) لانه وقت نوم وفی الشامیة تحته: (قوله بعد فلاح الخ) فیه رد علی من یقول ان محله بعد الاذان بتمامه۔

وفی الفقه علی المذاهب الاربعة(۱/۳۱۲): ثم یختم بقول لا اله الا الله الا فی صلوة الصبح فانه یندب ان یقول بعد حی علی الفلاح ''الصلوۃ خیر من النوم'' مرتین واذا ترکهما صح الاذان مع الکراهة۔

(۲۳) بلاعذر بیٹھ کر اذان دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اذان کیلئے کھڑا ہونا ضروری ہے یا بیٹھ کر بھی اذان دی جاسکتی ہے؟ اگر بغیر عذر کے کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو کیا اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اذان کے الفاظ کھڑے ہو کر ادا کرنا سنت ہے اور بلاعذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے البتہ اگر کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو دوبارہ دینا ضروری نہیں۔ البتہ ایک صورت میں بیٹھ کر اذان دینا بلاکراہت درست ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے۔

وفی الهندیة(۱/۵۴): ویکره الاذان قاعدا وان اذن لنفسه قاعدا فلابأس به۔

(۲۴) کیا مؤذن گواہ کے حکم میں ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن اذان میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو کیا اس کا یہ اذان دینا گواہی دینے کے حکم میں ہوگا؟ اور کیا مؤذن میں بھی ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو گواہ بننے کیلئے ہوتی ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان دینے سے مقصود اوقات صلاۃ کیلئے اعلان کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اذان دینا گواہی کے حکم میں نہیں اور نہ شرائطِ گواہی اذان دینے کیلئے ضروری ہیں۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ اذان دینے والا عادل، نیک وصالح ہو۔

لمافی الھندیة (۵۴/۱): ویکرہ اذان الفاسق ولا یعاد۔

(۲۵) بچے کی اذان کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ہماری مسجد میں ایک مرتبہ بارہ سال کے بچے نے اذان دیدی تو ایک آدمی نے اذان کا اعادہ کیا یہ کہتے ہوئے کہ بچے کی اذان درست نہیں ہے، کیا اس آدمی کی بات درست ہے؟ بچے کی اذان پر اعادہ لازم ہے کہ نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بارہ سال کا بچہ کیونکہ عاقل ہے اس لیے اسکی اذان درست ہے اسکا اعادہ نہیں کیا جائیگا البتہ افضل یہ ہے کہ بالغ مکلف شخص اذان دیا کرے۔

لمافی الشامیة (۳۹۴/۱): واما من حیث اقامة الشعار النافیة للاثم عن اھل البلدة فیصح اذان الکل سوی الصبی الذی لایعقل لان من سمعه لایعلم انه مؤذن بل یظنه یلعب بخلاف الصبی العاقل لانه قریب من الرجال ولذا عبر عنه الشارح بالمراھق۔

(۲۶) کئی سالوں کی قضاء نمازں کیلئے اذان واقامت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی کئی سال کی نمازیں قضاء ہو چکی ہیں اور اب وہ مستحبات بھی نہیں چھوڑنا چاہتا اگر یہ شخص ظہر کی نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں قضاء نماز پڑھے تو آیا اذان کہے یا نہیں جبکہ اذان ہو چکی ہو نیز ایسے شخص کیلئے اپنی نمازوں کی قضاء بہتر ہے یا نوافل اور سنت مؤکدہ پڑھنا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی کیونکہ کئی سال کی نمازیں فوت ہو چکی ہیں لہٰذا اسکو اختیار ہے کہ چاہے پہلے وقتی نماز پڑھے یا قضا پڑھے البتہ اگر وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ چند فوت شدہ نمازیں ادا سے پہلے پڑھ سکتا ہے تو پہلے

قضانمازیں پڑھ لے۔اوراس وقت میں جتنی قضانمازیں پڑھیگاتو پہلی قضا کیلئے اذان واقامت دونوں کہے گا،باقی میں اسکواختیار ہے چاہےتواذان واقامت دونوں کہے یاصرف اقامت پراکتفا کرے۔

نیزعام نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کہ پہلے قضانمازیں پڑھے البتہ سنن مؤکدہ وغیرمؤکدہ پڑھ لینی چاہئیں۔

لمافی مجمع الانهر(١/١١٤): (وكذا) يؤذن ويقيم (لاولى الفوائت وخيرفيه للبواقي) ان شاء اذن واقام وان شاء اقام فقط،هذااذاكان فى مجلس واحدواماااذاكان فى مجالس فانه يشترط كلاهما كمافى المستصفى۔

وفى التاتارخانية(١/٧٧٠): وفى الحجة الاشتغال بقضاء الفوائت اولى واهم من النوافل الاالسنن المعروفة وصلاة الضحى وصلاة التسبيح والصلوات التى رويت فى الاخبار۔

(٢٧)قضاءنماز پڑھتے وقت اذان واقامت کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قضانماز پڑھتے وقت اذان اوراقامت کہناضروری ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملك الوهاب......قضاءشدہ نمازاگرایک ہےتواس کوپڑھتے وقت اذان واقامت پوری کہنامسنون ہے چاہے باجماعت پڑھی جائے یااکیلے پڑھی جائے،اگرایک سے زائد ہیں توسب سے پہلی نمازکیلئے اذان واقامت دونوں کاکہنا ن ہےاور بقیہ میں اختیار ہے چاہےتواذان واقامت دونوں کہے یاصرف اقامت پراکتفاکرے یہ اس وقت ہے جب ایک ہی مجلس میں ایک سے زائدنمازیں اداکی جائیں البتہ اگرہرایک نمازالگ مجلس میں اداکرےتوپھرہرایک کیلئے اذان واقامت کہنامسنون ہے۔

لمافی الهندية (١/٥٥): ومن فاتته صلاة فى وقتها فقضاها أذن لها وأقام واحدا كان اوجماعة هكذا فى المحيط وإن فاتته صلوات أذن للاولى وأقام وكان مخيرا فى الباقى إن شاء أذن وأقام وإن شاء اقتصر على الاقامة كذا فى الهداية وإن أذن وأقام لكل صلاة فحسن... والتخيير فى البواقى إنما هو إذا قضاها فى مجلس واحد اما إذا قضاها فى مجالس فيشترط كلاهما۔

وفى الدرالمختار(١/٣٩٠):(و) يسن أن(يؤذن ويقيم لفائتة)...(وكذا) يسنان (لاولى الفوائت) لالفاسدة (ويخير فيه للباقى) لوفى مجلس وفعله اولى ويقيم للكل۔

(٢٨)میت کوقبرمیں اتارتے وقت اذان کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کوقبرمیں اتارتے وقت اذان دیناشرعاًکیساہے؟جائز

ہے یا بدعت؟ اگر بدعت ہے تو پھر نماز کے علاوہ اور مواقع میں کیوں جواز نقل کیا جاتا ہے ان میں وجہ فرق کیا ہے؟ تفصیل سے جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً درست نہیں، فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے اور دیگر مقامات پر نماز کے علاوہ جواذان کا جواز فقہاء نے نقل کیا ہے (مثلاً آندھی کے وقت، زلزلہ کے وقت، آگ لگ جانے کے وقت، جنات کی سرکشی کے وقت، کسی انسان یا جانور کی بدخلقی کے وقت، غمگین کے کان میں، مرگی کی بیماری کے وقت، غصہ کے وقت، نومولود بچہ کے کان میں) ان مقامات میں بعض تو منصوص ہیں مثلاً حزن کے وقت اور بچے کے کان میں اور جو غیر منصوص مقام ہیں ان میں بعض مقامات پر اذان دینے سے دفع مضرت مقصود ہوتی ہے اور بعض میں جلب منفعت اور ان مواقع پر اذان دینے کو عبادت بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف قبر پر اذان کو عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت کے ثبوت کیلئے دلیل خاص کا ہونا ضروری ہے اور یہاں دلیل معدوم ہے اس لئے فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔

تنبیہ......میت کو قبر میں اتارتے وقت احادیث مبارکہ میں یہ دعا منقول ہے: "بسم اللہ وعلی ملّة رسول اللہ" لہٰذا اس دعاء کو پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

لمافی الشامیة(۲/۲۳۵): لا یسن الأذان عند إدخال المیت فی قبره کما هو المعتاد الآن وقد صرّح ابن حَجر فی فتاویه بأنه بدعة وقال ۔ ومن ظنّ أنّه سنة قیاسا علی ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم یصب۔

وفی اللجنة الدائمة(۹/۷۲): لایجوز الأذان ولا الاقامة عند القبر بعد دفن المیت ولا فی القبر قبل دفنه لأن ذلك بدعة محدثة۔

(۲۹) شیعوں کا اذان میں "علی ولی اللہ" کا اضافہ کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیعوں کا اذان میں "علی ولی اللہ" وغیرہ کا اضافہ کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......شیعوں کا اذان میں "عَلِیٌ وَلِیُ اللہِ" وغیرہ کا اضافہ کرنا بدعت ہے کیونکہ احادیث مبارکہ، اقوال صحابہ اور ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کسی سے بھی ان کلمات کا اضافہ کرنا ثابت نہیں اور خود فقہاء شیعہ نے بھی اسکے عدم ثبوت کی صراحت اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا شرعاً لازم ہے۔ واللہ اعلم

لمافی اللجنة الدائمة (۶/۹۶): س: کیف یضع بعض المسلمین اسم علی بن ابی طالب رضی الله عنه فی الاذان والاقامة وهل فعل ذلك رسول الله ﷺ واصحابه؟

ج: الاذان من العبادات والعبادات كلها توقيفية ولم يكن فيه ولا فى الاقامة على عهد رسول الله ﷺ ولا على عهد خلفائه الراشدين ذكر اسم على رضى الله عنه ولم يشرع ذلك۔ وانما ابتدعه الرافضة كما هو شانهم فى الابتداء واهل السنة لايرون ذلك بل ينكرونه على فاعليه صيانة للتشريع الاسلامى عن البدع وحفظاله منها۔

وفى الحدائق الناضرة(۴۰۳/۷): (تاليف: شيخ يوسف البحرانى): قال: شيخنا الصدوق فى الفقيه بعد نقل خبر ابى بكر الحضرمى وكليب الاسدى: قال: مصنف هذا الكتاب هذا هو الاذان الصحيح لايزاد فيه ولا ينقص منه والمفوضة (لعنهم الله) قدوضعوا اخباراً وزادوا فى الاذان "محمد وال محمد خير البرية" مرتين وفى بعض رواياتهم بعد "أشهد ان محمدا رسول الله" "اشهد ان عليا ولى الله" مرتين ومنهم من روى بدل ذلك "اشهد ان عليا امير المؤمنين حقا" مرتين ولاشك فى ان عليا ولى الله وأنه امير المؤمنين حقا وأن محمدا وال محمد (صلوت الله عليهم) خير البرية و لكن ليس ذلك فى اصل الاذان وانما ذكرت ذلك ليعرف بهذه الزيادة المتهمون بالتفويض المدلسون انفسهم فى جملتنا۔

(۳۰) تہجد کی اذان کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عرب ممالک میں عام طور سے تہجد کی اذان ہوتی ہے فجر سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے یہ کب سے شروع ہوئی یہ خلفائے راشدین کے وقت میں رائج تھی یا نہیں اگر یہ بعد میں شروع ہوئی تو کیا بدعت میں شمار ہوگی؟

الجواب بعون الملك الوهاب......تہجد کیلئے اذان احناف کے ہاں ثابت نہیں یہ اذان رسول کریم ﷺ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی جو بعد میں نہیں رہی اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی نہیں تھی جیسا کہ طحاوی میں حضرت علقمہؒ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تہجد کیلئے اذان دے تو یہ بدعت نہیں ہوگی کیونکہ اس کی اصل موجود ہے لیکن دینی نہیں چاہیئے۔

لمافى الطحاوى(۱۰۵/۱): فهذا ابن عمر رضى الله عنهما يروى عن النبى ﷺ ماذكرنا، وهو ممن قدروى عن رسول الله ﷺ أنه قال ان بلالا ينادى بليل فكلوا واشربوا حتى ينادى ابن ام مكتوم فثبت بذلك أن ماكان من ندائه قبل طلوع الفجر مما كان مباحاله، هو لغير الصلوة وأن ماأنكره عليه اذ فعله قبل الفجر كان للصلوة... (ص۱۴۱) وقدروى عن علقمة من هذاشىء... عن ابراهيم قال شيعنا علقمة الى مكة فخرج بليل فسمع مؤذنا يؤذن بليل فقال

أما هذا فقد خالف سنة أصحاب رسول الله ﷺ لوكان نائما لكان خيرا له فإذا طلع الفجر أذن، فأخبر علقمة أن التأذين قبل طلوع الفجر خلاف لسنة أصحاب رسول الله ﷺ۔

وفى الشامية(۱/۳۸۵): (قوله كعيد) أى ووتر وجنازة وكسوف واستسقاء وتراويح وسنن رواتب لأنها أتباع للفرائض والوتر وإن كان واجبا عنده لكنه يؤدى فى وقت العشاء فاكتفى بأذانه لالكون الأذان لهما على الصحيح كما ذكره الزيلعى بحر فافهم لكن فى التعليل قصور لاقتضائه سنية الأذان لما ليس تبعا للفرائض كالعيد ونحوه فالمناسب التعليل بعدم وروده فى السنة تأمل۔

(۳۱) نبی کریم ﷺ سے أذان دینے کا ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور ﷺ نے کبھی خود بھی اذان دی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جی ہاں حضور ﷺ سے سفر کے موقع پر خود بھی أذان دینا ثابت ہے۔

لمافى الدرالمختار(۱/۴۰۱): الافضل كون الامام هو المؤذن وفى الضياء انه عليه الصلاة والسلام اذن فى سفر بنفسه واقام وصلى الظهر وقدحققناه فى الخزائن۔

وفى الشامية تحت :(قوله الافضل الخ) أى لقول عمر رضى الله عنه لولا الخلافة لأذنت مع الامامة كما قدمناه وفى السراج ان اباحنيفة كان يباشر الاذان والاقامة بنفسه۔(قوله وقد حققناه فى الخزائن) حيث قال بعد ماهنا هذا وفى شرح البخارى لابن حجروما يكثر السئوال عنه هل باشر النبى ﷺ الاذان بنفسه وقد اخرج الترمذى انه عليه السلام اذن فى سفر وصلى باصحابه وجزم به النووى وقواه ولكن وجد فى مسند احمد من هذا الوجه فامر بلالاً فاذن فعلم ان فى رواية الترمذى اختصارا وان معنى قوله اذن امربلالاً كما يقال اعطى الخليفة العالم الفلانى كذا وانما باشر العطاء غيره۔

وفى تقريرات الرافعى(ص۴۷): قوله (ولكن وجد فى مسند احمد من هذا الوجه الخ) ذكر السندى مانصه وفى السراج روى عقبة بن عامر قال كنت مع رسول الله ﷺ فى سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلى الظهر وقال السيوطى ظفرت بحديث آخر مرسل اخرجه سعيد بن منصور فى سننه قال اذن رسول الله ﷺ مرة فقال حيى على الصلاة وهذه رواية لاتقبل التاويل۔

(۳۲) "اذان کا جواب" دینے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ کیا اذان کا جواب دینا واجب ہے؟ اگر واجب ہو تو کیا جس مسجد کی بھی اذان ہو اُن سب کا جواب دینا لازم ہوگا یا صرف اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا لازم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... اذان کا جواب بالقول مستحب ہے اور بالفعل واجب ہے یعنی جب اذان کی آواز سنائی دے تو زبان سے جواب دینا مستحب ہے اور بالفعل کا مطلب یہ ہے کہ اذان سن کر نماز کیلئے جانا واجب ہے۔ پھر زبان سے جواب میں یہ تفصیل ہے کہ اگر متعدد اذانیں ہوں تو پہلی اذان کا جواب دیگا چاہے محلے کی مسجد میں ہو یا کہیں اور البتہ تمام اذانوں کا جواب دینا افضل ہے۔

وفی الشامية (۳۹٦/۱): (قوله قال الحلوانی ندبا الخ) ای قال الحلوانی ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هی الاجابة بالقدم...

وفيه ايضاً(۳۹۷/۱):(قوله ولوتكرر)أی بان اذن واحدبعدواحد،امالوسمعهم فی آنٍ واحدمن جهات فسيأتی (قوله اجاب الاول) سواء كان مؤذن مسجده اوغيره...اذا كان فی المسجد أكثرمن مؤذن أذنوا واحدا بعد واحد فالحرمة للاول۔

(۳۳) جمعہ کی اذان ثانی کا جواب

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی اذان جو خطبہ کے وقت ہوتی ہے اسکا جواب دینا چاہیئے یا خاموش رہنا چاہیئے؟ اسی طرح اس اذان کے بعد دعا پڑھی جائیگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... جمعہ کی دوسری اذان کا جواب زبان سے نہیں دینا چاہیے بلکہ دل ہی میں دیدینا کافی ہے اسی طرح اس اذان کے بعد کی دعا کا ترک افضل ہے۔

لمافی التاتارخانية (٦٧/٢):وفی الاوزجندی: اذا قال الخطيب؛ يايها الذين آمنوا صلوا عليه (الأية) فی الخطبة فالأصح السكوت وفی الحجة ولوسكت فهوافضل تحقيقا للانصات والذی عليه عامة مشايخنا ان علی القوم ان يستمعوا للخطبة من اولها الی آخرهاوقال ابوحنيفة ومحمد: واذا ذكرالله والرسول فی الخطبة يجب عليهم ان يستمعوا ولم يذكر الله تعالیٰ بالثناء عليه ولم يصلوا علی النبی ﷺ۔

وفی الدرالمختار(۳۹۹/۱):وينبغی ان لايجيب بلسانه اتفاقافی الاذان بين يدی الخطيب وان

یجیب بقدمه اتفاقا فی الاذان الاول یوم الجمعة لوجوب السعی بالنص۔

(۳۴) چلتے ہوئے رک کر اَذان کا جواب دینا بہتر ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پیدل چلتے وقت اگر اذان سنے تو چلتا ہوا جواب دے یا ٹھہر کر؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر پیدل چلتے وقت اذان سنائی دے تو اولی وبہتر یہ ہے کہ ٹھہر کر جواب دے تاہم اگر کسی ضرورت کی بنا پر چلتے چلتے جواب دیدے تو بھی کچھ حرج نہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۵۷): سمع الاذان وهو یمشی فالاولی أن یقف ساعة ویجیب۔

وفی الشامیة(۱/۳۹۷): (قوله بزازیة) کذا نقله فی النهر ولم أره فیها فلتراجع نسخة أخری نعم رأیت فیها سمع وهو یمشی فالافضل أن یقف للاجابة لیکون فی مکان واحد۔

(۳۵) دورانِ وعظ یا تقریر اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہو جائے تو کیا جواب دینا لازم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہوجائے تو جواب دینا لازم نہیں ہوگا کیونکہ وعظ اور تقریر کا مقصد مسلمانوں کو دین کی اہمیت اور دین کے احکامات سکھانا ہے۔لیکن بہتر یہ ہے کہ وعظ اور تقریر بند کر کے اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۷): یجب علی السامعین عند الاذان الاجابة......ولا ینبغی ان یتکلم السامع فی خلال الاذان والاقامة ولا یشتغل بقراء ة القرآن ولا بشئی من الاعمال سوی الاجابة۔

وفی الشامیة (۱/۳۹۶): (قوله وتعلیم علم) ای شرعی فیما یظهر ولذا عبر فی الجوهرة بقرائة الفقه (قوله بخلاف قرآن) لانه لایفوت... بخلاف التعلم فعلی هذا لو یقرأ تعلما او تعلیما لا یقطع۔

(۳۶) اذان کے پورا ہو جانے کے بعد جواب دینا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان پوری ہو جانے کے بعد اذان کا جواب دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مستحب یہ ہے کہ اذان کا جواب اذان کے ساتھ ساتھ دیا جائے اور اگر کوئی شخص اذان کے ساتھ اذان کا جواب نہ دے سکا ہو تو اذان کے بعد جواب دے دے بشرطیکہ زیادہ وقت نہ گزرا ہو، اور اگر اذان کے بعد وقت زیادہ ہو گیا ہو تو جواب دینا شرعاً مستحب نہ ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی الدر(۱/۲۰۱): قال فی النهر لم أره ثم اذا لم یجب حتی فرغ مَن تدارکه ان قصر الفصل۔

وفی الدر المختار(۱/۳۹۸): ولو لم یجبه حتی فرغ لم أره وینبغی تدارکه ان قصر الفصل۔

وفی الشامیة تحته: فلوسکت حتی فرغ کل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طویل کما فی اصل سنة الاجابة کما هو ظاهر۔

(۳۷) ریڈیو اور ٹی وی کی اذان کا جواب دینا ضروری نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر ریڈیو اور ٹی وی میں نماز کے وقت اذان نشر کی جاتی ہے اگر کوئی شخص یہ اذان سن لے تو اس پر اذان کا جواب دینا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اس اذان کا جواب دینا ضروری ہے جو سنت کے مطابق ہو، سنت کے مطابق وہ اذان ہے جس میں اعلام ہو، اور دینے والا سمجھ دار ہو، چنانچہ اگر ناسمجھ بچہ اذان دیتا ہے تو اس کی اذان کا جواب دینا ضروری نہیں کیونکہ یہ سنت کے مطابق نہیں اور نہ لوگ اس کے کلام کا اعتبار کریں گے اس کی اذان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پرندہ کو اذان یا سجدہ تلاوت کی آیت سکھا دے اور وہ پڑھے تو اس صورت میں نہ جواب دینا ضروری ہوگا اور نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگا اسی طرح جو آواز ٹکرا کر واپس آتی ہے اس سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس میں فقط اعلام ہے یہی حال ریڈیو اور ٹی وی کی اذان کا ہے کہ ان میں فقط اعلام ہے اور اس لیے اگر ان پر اذان آتی ہے تو اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔

لمافی نور الایضاح(ص۶۷): واذا سمع المسنون منه امسك وقال مثله وحوقل فی الحیعلتین (حاشیه ۱) وقید بالمسنون من الاذان فافاد انه اذا کان علی غیر وجه السنة کاذان المرأة وغیره لاتندب له المتابعة۔

وفی الشامیة(۱/۳۹۴): وروی عن الامام انه تستحب اعادة اذان المرأة وعلی هذه الروایة مشی الزیلعی وذکر فی البدائع ایضاً أن أذان الصبی الذی لا یعقل لایجزی ویعاد لان ما یصدر لاعن عقل لایعتد به کصوت الطیور۔

وفی الهندیة(۱/۱۳۲): ولا تجب اذا سمعها من طیر. هو المختار۔

(۳۸) مرغ کی اذان پر نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قریب میں کوئی مسجد نہ ہو تو مرغ کی اذان پر نماز فجر پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مرغ کی آواز کو اذان سمجھنا اور صرف اسی پر اعتماد کر کے نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں، اولاً اس لئے کہ مرغ کی آواز کو عرف میں اذان کہہ دیتے ہیں ورنہ حقیقت میں یہ اذان نہیں ہے۔ ثانیاً یہ بے وقت بانگ دے دیتا ہے اس کو وقت کی تعیین نہیں، ہاں اگر نماز کا وقت ہو جانے کا دوسرے قرائن سے بھی علم ہو جائے تو نماز پڑھنا صحیح ہے۔

اور اذان شرعی تو وہ مخصوص کلمات ہیں جو اذان کے وقت میں کہے جاتے ہیں اور ان کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے کہ اذان کوئی ایسا عاقل معتبر آدمی دے کہ جس پر لوگ بھروسہ کرتے ہوں تاکہ اذان کا مقصد ''اعلام'' صحیح طور پر حاصل ہو سکے۔ اور اگر مذکورہ صورت میں مسجد قریب نہیں ہے تو وقت ہو جانے پر خود اذان دے کر نماز پڑھنی چاہیئے۔

لمافی الهندية(۱/۵۳): واهلية الاذان تعتمد بمعرفة القبلة والعلم بمواقيت الصلوة، كذا فی فتاویٰ قاضی خان۔ وينبغی ان يكون المؤذن رجلاعاقلاصالحا تقياعالمابالسنة كذا فی النهاية۔

وفيه ايضاً(۱/۵۴): واذان الصبی الذی لايعقل لايجوز ويعاد وكذا المجنون هكذا فی النهاية۔

وفی الشامية (۱/۳۹۴): وذكر فی البدائع ايضاً أن اذان الصبی الذی لايعقل لايجزی ويعاد، لان مايصدر لاعن عقل لايعتد به كصوت الطيور۔

(۳۹) دینی کتب کا مطالعہ کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دینی کتب کے مطالعے کے دوران اگر اذان کی آواز سنے تو کیا اذان کا جواب دے یا مطالعہ جاری رکھے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ مطالعہ چھوڑ دے اور اذان کا جواب دے۔

لمافی الهندية(۱/۵۷): ولاينبغی ان يتكلم السامع فی خلال الاذان والاقامة ولايشتغل قراءة القرآن ولا بشئ من الاعمال سوی الاجابة ولوكان فی القراءة ينبغی ان يقطع ويشتغل بالاستماع والاجابة۔

وفی الدر المختار(۱/۳۹۶۔۳۹۸): (يجيب) وجوبا وقال الحلوانی ندباً والواجب الاجابة بالقدم (من

سمع الاذان) ولوجنبا لا حائضا ونفساء وسامع خطبة وفى صلاة جنازة وجماع ومستراح واكل وتعليم علم وتعلمه بخلاف القرآن (بأن يقول) بلسانه (كمقالة) ان سمع المسنون منه وهو ماعربيا... (ولوكان فى المسجد حين سمعه ليس عليه الاجابة ولوكان خارجه اجاب) بالمشى اليه (بالقدم ولواجاب باللسان لابه لايكون مجيباً)... (فيقطع قرأة القرآن لو كان يقرأ (بمنزله ويجيب)۔

(۴۰) اَذان میں اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف ''جل جلالۂ'' کہنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اَذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالۂ کہنا خلاف سنت ہے، اذان کے جواب میں اذان ہی کے کلمات دہرانے چاہئیں البتہ ''حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح'' کے جواب میں ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم'' اور ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کے جواب میں ''صدقت وبررت وبالحق نطقت'' کہنا چاہیے۔

لمافى الهندية (۵۸/۱): ويجب على السامعين عند الاذان الاجابة وهى ان يقول مثل ما قال المؤذن الا فى قوله حى على الصلوة حى على الفلاح فانه يقول مكان حى على الصلوة لاحول ولا قوة الا بالله العلى العظيم ...... وكذا فى قول المؤذن الصلاة خير من النوم لا يقول السامع مثله ولكن يقول صدقت وبررت۔

وفى الطحطاوى(۱۸۸/۱): (قوله ويجيب وجوبا) على المعتمد للأمر به فى قوله عليه السلام فقولوا مثل مايقول (قوله ندباً) اى إجابة اللسان مندوبة (قوله والواجب)۔۔ (قوله ولوجنبا) لأنه ثنآء لا أذان۔

وفى الشامية (۳۹۶/۱): (قوله من سمع الأذان) يفهم منه أنه لولم يسمع لصمم أو لبعد أنه لايجيب وهو ظاهر الحديث الآتى، إذا سمعتم الأذان'' حيث علق على السماع وقد صرح بعض الشافعية بأنه الظاهر وبأنه يجيب فى جميعه إذا لم يسمع الا بعضه۔

(۴۱) اقامت میں ''اشھد ان محمدا رسول اللہ'' کے جواب میں ''ﷺ'' کہنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اقامت میں اشھد ان محمدا رسول اللہ کے جواب

میں صرف ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان واقامت میں اشھد ان محمدا رسول اللہ کے جواب میں اشھد ان محمدا رسول اللہ ہی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جیسے مؤذن کہے تم بھی ویسے کہو (بخاری شریف، ۱/۸۶) اور حیعلتین کے جواب میں (لاحول ولاقوۃ الا باللہ) اور اقامت میں قدقامت الصلاۃ کے جواب میں (اقامھا اللہ وادامھا) کہو، لہٰذا اشھد ان محمدا رسول اللہ کے جواب میں صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہنا صحیح نہیں۔ ہاں یوں کرسکتا ہے کہ جواب میں اشھد ان محمدا رسول اللہ کہہ کر تھوڑا سا توقف کرے اور پھر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لے۔

لمافی البخاری (۱/۸۶): عن أبی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن۔

لمافی الھندیة (۱/۵۷): ویجب علی السامعین عند الاذان الاجابة وھی ان یقول مثل ما قال المؤذن الا فی قوله حی علی الصلوة حی علی الفلاح فانه یقول مکان حی علی الصلوة لاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم

وفی الدر المختار (۱/۴۰۰): (ویجیب الاقامة) ندبا اجماعا (کالاذان) ویقول عند قدقامت الصلاة اقامھا اللہ وادامھا۔

(۴۲) اذان مغرب کے بعد مروجہ وقفے کی شرعی حیثیت اور اس دوران نفل پڑھنے کا حکم

سوال......مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق استفسار کرنا ہے:

(۱)۔ اذانِ مغرب کے بعد دو رکعت نماز نفل پڑھنے کی عندالاحناف شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲)۔ آج کل بہت سی مساجد میں اذانِ مغرب کے بعد دو یا تین منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے شرعاً اس کی اجازت کیسی ہے؟ جبکہ اس سے قبل حنفی المسلک مساجد میں یہ ترتیب نہیں تھی۔ شرعی جواب عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنے کا معمول بنانا مکروہ ہے اور اس کی علت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں تاخیر لازم آتی ہے۔ حالانکہ نبی علیہ السلام نے مغرب میں تعجیل کا حکم فرمایا۔ یہ ''عن مرثد رضی اللہ عنہ بن عبداللہ قال لما قدم ابو ایوب رضی اللہ عنہ غازیاً وعقبة بن عامر رضی اللہ عنہ یومئذ علی مصر فأخر المغرب فقام الیه ابو ایوب فقال ماھذه الصلوة یا عقبة قال شغلنا قال أما سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یزال امتی بخیر أو قال علی الفطرة مالم یؤخروا المغرب إلی ان تشبک النجوم'' (ابوداؤد، ۱/۶۰)، (ترجمہ): حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں تاخیر کی تو حضرت ابوایوب (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوگئے اور فرمایا یہ کونسی نماز ہے اے

عقبہ، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم مشغول کر دیئے گئے۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہمیشہ رہے گی میری امت خیر پر یا آپ نے فرمایا فطرت پر، جب تک مغرب کی نماز میں تاخیر نہیں کرے گی یہاں تک کہ ستارے پھیل جائیں۔

اب اگر لوگ اذان مغرب کے بعد نوافل پڑھنا شروع کریں تو امام لازماً ان لوگوں کا انتظار کرے گا، جس سے مغرب کی نماز میں تاخیر لازم آئے گی اور تاخیر مغرب مکروہ ہے اور اگر امام ان لوگوں کا انتظار نہیں کرتا، تو بوقت اقامت صلوٰۃ مغرب ان لوگوں کا نوافل پڑھنا لازم آئے گا یہ بھی مکروہ ہے، بظاہر اس وجہ سے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے، **صلوا قبل المغرب ثم قال فی الثالثة لمن شاء کراهية أن يتخذها الناس سنة،** (بخاری، ۱/۱۵۷، وابو داؤد، ۱/۱۸۲) (ترجمہ: آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مغرب کے فرض سے پہلے نماز پڑھا کرو تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا جس کا جی چاہے کیونکہ آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ اسے ضروری (سنت) سمجھ بیٹھیں)۔

اسی طرح ابو داؤد (۱/۱۸۲) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ''**عن طاؤس قال سئل عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہ عن الرکعتين قبل المغرب فقال ما رأيت احداً في عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يصليهما**''

(ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ یہ دو رکعت پڑھتے)

فتح القدیر (۱/۴۴٦) میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے مسند الشامیین میں نقل کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ازواج مطہرات سے سوال کیا، کہ کیا آپ نے نبی علیہ السلام کو مغرب سے پہلے رکعتین پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، سب نے کہا نہیں، صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ میرے ہاں دو رکعت پڑھ لی، میں نے کہا یہ کونسی نماز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **نسيت رکعتين قبل العصر صليتهما الان،** (ترجمہ: عصر سے پہلے میں دو رکعت پڑھنا بھول گیا تھا وہ دو رکعت میں نے ابھی پڑھ لیں)۔

فتح الباری (۲/۸٦) میں حافظ صاحبؒ نے ابراہیم نخعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ خلفاء اربعہ مغرب سے پہلے دو رکعت نہیں پڑھتے تھے۔ حافظ صاحب نے اگرچہ اس طریق کو منقطع قرار دے کر اس کا اعتبار نہیں کیا لیکن مراسیل ابراہیم نخعی محدثین کے نزدیک قابل حجت ہیں، اسی طرح مسند بزار کی ایک روایت ہے ''**بین کل اذانين صلوة الا المغرب**'' (ترجمہ: ہر دو اذانوں (یعنی اذان و اقامت) کے درمیان نماز ہے مغرب کے علاوہ) یعنی مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان نماز نہیں ہے، اس حدیث کی تخریج دار قطنی (۱/۲۷۲) نے بھی کی ہے، ان تمام نصوص، خلفاء اربعہ کے عمل اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ازواج مطہرات سے پوچھنا اور ان کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا مندوب نہیں بلکہ ان کو سنت سمجھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، اس لئے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں بلاضرورت تاخیر لازم آتی ہے جو کہ مکروہ ہے۔

(۲)۔مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ کرنا جس میں ایک آیت طویلہ کی تلاوت ہوسکے یا اس قدر جلسہ خفیفہ کرنا جو خطیب دو خطبوں کے درمیان کرتا ہے جائز ہے لہٰذا اگر کسی عذر شرعی (لوگوں کی اکثریت کو مسبوق ہونے سے بچانے کیلئے) کی وجہ سے انتظامی اعتبار سے ایک دومنٹ کا وقفہ اذان مغرب اور اقامت کے درمیان رکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی۔

لمافی خلاصة الفتاوی(۱/۴۹): ويقعد المؤذن بين الاذان والاقامة فی جميع الصلوات الافی المغرب فان وصل الاقامة بالاذان ولم يفصل بينهما يكره واجمع الفقهاء رحمهم الله ان الموذن لا يفصل بين الاذان والاقامة فی المغرب بالصلوة ولكن يقوم ساكتا ساعة يسيرة ولا يجلس وعندهما يجلس جلسة خفيفة قدرما يجلس الخطيب بين الخطبتين ويسكت عند أبي حنيفة قدر آية طويلة او ثلث ايات قصار لوفعل كما قالا لا يكره عنده ولو فعل كما قال لا يكره عندهما۔

وفی الدر المختار (۱/۳۸۹): (ويجلس بينهما) بقدر ما يحضر الملازمون مراعياً لوقت الندب (الا فی المغرب) فيسكت قائما قدر ثلاث ايات قصار ويكره الوصل اجماعاً۔

وفی الشامية تحته: (قوله فيسكت قائماً) هذا عنده وعندهما يفصل بجلسة كجلسة الخطيب والخلاف فی الافضلية فلوجلس لايكره عنده ويستحب التحول للاقامة إلى غير موضع الاذان۔ وهو متفق عليه۔ وتمامه فی البحر۔

(۴۳)اذان کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دعا بعد الاذان میں ہاتھ اٹھانے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔

وفی فيض الباری(۲/۱۶۷): باب الدعاء عند النداء: والمسنون فی هذا الدعاء الا ترفع الايدی لانه لم يثبت عن النبی ﷺ رفعها۔ والتشبث فيه بالعمومات بعد ماورد فيه خصوص فعله ﷺ لغو۔

(۴۴)اذان کے بعد کی دعا کا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں اذان کے بعد کی دعا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی

جاتی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے بعض لوگ اسے بدعت کہتے ہیں؟

(۲)......نماز کیلئے وضو لازم ہے کیا نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱)۔اذان کے بعد کی دعا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے اور اس کا پڑھنا مستحب ہے۔البتہ اس کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کئی وجوہات سے درست نہیں ہے۔ ۱)۔ضرورت نہ ہونے کی بنا پر، ۲)۔لوگوں کا اس کو اذان کا جز سمجھنے کے اندیشے کی بنا پر، ۳)۔اس پر التزام کر کے دین کا جزء سمجھنے کی بنا پر وغیرہ وغیرہ۔لہٰذا اذان کے بعد کی دعا کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے نیز اگر لاؤڈ اسپیکر پر دعاء پڑھنے کو مستحب اور ثواب سمجھا جائے تو پھر یہ بدعت کے زمرہ میں آئے گا۔

(۲)......جس طرح نماز کیلئے وضو شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے۔ہاں اگر نماز جنازہ فوت ہونے کا خوف ہو، تو پھر امام اور ولی کے علاوہ دوسروں کیلئے تیمم کے ذریعے نماز جنازہ ادا کرنا درست ہوگا۔واللہ تعالیٰ اعلم

لمافی صحیح البخاری(۱/۸۶): باب الدعاء عند النداء: عن جابر بن عبد الله رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: " من قال حين يسمع النداء: اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلاة القائمة آت محمدا الوسيلة والفضيلة وابعثه مقاما محمودا الذي وعدته، حلت له شفاعتي يوم القيامة "۔

وفی مشکوة المصابیح(ص۲۷): باب الاعتصام بالكتاب والسنة: عن عائشة رضی الله عنها: قالت: قال رسول الله ﷺ: ''من أحدث فی أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ'' متفق عليه۔ وعن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ أمّا بعد فإن خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد وشرالأمور محدثاتها وكل بدعة ضلالة۔

وفی البحر الرائق(۱/۲۷۴): وصحح فی التجنيس فی الإمام عدم الجواز إن كانوا ينتظرونه والأجاز

وفی الشامية(۲/۲۰۷): (مطلب فی صلاة الجنازة) . . . وأما الشروط التی ترجع إلی المصلی فهی شروط بقية الصلوات من الطهارة الحقيقة بدناً وثوباً ومكاناً والحكمية۔ وستر العورة والاستقبال والنية سوى الوقت۔

وفی الشامية(۱/۲۴۱): (قوله: وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) أی ولو كان الماء قريباً۔ ثم اعلم أنه اختلف فيمن له حق التقدم فيها: فروى الحسن عن أبی حنيفة رحمة الله عليه أنه لايجوز للولی لأنه ينتظر ولو صلّوا له حق الإعادة، وصححه فی الهداية والخانية وكافی النسفی۔ وفی ظاهر الرواية: يجوز للولیّ أيضاً، لأنّ الانتظار فيها مكروه، وصححه شمس الأئمة الحلوانی: أی سواء انتظروه اولا، قال فی البرهان: إن رواية الحسن هنا أحسن لأن مجرّد الكراهة

لایقتضی العجز المقتضی لجواز التیمم، لأنها لیست أقویٰ من فوات الجمعة والوقتیة مع عدم جوازه لهما، وتبعه شیخ مشایخنا المقدّسی فی شرح نظم الکنز لابن الفصیح اهـ ملخصاً من حاشیة نوح أفندی۔

(۴۵) دعاءِ وسیلہ میں ''والدرجة الرفیعة'' پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ اذان کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں ''اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدن الوسيلة والفضيلة والدرجة الرفيعة وابعثه مقاما محمودن الذی وعدته وارزقنا شفاعته يوم القيامة انک لا تخلف الميعاد'' آیا یہ دعا کہیں سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ تحریر کریں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......اذان کے بعد جو دعاء وسیلہ پڑھی جاتی ہے، وہ صحیح بخاری وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ

اور ''انک لا تخلف الميعاد'' کی زیادتی ''السنن الکبریٰ للبیهقی'' میں سند قوی سے ثابت ہے۔ البتہ ''والدرجة الرفيعة'' ''وارزقنا شفاعته يوم القيامة'' کے الفاظ جو عوام الناس کے ہاں اس دعاءِ وسیلہ میں مشہور ہیں حضرات محدثین کرام کے نزدیک ان الفاظ کی کوئی اصل نہیں لیکن دعاء وسیلہ کے آخر میں اگر کوئی ان الفاظ کی زیادتی کرے، تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ دیگر روایات سے ان الفاظ کے معانی کا ثبوت ملتا ہے لیکن ان الفاظ کو اس دعاء وسیلہ کا جزء نہ قرار دے۔

لما فی الصحیح للبخاری(۸۶/۱): حدثنا علی بن عیاش قال حدثنا شعیب بن ابی حمزة عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال من قال حین یسمع النداء ''اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدان الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودن الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة۔

وفی الموضوعات الکبریٰ(ص۱۲۲): حدیث ''الدرجة الرفیعة'' فیما یقال بعد الاذان من الدعاء قال السخاوی لم أره فی شئ من الروایات۔

وفی عمدة القاری(۱۲۳/۵): وفی روایة البیهقی (الذی وعدته انک لا تخلف المیعاد)

وفی الشامیة (۳۹۸/۱): وروی البخاری وغیره من قال حین یسمع النداء ''اللهم رب هذه الدعوة

التامة والصلوة القائمة آت محمدان الوسيلة و الفضيلة و ابعثه مقاما محمودان الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة'' وزاد البیهقی فی آخره ''انك لا تخلف المیعاد'' وتمامه فی الامداد والفتح، قال ابن حجر فی شرح المنهاج وزيادة والدرجة الرفيعة وختمه بيا ارحم الراحمين لاأصل لهما۔

(۴۶) اذان کے کچھ کلمات ہو جانے کے بعد اذان کا جواب کہاں سے دے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کا جواب دینا فرض ہے یا سنت؟ اگر آدھی اذان ہو چکی ہو، اور آدھی اذان باقی ہو، اور کوئی اس کا جواب دینا چاہے تو کیا وہ شخص از سرنو اذان کا جواب دیگا یا جہاں تک اذان ہوئی ہے وہیں سے اذان کا جواب شروع کردے۔ میں اکثر از سرنو جلدی جلدی پڑھ کر موذن کی اذان تک کا جواب ایک ساتھ دے کر پھر موذن کے الفاظ کا جواب دیتا ہوں۔ کیا میرا یہ عمل درست ہے؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان کا جواب زبان سے دینا مستحب ہے اور اذان سننے کے بعد نماز کی تیاری میں لگنا اور مسجد کی طرف جانا واجب ہے، کلماتِ اذان کو مکمل سنا جائے یا بعض کلماتِ اذان کو، بہر دو صورت مکمل اذان کا جواب دیا جائیگا ہاں اگر دور ہونے کی بنا پر اذان کو نہ سن سکے تو اس صورت میں جواب دینا مسنون نہیں، پس صورت مسئولہ میں آپ کا عمل درست ہے، مگر بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب اذان شروع ہو تو مؤذن کے ساتھ اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافی الدر المختار(۱/۳۹۶): (ويجيب) وجوبا وقال الحلوانی ندبا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) وفی الشامية (قوله وقال الحلوانی ندبا الخ) ای قال الحلوانی ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هی الاجابة بالقدم...(ص۳۹۷) (قوله كمقالته) ای مثلها فی القول...(ص۳۹۸) (قوله لم ار الخ) البحث لصاحب البحر، وصرح به ابن حجر فی شرح المنهاج حيث قال: فلو سكت حتى فرغ كل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طويل كفی فی اصل سنة الاجابة كما هو ظاهر واستفيد من هذا ان المجيب لا يسبق المؤذن بل يعقب كل جملة منه بجملة منه۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۷۱۲): والدليل على الاجابة: ماروى ابو سعيد ان رسول الله ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل يقول المؤذن لكن قال المالكية المتبادر من قوله سمعتم ولو البعض خصوصاً وقد قال فقولوا مثل ما يقول ولم يقل مثل ما قال وهذا فی تقديری تعسف واضح فی التاويل والظاهر كما قال بعض المالكية ان يحكی الاذان كله...(ص۷۱۳) ويجيب

المؤذن سواء سمع الاذان كله ام بعضه فان لم يسمع لبعد او صمم لا تسن له الاجابة۔

(۴۷) شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب مؤذن اذان میں ''اشھد ان محمدا رسول اللہ'' کہتا ہے تو یہ لوگ انگوٹھے چومتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کا ثبوت کسی حدیث سے ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اذان میں مؤذن کے شہادتین کہتے وقت ہاتھوں کے انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا نہ کسی روایت صحیحہ سے ثابت ہے اور نہ کسی معتبر کتاب میں ہے۔ لہٰذا اس کو عبادت سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔

لما فی فیض الباری(۱۶۶/۲): وكذالك لا اصل لتقبيل الابهامين عند الشهادتين كما شرع فی بلادنا الا اثر اخرجه القاری عن ابی بكر رضی الله عنه فی الموضوعات لكنه ضعيف يقرب المنكر۔

وفی المقاصد الحسنة للسخاوی(ص۳۸۴): وكذاما اورده ابو العباس احمد بن ابی بكر الرداد اليمانی المتصوف فی كتابه ''موجبات الرحمة وعزائم المغفرة'' بسند فيه مجاهيل مع انقطاعه عن الخضر عليه السلام انه ممن قال حين سمع المؤذن يقول اشهد ان محمدا رسول الله، مرحبا بحبيبی وقرة عينی محمد بن عبدالله ﷺ ثم يقبل ابهاميه ويجعلهما علی عينيه لم يرمد أبداً۔

وفی الشامية (۳۹۸/۱): يستحب ان يقال عند سماع الأولی من الشهادة: صلی الله عليك يا رسول الله وعند الثانية منها قرت عينی بك يارسول الله اللهم متعنی بالسمع والبصر بعد وضع ظفری الابهامين علی العينين فانه عليه السلام يكون قائدا له الی الجنة ... كذا فی كنز العباد اهـ قهستانی ونحوه فی الفتاویٰ الصوفية وفی كتاب الفردوس ''من قبل ظفری إبهامه عند سماع أشهد أن محمدا رسول الله فی الاذن أنا قائده ومدخله فی صفوف الجنة وتمامه فی حواشی البحر للرملی عن المقاصد الحسنة للسخاوی وذكر ذلك الجراحی وأطال ثم قال: ولم يصح فی المرفوع من كل هذا شئ۔

(۴۸) اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہو جانا، بے اصل بات ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے کے لوگوں میں مشہور ہے کہ اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہو جاتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔ پانچوں نمازوں اور جمعہ کی نماز کیلئے اذان دینا سنت مؤکدہ ہے۔ نماز کے علاوہ بعض مواقع ایسے ہیں جن سے سلف صالحین سے اذان دینا عملاً چلا آ رہا ہے۔ مثلاً جہاد کے دوران غم اور پریشانی کے وقت، غصہ کے وقت، جب مسافر راستہ بھول جائے، مرگی کے دورہ پڑ جانے کے وقت، جانور یا انسان کی بدخلقی کے وقت وغیرہ ایسے مواقع پر اذان دینا جائز ہے، تاہم یہ بات کہ اذان دینے سے چوہے بھاگ جاتے ہیں اور اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجاتے ہیں، بے اصل بات ہے۔

لمافی المبسوط للسرخسی (۱/۱۳۰): ماروی ان النبی ﷺ قال اذا اذن المؤذن ادبر الشیطان وله حصاص کحصاص الحمار فاذا فرغ رجع فاذا ثوب أدبر فاذا فرغ رجع فاذا أقام أدبر فاذا فرغ رجع وجعل یوسوس الی المصلی انه کم صلی۔

وفی الشامیة (۱/۳۸۵): (قوله لایسن لغیرها) ای من الصلوات والا فیندب للمولود وفی حاشیة البحر للخیر الرملی: رأیت فی کتب الشافعیة انه قدیسن الآذان لغیر الصلوة کما فی أذن المولود والمهموم والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان اوبهیمة وعند مزدحم الجیش وعند الحریق۔

(۴۹) اَذان واقامت میں فصل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان اور جماعت میں کتنا فصل ہونا چاہیئے؟ نیز اگر کوئی بغیر فصل کے نماز پڑھ لے تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نمازِ مغرب کے علاوہ اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فصل کرنا مسنون ہے کہ کھانے والا کھانے سے فارغ ہوجائے اور وضو کرنے والا اپنی حاجت سے فارغ ہوجائے یا اتنا فصل کریں جس میں چار رکعت نماز اس طریقہ پر ادا ہوسکتی ہوں کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھ لی جائیں اور مغرب میں صرف تین چھوٹی آیات پڑھنے کی بقدر فصل کرنا مسنون ہے اور اذان واقامت میں فصل کئے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة (۱/۵۶): ویفصل بین الاذان والاقامة مقدار رکعتین او اربع یقرء فی کل رکعة نحوا من عشر آیات کذا فی الزاهدی، والوصل بین الاذان والاقامة مکروه بالاتفاق... والاولی للمؤذن فی الصلوٰة التی قبلها تطوع مسنون او مستحب ان یتطوع بین الاذان و الاقامة... فان لم یصل یجلس بینهما واما اذا کان فی المغرب فالمستحب ان یفصل بینهما بسکتة یسکت قائماً مقدار مایتمکن من قرآة ثلاث اٰیات قصار۔

وفی الدر المختار(۳۸۹/۱): (ویجلس بینهما) بقدر مایحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب الا فی المغرب فیسکت قائماً قدر ثلاث ایات قصار ویکره الوصل اجماعاً۔

(۵۰) مؤذن کی بغیر اجازت کسی اور کا اقامت کہنا

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں بعض بزرگ نمازی ایسے ہیں کہ امام کے مصلی پر پہنچتے ہی مؤذن کی اجازت کے بغیر اسکی جگہ پر پہنچ کر اقامت شروع کردیتے ہیں اور بعض دفعہ مؤذن کی طرف صرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ اقامت میں کہوں گا، مؤذن اگرچہ دل سے اجازت نہیں دیتا لیکن مروّتاً خاموش رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ مؤذن کی اجازت کے بغیر یا صرف اشارۃً اجازت لے کر اقامت کہنا کیسا ہے، نیز اقامت کہنا کس کا حق ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مؤذن کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اقامت کہے اور مؤذن کو یہ ناگوار گزرے تو دوسرے شخص کا اقامت کہنا مکروہ ہے چاہے اشارۃً بغیر رضامندی کے اجازت دیدے یا مروتاً خاموش رہے، ہاں اگر مؤذن کو یہ ناگوار نہ گزرے یا وہ رضامندی سے اجازت دیدے تو پھر کراہت بھی نہ رہے گی۔ نیز افضل یہ ہے کہ جو شخص اذان کہے وہی اقامت بھی کہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے کہ جو شخص اذان کہے اقامت بھی کہے۔

لمافی ابی داود(۷۶/۱): حدثناعبدالله بن مسلمة...انه سمع زیادابن الحارث الصدائی (حدیث طویل فیه)فارادبلال ان یقیم فقال له النبی ﷺ ان اخاصداء هواذن ومن اذن فهویقیم قال فأقمت۔

وفی الهندیة(۵۴/۱): والافضل ان یکون المؤذن هوالمقیم کذافی الکافی، وان اذن رجل واقام آخران غاب الاول جازمن غیرکراهة وان کان حاضراویلحقه الوحشة باقامة غیره یکره وان رضی به لایکره عندنا کذافی المحیط۔

(۵۱) امام سے دور کھڑے ہو کر اقامت کہنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں مؤذن اقامت کے وقت امام کے پیچھے سے بالکل دور کھڑے ہو کر اقامت کہتا ہے کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اقامت کہنے کیلئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے جہاں مناسب ہو اقامت کہی جاسکتی ہے، البتہ چونکہ بعض اوقات امام کی نماز کسی وجہ سے فاسد ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے نائب امام مقرر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر چونکہ مسجد کا مؤذن ہی نائب امام ہوتا ہے، تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے صف اوّل میں اقامت کہے تاکہ فساد نماز کے وقت بناء کر

سکے یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان حضرات کو جو اہل علم ہوں، امام کے قریب کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ بہرحال صورت مسئولہ میں امام سے دور کھڑے ہو کر اقامت کہنا درست ہے۔ واللہ اعلم

لمافی فتح الملهم(۲/۵۱۳): قال النووی: وفی هذا الحديث تقديم الافضل فالافضل الی الامام لانه اولیٰ بالاکرام، ولانه ربما احتاج الامام الی استخلاف فيكون هو اولی ولانه يتفطن لتنبيه الامام علی السهو لمالا يتفطن له غيره وليضبطوا صفة الصلاة ويحفظوها وينقلوها ويعلموها الناس وليقتدی بافعالهم من ورائهم۔

وفی الهندية(۱/۸۹): وينبغی ان يكون بحذاء الامام من هو افضل كذا فی شرح الطحاوی۔

(۵۲) میاں بیوی کی جماعت میں اذان واقامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی دونوں مل کر جماعت کر رہے ہیں، اس صورت میں آیا اذان واقامت ہوگی؟ اور جماعت کیلئے اقامت شوہر کہے گا یا بیوی بھی کہہ سکتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عورت کیلئے اذان واقامت کہنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر کبھی کسی ضرورت کی بناء پر گھر میں میاں بیوی جماعت سے نماز پڑھیں تو محلہ کی مسجد میں کہی گئی اذان پر اکتفاء کر لینا جائز ہے البتہ اگر اذان واقامت یا صرف اقامت کہنا چاہے تو صرف شوہر ہی کہے، بیوی کیلئے اذان واقامت کہنا جائز نہیں۔

لمافی معارف السنن(۲/۲۸۷): ثم من فاتته الجماعة فی مسجده له أن يصلّی فی مسجد حيه منفرداً أو يأتی بيته فيجمع بأهله ويصلی بهم۔

وفی الشامية(۱/۳۹۳۔۳۹۴): ثم اعلم انه ذكر فی الحاوی القدسی من سنن المؤذن كونه رجلا عاقلا، صالحاً عالما بالسنن والأوقات... وأنه يكره أذان المرأة والصبی العاقل ويجزی حتی لا يعاد لحصول المقصود وهو الاعلام وروی عن الامام انه تستحب اعادة أذان المرأة اهـ۔

وفی خلاصة الفتاوی(۱/۴۸): وليس علی النساء أذان ولا إقامة... وللرجال يكره اداء المكتوبة بالجماعة فی المسجد بغير اذان واقامة ولا يكره فی البيوت والكروم والضياع فإن تركوا الاذان والإقامة جاز۔

(۵۳) امام کا خود ہی اقامت کہنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً درست ہے لہٰذا امام خود بھی اقامت کہہ سکتا ہے۔

وفی الهندية (۱/۵۷): وان كان المؤذن والامام واحد فان اقام فی المسجد فالقوم لايقومون مالم يفرغ من الاقامة۔

(۵۴) امام اقامت کے وقت اپنا رُخ کس طرف رکھے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد میں امام ہوں۔ ایک صاحب جو کہ کافی معمر ہیں وہ بھی میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب اقامت کہی جاتی ہے تو آپ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوجاتے ہیں حالانکہ میں نے ایک بڑے عالم کو دیکھا ہے کہ جب اقامت ختم ہونے لگتی ہے وہ تب اپنا رخ قبلہ کی طرف کرتے ہیں۔ اور وجہ یہ بتائی کہ لوگوں کی طرف بلاضرورت پیٹھ کرنا درست نہیں۔ آنجناب سے گزارش تھی کہ اس مسئلے کو مدلل انداز میں براہِ کرم تحریری صورت میں دیدیں تاکہ جو بھی صحیح صورت ہو میں اسے اپنالوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں مذکورہ بزرگ کی بات بالکل غلط ہے کیونکہ خود ان کی پیٹھ پچھلی صف والوں کی طرف ہے تو ان کو بھی چاہیئے کہ پچھلی صف والوں کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں لہٰذا یہ بات بے بنیاد ومن گھڑت ہے۔ لہٰذا امام کو چاہیئے کہ اقامت شروع ہوتے ہی قبلہ رُو کھڑا ہوجائے البتہ اگر صفوں کی درستگی کیلئے مقتدیوں کی طرف رُخ کرلے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷۲۰): يستحب للامام تسوية الصفوف يلتفت عن يمينه وشماله۔

وفی الموسوعة الفقهية (۲/۲۱۲): يسن ان يامر بتسوية الصفوف فيلتفت عن يمينه وشماله قائلاً ''اعتدلوا وسووا صفوفكم... فقال ان النبی ﷺ كان اذا قام الى الصلوة اخذه بيمينه فقال: اعتدلوا ... ثم اخذه بيساره وقال: اعتدلوا... وفی رواية اعتدلوا فی صفوفكم وتراصوا فانی اراكم من وراء ظهری۔

وفی صحيح البخاری(۱/۱۰۰): حدثنا رضی اللہ عنہ انس قال اقيمت الصلاة فاقبل علينا رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فانی أراكم من وراء ظهری۔

فصل فی شروط الصلاۃ وارکانہا وواجباتہا وسننہا وآدابہا

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

(۵۵) نجاست غلیظہ والے کپڑوں کے ساتھ نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو رات کے وقت احتلام ہوگیا بیدار ہونے کے بعد اس نے غسل کیا اور شلوار کو دھولیا پھر نمازیں وغیرہ پڑھتا رہا دوسرے دن ظہر کی نماز سے کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا کہ شلوار کے کونے میں منی لگی ہوئی ہے تو کیا جتنی اس نے نمازیں ادا کی ہیں وہ صحیح ہوگئیں یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟ اگر لوٹانا ضروری ہے تو کیا صرف فرائض وواجبات لوٹائے جائیں گے یا سنت ونوافل بھی لوٹانا ضروری ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کپڑے پر نجاست غلیظہ اگر مقدار درہم سے زیادہ لگی ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اور اگر ایک درہم سے کم یا ایک درہم کے برابر لگی ہو تو اتنی مقدار معاف ہے نماز ہو جاتی ہے مگر پھر بھی نجاست کا دھونا ضروری ہے پس صورت مسئولہ میں اگر درہم کی مقدار سے کم یا درہم کے برابر منی لگی ہوئی تھی تو نماز ہوگئی اعادے کی ضرورت نہیں اور اگر ایک درہم سے زیادہ لگی ہوئی تھی تو نماز نہیں ہوئی کیونکہ کپڑوں کا پاک ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے اور مذکورہ بالا صورت میں فرائض وواجبات کا لوٹانا ضروری ہے سنت ونوافل کا لوٹانا ضروری نہیں۔

لما فی الشامیة(۱/۳۱۴): نجاسة المنی عندنا مغلظة۔

وفی الدر المختار(۱/۳۱۶): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم) وان کره تحریما فیجب غسله وما دونه تنزیها فیسن وفوقه مبطل۔

وفی الهندیة(۱/۴۳): فلو صلی مع هذا الثوب صلوات ثم ظهر ان النجاسة فی الطرف الاخر یجب علیه اعادة الصلوات التی صلی مع هذا الثوب کذا فی الخلاصة۔

وفی الشامیة تحته: (قوله وان کره تحریما) اشار الی ان العفو عنه بالنسبة الی صحة الصلاة به

. فلا ینافی الاثم کما استنبطه فی البحر من عبارة السراج۔

(۵۶) جن کپڑوں کو کیچڑ لگ جائے ان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کے دنوں میں جب ہم چلتے ہیں تو کپڑوں کو مٹی، کیچڑ وغیرہ لگ جاتی ہے تو کیا انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر کپڑوں کو مٹی وغیرہ لگ جائے تو بوجہ عموم بلوی اور ضرورتِ شدیدہ کے حضراتِ فقہاء کرام نے اس کے اندر گنجائش لکھی ہے، کہ ان ہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر کپڑوں کو کوئی ایسی نجاست لگی ہو جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا واجب ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ اجازتِ جواز اُس صورت میں ہے کہ جس وقت ضرورت شدید ہو ورنہ عدم ضرورت کے وقت ایسا نہ کرنا چاہیئے بلکہ احتیاط کرنی چاہیئے۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۶۱): والطین المسرقن والردغة فی الطریق فیها نجاسة طاهرة إلا إذارأی عین النجاسة بحروفیه دخان النجاسة...وفی البحر ماء المطر اذا مرّعلی العذرات لاینجس إلا أن تکون العذرة أکثرمن الأرض الطاهرة أوتکون العذرة عند المیزاب۔

وفی الشامیة(۱/۳۲۴-۳۲۵): والحاصل : أن الذی ینبغی أنه حیث کان العفو للضرورة وعدم إمکان الاحتراز أن یقال بالعفوو إن غلبت النجاسة مالم یرعینها لوأصابه بلا قصد وکان ممن یذهب ویجیئ والا فلا ضرورة، وقد حکی فی القنیة أیضاً قولین فیما لوابتلت قد ماه ممارش فی الأسواق الغالبة النجاسة ثم نقل أنه لوأصاب ثوبه، طین السوق أو السکة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس۔

(۵۷) ناپاک گھاس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں ایسی گھاس یا چمن میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں گائے یا کتے نے پیشاب کیا ہو؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پیشاب خشک ہوجائے اور اسکے اثرات وہاں سے زائل ہوجائیں تو نماز پڑھنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم گھاس میں اس وقت ہے جب گھاس زمین پر اُگی ہوئی ہو، اگر گھاس کاٹ

دی گئی اور بعد میں ناپاک ہوگئی تو اسے پاک کرنے کیلئے دھونے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۴۴): ومنهاالجفاف وزوال الاثرالارض تطهرباليبس وذهاب الاثرللصلاة لاللتيمم ... ولافرق بين الجفاف بالشمس والناروالريح والظل...ويشارك الارض فى حكمهاكل ماكان ثابتا فيها كالحيطان والاشجاروالكلاء والقصب مادام قائماعليهافاذاقطع الحشيش والخشب والقصب واصابته النجاسة لايطهرالا بالغسل۔

(۵۸) بھینسوں کے باڑے کے اوپر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بھینسوں کا باڑہ ہے ہم نے اس کے اندر اوپر چھٹے لگا دیے ہیں تا کہ ان پر نماز پڑھیں گے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آپ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔

لمافی الصحيح للإمام البخاری (۱/۶۱): عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ قال كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم يصلی فی مرابض الغنم ثم سمعته بعد يقول كان يصلی فی مرابض الغنم قبل ان يبنى المسجد۔

وفی عمدة القاری (۴/۱۸۲): (فان قلت) مرابد البقرهل تلحق بمرابض الغنم ام بمرابد الابل (قلت) ذكر ابوبكر بن المنذر انها ملحقة بمرابد الغنم فلا تكره الصلاة فيها۔ (فان قلت) فی حديث عبدالله بن عمرو رضی اللہ عنہ من مسند احمد الحاقها بالابل كما تقدم (قلت) فی اسناده عبدالله بن لهيعة والكلام فيه مشهور۔

وفی الدر المختار(۱/۴۰۲۔۴۰۳): ثم الشرط لغة العلامة اللازمة، وشرعا مايتوقف عليه الشئ ولا يدخل فيه (هی) ستة (طهارة بدنه) الخ... (ومكانه) ای موضع قدميه او احداهما ان رفع الاخرى وموضع سجوده اتفاقا فی الاصح لا موضع يديه وركبتيه على الظاهر الا اذا سجد على كفه كما سيجئ (من الثانی) ای الخبث، لقوله تعالى۔وثيابك فطهر۔ فبدنه ومكانه اولى۔

(۵۹) باریک دوپٹہ میں نماز کی ادائیگی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت باریک دوپٹہ میں نماز پڑھے جس سے سر کے بال نظر آتے ہوں تو ایسے دوپٹہ کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ اس میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں ایسے باریک دوپٹہ میں نماز درست نہیں ہے البتہ نماز کے علاوہ ایسا دوپٹہ استعمال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تنہائی میں یا محارم اور مسلمان خواتین کے سامنے اوڑھے تو جائز ہے اسکے علاوہ جائز نہیں۔

لمافی الهندية (۵۸/۱): والثوب الرقيق الذی يصف ماتحته لاتجوز الصلاة فيه كذافی التبيين۔

وفی الشامية (۴۰۴/۱): ثم ان الظاهرأن ا لمرادبمايجب ستره فی الخلوة خارج الصلاة هومابين السرة والركبة فقط حتی ان المرأة لايجب عليهاستر ماعداذالك وان كان عورة۔يدل عليه مافی باب الكراهية من القنية حيث قال:وفی غريب الرواية يرخص للمرأة كشف الرأس فی منزلهاوحدهافأولی لهالبس خمار رقيق يصف ماتحته عندمحارمها۔

(۶۰) سگریٹ اور نسوار کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز کیلئے آتے ہیں تو سگریٹ کی ڈبی (پیکٹ) جیب سے نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں، پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ نشہ والی اشیاء جیب میں ہوں تو نماز صحیح نہیں ہوتی۔ کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بو والی چیز جو کسی بھی مخلوق کیلئے ایذاء رسانی کا سبب بنے اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہی ہو، اس کا استعمال کر کے اجتماع گاہوں میں آنا جائز نہیں ہے اس پر سخت وعیدیں مذکور ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ترک کر دیا جائے یا کم از کم نماز سے قبل ان کے استعمال سے گریز کیا جائے، چاہے اور لوگ پاس نہ بھی ہوں فرشتے تو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں تاکہ ان کو بھی تکلیف نہ ہو، البتہ اگر ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز ادا کر لی جائے تو فقہاء کرام نے اس میں گنجائش رکھی ہے کہ نماز درست ہو جائے گی، لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ خیال کرنا کہ ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی یہ خیال غلط ہے۔

لمافی الدر المختار(۴۶۰/۶): (الاصل الاباحة أو التوقف)۔۔۔۔ قلت فيفهم منه حكم النباتات الذی شاع فی زماننا المسمی بالتتن فتنبه وقد كرهه شيخنا العمادی فی هديته الحاقاله بالثوم والبصل بالاولی فتدبر۔

وفی الشامية تحته : فقول الشارح الحاقاله بالثوم والبصل فيه نظر اذ لايناسب كلام العمادی نعم الحاقه بما ذكر هو الانصاف قال ابو السعود فتكون الكراهة تنزيهة والمكروه تنزيها يجامع الاباحة وقال ط۔ ويوخذ منه كراهة التحريم فی المسجد للنهی الوارد فی الثوم والبصل و هو ملحق بهما۔

(۶۱) وقت کے اندر تاخیر سے پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں فجر کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھاتے ہیں کہ جیسے ہی امام سلام پھیر لیتا ہے اس کے چند منٹ بعد ہی سورج طلوع ہوتا ہے۔کیا اتنی تاخیر سے نماز پڑھانا جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر سورج طلوع ہونے تک ہوتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں اتنی تاخیر سے پڑھی ہوئی نماز درست ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک نماز فجر اتنی تاخیر سے پڑھنا افضل ہے کہ اگر نماز پڑھنے کے بعد کسی وجہ سے نماز کو لوٹانا پڑے تو اسے مسنون قرأت (چالیس سے ساٹھ آیات پڑھنے) کے ساتھ لوٹا سکے تاہم اتنی تاخیر کرنا مناسب نہیں کہ دوران نماز سورج کے نکل آنے کا گمان ہو۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۴۰۴): قال اصحابنا رحمهم الله الاسفار بالفجر افضل فی الازمنة کلها الاصبیحة یوم النحر للحاج بمزدلفة فان هنالک التغلیس افضل الاانه لاینبغی ان یؤخر تاخیراً یقع الشك فی طلوع الشمس لانه حینئذ یقع الشك فی فساد صلوته وفی الغیاثیة والمختار انه لایؤخر تاخیرا لایمکن للمسبوق قضاء مافاته۔

وفی الهندیة (۱/۵۱): وقت الفجرمن الصبح الصادق وهو البیاض المنتشر فی الافق الی طلوع الشمس ...... یستحب تاخیر الفجر ولا یؤخرها بحیث یقع الشك فی طلوع الشمس بل یسفربها بحیث لو ظهر فساد صلوته یمکنه ان یعیدها فی الوقت بقراءة مستحبة۔

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۳۶۶): (والمستحب) للرجل (الابتداء) فی الفجر(باسفار والختم به) هو المختار بحیث یرتل اربعین آیة ثم یعیده بطهارة لوفسد وقیل یؤخر جدا لان الفساد موهوم۔

(۶۲) حطیم کے اندر نماز پڑھنے والا کس طرف رخ کرے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حطیم کے اندر نماز پڑھ رہا ہو، تو اس کیلئے کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حطیم کے اندر نماز پڑھنے والے کیلئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے۔

لمافی الهندیة(۱/۶۳): ولو صلی مستقبلاً بوجهه الی الحطیم لایجوز۔

وفی الدر المختار(۲/۴۹۵): فلوطاف من الفرجة لم یجز کاستقباله احتیاطاً۔

وفى الشامية تحته:(قوله كاستقباله) اى فانه اذا استقبله المصلى لم تصح صلاته لان فرضية استقبال الكعبة ثبتت بالنص القطعى وكون الحطيم من الكعبة ثبتت بالاحاد فصار كانه من الكعبة من وجه دون وجه فكان الاحتياط فى وجوب الطواف ورائه وفى عدم صحة استقباله۔

(٦٣) چاند پر بھی نماز کے وقت جہت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آئندہ زمانے میں لوگ خلائی سفر پر کثرت سے جانا شروع ہوجائیں گے۔ جو مسلمان چاند پر پہنچ جائے تو وہ وہاں کس سمت منہ کرکے نماز پڑھے گا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......واضح رہے کہ قبلہ کعبہ شریف کی چاردیواری کا نام نہیں ہے۔ بلکہ قبلہ تحت الثراء سے لے کر عرش معلیٰ تک کعبہ کے محاذات میں بننے والے خلا کا نام ہے۔ لہٰذا انسان جہاں کہیں بھی ہو، سمت قبلہ معلوم ہونے کے بعد استقبال قبلہ نماز میں ضروری ہے ورنہ تحری کر کے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے، لہٰذا چاند پر پہنچنے والے مسلمان کیلئے اولاً تو نماز کیلئے تعیین قبلہ ضروری ہے اور اگر باوجود سعی وکوشش کے قبلہ مشتبہ رہے تو تحری سے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے۔

وفى الهندية (۶۳/۱): لايجوز لاحد اداء فريضة ولا نافلة ولا سجدة تلاوة ولا صلاة جنازة الا متوجها الى القبلة كذا فى السراج والوهاج. اتفقوا على ان القبلة فى حق من كان بمكة عين الكعبة فيلزمه التوجه الى عينها كذا فى فتاوىٰ قاضى خان... ومن كان خارجا عن مكة فقبلته جهة الكعبة وهو قول عامة المشايخ هو الصحيح هكذا فى التبيين وجهة الكعبة تعرف بالدليل والدليل فى الامصار والقرى المحاريب التى نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فان لم تكن فالسوال من اهل ذالك الموضع۔ واما فى البحار والمفاوز فدليل القبلة النجوم هكذا فى فتاوىٰ قاضى خان...

وفى الشامية(۴۳۲/۱): (قوله والمعتبر فى القبلة الخ) اى ان الذى يجب استقباله او استقبال جهته هو العرصة...(قوله لاالبناء) اى ليس المراد بالقبلة الكعبة التى هى البنآء المرتفع على الارض...

(قوله فهى من الارض السابعة الى العرش) صرح بذلك فى الفتاوى الصوفية معزيا للحجنة، ثم قال: فلو صلى فى الجبال العالية والآبار العميقة السافلة جاز كما جاز على سطحها وفى جوفها فتال، فلو كان المعتبر البنآء لا العرصة لم يجز ذلك، فالتفريع صحيح فافهم۔

(۶۴) ہوائی جہاز میں بوقت نماز سمت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو، اور نماز کا وقت آجائے تو نماز کس طرح ادا کرے کیونکہ جہاز میں سمت قبلہ کا تعین صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ نماز پڑھنے کے دوران ہی جہاز کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......سفر کے دوران ہوائی جہاز میں جب نماز کا وقت ہوجائے تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قدرت ہو تو کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر ادا کرے۔ ہوائی جہاز میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے۔ اگر قبلہ کے رُخ کا علم نہ ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو تحری (خوب سوچ بچار) کر کے نماز ادا کرے۔ اگر بالفرض بعد میں اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہوگئی اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نیز دوران نماز اگر جہاز کا رخ بدل جائے تو اسے بھی چاہیئے کہ اپنا رخ قبلہ کی طرف پھیر لے۔

لمافی الهندية (۱/۱۴۳): اجمعوا أنه لو كان بحال يدور رأسه لو قام تجوز الصلاة فيها قاعداً۔ كذا في الخلاصة۔ ويلزمه التوجه إلى القبلة عند افتتاح الصلاة۔ كذا في الكافي في باب صلاة المريض۔ وكلما دارت السفينة يحول وجهه إليها ولو ترك تحويل وجهه إلى القبلة وهو قادر عليه لايجزيه۔

وفي الدر المختار (۲/۱۰۱): (صلى الفرض في فلك) جار (قاعداً بلا عذر صحّ) لغلبة العجز (وأساء) وقالا: لايصح الا بعذر وهو الأظهر، برهان... (صـ۱۰۲) ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت۔

وفي الشامية (۲/۱۰۲): (قوله ويلزم استقبال القبلة ـالخ) أي في قولهم جميعاً، بحر، وإن عجز عنه يمسك عن الصلاة. إمداد عن مجمع الروايات ولعله يمسك مالم يخف خروج الوقت لما تقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته، وهذا كذلك والا فما الفرق فليتأمل۔ وإنما لزمه الاستقبال لأنها في حقه كالبيت حتى لايتطوع فيها مومئا مع القدرة على الركوع والسجود بخلاف راكب الدابة۔ كذا في الكافي شرح المنية۔

(۶۵) بیت اللہ سے کس قدر انحراف جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کی حالت میں قبلہ سے کتنے انحراف کی گنجائش ہے؟ اسی طرح اگر کوئی شخص سعودی عرب میں نماز پڑھنا چاہے تو کعبہ کے بالکل مقابل میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے یا اگر تھوڑا بہت انحراف ہو جائے تو بھی نماز ہو جائیگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر بیت اللہ بالکل سامنے ہوتو اسوقت کعبہ کی سمت منہ کرنا لازمی ہے اور اگر بالکل سامنے نہ ہوتو اسمیں ۴۵ درجے انحراف کی گنجائش ہے اگراتنی مقدار کعبہ سے منحرف ہوکر نماز پڑھ لی تو نماز درست ہوگی۔

لمافی معارف السنن(۳/۳۷۹): ثم انه قدرتلك السعة فی الجهة بقدرربع الدائرة وصرحوابفساد صلاة من خرج عن مقدارالربع واذن يتحمل الانحراف فی الجهة عن الكعبة نفسهانحوخمس واربعين درجة كماحققه الغزالی وغيره من المحققين۔

(۶۶)مسجد سے متصل مکان کی چھت پر نماز میں امام کی اقتداء کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا مکان مسجد سے متصل ہے اس کی سطح مسجد کے برابر متصل ہے وہ وہاں سے چھت پر کھڑے ہوکر امام کی اقتداء کرتے ہیں امام کی حرکات ان پر مشتبہ بھی نہیں ہوتی تو کیا یہ اقتداء درست ہے کہ نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مذکورہ میں اس شخص کی اقتداء صحیح نہیں کیونکہ چھت اگرچہ مسجد کے ساتھ متصل ہے لیکن مکان مختلف ہے اور مکان مختلف ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافی الهندية(۱/۸۸): وإن قام علی سطح داره المتصل بالمسجد لايصح اقتداء ه وان كان لا يشتبه عليه حال الامام۔

وفی الدرالمختار(۱/۵۸۶): ولو اقتدى من سطح داره المتصلة بالمسجد لم يجز لاختلاف المكان۔

(۶۷)ایسے شخص کی نماز کا حکم جو بعض حروف کی ادائیگی پر قادر نہ ہو

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو اور الرحیم کی جگہ الیحیم پڑھے، کیا ایسے شخص کی نماز درست ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جو شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ شخص امام ہوگا یا منفرد، اگر امام ہے تو وہ اپنے جیسے لوگوں کی تو امامت کرسکتا ہے لیکن ان لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا جو الفاظ درست طریقے سے پڑھنے پر قادر ہوں، اور اگر وہ تنہا نماز پڑھتا ہے تو جب تک وہ الفاظ درست طریقے سے ادا کرنے پر قادر نہیں تو ایسی صورت میں اس کا اپنی نماز اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الهندية(۱/۷۹): ان ذكر حرفا مكان حرف ولم يغير المعنى بان قرأ ان المسلمون ان الظالمون وما اشبه ذلك لم تفسد صلاته وان غير المعنى فان أمكن الفصل بين

الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرا الطالحات مكان الصالحات تفسد صلاته عند الكل وان كان لايمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين والطاء مع التاء اختلف المشايخ قال أكثرهم لاتفسد۔

وفی الشامیہ(۶۳۳/۱):(قوله أو بدله بآخر) هذا اما ان يكون عجزا كالالثغ وقدمناحكمه فی باب الامامة ، واما ان يكون خطأ، وحينئذ فاذا لم يغير المعنى فان كان مثله فی القران نحوان المسلمون لايفسد، والا نحو قيامين بالقسط، وكمثال الشارح لاتفسد عندهما وتفسد عند ابي يوسف، وان غير فسدت عندهما۔۔۔۔۔۔۔(قوله الامايشق الخ) قال فی الخانية والخلاصة الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد والايمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال أكثرهم لاتفسدوفی خزانة الاكمل قال القاضی ابو عاصم: ان تعمد ذلك تفسد وان جرى على لسانه اولا يعرف التمييز لاتفسد وهو المختار۔

(۶۸)رکوع اور سجدہ پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کمر کی شدید بیماری میں مبتلا ہےاور یہ آدمی نماز اس طریقے سے پڑھتا ہے کہ کسی تکیہ وغیرہ کو ٹیک لگا کر اشارہ کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں حالانکہ رکوع اور سجدہ کرنے میں تکلیف زیادہ نہیں ہوتی تو کیا رکوع اور سجدے پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع اور سجدہ کس طرح ادا کرے گا؟ جو بھی طریقہ شرعاً جائز ہو، مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ مریض کسی بھی طرح سے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو اگر وہ رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر ہو تو اشارہ کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا اس کیلئے جائز نہیں البتہ اگر رکوع اور سجدہ کرنے سے اس کی تکلیف کی زیادتی یا مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اشارہ سے رکوع اور سجدہ کر سکتا ہے البتہ سجدہ میں بنسبت رکوع کے زیادہ جھکے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ شخص کی تکلیف اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ رکوع اور سجدہ نہ کر سکے اس لئے اس کیلئے اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز نہیں۔

لمافی المحيط البرهانی(۲۶/۳): الأصل فی هذا الفصل: أن المريض اذا قدر على الصلاة قائما بركوع وسجود فانه يصلّي المكتوبة قائماً بركوع وسجود ولا يجزئه غير ذلك، لانه لما قدر على

القيام والركوع والسجود كان بمنزلة الصحيح، والصحيح لا يجزئه أن يصلى المكتوبة الا قائماً بركوع وسجود كذلك هذا، وان عجز عن القيام وقدر على القعود فانه يصلى المكتوبة قاعداً بركوع وسجود ولا يجزئه غير ذلك لانه عجز عن نصف القيام وقدر على النصف فما قدر عليه لزمه وما عجز عنه سقط۔

وفى الهندية (۱/۱۳۶): وان عجز عن القيام والركوع والسجود وقدر على القعود يصلى قاعدا بايماء ويجعل السجود اخفض من الركوع كذا فى فتاوىٰ قاضيخان۔

وفى الشامية(۲/۹۷): لو قدر على بعض القيام دون تمامه أو كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد إن عجز وهو المذهب الصحيح لايروى خلافه عن اصحابنا، ولو ترك هذا خفت أن لا تجوز صلاته، وفى شرح القاضى فان عجز عن القيام مستويا قالوا يقوم متكئاً لايجزئه الا ذلك وكذا لو عجز عن القعود مستويا قالوا يقعد متكئاً لا يجزئه الا ذلك۔

(۶۹) دورانِ سفر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے ایک ساتھی نے گاڑی میں سیٹ پر بیٹھے ہوئے نیت باندھ لی اور اشارہ کے ساتھ نماز پڑھتا رہا، بعد میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اسطرح نماز پڑھنا جائز ہے تو انہوں نے کہا کہ نوافل پڑھ سکتے ہیں۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نوافل کا حکم صرف سفر کے ساتھ خاص ہے یا گاؤں، شہر کے اندر بھی اگر کہیں جانا ہو تو گاڑی میں اس طرح نوافل پڑھ سکتے ہیں؟ نیز اسی طرح چاہے سفر ہو یا حضر گاڑی میں نوافل کے علاوہ سنتوں وغیرہ کی نیت باندھی جاسکتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب……جب کوئی شخص شہر کی حدود سے باہر نکلے (مقیم ہو یا مسافر) تو اسکے لئے دورانِ سفر بس کی سیٹ پر بیٹھ کر فجر کی سنتوں کے علاوہ بقیہ سنن اور نوافل پڑھنا درست ہے۔

وفى الشامية(۲/۳۸): (قوله ويتنفل المقيم راكبًا الخ) اى بلاعذر۔اطلق النفل فشمل السنن المؤكدة الاسنة الفجر۔

(۷۰) بحری جہاز میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز میں سفر کررہا ہو تو ایسے شخص کی

نماز کی کیا صورت ہوگی کیونکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے تو کیا ہر صورت میں کھڑا ہونا ضروری ہے اگر ہو سکے تو کیا کرے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل ومتعذر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۱۰۱):(قوله وهوالاظهر) وفی الحلیة بعدسوق الأدلة : والاظهران قولهماأشبه فلاجرم ان فی الحاوی القدسی وبه ناخذ۔۔۔(قوله والافکالواقفة) ای ان لم تحرکهاالریح شدیدابل یسیرافحکمهاکالواقفة فلاتجوز الصلاة فیهاقاعدامع القدرة علی القیام کمافی الامداد۔

(۷۱) چار پائی اور گدے پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار پائی پر بلاعذر نماز پڑھنا کیسا ہے، نیز جو چیز اپنی جگہ پر نہ ٹھہرتی ہو مثلاً فوم کا گدا وغیرہ اس پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... چار پائی پر نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے بشرطیکہ وہ ٹھوس ہو، نیز ادائیگی سجدہ کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز پر سجدہ کیا جا رہا ہے وہ کم از کم ایسی ہو کہ جس میں کچھ نہ کچھ سختی اور حجم ہو، اس طور پر کہ نمازی اگر سجدہ کرنے میں مبالغہ کرے تو وہ چیز اس گہرائی اور اترائی سے مزید آگے نہ بڑھے اور نہ دبے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اس موٹے فوم میں اگر یہ مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں تو اس پر نماز پڑھنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لمافی الشامیة(۱/۵۰۰): (قوله وان یجدحجم الارض) تفسیره ان الساجدلوبالغ لایتسفل رأسه ابلغ من ذالك فصح علی طنفسة وحصیروحنطة و شعیروسریروعجلة ان کانت علی الارض لاعلی ظهرحیوان کبساط مشدودبین الاشجارولاعلی ارزاوذرة ... اوحشیش الاان وجدحجمه ومن هنایعلم الجوازعلی الطراحة القطن فان وجدالحجم جازوالافلا۔

(۷۲) سر کے بال بوقت سجدہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر انسان کے بال لمبے ہوں اور سجدے کے وقت وہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو کیا اس شخص کی نماز ہو جاتی ہے؟ جبکہ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس صورت میں نماز نہیں ہوتی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......سجدہ کی ادائیگی کی صحت میں اصل بات یہ ہے کہ پیشانی اور ناک سجدہ کرنے کی حالت میں

زمین پر یا جوچیز زمین پر ہے اچھی طرح قرار پالیں، ایسا نہ ہو کہ اگر نمازی اپنے سر کو زور دے، تو سر مزید نیچے جا سکے۔ جو بال سجدے کی حالت میں پیشانی پر آجاتے ہیں تو ان بالوں کے ہوتے ہوئے پیشانی اور ناک ظاہر ہے کہ اچھی طرح قرار پالیتے ہیں لہٰذا اس شخص کی نماز درست ہے۔

لمافی الدرالمختار(۱/۵۰۰): (کما یکره تنزیها بکور عمامته) الا بعذر(وان صح عندنا (بشرط کونه علی جبهته) کلها او بعضها کمامر۔ (واما اذا کان) الکور (علی رأسه فقط وسجد علیه مقتصراً) ای ولم تصب الارض جبهته ولا انفه علی القول به (لا) یصح لعدم السجود علی محله، وبشرط طهارة المکان وان یجد حجم الارض، والناس عنه غافلون۔

وفی الشامیة تحته: (قوله وأن یجد حجم الارض) تفسیره ان الساجد لوبالغ لا یتسفل راسه ابلغ من ذالك، فصح علی طنفسة و حصیر وحنطة وشعیر وسریر... ولا علی أرز اوذرة الافی جوالق او ثلج ان لم یلبده وکان یغیب فیه وجهه ولا یجد حجمه، او حشیش الا ان وجدحجمه، ومن هنا یعلم الجواز علی الطراحة القطن، فإن وجد الحجم جاز والا فلا. بحر (قوله والناس عنه غافلون) ای عن اشتراط وجود الحجم فی السجود علی نحو الکور والطراحة کما یغفلون عن اشتراط السجود علی الجبهة فی کور العمامة۔

(۷۳) مقتدی کا امام سے پہلے رکوع میں جا کر واپس اٹھنا اور پھر امام کے ساتھ دوبارہ رکوع میں شامل ہونا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص امام سے پہلے رکوع میں چلا گیا، اب اس کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع ہی کی حالت میں رہے، یہاں تک کہ امام بھی رکوع کرلے، لیکن اگر وہ شخص امام کے رکوع کرنے سے پہلے رکوع سے کھڑا ہوگیا اور امام کے ساتھ قیام میں رہا پھر امام کے ساتھ رکوع ادا کیا، تو کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز کے فرائض میں مقتدی کا امام کی اقتداء کرنا فرض ہے بایں معنی کہ مقتدی امام کے ساتھ رکن میں شریک ہوجائے اب صورت مسئولہ میں چونکہ مقتدی امام کے ساتھ اس رکوع کا اعادہ کرلیتا ہے لہٰذا وہ امام کے تابع اور شریک ہے اور جس عمل میں اس نے امام سے انفراد اختیار کرلیا ہے وہ ایک رکعت سے کم ہے جو کہ مفسد نماز نہیں لہٰذا اس کی یہ نماز صحیح ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۱۰۴۔۱۰۵): اذا زاد فی صلاته رکوعا أو سجودا ذکر فی ظاهر الروایة انها لاتفسد ...... ولو زاد فیها رکعة تامة قبل اتمام صلاته فسدت صلاته لورکع الامام وسجد سجدة

ورفع رأسه عنها فجاء رجل ودخل معه وركع وسجد سجدتين فانها تفسد صلاته لانه أدخل زيادة ركعة وهو الركوع والسجود وانما تفسد الصلاة هكذا فى المحيط۔

وفى الشامية (۴۷۱/۱): نعم تكون المتابعة فرضاً بمعنى أن يأتى بالفرض مع امامه أوبعده كما لوركع امامه فركع معه مقارنا أومعاقبا وشاركه فيه أو بعد مارفع منه فلولم يركع اصلا أو ركع ورفع قبل ان يركع امامه ولم يعده معه اوبعده بطلت صلاته۔

والحاصل ان المتابعة فى ذاتها ثلاثة انواع مقارنة لفعل الامام مثل ان يقارن احرامه لاحرام امامه وركوعه لركوعه وسلامه لسلامه ويدخل فيها مالوركع قبل امامه ودام حتى ادركه امامه فيه ومعاقبة لابتداء فعل امامه مع المشاركة فى باقيه ومتراخية عنه۔

رسالة

مذهب النعمان فی رفض الارکان

ارکان کے بھولنے پر ترتیب کا فرض ہونا، سجدہ سہو، رفض کی بنیاد پر اعادہ اور متعلقہ اصول، ابحاث

اور مختلف عبارات سے متعلق سیر حاصل تحقیقی فتوی

(۷۴) ارکان بھول جانے پر رفض اور اعادہ کے حکم پر مفصل فتویٰ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے یہ مسئلہ پڑھا کہ ایک بندہ قنوت بھول کر رکوع میں چلا جائے تو اولاً واپس نہ آنا چاہیے اور اگر واپس آ جائے تو دوبارہ رکوع نہ کرے پہلا رکوع باقی ہے لیکن کسی نماز میں ثناء پڑھ کر قراءت بھول جائے اور رکوع میں چلا جائے اور پھر بعد میں قراءت کیلئے لوٹے تو دوبارہ رکوع کرنا ضروری ہے کیونکہ پہلا رکوع لغو اور مرتفض ہو گیا کیا یہ مسئلہ درست ہے؟ قنوت واجب اور قراءت فرض ہونے کے اعتبار سے یہ فرق ہے؟ اگر ہے تو ان سوالوں کے جواب مطلوب ہیں:

(۱)۔ بالفرض ایک شخص بھول کر سجدہ پہلے کرلے اور رکوع بعد میں کرے تو اس کو دوبارہ سجدے کرنے ہوں گے پہلے سجدے مرتفض ہوں گے؟ کیا رکن کی تقدیم وتاخیر سے پچھلا رکن لغو ہو جاتا ہے؟

(۲)۔ سجدہ سہو کے اسباب بیان فرما دیں رکن کی تکرار اور تقدیم وتاخیر سے سجدہ سہو کافی نہیں ہوتا؟ ہم نے تو سنا تھا کہ کافی ہو جاتا ہے۔

(۳)۔ ایک مقتدی نماز میں سو جائے اور امام آگے نکل جائے تو اٹھنے کے بعد وہ اپنے رہے ارکان پورے کرتا ہے یہاں تاخیر ہو رہی جو سجدہ سہو سے پوری ہو جاتی ہے کیا یہ مسئلہ ایسا ہی ہے؟ اور اس مسئلے کا مسئولہ مسئلے سے تعلق ہے؟

(۴)۔ قراءت نماز میں فرض ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ قراءت اسی قیام میں فرض ہو جو ابتداء میں ہوتا ہے یعنی یہ دور کن تابع متبوع تو نہیں اس وجہ سے پچھلے رکوع کا رفض ہو رہا ہو اگر ایسا ہے تو مدلل بیان فرما دیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اولاً چند بنیادی باتیں ذہن نشین رہنا ضروری ہیں اور ان کا صحیح طور پر سمجھنا ہی آپ کے ذہن میں پیدا شکوک دور کر سکتا ہے بصورت دیگر مسئلہ مزید الجھے گا لہٰذا بندہ چند اہم امور عرض کرتا ہے۔

(۱)۔ پہلا یہ کہ فقہاء نے عموماً تو نماز کے چھ ارکان بتلائے ہیں تکبیر تحریمہ، قیام، قراءت، رکوع، سجود، تشہد اخیرہ، لیکن اس بحث میں آکر

ایک اور رکن "ترتیب بین الارکان فی رکعۃ واحدۃ" کا بھی ذکر کیا ہے یعنی ایک رکعت کے ارکان میں ترتیب بھی فرض ہے۔ کمافی الشامیۃ (۸۰/۲) "اما قراءۃ الفرض فتقدیمھا علی الرکوع فرض لا ینجبر بسجود السھو" (ترجمہ: جہاں تک تعلق ہے فرض قراءت کا تو اس کو رکوع پر مقدم کرنا فرض ہے جو کہ سجدہ سہو سے پورا نہیں ہوگا)۔

لیکن یہ ترتیب ایک رکعت کے ارکان میں فرض ہے مثلاً ایک شخص ثنا پڑھ کر فرض قراءت بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا پھر رکوع میں اسے قراءت بھولنا یاد آیا تو وہ قیام کی طرف لوٹے گا اور قراءت کرے گا اب چونکہ اس نے رکوع اور قیام دونوں اداء تو کر لیے ہیں لیکن ترتیب وار نہیں لہٰذا اس کا پہلے کیا رکوع کالعدم ہوگا اور اب اسے دوبارہ رکوع کرنا فرض ہے فقط سجدہ سہو سے نماز ادا نہ ہوگی۔ اگرچہ تقدیم وتاخیر کی بناء پر سجدہ سہو بھی واجب ہے لیکن ترتیبِ فرض کو چھوڑنے کی بناء پر رکوع بھی دوبارہ کرنا ضروری ہوگا۔ یہی بات آپ قراءتِ فرض بھول کر رکوع کے بعد سجدہ کر لینے میں بھی سمجھ سکتے ہیں، اب یہ شخص سجدے سے قیام میں قراءتِ فرض کیلئے عود کرتا ہے تو پہلے کیا رکوع اور سجدہ دونوں کالعدم ہو جائیں گے قراءت کے بعد دونوں ترتیب وار دوبارہ کرنے پڑیں گے اور تقدیم وتاخیر کی بناء پر سجدہ سہو بھی کرے گا۔

اس تفصیل سے متعلق ہم نے ذکر کر دیا کہ یہ ایک رکعت کی حد تک ہے اگر دوسری رکعت کا قیام شروع ہو گیا تو پچھلی رکعت کی ترتیب ساقط ہو جائے گی۔ مثلاً دوسری رکعت کے رکوع میں یاد آیا کہ میں نے پہلی رکعت کا رکوع نہیں کیا تھا تو اسے پہلی رکعت کا رکوع تو کرنا ہوگا لیکن اس کے بعد کئے سجدے یا دوسری رکعت کا قیام کالعدم نہ ہوں گے بلکہ پہلی رکعت کا رکوع کر کے دوبارہ یہ دوسری رکعت کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے مکمل کرے گا البتہ سجدہ سہو کرنا ہوگا۔

لمافی الکبیری (ص۴۲۸) فصل فی سجود السھو: (ویجب لستۃ اشیاء) فیجب (بتقدیم رکن نحو ان یرکع قبل ان یقرأ ویسجد قبل ان یرکع) ھذا التمثیل غیر واقع فی محلہ لان الرکوع قبل القراءۃ والسجود قبل الرکوع غیر معتد بہ حتی یفترض علیہ اعادۃ الرکوع بعد القراءۃ واعادۃ السجود بعد الرکوع علی مامر من ان الترتیب بین مالا یتکرر فی الرکعۃ الواحدۃ وبین غیرہ فرض واذا لم یقع ذلک معتدا بہ لا یکون فیہ تعتدھم الرکن نعم واذا فعل ذلک یجب علیہ سجود السھو لتاخیر الرکن بسبب زیادۃ التی زادھا فلیتأمل"

وفی الشامیۃ (۸۰/۲): (یجب تقدیمھا) ای تقدیم قراءۃ الواجب اما قراءۃ الفرض فتقدیمھا علی الرکوع فرض لا ینجبر بسجود السھو۔

(۲)۔ دوسری بات یہ ذہن نشین رہے کہ فقہاء نے یہاں "رفض" کا مسئلہ بھی ذکر کیا ہے۔ رفض کہتے ہیں چھوڑ دینے کو۔ یہاں رفض کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا کسی رکن کو درمیان میں چھوڑ دینا اور مکمل کئے بغیر پچھلے کسی بھولے رکن کی ادائیگی کیلئے اٹھ جانا مثلاً رکوع میں یاد آتا ہے کہ وہ پچھلی رکعت کا رکوع بھول گیا تھا اب اگر وہ اس رکوع سے اس نیت سے اٹھتا ہے کہ پچھلی رکعت کا رکوع کروں گا تو یہ اس

والے رکوع کو رفض کر رہا ہے اس رفض کی بنیاد پر پچھلی رکعت کا رکوع کرنے کے بعد اسے یہ رکوع دوبارہ کرنا ہوگا اور اگر وہ یہ رکوع کر کے اٹھ جاتا ہے قومہ میں اسے یاد آتا ہے کہ پچھلی رکعت کا رکوع چھوٹ گیا تھا تو چونکہ اس کا یہ رکوع مکمل ہو چکا اب وہ پچھلی رکعت کا رکوع کر کے اس رکعت کے سجدے میں چلا جائے گا اس رکعت کا رکوع دوبارہ نہ کرنا ہوگا کیونکہ اس نے رکوع کو رفض نہیں کیا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ رفض کا ثمرہ اگلی رکعت سے پچھلی رکعت کی طرف لوٹنے میں ہی ظاہر ہوگا اگر رفض کر کے آئے گا تو وہ رکن دوبارہ اداء کرنا ہوگا ورنہ نہیں۔ ایک ہی رکعت کے ارکان میں بھی رفض تو ہو سکتا ہے لیکن رفض ہو یا نہ ہو، ترتیبِ ارکان فی رکعۃ واحدۃ (جو کہ فرض ہے) کی وجہ سے وہ رکن بہر حال دوبارہ کرنا ہوگا مثلاً ایک شخص پہلی رکعت کی قراءت بھول کر رکوع میں چلا جاتا ہے اب وہ رکوع میں یاد آنے پر اسے رفض کر کے اٹھے یا رکوع مکمل ہونے کے بعد قومے میں یاد آنے پر قراءت کی طرف لوٹے بہر صورت یہ رکوع دوبارہ کرنا ہوگا کیونکہ یہ ایک ہی رکعت میں ترتیب کے لیے مخل ہے۔ جبکہ دو رکعت کے ارکان میں ترتیب فرض نہیں وہاں رفض میں اس رکن کا اعادہ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما فی الخانیۃ (۶۲/۱): مصلی الاربع اذا رفع راسه عن الركوع من الركعة الثالثة فتذكر انه لم يسجد فی الثانية الا سجدة واحدة فانه يسجد تلك السجدة ثم يتشهد للثانية ثم يسجد للثالثه سجدتين ثم يتم صلاته لان عوده الى السجدة المتروكة لا يرفض الركوع ويلزمه السهو لانه اخر السجدة فی الركعة الثانية عن محلها وان تذكر وهو راكع فی الثالثة انه ترك من الركعة الثانية سجدة فانه يسجد السجدة المتروكة ويتشهد ثم يقيم فيصلی الثالثة والرابعة بركوعها وسجودهما لانه لما تذكر فی الركوع والركوع قبل رفع الرأس مما يقبل الارتفاض فكان عوده للسجدة المتروكة رفضا للركوع فيرتفض بخلاف ما بعد التمام"

(۳)۔ تیسری بات یہ بھی ذہن نشین رہے کہ نماز میں مطلقاً قراءت فرض ہے جبکہ سورۃ فاتحہ یا ضم سورت واجب ہے فرض نہیں۔ لہٰذا اگر فاتحہ پڑھنے کے بعد سورت ملانا بھول جاتا ہے اور رکوع میں یاد آنے پر سورت پڑھنے کیلئے لوٹتا ہے تو اصول کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ فرض سے واجب کی طرف عود کر رہا ہے لہٰذا رفض یا سقوطِ ترتیب نہ ہو کیونکہ رفض فرض کا فرض سے ہوتا ہے اور ترتیب بین الارکان فرض ہے جبکہ واجب چھوٹ جانے میں تو فقط سجدہ سہو کافی ہے جیسا کہ دعاء قنوت، وتر میں فرض نہیں لہٰذا بھول جانے کی صورت میں لوٹنے کی ضرورت نہیں سجدہ سہو کافی ہوتا ہے لہٰذا اس اصول کے مطابق سورت ملانا بھول جانے کی صورت میں بھی اگر کوئی شخص سورت ملانے کیلئے رکوع سے واپس آتا ہے تو رفض یا سقوطِ ترتیب نہ ہونا چاہیے بلکہ رکوع باقی رہنا چاہیے جیسا کہ قنوت کیلئے لوٹنے کے بعد بھی پچھلا رکوع باقی رہتا ہے۔ لیکن ضم سورت سے متعلق فقہاء نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ویسے تو یہ واجب ہے لیکن جب اس کے لیے لوٹے گا تو یہ فرض بن جائے گی۔ گویا فرض تو مطلقاً قراءت ہے اور فاتحہ اور ضم سورت کی صورت میں اسے کرنا واجب ہے اور طوالِ مفصل وغیرہ تفصیلات کی رعایت سنت ہے لیکن جتنا قرآن بھی پڑھا جائے گا وہ مکمل فرض کہلائے گا۔ ان سب تفصیلات کا مقصد یہ ہے کہ اقل مقدار قراءت سے مطلقاً فرض

ادا ہوگا اور ضم سورت سے واجب۔ لیکن چاہے فرض ادا ہور ہا ہو یا واجب، وہ سب فرض بن جائے گا یہاں تک کہ اگر پورا قرآن پڑھ لیتا ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس نے فرض قراءت کی ہے جیسا کہ رکوع بقدرِ تسبیح فرض ہے اور تین تسبیح کے بقدر مسنون ہے لیکن جب تین تسبیح کے بقدر رکے گا تو مکمل رکوع فرض کہلائے گا، شامیہ میں ہے:

قوله (لوجوب تقديمها) أي تقديم قراءة الواجب أما قراءة الفرض فتقديمها على الركوع فرض لا ينجبر بسجود السهو والتحقيق أن تقديم الركوع على القراءة مطلقا موجب لسجود السهو لكن إذا ركع ثم قام فقرأ فإن أعاد الركوع صحت صلاته وإلا فسدت أما إذا ركع قبل القراءة أصلا فظاهر وأما إذا قرأ الفاتحة مثلا ثم ركع فتذكر السورة فعاد فقرأها ولم يعد الركوع فلأن ما قرأه ثانيا التحق بالقراءة الأولى فصار الكل فرضا فارتفض الركوع فإذا لم يعد تفسد صلاته نعم إذا كان قرأ الفاتحة والسورة ثم عاد لقراءة سورة أخرى لا يرتفض ركوعه كما نقله في الحلية عن الزاهدي وغيره فقد ظهر أن إيقاع الركوع قبل القراءة أصلا أو قبل قراءة الواجب يلزم به سجود السهو لكن إذا لم يعد الركوع يسقط سجود السهو لفساد الصلاة وإن أعاده صحت ويسجد للسهو۔ (شامية ۲/۸۰)

نیز شامیہ میں ہی چند سطر بعد یہ بحث ہے:

قال الحصكفي في الدر: (كركوع) متعلق بترك واجب (قبل قراءة) الواجب لوجوب تقديمها ثم إنما يتحقق الترك بالسجود فلو تذكر ولو بعد الرفع من الركوع عاد ثم أعاد الركوع أنه في تذكر الفاتحة يعيد السورة أيضا۔

وقال ابن عابدين تحتها: قوله (ثم أعاد الركوع) لأنه لما عاد وقرأ وقعت القراءة فرضا ولا ينافيه كون الفرض فيها آية واحدة والزائد واجب وسنة لأن معناه أن أقل الفرض آية ويجب أن يجعل ذلك الفرض الفاتحة والسورة ويسن أن تكون السورة من طوال المفصل أو أوساطه أو قصاره حتى لو قرأ القرآن كله وقع فرضا كما أن الركوع بقدر تسبيحة فرض وتطويله بقدر ثلاث سنة كما حققه في شرح المنية وقدمناه في فصل القراءة والحاصل أن ما يقرؤه يلتحق بما قبل الركوع ويلغو هذا الركوع فتلزم إعادته حتى لو لم يعده بطلت صلاته۔

(شامية ۲/۸۱)

(۴)۔ چوتھی بات یہ ملحوظ رہے کہ دعاء قنوت فرض نہیں لہٰذا بھول جانے کی صورت میں رکوع سے واپس قیام کی طرف نہ آنا چاہیے سجدہ سہو کافی ہے البتہ اگر آ بھی جائے تو چونکہ یہاں واجب اور فرض کی ترتیب میں خلل آیا ہے لہٰذا رکوع کا مقدم ہونا اسے فاسد نہ کرے گا بلکہ

رکوع باقی رہے گا قنوت پڑھ کر سجدہ میں چلا جائے۔ اسی طرح ابھی سورت ملانے سے متعلق جو تفصیلات تحریر ہوئیں کہ عموماً تو وہ واجب ہے لیکن فرض قراءت سے مل کر (اعادے کی صورت میں) وہ فرض بن جاتی ہے یہ اس صورت میں ہے جب فاتحہ پڑھتے ہی رکوع میں چلا جائے البتہ اگر ایک سورت پڑھ لی لیکن ارادہ دو سورتیں پڑھنے کا تھا پھر رکوع سے دوسری سورت پڑھنے کیلئے لوٹتا ہے تو یہ دوسری سورت کی قراءت فرض نہ بنے گی کیونکہ فرض قراءت اور واجب قراءت دونوں وہ کر چکا ہے اب اس دوسری سورت کی حیثیت فرض کی نہ بنے گی لہٰذا اس صورت میں رفض یا سقوطِ ترتیب نہ ہوگا اور پہلے کیا رکوع ہی کافی ہوگا۔

لو تذكر القنوت فی الركوع فالصحيح أنه لا يعود ولو عاد وقنت لا يرتفض ركوعه وعليه السهو لأن القنوت إذا أعيد يقع واجبا لا فرضا كما فی شرح المنية وأما إذا عاد لقراءة سورة أخرى فلا يرتفض ركوعه كما قدمناه لأنه وقع بعد قراءة تامة فكان فی موقعه وكان عوده إلى القراءة غير مشروع كما إذا عاد إلى القنوت بل أولى والله أعلم (شامية ۸۱/۲)

یہاں تک ذکر کردہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱)۔ نماز کے عموماً چھ فرائض بتائے جاتے ہیں مگر ترتیب بین الارکان فی رکعۃ واحدۃ (ایک رکعت میں موجود ارکان میں ترتیب) بھی فرض ہے البتہ دو رکعت میں فرض نہیں۔ دوسری رکعت میں پہلی رکعت کے کسی رکن کے بھول جانے پر لوٹنا درمیان کی ترتیب کو ساقط نہ کرے گا البتہ سجدہ سہو بہرصورت کرنا ہوگا۔

(۲)۔ رکن کو تمام کرنے کے بعد پچھلا کوئی رکن بھولنا یاد آئے تو اس کی طرف لوٹنا اس رکن کو رفض نہ کرے گا البتہ اس رکن میں یاد آنے پر پچھلے رکن کی طرف لوٹنا اس رکن کے رفض کا سبب بنے گا لہٰذا دو مختلف رکعتوں میں اگر دوسری رکعت کے کسی رکن کو رفض کر کے آرہا ہے تو اس رکن کا اعادہ ضروری ہوگا البتہ ایک رکعت کے ارکان میں تو بہرصورت اعادہ ہوگا کیونکہ ترتیب فرض ہے، اور ترتیب بین الارکان میں خلل پہلے کیے رکن کو کالعدم کرتا ہے۔

(۳)۔ تیسری بات یہ کہ مطلقاً قراءت نماز میں فرض ہے جو کہ فاتحہ پڑھ لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے سورت ملانا واجب ہے لیکن اگر کوئی سورت ملانا بھول جائے اور پھر رکوع سے لوٹے تو یہ سورت فرض قراءت بن جائے گی اور گزشتہ سے ملحق ہوگی لہٰذا پچھلا رکوع ختم ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہ ضم سورت کی طرف لوٹنا اسے فرض بنا دیتا ہے۔

(۴)۔ قنوت بھول کر اس کی طرف لوٹنا قنوت کو صرف واجب رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک سورت پڑھ کر دوسری سورت کا ارادہ ہو لیکن بھول جانے کی صورت میں اس کے لیے لوٹنا بھی اسے صرف واجب رکھتا ہے۔ ان دونوں (قنوت اور دوسری سورت) کیلئے لوٹنا نہیں چاہیے لیکن اگر کوئی لوٹ جاتا ہے تو چونکہ یہ بعد العود بھی واجب ادا ہوتی ہیں لہٰذا اس سے ترتیب ساقط نہ ہوگی اور پچھلا رکوع باقی رہے گا۔

الغرض ان تمام تفصیلات سے اتنا واضح ہو گیا کہ ایک رکعت کے ارکان میں ترتیب فرض ہے اور کسی رکن کا بھول جانا اور پھر اس

کے لیے اسی رکعت میں لوٹنا بعد کے تمام ارکان کو کالعدم کردے گا۔ البتہ دوسری رکعت سے پچھلی رکعت کے بھولے رکن کیلئے لوٹنا درمیان کے ارکان کو کالعدم تو نہ کرے گا لیکن اگر اس رکن کو رفض کرکے آتا ہے تو اس کا اعادہ ہوگا ورنہ اس کا بھی اعادہ نہ ہوگا۔ اس سے آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ تقدیمِ رکن اور تاخیرِ رکن کی بنیاد پر جو سجدہ سہو کا قول کیا جاتا ہے وہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ بہر صورت سجدہ سہو کرنا ہوتا ہے لیکن ایک ہی رکعت کے ارکان میں تقدیم و تاخیر کی صورت میں مقدم ارکان کا اعادہ بھی فرض ہے کیونکہ ترتیبِ فرض ساقط ہوئی ہے ورنہ نماز باطل ہوگی۔ نیز جن کتب میں تقدیم و تاخیر کی صورت میں فقط سجدہ سہو کا حکم ذکر ہے ان کا یہی مطلب ہے کہ اعادہ کرلیا جائے تب بھی سجدہ سہو کرنا ہوگا اور جن کتب میں تقدیم و تاخیر کی صورت میں مطلقاً بطلانِ صلاۃ کا حکم ذکر ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اعادہ نہ ہو کیونکہ جب اعادہ (مقدم رکن کا) نہ ہوگا تو چاہے سجدہ سہو کرلے نماز کالعدم ہوگی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ اس تفصیل کو واضح فرماتے ہیں:

وعلى هذا التقرير فما قدمه الشارح تبعا لغيره في واجبات الصلاة حيث عد منها الترتيب بين القراءة والركوع ناظر إلى مجرد التقديم والتأخير مع قطع النظر عن لزوم إعادة ما قدمه وما صرح به شراح الهداية وغيرهم من أنه لو قدم الركوع على القراءة تفسد الصلاة ناظر إلى الاكتفاء بما قدمه وعدم إعادته فلا تنافي بين كلامهم (شامية ۸۰/۲)

الغرض مسئلہ کچھ مغلق ہے از حدِ استطاعت احقر نے تفصیل بیان کردی۔ ان تفصیلات کی روشنی میں آپ کے سوالوں کے جوابات ترتیب وار درج ذیل ہیں:

(۱)۔ آپ کا ذکر کردہ مسئلہ درست ہے قنوت کیلئے لوٹنے میں دوبارہ رکوع نہیں کرنا بلکہ سجدہ سہو کافی ہے البتہ قراءت کیلئے بھولنے کے بعد لوٹنے میں رکوع دوبارہ کرنا ہوگا کیونکہ قراءت فرض ہے اور فرائضِ رکعۃ واحدہ میں ترتیب فرض ہے لہٰذا پہلے کیا رکوع کالعدم ہے آپ نے تو ثنا کے بعد رکوع کرلینے کا کہا ہے اگر کوئی شخص فاتحہ کے بعد رکوع کرلے اور سورت پڑھنا بھول جائے تو اس سورت کے لیے لوٹنے کی صورت میں یہ بھی بتصریح فقہاء فرض بن جاتی ہے اور پچھلا رکوع کالعدم ہوجائے گا۔ اسی طرح رکوع بھول کر سجدہ کرلینے سے اگر رکوع کی طرف سجدے سے عود کرتا ہے تو سجدے کالعدم ہوجائیں گے کیونکہ ایک رکعت کے ارکان میں ترتیب فرض ہے۔

(۲)۔ سجدہ سہو ان چیزوں سے واجب ہوتا ہے: ۱۔ تقدیم و تاخیر رکن ۲۔ تکرار رکن ۳۔ ترک واجب۔ لیکن آپ کا یہ سننا کہ "تقدیم و تاخیر رکن سے مطلقا سجدہ سہو کافی ہوجاتا ہے" یہ درست نہیں بلکہ یہ وضاحت آگئی کہ ایک رکعت کے ارکان میں ترتیب فرض ہے اس میں تقدیم و تاخیر کی صورت میں مقدم رکن کا اعادہ بھی فرض ہے ورنہ نماز کالعدم ہوگی۔ باقی جن کتب میں تقدیم و تاخیر کی صورت میں فقط سجدہ سہو کا ذکر ہے وہ اسی صورت میں ہے جب اعادہ کرلے ورنہ کافی نہیں۔

(۳)۔ مقتدی نماز میں سو جائے اور امام آگے نکل جائے تو جاگنے کے بعد وہ اپنے چھوٹے ہوئے ارکان ادا کرلے اگر لاحق ہے تو امام کی اقتداء کی بنیاد پر اس پر سجدہ سہو بھی واجب نہ ہوگا کیونکہ قاعدہ ہے "الامام ضامن"۔ لیکن اگر امام نماز سے فارغ ہوجائے تو

مقتدی پہلے ارکان کی قضاء کرے بعد میں سجدہ سہو کرلے۔یہاں ارکان کی تاخیر کی بنیاد پر سجدہ سہو کافی ہوگا۔

(۴)۔قراءت الگ فرض ہے اور قیام الگ فرض ہے۔فاتحہ کے بعد سورت بھولنے پر رکوع سے لوٹنے کی صورت میں رکوع کا رفض اس بنیاد پر ہورہا ہے کہ یہ واجب قراءت، لوٹنے کی صورت میں فرض بن جاتی ہے اور گزشتہ قراءت سے اس کا الحاق ہوجاتا ہے۔اس کا قیام سے کوئی تعلق نہیں تفصیلی بحث ہم نے ذکر کردی۔امید ہے آپ کو تشفی حاصل ہوئی ہوگی۔

لمافی البحرالرائق (۱۷۴/۲) باب سجود السهو كتاب الصلوة: وفي البدائع وأما بيان أن المتروك ساهيا هل يقضي أو لا فنقول إنه يقضي إن أمكنه التدارك بالقضاء سواء كان من الأفعال أو الأذكار وإن لم يمكن فإن كان المتروك فرضا فسدت وإن كان واجبا لا تفسد ولكنه ينقص ويدخل في حد الكراهة فإذا ترك سجدة صلبية من ركعة قضاها في آخرها إذا تذكر ولا تلزمه إعادة ما بعدها وإذا كانا سجدتين قضاهما ويبدأ بالأولى ثم بالثانية لأن القضاء على حسب الأداء--- ولو كان المتروك ركوعا فلا يتصور فيه القضاء وكذا إذا ترك سجدتين من ركعة لأنه لا يعتد بالسجود قبل الركوع لعدم مصادفته محله فلو قرأ وسجد ولم يركع ثم قام فقرأ وركع وسجد فهذا قد صلى ركعة ولا يكون هذا الركوع قضاء عن الأول وكذا لو قرأ وركع ولم يسجد ثم رفع رأسه فقرأ ولم يركع ثم سجد فهذا قد صلى ركعة ولا يكون هذا السجود قضاء عن الأول وكذا إذا قرأ وركع ثم رفع رأسه وقرأ وركع وسجد فهذا قد صلى ركعة والصحيح أن المعتبر الركوع الأول لكونه صادف محله فوقع الثاني مكررا۔

وفی الخانية (۶۵/۱) باب سجود السهو كتاب الصلوة: اذا اخر السجدة الصلبية او سجدة التلاوة عن موضعها كان عليه السهو و اذا سلم المسبوق ساهيا يلزمه السهو قيل هذا اذا سلم بعد الامام ... الخ۔

وفی التاتارخانية (۴۲۸/۲): وان كان اماما فصلى ركعة وترك فيها سجدة وصلى ركعة اخرى وسجدلها وتذكر المتروكة فى السجود فانه يرفع راسه من السجدة ويسجد المتروكة ثم يعيد ما كان فيها لانها ارتفضت فيعيدها استحسانا فاما ما قبل ذلك من المتروكة فهل يرتفض ان كان ما تخلل بين المتروكة وبين الذى تذكر فيه ركعة تامة؟ فانه لا يرتفض باتفاق الروايات فلا تلزمه اعادة ذلك وان لم يكن ركعة تامة فكذالك فى ظاهر الروايات وروى الحسن عن ابى حنيفة رحمه الله انه يرتفض۔

وفی الطحطاوى على الدر (۲۵۹/۱) كتاب الصلوة: (قوله: كعدد ركعاتها) فان الترتيب فيها واجب

وذلك لان الذى يقضيه المسبوق اول صلوته ولو كان شرطا لكان آخرا ورد بان ما يقضيه اول صلوته حكما لا حقيقتا على انه ليس اول صلوته مطلقا بل فى حق الاقوال دون الافعال فلا يتصور ترتيب بين الركعات فيه كما لا يتصور فى حق امام و منفرد فما اتى به اولا فهو اول وما اتى به آخر افهو آخر وكذالك المدرك واللاحق نعم يتاتى الترتيب بينهما فى المسبوق اللاحق كمن فاتته اولى الفجر وادرك الثانية ونام فيها حتى سلم الامام يصلى الركعة التى نام فيها اولا بلا قراءة ثم المسبوق بها بقراءة وان عكس صح .... الخ۔

وفى الدرالمختار(١/٤٥٥): (فإن أتى بها) أو بأحدها بأن قام أو قرأ أو ركع أو سجد أو قعد الأخير (نائما لا يعتد) بما أتى (به) بل يعيده ۔

وقال ابن عابدين تحته: قوله (بل يعيده) وهل يسجد للسهو لتأخير الركن الظاهر نعم فراجعه۔

وفى الشامية(٢/٨٠)باب سجود السهو كتاب الصلوة: قوله (لوجوب تقديمها) أي تقديم قراءة الواجب أما قراءة الفرض فتقديمها على الركوع فرض لا ينجبر بسجود السهو والتحقيق أن تقديم الركوع على القراءة مطلقا موجب لسجود السهو لكن إذا ركع ثم قام فقرأ فإن أعاد الركوع صحت صلاته وإلا فسدت أما إذا ركع قبل القراءة أصلا فظاهر وأما إذا قرأ الفاتحة مثلا ثم ركع فتذكر السورة فعاد فقرأها ولم يعد الركوع فلأن ما قرأه ثانيا التحق بالقراءة الأولى فصار الكل فرضا فارتفض الركوع فإذا لم يعده تفسد صلاته نعم إذا كان قرأ الفاتحة والسورة ثم عاد لقراءة سورة أخرى لا يرتفض ركوعه كما نقله في الحلية عن الزاهدي وغيره فقد ظهر أن إيقاع الركوع قبل القراءة أصلا أو قبل قراءة الواجب يلزم به سجود السهو لكن إذا لم يعد الركوع يسقط سجود السهو لفساد الصلاة وإن أعاده صحت ويسجد للسهو۔

(۷۵) تعدادِ رکعات میں نیت کی غلطی

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ظہر کی سنتیں پڑھنے کی نیت کی لیکن بجائے چار کے دو رکعات کی نیت کرلی اب وہ کتنی رکعتیں پڑھے نیز ظہر کی سنتوں کا اعادہ کرے یا نہیں؟ اسی طرح اگر سنتوں کی نیت ہی نہیں کی بلکہ صرف نماز کی نیت کی اور تکبیر کہہ دی اور پھر چار رکعات پڑھ لیں تو آیا اسطرح ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھیں کہ سنن رواتب کو مطلق نیت صلاۃ سے ادا کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر زبان سے دل کے ارادہ کیخلاف اور الفاظ نکل جائیں تو اسکا کوئی اعتبار نہیں۔لہٰذا صورت مسئولہ میں جب

نماز پڑھتے وقت اسکی نیت چار رکعات کی تھی اور غلطی سے دو رکعات کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں چار رکعات سنتیں ہی ادا ہونگی ،ہاں اگر شروع کرتے وقت دل ہی سے دو رکعات کی نیت کی تھی تو پھر دو ہی سنتیں پڑھے گا۔اور چار رکعات دوبارہ پڑھے گا،اسی طرح اگر سنت کی نیت ہی نہ کی بلکہ صرف نماز کی نیت کی اور چار رکعات پڑھ لیں تو بھی ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی۔

لمافی الدرالمختار(۴۱۴/۱): (و)الخامس (النية) بالاجماع (وهى الارادة) المرجحة لاحدالمتساويين اى ارادة الصلاة لله تعالى على الخلوص، وفى (ص۴۱۵) فلاعبرة للذكر باللسان ان خالف القلب لانه كلام لانية،

وفى الشامية تحته: (قوله ان خالف القلب) فلوقصدالظهروتلفظ بالعصرسهوااجزأه۔

وفى الدرالمختار (۴۱۷/۱): (وكفى مطلق نية الصلاة)وان لم يقل لله(لنفل وسنة) راتبة (وتراويح) على المعتمد۔

(۷۶)واجباتِ نماز کی تعداد،اور قومہ اور جلسہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چھوٹی کتابوں (نماز حنفی، تعلیم الاسلام وغیرہ) میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ واجبات نماز چودہ ہیں جن کے اندر انہوں نے قومہ اور جلسہ بھی شمار کیا ہے اب ہم کنز الدقائق پر پہنچے تو اس میں واجبات بارہ لکھے، قومہ اور جلسہ کو سنن صلوۃ میں شمار کیا، عبارت یہ ہے: وسننها رفع اليدين للتحريمة... والقومة والجلسة آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے واجبات نماز کتنے ہیں، اور قومہ، جلسہ واجب ہے یا مسنون؟ اور صاحب کنز نے ان کو سنن کے اندر کس لئے ذکر کر دیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... عام طور پر فقہ کی کتابوں میں واجبات کی تعداد ۱۴ بتائی جاتی ہے اور یہ وہ واجبات ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ورنہ واجبات اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔قومہ اور جلسہ کے بارے میں مذہبِ مشہور تو یہ ہے کہ یہ دونوں مسنون ہیں۔لیکن متاخرین فقہاء کرام (جیسا کہ علامہ ابن ہمام اور ان کے شاگرد ابن امیر حاج، علامہ طحطاوی، علامہ حصکفی اور علامہ شامی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک وجوب راجح ہے۔صاحب کنز نے بناء بر مذہب مشہور کے ان (یعنی قومہ اور جلسہ) کو سنن میں ذکر کیا ہے۔

لمافی البحر الرائق(۵۲۳/۱): قيد بالطمأنينة فى الاركان اى الركوع والسجود لان الطمأنينة فى القومة والجلسة سنة عند ابى حنيفة ومحمد بالاتفاق وعند ابى يوسف رحمه الله فرض كما تقدم وفى شرح الزاهدى مايدل على وجوبها عندهما كوجوبها فى الاركان فانه قال: وذكر صدر القضاة واتمام الركوع واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفة ومحمد وعند ابى يوسف والشافعى فرض وكذا رفع الراس من الركوع والانتصاب والقيام والطمأنينة فيه فيجب ان يكمل

الركوع حتى يطمئن كل عضو منه ويرفع راسه من الركوع حتى ينتصب قائما ويطمئن كل عضو منه وكذا فی السجود ولو ترك شيأ من ذالك ناسيا يلزمه سجدتا السهو ولو تركها عمدا يكره أشد الكراهة ويلزمه ان يعيد الصلوة اهـ وهو يدل على وجوب القومة والجلسة وسياق التصريح بسنيتهما ومقتضى الدليل وجوب الطمأنينة فی الاربعة ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالك كله وللامر فی حديث المسيئ صلاته۔ وفی فتاوىٰ قاضی خان فی فصل مايوجب السهو قال: المصلی إذا ركع ولم يرفع راسه من الركوع حتى خرساجدا ساهيا تجوز صلاته فی فول ابی حنيفة ومحمد وعليه السهو اهـ وفی المحيط: لو ترك تعديل الاركان او القومة التی بين الركوع والسجود ساهيا لزمه سجود السهو فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالك لان الكلام فيهما واحد والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال، انه الصواب والله الموفق للصواب۔

وفی فتح القدير(١/٣٠١۔٣٠٢): (قوله ثم القومة والجلسة) ای بين السجدتين سنة عندهما: ای باتفاق المشايخ بخلاف الطمانينة على ما سمعت من الخلاف وعند ابی يوسفؒ هذه الفرائض للمواظبة الواقعة بيانا وانت علمت حال الطمانينة، وينبغی ان تكون القومة والجلسة واجبتين للمواظبة۔ ......وانت علمت ان مقتضى الدليل فی كل من الطمأنينة والقومة والجلسة الوجوب۔

وفی التاتارخانية(١/٥١٠): واما واجبات الصلوة فالمذكور فی شروح المشائخ انها ستة، احداها: تعديل الاركان عند ابی حنيفة رحمه الله وفی المغرب، والمراد بتعديل اركان الصلاة تسكين الجوارح فی الركوع والسجود والقومة بينهما والقعدة بين السجدتين...... وهاهنا أشياء اخرهی من جملة الواجبات۔

وفی الطحطاوی على الدر(١/٢٠٧): قال الطحطاوی تحت قول الدر (وهی) على ماذكره اربعة عشر، قوله على ما ذكره) ای لا بالنظر للواقع لانها كثيرة جدا۔

(۷۷) نماز میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہیئے اور کیا یہ فاصلہ واجب ہے، سنت ہے، یا مستحب ہے؟ نیز پاؤں رکھنے کا صحیح طریقہ بھی بتادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان ہاتھ کی چار انگلیوں کے برابر فاصلہ رکھنا مستحب ہے لیکن اگر کسی شخص کو اس میں حرج ہو تو جتنی مقدار میں نماز میں خشوع وخضوع باقی رہے اسی لئے وہی مستحب ہے بشرطیکہ پاؤں بالکل کھلے نہ ہوں اور نہ بالکل جڑے ہوں۔

نیز پاؤں رکھنے کا صحیح اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں ورنہ مکروہ ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۴۴۴):وینبغی ان یکون بینهما مقدار اربع اصابع الید لانه اقرب الی الخشوع۔ هکذا روی عن ابی نصرالدبوسی انه کان یفعله کذافی الکبری۔

وفی الدرالمختار (۱/۵۰۳):(ویستقبل باطراف اصابعه رجلیه القبلةویکره ان لم یفعل) ذالك۔

وفی الشامیة تحته: (قوله ویکره ان لم یفعل ذالك)...وقال الرملی فی حاشیة البحرظاهره انه سنة وبه صرح فی زاد الفقیر۔

(۷۸) حالت نماز میں نگاہ کہاں رکھی جائے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز میں نظر ایک جگہ نہیں رکھتے ادھر ادھر گھماتے رہتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہوجائے گی نیز نماز کی حالت میں نگاہ کہاں رکھنی چاہیے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حالت قیام میں نگاہ سجدہ گاہ میں رکھنا اور حالت رکوع میں اپنے پاؤں پر رکھنا، اور حالت سجدہ میں اپنے ناک پر رکھنا اور حالت قعود میں اپنی گود میں رکھنا اور پہلے سلام کے وقت دائیں کندھے پر اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے پر رکھنا مستحب ہے......خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں خشوع اور خضوع مستحب ہے اگر نماز میں خشوع اور خضوع نہ ہو، اور آدمی ادھر ادھر دیکھے تو اس کو حدیث میں اختلاس شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی شیطان کا نماز میں سے چوری کرنا قرار دیا گیا ہے اور اگر نماز میں التفات ہو، اور خشوع اور خضوع میں خلل نہ ہو تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

لمافی البخاری (۱/۱۰۴): حدثنا مسدّد قال حدثنا ابو الاحوض قال حدثنا اشعث بن سلیم عن ابیه عن مسروق عن عائشةرضی الله عنها قالت سالت رسول الله ﷺ عن الالتفات فی الصلوة فقال هو اختلاس یختلسه الشیطان من صلوة العبد۔

وفی بدائع الصنائع (۲/۷۳): فقال یرمی ببصره الی موضع سجوده فی حالة القیام، وفی حالة الرکوع الی رؤس اصابع رجلیه وفی حالة السجود الی ارنبة انفه، وفی حالة القعدة الی حجره لان هذا

كله تعظيم وخشوع۔

وفی الهندية(۱/۷۲): (وادابها) نظره ان موضع سجوده حال القيام والی ظهر قدميه حالة الركوع والی ارنبته حالة السجود والی حجره حالة القعود وعند التسليمة الاولی الی منكبه الايمن وعند الثانية منكبه الايسر۔

وفی الدرالمختار(۱/۴۷۷): (ولها آداب) تركه لايوجب اساءة ولا عتاباً كترك سنة الزوائد لكن فعله افضل (نظره الی موضع سجوده حال قيامه والی ظهر قدميه حال ركوعه والی ارنبة أنفه حال سجوده والی حجره حال قعوده والی منكبه الايمن والايسر عند التسليمة الأولی والثانية۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۲/۹۶۴): قال الحنفية: يكره تنزيها الالتفات بالعنق فقط ای بالوجه كله، او ببعضه، وببصره۔

(۷۹) نمازی کے سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے مین کہ الحمد للہ میں پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا حتی الوسع اہتمام کرتا ہوں۔ اکثر ظہر کے وقت چونکہ لنچ ٹائم ہوتا ہے اور وقت بھی کم ہوتا ہے، ہمیں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اگلی صفوں میں نماز پڑھیں تو پچھلی صفوں میں بعد میں آنے والے نمازی چونکہ دیر تک نماز پڑھتے ہیں اس وجہ سے ہمیں بیٹھا رہنا پڑتا ہے، میں نے ایک صاحب سے سنا ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں کچھ فاصلے سے گزرنا صحیح ہے۔ براہ کرم آپ مجھے تفصیل سے یہ بتادیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے کتنے گز کے فاصلے پر آدمی کو شرعاً گزرنے کی اجازت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر نمازی چھوٹی مسجد یا چھوٹے کمرے میں ہو تو اس کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں (چھوٹی مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جو کہ چالیس گز شرعی یعنی ساٹھ فٹ انگریزی سے کم ہو) البتہ اگر نمازی بڑی مسجد، صحرا یا کسی میدان میں ہو اور اس کے آگے کوئی سترہ یا آڑ نہ ہو تو اصح قول کے مطابق دوصفوں کے بقدر فاصلہ چھوڑ کر آگے سے گزرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۰۴): والاصح انه موضع صلاته من قدمه الی موضع سجوده كذا فی التبيين قال مشايخنا اذا صلی راميا بصره الی موضع سجوده فلم يقع بصره عليه لم يكره وهو الصحيح۔

وفی الدر المختار (۱/۶۳۴): (ومرور مار فی الصحراء أوفی مسجد كبير بموضع سجوده) فی الاصح أو مروره (بين يديه) الی حائط القبلة (فی) بيت و (مسجد) صغير فانه كبقعة واحدة (مطلقا)۔

وفی الشامية تحته: (قوله ومسجد صغير) هو اقل من ستين زراعاً وقيل من اربعين وهو المختار كما اشار اليه فی الجواهر قهستانی (قوله فانه كبقعة واحدة) ای من حيث انه لم يجعل الفاصل فيه

بقدر صفين مانعا من الاقتداء تنزيلا له منزلة مكان واحد بخلاف المسجد الكبير فانه جعل فيه مانعافكذاهنا يجعل جميع مابين يدى المصلى الى حائط القبلة مكانا واحداً بخلاف المسجد الكبير والصحراء فانه لوجعل كذلك لزم الحرج على المارة فاقتصر على موضع السجود۔

(۸۰) نمازی کے ایک جانب سلام پھیرنے کے بعد سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف سلام پھیرا تو اس کے سامنے سے بکر گزر گیا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جو وعید ہے اس میں بکر آئے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں زید کا ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد اس کے سامنے سے گزرنے سے بکر وعید مذکور میں نہیں آئے گا کیونکہ پہلا سلام تحلیل اور خروج عن الصلاۃ کیلئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام جب ایک طرف سلام پھیر لیتا ہے اس کے بعد اس کے پیچھے اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافى التاتارخانية(۱/۵۵۲): وعن محمدرحمه الله ان التسليمة الثانية تحية للحاضرين و التسليمة الاولى للتحية والخروج لان من تحرم فقد غاب عن الناس ولا يكلمهم ولا يكلمونه وعند التحليل كانه يرجع اليهم فيسلم۔

وفى الدر المختار(۱/۴۶۸): وتنقضى قدوة بالاول قبل عليكم على المشهور عندنا (وفى الشامية) (قوله وتنقضى قدوة بالاول) اى بالسلام الاول قال فى التجنيس الامام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدى به قبل ان يقول عليكم لايصير داخلا فى صلاته لان هذا سلام۔

(۸۱) نماز میں تکبیرات کی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اور اکثر اوقات امام کے ساتھ تکبیرات نہیں کہتا اور کہتا ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، تو کیا اس کا ایسا کہنا درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... تکبیرات نماز میں سے تکبیر تحریمہ فرض ہے اور اس کو ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں سنت ہیں، ان کے ترک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے اور نہ سجدہ سہو لازم ہوتا ہے البتہ ان کے ترک کی عادت بنانا برا اور باعث گناہ ہے، لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ تکبیرات کی ضرورت نہیں بالکل غلط ہے۔

لمافى الهندية (۱/۶۸): (منها التحريمة) وهى شرط عندنا . . .

وفيه ايضاً(۱/۷۲): (سننها) رفع اليدين ... وتكبير الركوع ...وتكبير السجود الخ۔

وفی الدرالمختار(۱/۴۴۲): (من فرائضها) التی لاتصح بدونها (التحريمة) قائما (وهی شرط) فی غير جنازة علی القادر به يفتی۔

وفی الشامية تحته : (قوله التی لاتصح بدونها) صفة کاشفة اذ لاشئ من الفروض ما تصح الصلاة بدونه بلا عذر (قوله التحريمة)------ سميت بها لتحريمها الاشياء المباحة قبل الشروع بخلاف سائر التكبيرات۔

وفی الدرالمختار(۱/۴۷۳-۴۷۴) : (وسننها) ترك السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إسائة لوعامداً غير مستخف۔

وفی حاشية الطحطاوی علی المراقی(۱/۲۵۶): ترك السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إسائة لوعامداً غير مستخف------ ويلام علی تركها مع لحوق إثم يسير اھ۔

(۸۲) تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے یا سنت، میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ سنت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تکبیر تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے لہٰذا ''اللہ اکبر'' کے علاوہ کسی ایسے لفظ سے اگر تکبیر کہی گئی جس سے تحریمہ صحیح ہوتی ہو، جیسے ''اللہ اجل'' وغیرہ تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔

لمافی الهندية(۱/۷۲): والذكر إن كان وجب للصلاة فانه يجهر به كتكبيرة الافتتاح۔

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح(صـ۲۰۴): (قوله ويكره الشروع بغيره) أی تحريماً لأنه لترك الواجب۔

(۸۳) قومہ وجلسہ اور اس میں طمانیت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو وہ رکوع کے بعد سیدھے کھڑے نہیں ہوتے، جلدی سے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی قومہ صحیح نہیں کرتے۔ اسی طرح ایک سجدہ کرنے کے بعد سیدھے نہیں ہو پاتے اس سے پہلے دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی جلسہ بھی صحیح نہیں کرتے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قومہ اور جلسہ کا کیا حکم ہے ان میں طمانینت ضروری ہے یا نہیں؟ جولوگ اس کا خیال نہیں کرتے ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز کے تمام ارکان رکوع وسجدہ وغیرہ کی تعدیل تو واجب ہے، قومہ اور جلسہ نماز کے رکن نہیں ہیں، مشہور تو مذہب میں یہی ہے کہ یہ سنت ہیں، لیکن علامہ شامی اور طحطاویؒ کی تصریح کے مطابق نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت قومہ وجلسہ بھی واجب ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینتِ قومہ وجلسہ کے وجوب کو اختیار کیا ہے۔ طمانینت وتعدیل یہ ہے کہ مصلی ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار کھڑا ہو جائے اور تمام اعضاء اپنی جگہ پر ٹھہر جائیں۔ لہٰذا نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار طمانینت بھی قومہ اور جلسہ میں ضروری ہے اگر کسی سے بھول کر چھوٹ جائے تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز درست ہو جائے گی اور جو لوگ جان بوجھ کر قومہ اور جلسہ نہیں کرتے وہ سخت گناہ گار اور مکروہ تحریمی کے مرتکب ہیں ان کی اس طرح پڑھی گئی تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں۔

لمافی الدر المختار مع الشامية(۴۶۴/۱): وتعديل الاركان اى تسكين الجوارح قدر تسبيحة فى الركوع والسجود وكذا فى الرفع منهما على ما اختاره الكمال لكن المشهور ان مكمل الفرض واجب ومكمل الواجب سنة، قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت قوله وتعديل الاركان هو سنة عندهما فى تخريج الجرجانى وفى تخريج الكرخى واجب حتى تجب سجدتا السهو بتركه كذا فى الهداية، وجزم بالثانى فى الكنز، والوقاية والملتقى وهو مقتضى الادلة كما يأتى قال فى البحر: وبهذا يضعف قول الجرجانى (قوله وكذا فى الرفع منهما) اى يجب التعديل ايضا فى القومة من الركوع والجلسة بين السجدتين، وتضمن كلامه وجوب نفس القومة والجلسة ايضاً لانه يلزم من وجوب التعديل فيهما وجوبهما، (قوله على ما اختاره الكمال) قال فى البحر: ومقتضى الدليل وجوب الطمانينة فى الاربعة اى فى الركوع والسجود وفى القومة والجلسة، ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالك كله وللامر فى حديث المسئ صلاته، ولما ذكره قاضى خان من لزوم سجود السهو بترك الرفع من الركوع ساهياً وكذا فى المحيط فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالك لان الكلام فيهما واحد، والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال انه الصواب... وقال فى شرح المنية ولا ينبغى ان يعدل عن الدراية اى الدليل اذا وافقتها رواية على ما تقدم عن فتاوى قاضى خان، ومثله ما ذكر فى القنية من قوله: وقد شدد القاضى الصدر فى شرحه فى تعديل الاركان جميعها تشديداً بليغاً فقال: واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفة و محمد وعند ابى يوسف والشافعى (رحمهما الله) فريضة، فيمكث فى الركوع والسجود وفى القومة بينهما حتى يطمئنّ كل عضو منه، هذا هو الواجب عند ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله حتى لو تركها أو شيئاً

منها ساهیاً یلزمه السهو ولو عمداً یکره اشد الکراهة، ویلزمه ان یعید الصلوۃ وتکون معتبرۃ فی حق سقوط الترتیب ونحوه کمن طاف جنباً تلزمه الاعادة، والمعتبر هوالاول کذا هذا، والحاصل ان الاصح روایةً ودرایةً وجوب تعدیل الارکان، وامّا القومة والجلسة وتعدیلهما فالمشهور فی المذهب السنیة، وروی وجوبهما، وهو الموافق للادلة، وعلیه الکمال ومن بعده من المتاخرین وقد غلمت قول تلمیذه إنه الصواب۔

(۸۴) دورانِ برف باری جوتوں میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علما کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ برف باری کے دوران جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا صحیح ہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر جوتے پاک ہیں اور سجدہ کرتے وقت جوتوں کے ساتھ پاؤں کی انگلیاں بھی زمین سے لگ جاتی ہیں تو ایسے جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۹۱): حدثنا علی بن حجر نا اسماعیل بن ابراهیم عن سعید بن یزید ابی سلمة قال قلت لانس بن مالک اکان رسول اللہ ﷺ یصلی فی نعلیه قال نعم۔ قال ابو عیسی حدیث انس حدیث حسن صحیح والعمل علی هذا عند اهل العلم۔

وفی فتح الملهم(۴/۱۲۹): قوله: ''قال: نعم'' الخ: فیه جواز الصلوۃ فی النعال والخفاف، ای اذا تحقق طهارتها، ویتمکن معها من تمام السجود، بأن یسجد علی جمیع اصابع رجلیه، کما قاله الخطابی۔

وفی الدر المختار(۱/۴۴۷): (ومنها السجود) بجبهة وقدمیه، ووضع اصبع واحدة منهما شرط۔

وفی الشامیةتحته: (قوله وقدمیه) یجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدة منهما یکفی کما ذکره بعدح وأفاد انه لو لم یضع شیأ من القدمین لم یصح السجود۔

(۸۵) اگر ایک سلام پھیر لینے کے بعد کوئی شخص امام کی اقتداء کرے تو کیسا ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام نے دائیں طرف سلام پھیرا اور ابھی بائیں طرف سلام نہیں پھیرا تھا کہ کسی نے آ کر اقتداء کرلی تو کیا اس کی اقتداء کرنا درست ہے یانہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اقتداء درست نہیں ہے کیونکہ امام کی نماز پوری ہوچکی ہے۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۱۹۴-۱۹۵): واما صفته فاصابة لفظة السلام ليست بفرض عندنا ولكنها واجبة ومن المشايخ من اطلق اسم السنة عليها وانها لاتنا فی الوجوب الی أن قال أماحكمه فهو الخروج من الصلوة ثم الخروج يتعلق باحدی التسليمتين عند عامة العلماء وروی عن محمد انه قال التسليمة الاولیٰ للخروج والتحية والتسليمة الثانية للتحية خاصة۔

وفی الشامية(۱/۴۶۸): قال فی التجنيس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل واقتدی به قبل ان يقول عليكم لايصير داخلا فی صلوته لان هذا سلام الا تری انه لواراد ان يسلم علی أحد فی صلوته ساهياً فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلوته۔

(۸۶) نماز کی سنتیں اور احادیث طیبہ سے ان کا ثبوت

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کی سنتوں کا احادیث طیبہ سے ثبوت ہے؟ آپ سے درخواست ہے کہ نماز کی جو تیرہ سنتیں ذکر کی جاتی ہیں ان کی احادیث ترجمہ کے ساتھ ذکر کردیں۔ نیز اور سنتیں بھی اگر ہوں تو مختصراً ان کی احادیث اور ترجمہ بھی لکھ دیں ممنون ہوں گا۔

الجواب بعون الملك الوهاب......نماز کی سنتوں سے متعلق احادیث مع ترجمہ درج ذیل ہیں:

(۱)۔تحریمہ کے وقت مردوں کو دونوں ہاتھ کندھوں تک اور عورتوں کو سینے تک اٹھانا۔

لماروا ه اعلاء السنن فی كتاب الصلوة ابواب صفة الصلوة (۲/۱۷۱)دارالكتب: عن وائل بن حجر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ يا ابن حجر اذا صليت فاجعل يديك حذاء اذنيك والمرأة تجعل يديها حذاء ثدييها۔

ترجمہ: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے ابن حجر! جب تو نماز پڑھے تو اپنے ہاتھوں کو کانوں کے برابر اٹھا اور عورت اپنے ہاتھوں کو سینے کے برابر اٹھائے۔

(۲)۔مردوں کو ناف کے نیچے اور عورتوں کو سینہ پر ہاتھ باندھنا۔

لماروا ه مسند الامام احمد بن حنبل (۵/۲۲۶) حديث هلب الطائی رضی الله عنه (۶/۲۹۷) دارالباز: ۲۱۴۶۔ حدثنی سماك بن قبيصة بن هلب عن ابيه "رايت النبی ﷺ ينصرف عن يمينه وعن يساره ورأيته قال: يضع هذه علی صدره" وصف يحيی اليمنی علی اليسری فوق المفصل۔

ترجمہ: سماک بن قبیصہ بن ہلب طائی نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو نماز میں دائیں اور بائیں پھرتے دیکھا اور دیکھا کہ آپ ﷺ نے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ یحییٰ نے بیان کیا دایاں ہاتھ بائیں

ہاتھ کے جوڑ پر تھا۔

وفی مسند الامام احمد بن حنبل ومسند علی بن ابی طالب رضی الله عنه (۱/۱۷۷) دارالباز: ۸۷۷۔
عن علی رضی الله عنه قال ''ان من السنة فی الصلوة وضع الاکف علی الاکف تحت السرة''
ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے''بیشک نماز میں ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے۔

(۳)۔ثناء یعنی سبحانک اللھم آخر تک پڑھنا۔

لماروواه سنن الدار قطنی کتاب الصلوة باب دعاء الاستفتاح بعد التکبیر (۱/۲۹۹) دارالکتب: عن عمر رضی الله عنه قال: کان رسول الله ﷺ اذا کبر للصلوة قال: سبحانك اللهم و بحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا اله غیرك واذا تعوذ قال: اعوذ بالله من همزاة الشیاطین ونفخه ونفثه
ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ جب نماز کیلئے تکبیر کہتے تو ''سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الہ غیرک'' پڑھتے۔اورجب پناہ مانگتے تواعوذ باللہ من ھمزاۃ الشیاطین پڑھتے اور پھونک مارتے۔

(۴)۔تعوذ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا۔

لما رواه المصنف عبدالرزاق، باب متی یستعیذ (۸٦/۲) مجلس العلمی عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ کان یقرأ قبل القرأة اعوذ بالله من الشیطان الرجیم
ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ قرآت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے تھے۔

(۵)۔تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا۔

وفیه ایضاً باب قرأة بسم الله الرحمن الرحیم (۹۰/۲) مجلس العلمی: ۲٦۱۱۔ عن صالح مولی التؤمة انه سمع ابا هریرة یقول: یفتتح ببسم الله الرحمن الرحیم۔
ترجمہ: حضرت صالح رحمہ اللہ سے روایت ہے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنا آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نماز شروع فرماتے تھے۔

(٦)۔ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتے وقت تکبیر کہنا۔

لما رواه البخاری کتاب الصلوه باب اتمام التکبیر فی الرکوع (۱/۱۰۸) قدیمی: عن عمران بن حصین، قال: صلی مع علي رضي الله عنه بالبصرة فقال:ذکرنا هذا الرجل صلاة کنا نصلیها مع

رسول الله صلى الله عليه وسلم، فذكر أنه كان يكبر كلما رفع وكلما وضع۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی پھر کہا: ہمیں انہوں نے وہ نماز یاد دلادی جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتے تھے اور فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اٹھتے اور جھکتے تو تکبیر کہتے۔

(۷)۔رکوع سے اٹھتے وقت "سمع اللہ لمن حمدہ" اور "ربنا لک الحمد" کہنا۔

وفيه ايضا باب ما يقول الامام ومن خلفه اذا رفع راسه من الركوع (۱/۱۰۹) قديمي: عن ابي هريرة رضي الله عنه قال كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا قال سمع الله لمن حمده قال اللهم ربنا ولك الحمد وكان النبي صلى الله عليه وسلم اذا ركع واذا رفع راسه يكبر واذاقام من السجدتين قال الله اكبر۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے تو "اللھم ربنا ولک الحمد" بھی کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے اور جب دونوں سجدوں سے اٹھتے تو "اللہ اکبر" کہا کرتے تھے۔

(۸)۔رکوع میں سبحان ربی العظیم کم از کم تین مرتبہ کہنا اور اسی طرح سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کم سے کم تین مرتبہ کہنا۔

لما رواه الترمذی کتاب الصلوة باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود (۱/۶۰) قدیمی: عن ابن مسعود ان النبی صلى الله عليه وسلم قال اذا رکع احدکم فقال فی رکوعه سبحان ربي العظيم ثلث مرات فقد تم ركوعه وذلك ادناه واذا سجد فقال فی سجوده سبحان ربي الاعلى ثلث مرات فقدتم سجوده وذلك ادناه۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جب تم میں سے کوئی رکوع کرے اور رکوع میں "سبحان ربی العظیم" تین مرتبہ پڑھ لے تو اس کا رکوع مکمل ہو جائے گا، اور یہ کم سے کم ہے اور جب سجدہ کرے تو "سبحان ربی الاعلیٰ" تین مرتبہ کہے تو اس کا سجدہ مکمل ہو جائے گا اور یہ کم سے کم ہے۔

(۹)۔جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان) اور قعدہ یعنی التحیات میں مردوں کا دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں پاؤں پر بیٹھنا اور عورتوں کا دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر کولھوں پر بیٹھنا۔

لما رواه البخاری باب سنة الجلوس فی التشهد (۱/۱۱۴) قدیمی: عن عبد الله بن عبد الله أنه أخبره أنه كان يرى عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، يتربع في الصلاة إذا جلس ففعلته وأنا يومئذ حديث السن. فنهاني عبد الله بن عمر وقال: إنما سنة الصلاة أن تنصب رجلك اليمنى وتثني اليسرى. فقلت: إنك تفعل ذلك. فقال: إن رجلي لا تحملاني۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز میں تربع (چارزانو) بیٹھے ہوئے دیکھا، جب وہ بیٹھے۔ میں ابھی نوعمر تھا، میں نے بھی اسی طرح کرنا شروع کردیا، تو مجھے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منع فرمادیا اور فرمایا بیشک نماز میں سنت یہ ہے کہ تو اپنا دایاں پاؤں کھڑا کرے اور بایاں پاؤں پھیلائے میں نے عرض کیا آپ تو اسی (میری) طرح کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: میرے پاؤں میرا بوجھ نہیں اٹھاتے۔

(۱۰)۔درود شریف پڑھنا۔

لما رواه البخاری کتاب الانبیاء، (۱/۴۷۷) قدیمی:قال: حدثني عبد الله بن عيسى، سمع عبد الرحمن بن أبي ليلى قال: لقيني كعب بن عجرة فقال ألا أهدي لك هدية سمعتها من النبي ﷺ؟ فقلت: بلى فأهدها لي، فقال: سألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلنا: يا رسول الله كيف الصلاة عليكم أهل البيت، فإن الله قد علمنا كيف نسلم عليكم؟ قال: " قولوا: اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على إبراهيم، وعلى آل إبراهيم، إنك حميد مجيد، اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد، كما باركت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم إنك حميد مجيد "۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عیسیٰ نے حدیث بیان کی انہوں نے عبدالرحمن بن ابی لیلی سے سنا انہوں نے فرمایا مجھے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے اور فرمایا کیا میں تجھے ہدیہ نہ دوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا؟ میں نے کہا ضرور یہ ہدیہ مجھے عنایت فرمادیجئے، انہوں نے بیان کیا اور فرمایا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول، آپ اور آپ کے اہل بیت پر صلاۃ کس طرح بھیجیں؟ بیشک سلام بھیجنے کا طریقہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود ہی سکھا دیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہو:
"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ"۔

(۱۱)۔درود شریف کے بعد دعا پڑھنا۔

لما رواه البخاری باب الدعاء قبل السلام (۱/۱۱۵) قدیمی:عن أبي بكر الصديق رضي الله عنه أنه قال لرسول الله صلى الله عليه وسلم علمني دعاء أدعو به في صلاتي، قال: " قل اللهم إني ظلمت نفسي ظلما كثيرا، ولا يغفر الذنوب إلا أنت، فاغفر لي مغفرة من عندك، وارحمني إنك أنت الغفور الرحيم "

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، مجھے ایسی دعا سکھا دیجئے جسے میں نماز میں پڑھا کروں۔ فرمایا یہ دعا پڑھو: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ

فَاغْفِرْلِی مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِی إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ"

(۱۲) سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں والوں کی نیت کرنا۔

لما رواه اعلاء السنن باب وجوب الخروج من السلام وبيان كيفيته (۱/۱۸۲) دارالكتب: عن جابر بن سمرة رضى الله عنه فى حديث طويل مرفوع "انما يكفى احدكم ان يضع يديه على فخذه ثم يسلم على اخيه من على يمينه وشماله۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک لمبی حدیث مرفوع کے ذیل میں مروی ہے "بیشک تمہارے لیے یہ کافی ہے کہ اپنے ہاتھوں کو رانوں پر رکھو پھر اپنے دائیں طرف والے بھائی کو سلام کرو اور بائیں طرف والے کو۔

(۱۳)۔سلام کے وقت دائیں بائیں رخ پھیرنا۔

لما رواه الترمذى باب ماجاء فى الانصراف عن يمينه وعن يساره (۱/٦٦) قديمى: عن قبيصة بن هلب عن أبيه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يؤمنا فينصرف على جانبيه جميعا على يمينه وعلى شماله۔

ترجمہ: حضرت هلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اشارہ فرماتے اور دائیں اور بائیں جانب پھر جاتے۔

نماز کی دیگر سنتوں کی احادیث مع ترجمہ درج ذیل ہیں۔

تشہد کی حالت میں دائیں ہاتھ کو دائیں ران اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھنا اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا۔

لما رواه مسلم باب صفة الجلوس فى الصلوة وكيفية وضع اليدين على الفخذين (۱/۲۱٦) قديمى: حدثنى عامر بن عبد الله بن الزبير عن أبيه رضی اللہ عنہ قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا قعد فى الصلاة جعل قدمه اليسرى بين فخذه وساقه وفرش قدمه اليمنى ووضع يده اليسرى على ركبته اليسرى ووضع يده اليمنى على فخذه اليمنى وأشار بإصبعه۔

ترجمہ: حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے بائیں پاؤں کو اپنی ران اور پنڈلی کے درمیان رکھتے اور دائیں پاؤں کو بچھا دیتے تھے اور دایاں ہاتھ دائیں ران اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے۔

تشہد میں بیٹھنے کی حالت میں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے کیلئے انگوٹھے کو درمیانی انگلی سے ملا کر حلقہ بنانا۔

لمارواه مسلم باب صفة الجلوس فى الصلوة وكيفية وضع اليدين ... الخ (۱/۲۱٦): عن عامر بن عبد الله بن الزبير عن أبيه رضی اللہ عنہ قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا قعد يدعو وضع يده

اليمنى على فخذه اليمنى ويده اليسرى على فخذه اليسرىٰ وأشار بإصبعه السبابة ووضع إبهامه على إصبعه الوسطى ويلقم كفه اليسرى ركبته۔

ترجمہ: حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں آنحضرت ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو دعا فرماتے اور دائیں ہاتھ کو دائیں اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھتے اور انگوٹھے کو درمیان والی انگلی سے ملا کر حلقہ بنا کر شہادت والی انگلی اٹھا کر اشارہ فرماتے اور بایاں ہاتھ ران پر ہی ہوتا۔

نماز کیلئے آتے ہوئے اطمینان سے چلنا اور اطمینان سے نماز شروع کرنا۔

لما رواه مسلم باب اتيان الصلوة بوقار وسكينة والنهى عن اتيانها سعيا (۱/۲۲۰) قديمى: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا ثوب بالصلاة فلا يسع إليها أحدكم ولكن ليمش وعليه السكينة والوقار صل ما أدركت واقض ما سبقك۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز کا ارادہ کرے تو نماز کیلئے دوڑے نہیں بلکہ سکون اور وقار کے ساتھ چلے جتنی نماز مل جائے وہ پڑھ لے اور باقی بعد میں پڑھ لے۔

تکبیر تحریمہ کہتے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کو کھلا رکھنا۔

لما رواه الترمذى كتاب الصلوة باب نشر الاصابع عندالتكبير (۱/۵۶) قديمى: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا كبر للصلاة نشر أصابعه۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ جب نماز کیلئے تکبیر کہتے تو انگلیوں کو کھول لیتے۔

نماز میں سورۃ فاتحہ میں "ولا الضالین" کے بعد امین آہستہ کہنا۔

لما رواه الترمذى كتاب الصلوة باب ماجاء فى التامين (۱/۵۷) قديمى: عن وائل بن حجر رضي الله عنه قال سمعت النبى صلى الله عليه وسلم قرأ (غير المغضوب عليهم ولا الضالين) فقال آمين ومد بها صوته ---- وروى شعبة هذا الحديث عن سلمة بن كهيل عن حجر أبي العنبس عن علقمة بن وائل عن أبيه أن النبى صلى الله عليه وسلم قرأ (غير المغضوب عليهم ولا الضالين) فقال آمين. وخفض بها صوته۔

ترجمہ: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا آپ ﷺ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھتے اور امین میں آواز کو کھینچتے تھے۔

شعبہ رحمہ اللہ نے یہ روایت مسلمہ بن کھیل کے واسطے سے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ بیشک آپ ﷺ نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھا اور آواز آہستہ کی۔

رکوع کی حالت میں ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑنا اور کہنیوں کو پہلو سے دور رکھنا۔

لماروواه الترمذی، باب ماجاء انه یجا فی یدیه عن جنبیه فی الرکوع (۵۹/۱) قدیمی: فقال أبو حمید أنا أعلمکم بصلاة رسول الله صلی الله علیه وسلم إن رسول الله صلی الله علیه وسلم رکع فوضع یدیه علی رکبتیه کأنه قابض علیهما ووتر یدیه فنحاهما عن جنبیه۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں تم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارے میں بتاؤں بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے تھے، اور ہاتھوں کو کھلا رکھتے تھے اور پہلو سے دور رکھتے تھے۔

سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھنا پھر دونوں ہاتھوں کو اور اٹھتے وقت اس کے برعکس یعنی پہلے ہاتھوں کو زمین سے اٹھانا پھر گھٹنوں کو۔

لماروواه الترمذی باب وضع الیدین قبل الرکبتین فی السجود (۶۱/۱) قدیمی: عن وائل بن حجر قال رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا سجد یضع رکبتیه قبل یدیه وإذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه۔

ترجمہ: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ فرمایا تو گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھا اور جب اٹھے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو (زمین) سے اٹھایا۔

سجدہ میں پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھنا اور کہنیوں کو پہلو سے الگ رکھنا اور ہاتھوں کو کندھوں کے برابر رکھنا۔

لما رواه الترمذی باب السجود علی الجبهة والانف (۶۱/۱): عن أبي حمید الساعدی رضی الله عنه أن النبی صلی الله علیه وسلم کان إذا سجد أمکن أنفه وجبهته من الأرض ونحی یدیه عن جنبیه ووضع کفیه حذو منکبیه۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ فرماتے تو آرام سے اپنی ناک اور پیشانی کو زمین پر رکھتے اور ہاتھوں کو پہلو سے دور رکھتے اور ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے۔

سلام پھیرتے وقت دائیں، بائیں رخ پھیرنا اور لفظ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کر سلام پھیرنا۔

لماروواه الترمذی باب ماجاء فی التسلیم فی الصلوة (۶۵/۱) قدیمی: عن عبد الله رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم أنه کان یسلم عن یمینه وعن یساره السلام علیکم ورحمة الله السلام علیکم ورحمة الله۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دائیں اور بائیں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کر سلام پھیرتے تھے۔

(۸۷) آستین چڑھا کر یا صرف ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آستین کہنیوں سے اوپر چڑھا کر یا بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن کو چھپا کر نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے اگر چہ نماز ہو جائیگی۔

وفی الھندیۃ (۱/۱۰۶): ولو صلی مع السراویل والقمیص عندہ یکرہ کذافی الخلاصۃ وفی الفتاوی العتابیۃ وتکرہ الصلاۃ مع البرنس ولایکرہ لبسہ فی الحرب کذافی التاتارخانیۃ ولو صلی رافعا کمیہ الی المرفقین کرہ کذافی فتاوی قاضی خان۔

(۸۸) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ تکبیر کہتے وقت اٹھائے جائینگے یا تکبیر کے بعد یا پہلے؟ نیز بعض لوگ اپنی ہتھیلیوں کا رخ چہرے کی طرف رکھتے ہیں آیا اسطرح کرنا درست ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کے تینوں طریقے درست ہیں البتہ تکبیر سے پہلے ہاتھ اٹھانا مستحب ہے اور مرد ہاتھوں کو اتنا اٹھائے کہ انگوٹھوں کے پورے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں جبکہ عورت اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے کیونکہ اسمیں ستر زیادہ ہے، نیز ہتھیلیوں کا رخ چہرہ کی طرف کرنا بھی جائز ہے لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے۔

لمافی الھندیۃ (۱/۷۳): قال الفقیہ ابو جعفر یستقبل ببطون کفیہ القبلۃ وینشر اصابعہ و یرفعھما فاذا استقرتا فی موضع محاذاۃ الابھامین شحمتی الاذنین یکبر قال شمس الائمۃ السرخسی علیہ عامۃ المشائخ کذافی المحیط والرفع قبل التکبیر ھو الاصح۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۸۹) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی انگلیوں کی حالت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں انگلیاں کس حالت میں رہنی چاہئیں، کھلی رکھے یا ملا کر؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو نہ ہی کھولنے کی کوشش کرے نہ ملانے کی بلکہ اصل حالت پر رکھ کر

انگوٹھوں کو کانوں کی لو سے لگائے اور ہتھیلیوں کو قبلہ رخ کرے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۳۰۲): قوله ونشر اصابعه وكيفيته ان لا يضم كل الضم ولا يفرج كل التفريج بل يتركها على حالها منشورة كذا ذكره الشارح والظاهر أن المراد بالنشر عدم الطى بمعنى انه ليس له ان يرفعهما منصوبتين لا مضمومتين حتى تكون الاصابع مع الكف مستقبلة القبلة ومن السنن ان لا يطأطئ رأسه عند التكبير كمافى المبسوط۔

وفى الدر المختار(۱/۴۷۴): (رفع اليدين للتحريمة) فى الخلاصة ان اعتاد تركه اثم (ونشر الاصابع) اى تركها بحالها۔

وفى الشامية تحته: (قوله اى تركها بحالها) قال فى الحلية ظن بعضهم انه اراد بالنشر تفريج الا صابع وهو غلط بل أراد به النشر عن الطى يعنى برفعها منصوبتين لا مضمومتين حتى تكون الاصابع مع الكشف مستقبلة للقبلة ثم لا يخفى انه لا تتوقف السنة على ضم الاصابع اولا بل لو كانت منشورة غير متفرجة كل التفريج ولا مضمومة كل الضم ثم رفعها كذلك مستقبلا بهما القبلة فقد اتى بالسنة۔

(۹۰) تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نیت کرتے وقت ہاتھ کہاں تک اٹھانا مسنون ہے؟ اور کہاں باندھنا مسنون ہے؟ نیز اقامت کے دوران یا رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا یا کسی بڑے کے سامنے ہاتھ باندھنا شرعا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو دونوں کانوں تک اسطرح اٹھائیں کہ دونوں انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں اسکے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھ لیں۔ نیز دورانِ اقامت اور رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے، جبکہ کسی بڑے کے سامنے ہاتھ تعظیماً باندھ کر کھڑا ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اسلئے کہ تعظیماً ہاتھ باندھنا عبادت کیلئے ہوتا ہے جیسے نماز میں، اور غیر اللہ کی اس طور پر تعظیم جائز نہیں۔

لمافى الهندية(۱/۷۳): وكيفيتها اذا اراد الدخول فى الصلاة كبرورفع يديه حذاء اذنيه حتى يحاذى بابهاميه شحمتى اذنيه وبرؤس الاصابع فروع اذنيه۔۔۔(ووضع يده اليمنى على اليسرى تحت السرة) كمافرغ من التكبير... وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كمافى تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسال كذا فى النهاية وهو الصحيح، كذا فى الهداية ... ويرسل اتفاقا فى قومة الركوع اذا لذكرسنة الانتقال لا القومة۔۔۔

وفيه ايضاً (۳٦٨/۵): والتواضع لغيرالله حرام۔۔تجوزالخدمة لغيرالله تعالى بالقيام واخذاليدين والانحناء... ان قبل يد عالم اوسلطان عادل لعلمه وعدله لابأس به... وان قبل يدغيرعالم وغيرالسلطان العادل إن ارادبه تعظيم المسلم واكرامه فلابأس به وان ارادبه عبادة له اولينال منه شيئامن عرض الدنيافهومكروه۔

(۹۱) تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھے بغیر فوراً رکوع میں چلے جانے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو کہ پنج وقتہ نمازی ہیں کہ جب وہ نماز کیلئے مسجد میں آئے تو امام صاحب رکوع میں تھے، ان صاحب نے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع میں چلے گئے کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور شرعاً ایسی صورت میں کیا کرنا بہتر ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے تکبیر تحریمہ قیام کی حالت میں کہی ہے اس لئے اس کی نماز درست ہے تکبیر تحریمہ کا قیام یا قیام کے قریب حالت میں کہنا فرض ہے نیز تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنا مسنون ہے البتہ اگر نمازی کو تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر اور ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہونے کی صورت میں رکعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ہاتھ باندھے بغیر اور ثناء کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔

لمافی الهندية(۹۱/۱): وان أدرك الامام فى الركوع أو السجوديتحرى ان كان أكبر رأيه أنه لو أتى به أدركه فى شى من الركوع أو السجود يأتى به قائماً والايتابع الامام ولا يأتى به واذا لم يدرك الامام فى الركوع او السجود لاياتى بهما وان ادرك الامام فى القعدة لايأتى بالثناء بل يكبر للافتتاح ثم للانحطاط ثم يقعد۔

وفى الدر المختار(۴۸۰/۱):ويشترط كونه (قائماً) فلووجد الامام راكعا فكبر منحنياً ان الى القيام أقرب صح۔

(۹۲) تکبیر اولیٰ کی فضیلت کب تک حاصل ہو سکتی ہے؟

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر اولیٰ کا ثواب کب تک رہتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... تکبیر اولیٰ کا ثواب راجح قول کے مطابق پہلی رکعت کے حاصل ہونے تک رہتا ہے۔

لمافی الهندية(٦٩/۱): أما فضيلة تكبيرة الافتتاح فتكلموا فى وقت إدراكها والصحيح أن من ادرك

الركعة الأولى فقد أدرك فضيلة تكبيرة الافتتاح۔

وفى الشامية(١/٥٢٦): وتظهرفائدة الخلاف فى وقت إدراك فضيلة تكبيرة الافتتاح فعنده بالمقارنة، وعندهما إذاكبر فى وقت الثناء وقيل بالشروع قبل قراء ة ثلاث آيات لوكان المقتدى حاضراً وقيل سبع، لوغائبا وقيل بإدراك الركعة الأولى، وهذا أوسع وهو الصحيح اهـ وقيل بادراك الفاتحة، وهو المختار۔ خلاصة۔

رسالۃ

محاذاۃ الخدین فی مسئلۃ رفع الیدین

رفع یدین سے متعلق روایات، اختلاف کا تعین، ترک رفع یدین کی ترجیح

اس کے شواھد اور مسئلہ ھذا پر مبسوط اور مفصل فتوی۔

(۹۳) نماز میں رفع یدین کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا ایک غیر مقلد سے واسطہ پڑا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہم نے کہا بھائی اختلاف افضل کا ہے لہذا کرلو تب بھی صحیح نہ کرو تب بھی صحیح اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔ مفتی صاحب اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امام بخاری نے صرف رفع یدین کی احادیث لکھی ہیں۔ آپ ہمیں ترک والی احادیث بھی لکھ دیں اور اختلاف کی نوعیت اور حنفیہ کا اصل مذہب تفصیل سے بتائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......رفع یدین کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس صورت میں خلفائے راشدین، جلیل القدر کبار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین (یعنی حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت براء ابن عازب رضوان اللہ علیہم اجمعین) بلکہ امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان نمازوں کے اوپر سخت اشکال وارد ہوتا ہے جو رفع یدین کے بغیر ادا کی گئیں۔

"مسئلہ رفع یدین میں ائمۃ اربعۃ کے درمیان اختلاف کی نوعیت"

یہ بات واضح رہے کہ رفع یدین کا ثبوت اور ترک دونوں احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس کا انکار کوئی نہیں کرسکتا۔ اسی بناء پر ائمہ اربعہ علیہم الرحمۃ کے درمیان اختلاف واقع ہوا مگر یہ اختلاف جواز عدم جواز کا نہیں بلکہ افضل وغیر افضل کا ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے ہاں رفع یدین افضل ومستحب ہے، جیسا کہ علامہ نووی ؒ نے فرمایا:

وقال الشافعي واحمد وغيرهما يستحب رفع اليدين عند الركوع وعند الرفع منه

ترجمہ: "امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ نے فرمایا کہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین مستحب

ہے۔"

جبکہ احناف اور مالکیہ کے ہاں ترک رفع یدین افضل و مستحب ہے:

احناف کا مستدل (یعنی ترک رفع یدین کی احادیث)

عن علقمة قال قال عبدالله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه الا اصلی بکم صلوة رسول الله ﷺ فصلی فلم یرفع یدیه الا فی اول مرة (ترمذی ۱/۵۹، ابوداود ۱/۱۰۹، سنن نسائی ۲/۱۸۲، وفی مدونة الکبری ثم لا یرفعها حتی ینصرف (۱/۱۶۶)

ترجمہ: "حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھاؤں؟ پھر انہوں نے نماز پڑھائی پس پہلی مرتبہ (تکبیر تحریمہ) کے سوا رفع یدین نہیں کیا۔"

ابو حنیفة حدثنا حماد عن ابراهیم عن علقمة والاسود عن ابن مسعود رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ کان لا یرفع یدیه الا عند افتتاح الصلوة ولا یعود لشیء من ذالك

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے شروع میں (یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین فرماتے تھے اس کے علاوہ کسی رکن میں نہیں فرماتے تھے۔"

عن محمد بن جابر عن حماد بن سلیمان عن ابراهیم عن علقمة عن عبدالله قال صلیت مع ابی بکر وعمر فلم یرفعوا ایدیهم الا عند التکبیرة الاولی فی افتتاح الصلوة (سنن دار قطنی ۱/۲۹۶)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی۔ وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔"

عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما عن النبی ﷺ قال لا ترفع الایدی الا فی سبعة مواطن حین یفتتح الصلوة وحین یدخل المسجد الحرام فینظر الی البیت وحین یقوم علی الصفا وحین یقف مع الناس عشیة عرفة وبجمع رواه الطبرانی، نصب الرایة (۱/۳۹۰) ومثله فی المصنف لابن ابی شیبة (۲/۲۱۷)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رفع یدین نہیں کیا جاتا مگر سات جگہوں میں۔ جب نماز شروع کرے جب مسجد حرام میں داخل ہو کر بیت اللہ کو دیکھے۔ جب صفا پر کھڑا ہو۔ جب مروہ پر کھڑا ہو۔ جب عرفہ کی شام لوگوں کے ساتھ عرفات میں وقوف کرے۔"

عن تمیم بن طرفة عن جابر بن سمرة رضی الله تعالیٰ عنه قال خرج علینا رسول الله ﷺ فقال

مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوۃ (مسلم ۱/۱۸۱، سنن نسائی ۱/۱۷۶، ابو داود ۱/۱۴۳)

ترجمہ: "حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس گھر سے باہر تشریف لائے تو فرمایا کیا بات ہے۔ تمہیں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ گویا کہ وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کرو۔"

عن الاسود قال رایت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ یرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ثم لا یعود ورأیت ابراھیم والشعبی یفعلان ذالک (شرح معانی الاثار ۱/۲۲۷)

ترجمہ: "اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور میں نے ابراہیم اور شعبی کو دیکھا کہ وہ بھی اسی طرح کرتے تھے۔ (یعنی صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے اس کے علاوہ نہیں کرتے تھے۔)

عن البراء ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذ افتتح الصلاۃ رفع یدیہ الی قریب من اذنیہ ثم لا یعود۔ (شرح معانی الاثار ۱/۲۲۷، مدونۃ الکبری ۱/۱۶۶)۔

ترجمہ: "حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے شروع میں کانوں کے قریب تک رفع یدین کرتے تھے اور پھر نہیں کرتے تھے۔"

عن عاصم بن کلیب عن ابیہ ان علیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان یرفع یدیہ فی اول تکبیر من الصلوۃ ثم لا یرفع بعدہ (شرح معانی الاثار ۱/۱۶۳، مدونۃ الکبری ۱/۱۶۶، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲/۴۱۶)

ترجمہ: "عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کی پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے اس کے بعد رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

عن مجاھد قال صلیت خلف ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فلم یکن یرفع یدیہ الا فی التکبیرۃ الاولیٰ من الصلوۃ (شرح معانی الاثار ۱/۱۶۳)

ترجمہ: "مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز میں صرف پہلی تکبیر (یعنی تکبیر اولیٰ) کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔"

اخبرنی نعیم المجمر القاری ان اباھریرۃ کان یصلی بھم فیکبر کلما خفض ورفع وکان یرفع یدیہ حین یکبر ویفتتح الصلوۃ (المؤطا للامام محمد ص۹۰)

ترجمہ:"(ابوجعفر) قاری فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تھے تو جب بھی اوپر ہوتے اور نیچے ہوتے (یعنی انتقال کرتے وقت) تکبیر کہتے تھے اور رفع یدین نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے۔

عن ابی اسحاق قال کان اصحاب عبداللہ واصحاب علی لا یرفعون ایدیھم الافی افتتاح الصلوۃ قال وکیع ثم لا یعودون۔(مصنف لابن ابی شیبۃ ۱/۳۹۴)

ترجمہ:"ابواسحاق فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود کے اصحاب اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اصحاب صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔"

یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک رفع یدین ثابت ہے اسی طرح کبار صحابہ کرام وتابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ترک رفع یدین کا عمل متواتر ہے۔اب ذیل میں اس ترک رفع یدین کی وجہ بھی ذکر کی جاتی ہے تاکہ مسئلہ خوب واضح ہوجائے۔

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جو عمل اوفق بالقرآن ہو وہ راجح ہوتا ہے۔قرآن کریم میں ان مومنین کی مدح بیان فرمائی گئی ہے جو نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔(المؤمنون:۲)

ترجمہ:"وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع وخضوع مطلوب ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی خشوع کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الخشوع تارۃ من فعل القلب کالخشیۃ وتارۃ من فعل البدن کالسکون قیل لابد من اعتبارھما۔(فتح الملھم ۳/۳۱۹)

ترجمہ:"خشوع کبھی دل کا فعل ہوتا ہے جیسا کہ خشیت اور کبھی بدن کا جیسا کہ سکون بعض حضرات کہتے ہیں کہ خشوع کیلئے دونوں ضروری ہیں۔" جیسا کہ ایک حدیث میں بھی وارد ہے

لو خشع ھذا خشعت جوارحہ۔

ترجمہ:"اگر یہ خشوع اختیار کرتا تو اس کے اعضاء وجوارح سکون سے ہوتے۔"

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا ظاہر باطن کی ترجمانی کرتا ہے گویا نماز میں جس قدر ظاہری سکون ہوگا اسی قدر خشوع ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ ترک رفع اوفق بالقرآن ہے۔

نیز احادیث کے تعارض کے وقت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے جب ہم اس پہلو کو دیکھتے ہیں تو حضرات شیخین، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، سیدنا ابوہریرہ، حضرت براء بن عازب اور حضرت کعب بن عجرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل ترک رفع کا ہے، اور یہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علوم کا خلاصہ ہیں ان کے مقابلے میں جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے رفع یدین

منقول ہے وہ زیادہ تر کمسن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں یا قلیل صحبت یافتہ ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہم۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی ترک رفع یدین راجح ہوا۔ بعض نادان اس مسئلہ میں صحابی رسول صاحب النعلین ووسادہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نامناسب الفاظ کہہ جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو بڑی شان ہے، علامہ ذھبی ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

ابن مسعود الامام الربانی صاحب رسول اللہ ﷺ وخادمه واحد السابقین الاولین ومن کبار البدریین ومن نبلاء الفقهاء والمقرئین، وکان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایة ویزجر تلامذته عن التهاون فی ضبط الالفاظ... وکان ابن مسعود یقل من الروایة للحدیث ویتورع ...... وکان سادة الصحابة واوعیة العلم وائمة الهدی (تذکرة الحفاظ ۱/۱۶،۱۷)

ترجمہ: "ابن مسعود امام ربانی صحابی رسول اور خادم، سابقین اولین اور اکابر اہل بدر میں سے تھے ان کا شمار بلند پایہ فقہاء اور قراء میں تھا۔ الفاظ حدیث کے اختیار کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ روایت میں بڑی سختی فرماتے تھے اپنے تلامذہ کو ضبط الفاظ میں سستی کرنے پر ڈانٹ پلاتے تھے۔ حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے۔ اور اس بارے میں خاص احتیاط وورع سے کام لیتے تھے۔ ان کا شمار سادات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، خزانہ علم اور ائمۃ ہدیٰ میں ہوتا تھا۔"

نیز ترک رفع یدین کو اختیار کرنے کی ایک معقول وجہ بھی موجود ہے۔ جس سے تمام متعارضہ روایات کی توجیہ بھی ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ افعال صلوۃ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کے احکام حرکت سے سکون کی طرف منتقل ہوتے رہے مثلاً پہلے نماز میں کلام جائز تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ پہلے عمل کثیر مفسد صلوٰۃ نہیں تھا بعد میں اس کو مفسد صلوٰۃ قرار دے دیا گیا۔ پہلے نماز میں ادھر ادھر دیکھنا جائز تھا بعد میں اس کی ممانعت وارد ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں رفع یدین بکثرت ہوتا تھا اور ہر انتقال کے وقت مشروع تھا پھر رفتہ رفتہ اس میں کمی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ رفع یدین ابتداء مشروع تھا اور بعد میں اس کو ترک کردیا گیا تو اس اعتبار سے بھی ترک رفع یدین راجح ہوا۔

"مذکورہ مسئلہ کی احادیث پر ایک تحقیقی نظر"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رفع یدین کی احادیث ترک رفع یدین کی احادیث سے زیادہ ہیں معارف السنن (۲/۴۶۰) پر اس سے متعلق یہ بحث ہے کہ ان روایات پر اگر تحقیقی نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترک رفع یدین کی احادیث کی تعداد زیادہ ہے وہ اس طرح کہ کتب حدیث میں رفع یدین کے متعلق ذکر کی جانے والی احادیث تین طرح کی ہیں۔

۱۔ وہ احادیث جن میں رفع یدین کا ذکر ہے۔ پھر ان میں بعض احادیث ایسی ہیں جن میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے اور بعض احادیث ایسی ہیں جن میں ہر انتقال کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے اور بعض احادیث ایسی ہیں جن میں رکوع کیلئے جاتے وقت

اور رکوع سے اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کیلئے اٹھتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔

۲۔ وہ احادیث جن میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ تمام ارکان کیلئے رفع یدین کی نفی کا ذکر ہے۔

۳۔ وہ احادیث جو صفت صلوٰۃ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی ارکان کیلئے رفع یدین کا نہ ہی اثبات ہے اور نہ ہی نفی ہے۔

اب جو حضرات رفع یدین کے قائل ہیں۔ ان کا مستدل صرف وہ احادیث ہیں جن میں رکوع کیلئے جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کیلئے اٹھتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔

احناف کا مستدل ایک تو وہ احادیث ہیں جن میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تمام ارکان میں رفع یدین کی نفی کا ذکر ہے اسی طرح وہ احادیث بھی احناف کا مستدل ہیں جو صفت صلوٰۃ کو تو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی ارکان کیلئے نہ ہی رفع یدین کا اثبات ہے اور نہ ہی نفی ہے۔ اس لیے کہ اگر رفع یدین ہوا ہوتا تو صفت صلوۃ کو بیان کرتے وقت راوی اس رفع یدین (یعنی رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت) کو بیان کرتا یہ احادیث رفع یدین کے ذکر سے ساکت نہ ہوتیں لہٰذا یہ احادیث بھی احناف کا مستدل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترک رفع یدین کی احادیث کی تعداد رفع یدین کی احادیث سے زیادہ ہے۔

(۹۴) ناف سے نیچے ہاتھ باندھنے اور عدم رفع یدین کے ثبوت پر ایک تفصیلی فتویٰ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے؟ اور کیا کسی حدیث میں عدم رفع یدین ثابت ہے؟ احادیث سے مسئلہ کو واضح فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جی ہاں احادیث مبارکہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۰، طبع ادارۃ القرآن) میں ہے: **عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبيه قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وضع يمينه على شماله في الصلوة تحت السرة۔**

(ترجمہ): حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا آپ نے نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

اسی طرح مسند امام احمد (۱/۱۷۷) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو دار قطنی (۱/۲۸۹) اور بیہقی (۲/۳۱) اور ابو داؤد مع بذل المجہود (۲/۲۳)، المنہل العذب المورود شرح ابو داؤد (۳/۱۶۳، حصہ ۵)، و ابو داؤد طبع دار ابن حزم (۱/۲۳۸)، شرح العینی لابی داؤد (۳/۳۳۷) اور مصنف لابن ابی شیبۃ (۳/۲۲۴)، اسی طرح حضرت ابو ہریرۃ کی روایت ابو داؤد مع البذل (۲/۲۳)، المنہل العذب المورود (۳/۱۶۳، حصہ ۵) و ابو داؤد طبع دار ابن حزم (۱/۲۳۸) میں موجود ہے جس کو ابن حزم نے محلی بالآثار (۳/۳۰) میں بھی نقل فرمایا ہے۔ اور مغنی لابن قدامۃ (۱/۵۱۵) اور مجموع للنووی (۳/۲۵۹) میں بھی ہے اور امام اعظم، سفیان ثوری، ابو مجلز، ابراہیم نخعی، اسحاق بن راہویہ، ابو اسحاق مروزی شافعی، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔

(۲)۔ باقی رہا عدمِ رفع یدین تو خوب سمجھ لیا جائے کہ احناف عدم رفع یدین کے قائل نہیں بلکہ ترک رفع یدین کے قائل ہیں یعنی پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رفع یدین، رکوع اور سجود میں جاتے وقت اور رکوع اور سجود سے اٹھتے وقت فرماتے تھے پھر رکوع اور سجود کے وقت رفع یدین کو ترک کر دیا صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے اس کے بعد رکوع اور سجود کے وقت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل واضح ہے: **عن ابن مسعود الا اصلی بکم صلاة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فصلى فلم يرفع يديه الامرة، ترمذی (۱/۵۹) وفی النسائی (۱۸۲/۲) فرفع يديه اول مرة ثم لم يعد، وفی ابی داؤد (۱/۱۰۹)، مسند احمد (۱/۶۴۱)** یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والی نماز نہ پڑھاؤں؟ تو آپ نے نماز پڑھائی اور صرف پہلی مرتبہ ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث ابو داؤد (۱/۱۰۹) میں ہے، جس کو امام طحاوی نے شرح معانی الآثار (۱/۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۱۴) اور مصنف عبدالرزاق (۲/۷۲) اور دار قطنی (۱/۲۹۵) نے نقل کیا ہے۔

قال: کان النبی ﷺ اذا کبر لا فتتاح الصلوۃ رفع یدیہ... ثم لا یعود۔حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب تکبیر تحریمہ کہتے تو ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے، اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث دارقطنی نے (۱/۲۹۵) اور بیہقی نے نقل فرمائی۔عن عبداللہ قال صلیت مع النبی ﷺ و مع ابی بکر و مع عمر رضی اللہ عنہما فلم یرفعوا ایدیھم الا عند التکبیرۃ الاولیٰ فی افتتاح الصلوۃ۔یعنی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی وہ حضرات صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا عمل منقول ہے چنانچہ شرح معانی الآثار (۱/۱۶۳) اور مشکل الآثار (۱۵/۵۰) مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۸) میں ہے: عن الاسود قال رأیت عمر بن الخطاب یرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ثم لا یعود یعنی میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مؤطا میں امام محمد نے نقل کیا جس کو طحاوی نے شرح معانی الآثار (۱/۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۶) نے نقل کیا اور مسند الامام زید میں بھی (صفحہ ۸۹) میں مذکور ہے: واللفظ لہ حدثنی زید بن علی عن أبیہ عن جدہ عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان یرفع یدیہ فی التکبیرۃ الاولیٰ الی فروع اذنیہ ثم لا یرفعھما حتی یقضی صلاتہ یعنی سیدنا زید رحمہ اللہ اپنے والد علی بن حسین وہ اپنے والد حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نماز کے اختتام تک نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل مؤطا (صفحہ ۹۳) پر منقول ہے: عن عبدالعزیز بن حکیم قال رأیت ابن عمر رضی اللہ عنہ یرفع یدیہ حذاء اذنیہ فی اول تکبیرۃ افتتاح الصلوۃ ولم یرفعھما فیما سوی ذلک یعنی عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا آپ فقط تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔اس کو امام طحاوی نے مجاہد رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا (۱/۱۶۳) اور یہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) میں بھی مذکور ہے۔

یہ بطور نمونہ کے چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے احادیث نقل کردیں، اس کے علاوہ تابعین و تبع تابعین اور فقہاء و محدثین میں جماعت کثیرہ کا یہی مسلک ہے جو احناف کا ہے یعنی رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے، اس کے علاوہ نہیں۔چنانچہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۳/۲۷۲، حصہ ۵) میں چند کبار تابعین اور محدثین کے اسماء گرامی ذکر کئے مثلاً سفیان ثوری، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلیٰ، علقمہ بن قیس اور اسود بن یزید، عامر شعبی، ابواسحاق سبیعی، مغیرہ، وکیع، عاصم بن کلیب اور زفر رحمہم اللہ وغیرہم حضرات۔

جن میں اکثر کا ذکر شرح معانی الآثار (۱/۱۶۴) و مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) و مصنف عبدالرزاق (۲/۷۱)، و بیہقی میں ہے۔اس کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۶) میں مذکور ہے کہ عن ابی اسحاق قال: کان أصحاب عبداللہ رضی اللہ عنہ و اصحاب علی رضی اللہ عنہ لا یرفعون ایدیھم الا فی افتتاح الصلوۃ قال وکیع ثم لا یعودون۔یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے ساتھی اور تلامذہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے۔شیخ الاسلام ابوبکر بن عیاش (جو کہ

امام ابوداؤد اور احمد بن حنبل کے استاذ ہیں) فرماتے ہیں میں نے کسی فقیہ کو تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرتے نہیں دیکھا، شرح معانی الآثار (۱/۱۶۵)۔

یہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں اور محدثین اور تابعین کی جماعت جو رفع یدین رکوع اور سجود کے وقت ترک کررہے ہیں یقیناً ان کے ہاں نسخ ثابت ہو چکا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ نبی علیہ السلام کو تو انہوں نے رفع یدین عندالرکوع کرتے دیکھا ہو لیکن خود عمل اس کے خلاف کریں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اس طرح کا گمان محال ہے۔

نیز اصول حدیث کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت کی ہوئی حدیث کے خلاف عمل کرے تو اس کی روایت کو منسوخ مانا جائے گا (حسامی صفحہ ۶۷، توضیح، ۲/۴۸۶) پس عبداللہ بن عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جو رفع یدین بوقت رکوع نقل کرتے ہیں اور ان حضرات کا عمل اس کے خلاف ہے تو رفع یدین بوقت رکوع کا منسوخ ہونا اس اصول کی روشنی میں ثابت ہو گیا۔

نیز امام نسائی رحمہ اللہ کے صنیع سے بھی رفع یدین عندالرکوع کا نسخ ثابت ہوتا ہے چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اولاً باب رفع الیدین للرکوع قائم کیا اس کے بعد عنوان قائم کیا ''ترک ذلک'' یعنی رفع الیدین بوقت رکوع ثابت ہے لیکن اس کا ترک بھی ثابت ہے۔

نسخ کی ایک اور دلیل جس کو امام ابوداؤد نے (۱/۱۰۸) میں نقل فرمایا: عن میمون المکی انه رأی عبدالله بن الزبیر و صلی بهم یشیر بکفیه حین یقوم و حین ینهض للقیام فیقوم فیشیر بیدیه فانطلقت الی ابن عباس فقلت انی رأیت ابن الزبیر صلی صلاة لم أر أحداً یصلیها فوصفت له الاشارة فقال: ان احببت ان تنظر الی صلاة رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فاقتد بصلاة عبدالله۔

یعنی حضرت میمون مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ رکوع کے وقت بھی رفع یدین فرمارہے تھے تو وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ میں نے ابن زبیر کو ایسی نماز پڑھتے دیکھا کہ کسی کو بھی ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تجھے یہ پسند ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز دیکھے تو ان کی نماز کی اقتداء کر۔ حضرت میمون مکی کا یہ فرمانا کہ ''میں نے کسی کو ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا'' دلیل ہے اس بات کی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عام معمول رفع یدین بوقت رکوع نہ تھا باقی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اس کو صلاۃ الرسول فرمانا اس وجہ سے تھا کہ یہ ان سے ثابت ہے اور میمون مکی کا اس سے متوحش ہونا صحیح نہ تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

ترک رفع یدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، کبار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور فقہاء و محدثین سے بھی ثابت ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے لہٰذا اس کا انکار غلط ہے اور خلفاء راشدین، صحابہ کرام، فقہاء عظام، ائمہ مجتہدین اور محدثین رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

رسالة

كشف القناع عن مسئلة اتيان المسبوق بالثناء

مسبوق کا بوقت شرکت ثناء پڑھنے یا نہ پڑھنے کا بیان

نیز فقہاء کا مسئلہ ھذا کے ذیل میں انصات کو مسنون قرار دینے پر مفصل فتوی

(۹۵) امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد شریک ہونے والے کا ثناء پڑھنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرک اور مسبوق نماز میں امام کی قرأت شروع ہونے کے بعد شریک ہو تو اس کو ثناء پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آیات واحادیث اور اقوال فقہاء کرام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد مقتدی اور مسبوق وغیرہ کیلئے قرأت یا ثناء یا تعوذ وغیرہ پڑھنا ناجائز ہے خاموشی اختیار کر کے قرآن کا سننا اس کے لئے لازم ہے۔

لما في قوله تعالیٰ: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَه وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف:۲۰۴)

وفی قاضیخان (۱/۵۱): المسبوق اذا ادرك الامام فی القراء ة التی فیها یجهر فیها لا یأتی بالثناء فاذا قام الی قضاء ماسبق یاتی بالثناء ویتعوذ للقراء ة الخ۔

وفی التاتارخانیة(۱/۵۵۷): اذا انتهی الی الامام وقد سبقه الامام بشئ من صلوته هل یأتی بالثناء؟ فهذا علی وجوه: الاول اذا ادرك فی حال القیام فی الرکعة الاولیٰ اوفی الثانیة وفی هذا الوجه کان القاضی الامام ابو علی النسفی یحکی عن استاذه: لا یأتی بالثناء وقال غیره من اصحابنا یأتی وذکر شیخ الاسلام المعروف بخواهرزاده ان کانت الصلوة صلاة یخافت فیها بالقراء ة یأتی بالثناء لامحالة وفی النصاب وعلیه الفتوی: وأما اذا کانت صلوة یجهر فیها بالقراء ة ان ادرك الامام فی الرکعتین الاخریین فکذلك الجواب یشتغل بالثناء واذا کان فی الرکعتین الاولیین فقد اختلف المشایخ: منهم من یقول یشتغل بالثناء ومنهم من یقول لا یشتغل بالثناء الخ۔

وفی الشامیة (۵۴۶/۱): وفی شرح المنیة: والاصل ان الاستماع للقران فرض کفایة لانه لاقامة حقه بان یکون ملتفتا الیه غیر مضیع وذلك یحصل بانصات البعض۔

وفی الدر المختار (۵۴۶/۱): یجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ الخ۔

(۹۶) ظہر اور عصر میں مسبوق ثنا کب پڑھے گا؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تلاوت زور سے نہیں ہوتی اگر کسی کی ایک رکعت نکل گئی ہو، اور وہ اس نماز میں شامل ہو جائے تو ثناء کب پڑھی جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....مذکورہ صورت میں نیت باندھتے ہی تو ثناء نہیں پڑھ سکتے البتہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو رکعت ادا کی جائے گی وہ پہلی رکعت ہوگی اس میں ہر نماز کی پہلی رکعت کی طرح ابتداً ثناء پھر اعوذ باللہ پھر بسم اللہ.....اس طرح آخر تک پڑھیں گے۔

لمافی الھندیة (۹۱/۱): فاذا قام الی قضاء ماسبق یأتی بالثناء ویتعوذ للقرآءة کذا فی فتاوی قاضیخان والخلاصة والظھیریة...ومنھا انه یصلی اولاً ما ادرك مع الامام ثم یقضی ما سبق کذا فی محیط السرخسی...

(۹۷) گزشتہ دو فتاوی پر ایک فاضل کے اشکال کا مفصل جواب

سوال......جناب مفتی صاحب! مجھے آپ کی فتاویٰ کی کتاب نجم الفتاویٰ میں موجود ایک مسئلے سے متعلق چند سوالات کرنے ہیں مسئلہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ پر موجود ہے اور وہ مسئلہ ہے مسبوق کے ثناء پڑھنے سے متعلق۔ مذکورہ صفحے پر دو مسئلے ہیں دونوں میں مسبوق کو ثناء پڑھنے سے منع کیا گیا ہے لیکن پہلے فتوے میں جو تا تارخانیہ کا حوالہ ہے اس کے مطابق مفتی بہ قول یہی لکھا ہے کہ سری نمازوں میں مسبوق ثناء پڑھے گا اور جہری کی بھی آخری دو میں ملنے پر ثناء پڑھے گا البتہ جہری کی پہلی دو میں اختلاف ہے دونوں قول موجود ہیں......مسبوق کا سرّی نمازوں میں ثناء پڑھنا دیگر بھی بہت سی کتب میں موجود ہے نیز احسن الفتاویٰ (۳/ ۳۸۲) پر یہی فتویٰ تحریر ہے اس کے علاوہ خیر الفتاویٰ، فتاوی دار العلوم دیوبند اور فتاویٰ حقانیہ میں بھی سرّی نمازوں میں ثناء پڑھنے کا حکم ذکر ہے۔ آپ سے صرف ان سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ اگر نجم الفتاویٰ میں موجود فتوے کو لیا جائے تب بظاہر کوئی اشکال تو نہیں ہوتا لیکن حوالے اس کے مخالف ہیں جو سرّی میں ثناء پڑھنے کا بتا رہے ہیں لہٰذا اگر سرّی نماز میں ثناء مسبوق پڑھتا ہے تو درج ذیل سوالات اٹھتے ہیں:

۱)۔ استماعِ قرآن تو جہری اور سرّی دونوں نمازوں میں ضروری ہے تو کیا سرّی نمازوں میں جو حکماً استماع ہوتا ہے وہ مسبوق کے ثناء پڑھنے سے متاثر نہ ہوگا؟

۲)۔ اگر ثناء پڑھ سکتا ہے تو پھر قراءت کرنا کیوں منع ہے؟ وجہ فرق کیا ہے؟ بظاہر استماع قرآن کا حکم ہی قراءت سے منع کی علت ہے تو یہ علت تو ثناء پڑھنے میں بھی ہے اگر چہ ثناء دعاء ہو لیکن استماع تو متاثر ہو رہا ہے فما ھو وجہ الفرق بین الثناء والفاتحۃ؟

۳)۔ مسبوق نے جب دوبارہ پڑھنا ہی ہے تو پھر تحریمہ کے بعد پڑھنے کی کیا خاص ضرورت یا فائدہ ہے؟

۴)۔ مسبوق کی رکعت چھوٹ گئی ہے لہٰذا اسے تو دوبارہ پہلی رکعت پڑھنے کا موقع ملے گا لیکن ایک شخص پہلی رکعت میں قراءت شروع ہونے کے بعد پہنچا تو اسے تو دوبارہ رکعت پڑھنے کا موقع ملے گا نہیں اب سرّی نماز میں تو وہ ثناء پڑھ رہا ہے لیکن جہری میں نہیں جبکہ آگے مافات کا بدلہ نہیں اتارا جا سکتا تو یہاں جہری میں پڑھنے کی بھی گنجائش ہونی چاہیے۔

۵)۔ تاتارخانیہ وغیرہ میں ایک قول جہری نماز میں بھی ثناء پڑھنے کا ذکر ہے تو کیا اس قول کے مطابق استماع متاثر نہیں ہوگا؟

از راہِ کرم ہمارے پانچوں سوالات کے جوابات تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں آپ نے "نجم الفتاویٰ" میں موجود ایک فتوے سے متعلق اتنا تفصیلی استدراک فرمایا اور احقر سے مراجعت فرمائی اس پر بندہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کے مقامات کی نشاندہی فرماتے رہیں گے۔

مسبوق جب اپنی فوت شدہ رکعت کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے گا تو اس میں بالاتفاق اولاً ثناء پڑھے گا البتہ جب مسبوق درمیانِ نماز امام کے ساتھ شریک ہوگا اس وقت ثناء پڑھے گا یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے جہری نماز میں امام قراءت کر رہا ہو تو اسمیں بھی تقریباً اتفاق ہے کہ مسبوق ثناء نہیں پڑھے گا بلکہ خاموشی سے قراءت سنے گا بعض فقہاء نے جہری نمازوں میں بھی سکتات میں ثناء پڑھ لینے کا قول کیا ہے جو مرجوح ہے البتہ جہری نمازوں کی آخری رکعتیں اور سری نمازوں میں جب مسبوق شریک ہوگا تو ثناء پڑھے گا یا نہیں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض فقہاء پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض فقہاء نے نہ پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ محیط برھانی، خانیہ، تاتارخانیہ، البحر الرائق، ہندیہ اور شامیہ میں اس بات کو ترجیح دی گئی ہے کہ مسبوق سری نمازوں میں اور جہری نمازوں کی آخری رکعات میں ثناء پڑھے گا اس کے بالمقابل صاحبِ نہر، مراقی الفلاح میں علامہ شرنبلالی، کبیری، درمختار، طحطاوی علی المراقی اور طحطاوی علی الدر المختار ان حضرات نے مطلقاً ثناء نہ پڑھنے کے قول کو اختیار کیا ہے چاہے جہری نماز ہو یا سرّی، ہر حال میں جب امام قراءت کر رہا ہو تو مسبوق مطلقاً خاموش رہے گا۔

نجم الفتاویٰ میں اس دوسرے قول کے مطابق فتویٰ دیا گیا تھا یہی قول نقلاً وعقلاً راجح معلوم ہوتا ہے۔ علامہ طحطاوی، درمختار کے حاشیے پر فرماتے ہیں:

قال الحصكفي في الدر: (وقرأ) كما كبر (سبحانك اللهم) .... (إلا إذا) شرع الإمام في القراءة سواء (كان مسبوقا) أو مدركا (و) سواء كان (امامه يجهر بالقراءة) أو لا (فإنه) (لا يأتي به) لما في النهر عن الصغرى أدرك الإمام في القيام يثني ما لم يبدأ بالقراءة وقيل في المخافتة يثني.

وقال الطحطاوی فی حاشیتہ: (قولہ: وقیل فی المخافتۃ یثنی) وجہ ضعف ھذا القیل انہ اذا امتنع علی الماموم قراءۃ القرآن التی ھی فرض فی الصلاۃ عند قراءۃ الامام القرآن سرا او جھرا فلان یمتنع علیہ الثناء وھو نفل اولی بجامع التخلیط والتغلیط فی کل۔

امام حصکفی درمختار میں فرماتے ہیں: اور تکبیر کہتے ہی سبحانک اللھم پڑھے گا...... الایہ کہ امام قراءت شروع کر چکا ہو چاہے یہ شخص مسبوق ہو یا مدرک ہو اور چاہے امام جہراً قراءت کر رہا ہو یا سرا دونوں صورتوں میں یہ شخص ثناء نہیں پڑھے گا جیسا کہ نہر میں صغری سے نقل ہے کہ امام کو قیام میں پالے تو یہ ثناء پڑھے گا جب تک امام قراءت شروع نہ کر چکا ہو اور کہا گیا ہے کہ آہستہ یعنی سرّی نمازوں میں ثناء پڑھے گا علامہ طحطاوی اس کے حاشیے پر فرماتے ہیں: (وقیل فی المخافتۃ یثنی) اس قول کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ جب ماموم کو امام کی قراءت کے وقت قراءت سے ہی منع کر دیا گیا جو کہ نماز میں فرض ہے چاہے نماز سری ہو یا جہری تو پھر ثناء سے تو بطریقہ اولیٰ منع کیا جائے گا کیونکہ یہ تو نفل ہے کیونکہ خلط اور غلطی کا سبب بننا دونوں میں مشترک ہے۔" (طحطاوی علی الدر ۱/ ۲۱۸)

النہر الفائق میں ہے:

"اطلقہ فشمل الامام والماموم الا المسبوق اذا کان الامام یجھر بالقراءۃ کما صححہ فی الذخیرۃ کذا فی البحر والاولی ان یقال الا اذا شرع الامام فی القراءۃ مسبوقا کان او مدرکا جھرا او لا لما فی الصغری ادرک الامام فی القیام او الرکوع یثنی مالم یبدا الامام بالقراءۃ وقیل فی المخافتۃ یثنی (النھر الفائق ۱/۲۰۸)

علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے سری نماز میں بھی ثناء نہ پڑھنے کی عقلی وجہ بھی بیان فرمادی کہ مقتدی کو جب قراءت کرنے سے منع کیا گیا ہے تو پھر بدرجہ اولیٰ ثناء پڑھنا منع ہونا چاہیے اور یہ واضح بات ہے کہ وہ قراءت جو بعض فقہاء کے نزدیک وجوب تک کا درجہ رکھتی ہے ہمارے نزدیک منع ہے تو پھر ثناء کا درجہ تو نفل یا استحباب کا ہے اس کا جواز بے معنی اور خلافِ قیاس ہے اور یہی علامہ طحطاویؒ کے نزدیک اس قول (سری نماز میں مسبوق کا ثناء پڑھنا) کی ضعف کی وجہ ہے۔

البتہ بندہ یہاں مسئلہ اور اختلاف کی بنیادی وجہ پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔

احقر کے نزدیک کتب کے تتبع کے بعد جو وجہِ اختلاف سامنے آئی وہ یہ ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے سرّی نمازوں میں اور جہری نمازوں کی آخری رکعات میں ثناء کے جواز کا قول کیا ہے ان کے نزدیک جہری نمازوں کے علاوہ میں استماع (سننا) فرض نہیں اور نہ انصات واجب ہے بلکہ غیر جہری نمازوں میں انصات (خاموش رہنا) ان کے نزدیک قراءت کی تعظیم کی وجہ سے فقط مسنون ہے اسی لیے شامیہ میں اسے سنتِ غیر مقصودہ قرار دیا ہے یعنی فقط قراءت کی تعظیم میں (جو امام سراً کر رہا ہے) خاموش رہنا مسنون ہے خود اس کے مسنون ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے برخلاف ثناء کو سنت مقصودہ قرار دیا گیا ہے اور امام کی ثناء کو مقتدی کیلئے کافی نہیں قرار دیا گیا

اس لیے ایک سنت مقصودہ (ثناء) کو دوسری سنت جو کہ غیر مقصودہ (انصات) ہے کی وجہ سے ترک کرنا لازم آئے گا لہذا سری نمازوں میں انصات کے بجائے مسبوق وغیرہ قراءت کے شروع ہوجانے کے بعد بھی ثنا پڑھیں گے اس استدلال پر تفصیلی بحث سے قبل ہم ان حضرات کی عبارت من وعن نقل کردیتے ہیں[جنہوں نے یہ وجہ بیان فرمائی ہے] محیط برھانی میں ہے:

إن كانت الصلاة صلاة يخافت فيها بالقراءة يأتي بالثناء لا محالة؛ لأنه لو لم يأت بالثناء إنما لا يأتي كيلا يفوته الاستماع، فإذا كانت الصلاة مما يخافت فيها بالقراءة لا يلزمه الاستماع والثناء ذكر مقصود بنفسه، فيأتي به.فإن قيل:ان كان لا يفوته الاستماع متى يشتغل بالثناء، فإنه يفوت فريضة الإنصات.قلنا: الإنصات إنما يفرض حالة استماع القراءة؛ لأن الاستماع إنما يتحقق بالإنصات، والاستماع فرض فما لا يتحقق الاستماع إلا به يصير فرضاً تبعاً له. فأما في حالة غير الاستماع فالإنصات إنما شرع سنيته تعظيماً لا مر القراءة بقدر الإمكان لا سنّة مقصودة بنفسها، والثناء ذكر مقصود بنفسه فكان مراعاة الثناء أهم من مراعاة الإنصات. (المحيط البرهاني ۱۳۳/۲)

شامیہ میں ہے:

"الاستماع في غير حالة الجهر ليس بفرض بل يسن تعظيما للقراءة فكان سنة غير مقصودة لذاتها وعدم قراءة المؤتم في غير حالة الجهر لا لوجوب الإنصات بل لأن قراءة الإمام له قراءة وأما الثناء فهو سنة مقصودة لذاتها وليس ثناء الإمام ثناء للمؤتم فإذا تركه يلزم ترك سنة مقصودة لذاتها للإنصات الذي هو سنة تبعا بخلاف تركه حالة الجهر"

(شامية ۴۸۸/۱)

محیط اور شامیہ کی یہ تفصیلی عبارات ذکر کردی گئیں جن میں تفصیلاً وہی بات ذکر ہے جو ہم نے بیان کردی اسی طرح جو حضرات بھی مسبوق وغیرہ کے ثناء پڑھنے کے قائل ہیں ان کے نزدیک مسئلے کی علت یہی ہے اور اس سب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ سری نمازوں میں انصات (خاموش رہنا) واجب نہیں بلکہ سنت غیر مقصودہ ہے البتہ جہری نمازوں میں انصات واجب ہے لہذا جہری نمازوں میں مسبوق ثناء نہیں پڑھے گا۔

احقر کو اس بنیاد پر تردد ہے انصات کو سرّی نمازوں میں مسنون اور وہ بھی سنت غیر مقصودہ قرار دینا قابلِ تامل ہے مشہور اور مختار قول کے مطابق سرّی اور جہری دونوں نمازوں میں انصات مطلقاً واجب ہے۔

چنانچہ فتح القدیر میں علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ قراءت کی بحث میں انصات سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"قوله بالنص يعني قوله تعالى { وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَه وَأَنصِتُوا} والإنصات لا يخص

الجهرية لأنه عدم الكلام لكن قيل إن السكوت للاستماع لا مطلقا وحاصل الاستدلال بالآية أن المطلوب أمران الاستماع والسكوت فيعمل بكل منهما والأول يخص الجهرية والثاني لا فيجري على إطلاقه فيجب السكوت عند القراءة مطلقا"

"(قولہ بالنص) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قول ہے "وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ" یہ انصات جہری نمازوں کے ساتھ خاص نہیں ہے کیونکہ وہ کلام کا نہ ہونا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خاموش رہنا سننے کیلئے ہے نہ کہ مطلقاً۔ آیت سے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ مطلوب دو چیزیں ہیں سننا اور خاموش رہنا پس دونوں پر عمل کیا جائے گا پس پہلا (استماع) تو جہری کے ساتھ خاص ہوگا لیکن دوسرا (یعنی سکوت) جہری کے ساتھ خاص نہیں پس وہ اپنے اطلاق پر رہے گا قراءت کے وقت مطلقاً خاموش رہنا واجب ہوگا۔" (سری اور جہری دونوں میں)

(فتح القدیر ۱/۳۴۲)

اسی بنیاد پر علامہ رافعیؒ نے "التحریر المختار لرد المحتار" (جو کہ شامیہ پر استدراک کا حاشیہ ہے) میں شامیہ میں اسی مقام پر جو ہم نے نقل کیا [جس میں علامہ شامیؒ نے ذخیرہ کے حوالہ سے انصات کو سری نمازوں میں مسنون قرار دیا ہے] اس پر استدراک فرمایا ہے:

"(وعلله في الذخيرة بما حاصله الخ) خلاف المشهور فان المشهور ان السكوت في السريه والجهرية واجب لا سنة"

"(وعلله في الذخيرة بما حاصله الخ) یہ مشہور قول کے خلاف ہے کیونکہ مشہور قول یہ ہے کہ سکوت سری اور جہری دونوں نمازوں میں واجب ہے نہ کہ سنت۔" (التحریر المختار ۱/۶۰)

نیز علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی شامیہ میں قراءت کی بحث میں خود بحر کے حوالے سے انصات کو مطلقاً واجب قرار دیا ہے معلوم نہیں ثناء کی بحث میں انصات کو کیوں مسنون قرار دیا گیا ہے شامیہ میں قراءت کی بحث میں تحریر ہے:

قوله: (بل يستمع) إذا جهر (وينصت إذا أسر).. وكذا إذا جهر بالأولى قال في البحر وحاصل الآية أن المطلوب بها أمران الاستماع والسكوت فيعمل بكل منهما والأول يخص الجهرية والثاني لا فيجري على إطلاقه فيجب السكوت عند القراءة مطلقا۔

(مصنف کا قول: مقتدی سنے گا جب جہر ہو اور خاموش رہے گا جب سری نماز ہو) اور اسی طرح جہری نماز میں بدرجہ اولیٰ خاموش رہنا ہوگا۔ بحر میں ہے: کہ آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس سے مطلوب دو چیزیں ہیں ایک سننا اور دوسرا خاموش رہنا پس دونوں پر عمل کیا جائے گا اور پہلا جہری نمازوں کے ساتھ خاص ہوگا اور دوسرا جہری کے ساتھ خاص نہ ہوگا بلکہ مطلقاً رہے گا پس قراءت کے وقت مطلقاً سکوت خاموش رہنا واجب ہوگا۔ (شامیہ ۱/۵۴۵)

جب علامہ شامی رحمہ اللہ خود سکوت اور انصات کو مطلقاً سری اور جہری نمازوں میں بحر کے حوالے سے واجب قرار دے رہے

ہیں تو گویا کہ فتح القدیر میں علامہ ابن الہمامؒ، البحر الرائق میں علامہ ابن نجیم اور ردالمحتار میں علامہ شامی رحمہم اللہ خود انصات کے مطلقاً وجوب کا قول کر رہے ہیں تو پھر بحر اور شامیہ میں ثناء کی بحث میں سری نمازوں میں ثناء کے پڑھنے کا قول کرنے پر بطور اصل کے سری نمازوں میں انصات کو مسنون قرار دینا محلِ نظر اور تعارض ہے اسی وجہ سے ثناء کی بحث میں علامہ شامی رحمہ اللہ کے مسنون قرار دینے پر علامہ رافعیؒ نے التحریر المختار میں استدراک فرمایا ہے اور مشہور قول مطلقاً انصات کے وجوب کا ہونا قرار دیا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک قراءۃ خلف الامام کے منع کی وجہ انصات اور استماع کا وجوب ہی ہے جو کہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ ہم نے دلائل سے انصات کا وجوب مطلقاً ثابت کر دیا لہٰذا ثناء کی بحث میں ان حضرات کا انصات کو مسنون اور وہ بھی قراءتِ سریہ کی تعظیم میں غیر مقصودی طور پر مسنون قرار دینا ہی محل نظر ہے اس کے بعد ثناء کو سنتِ مقصودہ قرار دینا اور آخر میں یہ نتیجہ نکال لینا کہ سنتِ غیر مقصودہ کیلئے سنت مقصودہ کو نہیں چھوڑا جائے گا لہٰذا سری نمازوں میں ثناء پڑھی جائے گی۔ یہ قول نقلاً وعقلاً ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ علامہ طحطاوی رحمہ اللہ کے حوالے سے تو اس کے ضعف کی انتہائی معقول وجہ ذکر کر دی گئی کہ اگر آپ نے مقتدی کیلئے کچھ پڑھنے کا قول ہی کرنا ہے تو ثناء کے بجائے قراءت خلف الامام کا قول کریں کیونکہ قراءت بعض ائمہ کے نزدیک تو واجب بھی ہے اس واجب کے پڑھنے کا تو آپ قول نہیں کرتے لیکن ایک ثناء جو کہ نفل ہے اسے پڑھنا ضروری قرار دے رہے ہیں۔ باقی اس بات کے جواب میں یہ کہنا کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے لہٰذا وہ سرّی میں بھی قراءت نہیں کرے گا لیکن امام کی ثناء مقتدی کی ثناء نہیں لہٰذا سری نمازوں میں مقتدی ثناء پڑھے گا یہ بات بھی قابلِ تامل ہے کیونکہ ثناء تو بعد از قیام مسبوق پڑھ لے گا اور نہ بھی پڑھے تو ایک استحباب کا ترک ہو رہا ہے جبکہ دوسری طرف انصات جو کہ نص قرآنی سے فقہاء خود مطلقاً واجب قرار دے رہے ہیں اس میں خلل واقع ہو رہا ہے تو خلل کا دفع ضروری ہے اس خلل کی وجہ سے ہی آپ علیہ السلام نے قراءت خلف الامام سے منع فرمایا ایک حدیث میں ہے:

"عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- انصرف من صلاة جهر فيها بالقراءة فقال هل قرأ معي أحد منكم آنفا. فقال رجل نعم يا رسول الله. قال إني أقول ما لي أنازع القرآن . قال فانتهى الناس عن القراءة مع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- فيما جهر فيه رسول الله -صلى الله عليه وسلم- من الصلوات بالقراءة حين سمعوا ذلك من رسول الله صلى الله عليه وسلم" (جامع الترمذی ۷۱/۱) باب ماجاء فی ترك القراءة خلف الامام

یہی علامہ طحطاوی رحمہ اللہ فرما رہے ہیں:

"بجامع التخليط والتغليط في كل" (طحطاوی علی الدر ۲۱۸/۱)

یعنی دونوں جگہ ثناء اور قراءت خلف الامام میں علت مشترک ہے اور وہ ہے امام پر خلط کے وقوع کا امکان۔ اسی لیے مقتدیوں کو انصات خاموش رہنے کا حکم ہے۔ گویا کہ سری نمازوں میں قراءت کی طرح ثناء نہ پڑھنے کی دو وجہیں ہیں:

۱) انصات کا وجوب ۲) تخلیط علی الامام (امام کا غلطی میں پڑ جانا)۔

ان حوالجات کی بنیاد پر احقر کے نزدیک وہی بات راجح ہے جسے النہر الفائق، مراقی الفلاح، طحطاوی علی المراقی، درمختار اور طحطاوی علی الدر میں اختیار کیا گیا ہے۔ نیز انصات سے متعلق مختار اور مشہور قول ہی راجح ہے جسے علامہ ابن الہمام، علامہ ابن نجیم، تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی اور اس کے حاشیے پر علامہ چلپی اور شامیہ کے باب القراءۃ میں علامہ شامی رحمہم اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ سری اور جہری دونوں نمازوں میں انصات واجب ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں مسبوق چاہے سری نماز ہو یا جہری نماز کی آخری رکعات بعد از تکبیر تحریمہ ثناء نہیں پڑھے گا امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑے ہو کر اولاً ثناء پڑھے گا اور پہلی رکعت مکمل طور پر پڑھے گا۔ یہی قراءت خلف الامام کے مسئلے سے نزدیک اور موافق ہے۔ نیز مسئلہ ہذا میں انصات کو مسنون قرار دینے کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ آیت "وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ" سے ثابت انصات کے وجوب کا حکم جو کہ مطلقاً واجب ہے جسے علامہ ابن الہمام، علامہ زیلعی، علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہم اللہ اس آیت سے استدلال کر کے مطلقاً واجب قرار دے رہے ہیں اسے مسئلہ ہذا میں مسنون بنا دیا گیا اور پھر اصل قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ قراءت خلف الامام پر ثناء کو قیاس کر کے ثناء کے بھی نہ پڑھنے کا قول کیا جائے جیسا کہ علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے قیاس فرمایا ہے لیکن انصات کو مسنون قرار دینے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیاس یوں کیا جائے کہ سری نمازوں میں جب انصات مسنون ہونے کی بناء پر ثناء پڑھی جا سکتی ہے تو پھر قراءت خلف الامام ہی کر لی جائے کیونکہ قراءت خلف الامام بعض ائمہ کے نزدیک تو فرض تک ہے بالخصوص قراءتِ فاتحہ خلف الامام۔ جبکہ ثناء تو فقط استحباب یا سنیت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب قائلینِ جوازِ ثناء کے نزدیک انصات مسنون ہے تو پھر لازماً ان کے نزدیک قراءت خلف الامام بھی سری نمازوں میں ہونی چاہیے حضرت ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"ویؤید ما فی غنیة المصلی (ص:۲۹۷) واذا ادرك الشارع فی الصلوة عند شروعه الامام وهو ای والحال ان الامام يجهر بالقراءة لایأتی بالثناء بل یستمع وینصت للآیة وقال بعضهم یأتی بالثناء عند سکتات الامام حال کون الثناء کلمة کلمة او کلمتین کلمتین بحسب ما یمکنه لانه امکنه الاتیان بالسنة مع مراعاة مقتضی الامر۔

قلت: وكذا اذا امكنه الاتيان بالفاتحة مع مراعاة مقتضى الامر بل هی اولی واهم من الثناء لقول الشافعية بفرضيتها والخروج من الخلاف حسن فينبغی القول بجواز قراءتها فی الجهرية ان وجد فرصة بين السكتات والا لالئلا يخل بالاستماع المفروض وقال فی رد المحتار: قضية المتن الاتيان بالثناء فی المخافتة وان بدا الامام بالقراءة...... قلت: وهذا يؤيد ما روی عن محمد من استحسان قراءة الماموم فی السرية فان امر القراءة اهم من الثناء فلما جاز الاتيان به فی السرية مع اشتغال الامام بالقراءة فاولی ان يجوز الاتيان بها ايضا وما ذكره الشامی من الفرق بين الثناء والقراءة ناقلا عن الذخيرة بما نصه: وعدم قراءة الماموم ......

ففیه ان غایة ما یستفاد منه الفرق بینهما بالاستحباب وعدمه لا بالجواز وعدمه لانه حدیث قراءة الامام قراءة للمقتدی لایدل علی منع المأموم عن القراءة بل علی جواز اکتفاء بقراءة الامام والمفید للمنع انما هو الامر بالانصات فحسب وقد اعترف المجیب بعدم وجوبه فی السریة وما ذکره ابن الهمام انه لو ...... فالحق ان القول بجواز قراءة المأموم فی السریة لازم علی من جوّز الاتیان بالثناء فیها وکذا بجوازها فی سکتات الجهریة علی من جوزه فیها فافهم. والله اعلم (اعلاء السنن ۱۰۰/۴)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ قراءۃ خلف الامام فی السریۃ کے منع کی وجہ ہی انصات کا وجوب ہے اور جب آپ نے سری میں انصات کو مسنون قرار دے دیا تو پھر منع کی کوئی وجہ نہیں رہی باقی شامیؒ کا یہ کہنا کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے اس لیے نہ کرے یا علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ مقتدی اگر قراءت کرے گا تو یہ دو قراءتیں ہو جائیں گی ایک امام اس کی جگہ کر رہا ہے اور دوسرا خود یہ کرے گا لہٰذا مقتدی قراءت نہ کرے اس سب کا بھی علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے جواب دیا ہے فرماتے ہیں:

"وما ذکره ابن الهمام انه لو قرأ کان له قراءتان فی صلاة واحدة وهو غیر مشروع ففیه ان قراءة الامام لیست بقراءة المأموم حقیقة لاعرفا ولا شرعا وانما هی قراءة له حکما فلو قرأ لا یلزم الا ان تکون له قراءتان حقیقیة وحکمیة ولا عائبة فی اجتماعهما ولا دلیل یدل علی قبحه فالحق ان القول بجواز قراءة المأموم فی السریة لازم علی من جوز الاتیان بالثناء فیها الخ

(اعلاء السنن ۱۰۰/۴)

بہر حال مسئلہ ہذا میں اس سب تفصیل کے ذکر کرنے کی وجہ کوئی بحث برائے بحث یا تنقید مقصود نہیں کتب فقہ کی مراجعت سے جو کچھ سامنے آیا تحریر کر دیا گیا ہے مسئلہ زیرِ بحث میں انصات کو مسنون قرار دینے پر چونکہ علامہ رافعیؒ کے علاوہ کسی نے استدراک نہیں کیا نیز اعلاء السنن میں ذکر کردہ تفریعات بھی قابلِ غور وفکر ہیں۔ احقر نے ان سب کا تتبع کرتے ہوئے حتی المقدور امانت و دیانت کے ساتھ تحقیق نقل کر دی ہے۔ قراءت خلف الامام چاہے جہری نماز میں ہو یا سرّی دونوں میں مکروہ ہے اور کراہت کی وجہ انصات کا وجوب ہے۔ یہی آیتِ قرآنیہ سے ثابت ہوتا ہے، چاہے وہ جہری نماز ہو یا سری انصات بہر حال واجب ہے، اسی لئے مسئلہ ھذا میں پائی جانے والی بعض نقول جن میں جہری نمازوں میں بھی مسبوق کے ثناء پڑھنے کا ذکر ہے اس پر رد کرتے ہوئے کبیری میں ہے:

وهو بعید اذ لا فصل فی قوله تعالی واذا قریء القرآن فاستمعوا له الآیة بین الفاتحة وغیرها بل الأصح انه لایأتی به مطلقا لاطلاق النص. (کبیری، ۲۹۷)

ثناء سے متعلق مسئلہ ہذا میں اس انصات کو مسنون قرار دینا فقہ حنفی کے اتنے اہم مسئلے قراءت خلف الامام کی بنیاد (وجوب انصات) کو اپنی زد میں لے رہا ہے جس کا دفاع یا توجیہ احقر اپنا فرض سمجھتا ہے نیز مسئلہ ھذا پر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تفریعات کو بجا

سمجھتا ہے اور اصل سبب اشکال انصات کو مسنون قرار دینے کو سمجھتا ہے۔

لیکن مسئلہ میں چونکہ اعلام فقہاء اور اکابر کا اختلاف ہے لہٰذا دونوں آراء پر عمل کیا جاسکتا ہے مسئلہ مجتہد فیھا ہے البتہ ثناء نہ پڑھنے کی صورت میں صرف استحباب کا ترک ہے جو کہ اھون اور ایسر ہے بنسبت ثناء پڑھنا وجوب انصات میں مخل اور کراہت کا سبب ہے اس قاعدے کے مطابق بھی سری نمازوں میں ثناء نہ پڑھنا ہی مسبوق کیلئے بہتر معلوم ہوتا ہے نیز بعد از سلام کھڑے ہو کر اس نے ثناء پڑھنی ہی ہے جس طرح پہلی رکعت کی قراءت وغیرہ کی قضاء کرے گا ویسے ہی ثناء کو بھی اس وقت پڑھ لے گا۔

مسئلہ ہذا میں اکابرین کے فتاویٰ میں درج ذیل مقامات پر یہ مسئلہ درج ہے:

۱)۔امداد الفتاویٰ (۱/ ۴۰۳) عنوان: حکم ثناء وتعوذ درحق مسبوق

۲)۔کتاب الفتاویٰ (۲/ ۲۸۸) عنوان: مقتدی مسبوق اور ثناء

۳)۔خیر الفتاویٰ (۲/ ۴۰۷) عنوان: امام جہراً قراءت کررہا ہو تو مسبوق ثناء نہ پڑھے

۴)۔فتاویٰ دار العلوم دیوبند (۳/ ۲۵۷) مسبوق ثناء کب پڑھے گا

۵)۔فتاویٰ حقانیہ (۳/ ۱۸۰) مسبوق کیلئے ثناء پڑھنے کا حکم

۶)۔فتاویٰ عثمانی (۱/ ۴۲۰) عنوان: مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق۔

۷)۔احسن الفتاویٰ (۳/ ۳۸۲)

درج بالا فتاویٰ میں امداد الفتاویٰ اور کتاب الفتاویٰ کے علاوہ پانچوں مقامات پر سری نمازوں میں مسبوق کیلئے ثناء پڑھنے کا قول اختیار کیا گیا ہے البتہ ان دو میں مطلقاً انصات کے قول کو لیا گیا ہے۔

آخر میں مسک الختام کے طور پر امداد الفتاوی سے حضرت مولانا حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے دو فتاویٰ اس ذیل میں مکمل سوال وجواب کے ساتھ نقل کئے جارہے ہیں۔

عنوان: حکم ثناء وتعوذ درحق مسبوق

سوال: فتاویٰ اشرفیہ میں ایک شخص نے سوال مسبوق کے متعلق کیا کہ جماعت سے رہی ہوئی باقی رکعتیں کس طرح پوری کرے حضور نے جواب میں فرمایا کہ بعد سلام امام وہ مسبوق اٹھے اور ثناء وتعوذ بسم اللہ پڑھ کر الحمد وسورۃ پڑھے نیز بہشتی گوہر کے تتمہ میں حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسبوق کسی وقت یعنی بعد جماعت کے ثناء وتعوذ وبسم اللہ نہ پڑھے ثناء ساقط ہوگئی اس میں کیا مصلحت ہے؟

الجواب: معلوم ہوتا ہے آپ نے بہشتی زیور کے ضمیمہ کو بالکل نہیں سمجھا اور افسوس ہے کہ عبارت بھی اس کی بعینہ نقل نہیں کی اپنی طرف سے غلط سمجھ کر خلاصہ نکال کر نقل کردیا ایسا تصرف نقل میں گناہ بھی ہے میں نے جو ثناء کا نہ پڑھنا لکھا ہے تو امام کے ساتھ شریک ہونے کی حالت میں لکھا ہے یعنی نہ نیت باندھ کر پڑھے اور نہ امام کی قراءت کے وقفات میں پڑھے یہ کہاں لکھا

ہے کہ جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو تب بھی نہ پڑھے سائل نے اس کو پوچھا ہی نہیں۔"

(امداد الفتاویٰ ۱/ ۴۰۳)

دوسرا فتویٰ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا اس ذیل میں یہ ہے:

سوال: مسبوق رکعات جہریہ وخفیہ میں ثناء وتعوذ وتسمیہ تینوں پڑھے یا نہیں اور جب بعد فراغت کے اپنی بقیہ رکعتیں ادا کرنے کیلئے کھڑا ہو تو اس وقت ثناء وتعوذ وتسمیہ تینوں پڑھے یا صرف تعوذ وتسمیہ پر قناعت کرے جو کچھ فرق اس مسئلے کے متعلق رکعات جہریہ وسریہ میں ہو مطلع فرمائیے گا۔

الجواب: فی الدر المختار قبل باب الاستخلاف۔ والمسبوق منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ وإن قرأ مع الإمام لعدم الاعتداد بها لکراهتها۔ اس روایت سے دو امر مستفاد ہوئے ایک یہ کہ مسبوق امام کے ساتھ ثناء وتعوذ وتسمیہ نہ پڑھے دوسرے یہ کہ بعد فراغ امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو سب چیزیں اور قراءت پڑھے اور جہری وسری اس حکم میں دونوں برابر ہیں لا طلاق الدلیل۔ واللہ تعالیٰ اعلم (امداد الفتاویٰ ۱/ ۴۰۳)

لہٰذا صورت مسئولہ میں یہی قول عقلاً ونقلاً راجح معلوم ہوتا ہے کہ سری اور جہری کسی نماز میں مسبوق بوقت شرکت ثناء نہ پڑھے تمام دلائل اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ درج کردیئے گئے ہیں آخر میں آپ کے سوالوں کے بالترتیب جواب یہ ہیں:

۱)۔ استماعِ قرآن تو صرف جہری نمازوں میں واجب ہے سری میں نہیں کیونکہ سری میں تلاوتِ قرآن جہراً نہیں تو استماع (سننا) ممکن نہیں البتہ انصات (خاموش رہنا) راجح اور مشہور قول کے مطابق دونوں (جہری اور سری) میں واجب ہے لہٰذا مسبوق کے ثناء پڑھنے سے وہ متاثر ہوگا۔

۲)۔ ثناء پڑھنے کے جواز سے قراءت خلف الامام فی السریہ کے جواز کے قیاس کا اشکال ہم پر وارد نہیں ہوتا جن حضرات نے سری نمازوں میں ثناء کے جواز اور انصات کے مسنون ہونے کا قول کیا ہے یہ اشکال ان پر وارد ہوتا ہے ہمارے نزدیک ثناء پڑھنے سے واجب انصات متاثر ہو رہا ہے لہٰذا ثناء نہ پڑھی جائے۔

۳)۔ یہ بات بھی قابلِ تفکر ہے کہ مسبوق نے جب بعد از سلام امام کے ثناء پڑھنی ہی ہے تو ابھی ثناء پڑھنا بے محل ہے۔

۴)۔ ایسا شخص جو مسبوق تو نہ ہو لیکن پہلی رکعت میں امام کی قراءت شروع کرنے کے بعد اس کی شمولیت ہو وہ بھی ثناء نہیں پڑھے گا اگرچہ اسے قضاء کا موقع نہیں ملے گا لیکن ثناء نہ پڑھنے سے صرف ایک مستحب کا ترک لازم آرہا ہے جبکہ ثناء پڑھنے کی صورت میں واجب انصات میں خلل واقع ہو رہا ہے۔

۵)۔ تاتارخانیہ وغیرہ میں موجود جہری نمازوں میں بھی سکتات وغیرہ میں ثناء پڑھ لینے کا قول مخدوش ہے کیونکہ جہری نمازوں میں بھی مسبوق کا ثناء پڑھنا صرف انصاتِ واجب ہی میں مخل نہیں بلکہ استماعِ واجب (سننے) میں بھی مخل ہے یعنی یہاں تو دو واجب استماع (سننا) اور انصات (خاموش رہنا) دونوں میں خلل آرہا ہے لہٰذا اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

لما فى عمدة القارى:(١٤/٦) وقال النووي وهذا يؤيد وجوب قراءة الفاتحة على المأموم ومعناه اقرأها سرا بحيث تسمع نفسك قلت هذا لا يدل على الوجوب لأن المأموم مأمور بالإنصات لقوله تعالى وأنصتوا (الأعراف) والإنصات الإصغاء والقراءة سرا بحيث يسمع نفسه تخل بالإنصات فحينئذ يحمل ذلك على أن المراد تدبر ذلك وتفكره ـ

وفى المحيط البرهانى (١٣٣/٢) كتاب الصلاة: إذا انتهى إلى الإمام وقد سبقه الإمام بشيء من صلاته، هل يأتي بالثناء؟ فهذا على وجوه: الأول: إذا أدركه في حالة القيام في الركعة الاولى اوفى الثانية؟ وفي هذا الوجه كان القاضي الإمام أبو علي النسفي رحمه الله يحكي عن استاذه الشيخ الإمام أنه كان يقول: لا يأتي بالثناء، قال: وقال غيره من أصحابنا رحمهم الله يأتي، وذكر شيخ الإسلام المعروف بخواهر زاده رحمه الله: أنه إن كانت الصلاة صلاة يخافت فيها بالقراءة يأتي بالثناء لا محالة؛ لأنه لو لم يأت بالثناء إنما لا يأتي، كيلا يفوته الاستماع، فإذا كانت الصلاة مما يخافت فيها بالقراءة لا يلزمه الاستماع والثناء ذكر مقصود بنفسه، فيأتي به.

فإن قيل: ان كان لا يفوته الاستماع متى اشتغل بالثناء، فإنه يفوت فريضة الإنصات قلنا: الإنصات إنما يفرض حالة استماع القراءة لأن الاستماع إنما يتحقق بالإنصات، والاستماع فرض فما لا يتحقق الاستماع إلا به يصير فرضاً تبعاً له، فأما في حالة غير الاستماع فالإنصات إنما شرع سنيته تعظيماً لامر القراءة بقدر الإمكان لا سنّة مقصودة بنفسها، والثناء ذكر مقصود بنفسه فكان مراعاة الثناء أهم من مراعاة الإنصات. فإن قيل: الإنصات فرض، وإن كان لا يستمع القراءة حتى سقطت عن المقتدى القراءة التي هي ركن في الصلاة لأجل الإنصات.

قلنا: القراءة ما سقطت عن المقتدي لمكان الإنصات، لكن إنما سقطت لأن قراءة الإمام جعلت قراءة له متى شارك الإمام في القيام الذي هو محل قراءة الإمام. ألا ترى أنه متى أدركه في حالة الركوع صار مدركاً لهذه الركعة، وإن لم يوجد منه إنصات لقراءة الإمام؛ لأنه شاركه في القيام، فجعل قراءة الإمام له قراءة لمشاركته في القيام، فأما ثناء الإمام لم يجعل ثناء من المقتدي، فإذا لم يشتغل بالثناء يفوته الثناء أصلاً، وأما إذا كانت صلاة يجهر فيها بالقراءة إن أدرك الإمام في الركعتين الأخريين، فكذلك الجواب يشتغل بالثناء لأن الإمام يخافت بالقراءة في الأخريين. وإن كان في الركعتين الأوليين، فقد اختلف فيه المشايخ، منهم من يقول: يشتغل بالثناء، ومنهم من يقول: لا يشتغل بالثناء، بل يستمع القراءة، وإليه كان يميل

الشیخ الإمام أبو بکر محمد بن الفضل وهو الأصح،

وفی اعلاء السنن (١٠٢/٤) النهی عن القراءة خلف الامام: وظنی ان اقوی المسالك فی المسئلة هو ماروی عن محمد واختاره بعض المشایخ الاعلام وهو وان کان ضعیفا روایة فهو قوی درایة وبه یجتمع الآثار المرویة کلها فی هذا الباب ولما جوز محمد القراءة فی السریة فارجوان تجوز عنده فی الجهریة ایضا فی حالة السکتات اذا وجدها الماموم لعدم الفرق بینهما قال العلامه الشهیر والعابد الکبیر شیخ وقته واوانه مولانا شیخ رشید احمد الکنکوهی فی رسالة سبل الرشاد بالهندیة ماتعریبه: واما ما ثبت فی المرفوعات او الموقوفات من اباحة قراءة الفاتحة للمقتدی فهو رخصة للخواص المراعین للسکتات ...... وقال فی ردالمحتار قضیة المتن الاتیان بالثناء فی المخافتة وان بدأالامام بالقراءة ...... قلت وهذا یوید ماروی عن محمد من استحسان قراءة الماموم فی السریة فان امر القراءة اهم من الثناء فلما جاز الاتیان به فی السریة مع اشتغال الامام بالقراءة فاولی ان یجوز الاتیان بها ایضا وما ذکره الشامی من الفرق بین الثناء والقراءة ناقلا عن الذخیرة بما نصه وعدم قراءة الماموم فی غیر حالة الجهر لالوجوب الانصات بل لان قراءة الامام له قراءة واما الثناء فهو سنة مقصودة لذ اتها۔ففیه ان غایة ما یستفاد منه الفرق بینهما بالاستحباب وعدمه لا بالجواز وعدمه لان حدیث قراءة الامام قراءة للمقتدی لایدل علی منع الماموم عن القراءة بل علی جواز اکتفاء بقراءة الامام والمفید للمنع انما هو الامر بالانصات فحسب وقد اعترف المجیب بعدم وجوبه فی السریة ...... فالحق ان القول بجواز قراءة الماموم فی السریة لازم علی من جوز الاتیان بالثناء فیها وکذا بجوازها فی سکتات الجهریة علی من جوزه فیها فافهم۔

وفی الکبیری (٢٩٧): وروی عن الفقیه ابی جعفر الهندوانی انه قال اذا ادرك الامام فی الفاتحة یثنی بالاتفاق وان ادرکه فی السورة یثنی عند ابی یوسف لا عند محمد ذکره فی الذخیرة وهو بعید اذ لا فصل فی قوله تعالی واذا قریء القرآن فاستمعوا له الآیة،بین الفاتحة وغیرها بل الأصح انه لا یأتی به مطلقا لاطلاق النص۔

وفی تبیین الحقائق (٣٣٨/١): حظ المقتدی الانصات وقراءة الامام وقع عنهما فیجزیه ولهذا یجزیه اذاکان مسبوقابالاجماع۔الاستماع والانصات فرض بالنص وهوعام فی جمیع اوقات القراءة وقال الشلبی تحت هذه العبارة (٣٨٨/١) : (والانصات فرض بالنص الی آخره) یعنی قوله تعالیٰ

''وَإِذَا قُرِىءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا '' والانصات لا یخص الجھریة لانہ عدم الکلام لکن قیل انہ السکوت للاستماع لا مطلقا وحاصل الاستدلال بالآیة ان المطلوب امران الاستماع والسکوت فیعمل بکل منھما والاول یخص الجھریة والثانی لا فیجری علی اطلاقہ فیجب السکوت عند القراءة مطلقا۔

وفی الدر المختار(۴۸۸/۱)(إلا إذا) شرع الإمام في القراءة سواء (كان مسبوقا) أو مدركا (و) سواء كان (إمامه يجهر بالقراءة) أو لا (فإنه) (لا يأتي به) لما في النهر عن الصغرى أدرك الإمام في القيام يثني ما لم يبدأ بالقراءة وقيل في المخافتة يثني ۔

وتحته فی الشامیة:قوله (لما في النهر إلخ) تعليل لتحويل الشارح عبارة المصنف لأن قضية المتن الإتيان بالثناء في المخافتة وإن بدأ الإمام بالقراءة وهو ضعيف لتعبير الصغرى عنه بقيل ووجهه أنه إذا امتنع عن القراءة فبالأولى أن يمتنع عن الثناء وأقول ما ذكره المصنف جزم به في الدرر ۔ وقال في المنح وصححه في الذخيرة وفي المضمرات وعليه الفتوى ا هـ ۔ ومشى عليه في منية المصلي والشارح في الخزائن وشرح الملتقى ۔ واختاره قاضيخان حيث قال ولو أدرك الإمام بعدما اشتغل بالقراءة قال ابن الفضل لا يثني وقال غيره يثنی۔ وينبغي التفصيل إن كان الإمام يجهر لا يثني وإن كان يسر يثني ا هـ ۔ وهو مختار شيخ الإسلام خواهر زاده۔ وعلله في الذخيرة بما حاصله أن الاستماع في غير حالة الجهر ليس بفرض بل يسن تعظيما للقراءة فكان سنة غير مقصودة لذاتها وعدم قراءة المؤتم في غير حالة الجهر لا لوجوب الإنصات بل لأن قراءة الإمام له قراءة ۔ وأما الثناء فهو سنة مقصودة لذاتها وليس ثناء الإمام ثناء للمؤتم فإذا تركه يلزم ترك سنة مقصودة لذاتها للإنصات الذي هو سنة تبعا بخلاف تركه حالة الجهر اهـ فكان المعتمد ما مشى عليه المصنف فافهم ۔[1]

---

[1] مسئلے کے مزید حوالے درج ذیل ہیں:

(۱)فیض الباری:(۲۷۲/۲) (۲)فتح الملہم:(۲۵۴/۳) (۳)فتح القدیر:(۳۴۲/۱)
(۴)خانیة:(۴۲/۱) (۵)مراقی الفلاح:(۲۸۱) (۶)تبیین الحقائق:(۳۳۸/۱)
(۷)حاشیة الشلبی علی التبیین(۲۸۹/۱) (۸)ملتقی البحر(۱۴۲/۱) (۹)تاتارخانیة(۱۹۵/۲)
(۱۰)منحة الخالق علی حاشیة البحر الرائق(۵۴۰/۱) (۱۱)طحطاوی علی الدر(۲۱۸/۱) (۱۲)ھندیة(۹۰/۱)۔

(۹۸) رکوع وغیرہ میں ترک رفع یدین افضل ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں اکثر رفع یدین کے متعلق لوگوں کے درمیان جھگڑا رہتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع یدین مسنون ہے رکوع وغیرہ میں، اور بعض کہتے ہیں کہ ترک رفع یدین مسنون ہے۔ شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... خیر القرون سے لے کر دور حاضر تک رکوع وغیرہ میں رفع یدین اور ترک رفع یدین کے متعلق اختلاف چلا آرہا ہے دونوں طریقے مسنون ہیں لہٰذا جس فریق کے نزدیک جو راجح طریقہ ہے اس کو سنت سمجھ کر اختیار کرے، رفع یدین کو شرارت اور جھگڑے کا ذریعہ نہ بنائے کہ رفع یدین کو اختیار کر کے دوسرے فریق کی نمازوں کو فاسد بتائے۔ تاہم علماء احناف کے نزدیک قرآن وحدیث کی نصوص سے ترک رفع یدین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۷۳): والرفع قبل التكبير هو الاصح هكذا فی الهداية وهكذا تكبيرات القنوت وصلوة العيدين ولايرفعهما فی تكبيرة سواها كذا فی الاختيار شرح المختار فلو رفع عندنا لاتفسد صلوته علی الصحيح۔

وفی الشامية(۱/۵۶۳): واما الاقتداء بالمخالف فی الفروع كالشافعی فيجوز مالم يعلم منه مايفسد الصلاة علی اعتقاد المقتدی عليه الاجماع... ذهب عامة مشايخنا الی الجواز اذا كان يحتاط فی موضع الخلاف والا فلا والمعنی انه يجوز فی المراعی بلا كراهة وفی غيره معها ثم المواضع المهملة للمراعاة ان يتوضأ من الفصد والحجامة والقئ والرعاف ونحو ذلك لافيما هو سنة عنده مكروه عندنا كرفع اليدين فی الانتقالات وجهر البسملة واخفائها۔

(۹۹) حالت رکوع میں "الصاق کعبین" کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک چیز کے بارے میں متردد ہوں وہ یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ کی حالت میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کے ملا کر رکھنے کا کیا حکم ہے اب اس کے متعلق فتاوی شامیہ میں میں نے یہ عبارت پڑھی ہے:

(تنبيه) تقدم فی الركوع انه يسن الصاق الكعبين ولم يذكروا ذلك فی السجود وقدمنا انه ربما يفهم منه ان السجود كذالك اذا لم يذكروا تفريجهما بعد الركوع فالأصل بقاؤهما هنا كذلك تأمل۔ شامی(۱/۵۰۴)

اسی طرح طحطاوی میں ہے ''ویسن الصاق الکعبین فی الرکوع والسجود'' (طحطاوی علی الدرا/۲۲۰)
اب مذکورہ بالا عبارت سے رکوع اور سجدہ میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے، جبکہ آج تک کسی معتبر عالم دین سے یہ مسئلہ نہیں سنا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ الصاق الکعبین سنت ہے یا نہیں ہے مذکورہ بالا عبارات کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا یا نہیں؟ براہِ مہربانی میرے اشکال کو حل فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں ذکر کی گئی عبارت سے اگرچہ رکوع وسجود میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون معلوم ہوتا ہے لیکن درج ذیل وجوہ کی بنا پر اس عبارت کے مطابق فتویٰ نہیں دیا جائے گا لہٰذا راجح اور صحیح قول یہی ہے، کہ رکوع وسجود میں الصاق کعبین مسنون نہیں ہے۔

(۱)......پہلی وجہ الصاق الکعبینؒ کے مسنون نہ ہونے کی یہ ہے کہ جمہور فقہاء کرام نے اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ متون وشروح کی معتبر کتب جیسے قدوری، کنز، ہدایہ، بنایہ، فتح القدیر وغیرہ اسی طرح دیگر کتبِ معتبرہ میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲)......صرف متاخرین کی چند کتب میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر ملتا ہے ان کے بارے میں بھی یہ صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے صاحب مجتبیٰ کی اتباع میں لکھا ہے اور اس مسئلے کو فقہاء نے صاحب مجتبیٰ کے اوہام میں سے قرار دیا ہے۔

(۳)......متاخرین کی کتب میں اعلاء السنن (۳/۱۰، ۴۳) میں رکوع وسجود دونوں میں الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا قول کیا گیا ہے جبکہ خود مصنفؒ نے امداد الاحکام (۱/۴۷۷) میں فتویٰ اس کے برعکس دیا ہے یعنی الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر کوئی صحیح وصریح روایت دال نہیں ہے۔ لہٰذا جب مصنف کا اپنا فتویٰ روایت کے مخالف ہے تو ان کی اعلاء السنن والی عبارت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۴)......امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار (صفحہ ۱۶۶) میں بذریعہ نظر کے الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کی تردید کی ہے۔

(۵)......جب تطبیق وتخفیذ بالاتفاق منسوخ ہو گئے تو اب الصاق الکعبین کو مسنون قرار دینا بظاہر بہت مشکل ہے اور خشوع کے خلاف ہے اسی بات کی طرف طحطاوی علی الدر میں اشارہ کیا گیا ہے اس عبارت میں قولہ والصاق کعبیه) حالة الرکوع هذا ان تیسر له والا کیف تیسیر له علی الظاهر۔ (طحطاوی ا/۲۱۳) الغرض مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر راجح یہی ہے کہ الصاق الکعبین رکوع و سجود میں مسنون نہیں ہے۔

لمافی الصحیح للبخاری(۱/۱۰۹): عن ابی یعفور قال سمعت مصعب بن سعد صلیت الی جنب أبی فطبقت بین کفی ثم وضعتهما بین فخذی فنهانی ابی وقال کنا نفعله فنهینا عنه وامرنا ان نضع ایدینا علی الرکب۔

وفی مصنف ابن أبی شیبة (۲/۱۱۰): عن ابی عبیدة قال: خرج عبدالله من داره الی المسجد واذا رجل یصلی صافاً بین قدمیه فقال عبدالله اماهذا فقد اخطأ السنة ولو راوح بین قدمیه کان احبّ إلی۔

وفی تقریرات الرافعی (۶۱/۱): (قول الشارح ویسن ان یلصق کعبیه) قال الشیخ ابو الحسن السندی الصغیر فی تعلیقته علی الدر هذه السنة انما ذکرها من ذکرها من المتأخرین تبعاً للمجتبیٰ ولیس لها ذکر فی الکتب المتقدمة کالهدایة وشروحها و کان بعض مشایخنا یری أنها من اوهام صاحب المجتبیٰ ولم ترد فی السنة علی ماوقفنا علیه وکأنهم توهموا ذالك مما ورد أن الصحابة کانوا یهتمون بسدّ الخلل فی الصفوف حتی یضمون الکعاب والمناکب ولا یخفی ان المرادهنا الصاق کعبه بکعب صاحبه لاکعبه مع کعبه الاخر۔قلت ولعل الشیخ أبا الحسن لحظ الی الآثار الواردة فی ان التراوح بین القدمین فی الصلوۃ مطلقا افضل من الصاقهما اھ۔

(۱۰۰) اگرامام جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو پھر کیا کرے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی امام رکوع میں جاتے وقت یا سجدہ سے اٹھتے وقت جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو اب وہ مقتدیوں کو کس طرح متنبہ کرے گا آیا دوبارہ تکبیر کہے گا یا کوئی اور طریقہ اپنائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورتِ مسئولہ میں امام صاحب کو چاہیئے کہ جب بھولی ہوئی تکبیر یاد آ جائے تو مقتدیوں کو متنبہ کرنے کیلئے دوبارہ جہراً تکبیر کہہ دے۔

لمافی التاتارخانیة(۷۲۰/۱): ولو ترك تکبیرات الرکوع والسجود وتسبیحاتهما فلا سهو فیهما۔

وفیه ایضا(۴۳۵/۲)لو شك هل کبر ؟قیل ان کان فی الرکعة الاولی یعید التکبیر وان کان فی الرکعة الثانیة لا یعید۔

وفی رد المحتار(۲/۱): (قوله وتسمیع) أی اذا ترکه الامام لایترك المؤتم التحمید۔

(۱۰۱) ”سمع اللہ لمن حمدہ ربنالک الحمد“ کے ساتھ کچھ کلمات بڑھا کر پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام مسجد فرض نماز میں رکوع کے بعد قیام میں سمع اللہ لمن حمدہ ربنالک الحمد کے بعد حمداً کثیر أطیباً مبار کاً فیه پڑھتا ہے تو ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کرنے سے ایک رکن کی زیادتی ہوتی ہے اور اس پر سجدہ سہو لازم ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں اور اس امام کا اس طرح کرنے سے نماز میں کوئی اثر تو واقع نہیں ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سوال میں مذکورہ کلمات حدیث سے ثابت ہیں۔احناف کے ہاں یہ منفرد کیلئے ہیں۔لہٰذا امام کو چاہیے کہ مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے یہ کلمات نہ پڑھے البتہ اگر یہ کلمات پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی شرح الكبير(ص۳۱۸): (وان كان المصلى مقتديا) فانه (يأتى بالتحميد) بان يقول اللّٰهم ربنا ولك الحمد او اللّٰهم ربنا لك الحمد او ربنا ولك الحمد او ربنا لك الحمد وافضليتها على ترتيبها كذا فى الكافى۔

وفيه ايضاً(ص۳۱۶): (ولا ينبغى للامام ان يطيل التسبيح) أو غيره (على وجه يمل به القوم) اذا اتى بقدر السنة (لانه) اى التطويل المذكور (سبب التنفير) عن الجماعة (وانه) اى التنفير عن الجماعة (مكروه) لانه مؤد الى حرمان المسلمين الثواب الموعود على الصلوة بالجماعة۔

وفى الدر المختار(۵۶۴/۱): يكره تحريما(تطويل الصلاة) على القوم زائدا على قدر السنة فى قرائة وأذكار رضى القوم أو لا لإطلاق الأمر بالتخفيف نهر وفى الشرنبلالية ظاهر حديث معاذ أنه لايزيد على صلاة أضعفهم مطلقا ولذا قال الكمال إلا لضرورة...اھ

(۱۰۲)رکوع سجدہ میں تسبیح پڑھنے کی مسنون مقدار نیز نماز میں درودِ ابراہیمی کی جگہ کوئی دوسرا مختصر درود پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے رکوع اور سجود میں عام طور پر کم از کم تین بار سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جاتا ہے اگر کوئی شخص جلدی میں ہو تو کیا وہ صرف ایک بار یہ تسبیح پڑھ سکتا ہے، کیا اس کی نماز ہوجائے گی نماز میں زیادہ سے زیادہ کتنی بار تسبیح پڑھی جائے گی؟ نماز کی آخری رکعت میں نمازی سلام پھیرنے سے پہلے تین دعائیں پڑھتا ہے پہلے التحیات پھر درود ابراہیمی اور آخر میں ایک دعا، ان امور کے جواب مطلوب ہیں:

(i) کیا آخر میں جو دعا پڑھتا ہے وہ مخصوص ہے یا علماء نے جو چند بتائی ہیں ان میں سے کوئی ایک پڑھ سکتا ہے؟

(ii) اگر ایک شخص جلدی میں ہے تو نماز مختصر کرنے کی نیت سے وہ آخری دعا نہیں پڑھتا اور درود ابراہیمی کے بعد سلام پھیر لیتا ہے کیا اس کی نماز درست ہے؟

(iii) اگر کوئی شخص جلدی کی وجہ سے پورا درود ابراہیمی کے بجائے صرف **اللھم صلّ علی محمد وبارک وسلّم** پڑھ لے تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......رکوع اور سجدے میں تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے سے سنت کی ادائیگی ہوجاتی ہے جبکہ منفرد کیلئے کمالِ سنت یہ ہے کہ رکوع اور سجدے میں تسبیح سات یا نو دفعہ پڑھے، البتہ امام تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے پر اکتفا کرے اگر مقتدیوں کے اُکتا جانے کا اندیشہ ہو، نیز رکوع یا سجدے میں اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ تسبیح پڑھتا ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے لیکن نماز ہوجائے گی۔

(i) آخری قعدہ میں درود شریف پڑھنے کے بعد ہر ایسی دعا پڑھ سکتے ہیں جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو، کوئی خاص دعا متعین نہیں البتہ وہ دعا جو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی جو کہ صحیح بخاری شریف (۱/۱۱۵) میں بھی موجود ہے اس کے پڑھنے کا معمول بنالینا بہتر ہے وہ دعا یہ ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً کَثِیْراً وَّ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

(ii) آخری قعدہ میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے جبکہ درود شریف اور اس کے بعد دعا کا پڑھنا مسنون ہے، آخر میں دعا کا ترک کردینا مکروہ ہے، لیکن نماز ہوجائے گی تاہم اگر کوئی عذر ہو جیسا کہ بیماری وغیرہ تو پھر کوئی حرج نہیں۔

(iii) مذکورہ درود شریف پڑھ لے تو بھی نماز ہوجائے گی البتہ درود ابراہیمی پڑھنا بہتر ہے جو کہ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی الشامية(۱/۴۹۴): (قوله كره تنزيها) أى بناء على أن الامر بالتسبيح للاستحباب بحر... والحاصل أن فى تثليث التسبيح فى الركوع والسجود ثلاثة اقوال عندنا، ارجحها من حيث الدليل الوجوب تخريجا على القواعد المذهبية، فينبغى اعتماده كما اعتمد ابن الهمام ومن تبعه رواية وجوب القومة والجلسة والطمانينة فيهما كمامر وأما من حيث الرواية فالأرجح السنية لأنها المصرح بها فى مشاهير الكتب وصرحوا بأنه يكره أن ينقص عن الثلاث وان الزيادة مستحبة بعد أن يختم على وترخمس أو سبع أو تسع مالم يكن اماما فلا يطول وقد منا فى سنن الصلاة عن أصول أبي اليسر أن حكم السنة أن يندب الى تحصيلها ويلام على تركها مع حصول اثم يسير، وهذا يفيد أن كراهة تركها فوق التنزيه وتحت المكروه تحريما، وبهذا يضعف قول البحران الكراهة هنا للتنزيه لانه مستحب وان تبعه الشارح وغيره فتدبر۔

وفى الهداية(۱/۱۱۵): ودعا بما يشبه الفاظ القرآن والادعية المأثورة لما روينا من حديث ابن مسعود۔

وفى الهندية (۱/۷۶): ومن الادعية المأثورة ماروى عن أبي بكر رضى الله عنه انه قال لرسول الله ﷺ علمنى دعاء أدعو به فى صلاتى فقال قل اللهم انى ظلمت نفسى ظلما كثيرا وانه لا يغفر الذنوب الا أنت فاغفرلى مغفرة من عندك وارحمنى انك أنت الغفور الرحيم۔

وفى الشامية(۱/۶۵۳): (قوله وترك كل سنة ومستحب) السنة قسمان: سنة هدى وهى المؤكدة۔ وسنة زوائد۔ والمستحب غيره وهو المندوب، اوهما قسمان وقد يطلق عليه سنة. وقدمنا تحقيق ذلك كله فى سنن الوضوء۔ قال فى البحر عند قوله وعلى بساط فيه تصاوير: الحاصل أن

السنة ان كانت مؤكدة قوية لايبعد كون تركها مكروها تحريما، وان كانت غير مؤكدة فتركها مكروه تنزيها، وأما المستحب او المندوب فينبغي أن يكره تركه أصلا... الخ۔

وفی الشامية (۱/۵۱۲): (قوله وصل على النبی ﷺ) قال فی شرح المنية: والمختار فی صفتها مافی الكفاية والقنية والمجتبى قال: سئل محمد عن الصلاة على النبی ﷺ فقال يقول: اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد، وبارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد وهی الموافقة لمافی الصحيحين وغيرهما الخ۔

(۱۰۳) سجدہ میں زمین پر پاؤں رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ سجدہ میں سات اعضاء کا زمین پر لگنا ضروری ہے جن میں پاؤں بھی شامل ہیں۔ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ان کے دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوهاب......جن حضرات کے حالتِ سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں ان کی نماز درست نہیں ہوتی اس لئے کہ وضع القدمین واجب ہے البتہ دونوں پاؤں میں سے کسی ایک کا کوئی جز بقدر تسبیحہ واحدہ رکھنا صحت صلاۃ کیلئے کافی ہے، پس اگر پورے سجدہ میں بقدر ایک تسبیح کے دونوں پاؤں میں سے کسی کا کوئی جز زمین پر رکھ لیا تو واجب ادا ہو جائے گا اگر اتنی مقدار بھی نہیں رکھا تو ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ واضح رہے کہ صرف ایک قدم کو زمین پر بغیر عذر رکھنا مکروہ ہے۔

لمافی شرح العينی (۱/۳۰): الخامس السجود لقوله تعالىٰ اركعوا واسجدوا وفی حاشية العينی السجود بجبهته وقدميه ووضع اصبع واحدة شرط۔

الخامس تعديل الاركان وهو تسكين الجوارح فی الركوع والسجود حتى تطمئن مفاصله وادناه مقدار تسبيحة وفی حاشية العينی ای تسكين الجوارح فی الركوع والسجود بقدر تسبيحة۔

وفی فتح القدير (۱/۳۰۵): وأما افتراض وضع القدم فلأن السجود مع رفعهما بالتلاعب أشبه منه بالتعظيم والاجلال، ويكفيه وضع اصبع واحدة وفی الوجيز وضع القدمين فرض فإن وضع إحداهما دون الاخرى جاز ويكره۔

وفی الشامية (۱/۴۴۷): لو لم يضع شيئاً من القدمين لم يصح السجود۔

وفی الدرالمختار (۱/۴۶۴) (وتعديل الاركان) أی تسكين الجوارح قدر تسبيحة فی الركوع

والسجود وكذا فی الرفع منهما۔

وفی الشامية(۱/۵۰۴): وان ابن اميرحاج رجح فی الحلية الثانية وصرح هنا بأن توجيه الاصابع نحو القبلة سنة فثبت ماقدمناه من ان الخلاف السابق فی اصل الوضع لافی التوجيه وأن التوجيه سنة عندنا قولا واحداً... ويؤيد ماقلناه أن المحقق ابن الهمام قال فی زاد الفقير ومنها: ای من سنن الصلاة توجيه اصابع رجليه الی القبلة الخ۔

(۱۰۴) مقتدی نے ابھی رکوع یا سجدہ کی تسبیحات ختم نہیں کیں کہ امام نے سر اٹھالیا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی نے ابھی تین تسبیحات پوری نہیں پڑھی تھیں کہ امام نے رکوع سے یا سجدے سے سر اٹھالیا تو مقتدی ساتھ ہی سر اٹھائے یا تین تسبیحات پوری کرنے کے بعد اُٹھائے؟

الجواب بعون الملك الوهاب......صورت مسئولہ میں مقتدی پر تین تسبیحات پوری کرنی ضروری نہیں بلکہ امام کی متابعت ضروری ہے اس لئے کہ امام کی متابعت فرض ہے۔

لمافی قاضيخان(۱/۴۷): ولو رفع الامام رأسه من الركوع او السجود قبل ان يسبح المقتدی ثلاثاً تكلموا فيه والصحيح انه يتابع الامام لأن متابعة الامام فرض فلا يتركها بالسنة...الخ۔

وفی الهندية(۱/۹۰): ولو رفع الامام رأسه من الركوع أو السجود قبل ان يسبح المقتدی ثلاثاً الصحيح انه يتابع الامام...الخ۔

(۱۰۵) فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورت ملانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر نمازی فرض میں تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اگر کوئی سورۃ ملالے تو آیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملك الوهاب......فرض نماز کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الأخريين الفاتحة والسورة لايلزمه السهو وهو الأصح۔

وفی الدر المختار(۱/۵۱۱): (واكتفی) المفترض (فيما بعد الأولیين بالفاتحة) فإنها سنة علی الظاهر ولوزاد لابأس به۔

وفی الشامية تحته : (قوله ولو زاد لابأس) أی لو ضمّ اليها سورة لابأس به لأن القرائة فی

الأخريين مشروعة من غير تقدير۔

(۱۰۶) قعدہ اولیٰ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قعدہ اولیٰ میں بیٹھنا واجب ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگایا ہے وہ کہتا ہے کہ سنت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......قعدہ اولیٰ واجب ہے۔آپ کے دوست کو مغالطہ ہوا ہے اور اس طرح بلاتحقیق شرعی احکام کو بیان نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے معاشرے میں دینی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

وفی الهندية(۷۱/۱): وتجب القعدة الاولیٰ قدر التشهد اذا رفع راسه من السجدة الثانية فی الركعة الثانية فی ذوات الاربع والثلاث هو الاصح هكذا فی الظهيرية۔

وفی الدر المختار (۴۶۵/۱):(والقعود الاوّل) ولوفی نفل فی الأصح وكذا ترك الزيادة فيه على التشهد وأراد بالأول غير الاخير۔

(۱۰۷) تشہد میں اشارہ بالسّبابہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک امام صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز کے اندر تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی سنن أبي داؤد(۱۴۲/۱): عن عبدالله بن الزبير انه ذكر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم كان يشير باصبعه اذا دعا ولا يحركها۔

وفی الدر المختار(۵۰۸،۵۰۹/۱): وشيخ الاسلام الجد وغيرهم انه يشير لفعله عليه الصلاة والسلام ونسبوه لمحمد والامام بل فی متن درر البحار وشرحه غرر الاذكار المفتی به عندنا انه يشير باسطا اصابعه كلها وفی الشرنبلالية عن البرهان الصحيح انه يشير بمسبحته وحدها يرفعها عند النفی ويضعها عند الاثبات واحترز بالصحيح عما قيل لايشير لانه خلاف الدراية والرواية وبقولنا بالمسبحة عما قيل يقعد عند الاشارة وفی العينی عن التحفة الاصح انها مستحبة۔

وفی الشامية (۵۰۹/۱): وفی القهستانی: وعن اصحابنا جميعاً انه سنة فيحلق ابهام اليمنی ووسطها

ملصقا رأسها برأسها ويشير بالسبابة فهذه النقول كلها صريحة بان الاشارة المسنونة انما هي على كيفية خاصة الخ۔

(۱۰۸)''اشارہ بالسبابۃ فی الصلوٰۃ''عندالاحناف مکروہ ہے یا سنت؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احادیث مبارکہ سے نماز کے اندر تشہد کی حالت میں انگلی سے اشارہ کرنے کا جواز بلکہ سنیت واضح طور پر ثابت ہے اور احناف رحمہم اللہ بھی اس کے قائل ہیں لیکن احناف پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ''خلاصہ کیدانی'' والے نے اس کو مکروہ لکھا ہے، پھر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف معلوم نہیں لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے مگر سوال یہ ہے کہ فتاویٰ سراجیہ نے بھی ''اشارہ بالسبابہ'' کو مکروہ لکھا ہے، چنانچہ لکھا ہے (صفحہ:۱۱): ویکرہ ان یشیر بالسبابة فی الصلوة عندقوله''اشهدان لا إله الا الله''وهو المختار۔

اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا احناف کی دیگر کتابوں میں بھی اس طرح حوالہ ملتا ہے یا نہیں، اگر ہے جیسا کہ فتاویٰ سراجیہ میں ہے تو احناف کی دیگر کتابوں نے اس کا کوئی جواب یا رد لکھا ہے یا نہیں؟ فقط وفقکم اللہ تعالیٰ

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں فتاویٰ سراجیہ کے علاوہ احناف کی دیگر کتابوں میں بھی نماز کے اندر حالت تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنے کی کراہت کا قول موجود ہے۔لیکن ائمہ احناف کے متاخرین حضرات (علامہ عینی، علامہ ابن ہمام، علامہ سید احمد طحطاوی، علامہ شامی رحمہم اللہ) اس کے رد میں فرماتے ہیں کہ کراہت کا قول روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں مفتی بہ قول جواز اور سنت کا ہے۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی(ص۲۶۹): (و) تسن (الاشارة فی الصحيح) لانه ﷺ رفع اصبعه السبابة وقد أحناها شيئا ومن قال انه لا يشير أصلا فهو خلاف الرواية والدراية۔

وقال الطحطاوی رحمه الله تحته: (قوله فهو خلاف الرواية) لانه روی عن عدة اخبار منها ما أخرجه ابن السكن فی صحيحه عن ابن عمر...... (قوله والدراية) لان الفعل يوافق القول فكما ان القول فيه النفی والاثبات يكون الفعل كذلك

وفی الشامية(۵۰۹/۱): وعن كثير من المشائخ لايشير اصلا وهو خلاف الدراية والرواية فعن محمد ان ما ذكر فی كيفية الاشارة قول أبی حنيفة ومثله فی فتح القدير۔ وفی القهستانی: وعن اصحابنا جميعا انه سنة ...... وهذا ما اعتمده المتأخرون لثبوته عن النبی ﷺ بالاحاديث الصحيحة ولصحة نقله عن ائمتنا الثلاثة فلذا قال فی الفتح ان الأول خلاف الدراية والرواية۔

وفی الموطا للامام محمد(ص۱۰۸): عن علی ابن عبدالرحمن المعاوی انه قال رانی عبد الله بن عمر

وانا اعبث بالحصى فى الصلوة فلما انصرفت نهانى وقال اصنع كما كان رسول الله ﷺ يصنع فقلت كيف كان رسول الله ﷺ يصنع قال كان رسول الله ﷺ اذا جلس فى الصلوة وضع كفه اليمنى على فخذه اليمنى وقبض اصابعه كلها واشارباصبعه التى تلى الابهام ووضع كفه اليسرى على فخذه اليسرى قال محمد وبصنيع رسول الله ﷺ ناخذ وهو قول ابى حنيفة رحمه الله۔

وفى حاشية للامام الهمام ابى الحسنات محمد عبدالحى اللكنوى۔

(قوله وهو قول ابى حنيفة)... وقد ذكر ابن الهمام فى فتح القدير والشمنى فى شرح النقاية وغيرهما انه ذكر ابو يوسف رحمه الله فى الامالى مثل ما ذكر محمد فظهر ان اصحابنا الثلثة اتفقوا على تجويز الاشارة لثبوتها عن النبى ﷺ واصحابه بروايات متعددة وطرق متكثرة لا سبيل الى انكارها ولا الى ردها وقد قال به غيرهم من العلماء حتى قال ابن عبدالبر انه لا خلاف فى ذلك والى الله المشتكى من صنيع كثير من اصحابنا من اصحاب الفتاوى كصاحب الخلاصة والبزازية والكبرى و العتابية والغياثية والولوالجية وعمدة المفتى والظهيرية وغيرها حيث ذكروا ان المختار هو عدم الاشارة بل ذكر بعضهم انها مكروهة والذى حملهم على ذلك سكوت ايمتنا عن هذه المسالة فى ظاهر الرواية ولم يعلموا انه قد ثبت عنهم بروايات متعددة ولا انه ورد فى احاديث متكثرة فالحذر الحذر من الاعتماد على قولهم فى هذه المسالة مع كونه مخالفا لما ثبت عن النبى ﷺ واصحابه بل وعن ايمتنا ايضاً بل لوثبت عن ايمتنا التصريح بالنفى وثبت عن رسول الله ﷺ واصحابه الاثبات لكان فعل الرسول واصحابه احق والزم بالقبول فكيف وقد قال به ايمتنا ايضاً۔

(۱۰۹) تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ

سوال......کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ تشہد میں انگلی اٹھانے کی کیفیت ،طریقہ اوراسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر اسکو ہلاتے رہنا چاہیئے یانہیں؟ نیز کب اٹھانا چاہیئے اور کب رکھنا چاہیئے؟ آخر میں یہ بھی بتادیں کہ یہ طریقہ کسی حدیث شریف میں مذکور ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نمازی کلمہ شہادت پر پہنچتے وقت چھنگلی اوراس سے ملحقہ انگلی بند کرلے اوردرمیانی انگلی کا انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنا کرشہادت کی انگلی ''لاالہ'' پراٹھائے اور''الا اللہ'' پرچھوڑ دے مگر حلقہ کی ہیئت کوآخر تک باقی رکھے......مذکورہ بالاطریقہ سنت ہے اور یہ طریقہ ابن ماجہ کی حدیث (ص ۶۵) اورابوداؤد کی حدیث (۱/ ۱۴۲)

میں مذکور ہے۔ نیز انگلی کو اٹھانے کے بعد ہلاتے رہنا مکروہ ہے، جو کہ نماز کے اندر سکون و وقار کے خلاف ہے جبکہ نماز میں سکون مطلوب ہے۔

لمافی سنن ابي داؤد(۱/۱۴۲):عن عبدالله بن الزبيرانه ذكرأن النبی ﷺ كان يشيرباصبعه اذا دعا ولا يحركها۔

وفی اعلاء السنن(۳/۱۱۲):قال الطحطاوی فی حاشيته علی مزاقی الفلاح:قوله،وتسن الاشارة،أی من غيرتحريك فانه مكروه عندنا۔

وفی رسائل ابن عابدين(۱/۱۳۴): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه على فخذيه ثم عند وصوله الى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والإبهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفی وواضعا لها عند الاثبات ثم يستمر علی ذلك الخ۔

(۱۱۰) تشہد میں انگلیوں کا حلقہ کب تک بنائے رکھا جائے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے یہ کس وقت تک رکھنا چاہیئے، اشهد ان محمد عبده ورسوله پر ختم کردینا چاہیئے یا اخیر سلام تک رکھنا چاہیئے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملك الوهاب......حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے وہ تشہد کے بعد اخیر سلام تک اسی طرح برقرار رکھنا چاہیئے۔

لمافی رسائل ابن عابدين(۱/۱۲۷): وروی عن أئمتنا الثلاثة ابي حنيفة وابي يوسف ومحمد انه يشير عند التشهد وانه يعقد اصابعه علی مامر من اختلاف الكيفية وظاهر كلامهم انه لا ينشرها بعد العقد بل يبقيها كذلك لان المذكور فی هذه الرواية العقد ولم يذكروا النشر بعده، ورجح المتأخرون هذه الرواية لتأيدها بالمروی عن نبی الله ﷺ۔

وفی رسائل ابن عابدين(۱/۱۳۴): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه على فخذيه ثم عند وصوله الى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والابهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفی وواضعاً لها عند الاثبات ثم يستمر علی ذلك لانه ثبت العقد عند الاشارة بلاخلاف ولم يوجد أمر بتغييره فالأصل بقاء الشئ على ماهو عليه واستصحابه الى اخر أمره۔

(۱۱۱) شہادت کی انگلی نہ ہونے کی صورت میں دوسری انگلی سے اشارہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو تشہد میں شہادت کے دوران کونسی انگلی اٹھائے گا یا نہیں اٹھائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو وہ تشہد میں شہادت کے وقت کوئی دوسری انگلی نہ اٹھائے۔

لمافی الفقه الاسلامی(۷۱۵/۱): بحيث تكون رؤوس أصابعهما على الركبتين ورفع الاصبع السبابة من اليمنى فقط عند الشهادة فى التشهد۔

وفى حاشية الطحطاوى(۲۲۴/۱): (قوله أنه يشير) بيان لما فى قوله ماصححه۔(قوله المفتى به عندنا أنه يشير) اى بمسبحته اى وحدها۔

وفى الدر المختار(۵۰۹/۱): الصحيح أنه يشير بمسبحته وحدها يرفعها عند النفى ويضعها عند الاثبات۔

قال الشامى تحته: (قوله بمسبحته وحدها) فيكره أن يشير بالمسبحتين كما فى الفتح وغيره۔

(۱۱۲) امام مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے قبل سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تراویح میں امام کے پیچھے تراویح پڑھی جاتی ہے جب التحیات پر بیٹھتے ہیں تو پیچھے والے درود تک پڑھتے ہیں اور امام صاحب سلام پھیر دیتے ہیں یہ پورا کرنا چاہیئے یا امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیئے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اس صورت میں آپ کو امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیئے۔

وفى الهندية (۹۰/۱): ولو سلم الامام قبل ان يفرغ المقتدى من الدعاء الذى يكون بعد التشهد أو قبل أن يصلى على النبى ﷺ فانه يسلم مع الامام۔

(۱۱۳) مقتدی کا التحیات کے شروع میں اور ہر رکن میں بسم اللہ پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل عشاء کی نماز میں میرے برابر ایک معمر نمازی تھے۔ جب امام صاحب نے قعدۂ اولیٰ کیا تو انہوں نے التحیات الخ پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی، کیا اس طرح کرنے سے نماز میں کچھ حرج تو نہیں ہوتا؟ اور ہر رکن میں اگر بسم اللہ پڑھی جائے تو شرعاً یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مذکورہ صورت میں معمر شخص کی نماز درست ہے اور اس پر مقتدی ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو بھی

نہیں، البتہ رکوع، سجود اور تشہد کے شروع وغیرہ میں جو قرأت کا محل نہ ہو، قرأت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ اس سے تاخیر واجب یا تاخیر رکن لازم آتا ہے جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ بسم اللہ صرف ہر رکعت کے شروع میں سنت ہے اور ہر رکن میں اس کا پڑھنا کہیں بھی ثابت نہیں لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۷): وذكر هنالك اذا بدأ في موضع التشهد بالقرائة ثم تشهد فعليه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقراءة فلا سهو عليه۔

وفی الشامية(۲/۸۱): (قوله وتأخير قيام الخ) أشار إلى أن وجوب السجود ليس لخصوص الصلاة على النبي ﷺ بل لترك الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا فاصل حتى لوسكت يلزمه السهو كما قدمناه في فصل اذا أراد الشروع، قال المقدسي وكما لوقرأ القرآن هنا أو في الركوع يلزمه السهو مع أنه كلام الله تعالىٰ، وكما لو ذكر التشهد في القيام مع أنه توحيد الله تعالىٰ۔

(۱۱۴) نماز کے درود میں لفظِ سیدنا کا اضافہ اور مختلف ارکان میں دعائیں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ محمد سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا درست ہے؟ نیز ادعیہ ماثورہ جو کہ مختلف ارکان میں پڑھی جاتی ہیں کیا فرضوں میں ان کا پڑھنا درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ ''محمد'' اور لفظ ''ابراہیم'' (علیہما الصلاۃ السلام) سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا افضل ہے اور ادعیہ ماثورہ فرض نماز کے مختلف ارکان میں امام کو نہ پڑھنا چاہیئے اس لئے کہ امام کو تخفیف (ہلکی) نماز پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے البتہ منفرد کیلئے ان ادعیہ ماثورہ کا نماز کے مختلف ارکان میں پڑھنا درست ہے چاہے نماز فرض ہو یا نفل۔

لمافی الهندية (۱/۸۷): وينبغي للإمام أن لايطول بهم الصلاة بعد القدر المسنون وينبغي له أن يراعي حال الجماعة هكذا في الجوهرة النيرة۔

وفی الطحطاوی (۱/۲۲۶): (قوله وندب) يحتمل أن يقرأ بصيغة المصدر عطفاً على فاعل صح أو بصيغة المجهول وظاهر الشرح طلبها في نبينا و أبيه الخليل عليهما الصلاة والسلام لاشتراكهما فيها وصيغة الصلاة على هذا ''اللهم صل على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما صليت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انك حميد مجيد وبارك على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما باركت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انك حميد مجيد وترحم على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما ترحمت على سيدنا ابراهيم وعلى آل

سیدنا ابراهیم فی العالمین انك حمید مجید ولا يخفى أن هذه الزيادة مستحبة حلبى بزيادة (قوله لان زيادة الاخبار) الاولى حذف زيادة (قوله نقله الرملى) فيه أنه ليس من أهل المذهب۔

وفی الدر المختار(۱/۵۱۴،۵۱۳): وندب السيادة لأن زيادة الاخبار بالواقع عين سلوك الأدب فهو أفضل من تركه ذكره الرملى الشافعى وغيره ومانقل لا تسودونى فى الصلاة فكذب و قولهم لا سيدونى بالياء لحن أيضا والصواب بالواو۔

وفی الشامية تحته : (قوله ذكره الرملى الشافعى) اى فى شرحه على منهاج النووى ونصه: والأفضل الإتيان بلفظ السيادة كما قاله ابن ظهيرية وصرح به جمع وبه أفتى الشارح لأن فيه الاتيان بما أمرنا به وزيادة الاخبار بالواقع الذى هو أدب فهو أفضل من تركه وإن تردد فى أفضليته الأسنوى، وأما حديث ''لاتسيدونى فى الصلوة' فباطل لا أصل له كما قاله بعض متأخرى الحفاظ وقول الطوسى إنها مبطلة غلط واعترض بأن هذا مخالف لمذهبنا لما مر من قول الإمام من أنه لوزادفى تشهده أو نقص فيه كان مكروهاً قلت فيه نظر فإن الصلاة زائدة على التشهد ليست منه نعم ينبغى على هذا عدم ذكرها فى وأشهد أن محمداً عبده ورسوله وأنه يأتى بها مع ابراهيم عليه السلام (قوله لحن أيضاً) اى مع كونه كذباً (قوله والصواب بالواو) لأنه واوى العين من ساديسود۔

(۱۱۵) نماز میں سلام پھیرنے کی کیفیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ نماز میں سلام پھیرتے وقت چہرہ قبلہ کی جانب ہو، اور دلیل میں ''تلقاء وجہہ'' والی روایت پیش کرتا ہے۔ آیا زید کا یہ قول درست ہے اگر نہیں تو سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... نماز میں سلام کی ابتداء چونکہ قبلہ رخ ہی ہوتی ہے اور یہی حال دوسرے سلام کا ہے، باقی راوی کا سلام کو تلقاء وجہہ سے تعبیر کرنا بیانِ حال کیلئے ہے کہ عموماً جیسے پہلا سلام کرتے وقت رخ قبلہ جانب ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے سلام میں بھی لفظ ''السلام علیکم'' کے وقت عموماً رخ خود بخود قبلہ جانب ہو جاتا ہے۔ نیز تکلفات میں پڑنا مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کیلئے اور یہ ایسا اختلافی مسئلہ بھی نہیں کہ صحت و فساد صلاۃ اس پر موقوف ہوں لہٰذا بحث و مباحثہ سے گریز کرنا بہتر ہے۔

لمافی معارف السنن(۳/۱۱۰): وتاوّل فيه بعض المتاوّلين بان البداءة كان به من تلقاء الوجه ممتداً به إلى اليمين و مثله ذكره فى الكوكب الدرى، ولا ادرى لمن هو؟ ولعله يريد ان المقصود

بیان کیفیة السلام هکذا لابیان العدد، والکیفیة هذه من ابتداء تلقاء الوجه وانتهائه فی جانب الیمین، ذکره فی المجموع والمغنی وهو المعمول به عندنا۔

(۱۱۶) دعا کرتے وقت ہاتھ کیسے اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ مطلقاً دعا کرتے وقت خواہ نماز کے بعد ہو یا تلاوت کے بعد جب بھی کوئی دعا مانگے تو ہاتھ کاندھوں تک سیدھے سامنے رکھے اور دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملالے، یہی طریقہ مسنون ہے، اس کے برعکس عمر کہتا ہے کہ ہتھیلیوں کو ملائے نہ رکھے بلکہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تین انگل کا فاصلہ رکھے، کونسا طریقہ صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بوقت دعا دونوں ہتھیلیوں کے درمیان فاصلہ مستحب اور راجح ہے لیکن دونوں ہاتھ ملا کر بھی دعا کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ دونوں طریقے منقول ہیں۔ ہم دونوں طریقوں سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔

حسب ذیل احادیث سے بوقت دعا دونوں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی تائید ہوتی ہے۔

لمافی مجمع الزوائد(۱۰/۱۶۹): عن انس بن مالک رضی الله عنه قال رفع رسول الله ﷺ یدیه بعرفة یدعو فقال اصحاب النبی ﷺ هذا الابتهال ثم حاصت الناقه ففتح احدی یدیه فاخذها وهو رافع الاخری رواه البزار والطبرانی فی الاوسط بنحوه الا انه قال فرفع یدیه فسقط زمام الناقه فتناوله ورفع یدیه وزاد هذا الابتهال والتفرع ورجال البزار رجال الصحیح غیر احمد بن یحییٰ الصوفی وهو ثقه ولکن لاعمش لم یسمع من انس رضی الله تعالیٰ عنه۔

وعن سلمان رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ مارفع قوم اکفهم الی الله عزوجل یسئلونه شیئاً الا کان حقا علی الله ان یضع فی ایدیهم ماسألوا قلت له حدیث فی السنن غیر هذا رواه الطبرانی ورجاله رجال الصحیح۔

وفی مرقاة المفاتیح(۵/۴۷): وقدوردانه ﷺ فی الدعا یوم عرفة جمع بین کفیه وجعلهما مقابل صدره کاستطعام المسکین(قال الحافظ نور الدین رحمه الله علیه فی مجمع الزوائد) ''رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه الحسین بن عبدالله بن عبید الله وهو ضعیف'' قال ملا علی قاری فی المرقاة (۵/۴۶) ان الضعیف حجة فی الفضائل اتفاقا۔

حسب ذیل عبارات سے فرجہ بین الیدین کے استحباب کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی(ص۲۵۷): وفی النهر من فعل کیفیته المستحبة ان یکون بین الکفین فرجة وان قلت الخ۔ لکن فی شرح الحصن الحصین والظاهر ان من الادب ایضا

ضم الیدین وتوجیه اصابعهما نحو القبلة وفی شرح المشکوۃ وردانه ﷺ یوم عرفة جمع بین کفیه فی الدعاء وان ارید بالضم فی الکلام القرب التام لا ینافی وجود الفرجة القلیلة، واما قوله جمع بین کفیه لاینا فیه ایضاً لان المعنی جمع بینهما فی الرفع ولم یفرد احدهما به۔

وفی الهندیة(۵/۳۱۸): والافضل فی الدعاء ان یبسط کفیه ویکون بینهما فرجة وان قلت... والمستحب ان یرفع یدیه عند الدعاء بحذاء صدره کذا فی القنیة۔

وفی الشامیة(۱/۵۰۷): (فیبسط یدیه) حذاء صدره (نحو السماء) لانها قبلة الدعاء ویکون بینهما فرجة ''وایضاً فی رد المحتار (قوله ویکون بینهما فرجة) أی وان قلت قنیة۔

(۱۱۷) مردوں اور عورتوں کی نمازوں میں فرق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک قاری صاحب فرماتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے طریقہ نماز کی طرح نماز پڑھ سکتی ہیں۔ تو کیا اس قاری صاحب کی بات درست ہے؟ یا عورتوں اور مردوں کے طریقہ نماز میں فرق ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... احادیث مبارکہ اور عبارات فقہ کی رو سے مردوں اور عورتوں کی نمازوں میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر عورتوں کی نماز مردوں سے مختلف ہے۔ مثلاً (۱)۔ تکبیر تحریمہ کے وقت عورتیں کاندھوں تک ہاتھ اٹھائیں گی۔ جبکہ مرد کانوں تک اٹھاتے ہیں۔ (۲)۔ عورتیں سینے پر ہاتھ باندھیں گی، جبکہ مرد زیرِ ناف باندھتے ہیں۔ (۳)۔ رکوع میں عورتوں کیلئے مکمل جھکنا ضروری نہیں جبکہ مرد خوب جھکتے ہیں۔ (۴)۔ سجدے میں عورتوں کیلئے رانوں کو پیٹ سے اور ہاتھوں کو بغلوں سے ملانے کا حکم ہے جبکہ مرد جدا رکھتے ہیں۔ (۵)۔ قعدہ میں عورتیں سرین کے بل بیٹھیں گی جبکہ مرد بائیں پاؤں پر بیٹھتے ہیں۔ (۶)۔ اسی طرح عورتیں الگ جماعت نہیں کرا سکتیں اگر کرالیں تو ان کی امام کو صف اول کے بیچ میں ہی کھڑا ہونا ہوگا۔

الحاصل...... عورتیں نماز میں وہ طریقہ اختیار کریں گی کہ جو حالت ستر کے زیادہ قریب ہو۔

لمافی الشامیة(۱/۵۰۴): (قوله وحررنا فی الخزائن الخ) وذلك حیث قال تنبیه ذکر الزیلعی أنها تخلف الرجل فی عشر وقد زدت اکثر من ضعفها۔ ترفع یدیها حذاء منکبیها۔ ولا تخرج یدیها من کمیها۔ وتضع الکف علی الکف تحت ثدیها۔ وتنحنی فی الرکوع قلیلا ولا تعقد ولا تفرج فیه أصابعها بل تضمها وتضع یدیها علی رکبتیها ولا تحنی رکبتیها۔ وتنضم فی رکوعها وسجودها۔ وتفترش ذراعیها۔ وتتورك فی التشهد وتضع فیه یدیها تبلغ رؤوس أصابعها رکبتیها۔ وتضم فیه أصابعها۔ واذا نابها شیئ فی صلاتها تصفق ولا تسبح۔ ولا تؤم الرجل وتکره جماعتهن ویقف

الامام وسطهن ویکرہ حضورھا الجماعة وتؤخر مع الرجال ولا جمعة علیھا۔ لکن تنعقد بھا۔ ولا عید ولا تکبیر تشریق۔ ولا یستحب أن تسفر بالفجر ولا تجھر فی الجھریة بل لو قیل بالفساد بجھرھا لامکن بناء علی ان صوتھا عورة۔

(۱۱۸) عورتوں کی نماز کے طریقے کا احادیث سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ حنفی عورتیں جس طرح نماز پڑھتی ہیں اس کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر اس طریقے کا ثبوت احادیث سے ہے تو ان احادیث کو پیش کریں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......بعض لوگوں کا حنفی عورتوں کی نماز کے طریقے پر اعتراض کرنا کہ یہ طریقہ احادیث سے ثابت نہیں، درست نہیں ہے اس لئے کہ حنفی عورتوں کی نماز کا طریقہ احادیث طیبہ سے ثابت ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں نماز میں ہاتھ سینے کے برابر اٹھاتی ہیں جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۴۲۱) میں علامہؒ نے روایت ذکر کی ہے: عن عبد ربه بن زیتون قال رأیت ام الدرداء ترفع یدیھا حذو منکبیھا حین تفتتح الصلوة... الخ اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اعلاء السنن کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے اور صراحتاً اس سے ہاتھوں کا سینے کے برابر اٹھانا ثابت ہو رہا ہے، عن وائل بن حجر رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ یا ابن حجر اذا صلیت فاجعل یدیک حذاء اذنیک والمرأة تجعل یدیھا حذاء ثدیھا، (اعلاء السنن، ۲/۱۸۱، بحواله مجمع الزوائد)

اسی طرح عورت کی نماز میں سب سے زیادہ ستر کا خیال رکھا جاتا ہے لہٰذا جو طریقہ سب سے زیادہ ستر کا باعث ہو، اسی کے مطابق پڑھے یہ طریقہ کنز العمال کی روایت سے ثابت ہے عن ابن عمر رضی الله عنه مرفوعاً اذا جلست المرأة فی الصلوة وضعت فخذھا علی فخذھا الاخریٰ فاذا سجدت الصقت بطنھا فی فخذیھا کاستر مایکون لھا، (کنز العمال، ۷/۵۴۹) یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس طریقہ کے مطابق نماز میں ستر زیادہ ہو عورت اسی طرح سے نماز پڑھے، اس وجہ سے نماز میں ہاتھ باندھتے وقت بھی اس کا خاص خیال رکھا جائے گا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت سینے کے اوپر ہاتھ رکھے چنانچہ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں، فقلنا به فی ھذہ الحالة فی حق الرجل بخلاف المرأة فانھا تضع علی صدرھا لانه استر لھا فیکون فی حقھا أولیٰ... الخ۔ (اعلاء السنن، (۲/۱۹۹) لہٰذا اس صورت میں استر یہ ہے کہ عورت حالت قیام میں ہاتھ سینے کے اوپر رکھے، مذکورہ روایت پر اسی صورت میں عمل کرنا ممکن ہے نیز مذکورہ روایت کی تائید روایت تصفیق سے بھی ہوتی ہے جس میں عورت کو تصفیق کا حکم ہے جیسا کہ جامع الترمذی کی صحیح روایت میں ہے: عن ابی ھریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ التسبیح للرجال والتصفیق للنساء... الخ (جامع الترمذی، (۱/۸۵) اس حکم کی علت اور بناء ستر پر ہے کہ عورت ہر حال میں ستر کا لحاظ کرے گی اس لئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ حالت رکوع میں بھی اس علت کی وجہ سے عورت زیادہ نہ جھکے گی اس لئے کہ زیادہ جھکنے کی

صورت میں ستر کا لحاظ نہیں ہوتا لہٰذا رکوع میں صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گی اور انگلیاں مردوں کی طرح کھول کر نہیں رکھے گی۔ قال العلامة ابن عابدین علیہ الرحمۃ (وإلصاق کعبیه) أی حیث لا عذر (قوله للرجل) ای سنة للرجل فقط وهذا قید للأخذ والتفریج لأن المرأة تضع یدیها علی رکبتیها وضعاً ولا تفرج أصابعها (ردالمحتار، ۱/۴۷۶، ط ایچ ایم سعید) اس عبارت سے عورت کے رکوع کی کیفیت استر معلوم ہوتی ہے۔ کنز العمال کی روایت میں بھی صراحت کے ساتھ منقول ہے، عن ابن عمر رضی اللہ عنہ... اذا سجدت... کاستر مایکون لها اس بناء پر اس کو استر طریقہ سے نماز کی پابندی کا حکم ہے۔

اسی طرح سجدہ بھی اس طریقہ سے کرے گی جس سے زیادہ ستر پوشی ہو مثلاً عورت اپنے پورے جسم کو سمیٹ لے اور جسم کے بعض اعضاء کو دوسرے اعضاء کے ساتھ ملا لے، کہنیوں کو پہلوؤں کے ساتھ اور رانوں کو پیٹ کے ساتھ ملا لے اور مرد کی طرح سجدہ نہ کرے جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے عن یزید بن ابی حبیب رضی الله عنه ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرّ علی امرأتین تصلیان فقال اذا سجدتما فضمّا بعض اللحم الی الأرض فإن المرأة لیست کالرجل (مراسیل أبی داؤد، ص ۸) اسی طرح روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور اعلاء السنن میں وارد ہے، عن الحارث عن علی رضی الله عنه قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذیها... (مصنف ابن ابی شیبة، ۲/۵۰۴، اعلاء السنن، ۳/۳۰) ان روایات سے معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے سے پہلے عورت اپنے کو پوری طرح سے سمیٹ لے گی اور پھر سجدہ کرے گی لیکن سجدہ کرنے سے پہلے دائیں ران کو بائیں ران پر رکھ کر پیروں کو ایک طرف نکال کر سجدہ کرے گی جیسا کہ کنز العمال کی روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ثابت ہے اذا جلست المرأة فی الصلوة وضعت فخذها علی فخذها الاخریٰ فاذا سجدت ألصقت بطنها فی فخذیها کاستر مایکون لها (کنز العمال، ۷/۵۴۹) اور اس کے مشابہ مضمون امام اعظم رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے، ابو حنیفة عن نافع عن ابن عمر رضی الله عنه أنه سئل کیف کن النساء یصلین علی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال کن یتربعن ثم امرن أن یحتفزن (مسند الامام اعظم، ۱/۷۳) اس سے ماقبل والے مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ عورتیں خوب سمٹ کر پردے کے ساتھ نماز پڑھیں اور پھر حالت تشہد میں عورت کو مرد کی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں بلکہ اپنے پاؤں کو دائیں طرف نکال کر بائیں سرین پر بیٹھ جائے سنن کبریٰ کی روایت میں مذکور ہے: عن أبی سعید الخدری رضی الله عنه صاحب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أنه قال... وکان یأمر الرجال أن یتجافوا فی سجودهم ویأمر النساء یتحفضن فی سجودهن وکان یأمر الرجال أن یفرشوا الیسری وینصبوا الیمنی فی التشهد ویأمر النساء أن یتربعن... الخ (السنن الکبری للامام البیهقی، ۲/۲۲۲) اس روایت میں عورت کو مرد سے مختلف نماز پڑھنے کا حکم ہے اور اسکی ہم معنی روایت مصنف ابن أبی شیبہ کی ہے عن خالد بن اللجلاج قال کن النساء یؤمرن أن یتربعن اذا جلسن فی الصلاة ولا یجلسن جلوس الرجال علی أوراکهن یتقی ذلک علی المرأة مخافة أن یکون منها الشئ۔ (مصنف ابن ابی شیبه، ۲/۵۰۶) ان احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ عورت حالت تشہد میں بائیں سرین پر بیٹھے گی اور پیروں کو دائیں طرف نکالے گی یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت کی نماز کا فرق جو احناف کرتے ہیں روایات سے ثابت ہے اور ان لوگوں

کا یہ کہنا کہ عورت کی نماز کا یہ طریقہ کسی حدیث سے ثابت نہیں غلطی پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر کی روایات سے معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

لمافی اعلاء السنن(۳۰/۳): عن علی رضی اللہ عنہ قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها . . .

وقال رحمه الله فی اعلاء السنن فی شرح حديث علی رضی الله عنه والقياس أيضا يقتضی مخالفة هيئة المرأة فی جلوسها وسجودها عن هيئة الرجال لكون مبنی احوالهن على التستر والاحاديث المذكورة مويدة له . . . الخ۔

وفی الهندية(۷۵/۱): والمرأة لا تجافی فی ركوعها وسجودها وتقعد على رجليها وفی السجدة تفترش بطنها على فخذيها . . . الخ۔

وفی الدرالمختار(۵۰۴/۱): (والمرأة تخفض) فلا تبدی عضديها(وتلصق بطنها بفخذيها) لانه استر وحررنا فی الخزائن انها تخالف الرجل فی خمسة وعشرين . . .

وفی الشامية: وتضع يديها على ركبتيها ولا تحنی ركبتيها وتنضم فی ركوعها وسجودها وتفترش ذراعيها . . . وذكر فی البحر انها لا تنصب اصابع القدمين . . . الخ۔

(۱۱۹) ٹوپی کیسی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوپی پہننے کا ثبوت اور بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز اور غیر نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوپی پہننا ثابت ہے یا نہیں؟ ٹوپی کس قسم کی ہونی چاہیئے؟ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا یعنی ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......حضور اقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے نماز اور غیر نماز میں ٹوپی اور عمامہ یعنی پگڑی کا پہننا ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپیاں تین طرح کی تھیں ایک وہ تھی جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تھی دوسری وہ تھی جو سر سے کسی قدر اونچی ہوتی تھی تیسری بڑی ٹوپی تھی جس میں کان بھی ڈھک جاتے تھے اور بغیر ٹوپی کے ننگے سر نماز پڑھنا خلافِ سنت ہے اس لئے ٹوپی پہننے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

لما فی شمائل الترمذی(ص۸): عن جابر قال دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم مكة يوم الفتح عليه عمامة سوداء۔

وفی الصحيح للبخاری(۵۶/۱):وقال الحسن كان القوم يسجدون على العمامة والقلنسوة ويداه فی كمه۔

وفی كنز العمال(۱۲۱/۷): كان يلبس قلنسوة بيضاء(طب عن ابن عمر)۔۔۔كان يلبس القلانس تحت العمائم وبغير العمائم ويلبس العمائم بغير القلانس وكان يلبس القلانس اليمانية

وهن ابيض المضرّبة ويلبس ذوات الآذان فى الحرب وكان ربما نزع قلنسوته فجعلها سترة بين يديه وهو يصلي الخ۔

وفى بذل المجهود (٥/٥٢): ولأبي الشيخ عن ابن عباس كان لرسول الله ﷺ ثلث قلانس الحديث۔

(۱۲۰) مسجد میں رکھی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ٹوپی نہ ہونیکی صورت میں مسجد میں پڑی ہوئی ٹوپی کا استعمال یا چھوٹا رومال سر پر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ان دونوں صورتوں سے بہتر ہے کہ ننگے سر نماز پڑھ لی جائے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی کو استعمال کرنا یا چھوٹا رومال سر پر رکھنا درست ہے البتہ اسکی عادت نہ بنائی جائے، اور آپ کے دوست کی بات درست نہیں ہے کیونکہ سر ڈھانپنا نماز کے آداب میں سے ہے۔

لمافى الشامية(١/٦٤١): (قوله ولا بأس به للتذلل) قال فى شرح المنية : فيه اشارة الى أن الاولى ان لايفعله وأن يتذلل ويخشع بقلبه فانهما من أفعال القلب وتعقبه فى الامداد بمافى التجنيس من أنه يستحب له ذالك لان مبنى الصلاة على الخشوع۔

(۱۲۱) ننگے سر نماز پڑھنے سے متعلق مکروہ تنزیہی اور تحریمی کی تحقیق

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ لوگ جب نماز کو آتے ہیں تو ٹوپی نہیں پہن کر آتے بلکہ مساجد میں جو پلاسٹک کی ٹوپیاں یا لکڑی کی چھال کی ٹوپی بنی ہوتی ہے وہ پہن لیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ تو اپنی جیب سے ناک صاف کرنے والا رومال باندھ لیتے ہیں کیا ایسی صورت میں نماز ہوجاتی ہے کیونکہ میں نے کسی دینی کتاب میں یہ بات پڑھی تھی کہ ان ٹوپیوں میں نماز نہیں ہوتی۔ براہ کرم جلد از جلد قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......سب سے پہلے چند امور قابل ذکر ہیں۔

(۱)۔اکثر فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو مطلق مکروہ کہا ہے۔

(۲)۔جب کبھی مطلق کراہت کا ذکر ہو تو اس سے مراد کراہت تحریمی ہوتی ہے الآیۃ کہ کراہت تنزیہی کی کوئی دلیل وہاں موجود ہو جیسا کہ الشامیہ(۱/ ۲۲۴) پر مذکور ہے کہ ''الکراھة حیث اطلقت فالمرادمنھا التحریم''

(۳)۔بعض فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو ازار واحد میں نماز پڑھنے پر قیاس کیا ہے جیسا کہ البحرالرائق (۲/ ۴۴) پر مذکور ہے ''وان

صلّی فی ازار واحدیجوز ویکره... و کذا مکشوف الرأس للتهاون و التکاسل "اورازار واحد میں نماز (باوجود قمیص یا چادر وغیرہ پر قدرت کے) مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی (صفحہ ۳۴۹) پر مذکور ہے"وصلاته فی السراویل اوفی ازار مع قدرته علی لبس القمیص لما فیه من التهاون و التکاسل۔وفی شرحه (لما فیه من التهاون هذا یفید کراهة التحریم "لہٰذا مقیس (ننگے سر نماز پڑھنا) بھی مکروہ تحریمی ہوگا۔

(۴)۔علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے الشامیہ(۱/ ۶۵۳) میں فرمایا ہے کہ اگر سنت،سنت مؤکدۃ قویۃ ہوتو اس کا ترک مکروہ تحریمی ہے اور سرڈھانپ کرنماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ ملتقی الابحر (۱/ ۱۰۸۔۱۰۹) پر ملاعلی قاری رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام کے علاوہ کبھی بھی ننگے سر نماز ادا نہیں فرمائی لہٰذا اس سے بھی ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۵)۔بعض فقہاء کی عبارات میں اس کی صراحت ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے جیسا کہ شرح الوقایۃ(۱/ ۱۶۸) کے حاشیۃ پر اور الفقہ الاسلامی وادلتہ(۲/ ۹۷۲) میں مذکور ہے لہٰذا عبارات مذکورہ کے پیش نظر اگر کبھی کبھار کسی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی گئی تو مکروہ تنزیہی ہوگی اور اگر ننگے سر نماز پڑھنے کو مستقل عادت بنالیا گیا ہو تو اس صورت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا نیز ٹوپی اچھی اور صاف ہونی چاہیئے اور ٹوپی نہ ہو تو مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز ادا کرنا درست ہے البتہ رومال وغیرہ سے سر باندھنے میں سر کا درمیانی حصہ چھپانا ضروری ہے وگرنہ اس صورت میں بھی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

لمافی شرح الوقایة (۱/۱۶۸): وصلاته حاسرا راسه للتکاسل او للتهاون بها۔ لیس المراد بالتهاون الاهانة بالصلاة فانها کفر بل المراد قلة رعایتها ومحافظة حدودها۔ و فی حاشیته (صلاته حاسرا راسه) والظاهر ان الکراهة ههنا تنزیهیة۔

وفی فتاوی سراجیة (ص۱۱): اذا صلی حاسر الرأس کره۔

وفی الشامیة (۱/۱۳۲): اذا ذکروا مکروهاً فلا بد من النظر فی دلیله فان کان نهیا ظنیا یحکم بکراهة التحریم الالصارف النهی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نهیا بل کان مفیداً للترك الغیر الجازم فهی تنزیهیة۔

وفی الشامیة (۱/۲۲۴): واعلم ان المکروه اذا اطلق فی کلامهم فالمراد منه التحریم الا ان ینص علی کراهة التنزیه۔ فقد قال المصنف فی المصفی: لفظ الکراهة عند الاطلاق یراد بها التحریم۔ قال ابو یوسف قلت لابی حنیفة: اذا قلت فی شئ اکرهه فما رأیك فیه؟ قال: التحریم۔

وفی الشامیة (۱/۶۵۲): (والاعتجار) لنهی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عنه، وهو شد الرأس او تکویر عمامته علی

راسه وترك وسطه مكشوفاً...... وكراهته تحريمية۔

وفى الشامية (۱/۶۵۳): ان السنة ان كانت مؤكدة قوية لا يبعد كون تركها مكروهاً تحريماً وان كانت غير مؤكدة فتركها مكروه تنزيهاً۔ واما المستحب او المندوب فينبغى ان يكره تركه اصلاً۔

(۱۲.۲) سلام کا کتنا لفظ کہنے سے نماز سے خارج ہوجائے گا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز سے خروج کے لئے السلام علیکم کہنا واجب ہے تو قابل دریافت امر یہ ہے کہ پورا اسلام کہنے سے نماز سے خارج ہوجاتا ہے یا نصف سلام یا اس سے بھی کم الفاظ کہنے سے نماز سے خارج ہوجاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......دائیں طرف سلام کرتے وقت لفظ ''السلام'' کے میم کے ختم ہوتے ہی نمازی نماز سے خارج ہوجاتا ہے۔

لمافى الطحطاوى على الدر (۱/۲۱۰): لفظ السلام مرتين فالثانى واجب على الاصح برهان دون عليكم وتنقضى قدوة بالاول قبل عليكم على المشهور وعليه الشافعية۔

وفى الدر المختار(۱/۴۶۸): (ولفظ السلام) مرتين والثانى واجب على الاصح برهان دون عليكم وتنقضى قدوة بالاول قبل عليكم على المشهور عندنا وعليه الشافعية

قال الشامى تحته: (قوله وتنقضى قدوة بالاول) اى بالسلام الاول قال فى التجنيس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل و اقتدى به قبل ان يقول عليكم لايصير داخلا فى صلاته۔

فصل فی الامامۃ والجماعۃ

(امامت اور جماعت کے مسائل کا بیان)

(۱۲۳) نابالغ کی امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹا بچہ بڑوں کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں، نیز چھوٹا بچہ اگر چھوٹے بچوں کی امامت کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... نابالغ بچے کی امامت بڑوں کیلئے مطلقاً ناجائز ہے چاہے فرائض ہوں یا نوافل بڑوں کی نماز ادانہ ہوگی البتہ اگر بچہ بچوں کی امامت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۵۵۰):وشروط الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء الاسلام والبلوغ والعقل والذكورة والقراء ة والسلامة من الاعذار...احترزبالرجال الاصحاء...عن الصبيان فلايشترط فی امامهم البلوغ۔

(۱۲۴) نابالغ بچہ کا نابالغ بچوں کی امامت کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مدارس میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ بچوں کو جب چھٹی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی جماعت کراتا ہے شرعی طور پر یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی امامت کراسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۵۷۸): وصح لو توضأعلى الانقطاع وصلى كذلك كاقتداء بمفتصد أمن خروج الدم وكاقتداء امرأة بمثلها وصبی بمثله ومعذور بمثله الخ۔

وفی الهندية(۱/۸۵): وامامة الصبی المراهق لصبيان مثله يجوز كذا فی الخلاصه اھ۔

وفی الشامية(۱/۵۷۷): واما غير البالغ فان كان ذكراً تصح امامته لمثله من ذكر وأنثى وخنثى اھ۔

(۱۲۵) ۱۶ سالہ لڑکے کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کا امام ہوں، اور الحمد للہ پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھاتا ہوں، میرا ایک بیٹا (عبدالحمید) ہے جس کی عمر سولہ، سترہ سال ہے اور وہ حافظ قرآن بھی ہے۔ کبھی کبھی میری عدم موجودگی میں وہ نماز پڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح ابھی رمضان میں آخری دنوں میں تراویح بھی اس نے پڑھائی تھی۔ میری مسجد کے بعض نمازی حضرات اس کی امامت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ابھی یہ چھوٹا ہے۔ آپ حضرات سے شریعت کی روشنی میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا میرا یہ بیٹا فرض نمازوں میں، میری عدم موجودگی میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس پر اعتراض درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے بیٹے (عبدالحمید) کو نماز کے ضروری مسائل سے بخوبی واقفیت ہے اور امامت سے متعلق کوئی قابل اعتراض بات اس میں نہیں پائی جاتی تو شرعاً اس کے لئے نماز کی امامت کرانا درست ہے اور نمازیوں کا بلاوجہ اس کی امامت پر اعتراض کرنا شرعاً درست نہیں۔

لما في الهندية (۸۶،۸۷/۱): رجل ام قوما وهم له كارهون ان كانت الكراهة لفساد فيه أولانهم أحق بالامامة يكره له ذلك وان كان هو أحق بالامامة لايكره هكذا في المحيط۔

وفي الشامية (۵۶۲/۱): (قوله وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر أنها تنزيهية أيضاً والظاهر أيضاً كماقال الرحمتي ان المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة... سئل العلامة الشيخ عبدالرحمن بن عيسى المرشدي عن شخص بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الانبات ولم ينبت عذاره فهل يخرج بذلك عن حد الأمردية وخصوصا قد نبت له شعرات في ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديري اللحى، فهل حكمه في الإمامة كالرجال الكاملين أم لا، أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبي من متأخري علماء الحنفية عن هذه المسألة فأجاب بالجواز من غير كراهة وناهيك به قدوة۔

(۱۲۶) غیر شادی شدہ شخص کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ہے جس کا تعلق اونچے خاندان سے ہے اور وہ درجہ سادسہ میں پڑھتے ہیں اور ان کے والد کا تعلق علماء اور مشائخ کے ساتھ ہے اور وہ طالب علم ایک بڑی جامع مسجد کے امام بھی ہیں لیکن وہ غیر شادی شدہ ہیں جس کی وجہ سے اکثر مقتدی اعتراض کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کے لئے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......شریعت میں امامت کیلئے امام کا اعلم بالسنة ہونا ضروری ہے (یعنی نماز کے مسائل پر عبور ہو کہ صحت نماز کیلئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کن چیزوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے وغیرہ) اسی طرح امام کا فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جیسا کہ واضح ہے کہ مذکورہ امام وہ درجہ سادسہ کے طالب علم ہیں تو یقیناً نہ صرف نماز کے مسائل پر بلکہ دیگر مسائل پر بھی انکو عبور حاصل ہوگا اور بظاہر وہ نیک و صالح بھی ہوں گے لہٰذا ایسے شخص کا نمازیں پڑھانا اور امامت کے منصب پر فائز ہونا جائز ہے اور مقتدیوں کا صرف ''غیر شادی شدہ'' ہونے کی بناء پر مذکورہ امام پر اعتراض کرنا صحیح نہیں۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۵۵): عن اوس بن ضمعج قال سمعت ابا مسعود الانصاری رضی الله عنه یقول قال رسول الله ﷺ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب الله فان کانوا فی القراء ة سواء فاعلمھم بالسنة فان کانوا فی السنة سواء فاقدمھم ھجرة فان کانوا فی الھجرة سواء فاکثرھم سنا ولا یؤم الرجل فی سلطانه ولا یجلس علی تکرمته فی بیته الا باذنه۔

وفی الھندیة(۱/۸۳): الاولی بالامامة اعلمھم باحکام الصلاة ھکذا فی المضمرات وھو الظاھر ھکذا فی البحر الرائق ھذا اذا علم من القراء ة قدرما تقوم به سنة القراء ة ھکذا فی التبیین ولم یطعن فی دینه کذا فی الکفایة وھکذا فی النھایة ویجتنب الفواحش الظاھرة وان کان غیرہ اورع منه کذا فی المحیط وھکذا فی الزاھدی وان کان متبحرا فی علم الصلاة لکن لم یکن له حظ فی غیرہ من العلوم فھوا ولی کذا فی الخلاصة۔

وفی الشامیة(۱/۵۵۷): (والاحق بالامامة)... (الاعلم باحکام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاھرة وحفظه قدر فرض(قوله باحکام الصلاة فقط) ای وان کان غیر متبحر فی بقیة العلوم وھو اولی من المتبحر کذا فی زاد الفقیر عن شرح الارشاد (قوله بشرط اجتنابه الخ) کذا فی الدارية عن المجتبی وعبارة الکافی وغیرہ: الاعلم بالسنة اولی الا ان یطعن علیه فی دینه لان الناس لا یرغبون فی الاقتداء به... وفی (ص۵۵۹) (ولو ام قوما وھم له کارھون، ان) الکراھة (لفساد فیه اولانھم احق بالامامة منه کرہ) له ذلك تحریما لحدیث ابی داؤد ''لایقبل الله صلاة من تقدم قوما وھم له کارھون (وان ھو احق لا) والکراھة علیھم۔

(۱۲۷) جس امام کی قرأت صحیح نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قرآن غلط سلط پڑھ رکھا تھا لیکن اللہ کی توفیق سے

چار ماہ لگائے اس میں قرآن بھی سیکھا جب واپس کالونی کی مسجد میں آیا تو اب امام صاحب کا قرآن غور سے سنا توان کی قرأت درست نہ تھی مثلاً اللہ اکبر کو (اَللّٰهوٗ آکبَر) کہتے ہیں اور الحمدللہ رب العلمین ٥ الرحمن الرحیم ٥ درمیان میں نہ وقف کرتے ہیں اور نہ ملا کر پڑھتے ہیں بلکہ ایک سانس میں پڑھتے ہیں اور الرحمن الف پر زبر کو ظاہر کرتے ہیں اور " اَلْعٰلَمِیْنَ کا زبر جو نون پر ہے کھا جاتے ہیں۔ کیا اس سے نماز میں خلل آتا ہے یا نہیں؟ ہم تو ۱۸ سال سے ان کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں گذشتہ نمازوں کا کیا حکم ہے؟ مہربانی فرمائی جائے کہ بندہ بہت زیادہ پریشان ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... امام ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید (وقف، وصل، تشدید، تخفیف وغیرہ) کو جانتا ہو، اور قرآن پاک کو صحیح پڑھ سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں جس امام صاحب کے پیچھے اب تک آپ نے نمازیں پڑھی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امام صاحب نے ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے نماز فاسد ہو جائے البتہ آئندہ کیلئے ان امام کے بجائے کسی ایسے امام کو مقرر اور متعین کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کو بھی صحیح پڑھ سکتا ہو۔

لمافی حاشية الطحطاوی(ص۲۷۹): قوله: (بلا مدّ) الحاصل ان المد فی التکبیر إما ان یکون فی لفظ الله او فی لفظ اکبر، فان کان فی لفظ الله فاما ان یکون فی اوله اوفی وسطه او فی آخره...

وان کان فی آخره بان اشبع حرکة الهاء فهو خطأ من حیث اللغة ولا تفسد به الصلاة، وکذا تسکینها کذا فی الحلبی۔

وفی الهندیة (۱/۸۱): (ومنها الوقف والوصل والابتداء فی غیر موضعها) اذا وقف فی غیر موضع الوقف أو ابتدأ فی غیر موضع الابتداء ان لم یتغیر به المعنی تغیرا فاحشا... لا تفسدبا لاجماع بین علمائنا هکذا فی المحیط۔ وکذا ان وصل فی غیر موضع الوصل کمالو لم یقف عند قوله أصحاب النار بل وصل بقوله الذین یحملون العرش لاتفسد...

وفی الدر المختار(۱/۴۸۰): (واذا أراد الشروع فی الصلاة کبر)... (للافتتاح)... (بالحذف) اذ مد احد الهمزتین مفسد وتعمده کفر وکذا الباء فی الاصح۔ وفی الشامیة تحته اعلم ان المد ان کان فی الله فاما فی اوله اووسطه او آخره... وان کان فی آخره فهو خطأ ولا یفسد ایضا، وقیاس عدم الفساد فیهما صحة الشروع بهما

وفی الشامیة(۱/۶۳۲): تحت (قوله أو بوقف وابتداء) قال فی البزازیة الابتداء ان کان لا یغیر المعنی تغیرا فاحشا لا یفسد...

وفی الهندیة(۸۳/۱): الاولیٰ بالامامة أعلمهم باحکام الصلوة هکذا فی المضمرات وهو الظاهر هکذا فی البحر الرائق، هذا اذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هکذا فی التبیین... فان تساووا فأقرؤهم ای اعلمهم بعلم القراءة یقف فی موضع الوقف ویصل فی موضع الوصل ونحو ذالك من التشدید والتخفیف وغیرهما کذا فی الکفایة۔

(۱۲۸)تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک کرنے والے کی امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ میں ایک امام صاحب ہیں جو تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں ان کے پاس عورتیں تعویذات کیلئے آتی رہتی ہیں اس امام صاحب کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بکثرت روکنے کے باوجود اس کام سے باز نہیں آ رہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جائز طریقہ سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جائز طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذریعے یا ایسے کلام کے ذریعے کیا جائے جس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں اور وہ عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں ہو جس کے معنی معلوم ہوں اور اس کو مؤثر بالذات سمجھنے کا اعتقاد نہ ہو بلکہ اسکا اعتقاد یہ ہو کہ مؤثر حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور تعویذ گنڈہ دوسرے اسباب کی طرح ایک سبب ہے جو نفع ونقصان دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے۔ لہٰذا جو امام صاحب جائز طریقہ سے تعویذ گنڈے کرتے ہوں ان کی امامت درست ہے البتہ نامحرم عورتوں کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، براہ راست تعویذ نہ دینا چاہیئے، بلکہ ان کے کسی محرم یا خاوند کے ذریعے ان کو تعویذ دینا چاہیئے۔

وفی الدر المختار(۳۶۳/۶): (فرع) فی المجتبی: التمیمة المکروهة ماکان بغیر العربیة۔

(وفی الشامیة تحته): ولاباس بالمعاذات اذا کتب فیها القرآن او اسماء الله تعالیٰ ویقال رقاه الراقی رقیا ورقیة اذا عوذه ونفث فی عوذته قالوا وانما تکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب، ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو کفر أو غیر ذالك، واما ما کان من القرآن او شی من الدعوات فلا باس به اھ۔

(۱۲۹)بریلویوں کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں بریلویوں کی مساجد ہیں، دیوبندیوں کی ذرا دور ہیں، توکیا ہم بریلویوں کی مساجد میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا محلے سے دور دیوبندیوں کے پیچھے جا کر نمازیں

پڑھیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایسا مبتدع امام جس کے عقائد کفریہ ہوں تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔اور اگر اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔صورت مسئولہ میں اگر بریلوی ایسے ہیں کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں تو ان کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی اور اگر ان کے عقائد کفریہ نہیں تو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔لہٰذا بریلویوں کی مساجد کے علاوہ دوسری مساجد دیوبندیوں کی ہیں ان میں جا کر نماز پڑھنا چاہیئے۔البتہ اگر آپ (کسی عذر کی وجہ سے) وہاں نہیں جاسکتے تو اکیلے نماز پڑھنے سے (ان بریلویوں کے پیچھے جن کے عقائد کفریہ نہیں) انکے پیچھے نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۵۰): والفاسق اذا كان يؤم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم يقتدى به فى الجمعة ولا يترك الجماعة بامامة وفى غير الجمعة يستقبل من ان يتحول الى مسجد آخر ولا ياثم بذلك ولوصلى خلف مبتدع اوفاسق فهو محرز ثواب الجماعة لكن لاينال مثل ما ينال خلف تقى۔

وفى الهندية(۱/۸۶): الفاسق اذا كان يؤم يوم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم يقتدى به فى الجمعة ولا تترك الجمعة بامامته وفى غير الجمعة يجوز ان يتحول الى مسجد آخر ولايأثم به۔

(۱۳۰) غیر مقلد کی امامت کا شرعی حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں سفر پر جا رہا تھا تو راستے میں ہم نے ایک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جو غیر مقلدین کی تھی تو کیا ہماری نماز غیر مقلد کے پیچھے صحیح ہوگئی یا دوبارہ اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......فقہاء کرام نے مخالف مذہب والے امام کی اقتداء کے بارے میں تمام کتب معتبرہ ومستندہ میں یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر مخالف مذہب والا امام (مثلاً غیر مقلد ہو) اگر وہ ان مسائل میں جو ہمارے علماء احناف اور ان کے مابین مختلف فیہا ہوں ان میں ہمارے اصول کی رعایت رکھتا ہو، مثلاً غیر سبیلین سے کسی شے کے خارج ہونے پر وضو کرتا ہو، کپڑوں پر بقدر درہم منی لگ جانے پر دھوتا ہو، خون کے نکلنے پر وضو کرتا ہو، تو اس صورت میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر رعایت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور آج کل کے غیر مقلدین کا ان مسائل میں ہمارے اصول کی رعایت نہ کرنا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا اب ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور احتیاطاً واجب الاعادہ ہے لہٰذا آپ نے جو نماز غیر مقلد امام کی اقتداء میں ادا کی ہے احتیاطاً اس نماز کا اعادہ کر لیجئے۔

لمافی الشامية(۱/۵۶۳): وأما الاقتداء بالمخالف فى الفروع كالشافعى فيجوز مالم يعلم منه مايفسد

الصلاة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع، انما اختلف فى الكراهة اهـ فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى فى رسالة [الاهتداء فى الاقتداء] لملاعلى القارى: ذهب عامة مشايخنا إلى الجواز اذا كان يحتاط فى موضع الخلاف والا فلا۔ والمعنى أنه يجوز فى المراعى بلا كراهة وفى غيره معها ثم المواضع المهملة للمراعاة ان يتوضأ من الفصد والحجامة والقئ والرعاف ونحو ذالك لا فيما هو سنة عنده مكروه عندنا كرفع اليدين فى الانتقالات وجهر البسملة واخفائها فهذا وأمثاله لايمكن فيه الخروج عن عهدة الخلاف فكلهم يتبع مذهبه ولا يمنع مشربه اهـ۔

وفى الفتاوىٰ الكبرىٰ لابن تيمية (۲/۲۸۵): يكونون فى وقت يقلدون من يفسده وفى وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوىٰ ومثل هذا لايجوز باتفاق الامة۔

(۱۳۱) جو شخص مرغ لڑاتا، نسوار اور سگریٹ استعمال کرتا ہو، اس کی امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نسوار کھاتا ہے اور سگریٹ کثرت سے پیتا ہے اور مرغ لڑاتا ہے تو ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں جبکہ وہ قاری ہے اور منزل بھی یاد ہے؟

جواب بعون الملک الوھاب......اگر کوئی امام نسوار یا سگریٹ استعمال کرتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ انکا استعمال ترک کردے اور اگر اس کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا مشکل ہو تو پھر جب بھی مسجد آئے تو نسوار اور سگریٹ کی بدبو کو زائل کر کے آئے کیونکہ حدیث میں بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا ہے اور اگر امام مرغ لڑاتا ہو تو اس کو اس سے بچنا چاہیئے کیونکہ مرغ لڑانا ناجائز ہے اور اسی طرح مرغ لڑانے پر جوا لگانے سے اس فعل کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے مرغ لڑانے اور اس پر جوا لگانے سے آدمی فاسق ہوجاتا ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

لمافى الشامية(۱/۵۵۹): (ويكره تنزيها الخ) لقوله فى الاصل امامة غيرهم احب الى، بحر عن المجتبىٰ والمعراج ثم قال فيكره لهم التقدم ويكره الاقتداء بهم تنزيها فان امكن الصلوة خلف غيرهم فهو افضل والا فالاقتداء اولى من الانفراد ... (ص۵٦۰) (قوله و فاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزانى وآكل الربا ونحوذلك كذا فى البرجندى اسمعيل وفى المعراج قال اصحابنا لاينبغى ان يقتدى بالفاسق الا فى الجمعة لانه فى غيرها يجد اماما غيره اهـ قال فى الفتح وعليه فيكره فى الجمعة اذا تعددت اقامتها فى المصرى على قول محمد المفتى به لانه بسبيل الى التحول۔

(۱۳۲) داڑھی پر سیاہ خضاب لگانے والے کی امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علما کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص داڑھی پر سیاہ خصاب لگا تا ہو تو اس کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے اور فاسق کا امام بنانا مکروہ ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اس فعل کو چھوڑ کر توبہ نہیں کرتا تو اس کو امام نہ بنایا جائے بلکہ کسی متقی شخص کو امامت کیلئے منتخب کرنا چاہیئے۔

لمافی الهنديه(۳۵۹/۵): أما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلك من الغزاة ليكون اهيب فی عين العدوّ فهو محمود منه اتفق عليه المشايخ ومن فعل ذلك ليزين نفسه للنساء وليحبب نفسه اليهن فذلك مكروه وعليه عامة المشايخ۔وبعضهم جوز ذلك من غير كراهة۔ وروی عن أبي يوسف أنه قال: كما يعجبني ان تتزين لی يعجبها أن أتزين لها۔

وفی الشامية(۷۵۶/۶): ومذهبنا استحباب خضاب الشيب للرجل والمرأ ة بصفرة أوحمرة۔ وتحريم خضابه بالسواد علی الاصح۔

وفی التاتارخانية (۶۰۳/۱): ويكره ان يكون الامام فاسقا... وفی الكافی: وان تقدم الفاسق جاز... يجوز الاقتداء بمن كان معروفا بأكل الربا ولكن يكره۔

(۱۳۳) مسجد کا مقرر شدہ امام امامت کیلئے حقدار ہے یا دوسرا شخص؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مسجد میں کوئی بڑا عالم دین اور بزرگ بھی آ جائے تو نماز کون پڑھائے، امامِ مسجد یا مذکورہ بزرگ؟ بعض مقتدیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ مذکورہ بزرگ نماز پڑھائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مسجد کا جو مقرر امام ہے وہی مستحق ہے کہ امامت کرائے اگر چہ آنے والا بزرگ اور بڑا عالم کیوں نہ ہو۔

لمافی الدر المختار والشامية (۵۵۹/۱): واعلم أن صاحب البيت ومثله امام المسجد الراتب اولیٰ بالإمامة من غيره مطلقا۔ (قوله مطلقا) ای وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه۔

وفی الهندية(۸۳/۱): دخل المسجد من هو أولیٰ بالإمامة من إمام المحلة فإمام المحلة اولیٰ كذا فی

القنية۔

(۱۳۴) امامت میں وراثت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جہاں پر ایک امام کے مرنے پر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے، اس کے مرنے پر پھر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے اور اکثر بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے، تو کیا امامت میں اس طرح کی وراثت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......امامت میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ بانی مسجد اور محلہ والے جس کو بھی امام بنائیں وہی امام ہوگا، چاہے وہ امام کا بیٹا ہو یا کوئی اور ہو، بشرطیکہ اس میں امامت کی شرائط اور صلاحیت موجود ہو۔

لمافی الهندية(۱/۸۳): الاولی بالامامة أعلمهم بأحكام الصلاة هكذا فی المضمرات وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة قدرما تقوم به سنة القراءة هكذا فی التبيين ولم يطعن فی دينه كذا فی الكفاية وهكذا فی النهاية ويجتنب الفواحش الظاهرة وان كان غيره اورع منه كذا فی المحيط وهكذا فی الزاهدی وان كان متبحرا فی علم الصلاة لكن لم يكن له حظ فی غيره من العلوم فهو أولیٰ كذا فی الخلاصة فان تساووا فاقرء هم أی اعلمهم بعلم القراءة۔

وفی تنوير الابصارمع الدر(۱/۵۵۷): (والأحق بالامامة) تقديما بل نصبا مجمع الانهر (الاعلم باحكام الصلاة)فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض وقيل واجب وقيل سنة (ثم الاحسن تلاوة) وتجويداً (للقراة ثم الاورع) الاكثر اتقاء للشبهات والتقوی اتقاء المحرمات (ثم الاسن) ای الاقدم اسلاما فيقدم شاب علی شيخ اسلم وقالوا يقدم الاقدم ورعا وفی النهر عن الزاد وعليه يقاس سائر الخصال فيقال يقدم اقدمهم علما ونحوه وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الاحسن خلقا) بالضم الفة بالناس (ثم الاحسن وجها)۔

وفی الدرالمختار(۱/۴۰۰): ولاية الاذان والاقامة لبانی المسجد مطلقا وكذا الامامة لوعدلاً

وفی الشامية تحته:(قوله مطلقا)ای عدلا أولا۔ وفی الأشباه: ولد البانی وعشيرته اولیٰ من غيرهم اهـ

(۱۳۵) حضور ﷺ سے وتر کی امامت کا ثبوت اور مسبوق کا اپنی چھوٹی ہوئی رکعت کو پورا کرنے کا ثبوت

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نماز میں کچھ تاخیر سے پہنچا اور اس کی کچھ رکعت امام کے پیچھے چھوٹ گئی تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لیتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ کب سے شروع ہوا کیا یہ طریقہ جو آجکل معمول ہے حدیث میں آیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ منورہ میں شروع کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا پھر رائج کیا؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۲)۔کیا وتر کی امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب……مسبوق کی نماز کا طریقہ اصل میں سنت سے ثابت ہے البتہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اکثر رکعت رہ جاتی تھی ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا کہ وہ اپنی فوت شدہ نماز پوری کر رہے ہیں تو آپ علیہ السلام نے تاکید کے طور پر فرمایا کہ تم میں سے جب کسی کی رکعت چھوٹ جائے تو تم بھی ایسا ہی کر لیا کرو جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کر رہے ہیں۔

(۲)……آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی امامت ثابت نہیں ہے کیونکہ آپ علیہ السلام وتر ہمیشہ گھر میں پڑھا کرتے تھے البتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے صرف رمضان المبارک میں وتر باجماعت پڑھنا ثابت ہے اس لئے فقہاء کرام نے غیر رمضان میں وتر باجماعت نہ پڑھنے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

لما فی مسند امام احمد بن حنبل(۲۲۶/٦): حدثنا عبدالله... عن معاذ بن جبل قال احیلت الصلوة ثلاثة احوال... قال وكانوا يأتون الصلوة وقد سبقهم ببعضها النبى ﷺ قال فكان الرجل يشير الى الرجل ان جاء كم صلى فيقول واحدة أو اثنتين فيصليها ثم يدخل مع القوم فى صلاتهم قال: فجاء معاذ فقال لا اجده على حال أبدا الاكنت عليها ثم قضيت ماسبقنى قال فجاء وقد سبقه النبى ﷺ ببعضها قال فثبت معه فلما قضى رسول الله ﷺ صلاته قام فقضى فقال رسول الله ﷺ انه قد سن لكم معاذ فهكذا فاصنعوا...

وفى اعلاء السنن(٥،٦/٢٣): وروى ابن مسعود مرفوعا قال رسول الله ﷺ وتر الليل ثلاث كوتر النهار صلاة المغرب، واسناده حسن كما سيأتى...(ص ٣٤) ولان عائشة رضى الله عنها كانت ترى وتره ﷺ اكثر مما يراه ابن عمر لانه ﷺ كان يوتر فى بيته دائما وفى آخر الليل غالبا...

وفيه ايضاً(۳۶/۵،۶): حدثنا ابو النضر... عن عائشة رضى الله عنها ان رسول الله ﷺ كان اذا صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين ثم صلى بعدهما ركعتين اطول منهما ثم اوتر بثلاث لايفصل بينهن۔

وفی الهداية(۱۵۸/۱): ولا يصلى الوتر بجماعة فی غير شهر رمضان عليه اجماع المسلمين۔

(۱۳۶) فجر اور ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فجر اور ظہر کی نمازیں بسا اوقات تاخیر سے آتے ہیں اور جلدی سے وضو کر کے سنت ادا کئے بغیر نماز پڑھاتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ فجر یا ظہر کی سنتیں پڑھنے سے پہلے امام کا جماعت کرانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......فجر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا مکروہ ہے کیونکہ فرض کے بعد وقت کے اندر ان کی قضاء نہیں ہوسکتی، اس لئے کراہت زیادہ ہے البتہ ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا جائز ہے لیکن بلا عذر ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں امام کو بھی احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور اگر کبھی بالعذر تاخیر ہوجائے تو جس طرح جنازے کی نماز کیلئے امام وضو کی غرض سے جنازے کو مؤخر کرسکتا ہے اسی طرح پہلے سنتیں اداء کرلے پھر نماز پڑھائے نیز مقتدیوں کو بھی امام کی رعایت کرنی چاہیئے اور امام پر تنقید سے اجتناب کریں۔

لمافی الترمذی (۹۷/۱): عن عائشة رضى الله عنها ان النبى ﷺ كان اذا لم يصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها۔

وفی اعلاء السنن(۷/۷):عن عائشة رضى الله عنها قالت لم يكن النبى ﷺ على شى من النوافل اشدتعاهداً منه على ركعتى الفجر۔ قوله عن عائشة رضى الله عنهاالخ، قال المؤلف دلالته على تاكيدسنة الفجر ظاهرة۔

(۱۳۷) فجر کی سنت ادا کئے بغیر امامت کرانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے امام صاحب کو اگر کبھی فجر کی جماعت کے وقت پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے تو وہ بغیر سنت پڑھے نماز فجر پڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ فجر کی سنت جس نے نہ پڑھی ہو، اسے فجر کے فرض پڑھانا مکروہ ہے۔کیا یہ بات درست ہے؟ براہ کرم صحیح بات سے مجھے جلد از جلد مطلع فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......فجر کی سنت تمام سنتوں میں مؤکدترین اور اقوی سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے پڑھنے پر مداومت فرمائی ہے اور سفر وحضر، صحت وبیماری کسی حال میں ترک نہیں فرمایا ہے لہٰذا اس کا ترک کرنا درست نہیں۔البتہ اگر کسی نے عذر

کی بناء پر چھوڑ دی تو اس پر گناہ نہیں۔
صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب کو جماعت کے وقت پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور وہ سنت پڑھے بغیر فجر کی نماز پڑھا دیں تو نماز پڑھانا درست ہے البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

لمافی البخاری(۱/۱۵۶): عن عائشة رضی الله عنها قالت لم یکن النبی ﷺ علی شئ من النوافل اشد تعاهدا منه علی رکعتی الفجر۔

وفی الفتاوی التاتارخانیة(۱/۶۴۱): یجب ان یعلم ان التطوع قبل الفجر رکعتان اتفقت الاثار علیهما وانهما من اقوی السنن، وفی المنافع: سنة الفجر اقوی السنن حتی لو انکرها یخشی علیه الکفر، ولا یجوز ان یصلیها قاعدا مع القدرة علی القیام، ولهذا قیل انها قریب من الواجب۔

وفیه ایضاً (۱/۶۴۴): وفی النوازل: اذا ترك السنن ان ترکها بعذر فهو معذور، وان ترکها بغیر عذر لایکون معذورا فیها ویسأل الله تعالیٰ یوم القیامة عن ترکها۔ (وفی الصفحة ۶۴۲) وفی الکافی: وقالوا لو کان العالم مرجعا للفتوی له ترك سائر السنن لحاجة الناس الیه الاسنة الفجر۔

(۱۳۸)اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں؟اور امام کب تکبیر تحریمہ کہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں موجود ہے کہ جماعت کے وقت امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں اور امام قد قامت الصلوٰۃ کے وقت نماز شروع کردے۔عبارت یہ ہے و القیام حین قیل حی علی الفلاح و شروع الامام مذقیل قد قامت الصلوٰۃ کنز الدقائق (۱/۲۴) آجکل ہماری مساجد میں اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے کہ امام اور مقتدی اقامت سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقامت ختم ہو جانے کے بعد امام نماز شروع کرتا ہے۔آیا ہماری مساجد میں یہ عمل خلاف سنت ہو رہا ہے یا نہیں؟اگر نہیں تو اس عبارت کا کیا مقصد ہے اور آپ ﷺ کا کیا معمول تھا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......امام اور مقتدی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔(۱)۔کہ مقتدی مسجد میں ہو،اور امام خارج مسجد سے داخل ہو رہا ہو۔اگر امام سامنے محراب کی طرف سے داخل ہو رہا ہو تو مقتدی ان کو دیکھتے ہی نماز کیلئے کھڑے ہو جائیں۔(۲)۔اگر امام صف کے پیچھے سے آ رہا ہو،تو امام جس صف سے گزرتا جائے اس صف والے مقتدی کھڑے ہوتے جائیں۔(۳)۔امام اور مقتدی مسجد کے اندر ہوں تو اس بارے میں ہماری کتب میں جو تصریح ہے۔جیسا کہ کنز الدقائق (۱/۲۴) پر ہے''و القیام حین قد قیل حی علی الفلاح'' اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد امام اور مقتدی نہ بیٹھے جیسا کہ البحر الرائق (۱/۵۳۱) میں اس کی علت یہ بیان کی ہے''لانه

أمر فيستحب المسارعة اليه'' تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھنا مسارعت إلی الطاعت کے خلاف ہے نہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا بلکہ اس میں مسارعت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ کہ کنز کی اس عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعامل بھی یہ تھا کہ ابتداء اقامت سے کھڑے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہماری مساجد میں ائمہ اور مقتدیوں کا اقامت کی ابتداء سے کھڑا ہونا خلاف سنت نہیں ہے اور امام کے شروع فی الصلوۃ کے بارے میں امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ جب مؤذن اقامت سے فارغ ہوجائے تو امام تکبیر کہے تا کہ مؤذن امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے کی فضیلت سے محروم نہ ہوجائے۔

لمافی الصحیح لمسلم (۱/۲۲۰): عن أبي هريرة رضي الله عنه ان الصلوة كانت تقام لرسول الله صلى الله عليه وسلم فيأخذ الناس مصافهم قبل أن يقوم النبي صلى الله عليه وسلم مقامه۔

وفی فيض الباری (۲/۱۸۷): باب (متى يقوم الناس'' ويعلم من بعض الأحاديث أنهم كانوا يقومون لها بعد تمام الإقامة ومن بعضها أنهم كانوا يقومون فی خلالها وهكذا فی كتبنا. . .

والمسألة فيه أن الامام إن كان خارج المسجد ينبغی للمقتدين أن يقوموا لتسوية الصفوف إذا دخل فی المسجد، وإن كان فی المسجد فالمعتبر قيامه من موضعه وكيف ما كان ليست المسألة من نفس الصلاة بل من الآداب فان قام أحدٌ قبله لا يكون عاصياً۔

''فلا تقوموا حتى تروني'' قال العلماء إن بلالاً رضی الله عنه كان يراقب النبی صلى الله عليه وسلم فاذا رآه أقام وأما سائر الناس فكانوا لايرونه إلا بعد أن يصل إلى الصف وكان المسجد من بيته بحيث لوخرج قدمه منها وقع فی المسجد فكان بلال رضی الله عنه يقيم إذا خرج فاذا وصل موضع الإقامة وجد الصفوف قد سويت والاقامة قد تمت۔

وفی البحر الرائق (۱/۵۳۱): قوله: (والقيام حين قيل حیّ على الفلاح) لانه أمر به فيستحب المسارعة إليه أطلقه فشمل الإمام والمأموم إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهی اليه الإمام وهو الأظهر... (وشروع الإمام مذقيل قدقامت الصلاة) عند أبي حنيفة و محمدرحمهما الله و قال أبو يوسف رحمه الله: يشرع إذا فرغ من الإقامة محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة للمؤذن على الشروع معه ولهما أن المؤذن أمين، وقد أخبر بقيام الصلاة فيشرع عنده صوناً لكلامه عن الكذب وفيه مسارعة إلى امناجات وقد تابع المؤذن فی الأكثر فيقوم مقام الكل على أنهم قالوا المتابعة فی الأذان دون الاقامة كذا ذكره الشارح وفيه نظر لما نقلناه فی باب الأذان أن اجابة الاقامة مستحبة وفی الظهيرية: ولو أخر حتى يفرغ المؤذن من الاقامة لا بأس به فی قولهم جميعا والله اعلم۔

وفی الهندية(۱/۵۷): وإن كان المؤذن غير الإمام وكان القوم مع الإمام فی المسجد فانه يقوم الإمام والقوم إذا قال المؤذن حیّ علی الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح * فاما إذا كان الإمام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف واليه مال شمس الائمة الحلوانی والسرخسی وشيخ الإسلام خواهرزاده وإن كان الإمام دخل المسجد من قدامهم يقومون كمارأوالامام وإن كان المؤذن والإمام واحدا فإن أقام فی المسجد فالقوم لا يقومون مالم يفرغ من الإقامة وإن أقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا علی أنهم لا يقومون مالم يدخل الإمام المسجد۔

وفی الدر المختار(۱/۴۷۹): (قوله وشروع الإمام) فی الصلوة (مذقيل قد قامت الصلوة) ولو أخّر حتی اتمها لا بأس به إجماعاً وهو قول الثانی والثلاثة۔ وهو أعدل المذاهب كمافی شرح المجمع لمصنفه وفی القهستانی معزيا للخلاصة وهو الأصح (وتحته فی الشامية) ...(قوله لا بأس به إجماعاً) أی لأن الخلاف فی الأفضلية فنفی البأس ای الشدة ثابت فی كلا القولين وإن كان الفعل أولی فی أحدهما (قوله وهو) أی التأخير المفهوم من قوله أخر (قوله أنه الأصح) لأنه فيه محافظة علی فضيلة متابعة المؤذن وإعانة له علی الشروع مع الإمام۔

(۱۳۹) امام کا محراب میں کھڑے ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کو محراب میں کس جگہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی امام محراب سے بالکل باہر کھڑا ہو، لیکن سجدہ محراب میں ادا کرتا ہو، کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......محراب اگر اتنی چھوٹی ہو کہ اُس میں امام کے کھڑے ہونے سے اُس کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ ہوتی ہو تو مکروہ ہے، البتہ اگر اتنی بڑی محراب ہو کہ اُس میں کھڑے ہونے سے امام کی حالت مقتدیوں پر مشتبہ نہ ہوتی ہو تو امام کا محراب میں کھڑا ہونا بلا کراہت جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده فی الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا فی التبيين وإذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلابأس بأن يقوم فی الطاق كذا فی الفتاوی البرهانية۔

وفی الطحطاوی تحته (قوله لاشتباه الحال علی القوم) فان انتفی الاشتباه انتفت الكراهة وهذا التعليل لجماعة منهم الفقيه أبوجعفر الهندوانی۔

وفی الشامية (۱/۶۴۵): وحاصله أنه صرح محمد فی الجامع الصغير بالكراهة ولم يفصل، فاختلف المشايخ فی سببها، فقيل كونه يصير ممتازا عنهم فی المكان لأن المحراب فی معنى بيت آخر وذلك صنيع أهل الكتاب، واقتصر عليه فی الهداية واختاره الامام السرخسی رحمه الله و قال إنه الأوجه، وقيل اشتباه حاله على من فی يمينه ويساره فعلى الاول يكره مطلقا وعلى الثانی لايكره عند عدم الاشتباه ، وأيد الثانی فی الفتح بأن امتياز الامام فی المكان مطلوب، وتقدمه واجب وغايته اتفاق الملتين فی ذلك، وارتضاه فی الحلية وأيده لكن نازعه فی البحر بأن مقتضى ظاهر الرواية الكراهة مطلقاً، وبأن امتياز الامام المطلوب حاصل بتقدمه بلاوقوف فی مكان آخر ولهذا قال فی الولوالجية وغيرها إذا لم يضق المسجد بمن خلف الامام لاينبغی له ذلك لأنه يشبه تباين المكانين......

قلت: ای لأن المحراب إنما بنی علامة لمحل قيام الامام ليكون قيامه وسط الصف كما هو السنة، لا لأن يقوم فی داخله فهو وإن كان من بقاع المسجد لكن أشبه مكانا آخر فأورث الكراهة۔

(۱۴۰) امام اور مقتدیوں میں تعداد رکعات میں اختلاف کی صورت

سوال......کیافرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام اور مقتدی میں تعدادِ رکعات پر اختلاف ہوجائے تو کس کا قول معتبر ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں جب امام اور مقتدیوں کو تعدادِ رکعات میں اختلاف ہوجائے مثلاً مقتدی کہیں کہ تین رکعات پڑھائی ہیں جبکہ امام کہتا ہو کہ میں نے پوری چار رکعات پڑھائی ہیں تو اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)......اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین ہے تو اس صورت میں امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۲)......اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین تو نہیں ہے مگر مقتدیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کا حامی ہے تو اس صورت میں بھی امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۳)......امام کو اپنی بات کا پورا یقین بھی نہیں ہے، اور تمام مقتدی بھی اس کی رائے کے مخالف ہیں تو اس صورت میں مقتدیوں کا قول معتبر ہوگا، اور نماز دوبارہ لوٹائی جائے گی۔

لمافی الهندية(۱/۱۳۱): إذا شك الإمام فأخبره عدلان يأخذ بقولهما رجل صلى وحده أوصلى بقوم۔ فلما سلّم، أخبره رجل عدل، إنك صليت الظهر ثلاث ركعات۔ قالوا إن كان عند

المصلي أنه صلى أربع ركعات لايلتفت إلى قول المخبر۔

وفى الدر المختار(۹۴/۲): ولو اختلف الإمام والقوم فلو الإمام على يقين لم يعد وإلا أعاد بقولهم۔

وفى الطحطاوى(۳۱۷/۱):(قوله ولو اختلف الإمام والقوم)۔ أى كل القوم، أما لو إختلف القوم وقال بعضهم صلى ثلاثاً وقال بعضهم صلى أربعا۔ والإمام مع أحد الفريقين يؤخذ بقول الامام وإن كان معه واحد۔

(۱۴۱) گرمی کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جماعت کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک مسجد ہے جس میں رمضان المبارک میں ماشاء اللہ تراویح مع ختم قرآن ہوتی ہے لیکن بعض اوقات موسم گرما میں نماز عشاء اور تراویح وغیرہ مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی ہے۔ خصوصاً جب بجلی موجود نہ ہو سخت پریشانی ہوتی ہے تو کیا جماعت خانہ خالی ہوتے ہوئے مسجد کی چھت پر نماز عشاء وتراویح ادا کرنا مکروہ ہے یا جائز؟ حالانکہ مسجد کی چھت تو مسجد ہی کے حکم میں ہوا کرتی ہے۔ جیسے معتکف اگر مسجد کی چھت پر چڑھ جائے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا سوال یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر جماعت خانہ کے خالی ہوتے ہوئے نماز عشاء وتراویح ادا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسجد کے ہال کو چھوڑ کر چھت پر بغیر عذر نمازِ عشاء یا تراویح کی جماعت مکروہ ہے۔ اور فقہاء کرام کی عبارات گرمی کی وجہ سے چھت پر باجماعت نماز کی کراہت پر واضح ہیں لہٰذا گرمی کوئی ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ دیا جائے البتہ مسجد کے صحن میں نماز ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

جہاں تک معتکف کی بات ہے، معتکف کے چھت پر چڑھنے کی وجہ سے اعتکاف اس لئے نہیں ٹوٹتا کہ چھت مسجد کے حکم میں ہے اور جماعت اس لئے مکروہ ہے کہ چھت جماعت خانے کے حکم میں نہیں ہے اسلئے اگر کسی مسجد کی دو منزلیں ہیں تو دوسری منزل میں ہال کو چھوڑ کر نماز یا جماعت بلا کراہت جائز ہے کیونکہ وہ جماعت خانے کے حکم میں ہے۔

لما فی کبیری(ص۳۹۲): وفى القنية امام يصلى التراويح على سطح المسجد اختلف فى كراهته والاولى ان لايصلى فيه عند العذر فكيف بغيره۔

وفى التاتارخانية(۶۷۰/۱): وكذا اذا غلبه النوم يكره له أن يصلى مع القوم بل ينصرف حتى يستيقظ وكذا لو صلى على السطح من شدة الحر۔

وفى الهندية(۳۲۲/۵): الصعود على سطح كل مسجد مكروه لهذا اذا اشتد الحر يكره ان يصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحيئنذ لا يكره الصعود على سطحه للضرورة۔

وفى الشامية(۶۵۶/۱): ثم رأيت القهستانى نقل عن المفيد كراهة الصعود على سطح المسجد اھ

ویلزمه کراهة الصلاة ایضاً فوقه۔ فلیتامل(قوله لانه مسجد) علة لکراهة ماذکر فوقه قال الزیلعی، ولهذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیه اذا لم یتقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیه۔

(۱۴۲) بیمار کی تیمار داری کیلئے جماعت کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر والوں کی طبیعت سخت خراب ہو، ان کے پاس گھر میں کوئی اوران کی تیمارداری کرنے والا نہ ہو، اور مسجد میں نماز پڑھنے جانے کی صورت میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہو، تو کیا ایسی صورت میں جماعت کی نماز چھوڑنا درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر بیمار آدمی کے ساتھ تیمارداری کرنے والا کوئی اور نہ ہو، اور مسجد میں چلے جانے کی صورت میں بیمار کو تکلیف ہوتی ہو، تو اس صورت میں جماعت چھوڑنا درست ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۸۳): تسقط الجماعة بالاعذار حتی لاتجب علی المریض ...أن تفوته قافلة أو کان قیما لمریض الخ۔

وفی الشامیة (۱/۵۵٦): (قوله وقیامه بمریض)أی یحصل له بغیبته المشقة والوحشة۔

(۱۴۳) فرض نماز کا "جماعت سے" اور "مسجد میں جاکر" پڑھنا الگ الگ واجب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے؟ یا مسجد کی طرف جماعت کی نماز پڑھنے کیلئے جانا بھی واجب ہے؟ جبکہ علامہ طحطاویؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے "الأصح أن اقامتها فی البیت کاقامتها فی المسجد وان تفاوتت الفضیلة(صـ۲۸٦)" اوراعلاء السنن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی طرف جانا بھی واجب ہے "فثبت ان اتیان المسجد ایضا واجب کوجوب الجماعة(اعلاء السنن، ۴/۱۷۳)" اب ان دونوں قولوں میں سے راجح کون سا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کی طرف جانا جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے اگر واجب ہو، تو پنج وقت نماز کیلئے جانا واجب ہے، یا اکثر اوقات، یا بعض اوقات جانا واجب ہے، اور بعض اوقات جانے سے وجوب ساقط ہوجائے گا جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "فالواجب الحضور احیاناً(الشامیة، ۱/۵۵۲)" کبھی کبھی جانے سے وجوب ساقط ہوجائے گا۔قول فیصل بیان فرما کر مشکور فرمائیں۔نیز یہ کہ بعض حضرات سے سنا ہے، کہ اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت اداکیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا آیا یہ

بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......فرض نمازوں کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا مستقل طور پر واجب ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کیلئے مسجد میں آنا یہ الگ واجب ہے اور ہر ایک کے ترک کرنے پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ بہت سا ایندھن اکٹھا کرکے لائیں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلا دوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہے یعنی مسجد میں اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو تم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کے چھوڑنے والے ہو گے اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے اور جو شخص اچھی طرح وضوء کرے اس کے بعد مسجد کی طرف جائے تو ہر قدم پر ایک ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک ایک درجہ بلند ہوگا اور ایک ایک خطا معاف ہوگی اور ہم تو اپنا یہ حال دیکھتے تھے کہ جو شخص کھلم کھلا منافق ہو، وہ تو جماعت سے رہ جاتا تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عام منافقوں کی بھی جماعت چھوڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا کوئی سخت بیمار ہو ورنہ جو شخص دو آدمیوں کے سہارے سے گھسٹتا ہوا جا سکتا تھا وہ بھی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

رہی یہ بات کہ صاحب حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی نے صاحب قنیہ کے حوالے سے جو مطلقاً لکھا ہے الاصح ان اقامتھا فی البیت کاقامتھا فی المسجد وان تفاوتت الفضیلۃ اس کے متعلق صاحب اعلاء السنن نے تصریح کی ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اصحاب مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور صاحب قنیہ کی نقل ضعیف ہے اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے اور جہاں تک علامہ شامی کا قول ہے "فالواجب الحضور أحیانا" تو یہ اس صورت پر محمول ہو سکتا ہے جب کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت رہ گئی ہو، ورنہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ بغیر عذر کے کبھی کبھار بھی گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بدعت اور مکروہ ہے اور بعض حضرات سے سنی ہوئی بات کہ "اگر کسی شخص نے تین نمازیں با جماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا" درست نہیں ہے۔

لمافی اعلاء السنن (۱۸۶/۴): قلت دلالته علی الجزء الاول ظاهرة حیث بولغ فی تهدید من تخلف عنها وحکم علیه بالنفاق ومثل هذا التهدید لا یکون الافی ترك الواجب ولا یخفی ان وجوب الجماعة لو کان مجردا عن حضور المسجد لماهم رسول الله ﷺ باضرام البیوت علی المتخلفین لاحتمال انهم صلوها بالجماعة فی بیوتهم فثبت ان اتیان المسجد ایضا واجب

كوجوب الجماعة فمن صلاها بجماعة فی بيته اتی بواجب وترك واجبا آخر۔
وفيه ايضاً(۱۸۸/۴): قلت: وهذا صريح فی ان وجوب الجماعة انما يتأدى بجماعة المسجد لا بجماعة البيوت ونحوها فما ذكره صاحب القنية اختلف العلماء فی اقامتها فی البيت والاصح انها كاقامتها فی المسجد الا فی الفضيلة وهو ظاهر مذهب الشافعی اھ۔ كذا فی حاشية البحر لابن عابدين لا يصح مالم ينقل نقلا صريحا عن اصحاب المذهب ويرده ماذكرنا من الاحاديث فی المتن فالصحيح ان الجماعة واجبة مع وجوب اتيانها فی المسجد ومن اقامها فی البيت وهو يسمع النداء فقد أساء وأثم والله سبحانه وتعالىٰ أعلم۔
وفی البحر الرائق(۶۰۶/۱): وسئل الحلوانی عمن يجمع بأهله أحيانا هل ينال ثواب الجماعة أو لا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلا عذر۔

(۱۴۴) جماعت ثانیہ میں تعدد کی صورت میں شرکت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مدنی مسجد شب جمعہ کو چلا گیا۔ مغرب میں تھوڑی دیر سے پہنچا۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہو چکی تھی۔ برآمدے میں دوجگہ جماعت کے ساتھ نماز ہو رہی تھی۔ ایک جماعت میں نمازیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی جبکہ دوسری جماعت میں نمازیوں کی تعداد کم تھی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ جس جماعت میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہے ان کی آخری رکعت ہے۔ اور جس جماعت میں تھوڑے سے حضرات ہیں ان کی پہلی رکعت ہے۔ اب میں سخت متردد ہوا کہ کس جماعت میں شامل ہو جاؤں؟ آخرکار اس جماعت میں شریک ہوا جس کی پہلی رکعت تھی۔ لیکن دل میں ابھی تک یہ تردد ہے کہ کون سی جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے تھا؟ اب آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ اگر ایسا معاملہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟ آیا ثواب میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... احادیث مبارکہ میں بکثرت نماز باجماعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور باجماعت نماز نہ پڑھنے والوں کیلئے وعیدیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کی جائے۔ اور تکبیر اولیٰ کے حصول کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ احادیث میں اس کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ نیز اگر کوئی شخص جماعت کی نماز میں ایک رکعت یا چند رکعات ہونے کے بعد شریک ہوتا ہے تو بلاشبہ وہ بھی جماعت کو پانے والا ہے لیکن اس شخص کا ثواب اس آدمی سے کم ہوگا جو شروع سے امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ نے جو عمل کیا کہ اس جماعت میں شریک ہوئے جن کی ابھی پہلی رکعت تھی یہ بالکل درست ہے جس سے یقیناً آپ تکبیر اولیٰ اور باجماعت نماز پڑھنے کے ثواب کے مستحق ہوں گے جبکہ دوسری جماعت میں شریک ہونے سے آپ ان

فضائل سے محروم ہوجاتے۔لہٰذا جہاں ایسی صورتحال ہو کہ دو جماعتیں ہورہی ہوں اور ایک کی پہلی رکعت ہو، اور دوسری جماعت کی اکثر رکعات ہو چکی ہوں تو اس جماعت میں شریک ہونا چاہیے جن کی پہلی رکعت ہو یا کم رکعات ادا ہوئی ہوں، بشرطیکہ دوسری جماعت مسجد کے احاطہ سے باہر ہورہی ہو۔ اگر مسجد کے احاطے ہی میں دوسری جماعت ہورہی ہے تو یہ درست نہیں ہر ایک کو انفرادی نماز ادا کرنی چاہیے۔

لمافی الترمذی(۱/۵۲): عن ابن عمررضی الله عنهماقال قال رسول الله ﷺ :صلوة الجماعة تفضل علی صلوة الرجل وحده بسبع وعشرین درجة۔

وفی الشامیة(۱/۳۹۶): الراجح عند اهل المذهب وجوب الجماعة وانه یاثم بتفویتها اتفاقاً: وحینئذ یجب السعی بالقدم لا لاجل الاداء فی اول الوقت اوفی المسجد بل لأجل اقامة الجماعة والا لزم فوتها اصلاً او تکرارها فی مسجد ان وجد جماعة اخری وکل منها مکروه۔

(۱۴۵) بار بار وضو ٹوٹنے، ٹانگوں میں درد جیسے عذر کی بنا پر مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سال پہلے اپنی مقامی مسجد (جامع مسجد گول مارکیٹ) میں وضو کے بعد اچانک پیر پھسلنے کے بعد گر پڑا اور اس حادثے کے بعد سے مستقل طور پر بیمار آدمی کی زندگی گزار رہا ہوں، اس حادثے کے کچھ عرصے بعد جسم کے بائیں طرف فالج کا حملہ ہوا اور حالت مزید خراب ہوگئی۔ اب اللہ کے فضل سے بذریعہ علاج کچھ افاقہ ہوا۔ میری روٹین کچھ اس طرح ہے کہ میں عصر کی نماز میں باجماعت شریک ہوجاتا ہوں اور پھر تلاوت کر کے مغرب باجماعت پڑھ کر گھر لوٹتا ہوں۔ مسلسل گرم دواؤں کے استعمال سے مجھے قبض اور گیس کی شکایت رہتی ہے۔ میں عصر کی جماعت کیلئے گرم پانی کا وضو بنا کر گھر سے چلتا ہوں مگر وضو ۱۵ منٹ یا آدھا گھنٹے میں ٹوٹ جاتا ہے اکثر نماز شروع کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھنڈے یا گرم جو بھی میسر ہو دوبارہ وضو بنانا پڑتا ہے، مسجد میں گرم پانی ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا، لہٰذا مجبوراً ٹھنڈے پانی سے وضو بنانے پر میری انگلیوں میں اور پیروں میں کھنچاؤ اور تکلیف ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر نے رمضان کے روزے رکھنے اور نماز پڑھنے سے بھی منع کیا ہے۔ اب اس مسئلے کے حل کی جتنی بھی شرعی صورتیں ہوسکتی ہیں بیان فرمادیں۔ ان میں سے مناسب اور آسان صورت کو اختیار کرلوں گا۔ مسجد ۱۰ منٹ کی مسافت پر ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ نہیں چلا جاتا۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر بار بار وضو کرنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہو، اور گھر سے وضو کر کے مسجد تک جاتے جاتے یا نماز شروع ہوتے ہوتے وضو ٹوٹ جاتا ہو، یا بڑھاپے کی وجہ سے مسجد تک چلنے میں تکلیف ہوتی ہو، تو ایسی صورت میں اگر آپ جماعت میں شریک ہونے کی بجائے گھر میں ہی وضو کر کے جلدی جلدی نماز پڑھ لینا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے شرعاً اجازت ہے کہ آپ گھر میں ہی پڑھ لیں۔ کذا فی نفع المفتی والسائل بحواله فتاوی رحیمیه (۱/۱۹۵)۔ کیونکہ بیماری اور ایسے

بڑھاپے میں جس کی وجہ سے مسجد تک چلنا مشکل ہو جائے اس سے جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔

دوسری صورت آپ کیلئے یہ ہے کہ اگر پانی کے استعمال سے بیماری میں اضافہ ہونے یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں آپ تیمم کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ خوف غلبہ ظن یا تجربہ یا کسی مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب کی خبر سے معلوم ہو سکتا ہے۔

رہا ڈاکٹر کا روزہ رکھنے سے منع کرنا، تو اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے بیماری میں اضافہ ہونے کا یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو، اور کوئی مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب آپ کو روزہ نہ رکھنے کا مشورہ دے تو آپ کو شرعاً روزے فی الحال نہ رکھنے کی اجازت ہے البتہ بعد صحت قضاء کرنا ضروری ہوگا۔

رہا نماز کا مسئلہ، تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہو، اور بیماری میں اضافہ یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو بیٹھ کر ہی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر رکوع وسجدہ میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو اشارہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں اور اگر بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو لیٹ کر اشارتاً رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہوں تو فی الحال نماز کو موخر کر دیں۔

لما فی الھندیۃ (۱/۸۳): وتسقط الجماعۃ بالاعذار حتی لا تجب علی المریض والمقعد والزمن ومقطوع الید والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا یستطیع المشی والشیخ الکبیر العاجز والاعمیٰ عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

وفی الطحطاوی (ص۲۹۸): قولہ وشیخوخۃ، مصدر شاخ یشیخ اذا استبان منہ السن قاموس۔ ای اذا صار شیخا کبیرا لایستطیع المشی سقطت عنہ الجماعۃ۔

وفی الھندیۃ (۱/۲۸): ولو کان یجد الماء الا انہ مریض یخاف ان استعمل الماء اشتد مرضہ او ابطأبرءہ یتیمم ...... ویعرف ذلک الخوف اما بغلبۃ الظن عن امارۃ او تجربۃ او اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاھر الفسق کذا فی شرح منیۃ المصلی لابراھیم الحلبی۔

(۱۴۶) راستوں وغیرہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محلہ کی مسجد میں جماعت ثانی ہیئت اولیٰ کی تبدیلی کے باوجود درست نہیں ہے آیا یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے ہے یا مسافر بھی اس میں داخل ہیں، مثلاً تبلیغی جماعت والے محلہ کی مسجد میں اس وقت آئے جبکہ محلہ والے جماعت سے نماز پڑھ چکے تھے آیا یہ تبلیغی جماعت والے یعنی کوئی بھی مسافر ہیئت اولیٰ بدل کر مسجد میں جماعت ثانی کروا سکتے ہیں یا نہیں؟

اڈے کی مساجد مثلاً جو بس اسٹاپ پر ریلوے اسٹیشن پر یا سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی ہوتی ہیں ان مساجد میں امام و

مؤذن متعین ہوں جو پانچ وقت اذان دیتا ہو، اور نماز پڑھاتا ہو تو کیا اس صورت میں اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں جماعت ثانی کروانا درست ہے یا نہیں، درست ہونے کی صورت میں ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟ یا اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں اس وقت جماعت ثانی کروانا درست ہوگی جب ان مساجد میں امام ومؤذن متعین نہ ہوں کیا اس صورت میں بھی ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسجد محلہ جس میں امام ومؤذن مقرر ہوں اس میں جماعت ثانی مکروہ ہے اور یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے نہیں ہے بلکہ جو بھی جماعت ہوجانے کے بعد آئیں وہ سب اس حکم میں شامل ہیں لہٰذا جو بعد میں آئیں اور اگر وہ جماعت ثانی کرانا چاہتے ہیں تو کسی ایسی جگہ میں جو مسجد کی حدود سے خارج ہو وہاں جماعت کراسکتے ہیں اور اسی طرح ان مساجد میں بھی جماعت ثانی مکروہ ہے جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہوں، البتہ وہ مساجد جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین نہ ہوں تو ان میں جماعت ثانی مکروہ نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بس اڈے، ریلوے اسٹیشن اور سڑک کے کنارے جو مساجد ہیں اگر ان میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہیں تو ان مساجد میں جماعت ثانی مکروہ ہوگی اور اگر معین نہیں ہیں تو جماعت ثانی جائز ہوگی۔

لمافی الدر المختار(۱/۵۵۲): ویکره تکرار الجماعة بأذان وإقامة فی مسجد محلة لافی مسجد طريق او مسجد لا إمام له ولا مؤذن۔ وفی الشامية تحته (قوله يكره) أی تحريما لقول الكافی لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كمافی رسالة السندی (قوله بأذان و اقامة الخ)...يكره تكرار الجماعة فی مسجد محلة بأذان وإقامة إلا إذاصلى بهما فيه أولا غير أهله أو أهله لكن بمخافتة الأذان، ولو كرر أهله بدونهما أو كان مسجد طريق جاز اجماعا، كمافی مسجد ليس له إمام ولا مؤذن ويصلی الناس فيه فوجا فوجا، فإن الأفضل ان يصلی كل فريق بأذان وإقامة على حدة كمافی امالی قاضيخان ونحوه فی الدرر، والمراد بمسجد المحلة ماله إمام وجماعة معلومون كمافی الدرر وغيرها، قال فی المنبع: والتقييد بالمسجد المختص بالمحلة احتراز من الشارع، وبالأذان الثانی احتراز عما اذ اصلی فی مسجد المحلة جماعة بغير اذان حيث يباح اجماعا، ... وأما مسجد الشارع فالناس فيه سواء لا اختصاص له بفريق دون فريق۔

(۱۴۷) بدعتیوں کی جماعت کے بعد جماعت ثانی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد میں جب اہل بدعت میں سے مثلاً بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کرائے تو کیا اس مسجد میں دوبارہ صحیح العقیدہ شخص جماعت کراسکتا ہے یا نہیں اور یہ تکرارِ جماعت میں داخل ہوگا یا نہیں؟ اور دوسری جماعت کا کیا حکم ہے، آیا وہ درست ہے یا نہیں؟ یا مکروہ ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہوتو دوسری جماعت کرائی جاسکتی ہے۔اوروہ عبارت یہ ہے: لان تکرار الجماعۃ فی مسجد واحد مکروہ عندنا علی المعتمد الا اذا کانت الجماعۃ الاولیٰ غیر اھل ذلک المسجد او ادیت الجماعۃ علی وجہ مکروہ۔(شامیۃ:۱/۵۶۴)

المطلوب: ۱)۔بریلویوں کی جماعت کا کیا حکم ہے؟

۲)۔جب ایک دفعہ بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کروادے تو کیا دوسری جماعت اسی مسجد میں کروائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۳)۔دوسری جماعت میں کراہت تو نہیں ہوگی؟ وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جب محلے والے اپنی مسجد میں اذان اور اقامت کے ساتھ ایک مرتبہ نماز ادا کرلیں تو وہاں جماعت ثانیہ کروانا شرعاً مکروہ ہے۔جماعت ثانیہ کا ادا کرنا چونکہ جماعت اولیٰ کی سستی کا سبب ہے اور لوگوں کے دلوں سے فوتِ جماعت کا خوف نکل جانے کا سبب ہے اس لئے جماعت ثانی مکروہ ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں بریلویوں کی جماعت بشرطیکہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں کراہت کے ساتھ جائز ہے اس لئے اگر ایک دفعہ بریلویوں نے جماعت کرالی تو دوسری جماعت اسی مسجد میں کرانا جائز نہیں ہے۔علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یہ مراد نہیں کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہوتو دوسرے لوگ دوسری جماعت کراسکتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی ایسے فعل میں کراہت ہے جس کا تعلق ماہیت صلوۃ کے ساتھ ہے تو اس جماعت کا اعادہ واجب ہے۔

لمافی الکبیری(ص۴۷۶): یکرہ تقدیم المبتدع ایضا لانہ فاسق من حیث الاعتقاد وھواشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانہ فاسق ویخاف ویستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئاً علی خلاف ما یعتقدہ اھل السنۃ والجماعۃ وانما یجوز الاقتداء بہ مع الکراھۃ اذا لم یکن مایعتقدہ یودی الی الکفر عند اھل السنۃ اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز اصلا۔

وفی الشامیۃ(۱/۴۵۷): فیخالف تلک القاعدۃ الا ان یدعی تخصیصھا بان مرادھم بالواجب والسنۃ التی تعادبترکہ ما کان من ماھیۃ الصلاۃ واجزائھا فلا یشمل الجماعۃ لانھا وصف لھا خارج عن ماھیتھا۔

وفی اعلاء السنن(۴/۲۳۲): عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار انہ دخل علی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ وھو محصور، فقال: انک امام عامۃ، ونزل بک ما تری، ویصلی لنا امام فتنۃ، ونتحرج، فقال: الصلاۃ احسن ما یعمل الناس، فاذا احسن الناس فاحسن معھم، واذا اساؤوا فاجتنب اساء تھم اخرجہ البخاری(۱/۹۶)

قوله عن عبید الله بن عدی الخ۔ دلالته علی صحة الصلاة خلف الفاسق من قول عثمان رضی الله عنه، ظاهرة، والمراد بامام الفتنة هو کنانة بن بشر البلوی احد رؤوس المصریین، فان سیف ابن عمر روی حدیث الباب فی کتاب الفتوح من طریق اخری عن الزهری بسنده فقال فیه: دخلت علی عثمان رضی اللہ عنہ وهو محصور وکنانة یصلی بالناس فقال: کیف تری؟ الحدیث۔

کذا قال الحافظ فی الفتح(۱۵۹/۷): وفیه دلیل علی کراهة الصلاة خلفه ایضاً لما فیه من قول عبید الله بن عدی: ''ونتحرج'' ولما فی روایة سیف بن عمر من قول یوسف الانصاری ''کره الناس الصلاة خلف الذین حصروا عثمان رضی اللہ عنہ'' ولکن عثمان رضی الله عنه، انما حضهم علی الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذلك تزول الکراهة عمن یقتدی به۔

(۱۴۸)اہل حق کی مسجد نہ ہونے کی صورت میں بدعتیوں کے پیچھے نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے رشتہ دار کراچی کے ایک علاقہ میں رہتے ہیں وہاں قریب میں کوئی مسجد اہل حق کی نہیں ہے بلکہ تمام مساجد بدعتیوں کی ہیں۔اب نماز کا کیا حکم ہے گھر میں پڑھ لیں یا ان کی اقتداء میں مسجد جا کر پڑھیں نیز بندہ کا وہاں کبھی کبھی جانا ہوتا ہے تو بندہ کیلئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بندہ آخری سال کا طالب علم ہے۔تفصیلاً وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......بہتر یہ ہے کہ اہل حق کی مساجد میں نماز ادا کی جائے اور اگر اہل حق کی مساجد وہاں قریب میں نہیں ہیں تو اس صورت میں اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ بدعتیوں کی مساجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔

لما فی کنز العمال(۱۴۸۱۵،۵۴/۶): صلوا خلف کل بر وفاجر۔

وفی نصب الرایة(۲۸/۲): قال علیه السلام: ((من صلی خلف عالم تقی، فکأنما صلی خلف نبی))۔

وفی الدر المختار(۵۶۲/۱): وفی النهر عن المحیط، صلی خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة، وفی الشامیة(قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولی من الانفراد، لکن لا ینال، کما ینال خلف تقی ورع۔

(۱۴۹)تبلیغی جماعتوں کا بریلوی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تبلیغی حضرات کی جماعتیں جب سہ روزہ یا چلہ وغیرہ کیلئے نکلتی ہیں تو ہر مسجد میں دن گزارتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں بریلوی حضرات کی مسجدوں میں چلی جاتی ہیں تو وہاں پر جماعت

کے ساتھ فرض نمازیں ان کے پیچھے با جماعت نماز ادا کرتے ہیں اس وجہ سے کہ جوڑ پیدا ہوا گر علیحدہ اپنی نماز ادا کریں تو توڑ پیدا ہوگا اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ یہ شرک وبدعات کا ارتکاب کرتے ہیں اس کے باوجود بھی وہ شخص ان کے پیچھے نماز ادا کرے تو اس شخص کو چاہیے کہ دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدید نکاح کرے تو آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بدعتی آدمی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جبکہ اس کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں اور لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر ہوں لیکن اگر لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر نہیں اور اس مسجد کے علاوہ کوئی دوسری مسجد بھی گاؤں اور محلے میں نہیں ہے تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر بدعتی کے عقائد کفر تک پہنچے ہوں تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تبلیغی حضرات کی نمازیں بریلوی ائمہ کے پیچھے جائز تو ہیں لیکن اس سے از حد اجتناب کرنا چاہیئے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ ان کے عقائد کفریہ حد تک نہ پہنچے ہوں ورنہ ان کے پیچھے نماز جائز نہیں۔

لما فی اعلاء السنن(۲۳۲/۴): کره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان، ولكن عثمان رضى الله عنه إنما حضهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذالك تزول الكراهة عمّن يقتدى به۔

وفي البحر الرائق(۶۱۱/۱): وأطلق المصنف في المبتدع فشمل كل مبتدع هو من أهل قبلتنا، وقيده في المحيط والخلاصة والمجتبى وغيرها بان لا تكون بدعته تكفره فان كانت تكفره فالصلاة خلفه لا تجوز۔

وفي الدر المختار(۵۶۲/۱): وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة قال في الشامية (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع، لحديث ''من صلى خلف عالم تقي فكانما صلى خلف نبي''۔

وفي كبيري(ص۴۷۶): ويكره تقديم المبتدع ايضاً لانه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل لان الفاسق من حيث العمل يعترف بانه فاسق ويخاف ويستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من يعتقد شيئاً على خلاف ما يعتقده أهل السنة والجماعة ......أما لو كان مؤديا الى الكفر فلا يجوز أصلا كالغلاة من الروافض۔

(۱۵۰) بدعتی اور فاسق کے پیچھے پڑھی گئی نماز کے بارے میں فقہاء کرام کے اقوال (مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی) میں تطبیق

سوال...... مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق دریافت کرنا ہے (۱)۔ بدعتی، فاسق وفاجر مثلاً شرابی، زانی، ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے، مماتی، بلاوجہ دوسرے پر لعن طعن کرنے والے، سودخور الغرض کسی بھی قسم کے گناہ کبیرہ میں مبتلا شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ مکروہ تحریمی یا تنزیہی؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے تو ذمہ سے فرضیت صلاۃ ساقط ہوگی یا واجب الاعادہ ہے؟ اگر واجب الاعادہ نہیں تو فقہاء کرام کی اس عبارت کا کیا مطلب: وکل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تعاد (الدر المختار، ۲/۶۴) نیز کتب فقہاء کی عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات میں ہے کہ:

قال (ویجوز امامۃ الاعمی والاعرابی... والفاسق، وغیرھم احب الی) (المبسوط السرخسی: ۱/۴۰)

فالحاصل انہ یکرہ لھولاء التقدم ویکرہ الاقتداء بھم کراھۃ تنزیھۃ الخ۔ (البحر الرائق، ۱/۶۱۱)

(ویکرہ) تنزیھاً (امامۃ عبد)... (وفاسق واعمی) الخ۔ (الدر المختار، ۱/۵۶۰،۵۵۹)

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء احناف نے ان حضرات مذکورہ کے پیچھے نماز پڑھ لینے کو جائز قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی نہیں مثلاً منقول ہے: باب امامۃ المفتون والمبتدع، وقال الحسن صل، وعلیہ بدعتہ...... عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار انہ دخل علی عثمان بن عفان وھو محصور فقال انک امام عامۃ، ونزل بک ماتری! ویصلی لنا امام فتنۃ، ونتحرج فقال الصلوۃ... الخ۔ (صحیح البخاری، ۱/۹۶)

ویکرہ تقدیم العبد... والفاسق... فان تقدموا جاز۔ (مختصر القدوری، ص۳۵)

ویکرہ تقدیم العبد... والفاسق... وان تقدموا جاز۔ (الفقہ النافع، ۱/۲۱۵)

حتی تجوز امامۃ العبد والاعرابی... والفاسق وھذا قول عامۃ العلماء۔ (بدائع الصنائع، ۱/۶۶۶)

قال اما الفاسق فتجوز الصلاۃ خلفہ لقولہ علیہ السلام "صلوا خلف کل بر وفاجر"۔ (المحیط البرھانی، ۲/۱۴۸)

قال المرغینانی: تجوز الصلاۃ خلف صاحب ھوی وبدعۃ۔ (تبیین الحقائق، ۱/۳۴۵)

قولہ: (ویکرہ تقدیم العبد والاعرابی)... قولہ (والفاسق)... (فان تقدموا جاز) لقولہ علیہ السلام صلوا خلف کل بر و فاجر۔ (الجوھرۃ النیرۃ، ۱/۱۵۹)

وفی الفتاوی لو صلی خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعۃ الخ۔ البحر الرائق (۱/۶۱۰)

الصلاۃ خلف اهل الهواء والبدعة ان کان هوی لا یکفر... وهو من اهل ملّتنا یجوز۔ (الفتاوی الولوالجیة،۱/۱۲۰)

ویصح الاقتداء بأهل الهواء الخ۔ (الخانیة علی هامش الهندیة،۱/۹۱)

الاقتداء بأهل الهواء جائزة الخ۔ (خلاصة الفتاوی،۱/۱۴۹)

اذا صلی رجل خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعة الخ۔ (کتاب التجنیس والمزید،۲/۳)

الصلوۃ خلف المبتدع تجوز الا فی روایة عن ابی حنیفة (الفتاوی السراجیة:ص۱۵)

والمصلی خلف مبتدع او فاسق ینال ثواب الجماعة۔ (البزازیة علی هامش الهندیة:۱/۵۵)

قال المرغینانی تجوز الصلاۃ خلف صاحب هوی وبدعة۔ (الهندیة المعروف بالفتاوی العالمگیریة:۱/۸۴)

ان مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق، بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور جماعت کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے اگرچہ مکروہ ہے، پس اس کراہت کو کراہت تنزیہہ پر محمول کرنا چاہیئے ورنہ اگر مکروہ تحریمی پر محمول کیا جائے گا تو ''کل صلاۃ ادیت مع کراهة التحریم تعاد'' کے خلاف ہونا لازم آئے گا، کیونکہ نماز کا واجب الاعادہ ہونا بظاہر جواز صلاۃ خلف الفاسق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے عمدۃ الرعایۃ علی شرح الوقایۃ حاشیہ نمبر ۸ صفحہ نمبر ۱۵۲ پر فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ قوله کره: الکراهة فی تقدیم الفاسق تحریمیة، وکذا المبتدع فانه اشد من الفاسق من حیث العمل الخ۔ (شرح الوقایة مع عمدۃ الرعایة، ۱/۱۵۲) اور علامہ طحطاویؒ نے بھی اسی کے موافق لکھا۔

(فتجب إهانته شرعاً فلا یعظم بتقدیمه للإمامة) تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة۔(حاشیة الطحطاوی، ص۳۰۳، طبع قدیمی کتب خانه)

الحاصل: حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی وعلامہ طحطاوی رحمہما اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، پس اگر اس قول کو لیا جائے تو قاعدہ ''وکل صلاۃ ادیت مع کراهة التحریم تعاد'' کے مطابق نماز واجب الاعادہ ہونی چاہیئے، نیز یہ کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ناجائز ہو، اور فضیلت جماعت بھی حاصل نہ ہو۔

باقی دیگر فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، بناء بریں ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہوگا اور فضیلت جماعت بھی حاصل ہوجائے گی، اب آپ یہ بتائیں کہ ان میں کونسا قول درست ہے؟ اگر نماز مکروہ تحریمی ہے تو واجب الاعادہ ہے یا نہیں، اگر نہیں تو مذکورہ قاعدہ ''وکل صلاۃ ادیت الخ'' کا کیا مطلب ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... فقہاء کرام کی عبارات پر آپ کے پیش کردہ اشکالات بادی النظر میں تو درست معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر کچھ غور وفکر کریں اور تمام عبارتوں پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کی عبارتوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہے۔

دفع تعارضِ اوّل:...... جہاں فقہاء کرام نے فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز کے مکروہ تحریمی ہونے کا قول کیا ہے وہاں فقہاء کرام

''تقدیم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد واختیار سے کسی فاسق وبدعتی کو امامت کیلئے آگے کرنا، جس سے معلوم ہوا کہ کراہتِ تحریمی ''تقدیم'' کی صورت میں ہے اور جہاں مکروہ تنزیہی کا قول کیا ہے وہاں لفظ ''اقتداء یا تقدم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پہلے سے فاسق وبدعتی امام موجود ہو یا خود ہی آگے بڑھ جائے جس کو ہٹانے میں فتنہ وفساد کا خوف ہو، اور پھر اس کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے، جس سے واضح ہوا کہ کراہت تنزیہی محض ''اقتداء'' کی صورت میں ہے تو دونوں صورتیں الگ ہیں جس کی وجہ سے دونوں کا حکم بھی الگ ہے فلا تعارض بینھما۔

دفع تعارضِ ثانی:...... قاعدہ "کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا" عام ہے۔ ہر نماز جو کراہت تحریم کے ساتھ اداء ہو اس کا اعادہ واجب ہے۔ اس میں علامہ شامیؒ نے اگرچہ ماہیت اور خارج از ماہیتِ صلوۃ سے اعادے اور عدم اعادے کا فرق کیا ہے اور اسے ''الاقرب'' قرار دیا ہے اگرچہ آخر میں وہ خود اس پر مطمئن نہیں۔ بہر حال یہ فرق تسامح ہے اور اس پر بہت سے دلائل موجود ہیں لہذا یہ قاعدہ عام ہے اور ہر مکروہِ تحریمی کے ساتھ اداء نماز کا اعادہ واجب ہے۔

لیکن یہاں آپ کا وارد کردہ اشکال لازم آئیگا کہ اگر فاسق کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی ہے تو پھر واجب الاعادہ کیوں نہیں؟؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نص موجود ہے "صلوا خلف کل بر وفاجر" (کنز العمال ۱/۹۶) اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امام الفتنہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا (بخاری ۱/۹۶) تا کہ امت انتشار وافتراق سے بچی رہے، وفی ھذا الاثر لحض علی شھود الجماعۃ ولا سیما فی زمن الفتنۃ لئلا یزداد تفرق الکلمۃ (فتح الباری ۲/۱۵۱) لہذا فاسق ومبتدع کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہونے کے باوجود واجب الاعادہ نہیں اور یہ اس قاعدے کے اطلاق سے مستثنیٰ ہے۔ فاندفع الاشکال

لمافی الشامیة(۱/۵۶۰): بل مشی فی شرح المنیة علی أن کراھة تقدیمه کراھة تحریم لما ذکرنا قال: ولذا لم تجز الصلاة خلفه أصلاً عند مالك وروایة عن أحمد۔

وفی الشامیة (۱/۴۵۷): مطلب کل صلاة أدیت مع کراھة التحریم تجب إعادتھا قوله (وکذا کل صلاة الخ) الظاھر أنه یشمل نحو مدافعة الأخبثین مما لم یوجب سجودا أصلا وأن النقص إذا دخل في صلاة الإمام ولم یجبر وجبت الإعادة علی المقتدي أیضا وأنه یستثنی منه الجمعة والعید إذا أدیت مع کراھة التحریم إلا إذا أعادھا الإمام والقوم جمیعا فلیراجع ح ۔ أقول: وقد ذکر فی الامداد بحثا ان کون الإعادة بترك الواجب واجبة لا یمنع أن تکون الإعادة مندوبة بترك سنة اھ ونحوه في القھستاني بل قال فی فتح القدیر: والحق التفصیل بین کون تلك الکراھة کراھة تحریم فتجب الإعادة أو تنزیه فتستحب۔ بقی ھنا شئی وھو أن صلاة الجماعة واجبة علی الراجح فی المذھب أو سنة مؤکدة فی حکم الواجب کما فی البحر وصرّحوا بفسق تارکھا وتعزیرہ وأنه یأثم ومقتضی ھذا أنه لو صلی منفرداً یؤمر بإعادتھا بالجماعة وھو مخالف لما

صرّحوا به فى باب ادراك الفريضة من أنه لوصلى ثلاث ركعات من الظهر ثم اقيمت الجماعة يتم ويقتدى متطوعاً، فإنه كالصريح فى أنه ليس له إعادة الظهر بالجماعة مع أن صلاته منفرداً مكروهة تحريماً أو قريبة من التحريم فيخالف تلك القاعدة إلا أن يدعى تخصيصها بأن مرادهم بالواجب والسنة التى تعاد بتركه ما كان من ماهية الصلاة وأجزائها فلا يشمل الجماعة لأنها وصف لها خارج عن ماهيتها۔ أو يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدى متطوعاً بما إذا كانت صلاته منفرداً لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفرداً مكروهة۔ والأقرب الأول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لأنها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة و يؤيده أيضاً أنهم قالوا يجب الترتيب فى سور القرآن فلو قرأ منكوساً أثم لكن لا يلزمه سجود السهو لأن ذلك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلاة كما ذكره فى البحر فى باب السهو لكن قولهم كلّ صلاة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترك الواجب وغيره، ويؤيده ماصرّحوا به من وجوب الإعادة بالصلاة فى ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلى وهو حامل الصنم۔

وفى حاشية الطحطاوى(صـ٣٠٣): (قوله: فتجب إهانته شرعاً فلا يعظم بتقديمه للإمامة) تبع فيه الزيلعى: ومفاده كون الكراهة فى الفاسق تحريمية۔

وفى البحرالرائق(١/٦١١): فالحاصل أنه يكره لهولاء التقدم ويكره الاقتداء بهم كراهة تنزيهة فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد، وينبغى أن يكون محل كراهة الاقتداء بهم عند وجود غيرهم وإلا فلا كراهة كما لا يخفى۔

وفى التحرير المختار(١/٥٧): (قوله: ويؤيده ما صرّحوا الخ) قد يقال ان ذلك ليس من واجبات اللباس بل يقال خلوّ المصلى عن ثوب فيه صورة أو عن حمله صنماً من واجبات الصلاة۔[1]

---

[1] نوٹ: مسئلہ هذا کی مکمل تحقیق نجم الفتاوی، کتاب الصلوۃ کے مسئلہ ۱۸۷ میں مدلل فتوے ''الافاضة فى قاعدة الفقهاء كل صلوة اديت مع الكراهة تجب الاعادة'' کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے۔(از مرتب)

فصل فی المسبوق واللاحق

مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان

(۱۵۱) امام کے رکوع سے سر اُٹھا لینے کے بعد جماعت میں شامل ہونے کا حکم

سوال...... مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق استفسار کرنا تھا:

(۱)۔ امام جب رکوع سے قومہ کی طرف آجائے اور اب تک تکبیر نہ کہی ہو اسی دوران کوئی مقتدی آکر نماز کی نیت کر کے رکوع بھی امام کے تکبیر کہنے سے قبل ادا کر کے قومہ کی طرف آجائے تو یہ کیسا ہے؟

(۲)۔ مقتدی (مسبوق) کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہوتا ہے یا تکبیر کہنے پر یا دونوں کے جمع ہونے پر؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مقتدی کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ امام جب رکوع سے قومہ کی طرف آجائے اس وقت مقتدی رکوع میں شامل ہوا تو مقتدی کی اس رکعت کو شمار نہیں کیا جائے گا، مقتدی مسبوق کہلائے گا، کیونکہ امام کے ساتھ افعال میں مشارکت ضروری ہے، اور امام کے رکوع سے سر اٹھانے کی وجہ سے مشارکت نہیں پائی گئی۔

لمافی الدر المختار(۲/۶۰): (ولو اقتدی بإمام راكع فوقف حتى رفع الإمام رأسه لم يدرك) المؤتم (الركعة) لأن المشاركة فی جزء من الركن شرط ولم توجد فيكون مسبوقا فياتی بها بعد فراغ الامام بخلاف مالو أدركه فی القيام ولم يركع معه فإنه يصير مدركاً لها فيكون لاحقاً۔

(۱۵۲) امام کو آخری رکعت میں پالینے والے شخص کیلئے بقیہ نماز پڑھنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ اگر کوئی شخص امام کے ساتھ آخری رکعت پالے چار رکعت والی نماز میں، تو نماز پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔ اگر کوئی شخص اس کے بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے بلکہ دو رکعت کے بعد بیٹھے اور تشہد پڑھ کر آخری رکعت کے لئے اٹھے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ جو شخص چار رکعت والی نماز میں امام کے ساتھ ایک رکعت پائے وہ باقی نماز اس طرح ادا

کرے کہ پہلی رکعت میں ثناء، تعوذ، تسمیہ، فاتحہ پڑھے اور ساتھ سورت ملائے اس رکعت میں دوسرے سجدہ کے بعد قعدہ اولیٰ میں بیٹھے اور تشہد پڑھے۔ پھر دوسری رکعت میں تسمیہ پڑھے قرأت کرے پہلی رکعت کی طرح لیکن قعدہ نہ کرے، تیسری رکعت میں صرف فاتحہ پڑھے اور باقی نماز پوری کرے۔

(۲)۔اگر کوئی بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا اگر سجدہ سہو ترک کر دیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافی بدائع الصنائع(۱۶۵/۲): ولو ادرك مع الامام ركعة فى ذوات الأربع، فقام إلى القضاء۔ قضى ركعةً يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة ويتشهد ثم يقوم فيقضى ركعةً أخرى يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة، ولوترك القراء ة فى إحداهما تفسد صلاته لما قلنا وفى الثالثة هو بالخيار والقراء ة أفضل لما عرف۔

وفى الشامية(۵۹۷/۱): وفى الفيض عن المستصفى: لو أدركه فى ركعة الرباعى يقضى ركعتين بفاتحة وسورة ثم يتشهد ثم يأتى بالثالثة بفاتحة خاصة اھ عند أبى حنيفة وقالا: ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتين اولاهما بفاتحة وسورة و ثانيتهما بفاتحة خاصة اھ وظاهر كلامهم اعتماد قول محمد۔

(قوله وتشهد بينهما): قال فى شرح المنية ولو لم يقعد جاز استحساناً لا قياساً ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة أولى من وجه۔

وفى تقريرات الرافعى على الشامية (۷۷/۱): (قوله ولو لم يقعد جاز الخ) المراد بالجواز الصحة بلا اثم نظراً لكون الركعة التى صلاها أولىٰ من وجه لا أصل الصحة اذهى قياس أيضا اذ التشهد واجب ولا الحل بلاكراهة أصلا اذ هى متحققة ثم ظهر أن المراد أنه ترك القعود بينهما اصلا لا التشهد فقط فالقياس الفساد عندهما لأنه هو القعود الأخير۔

(۱۵۳)مسبوق کا امام کے سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز میں شریک ہونا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل رات نماز عشاء میں ہمارے امام صاحب نے کسی غلطی کی بنا پر سجدۂ سہو کیا تو اس وقت ایک آدمی نماز میں شریک ہوا لیکن وہ شخص سجدۂ سہو میں شریک نہیں ہوسکا بلکہ سجدۂ سہو ہو جانے کے بعد نماز میں آکر ملا، آیا اس طرح اس کی نماز ہوگئی؟ اور کیا مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز ہو جائے گی اور مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے۔

لمافی الهندية(۱۲۸/۱): ولا يشترط ان يكون مقتديا به وقت السهو حتى لوأدرك الامام بعدما سها يلزمه ان يسجد مع الامام تبعاله ولودخل معه بعدما سجد سجدة السهو يتابعه فی الثانية ولا يقضی الأولیٰ وان دخل معه بعد ما سجدهما لا يقضيهما كذا فی التبيين۔

وفی الدر المختار (۸۲/۲):(والمسبوق يسجد مع امامه مطلقا) سواء كان السهو قبل الاقتداء أوبعده (ثم يقضی مافاته)۔

(وفی الشامية تحته): (قوله سواء كان السهو قبل الاقتداء أو بعده) بيان للاطلاق وشمل أيضا ماإذا سجد الامام واحدة ثم اقتدى به قال فی البحر فانه يتابعه فی الاخری ولا يقضی قضاء الاولی كما لا يقضيهما ولو اقتدى به بعدما سجدهما۔

(۱۵۴) مسبوق کیلئے امام کے ساتھ قعدہ اخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق درود شریف وغیرہ بھی پڑھے گا یا صرف تشہد پڑھے گا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......مسبوق کو قعدہ اخیرہ میں درود شریف اور دعا وغیرہ نہیں پڑھنا چاہیئے، بلکہ تشہد کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک اس سے فارغ ہو، اگر پہلے فارغ ہوجائے تو کلمۂ شہادت کو مکرر پڑھتا رہے یا پھر خاموش بیٹھا رہے۔

لمافی الهندية(۹۱/۱): ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام فی التشهد الاخير واذا أتم التشهد لايشتغل بما بعده من الدعوات ثم ماذا يفعل تكلموا فيه ومن ابن شجاع انه يكرر التشهد ای قوله اشهد والصحيح ان المسبوق يترسل فی التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام۔

وفی الدر المختار(۵۱۱/۱): واما المسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام امامه۔ وقيل يتم، وقيل يكرر كلمة الشهادة۔

(وفی الشاميه تحته) : (قوله فيترسل) ای يتمهل وهذاماصححه فی الخانية وشرح المنية فی بحث المسبوق من باب السهو وباقی الاقوال مصحح ايضاً۔ قال فی البحر وينبغی الافتاء بما فی الخانية كما لا يخفی۔۔۔۔۔۔وهذا فی قعدة الامام الاخيرة كما هو صريح۔قوله: ليفرغ عند سلام امامه واما فيما قبلها من القعدات فحكمه السكوت كما لايخفی۔

(۱۵۵) تشہد میں مسبوق کا درود شریف پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق قعدہ میں تشہد پڑھنے کے بعد خاموش رہے یا درود شریف وغیرہ پڑھے۔ نیز اگر قدیم اور جدید قضاء نمازیں جمع ہوں تو کیا ترتیب ساقط ہوگی۔ مثلاً زید دس سال سے مسلسل نماز پڑھ رہا ہے جبکہ اس سے پہلے اس کے ذمے بہت سی قضاء نمازیں ہیں۔ اب پھر اس سے ایک نماز چھوٹ گئی تو اس پر صاحب ترتیب کے احکام تو لاگو نہیں ہوں گے؟ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مسبوق امام کے ساتھ قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد درود شریف نہ ملائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تشہد کو اتنا آہستہ پڑھے کہ امام کے سلام پھیرنے تک مکمل کرے اور اگر پڑھ چکا ہے تو شہادتین کو لوٹاتا رہے۔ ایسا شخص جس کی قدیم نمازیں باقی ہوں تو ایسے شخص کو سب سے پہلے اپنی فوت شدہ نمازوں کی فکر کرنی چاہیئے جتنا جلد ممکن ہو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرلے۔ تاہم ایسا شخص صاحب ترتیب نہیں کہلائے گا۔

لما فی الھندیة(۱/۹۱): ومنها ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام فى التشهد الاخير واذا اتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات ثم ما ذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله أشهد ان لا اله الا الله وهو المختار كذا فى الغياثية والصحيح أن المسبوق يترسل فى التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام كذا فى الوجيز للكردرى وفتاوىٰ قاضى خان وهكذا فى الخلاصة وفتح القدير۔

وفى الشامية(۲/): (قوله أوقديمة على المعتمد الخ) كما لو ترك صلاة شهر نسقا ثم أقبل على الصلاة ثم ترك فائتة حادثة فان الوقتية جائزة مع تذكرالفائتة الحادثة لانضمامها إلى الفوائت القديمة وهى كثيرة فلم يجب الترتيب وقال بعضهم إن المسقط الفوائت الحديثة لا القديمة ويجعل الماضى كأن لم يكن زجراً له عن التهاون بالصلوات فلا تجوز الوقتية مع تذكرها وصححه الصدر الشهيد۔ وفى التجنيس وعليه الفتوى وذكر فى المجتبى ان الأول أصح وفى الكافى والمعراج وعليه الفتوىٰ فقد اختلف التصحيح والفتوى كما رأيت والعمل بما وافق إطلاق المتون اولىٰ۔

(۱۵۶) مسبوق کا غلطی سے سلام پھیر دینا اور گھر سے نماز کی نیت کا حکم

سوال......مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق استفسار کرنا تھا:

(ا)۔مسبوق اگرامام کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دے تو اسے سجدہ سہو کرنا ہوگا یا نہیں؟ یعنی ایک سلام پھیرے اور پھر یاد آتے ہی کھڑا ہو جائے تو سجدہ سہو کرے گا یا نہیں؟ اس مسئلے کی تین صورتیں ہیں:

> امام کے پیچھے مقتدی کی غلطی مطلقاً معاف ہے لہٰذا بھول کر اگر درود اور دعا بھی پڑھ لی اور پھر سلام پھیرا (ایک سلام) اور یاد آنے پر کھڑا ہو گیا تو سجدہ سہو کرے گا یا نہیں؟

> درود وغیرہ تو نہ پڑھا ہو مگر غلطی سے سلام پھیر دے تو سجدہ سہو کرے گا یا نہیں؟

> سلام تو نہ پھیرے صرف درود (آدھا یا پورا) پڑھ لے اور پھر یاد آجائے کہ میں مسبوق ہوں۔

مفتی صاحب! آپ تو عالم اور مسائل سے واقف ہیں ہم جاہل لوگ اکثر اس طرح بھول جاتے ہیں اور کشمکش میں پڑ جاتے ہیں برائے مہربانی ہمیں ہر صورت کا حکم بتائیں تینوں صورتوں کا۔ یا اگر خطا مطلقاً آخر تک معاف ہے تو بھی بتائیں کیونکہ ہم مسبوق ہوتے ہیں اور یہ بھولنے کا معاملہ بہت ہوتا ہے۔ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمارا معاملہ حل فرمائیں۔

(۲)۔دوسرا مفتی صاحب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم گھر سے آتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم عصر کی نماز پڑھنے جارہے ہیں مگر مسجد جا کر جب نماز کی تکبیر کہنے لگتے ہیں تو چند سیکنڈ کو تو کچھ نیت نہیں ہوتی اور تکبیر کے تقریباً تین سیکنڈ بعد ہمیں استحضار ہوتا ہے کہ ہم عصر کی نماز میں ہیں۔

مفتی صاحب کیا گھر سے نکلتے وقت کی نیت کافی ہے یا ہر نماز کیلئے کھڑے ہو کر تکبیر سے پہلے دل میں نیت کرنا ضروری ہے۔ مفتی صاحب ضرور بتائیں کیونکہ ہم بہت سی نمازیں ایسے ہی پڑھتے ہیں کہ تکبیر کے بعد ہاتھ باندھنے کے چند سیکنڈوں کے بعد ہمیں یاد آتا ہے۔ کیا ہماری نمازیں ہوگئیں؟ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جواب سے پہلے اصولاً دو باتیں سمجھ لیں۔(۱) امام کے پیچھے مقتدی کی غلطی معاف ہے جب تک کہ آدمی امام کی اقتداء میں رہے۔(۲) مسبوق قعدۂ اخیرہ میں تشہد اس قدر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک فارغ ہو جائے۔

اصول مذکورہ کے پیشِ نظر (جواب یہ ہے) اگر مسبوق نے امام کے ساتھ سلام پھیرا۔ یا امام سے پہلے، تو سجدہ سہو لازم نہ ہوگا۔ چونکہ امام کے پیچھے مقتدی کی غلطی ہے۔ یہی حکم "درود ودعا" پورا یا آدھا پڑھنے کا ہے۔ اور اگر امام کے بعد سلام پھیرا تو سجدہ سہو لازم ہوگا۔ کیونکہ وقتِ خطا امام کی اقتداء نہیں تھی۔ سلام سے اقتداء ختم ہوگئی البتہ عموماً مقتدی امام کے سلام کے بعد ہی سلام پھیرتا ہے نیز حتمی تعین مشکل ہے لہٰذا مسبوق اگر غلطی سے سلام پھیر لے تو اسے سجدہ سہو کر لینا چاہیے۔ جہاں تک نیت کا تعلق ہے۔ تو نیت "دل کے ارادہ" کا نام ہے۔ جب آپ نے گھر سے نکلتے ہوئے عزم کر لیا اور جا کر نماز میں شریک ہو گئے۔ اور کوئی منافی صلوٰۃ کام نہیں کیا۔ مثلاً کھانا، پینا وغیرہ، تو تجدیدِ نیت کی ضرورت نہیں۔ اسی نیت سے نماز ہو جائے گی، واضح رہے کہ چلنا، پھرنا، وضو بنانا وغیرہ "منافی نماز" نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افعال مانع بناء نہیں۔ امید ہے کہ تقریر مذکورہ سے آپ کے سوالات کا جواب مل گیا ہوگا۔

لمافي صحيح البخارى (۲/۱): سمع علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي

الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه۔

وفي جامع الترمذی (۱/۵۱): باب ما جاء أن الإمام ضامن والمؤذن مؤتمن:حدثنا هناد حدثنا أبو الأحوص و أبو معاوية عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الإمام ضامن والمؤذن مؤتمن۔

وفی الشامية (۱/۵۹۹): قوله (وإلا لا) أي وإن سلم معه أو قبله لا يلزمه لأنه مقتد في هاتين الحالتين ح وفي شرح المنية عن المحيط إن سلم في الأولى مقارنا لسلامه فلا سهو عليه لأنه مقتد به وبعده يلزم لأنه منفرد اهـ ثم قال فعلى هذا يراد بالمعية حقيقتها وهو نادر الوقوع اهـ۔

وفی الدر مع الرد (۱/۴۱۶): وفي البدائع خرج من منزله يريد الجماعة فلما انتهى إلى الإمام كبر ولم تحضره النية جاز ومفاده جواز تقديم الاقتداء أيضا فليحفظ

وفی الشامية (۱/۴۱۶): قوله (جاز) وأما اشتراطهم عدم الفاصل بين النية والتكبير فالمراد به ما كان من أعمال الدنيا كما في التاترخانية وفي البحر المراد به الفاصل الأجنبي وهو ما لا يليق بالصلاة كالأكل والشرب والكلام لأن هذه الأفعال تبطل الصلاة فتبطل النية وأما المشي والوضوء فليس بأجنبي ألا ترى أن من أحدث في صلاته له أن يفعل ذلك ولا يمنعه من البناء

(۱۵۷)ایک یادورکعات نکل جانے کی صورت میں تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے؟

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم فرض نماز امام کے ساتھ پڑھیں،اور ہماری ایک یا دورکعت نکل جائے تواب تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد آپ کی بقیہ نماز ''تلاوت'' کے بارے میں شروع کی نماز ہوگی اور''قعدہ وتشہد'' کے سلسلے میں آخری نماز ہوگی یعنی آپ امام کے سلام کے بعد جورکعت پڑھیں گے اس میں پہلی رکعت کی طرح تلاوت کریں گے پھر دوسری رکعت میں دوسری رکعت کی طرح تلاوت کریں اور امام کے بعد جوآپ نے دورکعتیں ادا کیں ہیں اس کے بعد جوقعدہ کریں گے(تشہد پڑھیں گے)وہ آخری ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۹۱):ومنها أنه يقضي أول صلاته في حق القراءة وآخرها في حق التشهد حتى

لوادرك ركعة من المغرب قضى وفصل ركعتين بقعدة فيكون بثلاث قعدات وقرأ فى كل فاتحة وسورة۔

(١٥٨) مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی رکعات میں قراءت کیوں کرتا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض کی آخری دو رکعت میں سورۃ کی قرأت نہیں کی جاتی، لیکن جب کوئی امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اگلی دو رکعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھتا ہے تو اسے حکم دیا جاتا ہے کہ سورت بھی پڑھو، اور اگر کوئی سورت پڑھنا بھول جاتا ہے تو اسے سجدۂ سہو کا حکم ہوتا ہے۔ براہ کرم اس کی وجہ ذرا وضاحت کے ساتھ بتادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے دین کی خدمت میں لگائے رکھے۔

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر کوئی شخص امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے تو اس کی یہ دو رکعتیں آخری دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں اس لئے امام کے سلام کے بعد جو دو رکعت وہ پڑھتا ہے یہ اس کی پہلی دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں، اور فرض کی پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانا واجب ہے اس لئے ان دو رکعتوں میں اس کو سورت پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر سورت پڑھنا بھول جائے تو چونکہ ان دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے ساتھ سورت کا ملانا واجب ہے تو اس واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کو سجدۂ سہو کا حکم دیا جاتا ہے۔

لمافى الهندية (١/٧١): الفصل الثانى فى واجبات الصلاة۔ يجب تعيين الاولين من الثلاثية والرباعية المكتوبتين للقراء ة المفروضة حتى لوقرأ فى الاخريين من الرباعية دون الاولين اوفى احدى الاولين واحدى الاخريين ساهياً وجب عليه سجود السهو كذا فى البحر الرائق: وتجب قرائة الفاتحة وضم السورة أوما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصاراو آية طويلة فى الاولين بعد الفاتحة كذا فى النهر الفائق . . . وكذا ما يقضيه المسبوق بعد فراغ الامام أول صلاته عندنا۔

وفى الشامية(١/٤٤٦): (قوله ومنها القراء ة) اى قراء ة آية من القرآن وهى فرض عملى فى جميع ركعات النفل والوتر وفى ركعتين من الفرض . . . واما تعيين القراء ة فى الاولين من الفرض فهو واجب . . . واما قراء ة الفاتحة والسورة أو ثلاث آيات فهى واجبة ايضاً۔

وفى الدرالمختار(١/٥٩٦): (والمسبوق من سبقه الأمام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتى يثنى ويتعوذ ويقرأ . . . (فيما يقضيه) اى بعد متابعته لامامه، فلو قبلها فالا ظهر الفساد ويقضى اول صلاته فى حق قراء ة، وآخرها فى حق تشهد،

وفيه ايضاً(۸۳/۲): (ثم يقضی مافاته) ولو سها فيه سجد ثانياً۔

(قوله ولو سها فيه) ای فيما يقضيه بعد فراغ الامام يسجد ثانياً لانه منفرد فيه والمنفرد يسجد لسهوه۔

(۱۵۹) مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص یعنی مسبوق امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، امام نے جیسے ہی سجدہ سہو کیلئے دائیں طرف سلام پھیر لیا تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا، لیکن امام بائیں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو میں چلا گیا تو کیا یہ مسبوق بھی امام کے ساتھ سجدہ سہو میں چلا جائے؟ اور مسبوق پر اس طرح فعل کرنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی الهندية(۱۲۸/۱): ولوسلم الامام فقام المسبوق ثم تذكر الامام ان عليه سهواً فسجد له قبل ان يقيد المسبوق الركعة بسجدة فعليه ان يرفض ذلك ويعود الى متابعته ثم اذا سلم الامام قام الى القضاء. ولا يعتد بما فعل من القيام والقراءة والركوع ولو لم يعد الى متابعة الامام ومضى على قضائه فانه تجوز صلوته ويسجد للسهو بعد فراغه استحساناً۔

وفی الشامية (۵۹۸/۱) : والحاصل انه اذا لم يقيد ماقام اليه بسجدة لم يصر منفردا ويرتفض فلولم يتابع امامه فسدت صلوته وقد اطلق الفساد هنا فی الفتح وغيره لكن فصل فی الذخيرة فی تذكر التلاوية بانه ان لم يتابع الامام فيها ينظران وجد منه قيام وقراءة بعد فراغ الامام من القعدة الثانية مقدار ماتجوز به الصلوة جازت صلوته والا فلا۔

وفی الدر المختار (۵۹۸/۱) وهذا كله قبل تقييد ماقام اليه بسجدة اما بعده فتفسد فی صلبية مطلقا وكذا فی تلاوية وسهو ان تابع والا لا۔

(۱۶۰) مسبوق اپنی بقیہ رکعات کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جب وہ کبھی مسبوق ہوتا ہے تو امام کے سلام پھیرتے ہی وہ فوراً کھڑا ہو جاتا ہے تو امام کے سلام کے کتنی دیر بعد مسبوق کو اُٹھنا چاہیئے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......آپ کے دوست کو امام کے سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ امام کی فراغت کا

انتظار کرے تاکہ امام پر سجدہ سہو ہونے کی صورت میں یہ اس میں شریک ہو سکے۔

لما فی الهندية (۱/۹۱): انه لايقوم الى القضاء بعد التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام۔

وفی الدر المختار (۱/۵۹۷): وينبغى أن يصبر حتى يفهم أنه لاسهو على الامام۔

وفی الشامية تحته: (قوله وينبغى أن يصبر الخ) أى لايقوم بعد التسليمة أو التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كما فى الفيض والفتح والبحر: قال الزند ويستى فى النظم يمكث حتى يقوم الامام الى تطوعه أويستند الى المحراب ان كان لاتطوع بعدها، قال فى الحلية: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لاسهو على الامام أو يوجد له مايقطع حرمة الصلاة۔

(۱۶۱) مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جماعت میں شامل ہوا اس وقت ایک رکعت مکمل ہو چکی تھی، امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الشمس اور دوسری میں سورۃ واللیل پڑھی ہے یہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رکعت پوری کرے گا، اب اس مسبوق کیلئے سورتوں کی ترتیب ضروری ہے کہ نہیں یا یہ کوئی بھی سورت مثلاً اخلاص، کافرون وغیرہ پڑھ سکتا ہے؟ ترتیب کو الٹنے سے کراہت آئے گی یا نہیں جبکہ مکمل نماز میں سورتوں کی ترتیب ضروری ہے ورنہ کراہت آتی ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب ضروری نہیں ہے اس لئے کہ مسبوق اپنی بقیہ نماز میں منفرد کے حکم میں ہوتا ہے۔

لما فی المبسوط (۱/۱۸۶): لان المسبوق فيمايقضى كالمنفرد حتى تلزمه القراءة وسجود السهو اذا سها

وفی الدر المختار (۱/۵۹۶): والمسبوق من سبقه الامام بها او ببعضها وهو منفرد۔

(۱۶۲) مسبوق اگر اپنی پہلی رکعت میں سورت نہ ملائے تو اس کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں ظہر کی نماز میں تاخیر سے پہنچا اور جماعت کھڑی تھی، میں جماعت میں شریک ہوا، اور ایک رکعت مل گئی امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد میں نے بقایا تین رکعات اس طرح پڑھیں کہ پہلی رکعت میں صرف الحمد شریف پڑھی اور قعدہ کرلیا اس کے بعد دو رکعات میں الحمد کے ساتھ سورۃ بھی ملالی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے میری نماز ادا ہوگئی ہے یا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نیز اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں جب آپ امام کے ساتھ آخری رکعت میں شریک ہوئے تو بقیہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پہلی اور دوسری رکعت میں الحمد شریف کے ساتھ دوسری کوئی سورت

تے اور اگر پہلی رکعت میں ملانا بھول گئے تو آخر میں سجدہ سہو کرتے لیکن چونکہ آپ نے اس طرح نہیں کیا، لہٰذا آپ پر دوبارہ نماز پڑھنا واجب اور ضروری ہے اگر آپ دوبارہ نماز نہیں لوٹائیں گے تو گناہگار ہوں گے۔

لمافی خلاصة الفتاوىٰ(۱/۱۶۶،۱۶۵): والمسبوق فيما يقضي يقضي اول صلاته في حق القرائة واخر صلوته في حق التشهد حتى لو ادرك مع الامام ركعة من المغرب ثم قام الى قضائه بعد تسليم الامام فانه يقضي ركعتين ويقرأ في ركعة بالفاتحة والسورة ولو ترك القراءة في احداهما تفسد صلوته وعليه ان يقضي ركعة ويتشهد ثم ركعة اخرى ويتشهد ويسلم۔

وفي الشامية(۱/۴۵۹): اعلم ان في محل القرائة المفروضه في الفرض ثلاثة اقوال الاول ان محلها الركعتان الاوليان عينا وصححه في البدائع۔ الثاني ان محلها ركعتان منها غير عين: اى فيكون تعيينها في الاوليين واجبا وهو المشهور في المذهب الثالث ان تعيينها فيهما افضل وعليه مشى في غاية البيان وهو ضعيف والقولان الاولان اتفقا على ان لو قرأ في الاخريين فقط يصح ويلزمه سجود السهو لو ساهيا لكن سببه على الاول تغيير الفرض عن محله وتكون قراء ته قضاء عن قرأته في الاوليين وسببه على الثاني ترك الواجب و تكون قرائته في الاخريين اداء... والحاصل انه قيل ان محل القراءة ركعتان من الفرض غير عين وكونها في الاوليين افضل وقيل ان محلها الاوليان منه عينا فيجب كونها فيهما وهو المشهور في المذهب الذى عليه المتون وهو المصحح وعلمت تأييده بما مرفي عبارة البحر عن البدائع من مسألة المسافر والمسبوق وقال القهستاني: انه الصحيح من مذهب اصحابنا۔

وفيه ايضاً(۱/۴۵۶): (ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو ان لم يسجد له وان لم يعدها يكون فاسقا آثما وكذا كل صلاة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها۔

۱۶۳) مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں؟

ل......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ایک یا دو رکعات کے بعد امام کیساتھ شریک ہوا نے آخری رکعت میں سجدہ سہو کیلئے سلام پھیرا اور سجدہ سہو کیا تو پیچھے اس مسبوق نے بھی امام کیساتھ سلام پھیر دیا اور بعد میں کھڑے ر اپنی نماز پوری کرلی، اب سوال یہ ہے کہ مسبوق کے امام کیساتھ سلام پھیرنے سے مسبوق کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ اور اس پر سجدۂ سہو ب تو نہیں؟

ب بعون الملک الوھاب......سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ مسبوق سجدہ سہو میں تو امام کی متابعت کریگا یعنی سجدہ

سہواً امام کیساتھ ادا کریگا البتہ سلام میں امام کی متابعت نہیں کریگا یعنی بغیر سلام پھیرے امام کیساتھ سجدہ میں جائیگا، اب صورت مسئولہ کو سمجھیے، اگر مسبوق نے امام کیساتھ سلام پھیر لیا تو پھر اگر قصداً سلام پھیرا ہے (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہوگئی اور اگر قصداً سلام نہیں پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور سجدہ سہو بھی لازم نہ ہوگا، اسی طرح جب امام نماز ختم کرنے کیلئے سلام پھیرے تو اس سلام میں بھی مسبوق امام کی متابعت نہ کرے اگر اس آخری سلام میں مسبوق نے امام کیساتھ قصداً سلام پھیر لیا (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہو جائیگی اور اگر سہواً سلام پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور یہ سلام جو مسبوق نے سہواً پھیرا ہے اگر یہ سلام، امام کے سلام سے کچھ پہلے یا متصل واقع ہوا ہو تو مسبوق پر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا کیونکہ مسبوق مقتدی کے حکم میں ہے اور امام کے ساتھ مقتدی جب سہو کرلے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر مسبوق نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا تو اپنی نماز کے آخر میں اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا کیونکہ اب یہ منفرد ہو گیا۔

لمافی الشامية (۲/۸۲): (قوله، والمسبوق يسجدمع امامه) قيدبالسجود لانه لايتابعه فى السلام بل يسجدمعه ويتشهدفاذاسلم الامام قام الى القضاء فان سلم فان كان عامدافسدت والالا ولاسجود عليه ان سلم سهواقبل الامام اومعه وان سلم بعده لزمه لكونه منفردا حينئذ۔

(۱۶۴) مسبوق کا اپنی بقیہ رکعات میں قرآت بھول جانے پر سجدۂ سہو نہ کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد آ کر جماعت میں شریک ہوا، اور جب امام نے سلام پھیر دیا تو کھڑے ہو کر اپنی بقیہ دو رکعت پڑھنے لگا، ان دو رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا بھول گیا۔ لیکن چونکہ اس نے آخری دو رکعت امام کے ساتھ پڑھیں تھیں اس وجہ سے اس نے ان دو رکعتوں میں چھوٹنے والی سورت کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں کیا تو آیا اس کی نماز ہوگئی؟ یا اس کا اعادہ کرنا لازم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسبوق آدمی (جس کی ابتداء امام سے کچھ رکعتیں رہ گئی ہوں) وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں منفرد یعنی اکیلے نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی کرے تو اس کے ذمہ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا واجب ہے اسی طرح اگر اس سے کچھ سہو ہو جائے اپنی بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں تو اس پر سجدہ سہو کرنا بھی لازم ہوتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص پر واجب کے ترک یعنی پہلی دو رکعتوں میں سورت چھوڑنے کی بناء پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے اور مذکورہ شخص کا اس بات کو علت ومدار بنانا کہ میں نے چونکہ آخری دو رکعتیں امام کے ساتھ پڑھی تھیں اس لئے سجدہ سہو نہیں کیا یہ بات صحیح نہیں۔

لمافی المبسوط للامام السرخسی (۱/۲۲۰): قال وان سها عن القراءة فى الاولیین فعليه سجود

السهو لان القراءة ركن والاوليان تعينتا لاداء هذا الركن واجبا وبترك الواجب يتمكن النقصان في الصلاة۔

وفي الهندية (۱/۹۱): ولو ادرك ركعتين قفى ركعتين بقراءة ولو ترك في احدهما فسدت. وفي (ص۱۲۶): ولا يجب السجود الا بترك واجب او تاخيره....... ولو قرأ الفاتحة وحدها وترك السورة يجب عليه سجود السهو وكذا لو قرأ مع الفاتحة آية قصيرة كذا في التبيين۔

(۱۶۵) سجدہ میں سوجانے اور نیند یا کسی اور وجہ سے مقتدی کے لاحق ہو جانے کا حکم

سوال.....: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دکان پر کام کرتا ہوں اور رات دیر تک دکان کھلی رہتی ہے اس لئے صبح کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے آج صبح کی نماز میں میں پہلے سجدہ میں سوگیا اور جب آنکھ کھلی تو امام صاحب کھڑے تھے میں بھی کھڑا ہو گیا اور آخر میں امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی تو میری یہ نماز ہوئی یا نہیں؟ نہیں ہوئی تو کس طرح ادا کروں از سرنو ادا کروں یا آخر میں امام کے سلام کے بعد سجدہ سہو کر کے ادا کروں۔ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب آپ سجدہ میں سوگئے، اگر اس حالت میں سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار نہ رہی تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹ گیا، اور نماز بھی جاتی رہی۔ سجدہ کی مسنون کیفیت سے مراد یہ ہے کہ حالت سجدہ میں انسان کا پیٹ رانوں سے اور بازو پہلوؤں سے الگ رہیں اور اگر سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار رہی، تو آنکھ کھلنے پر آپ کو چاہیئے تھا کہ پہلے دوسرا سجدہ جو آپ سے چھوٹ گیا تھا، ادا کرتے اور پھر امام کے ساتھ رکعت میں شریک ہو جاتے، تو آپ کی نماز درست ہو جاتی، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا۔ پھر بھی اگر آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد چھوٹا ہوا سجدہ ادا کر کے سلام پھیر دیتے، تب بھی آپ کی نماز درست ہو جاتی۔ لیکن چونکہ آپ نے ان صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کی بلکہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا، حالانکہ سجدہ سہو سے فرض کا تدارک نہیں ہوتا، اور نہ ہی لاحق (جو شروع سے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو، اور بیچ میں نماز کا کچھ حصہ عذر کی بنا پر چھوٹ جائے) پر سجدہ سہو آتا ہے۔ اور فرض کے رہ جانے سے نماز نماز ہی نہیں رہتی لہٰذا اب آپ کو چاہیے کہ اپنی نماز کی از سرنو قضا کریں۔

لما في الهندية (۱/۹۲): واذا كبر مع الامام ثم نام حتى صلى الامام ركعة ثم انتبه فانه يصلي الركعة الاولى وان كان الامام يصلي الركعة الثانية هكذا في الذخيرة ولو لم يشتغل بقضاء ما سبقه الامام ولكن يتابع الامام اولا ثم قضى ما سبقه الامام بعد تسليم الامام جازت صلاته عندنا۔

وفي الشامية (۱/۱۴۱): (قوله وساجدا) وكذا قائما وراكعا بالاولى والهيئة المسنونة بان يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه كما في البحر. قال ط: وظاهره ان المراد الهيئة المسنونة في حق الرجل لا المرأة۔

فصل فی القراءۃ

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۶۶) نماز میں منہ ہی منہ میں قراءت کا حکم

سوال......سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ منہ ہی منہ میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافی الھندیة(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجھر والمخافتة قال الفقیه ابو جعفر والشیخ الامام ابو بکر... ادنی الجھر ان یسمع غیرہ وادنی المخافتة ان یسمع نفسه وعلی ھذا یعتمد کذا فی المحیط۔ وھو الصحیح کذا فی الوقایة والنقایة۔ وبه اخذ عامة المشایخ، ولو کان بحیث تجاوز شفتیه حتی لو قرب انسان صماخه من فمه یدخل صوته فی اذنه وفھم مایقرأ فھذہ مجمجة (۱) کذا فی الخلاصة۔

وفی الشامیة (۱/۵۳۴): فشرط الھندوانی والفضلی لوجودھا خروج صوت یصل الی اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المریسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم یصل الی اذنه... ولم یشترط الکرخی وابوبکرالبلخی السماع واکتفیابتصحیح الحروف۔ واختار شیخ الاسلام وقاضیخان وصاحب المحیط والحلوانی قول الھندوانی... وان ما قاله الھندوانی اصح وارجح لاعتماد اکثر علمائنا علیه۔

(۱۶۷) نماز میں دل ہی دل میں تلاوت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں الحمدللہ ایک عرصہ سے نماز پابندی سے پڑھ رہا ہو

میں نے اپنی قضائے عمری بھی پوری کرلی ہے۔ایک صاحب سے ایک دن باتوں باتوں میں اس مسئلے کا پتا چلا کہ نماز میں تلاوت زبان سے کرنا ضروری ہے، حالانکہ میں تو اب تک ساری نمازوں میں تلاوت وغیرہ دل ہی دل میں کرتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں بڑا پریشان ہوں کہ میری گزشتہ نمازوں کا کیا ہوگا؟ کیا دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی؟ مہربانی فرما کر اس مسئلے کا حل جلد مرحمت فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز میں تلاوت زبان سے کرنا ضروری ہے اور دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی لہٰذا جتنی نمازیں آپ نے اس طرح اکیلے پڑھی ہیں وہ ادا نہیں ہوئیں لہٰذا ان نمازوں کا اعادہ کرنا لازم ہے۔

لمافی بدائع الصنائع (۱/۱۶۲،۱۶۱): ثم المنفرد اذا خافت واسمع أذنيه يجوز بلا خلاف لوجود القرائة بيقين اذ السماع بدون القرائة لا يتصور وأما اذا صحح الحروف بلسانه وأداها على وجهها ولم يسمع أذنيه ولكن وقع له العلم بتحريك اللسان وخروج الحروف من مخارجها فهل تجوز صلاته اختلف فيه ذكر الكرخي أنه يجوز وهو قول أبي بكر البلخي المعروف بالأعمش وعن الشيخ أبي القاسم الصفار والفقيه أبي جعفر الهندواني والشيخ الامام أبي بكر محمد بن الفضل البخارى انه لا يجوز مالم يسمع نفسه و عن بشر بن غياث المريسي انه قال ان كان بحال لو أدنى رجل صماخ أذنيه الى فيه سمع كفى وإلا فلا ومنهم من ذكر فى المسئلة خلافاً بين أبي يوسف ومحمد فقال على قول أبي يوسف يجوز وعلى قول محمد لا يجوز وجه قول الكرخي أن القراءة فعل اللسان وذلك بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص وقدوجد فأما اسماعه نفسه فلا عبرة به لأن السماع فعل الأذنين دون اللسان... وما قاله الكرخي أقيس وأصح۔

وفى الشامية(۱/۵۳۴): اعلم انهم اختلفوا فى حد وجود القرائة على ثلاثة أقوال فشرط الهندواني والفضلي لوجودها خروج صوت يصل إلى أذنه وبه قال الشافعي۔ وشرط بشر المريسي وأحمد خروج الصوت من الفم وإن لم يصل إلى أذنه لكن بشرط كونه مسموعاً فى الجملة حتى لو أدنى أحدصماخه إلى فيه يسمع ولم يشترط الكرخي وأبو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الحروف... وذكر أن كلامن قولى الهندواني والكرخي مصححان وأن ما قاله الهندواني أصح وأرجح لاعتماد أكثر علمائنا عليه۔

(۱۶۸) سری نمازوں میں قرأت میں تصحیح حروف ضروری ہے یا پھر آواز کا سنائی دینا بھی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا

آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں تلاوت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافی الهندية(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل ادنی الجهر ان يسمع غيره وادنی المخافتة ان يسمع نفسه وعلی هذا يعتمد كذا فی المحيط۔ وهو الصحيح كذا فی الوقاية والنقاية۔ وبه اخذ عامة المشايخ كذا الزاهدی ولو كان بحيث تجاوز شفتيه حتی لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته فی اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجه كذا فی الخلاصة۔

وفی الشامية (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الی اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المريسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الی اذنه... ولم يشترط الكرخی وابوبكرالبلخی السماع واكتفيابتصحيح الحروف۔ واختار شيخ الاسلام۔ وقاضيخان وصاحب المحيط والحلوانی قول الهندوانی.... وأن ما قاله الهندوانی اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه۔

(۱۶۹)''ض'' کی ادائیگی کا طریقہ اور اس میں تعامل عرب

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ''ض'' کی ادائیگی میں جو اختلاف ہے براہ کرم اس کی صحیح وضاحت فرمادیں کہ کونسا طریقہ افضل ہے''دال'' کی آواز میں پڑھنا افضل ہے یا ''ظا''، ''ذال'' کی آواز میں پڑھنا افضل ہے اور یہ بھی وضاحت سے بتادیں کہ تعامل عرب کیا ہے؟ کیونکہ حدیث میں ہے کہ قرآن کو عرب کے طرز میں پڑھیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جمہور قراء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ حرف ضاد کا مخرج اصلی حافہ لسان یعنی زبان کی دائیں، بائیں کروٹ اور اس کی متصل داڑھیں ہیں۔جس کی آواز ظاء معجمہ کے مشابہ ہے البتہ دال کے مشابہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کتب فقہ اور قرأت کی کتابوں میں اس کی تشریحات موجود ہیں اور چونکہ حرف ضاد، ظا کے مشابہ ہے تو قراء کرام نے ضاد کو صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے یہ فرمایا ہے کہ اس کو بذریعہ استطالت اور ظاء سے ممتاز کر کے پڑھا جائے تا کہ ہر ایک میں امتیاز ہو سکے۔البتہ اگر کوئی قاری کوشش کے باوجود بھی حرف ضاد کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے تو پھر فقہاء کرام نے گنجائش رکھی ہے کہ اگر دال یا ذال، یا ظا میں سے جس کے مشابہ بھی پڑھا جائیگا عموم بلویٰ کے تحت اس کی نماز درست قرار دی جائے گی،البتہ اگر کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ جان بوجھ کر غلط پڑھتا ہے تو پھر نماز فاسد ہو جائے گی۔

لما فی الشامیة (۱/۶۳۲): وفی التاتارخانیة عن الحاوی حکی عن الصفار انه کان یقول الخطأ اذا دخل فی الحروف لایفسد لان فیه بلوی عامة الناس لانهم لایقیمون الحروف الا بمشقة. اھ
وفیها اذا لم یکن بین الحرفین اتحاد المخرج ولا قربه الا ان فیه بلوی العامة کالذال مکان الصاد أو الزای المحض مکان الذال والظاء مکان الضاد لاتفسد عند بعض المشایخ۔
وفیه ایضاً(۱/۶۳۳): ان تعمد ذلک تفسد وان جری علی لسانه أو لایعرف التمیز لاتفسد وهو المختار حلیة وفی البزازیة وهو أعدل الاقاویل وهو المختار۔

(۱۷۰) ظہر وعصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنے کی وجہ

سوال:.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت آہستہ کیوں کی جاتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں قرأت زور سے کی جاتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں تمام نمازوں کے اندر قرأت جہر (اونچی آواز) کے ساتھ پڑھتے تھے یہاں تک کہ کفار نے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے اور ان کی نمازوں میں خلل ڈالنے کیلئے قرأت کے دوران شور مچانے کا مشورہ کیا۔ظہر اور عصر ان دو اوقات میں یہ لوگ فارغ ہوتے تھے، اسی لئے ان اوقات میں تکلیف پہنچانے اور اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کیلئے تیار بیٹھے رہتے تھے بخلاف باقی تین اوقات کے کہ ان میں یہ لوگ مصروف رہتے تھے اس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ضرر سے بچنے کیلئے ظہر اور عصر کی نمازوں کی قرأت آہستہ پڑھنا شروع کی اور چونکہ اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاحیات مواظبت اختیار کی اس وجہ سے یہ عمل واجب قرار پایا۔ جمعہ اور عیدین میں چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوتی تھی اور یہ نمازیں شہر میں ادا ہوتی تھیں اور کفار کو شہر میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی قوت حاصل نہیں تھی اس لئے جمعہ اور عیدین میں قرأت جہراً ہوا کرتی تھی۔

اب بھی ظہر اور عصر میں آہستہ قرأت پڑھنا حکمت اور فائدے سے خالی نہیں۔ یہ کہ قرأت رکن ہے جس کو امام قوم کی طرف سے ادا کرتا ہے تو جہر اس لئے کرتا ہے کہ اس میں فکر کریں اور ان کو بھی فائدہ حاصل ہو، لیکن ظہر اور عصر کی نمازوں میں لوگوں کے دل عموماً اپنے کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں جن کو چھوڑ کر لوگ نماز کیلئے آئے ہوتے ہیں اس وجہ سے حقیقی معنوں میں قرأت میں فکر کرنا مشکل ہے۔اس لئے ظہر اور عصر میں قرأت جہراً مفید نہیں بلکہ سراً مفید ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان میں لوگ فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور پوری توجہ قرأت کی طرف یکسوئی کے ساتھ مبذول کی جاسکتی ہے اس لئے اس میں قرأت جہراً مفید ہے جمعہ اور عیدین کا خاص دن ہونے کی وجہ سے ان میں تیاری کر کے اہتمام کے ساتھ آتے ہیں۔اور فارغ البال ہو کر توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۶۸۳،۶۸۲): ویجب علیه المخافتة فیما یخافت وانما کان کذلک لأن القراءة رکن یتحمله الامام عن القوم فعلا فیجهر لیتأمل القوم ویتفکروا فی ذلک فتحصل

ثمرة القراء ة وفائدتها للقوم فتصير قراء ة الامام قراء ة لهم تقديرا كأنهم قرؤوا وثمرة الجهر تفوت فی صلوة النهار لأن الناس فی الاغلب يحضرون الجماعات فی خلال الكسب والتصرف والانتشار فی الارض فكانت قلوبهم متعلقة بذلك فيشغلهم ذلك عن حقيقة التأمل فلا يكون الجهر مفيداً بل يقع تسبيباً الی الاثم بترك التأمل۔

وفی المبسوط للسرخسی(۱/۱۷): وقد كان النبی ﷺ فی الابتداء يجهر بالقرآن فی الصلاة كلها وكان المشركون يؤذونه ويسبون من أنزل ومن أنزل عليه فأنزل الله تعالیٰ ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا فكان يخافت بعد ذلك فی صلاة الظهر والعصر لأنهم كانوا مستعدين للأذی فی هذين الوقتين ويجهر فی صلاة المغرب لأنهم كانوا مشغولين بالأكل وفی صلاة العشاء والفجر لأنهم كانوا نياما ولهذا جهر فی الجمعة والعيدين لأنه اقامها بالمدينة وما كان للكفار بها قوة الأذی۔

وفی الدر المختار(۱/۵۳۳): وكان عليه الصلاة والسلام يجهر فی الكل ثم تركه فی الظهر والعصر لدفع أذی الكفار۔

(۱۷۱) قراتِ شاذہ سے تلاوت

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا کیسا ہے اور اگر نماز میں پڑھے تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب……نماز میں قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا بذات خود تو منع نہیں ہے،مگر عام مجمعوں میں اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔کیونکہ یہ طریقہ ناواقف لوگوں میں شکوک وشبہات کا باعث بن سکتا ہے۔اس لئے عام مجمعوں میں قرأتِ حفص سے ہی تلاوت کرنی چاہیئے۔

لمافی الهندية(۱/۷۹): فی الحجة قراء ة القران بالقراء ات السبعة والروايات كلها جائزة۔ ولكنی أری الصواب أن لايقرأ القراء ة العجيبة بالامالات والروايات الغريبة۔

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۲۰۳) : (قوله ومنها القراء ة) أی من القرآن المنقول عن الرسول عليه الصلاة والسلام متواترا فلا يقرأ بالشواذ وان قرأ بها لا تفسد ولا يعتد بها۔

وفی الشامية(۱/۵۴۴):۔ حاصل معنی كلام هذ ين الشيخين بيان وجه الكراهة فی المداومة۔ وهو أنه ان رأی ذالك حتماً يكره من حيث تغيير المشروع، وإلايكره من حيث إيهام

الجاھل۔

(۱۷۲) قراءۃ سبعہ أو عشرۃ کی نماز میں تلاوت اور مخفف کو مشدد یا برعکس پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ''مسجد خالد بن ولیدؓ'' میں امام ہے یہ مسجد چونکہ ہمارے گھر کے قریب ہے اس لئے میں اکثر نمازیں وہاں پڑھتا ہوں، لیکن امام صاحب عام طور پر مشدد الفاظ کو غیر مشدد کر کے پڑھتے ہیں کبھی کبھی غیر مشدد الفاظ کو مشدد کر کے ادا کرتے ہیں، ایک دن میرے ایک دوست (جو کہ حافظ قرآن اور اچھے قاری ہیں) تشریف لائے تھے جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو حافظ صاحب نے کہا کہ تمہارے امام صاحب تو قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں شاید اس سے نماز فاسد ہوتی ہو۔ لہٰذا آپ کسی مفتی صاحب سے معلوم کرلیں، لیکن پہلے میں نے جا کر اپنے امام صاحب سے پوچھ لیا تو انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کی ایک ہی قرأت نہیں بلکہ بہت ساری قرائتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو نماز میں پڑھنا جائز ہے۔ لیکن مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہ اب تک یہ بات ہم نے کسی سے نہیں سنی تھی۔ لہٰذا مفتی صاحب برائے مہربانی آپ فرمائیں کیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہوجاتی ہے؟ کیا امام صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن پڑھنے کی بہت سی قرأتیں ہیں یہ بات صحیح ہے اور جتنی نمازیں اب تک ہم نے پڑھی ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... قراءۃ سبعہ او عشرہ (جو کہ مشہور ''سبعہ عشرۃ'' سے ہیں) اگرچہ نماز میں پڑھنا درست ہے لیکن أئمہ کرام کیلئے بہتر یہی ہے کہ جو مشہور روایت (امام حفصؒ کی روایت) عام طور پر پڑھی جاتی ہے اس کی تلاوت کریں کیونکہ عوام دوسری روایات کے متعلق علم نہیں رکھتے اس لئے وہ بعض اوقات ان روایات کو صحیح نہیں سمجھتے حالانکہ ان کے صحیح ہونے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں۔ لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے روایت حفص میں ہی قرأت کی جائے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم رکھتے ہیں اور پھر کسی روایت کے تحت مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھ رہے ہیں تو ان کیلئے اس طرح پڑھنا جائز ہوگا گو مصلحت کے تحت مناسب نہیں۔ لیکن اگر وہ قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم نہیں رکھتے بلکہ مشہور قرأت حفص میں ہی تلاوت کرتے ہوئے مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھتے ہیں تو اب دیکھا جائے گا اگر اس سے معنی میں تغیر فحش پیدا نہیں ہوا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

لمافی الصحیح للبخاری(۲/۷۴۷): حدثناہ انھما سمعا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ... ثم قال اقرأ یا عمر فقرأت القرائۃ التی اقرأنی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذلک انزلت ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرؤا ماتیسر منہ۔

وفى التاتارخانية(۱/۴۹۲): فى ترك المد والتشديد فى موضعهما والاتيان بهما فى غير موضعهما ان كان لا يغير المعنى ولا يقبح الكلام لايوجب فساد الصلوة وان كان يغير المعنى ويقبح الكلام اختلف المشائخ: قال بعضهم: لا تفسد الصلوٰة: وقال عامتهم تفسد صلاته، وفى النصاب وعليه الفتوى۔

مثال الاول فى ترك التشديد اذا قرا ''ملعونين اينما ثقفوا اخذوا وقتلوا'' بغير تشديد لا تفسد صلوته لانه قريب من ''قتّلوا'' بالتشديد... المثال الثانى... ولو قرا ''فمن اظلم ممن كذب على الله شدد الذال فى ''كذب'' اختلف المشائخ فيه وفى الغياثيه قال بعضهم لاتفسد، وعليه الفتوىٰ۔

ولو قرأ ''فاولئك هم العادون' وشدد الدال تفسد صلاته بلا خلاف......

وفى الهندية (۱/۷۹): فى الحجة قرائة القران القرائات السبعة والروايات كلها جائز ولكنى ارى الصواب ان لا يقرأ القرائة العجيبة بالامالات والروايات الغريبة كذا فى التاتارخانية۔

وفى الشامية(۱/۵۴۱): (قوله ويجوز بالروايات السبع) بل يجوز بالعشر ايضاً كما نص عليه اهل الاصول (قوله بالغريبة) اى بالروايات الغريبة والامالات، لأن بعض السفهاء يقولون مالا يغلمون فيقعون فى الاثم والشقاء، ولا ينبغى للأمة ان يحملوا العوام على مافيه نقصان دينهم ولا يقرأ عندهم مثل قراءة ابى جعفر وابن عامر وعلى بن حمزة والكسائى صيانة لدينهم فلعلهم يستخفون او يضحكون وان كان كل القرائات والروايات صحيحة فصيحة، ومشايخنا اختاروا قراءة ابى عمر وحفص عن عاصم من التاتارخانية عن فتاوىٰ الحجة۔

(۱۷۳) نماز میں قرأت کے چند متفرق مسائل

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں ترتیب سورۃ (مثلاً اگر پہلی رکعت میں سورۃ فیل پڑھی ہے تو دوسری رکعت میں سورۃ قریش پڑھیں نہ کہ سورۃ ہمزہ) کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور بصورت عدم لحاظ ترتیب شرعی حکم کیا ہوگا؟ اسی طرح ہر رکعت میں ایک ہی سورت پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ اسی طرح پہلی رکعت میں سورۃ نصر اور دوسری میں سورۃ اخلاص پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز پہلی رکعت میں طویل قرأت اور دوسری رکعت میں مختصر قرأت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور اس کا لحاظ نہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ ان تمام مسائل میں فرض، سنن اور نوافل کے اعتبار سے کوئی فرق ہے؟ اگر کسی شخص کو وتر میں یہ ہی یاد نہ ہو کہ اس نے دعائے قنوت پڑھی یا نہیں تو ایسے شخص پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی غلطی سے تیسری رکعت میں قعدہ کرلے پھر یاد آ۔۔

پر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو یا بغیر تکبیر کہے کھڑا ہو کر چوتھی رکعت مکمل کرے۔ آیا اس کی نماز ہو گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... فرض نماز میں سورتوں کی ترتیب بلحاظ قراءت ملحوظ رکھنی چاہیئے اگر کوئی عدم ترتیب کو عادت بنائے گا تو گناہ گار ہوگا اور قصداً منکوس قراءت کرنا (یعنی پہلی رکعت میں بعد والی سورت اور دوسری رکعت میں اس سے اوپر والی سورت پڑھنا) مکروہ ہے۔ البتہ اگر نفل میں کوئی اس طرح کرے تو کوئی حرج نہیں۔ نیز فرض کی ہر رکعت میں ایک ہی سورت پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، نفل میں نہیں۔ اسی طرح فرض نماز میں چھوٹی سورتوں میں بیچ میں ایک سورت چھوڑنا مکروہ ہے، دو یا دو سے زیادہ یا ایک بڑی سورت چھوڑے تو یہ مکروہ نہیں۔ پہلی رکعت میں طویل قراءت اور دوسری میں مختصر قرأت کرنا فجر میں سنت ہے اور باقی نمازوں میں اولیٰ ہے اور اس کے برعکس کرنے میں اگر دوسری رکعت تین آیات کی مقدار سے زیادہ طویل ہو جائے تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔ اگر کسی کو وتر میں یہ یاد ہی نہ ہو کہ قنوت پڑھی ہے یا نہیں تو اس کو آخر میں سجدہ سہو کر لینا چاہیئے۔ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی تیسری رکعت میں قعدہ کرلے تو پھر یاد آنے پر بغیر تکبیر کہے کھڑا ہو جائے اور اگر تین تسبیح کے بقدر بیٹھا ہو تو آخر میں سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔

لمافی صحيح البخاری(۱/۱۰۷): عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابيه رضی الله عنه ان النبی صلی الله علیه وسلم كان يقرء فی الظهر فی الاولیين بام الكتاب وسورتين وفی الركعتين الاخريين بام الكتاب ويسمعنا الآية ويطول فی الركعة الاولیٰ مالا يطيل فی الركعة الثانية وهكذا فی العصر وهكذا فی الصبح۔

وفی حاشية الطحطاوی (۴۷۴): (قوله: وجب عليه سجود السهو) إذا شغله التفكر عن اداء واجب بقدر ركن... ...وهو مقدر بثلاث تسبيحات. ثم ان محل وجوب سجود السهو إذا لم يشتغل حالة الشك بقرأة ولا تسبيح اهـ۔

وفی الدر المختار(۱/۵۴۲.۵۴۱): (وتطال اولی الفجر علی ثانيتها) بقدر الثلث وقيل النصف ندبا فلوفحش لابأس به (فقط) وقال محمد: ولی الكل حتی التراويح قيل وعليه الفتوی (واطالة الثانية علی الاولی يكره) تنزيها(اجماعا ان بثلث آيات) ان تقاربت طولا وقصرا والاعتبر الحروف والكلمات ...... (صـ۵۴۳) (وان باقل لا) يكره۔

وفی الدر المختار(۱/۵۴۷.۵۴۶): لابأس ان يقرأ سورة ويعيد ها فی الثانية وان يقرأ فی الاولی من محل وفی الثانية من آخر ولومن سورة ان كان بينهما ايتان فأكثر ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفی القنية قرأ فی الاولی الكافرون وفی الثانية الم تر أوتبت، ثم ذكر يتم وقيل يقطع ويبدء ولايكره فی النفل شئ من ذلك

وفی الشامية تحته: (قوله ثم ذكر يتم) افادان التنكيس أو الفصل بالقصيرة انما يكره اذا كان عن قصد فلو سهوا فلا كما فی شرح المنية۔

وفیه ایضاً(۹/۲): (ولو نسیه) أی القنوت(ثم تذکره فی الرکوع لایقنت) فیه لفوات محله (ولایعود الی القیام) فی الاصح لان فیه رفض الفرض للواجب (فان عادالیه وقنت ولم یعدا لرکوع لم تفسد صلا ته)لکون رکوعه بعدقراء ۃ تامة (ص۱۰) (وسجد للسهو)قنت اولا لزواله عن محله۔

(۱۷۴)مسئلہ زلۃ القاری

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱).....مسئلہ زلۃ القاری میں فتویٰ طرفین رحمہا اللہ کے قول پر ہے یا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر؟

(۲).....طرفین رحمہا اللہ کے نزدیک فساد وعدم فساد کا مدار دولفظوں کے آپس میں قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے پر ہے، کسی لفظ کے قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے کی کیا تحدید اور ضابطہ ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......زلۃ القاری کے مسئلے میں طرفین (امام صاحب، امام محمد رحمہما اللہ) اور امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے۔طرفین کے نزدیک مدار معنی میں تغیر فاحش ہونے یا نہ ہونے پر ہے، جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک لفظ کے مثل کے قرآن میں موجود ہونے نہ ہونے پر مدار ہے البتہ متأخرین نے دونوں روایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کافی وسعت سے کام لیا ہے۔متأخرین کی ذکر کردہ تفصیل ہی مفتی بہ ہے، جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱)اگر غلطی اعراب میں ہوتو خواہ معنی کفر تک پہنچ جائیں نماز فاسد نہ ہوگی۔تخفیف المشدد اور ترک المد بھی خطاء فی الاعراب میں شامل ہیں۔

(۲)وقف، وصل یا وصل حرف بکلمہ (ایا کنعبد)ان صورتوں میں بھی نماز مطلقاً فاسد نہیں ہوگی۔

(۳)زیادتی حرف، نقص حرف، تقدیم وتاخیر یا زیادتی کلمہ، ان تمام صورتوں میں اگر معنی میں اس قدر تغیر ہوگیا کہ تعمداً اس معنی کا کہنا کفر ہوتو نماز فاسد ہوجائے گی۔

(۴)اگر معنی اس قدر متغیر ہو کہ کفر تک نہ پہنچے، مگر آیت کے مفہوم کے مخالف ہوجائے تو احتیاط اسی میں ہے کہ نماز کا اعادہ کرلے۔اگر اعادہ نہیں کرتا تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

(۵)ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھ دینے سے اگر مفہوم تبدیل نہ ہوتا ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی۔جیسے ''ان المسلمین'' کی جگہ ''المسلمون'' پڑھنا۔اگر مفہوم تبدیل ہوجائے تو دیکھا جائے گا کہ دونوں حرفوں میں بلا تکلف فرق ہوسکتا ہے یا نہیں اگر ہوسکتا ہے جیسے ''الصالحات'' کی جگہ ''الطالحات'' اس سے نماز فاسد ہوجائے گی ورنہ نہیں۔(۶)اگر پورا کلمہ چھوڑ دیتا ہے یا بڑھا دیتا ہے تو تغیر معنی کی صورت میں احوط یہی ہے کہ نماز کا اعادہ کرلے۔اگر کلمہ کی زیادتی ایسی ہے کہ قرآن کریم میں وہ کلمہ ہی نہیں اور معنی بھی متغیر ہوجائے تو

اعادہ بھی ضروری ہے۔

سؤال کی دوسری شق کا جواب یہ ہے کہ بعید المعنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس تغیر سے معنی ایسے ہوجائیں کہ اگر عمداً کہا جائے تو کفر لازم آئے یا کفر تو لازم نہ آئے مگر آیت کے مفہوم کے مخالف ہوجائے۔ اگر آیت کا مفہوم تبدیل نہ ہوتا ہو تو اسے قریب المعنی شمار کیا جائیگا۔

لما فی الشامیة (۶۳۰/۱): مطلب مسائل زلة القاریء۔۔۔ان الخطاء اما فی الاعراب أی الحركات والسكون ويدخل فيه تخفيف المشدد وقصر الممدود وعكسهما أو فی الحروف بوضع حرف مكان اخر، أو زيادته أو نقصه أو تقديمه أو تأخيره أو فی الكلمات أو فی الجمل كذلك أو فی الوقف ومقابله والقاعدة عند المتقدمين ان ماغير المعنى تغييراً يكون اعتقاده كفراً يفسد فی جميع ذلك سواء كان فی القرآن أولا۔ الا ما كان من تبديل الجمل مفصولا بوقف تام وان لم يكن التغيير كذلك فان لم يكن مثله فی القرآن والمعنى بعيد متغير تغيراً فاحشاً يفسد ايضاً كهذا الغبار مكان هذا الغراب، وكذا اذا لم يكن مثله فی القرآن ولا معنى له كالسرائل باللام مكان السرائر وان كان مثله فی القرآن والمعنى بعيد ولم يكن متغيرا فاحشا تفسد أيضا عند ابی حنيفة و محمد، وهو الاحوط، وقال بعض المشايخ: لاتفسد لعموم البلوى، وهو قول أبی يوسف وان لم يكن مثله فی القرآن ولكن لم يتغير به المعنى نحو قيامين مكان قوامين فالخلاف على العكس، فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغير المعنى كثيراً وجود المثل فی القرآن عنده والموافقة فی المعنى عندهما، فهذه قواعد الائمة المتقدمين، واما المتأخرون كابن مقاتل وابن سلام واسمعيل الزاهد وابی بكر البلخی والهندوانی وابن الفضل والحلوانی، فاتفقوا على ان الخطأ فی الاعراب لايفسد مطلقاً ولو اعتقاده كفرا لان اكثر الناس لايميزون بين وجوه الاعراب، قال قاضيخان: وما قاله المتأخرون أوسع وما قاله المتقدمون أحوط، وان كان الخطأ بابدال حرف بحرف، فان امكن الفصل بينهما بلا كلفة كالصاد مع الطاء بأن قرء الطالحات مكان الصالحات فاتفقوا على انه مفسد، ۔۔۔(أو تخفيف مشدد) قال في البزازية إن لم يغير المعنى نحو { وقتلوا تقتيلا } لا يفسد وإن غير نحو { برب الناس } الناس۔۔الخ

(۱۷۵) قرأت میں حرکات واعراب کی تبدیلی سے نماز کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب صبح کی نماز پڑھا رہے تھے انہوں نے سورۃ النمل کا آخری رکوع تلاوت کیا جب اس آیت پر پہنچے ''وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ٥ (سورۃ نمل: ۹۲) تو انہوں نے مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ کو مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ پڑھا جب نماز ہوگئی سارے مقتدی چلے گئے تو بعد میں امام صاحب کو خیال آیا کہ میں نے تو قرأت میں غلطی کی ہے۔ آیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہوگئی یا اعادہ ضروری ہوگا نیز اعادہ کرنے میں انتشار کا بھی قوی اندیشہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی آسان سا حل اس مسئلے کا نکال دیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب.....نماز کے دوران قراءت کرتے وقت حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے نماز میں کسی قسم کی خرابی اور نقصان واقع نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے معنی ومطلب میں تبدیلی اور فساد واقع ہوجائے۔ صورت مسئولہ میں اس غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوئی لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لمافی الهندية (۸۱/۱): (ومنها اللحن فی الاعراب) اذا لحن فی الإعراب لحنا لايغير المعنى بأن قرأ ''لاترفعوا اصواتكم'' ''برفع التاء'' لاتفسد صلاته بالاجماع وان غير المعنى تغيراً فاحشا بأن قرأ ''وعصى آدم ربه'' ''بنصب الميم'' ورفع الرب'' وما اشبه ذلك ممالو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلاته فی قول المتقدمين واختلف المتأخرون ''إلى ان قال'' لاتفسد صلاته وما قاله المتقدمون احوط لانه لو تعمد يكون كفراً وما يكون كفراً لا يكون من القرآن۔ وما قاله المتأخرون اوسع لان الناس لايميزون بين اعراب واعراب كذا فی فتاویٰ قاضی خان۔ وهو الأشبه كذا فی المحيط. وبه يفتى كذا فی العتابية. وهكذا فی الظهيرية۔

وفی الدر المختار(۶۳۲/۱،۶۳۱): ''ومنها زلة القارى''۔ فلو فی اعراب او تخفيف مشدد وعكسه او بزيادة حرف فأكثر نحو الصراط الذين، او بوصل حرف بكلمة نحو إياك نعبد، أو بوقف و ابتداء لم تفسد وإن غير المعنى به يفتى بزازية الخ۔

وفی الشامية: (قوله فلو فی اعراب) ككسر قواما مكان فتحها وفتح باء تعبد مكان ضمها، ومثال ما يغير، إنما يخشى الله من عباده العلماء۔ بضم الجلالة وفتح همزة العلماء، وهو مفسد عند المتقدمين۔

واختلف المتأخرون، فذهب ابن مقاتل ومن معه الى انه لايفسد والاول أحوط وهذا أوسع.

كذا فی زاد الفقير لابن الهمام. وكذا- وعطی آدم ربه- بنصب الاول ورفع الثانی يفسد عند العامة. وكذا- فساء مطر المنذرين- بكسر الذال- وإياك نعبد- بكسر الكاف و- المصور- بفتح الواو إلا اذا نصب الراء أو وقف عليها وفی النوازل: لا تفسد فی الكل. وبه يفتی بزازية وخلاصة-

(۱۷۶) آیت کا کچھ حصہ چھوٹنے پر نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ امام سے دوران قرأت ایک آیتِ شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اس سے آگے کی آیات پڑھ لیں، ایسی صورت میں نماز کا اعادہ کرنا پڑیگا یا نہیں؟ اور اگر امام نے نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرلیا ہو تو نماز ہو جائیگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اگر امام سے دوران قرأت آیت شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اور اسکی وجہ سے معنی میں تغیرِ فاحش واقع ہو گیا ہو تو نماز فاسد ہو جائیگی چاہے سجدہ سہو بھی کرلیا ہو، اور اگر معنی میں تغیرِ فاحش واقع نہیں ہوا تو نماز بغیر سجدہ سہو کے ہو جائیگی اگر سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ نیز اگر ایک آیت کو مکمل کرنے کے بعد عمداً ایک یا چند آیات کو چھوڑ کر آگے سے پڑھ لیا تو یہ مکروہ ہے۔

لما فی الحلبی الکبیر(۱/۴۹۴): لو انتقل فی الركعة الواحدة من اٰية الی اٰية يكره وان كان بينهما اٰيات بلاضرورة-

وفی الدر المختار(۱/۶۳۳، ۶۳۲): ولو زاد كلمة اونقص كلمة-- لم تفسد ما لم يتغير المعنی-

(۱۷۷) آیات کے کلمات میں تقدیم وتاخیر کردینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج ہمارے امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے تو انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی آخری آیات تلاوت کیں لیکن اس میں تقدیم وتاخیر کردی مثلاً اَفَلَا یَنظُرُونَ اِلَى الاِبِلِ كَيفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَاءِ كَيفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الأَرْضِ كَيفَ سُطِحَتْ قرآن میں اس طرح ہے لیکن انہوں نے خُلِقَتْ کی جگہ رُفِعَتْ پڑھا، رُفِعَتْ کی جگہ خُلِقَتْ پڑھا، نُصِبَتْ کی جگہ سُطِحَتْ پڑھا اور سُطِحَتْ کی جگہ نُصِبَتْ پڑھا آیا اس صورت میں نماز ہوگئی یا واجب الاعادہ ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... دورانِ نماز اگر غلطی سے ایک کلمہ کی جگہ پر دوسرا کلمہ پڑھ لیں اور اس سے معنی میں تغیر فاحش لازم آتا ہو، تو نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن اگر معنی میں فساد زیادہ لازم نہ آتا ہو، اور دوسرا کلمہ قرآن میں موجود بھی ہو تو امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی۔

صورت مسئولہ میں اگر چہ احتیاط طرفین کے قول پر عمل کرنے ہی میں ہے کہ نماز کا اعادہ کیا جائے البتہ اس نماز کی ادائیگی کو چند دن گزر چکے ہیں اور اعادہ کا حکم کرنے سے فساد اور حرج کا اندیشہ ہے لہٰذا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافى المحيط البرهانى(۲/۶۷): وان كان اختلافاً متباعداً نحو أن يختم اية الرحمة باية العذاب أو اية العذاب باية الرحمة، أو اراد أن يقرء الرحمن علم القران فجرى على لسانه الشيطان... فعلى قول أبي حنيفة ومحمد تفسد صلاته وأما على قول ابي يوسف: فقد اختلف المشايخ. قال بعضهم لا تفسد اذا لم يقصد ذلك، ومر على لسانه غلطا، ويجعل كأنه ابتدا بكلمة من كلمات القراءة وهذا لأنه قصد قرائة القران على ما أنزل، فيجعل فى التقدير كأنه ترك القرائة من هذا الموضع وأخذ بالقرائة من ذلك الموضع،-وهو فى ذلك الموضع قرآن فلا تفسد صلاته وبه كان يفتي الشيخ الامام الفقيه ابو الحسن وهو اختيار محمد بن مقاتل الرازى وقيل فى المسئلة عن ابي يوسف روايتان۔

وفى خلاصة الفتاوى(۱/۱۱۵): ولو قرء أفلا ينظرون الى قوله والى الجبال كيف سطحت مكان نصبت فعلى قياس قول ابي يوسف لايفسد وكذا نصبت مكان سطحت وخلقت مكان رفعت وعلى قولهما ينبغي أن يفسد۔

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۰۳۷): تبطل الصلوة بكل ما غير المعنى تغيراً يكون اعتقاده كفراً. وبكل مالم يكن مثله فى القرآن، والمعنى بعيد متغير تغيراً فاحشاً، كهذا الغبار مكان ''هذا الغراب'' (المائدة،۵،۳۱) وبكل مالم يكن له مثل فى القران ولا معنى له كالسرائل مكان ''السرائر'' (الطارق : ۸۶/۹) وتبطل ايضاً عند ابي حنيفة ومحمد بماله مثل فى القران والمعنى بعيد ولم يكن متغيرا تغيّراً فاحشاً ولا تبطل عند ابي يوسف لعموم البلوى۔

وفى الشامية(۱/۶۳۱): فالمعتبر فى عدم الفساد عند عدم تغير المعنى كثيرا وجود المثل فى القران عنده والموافقة فى المعنى عندهما فهذه قواعد الائمة المتقدمين۔

وفى الشامية(۱/۶۳۳): وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع، وأن قول المتقدمين أحوط، قال فى شرح المنية: وهو الذى صححه المحققون وفرعوا عليه. فاعمل بما تختار، والاحتياط أولى سيما فى أمر الصلوة التى هى أول ما يحاسب العبد عليها۔

(۱۷۸) اس آدمی کی نماز کا حکم جو قرأت پر قدرت نہ رکھتا ہو

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بھائی ہے جس کی زبان میں زبردست قسم کی لکنت ہے۔ ایک ایک حرف کو کئی کئی بار ادا کرتا ہے اور لفظوں کو خوب کھینچ تان کر پڑھتا ہے، مثلاً اگر اس نے یہ پوچھنا ہو (یہ کون ہے) تو کہے گا اے اے اے کون (میں ک ک ک) واو کو بھی خوب کھینچتا ہے تین چار واو بن جاتے ہیں۔ (ہے) کو عجوبہ بناتا ہے۔ وہ بالغ ہے اب نماز کا اس کیلئے مسئلہ ہے سوچتے ہیں قرآن نہ پڑھائیں بگاڑے گا تو گناہگار ہوگا۔ مسجد میں آتا ہے امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے لیکن پڑھتا نہیں اور جب سنتیں پڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں، اللہ اللہ، پڑھتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی نماز بغیر قرأت درست ہے یا نہیں؟ یا ہم اس کو لازمی غلط سلط قرآن سکھوائیں یا یوں ہی رہنے دیں اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ابتداء میں قرآن پڑھوانے کی کوشش کی امام صاحب بیچارے نے بہت زور لگایا مگر وہ بھی تھک گئے کہنے لگے یہ نہیں پڑھ سکتا اور جو چند جملے سیکھے گا وہ بھی قرآن کی بجائے کوئی لطیفہ نظر آئے گا۔ مہربانی کریں کہ شرعی حکم سے آگاہ کریں تاکہ بیچارا جہنم سے بچ جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز میں قرأت کرنا اُس آدمی پر فرض ہے جو قرأت قرآن پر قادر ہو۔ صورت مسئولہ میں اگر آپ کا بھائی اس طریقہ پر قرآن پڑھتا ہو جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہے اور وہ کسی بھی سورت کے صحیح پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتا، بہت کوشش کرنے کے بعد وہ سیکھنے سے مایوس ہو جائے، اور کوئی معتبر قاری اس کی تصدیق بھی کرے کہ یہ کبھی بھی درست نہیں پڑھ سکتا تو اس کی نماز بغیر قرأت قرآن کے درست ہے۔

لما فی الشامیة(۵۸۲/۱): (قوله دائماً) ای فی آناء اللیل وأطراف النهار، فمادام فی التصحیح والتعلم ولم یقدر علیه فصلاته جائزة وان ترك جهده فصلاته فاسدة كما فی المحیط وغیره، قال فی الذخیرہ، وانه مشكل عندی، لان ما كان خلقة فالعبد لا یقدر علی تغییره اهـ وتمامه فی شرح المنیة۔

وفی اعلاء السنن(۱۴۸/۴): عن رفاعة بن رافع رضی الله عنه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم علم رجلاً الصلوة فقال ان كان معك قران فاقرأ والا فاحمدالله، وكبره، وهلله، ثم اركع، رواه ابو داؤد، والترمذی، وأخرجه النسائی، ایضاً وقال الترمذی: حدیث رفاعة رضی الله عنه حسن، كذا فی النیل (۱۱۸/۲) قوله عن رفاعة بن رافع رضی الله عنه الخ، قلت فیه دلالة علی أن العاجز عن قرائة القران تسقط عنه القرائة مادام عاجزا، ویكفیه الذكر عوضا عنها، ولا یخفی أن الذكر لا یتقید بالعربیة ولا ینحصر فیها بل یحصل بأی لسان كان، كالایمان فانه لو آمن بغیر العربیة جاز اجماعاً لحصول المقصود، كذا فی البحر(۲۰۷/۱)۔

وفيه ايضاً(۴/۱۶۳): قلت وقد صرح بوجوب التجويد وتصحيح الحروف فقهاء نا الحنفية ايضاً. قال فی غنية المستملی: وقال صاحب المحيط: والمختار للفتوی فی جنس هذه المسائل انه إن كان يجتهد آناء الليل وأطراف النهار فی التصحيح ولا يقدر عليه فصلاته جائزة وان ترك جهده فصلاته فاسدة وان ترك جهده فی بعض عمره لا يسعه أن يتركه فی باقی عمره ولو ترك تفسد صلاته. انتهی۔

وقال صاحب الذخيرة: وانه مشكل عندی (ا) لان ماكان خلقة فالعبد لا يقدر علی تغييره "انتهی"۔

وعلی هامشها(۴/۱۶۳): (ا) ای الحكم بفساد صلاة بترك الجهد بعد ما اجتهد مدة وصرف فيها برهة من الزمان... مشكل يفضی إلی الحرج ولذا قال شيخ فی بعض تصانيفه إن تصحيح الحروف وبذل الجهد فيه واجب مالم يحصل اليأس منه. واذا أيس سقط الجهد وتجوز صلاته دائماً. والمعتبر فی حصول اليأس شهادة حاذق من القراء بان ذالك لا يرجی منه أن يصح الحروف ابداً لا مجرد زعم المتعلم۔ فافهم فان هذا لا تجده فی كتاب ولكنه هو الأولی بالصواب۔

(۱۷۹)سورۃ"الم السجدة"اور"هل اتی علی الانسان"جمعہ کو فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے جو گلشن اقبال میں پڑھتا ہے ایک دن اس سے ملنے کسی کام کی وجہ سے جانا ہوا تو رات وہیں رہا صبح کی نماز جماعت سے پڑھی امام نے بہت طویل قرأت کی دونوں رکعتوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھیں جب نماز ختم ہوگئی تو میں نے کہا بھائی تمہارا امام تو بہت طویل قرأت کرتا ہے کہنے لگا اصل میں آج جمعہ ہے اور جمعہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح میں الم السجدہ اور سورۃ هل اتی علی الانسان، پڑھتے تھے۔ میں نے کہا ہمارے امام صاحب نے تو کبھی نہیں پڑھی پھر جب میں اپنے محلے میں آیا امام صاحب کو بتایا کہ یوں معاملہ ہوا اس نے کہا ہمارے فقہ میں ان کو پڑھنا منع ہے، اس لئے میں نہیں پڑھتا میرے ذہن میں خیال آیا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے پھر ہمارے فقہ میں کیوں منع ہے مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ برائے مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب بعون الملك الوهاب..... یہ بات تو احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعة المبارک کے دن فجر کی نماز میں سورۃ "الم السجدہ" اور سورۃ "هل اتی علی الانسان" کی تلاوت فرمایا کرتے تھے البتہ یہ سورتیں ہمیشہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پڑھنے سے ہمارے فقہاء کرام نے منع فرمایا ہے کیونکہ ہمیشہ پڑھنے سے صرف ان سورتوں کی فضیلت اور دوسری سورتوں سے اعراض لازم آتا ہے اور چونکہ ان سورتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نہیں پڑھا اس لئے ان پر مداومت اختیار کرنے سے کراہت ثابت ہوتی ہے،

لہٰذا جو کام شریعت میں جس طرح ثابت ہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ باعث ثواب ہوگا وگرنہ باعث عقاب، آجکل تو یہ سنت بالکل ہی متروک ہوکررہ گئی ہے لہٰذا ائمہ مساجد کو کبھی کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ سنت زندہ ہوسکے۔
خلاصہ یہ کہ یہ سورتیں کبھی کبھی چھوڑ دینی بھی چاہئیں دوام اختیار نہیں کرنا چاہیے البتہ ان ائمہ کرام کا عمل بھی درست نہیں جو ان سورتوں کو کبھی نہیں پڑھتے سب کو اعتدال سے کام لینا چاہیے۔

لمافی سنن ابی دأوود (۱/۱۵۴): عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقرأ فی صلوۃ الفجر یوم الجمعة تنزیل السجدة وهل اتی علی الانسان حین من الدهر۔

وفی فتح القدیر(۱/۳۳۷): والحق أن المداومة مطلقاً مکروهة سواء رآه حتما یکره غیره أولا لأن دلیل الکراهة لا یفصل وهو ایهام التفضیل وهجر الباقی لکن الهجران إنما یلزم لو لم یقرأ الباقی فی صلوۃ أخریٰ فالحق أنه ایهام التعین ثم مقتضی الدلیل عدم المداومة لا المداومة علی العدم کما یفعله حنفیة العصر بل یستحب أن یقرأ بذلك أحیاناً تبرکاً بالمأثور فإن لزوم الایهام ینتفی بالترك أحیاناً۔

وفی الهندیة (۱/۷۸): ویکره أن یوقت شیئاً من القرآن لشئ من الصلوات قال الطحاوی والاسبیجابی هذا اذا رآه حتماً واجباً بحیث لا یجوز غیره أو رأی قراءة غیره مکروهة وأما اذا قرأ لاجل الیسر علیه أو تبرکاً بقراءته صلی اللہ علیہ وسلم فلا کراهیة فی ذلك ولکن یشترط أن یقرأ غیره أحیاناً لئلا یظن الجاهل أن غیره لا یجوز هکذا فی التبیین۔

وفی الشامیة(۱/۵۴۴): هذا، وقید الطحاوی والاسبیجابی الکراهة بما اذا رأی ذلك حتماً لا یجوز غیره أما لو قراء للتیسیر علیه أو تبرکاً بقراءته علیه الصلاة والسلام فلا کراهة لکن بشرط أن یقرأ غیرها أحیانا لئلا یظن الجاهل أن غیرها لا یجوز واعترضه فی الفتح بأنه لا تحریر فیه لأن الکلام فی المداومة اهـ۔

وأقول: حاصل معنی کلام هذین الشیخین بیان وجه الکراهة فی المداومة وهو أنه إن رأی ذلك حتماً یکره من حیث تغییر المشروع والا یکره من حیث ایهام الجاهل وبهذا الحمل یتاید أیضا کلام الفتح السابق ویندفع اعتراضه اللاحق فتدبر۔

(۱۸۰) آیت سجدہ کو بطور مذاق پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ایک مدرسہ میں پڑھتے ہیں جب کھانے کیلئے جمع ہوتے

ہیں تو ایک ساتھی کی عادت ہے کہ وہ سجدہ والی آیت پڑھ دیتا ہے سب ساتھی سجدہ کرتے اور اس کو منع کرتے ہیں مگر وہ باز نہیں آیا اس کی پٹائی بھی لگائی لیکن وہ باز نہ آیا، اب ہم نے کہا ہم سجدہ نہیں کریں گے اور گناہ تم کو ہوگا کیونکہ تم جان بوجھ کر ہمیں تنگ کرتے ہو، سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح دوسروں کو تنگ کرنے کیلئے جو پڑھے اس سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم سجدہ چھوڑ دیں تو وہ گناہگار ہوگا یا ہم بھی گناہگار ہوں گے کیونکہ اس کا قصد تلاوت نہیں بلکہ ہمیں تنگ کرنا مقصود ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......آیت سجدہ کی تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے تلاوت کرنے والے یا سننے والے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ لوگوں پر آیت سجدہ سننے سے سجدہ کرنا واجب ہے اگرچہ آیت سجدہ تلاوت کرنے والا تنگ کرنے کی نیت سے تلاوت کرے البتہ اس طرح کرنے والا لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرنے والا ہے جس کی وجہ سے وہ سخت گنہگار ہوگا، نیز آیات قرآنیہ کو بطور مذاق پڑھنے پر فقہاء نے ایسے شخص کے متعلق کفر کا حکم لکھا ہے۔ مذکورہ صورت میں بھی مذاق کی سی صورت پائی جارہی ہے اس لئے اس شخص کو اپنے اس فعل شنیع سے خوب توبہ واستغفار کرنا چاہیے اور آئندہ ایسی نازیبا حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافی الهندية(۱/۱۳۲): والسجدة واجبة فی هذه المواضع علی التالی والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم يقصد۔

وفی الدرالمختار مع الشامية(۲/۱۰۴): (بشرط سماعها) فالسبب التلاوة وان لم يوجد السماع كتلاوة الاصم والسماع شرط فی حق غير التالی ولو بالفارسية...

وفی الشامية تحته: وذكر فی المجتبی ان الموجب للسجدة احد ثلاثة التلاوة والسماع والائتمام... وصرح ايضا بان السماع شرط فی حق غير التالی۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۲/۱۱۳۶): سجدة التلاوة واجبة بالتلاوة علی القاری والسامع عند الحنفية، سنة عند بقية الفقهاء سواء عند الحنفية والشافعية قصد السامع سماع القرآن اولم يقصد ای فتطلب من القاری والمستمع (وهو قاصد السماع) والسامع (وهو من لم يقصد السماع)... استدل الحنفية علی الوجوب بحديث (السجدة علي من سمعها وعلی من تلاها) وفيه ايضاً(صـ۱۱۴۱) يستحسن اخفاء اية السجدة عن سامع غير متهئ للسجود۔

وفی الهندية(۲/۲۶۶): اذا انكر الرجل آية من القرآن او تسخر بآية من القرآن وفی الخزانة اوعاب كفر كذا فی التاتارخانية۔

وفی البزازية علی هامش الهندية(۶/۳۳۸): قرأ القرآن علی ضرب الدف والقضيب يكفر لاستخفافه وأدب القرآن ان لا يقرأ فی مثل هذه المجالس۔ والمجلس الذی اجتمعوا فيه

للغنا والرقص لا يقرأ فيه القرآن كما لا يقرأ في البيع والكنائس لانه مجمع الشيطان قال من ذكر الله كبر يكفر۔ ادخال اية القرآن في المزاح والدعا به كفر لانه استخفاف به وكذا المزاح به مثل ان يقول قل هو الله احد راپوست بردی۔ الخ۔

(۱۸۱) نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے غلطی کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سال مدرسہ کی سالانہ چھٹیوں میں، میں چلّے میں گیا تھا، ہماری تشکیل بلوچستان کے پہاڑی علاقے ڈیرہ بگٹی میں ہوئی وہاں مسجد کے جو امام صاحب تھے قرآن پڑھتے ہوئے تلفظ صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے اور ایک بڑی غلطی یہ کرتے کہ الحمدللہ میں الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھتے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس طرح پڑھنے سے معنی غلط ہو جاتا ہے اور اس سے نماز بھی مکروہ ہو جاتی ہے تو امام صاحب نے کہا کہ میرے پیچھے کئی مرتبہ علماء نے نماز پڑھی ہے مگر کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے تم تبلیغی لوگ ویسے علماء پر اعتراضات کرتے ہو۔ تو میں خاموش ہو گیا کہ جب علماء کرام نے کچھ نہیں فرمایا ہے تو شاید نماز اس سے فاسد نہ ہوتی ہو، مگر دل پھر بھی مطمئن نہ ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ فرمائیں قرآن وسنت کی روشنی میں کیا اس طریقے سے قرآن پڑھنا جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... نماز میں قرآن شریف کو صحیح نہ پڑھنا اور تلفظ ادا کرنے میں ایسی غلطی کرنا جس سے معنی میں بگاڑ لازم آتا ہو ایسی غلطی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور جس غلطی سے معنی میں بگاڑ لازم نہ آتا ہو، تو ایسی غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوتی لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی۔ کیونکہ الف کو کھینچ کر پڑھنے سے ہمزہ استفہام بن کر الحمدللہ کا معنی بگڑ جاتا ہے۔

لمافی الهندية(۱/۶۸): ولو قال الله اكبر مع الف الاستفهام لا يصير شارعاً بالاتفاق۔

وفيه ايضاً(صـ۷۹): ان ذكر حرفاً مكان حرف ولم يغير المعنى... لم تفسد صلوته، وان غير المعنى فان امكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مكان الصالحات تفسد صلوته عند الكل وان كان لايمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين والطاء مع التاء اختلف المشائخ قال اكثرهم لاتفسد صلاته هكذا في فتاوى قاضيخان وكثير من المشايخ افتوابه۔

وفي الدر المختار (۱/۶۳۰): ومنها مد الهمزة في التكبير كما مر. ومنها القراءة بالالحان ان غير المعنى والا لا، الا في حرف مدّ ولين اذا فحش والا لا بزازية۔

وفي الشامية تحته: (قوله والا لا الخ) اي وان لم يغير المعنى فلا فساد الا في حرف مدّ ولين ان

فحش فانه يفسد، وان لم يغير المعنیٰ۔

(۱۸۲) دورانِ نماز سورتوں کے درمیان قصداً ترتیب نہ رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مسجد کا جو امام ہے وہ ایک نوجوان آدمی ہے جو کہ صرف حافظ قرآن ہے اب تک اُس نے عالم کا کورس نہیں کیا ہے، بعض اوقات یہ حافظ صاحب نمازوں میں پہلی رکعت میں کوئی سورت پڑھ لیتا ہے پھر دوسری رکعت میں اُس سے پیچھے والی سورت پڑھ لیتا ہے تو ایک دن عشاء کی نماز میں جب اس نے اسی طرح کیا تو نماز کے بعد میں نے کہا کہ حافظ صاحب اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے اور اِس سے نماز فاسد ہوتی ہے تو حافظ صاحب نے کہا کہ قرآن پاک میں اللہ پاک کا ارشاد مبارک ہے ''فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ'' (قرآن مجید میں سے جو آسان ہو پڑھ لو) لہٰذا جس طرح بھی پڑھ لیں نماز ہوجاتی ہے مگر حافظ صاحب چونکہ عالم یا مفتی نہیں ہیں لہٰذا اس کی بات پر مجھے اطمینان نہیں ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ بتائیں، کیا اس طرح جان بوجھ کر نماز میں قرأت جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت رکھنا یہ قرآن مجید کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے اگر کسی شخص سے غیر ارادی طور پر کبھی سورتوں میں تقدیم اور تاخیر ہوجائے تو نماز بلا کراہت ادا ہوجاتی ہے البتہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا فعل کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں حافظ صاحب کا قصداً اس طرح کرنا اور اس بات کو اپنی عادت بنالینا ٹھیک نہیں کیونکہ اس صورت میں فرض نماز کی ادائیگی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے البتہ آپ کا یہ کہنا کہ اس طرح سورتوں میں تقدیم وتاخیر کرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ قرآن کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا نماز فاسد نہیں ہوتی مگر قصداً اس طرح کرنے سے فرض نماز مکروہ ضرور ہوتی ہے، لہٰذا حافظ صاحب کو احسن طریقے سے مسئلہ بتادیا جائے۔

لمافی البحر الرائق(۱۶۵/۲): ... لو قرأ سورة ثم قرأ فی الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القران لامن واجبات الصلاة فتركها لا يوجب سجود السهو۔

وفی الهندية(۷۸/۱): واذا قرأ فی ركعة سورة وفی الركعة الاخرى اوفی تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره... هذا كله فی الفرائض واما فی السنن فلا يكره۔

وفی الدرالمختار (۵۴۶/۱): ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفی القنية قرأ فی الاولى الكافرون وفی الثانية الم تر او تبت ثم ذكر يتم وقيل يقطع ويبدأ

وفی الشامیة تحته: (قوله وان یقرأ منکوسا) بان یقرأ فی الثانیة سورة اعلی مما قرأ فی الاولی، لان ترتیب السور فی القراءة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهیلا لضرورة التعلیم...(قوله ثم ذکریتم) افاد ان التنکیس او الفصل بالقصیرة انما یکره اذا کان عن قصد فلو سهوا فلا کما فی شرح المنیة۔

وفیه ایضاً(۱/۴۵۷) ویؤیده ایضا انهم قالوا یجب الترتیب فی سور القران فلو قرأ منکوسا اثم لکن لا یلزمه سجود السهو لان ذلك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلوة کما ذکره فی البحر فی باب السهو لکن قولهم کل صلوة ادیت مع کراهة التحریم یشمل ترك الواجب وغیره ویؤیده ماصرحوا به من وجوب الاعادة بالصلاة فی ثوب فیه صورة بمنزلة من یصلی وهو حامل الصنم۔

(۱۸۳) دورانِ تلاوت سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا کیوں واجب ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن ہمارے امام صاحب غائب تھے تو ایک بوڑھے آدمی کو لوگوں نے نماز کیلئے آگے کر دیا اس نے پہلی رکعت میں ارأیت الذی (سورۃ الماعون) پڑھی، دوسری رکعت میں الم تر (سورۃ الفیل) پڑھی مسجد میں شور شروع ہوگیا قرآن الٹا پڑھا نماز نہیں ہوئی، متولی صاحب کھڑے ہوگئے اور لوگوں کو خاموش کرایا اور کہا نماز ہوجاتی ہے پھر ہم دو آدمی دوسری مسجد کے امام کے پاس چلے گئے ان سے سوال کیا انہوں نے فرمایا کہ نماز ہوگئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے وہاں سے تو ہم خاموشی سے چلے آئے مگر میرے ذہن میں یہ بات آتی رہی مکروہ کیوں ہے؟ سارا قرآن ہے جہاں سے پڑھو پھر یہ کراہت کیوں؟ جبکہ بی اے کے نصاب میں ہم نے پڑھا تھا کہ قرآن کی ترتیب نزولی اور ہے جب نازل ہونے میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں پھر بغیر ترتیب کے پڑھنے سے کیوں کراہت آتی ہے؟ مہربانی فرما کر تشفی فرمائیں تاکہ میرے عقائد میں اس وجہ سے کوئی خلل نہ آئے اور اکابر پر بدگمانی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزاء عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مذکورہ امام صاحب کا یہ کہنا کہ نماز ہوگئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے تو یہ بات ٹھیک ہے مگر یہ بات جان لیجئے کہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ تلاوتِ قرآن مجید کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا اگر کسی شخص سے بغیر قصد کے اس طرح ہوجائے تو نماز بلا کراہت درست ہے ہاں اگر قصداً اس طرح تقدیم وتاخیر کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، جہاں تک آپ کی یہ بات رہی کہ سارا قرآن ہے جہاں سے دل چاہے پڑھو اور آپ کا ''بی اے'' کے نصاب میں یہ بات پڑھنا کہ ترتیب نزولی کچھ اور تھی تو جہاں سے دل چاہے پڑھو اور نماز میں اس طرح کرنے سے کراہت کیوں آتی ہے تو یہ بات سمجھ لیں کہ اگرچہ ترتیب نزولی قرآن مجید کی کچھ اور تھی اور وجہ اس کی موقع ومحل کی مناسبت اور ضرورت تھی کہ جب

جس مسئلہ کی ضرورت ہوئی تو اللہ رب العزت نے وحی کے ذریعے اسی کو نازل کر دیا مگر جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر آپ ﷺ سے فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد رکھیں اور آپ ﷺ اپنے کاتبین وحی کو اسی طرح حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طرح قرآن کو لکھا جس طرح آپ سے سنا اگرچہ قرآن مجید کو مصحف میں آپ ﷺ کے دار فانی سے پردہ فرما جانے کے بعد جمع کیا گیا لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے صرف جمع کرنے میں سعی کی ترتیب میں نہیں ترتیب وہی تھی جس کو انہوں نے آپ ﷺ سے بطور تلاوت کے سنا تھا یا آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا تھا کہ اس ترتیب سے رکھو اور مصحف میں اس ترتیب کے ساتھ درج رکھنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اس وجہ سے سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا دوران قراءت تلاوت کے واجبات میں سے ہے لہٰذا اس واجب کے ترک کی بناء پر (جو کہ آپ ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ثابت ہے) کراہت آتی ہے۔

لما في البحر الرائق (٢/١٦٥): الرابعة سببه ترك واجب من واجبات الصلاة الاصلية سهواً وهو المراد بقوله "بترك واجب" لاكل واجب بدليل ما ستذكره من انه لو ترك ترتيب السور لا يلزمه شيء مع كونه واجباً وهو اجمعة ما قيل فيه...... لو قرأ سورة ثم قرأ في الثانية سورة قبلها ساهياً لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القرآن لا من واجبات الصلاة فتركها لا يوجب سجود السهو۔

وفي البناية (١/٨٠): واذا قرأ في ركعة سورة وفي الركعة الاخرى او في تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره... هذا كله في الفرائض واما في السنن فلا يكره۔

وفي الشامية (١/٥٣٦): ويكره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منكوساً الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفي القنية قرأ في الاولى الكافرون وفي الثانية الم تر أو تبت ثم ذكر يتم وقيل يقطع يبدأ (قوله وان يقرأ منكوساً) بان يقرأ في الثانية سورة اعلى مما قرأ في الاولى، لان ترتيب السور في القراءة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم (قوله ثم ذكر يتم) افاد ان التنكيس او الفصل بالقصيرة انما يكره اذا عن قصد فلو سهوا فلا كما في شرح المنية. وفيه ايضاً (١/٥٤٧): ويؤيده ايضا انهم قالوا يجب الترتيب في سور القرآن فلو قرأ منكوساً اثم لكن لا يلزمه سجود السهو لان ذلك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلوة كما ذكره في البحر في باب السهو۔

(۱۸۴) ایک رکعت میں دو سورتیں ملا کر پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعرات کی رات کو چونکہ مدرسہ میں چھٹی ہوتی ہے میں اپنے گھر کو چلا گیا مغرب کو جب نماز پڑھنے کیلئے مسجد گیا تو امام صاحب نے نماز پڑھانے کیلئے مجھے کہا، تو میں نے مغرب کی نماز میں پہلی رکعت میں الم ترکیف اور سورۃ قریش دونوں پڑھیں اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ جماعت پڑھاتے ہوئے دو سورتیں ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے میں نے کچھ نہیں کہا اور سوچا کہ مدرسہ جا کر مفتی صاحب سے پوچھ لیں گے۔ لہٰذا مفتی صاحب آپ بتلائیں کہ مذکورہ امام کا یہ کہنا کہ "فرض نماز کی جماعت کراتے ہوئے دو سورتوں کو ملا کر ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے" صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......بہتر یہ ہے کہ فرض نماز کی ایک رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک سورت پڑھی جائے دو سورتیں نہ پڑھے اگر دو سورتیں پڑھ لیں، جیسا کہ صورت مذکورہ میں ہے تو بھی بلا کراہت نماز جائز ہے لہٰذا امام صاحب کی بات درست ہے۔

لما فی بدائع الصنائع (۲/۴۴): ولو جمع بین السّورتین فی رکعة لا یکرہ لما روی أن النبی ﷺ اوتر بسبع سور من المفصّل والافضل الّا یجمع۔

وفی الھندیة (۱/۷۸): واذا جمع بین سورتین بینھما سور أو سورة واحدة فی رکعة واحدة یکرہ وأمّا فی الرّکعتین ان کان بینھما سور لا یکرہ الخ...

وفی الشامیة(۱/۵۴۶): وفی التاتارخانیة: اذا جمع بین سورتین فی رکعة رایت فی موضع انّه لا بأس به وذکر شیخ الاسلام لاینبغی له ان یفعل علی ما ھو ظاھرالروایة اھ وفی شرح المنیة: الاولیٰ ان لا یفعل فی الفرض ولو فعل لا یکرہ إلّا ان یترك بینھما سورة أو أکثر۔

فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

(۱۸۵) دورانِ نماز ستر کھل جانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بچہ ہے جس کی عمر دو تین سال ہے میں جب نماز پڑھتی ہوں تو میرے پاس آ کر میرا دوپٹہ اتار لیتا ہے جس کی وجہ سے میرا سر ننگا ہو جاتا ہے بسا اوقات میرے آگے آ کر بیٹھ جاتا ہے میں اس کو ایک طرف کر کے سجدہ کر لیتی ہوں اب سر ننگا ہونے کی وجہ سے یا بچہ کو ہٹانے کی وجہ سے میری نماز میں فساد آئے گا یا نماز درست ہو جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... عورت کا نماز کے اندر سوائے چہرہ، ہتھیلی اور قدموں کے تمام بدن کا چھپانا فرض ہے۔ بدن کے جو اعضاء ستر میں داخل ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ نماز پڑھتے وقت کھل جائے اور اتنی دیر کھلا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر کھلتے ہی فوراً کھلے ہوئے حصے کو عمل قلیل کے ساتھ چھپا لیں تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمل قلیل سے مراد وہ کام ہے جو ایک ہاتھ کے ذریعے سے کیا جا سکے اور اس میں تکرار بھی نہ ہو۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ کا سر اتنی دیر تک ننگا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہے تو آپ کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ اگر سر کھلتے ہی فوراً عمل قلیل کے ساتھ سر کو دوبارہ چھپا لیں تو آپ کی نماز درست ہو جائے گی اسی طرح سجدہ کرنے کیلئے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کو عمل قلیل کے ذریعے ایک طرف ہٹا دینے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

لمافی الھندیۃ (۱/۵۸): بدن الحرۃ عورۃ الا وجہھا وکفیھا وقدمیھا کذا فی المتون وشعر المرأۃ ماعلی راسھا عورۃ واما المسترسل ففیہ روایتان الاصح انہ عورۃ کذا فی الخلاصۃ وھو الصحیح وبہ اخذ الفقیہ ابو اللیث و علیہ الفتوی کذا فی معراج الدرایۃ... وان انکشف عورتہ فی الصلاۃ فسترھا بلا مکث جازت صلاتہ اجماعا وان ادی رکنا مع الانکشاف فسدت اجماعاً... والعمل القلیل ان تاخذہ بیدواحدۃ کذا فی السراج الوھاج۔

وفی الدر المختار (۱/۴۰۵): (وللحرۃ) ولو خنثی (جمیع بدنھا) حتی شعرھا النازل فی الاصح (خلا

الوجه والكفين) فظهر الكف عورة على المذهب (والقدمين)

وفيه ايضاً(۱/۴۰۸): (ويمنع)حتى انعقادها(كشف ربع عضو)قدر اداء ركن بلاصنعه (من عورة غليظة او خفيفة على المعتمد(والغليظة قبل ودبر وماحولهما والخفيفة ماعدا ذلك) من الرجل والمرأة

وفى الشامية (۱/۴۰۸): (قوله حتى انعقادها)... اى ويمنع صحة الصلاة حتى انعقادها. والحاصل انه يمنع الصلاة فى الابتداء ويرفعها فى البقاء ح (قوله قدر اداء ركن) اى بسنته منية قال شارحها وذلك قدر ثلاث تسبيحات اهـ

وفى الهندية(۱/۱۰۱): العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لاكذا فى محيط السرخسى... وفيه ايضاً (صـ۱۰۲) وكل ما يقام بيد واحدة فهو يسير مالم يتكرر كذا فى فتاوى قاضيخان... (والثالث) انه لو نظر اليه ناظر من بعيد ان كان لا يشك انه فى غير الصلاة فهو كثير مفسد وان شك فليس بمفسد وهذا هو الاصح هكذا فى التبيين وهو احسن كذا فى المحيط السرخسى وهو اختيار العامة كذا فى فتاوىٰ قاضيخان والخلاصة۔

وكذا اذا تردى برداء اوحمل شيئا خفيفا يحمل بيد واحدة او حمل صبيا او ثوباً على عاتقه لم تفسد صلاته كذا فى فتاوى قاضيخان۔ وان حمل شيئا بحيث يتكلف بحمله وله مؤنة فسدت صلاته كذا فى الظهيرية۔

رسالۃ

الافاضۃ فی قاعدۃ الفقہاء

"کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ تجب الاعادۃ"

فقہاء کا بیان کردہ قاعدہ "ہر وہ نماز جو مکروہ تحریمی کے ساتھ اداء ہو وہ واجب الاعادہ ہے"

اس میں بعض محققین کی ماہیت اور غیر ماہیت کی قید سے متعلق تفصیلی فتوی

(۱۸۶) عورت کا سر پر کوہان نما جوڑے میں پڑھی نماز کے اعادے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت سر کے اوپر کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھے تو شرعاً کیا حکم ہے؟ جبکہ حدیث شریف میں اس طرح جوڑا باندھنے پر وعید وارد ہوئی ہے کہ ایسی عورتوں کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی (تکملہ فتح الملہم، ۴/ ۱۹۹)

عورت کا کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے یا مکروہ تنزیہی خلاف اولیٰ؟

بندہ نے اس مسئلہ کو عربی، اردو کتب فتاویٰ میں تلاش کیا لیکن کہیں کوئی واضح تصریح نہیں ملی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے (رد المحتار ۱/ ۶۴۲ کراچی) میں عقص شعر کی مختلف صورتیں ذکر فرما کر کراہت کا قول تحریر فرمایا ہے۔ جیسا کہ تصریح حسب ذیل ہے:

(قوله وعقص شعره اھ) ای ضفره وفتله، والمراد به ان يجعله على هامته ويشده او ان يلف ذوائبه حول راسه كما يفعله النساء فى بعض الاوقات ...... وجميع ذلك مكروه اھ

امداد الاحکام (۱/ ۵۵۷) میں بعنوان "عورتوں کیلئے نماز میں عقص شعر مکروہ ہے یا نہیں" ایک سوال وجواب ہے۔ لیکن وہ بھی مردوں سے متعلق ہے۔ عورت کے بالوں سے متعلق کسی بھی صورت کی تصریح نہیں، خاص کر مذکورہ صورت جس پر وعید ہے۔ نیز امداد الاحکام (۱/ ۵۱۳) میں بعنوان کراہت عقص شعر نماز میں مرد وعورت کیلئے عام ہے یا صرف مردوں کیلئے خاص ہے" کے تحت بھی تقریباً وہی بات ذکر کی گئی ہے جو امداد الاحکام (۱/ ۵۵۷) پر مذکور ہے۔

احسن الفتاویٰ (۸/ ۷۴) میں بعنوان "عورتوں کا جوڑا باندھنا" میں صرف اتنی بات ملتی ہے کہ "البتہ گدی پر جوڑا باندھنا شر

جائز ہے بلکہ نماز میں افضل ہے۔اس لیے کہ اس سے بالوں کے پردے میں سہولت ہوتی ہے" البتہ اسی جواب میں حضرتؒ نے عورتوں کا سر کے اوپر جوڑا باندھنے کو ناجائز فرمایا ہے۔

اسی طرح احسن الفتاویٰ (۱۰/۳۱۸) پر بعنوان" جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا" کے تحت ایک سوال کا جواب مذکور ہے لیکن وہاں بھی عورت کا کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز ادا کرنے کے بارے میں جواز یا عدم جواز کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

۲۔حدیث مبارکہ میں کوہان نما جوڑا باندھنے کی جو وعید بیان کی گئی ہے۔اس کی علت کیا ہے؟

بندہ رہنمائی کا طالب ہے۔امید ہے باحوالہ جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱)۔گدی پر جوڑا باندھنا جیسے کہ عام طور پر عورتیں باندھتی ہیں۔

(۲)۔سر کے اوپر کوہان نما جوڑا باندھنا۔

پہلی صورت کا حکم تمام عربی اردو کتب میں موجود ہے کہ یہ صورت مردوں کیلئے ناجائز ہے۔ایسی حالت میں مردوں کیلئے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "نھی ان یصلی الرجل وراسہ معقوص" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ عمل عورتوں کیلئے جائز ہے اور البحر الرائق (۱/۴۱) پر عقص شعر کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا "ان یلف ذوائبه حول رأسه کما یفعله النساء" یفعلہ النساء سے معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف مردوں کیلئے خاص ہے ورنہ تعریف الشئ بالشئ لازم آئے گی۔حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے بھی احسن الفتاویٰ میں یہ بات ذکر فرمائی ہے۔اور (۸/۴۷) میں فرمایا کہ یہ صورت یعنی (عقص شعر) عورتوں کیلئے نماز میں زیادہ بہتر ہے کہ اس میں بالوں کا ستر ہے۔

دوسری صورت کہ" کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا" اس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ عربی و اردو کتب میں اس کی تصریح نہیں تو عربی کتب میں اس کی ممانعت و کراہت اصول و قواعد سے معلوم ہوتی ہے اور اردو کتب میں سے احسن الفتاویٰ (۱/۳۱۸) میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے صلوٰۃ کے ابواب میں تصریح فرمائی ہے کہ کوہان نما جوڑا باندھنا عورتوں کیلئے جائز نہیں اور یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ بات تو چل رہی ہو نماز کی اور حکم بیان کیا جارہا ہو نماز کے باہر کا۔اب مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے کیونکہ اس طرح جوڑا باندھنے کی سخت وعید آئی ہے ان کو اہل نار میں سے فرمایا گیا ہے لہٰذا یہ گناہ کبیرہ ہے اور نماز کے اندر تو اس کی قباحت اور بھی بڑھ جائے گی۔کیونکہ اس طرح کے کئی افعال جس پر نماز کے اندر یا خارج صلوٰۃ میں نہی وارد ہوئی ہو یا اس پر سخت وعید وارد ہوئی ہو نماز کے اندر ایسے افعال پائے جانے کی وجہ سے فقہاء ایسی نماز کو مکروہ تحریمی فرماتے ہیں جیسے کہ البحر الرائق (۲/۳۶) میں ہے: قوله (والتخصر) وهو وضع اليد على الخاصرة......أنه فعل المتكبرين ولا يليق بالصلاة أو أنه فعل الشيطان حتى قيل إن إبليس اهبط من الجنة لذلك فلهذا قال في المبسوط والمجتبى ويكره التخصر خارج الصلاة أيضا والذي يظهر أنها تحريمية فيها للنهي المذكور الخ۔

اسی طرح شامی میں ہے "یکرہ اشتمال الصماء لنهیه علیه الصلوة والسلام عنها وظاهر التعلیل بالنهی ان الکراهة تحریمیة کمامر فی نظائرہ" (۱/۶۵۲) لہٰذا جس طرح حالت نماز میں تخصر اور اشتمال صماء کے پائے جانے سے نماز مکروہ تحریمی ہے بوجہ نہی اور متکبرین کا طریقہ ہونے کے اسی طرح حالت نماز میں کوہان نما جوڑا باندھنے سے نماز مکروہ تحریمی ہونی چاہیے کیونکہ اس پر بھی سخت وعید وارد ہوئی ہے اور شرح نووی وغیرہ نے اس کو فاسقات فاجرات کا طریقہ بتلایا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عقص شعر کے تحت یہ عبارت "والاشبه بسیاق الحدیث انها تحریم الا ان تثبت علی التنزیه اجماع فتعین القول به" (۱/۶۴۲) اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مکروہ تحریمی کے خلاف جب تک مکروہ تنزیہی کے اثبات پر اجماع نہ ہو جائے تو وہ مکروہ تحریمی ہی رہتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے (۱/۶۳۹) پر فرمایا: جب بھی کسی فعل پر مکروہ کا اطلاق ہو تو اس کی دلیل پر نظر کی جائے گی اگر اس پر وارد ہونے والی نہی ظنی الثبوت ہو تو مکروہ تحریمی ہوگا جب تک کہ نہی کیلئے صارف عن النہی کوئی قرینہ نہ پایا جائے "إذا ذکروا مکروها فلا بد من النظر في دلیله فإن کان نهیا ظنیا یحکم بکراهة التحریم إلا لصارف للنهي عن التحریم إلی الندب" (شامیۃ ۱/۱۳۲) ان تمام اصولوں سے اتنی بات تو واضح ہوگئی کہ یہ فعل نماز کے اندر مکروہ تحریمی ہے اور ہر وہ نماز جو کراہت تحریمی کے ساتھ ادا کی جائے اس کا اعادہ لازم ہے۔

(۲)۔ حدیث مبارکہ میں کوہان نما جوڑا باندھنے کی جو وعید ہے شرح نووی اور مرقاۃ وغیرہ میں اس کی کئی علتیں بیان کی گئی ہیں کہ یہ متکبرانہ انداز ہے ایسی عورتیں قلباً وجسماً اپنے آپ کو مردوں کی طرف مائل کرتی ہیں اس طرح کے بال بنانا فاجرات فاسقات عورتوں کا شیوہ ہے ایسی عورتیں اپنی آنکھوں کو اور اپنے سر کو نیچے نہیں کرتیں بے جا زینت کا اظہار ہے بنی اسرائیل کی عورتوں کیلئے بھی اس کی ممانعت تھی وغیرہ وغیرہ۔

وفی شرح النووی (۲/۳۸۳) باب جهنم اعاذنا الله منها: واما مائلات ممیلات فقیل زائغات عن طاعة الله تعالی وما یلزمهن من حفظ الفروج وغیرها وممیلات یعلمن غیرهن مثل فعلهن وقیل مائلات متبخترات فی مشیتهن ممیلات أکتافهن وقیل مائلات یتمشطن المشطة المیلاء وهي مشطة البغایا معروفة لهن ممیلات یمشطن غیرهن تلك المشطة وقیل مائلات إلی الرجال ممیلات لهم بما یبدین من زینتهن وغیرها وأما رؤوسهن کأسنمة البخت فمعناه یعظمن رؤوسهن بالخمر والعمائم وغیرها مما یلف علی الرأس حتی تشبه أسنمة الابل البخت هذا هو المشهور فی تفسیره قال المازری ویجوز أن یکون معناه یطمحن إلی الرجال ولا یغضضن عنهم ولا ینکسن رؤوسهن واختار القاضي أن المائلات تمشطن المشطة المیلاء قال وهی ضفر الغدائر وشدها إلی فوق وجمعها فی وسط الرأس فتصیر کأسنمة البخت۔

(۱۸۷) مذکورہ فتوے پر ایک استدراک

سوال......عرض یہ ہے کہ بندہ کی نظر سے آنجناب کے دارالافتاء سے منسوب ایک فتویٰ گزرا جس میں یہ درج تھا کہ عورت کا کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور ایسی نماز واجب الاعادۃ ہے جبکہ علامہ شامیؒ نے اس نماز کو واجب الاعادہ قرار دیا ہے جس میں ماہیت صلوٰۃ میں کراہت پائی جائے (۱/۴۵۷ شامی) اور بندہ کی ناقص سمجھ کے مطابق کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنے سے ماہیت صلوٰۃ میں کراہت نہیں پائی جارہی اس کے باوجود نماز کو واجب الاعادہ تحریر کیا گیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جو نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ادا کی جائے وہ واجب الاعادہ ہوگی یا نہیں اس کیلئے فقہاء کرام کا یہ اصول ہے کہ "کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ تجب اعادتھا" اور فقہاء نے یہ قاعدہ عام اور مطلق رکھا ہے اس میں کسی قسم کی کوئی تخصیص اور قیود نہیں لگائیں علامہ شامی رحمہ اللہ کا اس قاعدہ میں تخصیص کرنا (بان مرادھم بالواجب والسنۃ التی تعاد بترکہ ما کان من ماھیۃ الصلوۃ واجزائھا ۱/۴۵۷) محل نظر ہے کیونکہ اول تو خود علامہ شامی اس تخصیص پر مطمئن نہیں جیسا کہ فرماتے ہیں "لکن قولھم کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم یشمل ترک الواجب وغیرہ ویؤیدہ ما صرحوا بہ من وجوب الاعادۃ بالصلوۃ فی ثوب فیہ صورۃ بمنزلۃ من یصلی وھو حامل الصنم (۱/۴۵۷)" نیز بعض مقامات پر علامہؒ خود اپنی اس تخصیص کی مخالفت فرمارہے ہیں اور فقہاء کے مذکورہ قاعدہ اور اصول کو مطلق رکھ کر حکم لگارہے ہیں جیسا کہ "صلوۃ مع مدافعۃ الاخبثین" پر اعادہ کا حکم صادر فرمایا قولہ وکذا کل صلوۃ الخ الظاھر انہ یشمل نحو مدافعۃ الاخبثین (۱/۴۵۷) اسی طرح تصویر والے کپڑوں میں نماز پڑھنے پر اعادہ کا حکم فرمایا: وقال فی المعراج وفی جامع التمرتاشی لو صلی فی ثوب فیہ صورۃ یکرہ وتجب الاعادۃ قال ابو الیسر ھذا ھو الحکم فی کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ (۲/۶۳) اسی طرح "صلوۃ الی وجہ انسان" کے اعادہ کے حکم کو بھی اسی قاعدہ کی اطلاقیت پر محمول فرمایا قولہ وصلوۃ الی وجہ انسان... ویکون الامر بالاعادۃ لازالۃ الکراھۃ لانہ الحکم فی کل صلوۃ ادیت مع الکراھۃ (۱/۶۴۴)

حالانکہ یہ تمام افعال ماہیت اور اجزاء صلوٰۃ میں سے نہیں ہیں اس کے باوجود اعادہ کا حکم فرمایا، معلوم ہوا کہ فقہاء کا مذکورہ قاعدہ مطلق اور عام ہے (البتہ بعض جزئیات میں فقہاء نے اتفاقاً اعادہ کی صراحت کردی ہے اور اکثر جزئیات کو مطلق ہی رکھا ہے اور ان تمام جزئیات کیلئے اصول ذکر فرمایا) لہٰذا اسی اصول وقاعدہ کے تحت عورت کو کوہان نما جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا بھی مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہونا چاہیے۔

رہا علامہ شامیؒ کا یہ کہنا کہ چونکہ جماعت واجب یا سنت مؤکدہ فی حکم الواجب ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی بلا جماعت انفراداً نماز پڑھ لے تو اس کے اعادہ کا حکم دینا چاہیے حالانکہ فقہاء اسکے اعادہ کا حکم نہیں دیتے، کیونکہ "باب ادراک الفریضۃ" میں صراحت فرماتے ہیں کہ "انہ لو صلی ثلاث رکعات من الظھر ثم اقیمت الجماعۃ یتم ویقتدی متطوعاً" (اگر کوئی شخص ظہر کی تین رکعت پڑھ لے اور پھر جماعت کھڑی ہوجائے تو اسے چاہیے کہ اپنی نماز پوری کرکے جماعت میں نفل کی نیت سے شامل ہوجائے) اس

سے تقریباً صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ظہر کی نماز کا جماعت کے ساتھ اعادہ نہیں ہے، حالانکہ اس کی نماز مکروہ تحریمی یا قریب من التحریم ہے اور یہ مذکورہ قاعدہ کے مخالف ہے لہٰذا اس قاعدہ میں تخصیص کا دعویٰ کرنا پڑے گا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ کا دعویٰ تخصیص کا دارومدار فقہاء کے اس قول پر ہے کہ "ویقتدی متطوعاً" اور اس کو "کالصریح" فرمایا حالانکہ اس "متطوعاً" میں بھی اعادہ کا احتمال ہوسکتا ہے کیونکہ واجب الاعادہ نماز بھی درحقیقت نفل ہی ہوتی ہے جو فرض کی کوتاہی کے تدارک کیلئے پڑھی جاتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیمؒ الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں "واما الصلاۃ المعادۃ لارتکاب مکروہ او ترک الواجب فلا شک انھا جابرۃ لافرض لقولھم بسقوط الفرض بالاولی، فعلی ھذا ینوی کونھا جابرۃ لنقص الفرض علی انھا نفل تحقیقاً" (۱۳۷ القاعدۃ الثانیۃ، ط: میر محمد کتب خانہ کراچی) لہٰذا اس "یقتدی متطوعاً" کو صریح کہہ کر اس سے فقہاء کے عمومی قاعدہ میں تخصیص کرنا محل نظر ہے، اور جہاں تک تعلق ہے انفرادی نماز کے واجب الاعادہ نہ ہونے کا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی نماز کے واجب الاعادہ نہ ہونے کی تخصیص نص سے ثابت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں جس شخص نے انفرادی نماز پڑھ لی تھی، تو اسے ترک جماعت کی وجہ سے اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا (بخاری ۱/۹۷، ۹۸) اسی طرح جس حدیث مبارکہ میں جماعت میں حاضر نہ ہونے والوں کے گھروں کے جلانے کا ذکر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا (مسلم، ۱/۲۳۲) نیز فقہاء کی صراحت کے مطابق فاسق ومبتدع کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے فی الدر المختار ویکرہ امامۃ عبد... وفاسق... ومبتدع... وقال ابن عابدین علیہ الرحمۃ تحتہ واما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بانہ لا یھتم لامر دینہ...... فھو کالمبتدع تکرہ امامتہ فی کل حال بل مشی فی شرح المنیۃ علی ان کراھۃ تقدیمہ کراھۃ تحریم (۱/۵۶۰)

لیکن واجب الاعادہ نہیں ہے بلکہ تنہا پڑھنے سے ان کی اقتداء میں پڑھنا بہتر ہے فی الدر المختار: صلی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعۃ۔۔۔ قال الشامی تحتہ: افاد ان الصلوۃ خلفھما اولی من الانفراد کیونکہ یہاں نص موجود ہے "صلوا خلف کل بر وفاجر" (کنز العمال ۱/۹۶) اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امام الفتنہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا (بخاری ۱/۹۶) تاکہ امت انتشار وافتراق سے بچی رہے، وفی ھذا الاثر لحض علی شھود الجماعۃ ولا سیما فی زمن الفتنۃ لئلا یزداد تفرق الکلمۃ (فتح الباری ۲/۱۵۱) توجس طرح فاسق ومبتدع کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہونے کے باوجود واجب الاعادہ نہیں نص کے باعث تو اسی طرح انفرادی نماز پڑھنا بھی ترک جماعت کی وجہ سے واجب الاعادہ نہیں نص کے پائے جانے کی وجہ سے نیز اگر انفرادی نماز کو ترک جماعت کی وجہ سے واجب الاعادہ کہا جائے تو چونکہ اکثر اوقات با جماعت اعادہ متعذر رہوتا ہے کہ اگر جماعت کا وقت نکل جانے کے بعد پڑھی تو اب یا تو دیگر مساجد میں جماعت ڈھونتا پھرے یا ایسے اشخاص کو جمع کرے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی تو اس میں حرج ہے اور اگر کہیں جماعت یا ایسے اشخاص میسر نہ ہوئے تو پھر باجماعت اعادہ کے حکم سے تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی اور اگر انفراداً ہی اعادہ کرے تو اس صورت میں دور لازم آئے گا لہٰذا علامہ شامیؒ کا انفرادی نماز کے ترک جماعت کی وجہ سے واجب الاعادہ نہ ہونے پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء کے عام اور مطلق قاعدے واصول میں تخصیص کرنا ان کا تفرد معلوم ہوتا ہے نیز اگلی سطر میں وہ خود اس پر

مطمئن نہیں اس لئے قاعدہ کو عموم پر رکھنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں نماز کا واجب الاعادہ ہونا ہی راجح معلوم ہوتا ہے یہ ہماری ناقص رائے ہے لہٰذا اس مسئلہ کی تحقیق دوسرے مفتیان کرام سے بھی کرلی جائے ھذا ما ظھر لی من الفتاح الوھاب۔

رسالة

الكلمات الهندية

فی الاجابة عن الدعاء بغیر العربیة

غیر عربی میں دعا، قراءت اور شروع فی الصلوۃ کا حکم

اس میں امام صاحبؒ کا مذہب اور رجوع کی تحقیق نیز ایسی نماز کے اعادے کا حکم

(۱۸۸) غیر عربی میں دعا کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نفل نماز کے سجدوں میں ایسی چیزیں جو مخلوق سے نہیں مانگی جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاتی ہوں ایسی چیزوں کا عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں مانگنا کیسا ہے؟ مثلاً اردو، انگلش، گجراتی میں کرنا اس میں امام صاحب کا مذہب کیا ہے بعض حضرات سے سنا ہے کہ امام صاحب پہلے جواز کے قائل تھے پھر سب میں رجوع کر لیا پہلے فارسی میں قرآن کے پڑھنے کے بھی قائل تھے نیز یہ بھی بتادیں کہ امام صاحب کے نزدیک اب اس کا کیا حکم ہے اگر نماز صحیح ہو تو کراہت ہوگی یا نہیں؟ نماز کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟ میں بھی عالم ہوں میں نے کتب کی مراجعت کی تو متفرق کتب کی بکھری ہوئی عبارتیں اور نقل مذاہب میں شبہات مجھے سمجھ نہ آسکے آپ سے مسئلے کی مکمل تشریح مطلوب ہے نیز ایسی چیزیں جو بندوں سے مانگی جاتی ہوں انہیں عربی میں ہی نماز میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسئولہ صورت میں کتب فقہ اور اکابرین کی تحریرات کا تفصیلی مطالعہ اور جائزہ لینے کے بعد بندہ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں مفید ہوگا کہ اولاً ان کا نمبروار ذکر کر دیا جائے۔ مسئلہ چونکہ نماز میں دعاء بغیر العربیہ سے متعلق ہے اور ساتھ ایسی چیزیں جو بندوں سے بھی مانگی جاسکتی ہوں ان کی نماز میں دعا کرنے سے بھی متعلق ہے لیکن دعاء بغیر العربیہ کا مسئلہ چند دوسرے اہم مسائل پر موقوف ہے ان مسائل کا سمجھنا اور تنقیح کا سامنے آنا ضروری ہے ورنہ یہ مسئلہ تشنہ ہی رہے گا اس لیے بندہ ترتیب وار چند مسائل کا ذکر کر کے آپ کے مسئلے کی طرف آئے گا۔

(۱)۔ پہلا مسئلہ نماز میں قراءت بغیر العربیہ کا ہے مثلاً فارسی یا اردو زبان میں قرآن پاک کا پڑھنا اس کا کیا حکم ہے؟ یہاں امام

صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ کا اختلاف تھا اختلاف کی نوعیت جاننا ضروری ہے اتنی بات واضح رہے کہ اس بات میں تو ائمہ ثلثہ کا اتفاق ہے کہ قراءت بالفارسیہ وغیرھا سے نماز مطلقاً فاسد نہیں ہوتی۔ یہ قراءت مطلقاً مفسد نہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ کیا قراءت بغیر العربیہ صحت صلوۃ کیلئے کافی ہوگی یا نہیں امام صاحب کا قول یہ ہے کہ قراءت بالفارسیہ وغیرھا بھی کافی ہیں اور نماز اداء ہوجائے گی جبکہ صاحبین کے مذہب میں تفصیل ہے جس کی مختصر تنقیح یہ ہے کہ اگر قصے یا امرونہی سے متعلق آیات پڑھتا ہے تو یہ تو مطلقاً مفسد ہیں لیکن ذکر یا تنزیہ سے متعلق آیات غیر عربی میں پڑھنے سے نماز میں فساد نہ آئے گا البتہ اس پر اکتفاء جائز نہیں بلکہ قدر ماتجوز بہ الصلاۃ (یعنی اتنی آیات کا پڑھنا جس سے نماز درست ہوجائے) جو کہ تین چھوٹی یا ایک بڑی آیت ہے اگر پڑھ لی جائیں اور ذکر اور تنزیہ سے متعلق آیات بھی پڑھ لے تو صاحبین کے نزدیک بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔

گویا امام صاحب کے نزدیک قراءت بغیر العربیہ مطلقاً صحیح ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک قصص امرونہی کی آیات کا غیر عربی میں پڑھنا تو مفسد ہے لیکن ذکر وتنزیہ کی آیات پر غیر عربی میں اکتفاء جائز نہیں البتہ اگر تین چھوٹی آیات وغیرہ عربی میں پڑھ لی جائیں جس سے نماز درست ہوجائے تو اس سے زائد ذکر وتنزیہ کی آیات غیر عربی میں پڑھنا صحیح ہے۔ امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ دونوں کے دلائل کتب فقہ میں مفصلاً اور مبسوطاً ذکر ہیں بندہ یہاں ان سے بحث نہیں کرتا۔ بدائع الصنائع میں علامہ کاشانی رحمہ اللہ نے امام صاحب کے مذہب کو ترجیح دی ہے لیکن عامۃ الکتب اور رؤساء فقہاء حنفیہ نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف رجوع ثابت کیا ہے کیونکہ صاحبین کی دلیل (لأن المأمور به قراءة القرآن وهو اسم للمنزل باللفظ العربي المنظوم الخاص المكتوب في المصاحف المنقول إلينا نقلا متواترا والأعجمي إنما يسمى قرآنا مجازا ولذا يصح نفي اسم القرآن عنه فلقوة دليل قولهما رجع إليه۔ شامیہ ۱/۴۸۴) اس دلیل کی قوت کی بناء پر امام صاحب نے مسئلہ قراءت بالفارسیہ وغیرھا میں صاحبین کے قول کی طرف رجوع کرلیا ہے اور اب اتفاقی قول یہی ہے کہ قراءت بغیر العربیہ جائز نہیں۔ باقی امام صاحب کا اصل مذہب ہو یا صاحبین کے مذہب میں ذکر وتنزیہ کی آیات کا مع تین آیات کے پڑھنے کی گنجائش یہ سب جوازِ صلوۃ اور صحت کی حد تک ہے ورنہ مکروہ تحریمی تو یہ بہر حال ہے اور بغیر عذر کے ایسا کرنے والے کی نماز ادا تو ہوجائے گی لیکن کراہتِ تحریمی کے ساتھ جو کہ واجب الاعادہ ہوگی۔ نیز یہاں یہ بات بھی واضح ہو کہ یہ اختلاف غیر عاجز (یعنی جو شخص عربی میں تلاوت کرسکتا ہے) کے بارے میں تھا عاجز کے بارے میں اتفاقاً یہ مذہب ہے کہ وہ قراءت بغیر العربیۃ کرسکتا ہے۔ اس سے متعلق اختلاف نہیں۔ قراءت سے متعلق یہ تمام تفصیلات بحر (۱/۵۳۶)، بدائع (۱/۵۲۷) اور شامیہ میں ذکر ہیں شامیہ کی عبارت درج ذیل ہے:

قال الحصكفي في الدر: (وصح شروعه) أيضا مع كراهة التحريم (بتسبيح وتهليل) وتحميد وسائر كلم التعظيم الخالصة له تعالى ولو مشتركة كرحيم وكريم في الأصح وخصه الثاني بأكبر وكبير منكرا ومعرفا زاد في الخلاصة والكبار مخففا ومثقلا (كما صح لو شرع بغير عربية) أي لسان كان (أو قرأ بها عاجزا) فجائز إجماعا قيد القراءة بالعجز لأن الأصح رجوعه إلى

قولهما وعليه الفتوى ۔۔ فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل إن قصة تفسد وإن ذكرا لا۔

وقال ابن عابدين تحتها: قوله (قرأ بالفارسية) أي مع القدرة على العربية ... قوله (إن قصة الخ) اختار هذا التفصيل في الفتح توفيقا بين القولين وهما ما قاله في الهداية من أنه لا خلاف في عدم الفساد إذا قرأ معه بالعربية ما تجوز به الصلاة وما قاله النجم النسفي وقاضيخان من أنها تفسد عندهما فقال في الفتح والوجه إذا كان المقروء من مكان القصص والأمر والنهي أن تفسد بمجرد قراءته لأنه حينئذ متكلم بكلام غير القرآن بخلاف ما إذا كان ذكرا أو تنزيها فإنها تفسد إذا اقتصر على ذلك بسبب إخلاء الصلاة عن القراءة اھ وتبعه في البحر وقواه في النهر فلذا جزم به الشارح۔

(۲)۔ دوسرا مسئلہ شروعِ صلوۃ کا ہے یعنی نماز کی ابتداء میں موجود تحریمہ سے متعلق ہے۔ یعنی اللہ اکبر کہنا ضروری ہے یا دیگر کوئی لفظ عربی یا غیر عربی میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک اختلاف تو اللہ اکبر کے علاوہ عربی میں ہی تعظیم پر دال کوئی لفظ کہنے میں ہے اس میں امام صاحب اور امام محمد رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ہر تعظیم پر دال لفظ کہا جاسکتا ہے مثلاً اللہ اجل، اللہ اعظم، اللہ الکبار وغیرہ جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صرف پانچ الفاظ (اللہ اکبر، اللہ الاکبر، اللہ کبیر، اللہ الکبیر اور اللہ الکبار) سے نماز کی ابتداء ہوسکتی ہے یعنی تکبیر کا لفظ ان میں کسی بھی درجے میں موجود ہے جبکہ طرفین ہر تعظیم پر دال لفظ سے آغاز کے جواز کے قائل ہیں۔ البتہ مکروہ تحریمی ان کے ہاں بھی ہے جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تو نماز کی ابتداء ہی ان پانچ الفاظ کے علاوہ سے نہ ہوگی۔ بعض حضرات نے ایک چھٹا لفظ "اللہ کبار" بھی بتایا ہے۔ یہاں یہ بات بالخصوص ذہن نشین رہے کہ تکبیر میں لفظ "اللہ اکبر" کی تاکید آئی ہے لہٰذا چاہے طرفین کے ہاں مطلقاً گنجائش ہو یا امام ابو یوسفؒ کے بقیہ چار الفاظ ہوں سب کا استعمال "اللہ اکبر" کے علاوہ مکروہ تحریمی ہے۔ "الراجح انه مكروه تحريما" (شامی ۱/ ۴۸۳)۔ اس باب میں طرفین کا قول راجح ہے کہ نماز کا آغاز مع کراھۃ التحریم ہوجائے گا۔ شامیہ میں نہر اور حلیہ کے حوالے سے نقل ہے "والصحيح قولهما كما في النهر والحلية عن التحفة والزاد" (شامیہ ۱/ ۴۸۳)

لیکن شروع فی الصلوٰۃ میں ذکر کردہ یہ اختلاف ہمارا موضوع بحث نہیں۔ شروع فی الصلاۃ میں ایک اور اختلاف شروع بغیر العربیۃ کا ہے وہ ہمارا موضوع بحث ہے اس میں امام صاحب کے نزدیک عربی کے علاوہ فارسی وغیرہ ہر زبان میں تعظیم پر دال الفاظ سے نماز کی ابتداء ہوجاتی ہے مثلاً "اللہ بزرگ است" وغیرہ سے جبکہ صاحبین کے نزدیک غیر عربی میں تکبیر کہنے سے نماز کی ابتداء ہی نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی یہ عمل مکروہ تحریمی ہے البتہ صحت کے وہ قائل ہیں جبکہ صاحبین صحت کے قائل نہیں۔ گویا امام محمد شروع فی الصلاۃ کے پہلے اختلاف یعنی "اللہ اعظم" وغیرہ پڑھنے کے جواز میں امام صاحب کے ساتھ جبکہ غیر عربی میں "اللہ اکبر" وغیرہ کہنے کے عدم جواز میں امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہیں۔ نیز قراءت قرآن بغیر العربیۃ کی طرح شروع فی الصلوٰۃ

العربیہ میں بھی امام صاحب اور صاحبین کا بعینہ اختلاف ہے اور یہاں بھی اختلاف غیر عاجز سے متعلق ہے عاجز کے لیے تو امام صاحب، صاحبین سب بالاتفاق جوازِ شروع بغیر العربیہ کے قائل ہیں۔

البتہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے کہ کیا قراءت بغیر العربیہ کی طرح شروع بغیر العربیہ میں بھی امام صاحب نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کیا ہے اور اب وہ عدمِ صحت کے قائل ہیں یا نہیں؟ اس پر ہم چند سطر بعد مفصل کلام کریں گے۔

(۳)۔ تیسرا مسئلہ یہاں دعاء بغیر العربیۃ، خطبہ، اور جمیع اذکارِ صلاۃ سے متعلق ہے کہ ان کے غیر عربی میں پڑھنے کا کیا حکم ہے تو یہاں ذہن نشین رہے کہ فقہاء کی تصریح کے مطابق ان سب میں شروع فی الصلاۃ کی طرح ہی امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے امام صاحب کراہت تحریم کے ساتھ صحت کے قائل اور صاحبین کے نزدیک دعاء، خطبہ یا کوئی بھی ذکر غیر عربی میں صحیح نہیں۔

گویا شروع فی الصلاۃ، دعاء بغیر العربیہ، خطبہ اور جمیع اذکار الصلاۃ کا غیر عربی میں پڑھنا امام صاحب اور صاحبین کے نزدیک مختلف فیہ ہے امام صاحب صحت مع الکراہۃ التحریم کے قائل ہیں جبکہ صاحبین عدمِ صحت کے قائل ہیں۔ اب اس بات پر ہم روشنی ڈالیں گے کہ کیا قراءت کی طرح ان دیگر مسائل میں بھی امام صاحب نے رجوع کیا ہے تو یہاں یہ بات واضح رہے کہ قراءت کے علاوہ اشیاء میں امام صاحب نے رجوع نہیں کیا بلکہ فقہاء نے ان سب میں امام صاحب کے مذہب کو ہی معتمد، مختار اور اقوی قرار دیا ہے۔ شامیہ میں علامہ طحطاوی سے نقل ہے "والمعتمد قولہ، ط "نیز منحۃ الخالق میں ہے "المختار فی الشروع مذھب الامام فی انہ یصح بالفارسیۃ بدون العجز "(منحۃ ۱/ ۵۳۵)۔ البتہ علامہ عینیؒ نے کنز الدقائق کی شرح میں ان تمام میں بھی امام صاحب کا صاحبینؒ کی طرف رجوع ذکر کیا ہے علامہ عینیؒ پر قراءت اور دیگر اشیاء میں فرق سے متعلق اشتباہ ہوگیا ہے۔ اس پر فقہاء نے علامہ عینی پر سخت استدراک فرمایا ہے بلکہ درمختار میں تو تاتارخانیہ کی ایک عبارت سے صاحبین کا ان اشیاء میں امام صاحب کی طرف رجوع ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاتارخانیہ میں تکبیر بالفارسیہ کو تلبیہ کی طرح اتفاقاً غیر عربی میں جائز قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبین نے رجوع کیا ہے نہ کہ امام اعظمؒ نے۔ لیکن علامہ شامیؒ نے یہاں وضاحت فرمائی ہے کہ تاتارخانیہ میں ذکر "ولو کبر بالفارسیۃ او لبی بالفارسیۃ ...... جاز بالاتفاق" میں کبر سے تکبیر تحریمہ مراد ہونا واضح نہیں لہٰذا صاحبین کا رجوع کا دعویٰ کرنا محلِ نظر ہے کیونکہ کبر سے مراد تکبیر تشریق یا تکبیر ذبح ہے نہ کہ تکبیر تحریمہ۔ نیز تمام دیگر اذکار جو تاتارخانیہ میں ذکر ہیں وہ غیر نماز کے ہیں تو کبر سے بھی تکبیر ذبح مراد لینا اولیٰ ہے لہٰذا صاحبین کا رجوع اتنی مبہم عبارت سے ثابت کرنا محلِ نظر ہے۔

درمختار کی طرف سے علامہ شامی کو یہ جواب دیا جاسکتا ہے جیسا کہ علامہ رافعیؒ نے دیا بھی ہے کہ درمختار میں "فظاھرہ" کے الفاظ ہیں کہ تاتارخانیہ کی عبارت سے بظاہر صاحبین کا امام کی طرف رجوع ثابت ہوتا ہے اور درمختار میں یہ بات علامہ عینی کے امام صاحب کے اثباتِ رجوع پر استدراک کا ذکر ہے نیز "بظاہر" کا لفظ بھی جزم کے منافی ہے لہٰذا درمختار میں جزماً رجوع ثابت نہیں کیا گیا بلکہ ایک احتمال ظاہر کیا گیا ہے کہ صاحبین کا رجوع تو بظاہر ثابت کیا جاسکتا ہے امام کا نہیں۔ لہٰذا استدراک کی ضرورت نہیں۔

الغرض اس تمام تفصیل سے قطع نظر قراءت کے علاوہ دعاء، خطبہ اور جمیع اذکار الصلاۃ میں امام صاحب کا رجوع ثابت نہیں

اسمیں تا حال امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے نیز امام کا مذہب اور اس کے دلائل یہاں قوی ہیں لہٰذا یہی معتمد اور مختار ہے کہ دعاء، خطبہ اور جمیع اذکار الصلاۃ کا عربی کے علاوہ میں پڑھنا کراہتِ تحریمی کے ساتھ درست ہے یہ بحث بحر (١/ ٥٣٥) منحۃ علی البحر (١/ ٥٣٥) تبیین (١/ ٢٨٥) طحطاوی اور شامیہ میں ہے شامیہ کی بحث نقل کی جارہی ہے:

قال الحصكفي في الدر: (وصح شروعه) أيضا مع كراهة التحريم (بتسبيح وتهليل) وتحميد وسائر كلم التعظيم الخالصة له تعالى ولو مشتركة كرحيم و كريم في الأصح وخصه الثاني بأكبر و كبير منكرا او معرفا زاد في الخلاصة والكبار مخففا ومثقلا (كما صح لو شرع بغير عربية) أي لسان كان وخصه البردعي بالفارسية لمزيتها بحديث لسان أهل الجنة العربية والفارسية الدرية بتشديد الراء قهستاني، وشرطا عجزه وعلى هذا الخلاف الخطبة وجميع أذكار الصلاة وأما ما ذكره بقوله أو آمن أو لبى أو سلم أو سمى عند ذبح أو شهد عند حاكم أو رد سلاما ولم أر لو شمت عاطسا (أو قرأ بها عاجزا) فجائز إجماعا قيد القراءة بالعجز لأن الأصح رجوعه إلى قولهما وعليه الفتوى. قلت وجعل العيني الشروع كالقراءة لا سلف له فيه ولا سند له يقويه بل جعله في التاتر خانية كالتلبية يجوز اتفاقا فظاهره كالمتن رجوعهما إليه لا هو إليهما فاحفظه فقد اشتبه على كثير من القاصرين .... فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل إن قصة تفسد وإن ذكرا لا.

وقال ابن عابدين تحتها في رد المحتار: (أيضا الخ) أي كما صح شروعه بالتكبير السابق صح أيضا بالتسبيح ونحوه لكن مع كراهة التحريم لأن الشروع بالتكبير واجب وقدمنا أن الواجب لفظ الله أكبر من بين ألفاظ التكبير الآتية

وقال في الخزائن هنا وهل يكره الشروع بغير الله أكبر تصحيحان. والراجح أنه مكروه تحريما وأن وجوبه عام لا خاص بالعبد كما حرره في البحر للمواظبة التي لم تقترن بترك ..... قوله (وخصه الثاني) فلا يصح الشروع عنده إلا بهذه الألفاظ المشتقة من التكبير والصحيح قولهما كما في النهر والحلية عن التحفة والزاد قوله (والكبار) أي بضم الكاف بمعنى الكبير كما في القاموس والظاهر أنه يجوز تنكيره عند أبي يوسف كما جاز في الأكبر والكبير فليراجع ح .... قوله (وشرطا عجزه) أي التكبير بالعربية والمعتمد قوله ط ... قوله (وجميع أذكار الصلاة) في التاتر خانية عن المحيط وعلى هذا الخلاف لو سبح بالفارسية في الصلاة أو دعا أو أثنى على الله تعالى أو تعوذ أو هلل أو تشهد أو صلى على النبي ﷺ بالفارسية في الصلاة أي يصح

عنده لكن سيأتي كراهة الدعاء بالأعجمية .... قوله (ولا سند له يقويه) أي ليس له دليل يقوى مدعاه لأن الإمام رجع إلى قولهما في اشتراط القراءة بالعربية لأن المأمور به قراءة القرآن ..... قوله (بل جعله في التاترخانية كالتلبية) نص عبارتها وفي شرح الطحاوي ولو كبر بالفارسية أو سمى بالفارسية عند الذبح أو لبى عند الإحرام بالفارسية أو بأي لسان سواء كان يحسن العربية أو لا جاز بالاتفاق اھ قوله (كالمتن) حيث لم يقيد الشروع بالعجز كما قيد به القراءة قوله (رجوعهما إليه الخ) أي إنهما رجعا إلى قوله بصحة الشروع بالفارسية بلا عجز كما رجع هو إلى قولهما بعدم الصحة في القراءة فقط لا في الشروع أيضا كما توهمه العيني لكن كونهما رجعا إلى قوله في الشروع لم ينقله أحد وإنما المنقول حكاية الخلاف كما قدمناه وأما ما في التاترخانية فغير صريح في تكبير الشروع بل هو محتمل لتكبير التشريق أو الذبح بل هذا أولى لأنه قرنه مع الأذكار الخارجة عن الصلاة وأما عبارة المتن فهي مبنية على قول الإمام فالحاصل أن ما أورده على العيني في دعوى رجوعه إلى قولهما يرد عليه في دعواه رجوعهما إلى قوله ۔ (شامية ١/٤٨٤)

وقال الرافعي في التحرير المختار تحت قول ابن عابدين (واما ما في التتارخانية فغير صريح الخ): هو كذلك لكن الشارح لم يدع الصراحة في ذلك بل الظهور فقط ۔ (التحرير المختار ١/٥٩)

الغرض خلاصہ یہ نکلا کہ قراءت کے علاوہ شروع، خطبہ، اذکار صلاۃ تمام میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف باقی ہے امام صاحب یا صاحبین کسی نے دوسرے کی طرف رجوع نہیں کیا ہے علامہ عینیؒ سے تمام میں امام صاحب کے رجوع کا دعویٰ محل نظر ہے بعد میں علامہ شرنبلالی، شیخ زادہ (صاحب مجمع الانہر) وغیرہ کو عینی کی طرح یہ اشتباہ ہو گیا اور انہوں نے تمام میں امام اعظم کے رجوع کا قول کیا ہے البتہ علامہ حصکفیؒ نے چونکہ علامہ عینیؒ اور ان کے متبعین پر کچھ سخت الفاظ میں رد کیا ہے لہٰذا علامہ شامی رحمہ اللہ علامہ حصکفی کے رد میں کچھ تاویل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ علامہ حصکفیؒ سے خود ملتقی کی شرح در منتقی میں یہ تسامح ہوا ہے اور علامہ حصکفیؒ نے در منتقی میں خود علامہ عینیؒ کی اتباع کی ہے شامیہ مع الدر کی عبارت یہ ہے:

قال الحصكفي في الدر: قلت وجعل العيني الشروع كالقراءة لا سلف له فيه ولا سند له يقويه بل جعله في التاترخانية كالتلبية يجوز اتفاقا فظاهره كالمتن رجوعهما إليه لا هو إليهما فاحفظه فقد اشتبه على كثير من القاصرين حتى الشرنبلالي في كل كتبه فتنبه

وقال ابن عابدين تحتها: قوله (حتى الشرنبلالي) أي اشتبه عليه ذلك أيضا فحتى ابتدائية والخبر محذوف لا عاطفة لأنا لم نعهد من هذا الشارح الفاضل قلة الأدب مع العلماء حتى

یجعل الشرنبلالی من القاصرین.... واعلم أن الشارح نفسه خفی علیه ذلك فتبع العینی فی شرحه علی الملتقی وفی الخزائن بل خفی أیضا علی البرهان الطرابلسی فی متنه مواهب الرحمن حیث قال والأصح رجوعه إلیهما فی عدم جواز الشروع والقراءة بالفارسیة لغیر العاجز عن العربیة. (شامیه ۴۸۵/۱)

بندہ ناچیز عرض کرتا ہے اس تمام بحث میں کچھ مخفیات ہیں جنہیں واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اولاً تو علامہ عینیؒ سے متعلق یہ بات کہ انہوں نے تمام مسائل میں امام سے رجوع کا قول کیا ہے کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ علامہ عینی کی کنز الدقائق کی شرح رمز الحقائق میں موجود عبارت سے یہ دعویٰ اخذ کیا گیا ہے وہ عبارت یہ ہے:

"اما الشروع بالفارسیة او القراءة بها فهو جائز عند ابی حنیفه مطلقا وقالا لا یجوز الا عند العجز وبه قالت الثلاثة وعلیه الفتوی وصح رجوع ابی حنیفه الی قولهما کما لو قرأبها ای بالفارسیة حال کونه عاجزا عن العربیة فانه یجوز بلا خلاف (رمز الحقائق ۳۲/۱)

علامہ عینی کی اس عبارت میں اگرچہ قراءت اور شروع دونوں کے ذکر کے بعد امام کے رجوع کا ذکر ہے جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ عینی دونوں میں رجوع کا دعویٰ ذکر کر رہے ہیں لیکن اس "صح رجوع ابی حنیفه" کو صرف قراءت کے ساتھ بھی خاص کیا جاسکتا ہے اولاً تو اس لیے کہ علامہ عینی نے ہی ہدایہ کی شرح بنایہ میں فقط قراءت میں رجوع کا ذکر کیا ہے ثانیاً "کما لو قراء بها الخ" میں مشبہ بہ میں اتفاق بھی قراءت للعاجز کے بارے میں ذکر ہے تو مشبہ میں بھی فقط قراءت میں عدمِ جواز پر اتفاق مراد لیا جاسکتا ہے۔ علامہ عینی کی بنایہ میں عبارت یہ ہے:

(ویروی رجوعه) ای رجوع ابی حنیفه (فی اصل المسألة) یعنی القراءة بالفارسیة (الی قولهما) ای الی قول ابی یوسف ومحمد رواه ابو بکر الرازی وغیره (وعلیه الاعتماد) ای علی القول بالرجوع الاعتماد ولتنزیله منزلة الاجماع فان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعا بالاجماع.

(البنایة ۱۲۹/۲)

اسی بنیاد پر علامہ عبدالحی لکھنویؒ مسئلہ ہذا سے متعلق اپنے شہرہ آفاق رسالہ "آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس" میں فرماتے ہیں:

"والحق انه لم یرو رجوعه فی مسئلة الشروع بل هی علی الخلاف فان اجلة الفقهاء منهم صاحب الهدایة وشراحها العینی والسغناقی الخ" (آکام النفائس ص۱۵)

نیز علامہ عینی کی کنز الدقائق کی شرح سے متعلق عبارت ذکر کر کے علامہ عبدالحیؒ فرماتے ہیں:

"لکنه لیس صریحا فی اثبات الرجوع فیما نحن فیه بل یحتمل تعلق الرجوع بالقراءة فقط دون

ما نحن فیہ۔" (آکام النفائس ص۱۴)

لہٰذا علامہ عینیؒ کی ایک غیر صریح عبارت کو لے کر اس کی بناء پر انہیں تنقید کا نشانہ بنانا درست معلوم نہیں ہوتا جبکہ بنایہ میں وہ خود تصریح فرمارہے ہیں نیز یہاں ایک اور بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے علامہ حصکفیؒ صاحب درمختار سے متعلق جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے خود "درِ منتقی" میں علامہ عینی کی اتباع کر کے تمام مسائل میں رجوع کا قول کیا ہے یہ بھی محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

"واعلم ان الشارح نفسه خفي عليه ذلك فتبع العيني في شرحه على الملتقى" (شامیہ ۱/۴۸۵)

اس کے محل نظر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ "در منتقی" میں علامہ حصکفیؒ نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا بلکہ صرف قراءت میں علامہ عینی کے حوالے سے امام کا رجوع ذکر کر کے شروع میں علامہ عینی کے رجوع کے دعویٰ پر ردّ فرمایا ہے بلکہ تقریباً درمختار کے اسلوب میں ہی علامہ حصکفی نے در منتقی میں بھی علامہ عینی پر ردّ فرمایا ہے پھر یہ دعویٰ کرنا کہ علامہ حصکفی پر معاملہ خفی رہ گیا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ در منتقی کی عبارت یہ ہے:

(لو قرأبها) وهذا اذا كبر وقرأ بالفارسية (عاجزا عن العربية) بان كان لا يحسن العربية بشرط ان لا يخل بالمعنى وهذا قولهما وبه قالت الثلاثة واليه صح رجوع الامام وعليه الفتوىٰ قاله العيني وغيره (قلت) ولم اره سندا في رجوع الامام في التكبير بل في التتارخانيه جوازه بالفارسية اتفاقا احسن العربية ام لا (الدر المنتقى المطبوع مع مجمع الانهر ۱/۱۴۰)

بظاہر "قالہ العینی" سے جو کہ قراءت سے متعلق تھا علامہ شامیؒ کو اشتباہ ہوگیا ہے۔ الغرض ان تمام باتوں سے قطع نظر خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے قراءت بالفارسیہ کے جواز والے قول سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کرلیا ہے البتہ شروع اور جمیع اذکار صلوۃ میں اختلاف بدستور باقی ہے صاحبین کے نزدیک نماز کی ابتداء ہی غیر عربی میں نہ ہوگی اور جمیع اذکارِ صلوۃ درست ہی نہ ہوں گے (بلکہ منافی صلوۃ قرار دیئے جائیں گے) لیکن امام صاحبؒ کے نزدیک کراہت کے ساتھ نماز ادا ہوجائے گی۔ قراءت میں فقط امامؒ کی دلیل میں کچھ ضعف تھا اور صاحبین کی دلیل قوی تھی لہٰذا فقط قراءت میں امام صاحبؒ نے رجوع کیا ہے دیگر مسائل میں نہیں اور یہ بڑوں کی شان ہے کہ جب انہیں غیر کی دلیل زیادہ قوی معلوم ہوتو اس کی طرف رجوع فرمالیتے ہیں۔ حرص کرنے والوں کو ان باتوں میں آگے بڑھنے کی حرص کرنی چاہیئے۔

"دلّه على مذهبه دلائل شافية ومقدمات كافيه وان كانت عند غيره مجروحة ومقدوحة ولله دره وعلى مقلده شكره حيث رجع عن قوله الى قولهما اذ لاح له ضعف دليله وقوة دليلهما وبمثل هذا فليعمل العاملون ولمثل هذا فليتنافس المتنافسون" (آکام النفائس ص۳۲)

نیز یہ بھی ذکر کردیا گیا کہ شروع، خطبہ اور جمیع اذکارِ صلوۃ میں امام نے رجوع نہیں فرمایا اور امام کا مذہب ہی بتصریح فقہاء راجح اور مختار ہے اس میں یسر (سہولت) ہے۔ نماز صحیح ہوجائے گی البتہ یہ تصریح بھی ذکر کردی گئی کہ نماز کراہتِ تحریمی کے ساتھ اداء ہوگی،

جو کہ واجب الاعادہ ہوگی، شروع سے متعلق شامیہ میں ہے:

"(وصح شروعه) ايضا مع كراهة التحريم

وقال ابن عابدين تحتها: (أيضا الخ) أى كما صح شروعه بالتكبير السابق صح أيضا بالتسبيح ونحوه لكن مع كراهة التحريم. (شامية ۱/۴۸۳)

نیز خطبہ اور جمیع اذکارِ صلوۃ سے متعلق اولاً تو فقہاء "شروع" میں اختلاف ذکر کر کے یہ بتادیتے ہیں کہ خطبہ اور جمیع اذکارِ صلوۃ میں بھی شروع فی الصلوٰۃ کی طرح اختلاف ہے یہی اختلاف ان تمام کے امام صاحبؒ کے نزدیک صحیح مع کراھۃ التحریم ہونے پر دال ہے:

قال الحصكفى فى الدر: وعلى هذا الخلاف الخطبة وجميع أذكار الصلوة.

وقال ابن عابدين تحتها: قوله (وجميع أذكار الصلاة) فى التاترخانية عن المحيط وعلى هذا الخلاف لو سبح بالفارسية فى الصلاة أو دعا أو أثنى على الله تعالى أو تعوذ أو هلل أو تشهد أو صلى على النبى بالفارسية فى الصلاة أى يصح عنده لكن سيأتى كراهة الدعاء بالأعجمية.

(شامية ۱/۴۸۴)

امام صاحب کے نزدیک شروع، خطبہ اور جمیع اذکارِ صلاۃ کے صحیح مع کراھۃ التحریم ہونے کیلئے یہی دلیل کافی تھی لیکن نہر اور درمختار، شامیہ وغیرہ میں صراحۃً بھی ان کے مکروہ تحریمی ہونے کا ذکر ہے:

قال الحصكفى فى الدر: (ودعا) بالعربية، وحرم بغيرها، نهر

وقال ابن عابدين تحتها: مطلب فى الدعاء بغير العربية قوله (وحرم بغيرها)...هذا وقد تقدم أول الفصل أن الإمام رجع إلى قولهما بعدم جواز الصلاة بالقراءة بالفارسية إلا عند العجز عن العربية، وأما صحة الشروع بالفارسية و كذا جميع أذكار الصلاة فهى على الخلاف فعنده تصح الصلاة بها مطلقا خلافا لهما كما حققه الشارح هناك، والظاهر أن الصحة عنده لا تنفى الكراهة وقد صرحوا بها فى الشروع، وأما بقية أذكار الصلاة فلم أر من صرح فيها بالكراهة سوى ما تقدم ولا يبعد أن يكون الدعاء بالفارسية مكروها تحريما فى الصلاة وتنزيها خارجها فليتأمل وليراجع. (شامية ۱/۵۲۱)

وقال الرافعى تحت قول ابن عابدين: (قوله: والظاهر ان الصحة عنده لا تنفى الكراهة) بعد وجود التصريح بالكراهة فى الشروع فهو كاف ولا حاجة لهذا الاستظهار"

(التحرير المختار ۱/۶۴)

علامہ شامی اور علامہ رافعی دونوں کے اتفاق اور نہر اور درمختار کی حرام کی تصریح کے بعد واضح ہو گیا کہ شروع فی الصلاۃ میں کراہتِ تحریمی کی صراحت ہی بقیہ تمام میں امام کے نزدیک کراہتِ تحریمی ہونے کیلئے کافی تھی لیکن علامہ شامی نے پھر بھی یہاں تصریح کردی کہ یہ کراہت تحریمی کے ساتھ امام کے نزدیک صحیح ہیں۔ نیز یہ اشکال بھی مدفوع ہے کہ صحیح ہیں تو پھر کراہت کیوں؟ اس لیے کہ صحیح ہوجانا نفسِ صحت کا حکم ہے جبکہ کراہت امرِ آخر ہے۔ علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں:

"قلت نفس الجواز امر آخر و الجواز بلا کراھۃ امر آخر واحدھما لا یستلزم ثانیھما وھم انما یکتفون بنفس الجواز من غیر نفی الکراھۃ وھو لا یستلزم انتفاء الکراھۃ"

(آکام النفائس ص۴۸)

الغرض نماز میں تکبیر تحریمہ، اذکار وغیرہ کا عربی میں اداء کرنا امام اعظمؒ کے مذہب کے مطابق صحیح مع کراھۃ التحریم ہے نیز خطبہ بھی غیر عربی میں ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے اور یہ سب اختلاف قادر شخص کے بارے میں ہے عاجز کیلئے جواز میں اختلاف نہیں۔

یہاں آخر میں بندہ ناچیز ایک انتہائی اہم بات پر بھی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہے وہ یہ کہ خطبہ تو نماز سے خارج ہے اگر ایک عربی پر قادر شخص غیر عربی میں خطبہ دیدیتا ہے تو خطبہ درست ہوجائے گا کراہتِ تحریمی کے ساتھ اور اعادہ کی ضرورت نہیں کیونکہ خطبہ کا اعادہ نہیں ہوتا جیسا کہ تلبیہ، تسمیہ وغیرہ بھی ادا ہوجاتے ہیں۔ (صاحبین کے مذہب کے مطابق دوبارہ خطبہ دینا ہوگا لیکن وہ اعادہ نہیں استیناف ہی ہوگا)۔ نماز سے متعلق یہ بات واضح کردینا مناسب ہے کہ فقہاء نے یہ اصول تحریر فرمایا ہے:

"کل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا" (الدر المختار ۱/۴۵۷)

ہر وہ نماز جو مکروہِ تحریمی کے ساتھ ادا ہو وہ واجب الاعادۃ ہے اس میں ماہیت اور غیر ماہیتِ صلوۃ میں مکروہ تحریمی کے ارتکاب کے فرق والے قول کو اگر لے بھی لیا جائے تو بھی نماز میں غیر عربی میں تکبیر یا دعاء واذکار بہر حال ماہیتِ صلوۃ میں داخل ہیں لہٰذا نماز امام صاحبؒ کے مذہب کے مطابق واجب الاعادہ ہوگی۔ بہر حال یہ اصولی مسئلہ ہے جس میں کوئی تردد نہیں کہ کراہتِ تحریمی کے ساتھ اداء نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے لہٰذا ہر وہ نماز جس میں غیر عربی میں تکبیر یا اذکار ادا کئے گئے ہوں اس نماز کا اعادہ ضروری ہوگا۔ اور امام صاحب کے مذہب کے مطابق ان سب کا نماز میں مکروہِ تحریمی ہونا مصرح ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ یہاں مسئلہ کراہتِ تحریمی کے ارتکاب کا ہے جس سے نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے ترکِ واجب یا ترکِ سنت کا نہیں بعض حضرات نے مسئلے کا عنوان ہی ترکِ واجب اور ترکِ سنت پر رکھ لیا ہے جس سے اشتباہ پیدا ہوا ہے مثلاً یہ فرمانا کہ

"مکروہ جب مطلق بولا جائے تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ ان اذکار کو غیر عربی زبان میں اداء کرنا مکروہ تحریمی یعنی ناجائز ہوا لیکن اگر کسی شخص نے اس ناجائز کام کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ اذکار غیر عربی زبان میں ادا کرلیے تو وہ اس معنی میں شرعاً معتبر ہوں گے کہ اگر وہ ذکر فرض ہے تو فریضہ ساقط ہوجائے گا لیکن اللہ اکبر کے الفاظ چونکہ واجب ہیں اس لیے ترکِ واجب کا ارتکاب لازم آئے گا جس کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی اور اگر وہ ذکر واجب ہے مثلاً

تشہد اور قنوت ان کو غیر عربی میں اداء کرنے سے واجب ساقط ہو جائے گا اگرچہ ترکِ سنت کا گناہ ہوگا لہٰذا خطبہ جمعہ کے بارے میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ غیر عربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی یعنی ناجائز ہے لہٰذا لوگوں کو اس سے منع کیا جائے گا لیکن اگر کسی نے اس مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرلیا تو کراہت کے باوجود صحت جمعہ کی شرط پوری ہو جائے گی اور اس کے بعد اداء کیا ہوا جمعہ صحیح ہو جائے گا۔" (فقہی مقالات ۳/۱۲۶)

اس عبارت میں کراہتِ تحریمی کا اعتراف کرتے ہوئے مسئلے کا عنوان بدل دیا گیا ہے تکبیر تحریمہ فارسی میں کہنے پر ترک واجب کی بنیاد پر وجوبِ اعادہ کا حکم لگایا گیا ہے جبکہ تشہد اور قنوت غیر عربی میں پڑھنے پر ترکِ سنت کا حکم لگا دیا گیا ہے اور وجوبِ اعادہ کا حکم نہیں لگایا گیا۔ اس کے بعد خطبہ جمعہ کے مکروہ تحریمی اور ادا ہو جانے کا ذکر ہے۔

بندہ ناچیز عرض کرتا ہے خطبہ میں تو مسلم ہے کیونکہ خطبہ کا کوئی بدل نہیں اور یہ نماز نہیں لہٰذا یہ تو کراہتِ تحریمی کے ساتھ ادا ہو جائے گا جیسا کہ تلبیہ وغیرہ ادا ہو جاتی ہیں لیکن تکبیر، تشہد اور قنوت میں ترک واجب اور ترکِ سنت کا فرق تسلیم کرنے سے بندہ عاجز ہے کیونکہ مسئلہ ترک واجب یا ترک سنت کا نہیں ارتکابِ مکروہ تحریمی کا ہے جس سے بہر صورت نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے مثلاً تصویر والے کپڑے میں نماز، مدافع الاخبثین کی نماز، انسان کے چہرے کے سامنے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہیں جبکہ یہاں کوئی ترک واجب وغیرہ نہیں۔ لہٰذا بندے کے نزدیک تکبیر تحریمہ، تشہد، قنوت، قراءت یا کوئی بھی نماز کا ذکر غیر عربی میں ادا کرنے سے بتصریحِ فقہاء نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوگی اس میں ترک سنت اور ترکِ واجب کا فرق محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا جواب کا قدرے تفصیلی خلاصہ یہ ہے کہ قراءت اور شروع فی الصلوٰۃ وغیرہ میں امام صاحب اور صاحبین کا غیر عربی میں اداء کرنے سے متعلق اختلاف تھا امام صاحب صحت جبکہ صاحبین عدم صحت کے قائل تھے لیکن غیر عاجز سے متعلق یہ اختلاف فقط مسئلہ قراءت میں ختم ہو گیا کیونکہ امام نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کرلیا البتہ شروع فی الصلوٰۃ، خطبہ اور جمیع اذکارِ صلوۃ میں بدستور یہ اختلاف باقی ہے امام کے نزدیک یہ افعال صحیح مع کراہۃ التحریم ہیں اور ان میں امام کی دلیل قوی ہے اور امام کا مذہب ہی معتمد اور مختار ہے قراءت کے علاوہ امام کے رجوع کا دعویٰ یا بعض کا صاحبین کے امام کی طرف رجوع کا دعویٰ محل نظر ہے بلکہ اختلاف باقی ہے۔ نیز امام صاحبؒ کے نزدیک خطبہ تو کراہتِ تحریم کے ساتھ ادا ہو جائے گا لیکن یہ شخص گناہ گار ہوگا۔ کیونکہ یہ عربی میں خطبہ دینے پر قادر ہے البتہ نماز مطلقاً چاہے تکبیر تحریمہ غیر عربی میں کہے یا کوئی اور ذکر غیر عربی میں ادا کرے یہ نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہوگی اس میں بعض حضرات کا فرق کرنا محل نظر ہے۔ تمام تحقیق کا خلاصہ اور ماحصل یہی ہے۔

نیز آپ کا دوسرا مسئلہ نماز میں عربی میں ہی دعاؤں کے مانگنے سے متعلق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دعائیں جو قرآن وحدیث میں منقول و ماثور ہوں چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی ہوں ان کا نماز میں مانگنا درست ہے اور جن دعاؤں کا قرآن وحدیث میں ذکر نہیں اگر وہ بندوں سے مانگنا محال ہوں تو ان سے بھی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً اللهم اغفرلی (اے اللہ میری مغفرت کردے) یا اللهم ارزقنی الحج (اے اللہ مجھے حج کی توفیق عطا فرما) البتہ وہ دعائیں جن کا قرآن وحدیث میں ذکر نہیں اور وہ بندوں سے مانگی جاسکتی ہوں تو

ان سے نماز فاسد ہوجائے گی مثلاً ارزقنی التفاحۃ (مجھے سیب عطا کر) وغیرہ ایسی دعائیں جو مخلوق سے مانگنا محال نہ ہوں ان سے نماز فاسد ہوجاتی ہے کیونکہ یہ بماشبہ کلام الناس دعائیں ہیں البتہ یہ فاسد کا حکم تشہد سے قبل ہے تشہد کے بعد اگر بماشبہ کلام الناس دعائیں عربی میں مانگتا ہے تو نماز کراہتِ تحریم کے ساتھ ادا ہوجائے گی۔ الغرض قرآن وحدیث میں منقول دعائیں مانگنا مطلقاً درست ہے غیر منقول دعاؤں میں جن کا بندوں سے مانگنا محال ہو وہ درست ہیں اور جن کا مانگنا محال نہ ہو وہ قبل التشہد مفسد ہیں اور بعد التشہد مفسد تو نہیں البتہ کراہت تحریم کے ساتھ نماز ادا ہوجائے گی۔

لمافی شرح العینی علی کنز الدقائق (۳۲/۱): فلو شرع المصلی فی صلاته بالتسبيح بان قال سبحان الله عوض الله اكبر او التهليل بان قال لا اله الا الله او شرع بالفارسية بان قال خدا بزرگ بمعنى الله اكبر وكذا سائر لغات العجم مثل السريانية والعبرانية والهندية والتركية صح شروعه فى هذه الصور اما الافتتاح بالتسبيح والتهليل فهو قول ابى حنيفة ومحمد وكذلك يجوز عندهما كل ما يدل على التعظيم وقال ابو يوسف ان كان يحسن التكبير لم يجز الا الله اكبر والله الاكبر والله كبير والله الكبير ولهما قوله تعالى وذكر اسم ربه فصلى نزلت فى تكبيرة الافتتاح فقد اعتبر مطلق الذكر والمقصود التعظيم وقد حصل ولكن قيل يكره للشروع بغير لفظ التكبير لاجل الاخبار وقال السرخسى الاصح انه لا يكره واما الشروع بالفارسية او القراءة بها فهو جائز عند ابى حنيفة مطلقا وقالا لا يجوز الا عند العجز وبه قالت الثلاثة وعليه الفتوى وصح رجوع ابى حنيفة الى قولهما كما لو قرأبها اى بالفارسية حال كونه عاجزا عن العربية فانه يجوز بلا خلاف او ذبح حيوانا وسمى بها اى بالفارسية جاز ايضا بلا خلاف وكذا التلبية فى الحج والسلام۔

وفى الدرالمختار (۵۲۱/۱): ودعا بالعربية وحرم بغيرها نهر۔

وفى الشامية (۵۲۱/۱): مطلب في الدعاء بغير العربية قوله (وحرم بغيرها) أقول نقله في النهر عن الإمام القرافي المالكي معللا باحتماله على ما ينافي التعظيم،ثم رأيت العلامة اللقاني المالكي نقل في شرحه الكبير على منظومته المسماة جوهرة التوحيد كلام القرافي وقيد الأعجمية بالمجهولة المدلول أخذا من تعليله بجواز اشتمالها على ما ينافي جلال الربوبية ثم قال واحترزنا بذلك عما إذا علم مدلولها فيجوز استعماله مطلقا في الصلاة وغيرها لأن الله تعالى قال { وعلم آدم الأسماء كلها } البقرة ۳۱ { وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه } إبراهيم ۴ ا هـ لكن المنقول عندنا الكراهة فقد قال في غرر الأفكار شرح درر البحار في هذا المحل وكره الدعاء

بالعجمية لأن عمر نهى عن رطانة الأعاجم اهـ والرطانة كما في القاموس الكلام بالأعجمية ورأيت في الولوالجية في بحث التكبير بالفارسية أن التكبير عبادة لله تعالى والله تعالى لا يحب غير العربية ولهذا كان الدعاء بالعربية أقرب إلى الإجابة فلا يقع غيرها من الألسن في الرضا والمحبة لها موقع كلام العرب اهـ وظاهر التعليل أن الدعاء بغير العربية خلاف الأولى وأن الكراهة فيه تنزيهية هذا وقد تقدم أول الفصل أن الإمام رجع إلى قولهما بعدم جواز الصلاة بالقراءة بالفارسية إلا عند العجز عن العربية - وأما صحة الشروع بالفارسية وكذا جميع أذكار الصلاة فهي على الخلاف فعنده تصح الصلاة بها مطلقا خلافا لهما كما حققه الشارح هناك والظاهر أن الصحة عنده لا تنفي الكراهة وقد صرحوا بها في الشروع-

وأما بقية أذكار الصلاة فلم أر من صرح فيها بالكراهة سوى ما تقدم ولا يبعد أن يكون الدعاء بالفارسية مكروها تحريما في الصلاة وتنزيها خارجها فليتأمل وليراجع

وفي الدر المختار (١/٤٥٧) مطلب واجبات الصلاة : وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها والمختار أنه جابر للأول-

وفيه ايضاً(١/٥٢٣): (بالأدعية المذكورة في القرآن والسنة لا بما يشبه كلام الناس) اضطرب فيه كلامهم ولا سيما المصنف والمختار كما قاله الحلبي أن ما هو في القرآن أو في الحديث لا يفسد وما ليس في أحدهما إن استحال طلبه من الخلق لا يفسد وإلا يفسد لو قبل قدر التشهد وإلا تتم به ما لم يتذكر سجدة فلا تفسد بسؤال المغفرة مطلقا ولو لعمي أو لعمرو وكذا الرزق ما لم يقيده بمال ونحوه لاستعماله في العباد مجازا-

(۱۸۹) نماز میں قرآن یا کوئی لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے کمرے میں مغرب کی جانب دیوار میں ایک بڑا سا چارٹ لگا ہوا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب تفصیل سے لکھا ہوا ہے جب میں کمرے میں نماز پڑھتا ہوں تو بعض اوقات میری نظر اس پر پڑ جاتی ہے کبھی تو الفاظ بھی پڑھ لیتا ہوں تو کیا میری نماز صحیح ہو جائیگی یا دوبارہ لوٹانا لازم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کوئی شخص نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھتا ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی تھوڑا پڑھا ہو یا زیادہ لہٰذا نماز دوبارہ پڑھے گا اگر اس نے قرآن میں دیکھا اور سمجھ گیا لیکن زبان سے نہیں پڑھا تو اس کی نماز درست ہے لیکن مکروہ ہے لہٰذا اگر آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ مبارک زبان سے پڑھ لیا تو آپ کی نماز فاسد ہے دوبارہ پڑھنی ہوگی۔

لما فی الدر المختار (۶۲۳/۱): وقراء ته من مصحف ای مافیه قرآن مطلقا لانه تعلم وفی الشامیة قوله ای مافیه قرآن عممه لیشمل المحراب فانه اذا قرأ مافیه فسدت فی الصحیح (قوله مطلقا) ای قلیلا او کثیرا اماماً أو منفردا امیا لا یمکنه القراء ۃ الا منه اولا۔

وفی الفقه الاسلامی (۱۰۲۴/۲): ولا تفسد الصلوۃ بالنظر الی مکتوب وفهمه غیر انه مکروہ اما القراء ۃ من المصحف فتفسد الصلوۃ عند ابی حنیفة لان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الاوراق عمل کثیر ولانه یشبه التلقین من الآخرین۔

(۱۹۰) نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو، اور نماز کی حالت میں اس کو نیند آ جائے تو کیا اس سے نماز میں کچھ خلل پڑے گا یا نہیں؟ نیز اگر نیند کے اندر وہ ہنسنے لگ جائے تو پھر اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......قہقہہ وہ ہنسی ہے جو دوسرے کو بھی سنائی دے اس سے بیداری کی حالت میں وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ ضحک وہ ہنسی ہے جس کی آواز اپنے تک محدود رہے اس سے بیداری کی حالت میں نماز فاسد ہوتی ہے، نہ کہ وضو۔ اور تبسم وہ مسکراہٹ ہے جس میں کوئی آواز نہ ہو۔ اس سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو۔ اور نماز کی حالت میں نیند آنے سے نماز میں کچھ خلل نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ نماز ہیئت مسنونہ پر ہو، اور نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنے یعنی ضحک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو، اور سونے کی حالت میں قہقہہ لگانے سے صرف نماز فاسد ہو جاتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔

لما فی التاتارخانیه (۱۳۸/۱): وکذلک القهقهة من النائم فی الصلاۃ لاینقض الوضوء... هکذا وقع فی بعض الکتب وذکر الزندویسی فی نظمه، اذا نام فی صلوته قائماً او ساجداً ثم قهقه لا روایة

لهذا فی الاصول قال شداد بن اوس (قال ابو حنيفة تفسد صلوته ولايفسد وضوء ه وهكذا افتی الفقيه عبدالواحد۔

وفی الهندية(۱/۱۲): ومنها النوم. ينقضه النوم مضطجعاً فی الصلوة وفی غيرها بلاخلاف بين الفقهاء وكذا النوم متورّكاً بأن نام على احدوركيه هكذا فی البدائع ... ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولو فی السرج او المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقاً ان كان فی الصلوة وان كان خارجها فكذلك۔

وفی الشامية(۱/۱۴۱): قال فی شرح الوهبانية، ظاهر الرواية ان النوم فی الصلوة قائماً او قاعداً او ساجداً لا يكون حدثاً سواء غلبه النوم او تعمده، وفی جوامع الفقه انه فی الركوع والسجود لاينقض ولو تعمده ولكن تفسد صلوته۔

وفی تبيين الحقائق(۱/۵۶): ثم القهقهة ما يكون مسموعاً له ولجيرانه بدت اسنانه اولا وقد تقدم حكمها، والضحك مايكون مسموعاً له دون جيرانه وهو مبطل للصلوة دون الوضوء والتبسم مالاصوت فيه ولا تأثير له فی واحد منهما۔

(۱۹۱) عورت اگر مرد کے محاذاۃ میں کھڑی ہو اور دونوں نماز میں مشترک ہوں تو اس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں گھر میں ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا دو رکعت فرض ادا کئے تھے کہ میری بیوی نے اسی مصلّی پر میرے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی اسی دوران میری بیوی کے بڑے بھائی آ گئے جو کہ عالم ہیں انہوں نے دیکھ کر فرمایا آپ کی نماز فاسد ہوگئی ہے کیونکہ آپ نے عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی میری نماز فاسد ہوگئی ہے یا نہیں؟ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... جب کوئی عورت نماز میں مرد کے ساتھ یا آگے اس طرح کھڑی ہو جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، اور نہ دونوں میں ایک آدمی کے کھڑے ہونے کے بقدر فاصلہ ہو، اور دونوں ایک ہی نماز میں شریک ہوں، یعنی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوں، تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ یہ صورت نہیں پائی گئی لہٰذا آپ کی نماز صحیح ہے۔ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں، مگر اس طرح عورت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافی الهندية(۱/۸۹): محاذاة المرأة الرجل مفسدة لصلاته... والمسبوق بان فی حق التحريمة منفرد فيما يقضيه فلو حاذت الرجل المرأة فيما يقضيان لاتفسد صلوته۔ كذا فی التبيين۔

وفی الدر المختار مع الشامية(۱/۵۷۴): (مشتركة) فمحاذاة المصلية لمصل ليس فی صلاتها مكروهة

لا مفسد۔

وفی الشامية تحته: (قوله ليس فی صلاتها) بأن صليا منفردين أو مقتديا أحدهما بامام لم يقتدبه الآخر شرح المنية (قوله مكروهة) الظاهر انها تحريمة لانها مظنة الشهوة والكراهة على الطارئ ط، قلت: وفی معراج الدراية: وذكر شيخ الاسلام مكان الكراهة الاساءة، والكراهة أفحش اهـ۔

وفی الشامية(۵۷۳/۱): فالتفسير الصحيح للمحاذاة مافی المجتبی: المحاذاة المفسدة ان تقوم بجنب الرجل من غير حائل او قدامه۔

(۱۹۲) مرد کا عورت کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھر پر عورت مرد سے آگے نماز پڑھ رہی ہے۔یعنی مرد اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دل میں یہ خیال آ جائے کہ عورت امامت کر رہی ہے جبکہ وہ امامت نہیں کر رہی ہوتی، اس صورت میں مرد کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اصل حکم یہ ہے کہ مرد عورت سے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھے تا کہ نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ تاہم گھر وغیرہ پر محرم عورت یا بیوی آگے نماز پڑھ رہی ہے اور مرد اس کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے اس طور پر کہ نماز میں یکسوئی برقرار رہے اور کوئی خلل بھی واقع نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے اور دل میں صرف یہ خیال آنا کہ ''عورت امامت کرا رہی ہے'' نماز کیلئے مخل نہیں جبکہ حقیقت میں وہ امامت کرا بھی نہیں رہی ہے۔

لمافی صحيح البخاری(۷۴/۱): عن عائشة رضی الله عنها قالت بئسما عدلتمونا بالكلب و الحمار لقد رأيتنی ورسول الله ﷺ يصلی وانا مضطجعة بينه وبين القبلة فاذا اراد ان يسجد غمز رجلی فقبضتهما۔

وفی الشامية(۶۳۴/۱): (قوله ولو امرأة او كلبا) بيان للاطلاق، واشار به إلى الرد على الظاهرية بقولهم۔ يقطع الصلاة مرور المرأة والكلب والحمار۔

(۱۹۳) تعدادِ رکعات میں شک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنہیں نماز کے دوران اکثر شک پڑ جاتا ہے کہ دو رکعتیں پڑھیں یا تین، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......دوران نماز اگر رکعتوں کی تعداد میں اکثر شک ہوتا ہو تو تحری، غور وفکر کے ذریعے جس جانب ظن غالب ہو اس کے مطابق نماز پوری کرلیں اور اگر کسی ایک جانب ظن غالب نہ ہو تو کم رکعتوں پر بنا کریں اور ہر رکعت پر قعدہ کر کے آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی الدر المختار (۲/۹۳،۹۲): (اذاشلث) فی صلاته.........(وان کثر)شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والاا خذبالاقل) لتیقنه (وقعدفی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا لئلا یصیر تارکافرض القعود او واجبه.

وفی الشامیة تحته: ولوشلث انها الثانیة او الثالثة اتمها وقعد ثم صلی اخری وقعد ثم الرابعة وقعد وتمامه فی البحر۔

(۱۹۴) نماز میں قطرہ کا وہم اور تعداد رکعات میں شک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہوگیا ہے شادی سے پہلے میں بہت دین کا کام کرتی تھی اور بہت زیادہ عبادت کرتی تھی گھر کے تمام کام خود کرتی تھی اور جو بھی حدیث پڑھتی تھی اُس پر عمل کرتی تھی۔ پھر دوسری حدیث پڑھتی تھی۔

(۱)۔ بہر حال مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتاسکتی بس اتنا بتاسکتی ہوں کہ جتنا نماز کو اچھا اور خوبصورت بنانا چاہتی ہوں اتنی ہی نماز میں بھولتی ہوں میں اول وقت میں نماز پڑھتی تھی اللہ کی توفیق سے اور اب بھی میری یہی کوشش ہوتی ہے مگر مجھے بیماری ایسی ہے کہ پیشاب نکل جاتا ہے وہ بھی صرف قطرہ اور کبھی وہم ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ نکل گیا۔ پوری نماز میں مجھے یہی ہوتا ہے کہ نکل گیا جب دیکھتی ہوں تو بعض دفعہ تو ایک قطرہ ہوتا ہے یا نقطہ بعض دفعہ کچھ نہیں مگر نماز میں یہی خیال ہوتا ہے کہ نکل گیا نماز پڑھنے کھڑی ہوتی ہوں۔ چار رکعت کی نیت کرتی ہوں اور آرام سے صحیح صحیح پڑھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں کہ کتنی رکعت پڑھی پھر دوبارہ پڑھتی ہوں اور کہیں جاتی ہوں وضو کر کے کہ اگر اذان ہوگی تو فوراً نماز پڑھ لوں گی تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پہلے پیشاب کرلوں وضو ٹوٹ گیا نماز کو دیر ہوجاتی ہے اور جب کھڑی ہوجاؤں جلدی تو بھول جاتی ہوں کہ کیا پڑھا اور سوچتی ہوں کہ نفل پڑھوں گی قرآن پڑھوں گی بعض دفعہ تو پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ وقت نہیں رہتا اسی میں تھک جاتی ہوں جب ہاتھ روم جاتی ہوں تو اتنی دیر ہوجاتی ہے پیشاب رک رک کے آتا ہے بار بار دھوتی ہوں پہلے ہر وقت وضو رہتا تھا۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔ ہر وہ شخص جس کو قطروں کی بیماری ہو، اور اس کے پیشاب کے قطرے ہر وقت ٹپکتے رہتے ہوں اور اس کو نماز پڑھنے کے وقت کے بقدر بھی قطروں سے افاقہ نہ ہوتا ہو تو وہ شخص معذور ہے اور اگر یہ کیفیت اور حالت نہ ہو بلکہ پوری نماز بغیر قطروں کے ٹپکنے کے پڑھی جاسکتی ہو تو وہ شخص معذور شمار نہیں ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ معذور کے حکم میں نہیں ہیں اس

لئے اچھے طریقے سے وضوء کر کے نماز شروع کریں۔ دورانِ نماز قطرے گرنے کے جو خیالات آتے رہتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنی نماز پوری کرلیں لیکن اگر قطرے گرنے کا یقین ہوجائے تو پھر نماز توڑ کر وضو کر کے دوبارہ پڑھ لیں۔ بغیر یقین کے جتنے بھی وہم اور خیال قطروں کے گرنے کے آئیں تو نماز نہ توڑیں بلکہ اپنی نماز کو اسی حالت میں پوری کرلیں۔ رہا نماز میں بھول جانے کا مسئلہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب آپ نماز میں بھول جائیں تو غور وفکر کر کے جتنی رکعت پڑھنے کا ظن غالب ہوجائے اسی رکعت سے آگے پڑھ لیں مثلاً دو اور تین رکعت میں اگر ظن غالب تین رکعتوں کا ہے تو تیسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں اور اگر ظن غالب دو رکعتوں کا ہے تو دوسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں۔ اور اگر تحری کے باوجود ظن غالب کسی رکعت کا حاصل نہیں ہوتا ہو تو پھر بناء علی الاقل کریں۔ یعنی مثلاً تین اور چار میں تین رکعت پر اکتفاء کر کے مزید ایک رکعت اور ساتھ ملالیں۔ اور پھر آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی البخاری(۲۵/۱): عن عباد بن تمیم عن عمه انه شکیٰ الی رسول الله ﷺ الرجل الذی یخیل الیه انه یجد الشئ فی الصلاۃ فقال لا ینفتل اولا ینصرف حتی یسمع صوتا او یجد ریحا۔

وفی الدر المختار (۹۲،۹۳،۹۴/۲): (واذاشك) فی صلاته (من لم یکن ذلك) ای الشك (عادۃ له) وقیل من لم یشك فی صلاۃ قط بعد بلوغه وعلیه اکثر المشائخ بحر عن الخلاصة (کم صلی استأنف) بعمل مناف و بالسلام قاعدا اولی لانه المحل (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا اخذ بالاقل) لتیقنه (وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا لئلا یصیر تارکا فرض القعود او واجبه (و) اعلم انه (اذا شغله ذلك) الشك فتفکر (قدر اداء رکن ولم یشتغل حالة الشك بقرائة ولا تسبیح) ذکره فی الذخیرۃ (وجب علیه سجود السهو فی) جمیع (صور الشك) سواء عمل بالتحری اوبنی علی الاقل فتح لتاخیر الرکن لکن فی السراج انه یسجد للسهو فی اخذ الاقل مطلقا وفی غلبة الظن ان تفکر قدر رکن۔

(۱۹۵) رکوع وسجود اور سلام میں امام کی متابعت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے اٹھے گا یا امام کی اطاعت کرتے ہوئے اسکے ساتھ اٹھے گا اسی طرح رکوع اور سجدے میں تسبیحات مکمل کر کے اٹھے یا امام کے ساتھ ہی اٹھ جائے؟ نیز قعدہ اخیرہ میں مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے پہلے ہی امام نے سلام پھیر دیا تو کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں تین مسئلے ہیں (۱) پہلے مسئلہ میں مقتدی کو چاہیئے کہ قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے پھر اٹھ جائے، اگر تشہد پورا کئے بغیر اٹھ جائے تو یہ بھی جائز ہے لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق اسطرح کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (۲) (۳) دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں مقتدی کو چاہیئے کہ رکوع اور سجدے کی تسبیحات کو چھوڑ کر اسی طرح درود شریف

کو چھوڑ کر امام کی اتباع کرے کیونکہ تسبیحات اور درود شریف نماز میں پڑھنا سنت ہے جبکہ امام کی اتباع واجب ہے چنانچہ امام کی اتباع میں مقتدی کو رکوع وسجدے سے اٹھ جانا اور درود شریف چھوڑ کر امام کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیئے۔

لمافی الشامیة(۱/۴۷۰): ...فإن عارضها واجب لاینبغی أن یفوته بل یأتی به ثم یتابع، کما لو قام الإمام قبل أن یتم المقتدی التشهد فإنه یتمه ثم یقوم لان الاتیان به لایفوت المتابعة بالکلیة وانما یؤخرها، والمتابعة مع قطعه تفوته بالکلیة، فکان تأخیر أحد الواجبین مع الاتیان بهما أولی من ترك أحدهما بالکلیة بخلاف مااذاعارضهاسنةکمارفع الامام قبل تسبیح المقتدی ثلاثافالاصح انه یتابعه لان ترك السنة اولی من تاخیرالواجب...

(۱۹۶) سجدہ کی حالت میں پیر کی انگلیوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن پہلے ہماری مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص ظہر کی سنتیں ادا کر رہا تھا کہ سجدہ کی حالت میں اسکے پاؤں کی انگلیاں اٹھ گئیں، بعد نماز ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپکی نماز ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کریں یہ بات ہم نے امام صاحب سے دریافت کی تو وہ ہمیں اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، برائے مہربانی صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ کرنا سنت ہے، دونوں پاؤں زمین سے لگانا واجب ہے اور بلا عذر ایک پاؤں کا زمین سے اٹھائے رکھنا مکروہ تحریمی ہے اور دونوں میں سے ایک پاؤں کا کچھ حصہ زمین پر لگانا فرض ہے چاہے ایک انگلی ہی کیوں نہ ہو اور اگر دونوں پاؤں زمین سے اٹھائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کی مقدار اٹھائے رکھے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۴): ... أو سقوط الثوب عن عورته مع التعمد مطلقا ومع اداء رکن ان لم یتعمد علم أو یعلم ومع المکث قدره ان لم یؤد عند أبی حنیفة ومحمد رحمهما الله۔

وفی الدر المختار(۱/۶۲۶،۶۲۵): (و) یفسدها (أداء رکن) حقیقة اتفاقا (أو تمکنه) منه بسنة، وهو قدر ثلاث تسبیحات... الخ۔

وفی الشامیة(۱/۴۴۷): (قوله وقدمیه) یجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدةمنهمایکفی کما ذکره بعد۔ ح۔ وافادانه لولم یضع شیأمن القدمین لم یصح السجودوهومقتضی ماقدمناه اٰنفا۔

(۱۹۷) دوسرے شخص کا نمازی کو نماز میں یاد دلانا

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنکی عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے اور بیماری کی وجہ سے اکثر باتیں بھول جاتے ہیں، چونکہ وہ نماز کے بہت پابند ہیں اگر کوئی نماز ایسی حالت میں قضا ہوجائے تو سب پر ناراض ہوتے ہیں، چنانچہ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں رکعات کی تعداد بلکہ بعض دفعہ دو سجدوں میں بھی غلطی ہوجاتی ہے، ایسی صورت میں انکے ساتھ ایک آدمی بیٹھتا ہے جو انہیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ ابھی کھڑے ہوجائیں اور اب بیٹھ جائیں وغیرہ، کیا ایسی صورت میں انکی نماز ہوجاتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب……خارج صلوٰۃ سے کسی شخص کا نمازی کو یاد دلانے سے نماز درست نہیں ہوتی بلکہ جو شخص تعداد رکعات وغیرہ میں بھول کے عارضہ میں مبتلاء ہو اور یہ عارضہ اسے کثرت سے پیش آتا ہو تو اسکے لئے حکم یہ ہے کہ ایسا شخص نماز میں غور وفکر کرے اور جس طرف غالب گمان ہوجائے اسی رکن سے نماز پوری کرے اور اگر کسی ایک جانب غالب گمان نہ ہو رہا ہو تو بنا علی الاقل یعنی جو کم رکن ہو اس سے نماز پوری کرے مثلاً پہلی یا دوسری رکعت میں شک واقع ہوگیا تو غور وفکر کے بعد اگر غالب گمان یہ ہو کہ دوسری رکعت ہے تو اسی سے نماز جاری رکھے اور اگر غالب گمان نہ ہو تو پہلی رکعت ہی سمجھے کیونکہ یہ صورت یقینی ہے، اسیطرح سجدوں کی تعداد میں کرے اور آخر میں سجدہ سہو کرلے۔

لمافی الشامیة (۶۲۲/۱): (قوله الااذاسمعه المؤتم الخ) فی البحرعن القنية ولوسمعه المؤتم ممن ليس فی الصلاة ففتح به علی امامه يجب ان تبطل صلاة الکل لان التلقين من خارج۔

وفی الشامية ايضاً(۹۳/۲): (قوله وان کثرشکه) بان عرض له مرتين فی عمره علی ماعليه اکثرهم اوفی صلا ته علی مااختاره فخرالاسلام… (وقوله والا) ای وان لم يغلب علی ظنه شئ۔

وفيه ايضاً(صـ۹۴): (قوله سواء عمل بالتحری) ای بأن غلب علی ظنه انهاالرکعة الثانية مثلا. وقوله اوبنی علی الاقل ای بأن لم يغلب علی ظنه شئ واخذبالاقل۔

(۱۹۸) فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چار رکعت والی فرض نماز میں کوئی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد بھی سورت پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب……اگر کوئی فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد سورت ملالے تو سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔

لما فی الهندیة(۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة لایلزمه السهو وهو الاصح۔

وفی الشامیة (۱/۵۱۱): (قوله ولو زاد ولا بأس) ای لوضم إلیها سورة لابأس به لأن القراءة فی الاخریین مشروعة من غیر تقدیر۔

(۱۹۹) نمازی کا کسی دوسرے کو سبحان اللہ کہہ کر تنبیہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو۔ تو خارج عن الصلوٰۃ کو تنبیہ کرنے کیلئے ''سبحان اللہ'' کہتا ہے اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اگر فاسد ہوتی ہے تو صاحب ہدایہؒ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے: ''أو یدفع بالتسبیح لما روینا من قبل'' (الہدایہ، ۱/۹۹)

الجواب بعون الملک الوھاب......فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اگر نمازی نماز میں قرآن کی آیت یا لا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ یا الحمد للہ وغیرہ کسی کو جواب دینے کی نیت سے پڑھے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہوئے گی اور اگر کوئی نمازی مذکورہ کلمات بطور اعلام (کہ میں نماز میں ہوں) یا امام دورانِ نماز قرأت وغیرہ میں غلطی کرے اور مقتدی نے یہ کلمات پڑھے تو نماز فاسد نہ ہوگی اگرچہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز فاسد ہو جائے لیکن یہاں پر حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا ہے اور یہی مقصد صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا ہے۔

لما فی البخاری(۱/۱۶۲،۱۶۵،۳۷۰): من نابه شئ فی صلاته فلیقل سبحان الله۔

وفی الهدایة(۱/۱۳۸): (فلو اجاب فی الصلوة رجلا بلا إله الا الله فهذا کلام مفسد عند ابی حنیفة ومحمد وقال ابو یوسف لا یکون مفسدا) وهذا الخلاف فیما اذا اراد به جوابه له أنه ثناء بصیغته فلا یتغیر بعزیمته ولهما أنه اخرج الکلام مخرج الجواب وهو یحتمله فیجعل جوابا کالتشمیت والاسترجاع علی الخلاف فی الصحیح(وان اراد به اعلامه انه فی الصلوة لم تفسد بالاجماع) لقوله علیه السلام اذا نابت احدکم نائبة فی الصلوٰة فلیسبح۔

وفی الدر المختار (۱/۶۲۰،۶۲۱): (وجواب خبر) سوء (بالاسترجاع علی المذهب) لانه بقصد الجواب صار ککلام الناس (وکذا) یفسدها (کل ما قصدبه الجواب) کأن قیل أمع الله اله فقال لا اله الا الله... (أو الخطاب ك) قوله لمن اسمه یحیی أو موسی (یا یحیی خذ الکتاب بقوة) أو. وما تلك بیمینك یا موسی (مخاطبا لمن اسمه ذلك)...الخ۔

وقال فی الشامیة(۱/۶۲۱): واحترز بقصد الجواب عما لو سبح لمن استأذنه فی الدخول علی قصد اعلامه أنه فی الصلاة کما یأتی أو سبح لتنبیه إمامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما إلا أنه خارج عن

القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت أحدکم نائبة وهو فی الصلاۃ فلیسبح))

(۲۰۰) امام کے پیچھے نیت میں غلطی کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب نے ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے ظہر کی جگہ عصر کی نماز کی نیت کر لی تو کیا انکی نماز صحیح ہوگئی اگر صحیح ہوگئی تو ظہر کی ہوئی یا عصر کی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جس شخص نے امام کے پیچھے ظہر کے بجائے عصر کی نیت کی تو نہ ظہر ادا ہوگی نہ ہی عصر البتہ اگر مقتدی کے دل میں نیت ظہر پڑھنے کی تھی لیکن غلطی سے زبان سے عصر کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں ظہر ہی کی نماز ادا ہوگی۔

لما فی الهندیة(۸۶/۱): لایصح اقتداء مصلی الظهر بمصلی العصر۔

وفی الشامیة(۵۷۹/۱): (قوله وبمفترض فرضا اخر) سواء تغایر الفرضان اسما اوصفة کمصلی ظهر امس بمصلی ظهر الیوم۔

وفی الدر المختار(۴۱۵/۱): فلا عبرة للذکر باللسان إن خالف القلب لأنه کلام لا نیة

وقال ابن عابدین رحمه الله تحته: (قوله إن خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهوا أجزأه۔

(۲۰۱) عمداً واجب کو ترک کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میری والدہ گھر میں عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں کہ بھول کر پہلی رکعت میں التحیات پر بیٹھ گئیں اور التحیات پوری پڑھنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ یہ تو پہلی رکعت ہے تو فوراً کھڑی ہوگئیں اور دوسری رکعت میں التحیات پر نہیں بیٹھیں اور آخری رکعت میں التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا کیا اس طرح میری نماز ہوگئی ہے تو میں نے امی سے کہا کہ آپ کو دوسری رکعت میں بھی التحیات میں بیٹھنا چاہیے تھا تو امی کہنے لگیں وہ تو میں پہلی رکعت میں پڑھ چکی تھی اسلئے نہیں بیٹھی لیکن آخر میں سجدہ سہو تو کرلیا ہے۔ کیا میری نماز ہوگئی۔ تو میں نے امی سے کہا کہ میں اپنے مدرسے میں مفتی صاحب سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح میری والدہ کی نماز درست ہے یا دوبارہ ادا کریں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کی والدہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھ گئی تھیں، جس سے تاخیر رکن لازم آیا، اب اگر وہ دوسری رکعت کے بعد بھی بیٹھ جاتیں، اور تشہد پڑھ لیتیں، تو سہواً تاخیر رکن کی وجہ سے سجدہ سہو کر لینے سے نماز درست ہو جاتی، لیکن چونکہ انہوں نے قعدہ اولیٰ قصداً ترک کر دیا اور واجب کو قصداً ترک کرنے سے تو صرف سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں بلکہ اعادہ صلوۃ (نماز کا لوٹانا) واجب ہے، لہٰذا آپ کی والدہ پر اس نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے۔

لمافی الھندیۃ(۱/۱۲۶): وفی الولوالجیۃ: الأصل فی ھذا أن المتروك ثلاثۃ أنواع فرض وسنۃ، وواجب ... وفی الثالث ان ترك ساھیاً یجبر بسجدتی السھو وان ترك عامداً لا کذا فی التاتارخانیۃ وظاھر کلام الجم الغفیر أنہ لا یجب السجود فی العمد وانما تجب الاعادۃ جبراً لنقصانہ، کذا فی البحرالرائق۔

وفی البحر الرائق(۲/۱۶۱): وظاھر کلام الجم الغفیر أنہ لایجب السجود فی العمد وانما تجب الاعادۃ اذا ترك واجباً عمدا جبر النقصانہ. وذکر الولوالجی فی فتاواہ أن الواجب اذا ترکہ عمدا لا ینجبر بسجدتی السھو لانھا عرفتا جابرتین بالشرع والشرع ورد حالۃ السھو وجعلھا مثلاً لھذا الفائت لا فوقہ۔

وفی الشامیۃ(۲/۷۹): ولو بنی علی الفرض تطوعاً وقد سھا فی الفرض لا یسجد اھ... لان النفل صلاۃ أخری غیر الفرض ولا یمکن ان یکون سجود السھو لصلاۃ واقعاً فی صلاۃ أخری مقصودۃ وان کانت تحریمۃ الفرض باقیۃ فلذا لا یسجد، أو لانہ لما بنی النفل عمدا صار مؤخراً للسلام عن محلہ عمدا. والعمد لا یجبرہ سجود السھو بل تلزم فیہ الاعادۃ. وحیث کانت الاعادۃ واجبۃ لم یبق السجود واجبا عن سھوہ فی الفرض لانہ بالاعادۃ یأتی بماسھا فیہ، والسجود جا بر عما فات قائم مقام الاعادۃ، فاذا وجبت الاعادۃ سقط السجود۔

(۲۰۲) امام نے پانچ رکعت پڑھیں اعادہ نماز کے وقت دیگر لوگ شامل ہوگئے انکی نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مولوی صاحب نے عصر کی نماز چار رکعات کے بجائے پانچ رکعات پڑھائیں اور قعدہ اخیرہ میں نہیں بیٹھے تھے۔سلام کے بعد مقتدیوں نے یاددلایا کہ پانچ رکعتیں ہوگئیں لہٰذا مولوی صاحب نے نماز دوبارہ لوٹا دی اور دوسری جماعت کے بعد یہ اعلان کیا کہ جوحضرات پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے وہ دوبارہ نماز دھرائیں ان کی نماز نہیں ہوئی۔کیاان کا یہ اعلان کرنا درست ہے یا نہیں، اگر درست ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب امام صاحب نے پانچ رکعات نماز پڑھائی تو ان کی فرض نماز باطل ہوگئی لہٰذا جب دوبارہ نماز لوٹانے کیلئے دوبارہ جماعت کرائی گئی تو گویا وہ پہلی بار نماز پڑھ رہے تھے لہٰذا وہ لوگ جو پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے لیکن دوسری جماعت میں شریک ہوگئے ان کی نماز درست ہے۔اور امام صاحب کا اعلان کرنا غلط ہے۔

لمافی الھدایۃ(۱/[illegible]): وان سہا عن القعدہ الأخیرۃ حتیٰ قام الی الخامسۃ رجع الی القعدۃ مالم

يسجد... والغیٰ الخامسة... وان قيّد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا۔

وفي الهندية(۱/۱۰۴): ولو زاد فيها ركعةً تامةً قبل إتمام صلوته فسدت صلوته۔

(۲۰۳) سنت کے فساد پراعادہ کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اگرعشاء کی نماز میں وتر پڑھنے کے بعدمعلوم ہوکہ سنتیں پڑھتے ہوئے کوئی ایسی غلطی ہوگئی تھی جسکی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی تھی یاصرف فساد کاشک ہوتویہ سنتیں دوبارہ پڑھی جائینگی یانہیں؟اگردوبارہ پڑھی جائینگی توآیاوتربھی دوبارہ پڑھے جائینگے؟

الجواب بعون الملك الوهاب...... اگرسنتوں کے فسادکایقین ہوتوانکااعادہ ضروری ہے البتہ وتردوبارہ پڑھناضروری نہیں اگرفسادمیں صرف شک ہوپھرظنِ غالب کوترجیح دی جائیگی اگرفسادکاظنِ غالب ہوتوپھربھی صرف سنتوں کادوبارہ پڑھناضروری ہے نہ کہ وتراوراگرفسادکاظن غالب نہیں ہےتونہ سنتوں کااعادہ کرناہوگااورنہ وترکا۔

وفي الشامية(۲/۲۸): ولوصلى العشاء بلاوُضوء والوتروالسنة به يعيدالعشاء والسنة لا الوتر ---والله اعلم بالصواب۔

(۲۰۴) نماز کے فساد کااعلان امام پرلازم ہے

سوال......کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ ایک گاؤں کی مسجدمیں امام ہے امسال رمضان المبارک سے پہلے یہ مسئلہ پیش آیاکہ بندہ نے مغرب کی نمازبغیروضوکے پڑھادی۔اب مجھے کیاکرناچاہیئے؟

الجواب بعون الملك الوهاب...... امام اگرکسی خاص محلہ کاہے یامعین لوگوں کونمازپڑھاتاہےتواس پرلازم ہے کہ کسی بھی طریقہ سے مقتدیوں کواطلاع کردے کہ وہ اپنی نمازکااعادہ کرلیں،اوراگربعض مقتدی معین ہوں اوربعض غیرمعین ہوں توجن کوجانتاہے انکواطلاع کرنالازم ہوگا۔البتہ غیرمعین حضرات کواطلاع کرنالازم نہ ہوگا۔

لمافي الشامية (۱/۵۹۲): (قوله لومعينين) اى معلومين وقال:ح:وان تعين بعضهم لزمه اخباره (قوله والا) اى وان لم يكونوامعينين كلهم اوبعضهم لايلزمه۔

(۲۰۵) پہلے سے نماز میں شامل فرد کاامام کے رکوع کے بعدرکوع کرنے کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رمضان المبارک میں وترکی نمازپڑھارہاتھاتوآخری رکعت میں بجائےقنوت کے میں تکبیرکہہ کررکوع میں چلاگیامقتدیوں نےلقمہ دیامیں نےنہیں لیاچونکہ میں رکوع میں پہنچ گیاتھابعدمیں

کچھ مقتدی تو میرے ساتھ رکوع میں شامل ہو گئے اور بعض نے میرے اٹھنے کے بعد رکوع کیا، میں نے سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی اب جن حضرات نے میرے بعد رکوع کیا ہے، ان کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جن مقتدیوں نے امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا لیکن امام کے بعد کر لیا ہے، تو ان کی نماز بھی درست ہوگئی، ایسے لوگ لاحق کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۰): ''اجمعوا أنّه لو انتهى الى الامام وهو قائم فكبّر ولم يركع مع الامام حتى ركع الامام، ثم ركع أنّه يصير مدركا لتلك الركعة۔''

وفى الشامية(۱/۵۹۴): قال فى الدر المختار: (واللاحق من فاتته) الركعات (كلها أو بعضها) لكن (بعد اقتدائه بعذر كغفلة وزحمة... وكذا بلا عذر... ويبدأ بقضاء ما فاته عكس المسبوق ثم يتابع امامه إن امكنه ادراكه والا تابعه۔

وفى الشامية(ص۵۹۵/۱): وحق التعبير أن يقول: ويبدأ بقضاء ما فاته بلا قراءة عكس المسبوق ثم يتابع امامه ان ادركه ثم ما سبق به۔

وفيه ايضاً(۱/۴۷۱،۴۷۰): ''والحاصل ان متابعة الامام فى الفرائض والواجبات من غير تاخير واجبة. فان عارضها واجب لاينبغى أن يفوته بل ياتى به ثم يتابع...... نعم تكون المتابعة فرضاً، بمعنى أن يأتى بالفرض مع امامه او بعده، كمالو ركع امامه فركع معه مقارناً او معاقباً او شاركه فيه او بعد مارفع منه. فلو لم يركع اصلاً او ركع ورفع قبل ان يركع امامه ولم يعده معه او بعده بطلت صلاته۔

(۲۰٦) نماز پڑھتے ہوئے کسی کی آمد پر دروازہ کھولنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کسی کا انتظار کر رہا ہو، اور اسے نماز بھی پڑھنی ہے تو وہ نماز شروع کر دیتا ہے اب نماز کے دوران آنے والا آجاتا ہے تو پھر نمازی کو کیا کرنا چاہیئے، کیا نماز توڑ کر دروازہ کھولنا چاہیئے یا اگر وہ دروازے کے قریب ہی ہے تو وہ بغیر نیت توڑے جا کر دروازہ کھول دے اور پھر نماز پوری کرے، کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز چونکہ ایک اہم ترین عبادت ہے بندہ کو چاہیئے کہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرے اور دھیان صرف اللہ کی طرف ہو، کسی دوسری طرف دھیان نہ جائے اور کوئی منافی صلوٰۃ کام سرزد نہ ہو، لہٰذا جب کوئی شخص نماز کو شروع کرے اور کوئی نماز کے دوران آجائے تو اگر آنے والے کے بارے میں غالب گمان یا یقین ہو کہ اسے کوئی جلدی یا اشد ضرورت نہیں تو نماز مکمل کر کے ہی دروازہ وغیرہ کھولنا چاہیئے، تاہم اگر دوران نماز آنے والا بہت جلدی میں ہو، یا اسے کوئی سخت حاجت ہو تو نمازی آدمی کیلئے

دورانِ نماز دروازہ کھولنے کی صرف ان شرائط کے ساتھ گنجائش ہے کہ نمازی دروازے کے قریب ہو، اور تھوڑے سے عمل سے دروازہ کھول سکتا ہو۔ اور ایک دو قدم سے زیادہ چلنا پھرنا لازم نہ آتا ہو۔ اور قبلہ سے انحراف بھی لازم نہ آتا ہو، تب اگر ایک دو قدم چل کر دروازہ کھول دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی جب تک کہ عمل کثیر کا ارتکاب نہ کرے، (عمل کثیر یہ ہے کہ اگر نمازی کوئی عمل کرتا ہو، اور نماز سے باہر کوئی اس کو دیکھ لے تو وہ یہ یقین کرے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا)۔

لما فی مشكوة المصابيح (۱/۹۲): وعن عائشة رضی الله عنها قالت كان رسول الله ﷺ يصلی تطوعاً والباب مغلق عليه فجئت فاستفتحت فمشى ففتح لی ثم رجع الى مصلاه وذكرت ان الباب كان فی القبلة۔ (رواه احمد وابو داؤد والترمذی وروى النسائی نحوه)

و فی الشامية (۱/٦۲۸): هذا وذكر فی الحلية ايضاً فی فصل المكروهات أن الذی تقتضيه القواعد المذهبية المستندة الى الادلة الشرعية ووقع به التصريح فی بعض الصور الجزئية ان المشی لا يخلوا ما ان يكون بلا عذر او بعذر فالاول ان كان كثيراً متوالياً تفسد وان لم يستدبر القبلة وان كان كثيراً غير متوال بل تفرق فی ركعات او كان قليلاً فان استدبرها فسدت صلاته للمنافی بلا ضرورة والا فلا وكره لما عرف ان من افسد كثيره كره قليله بلا ضرورة وان كان بعذر فان كان للطهارة عند سبق الحدث او فی صلاة الخوف لم يفسدها ولم يكره قل او كثر استدبر اولا وان كان لغير ماذكر فان استدبر معه فسدت قل اوكثر وان لم يستدبر فان قل لم يفسد ولم يكره وان كان كثيرا متلاحقاً افسد واما غير المتلاحق ففی كونه مفسداً او مكروها خلاف وتأمل اه ملخصاً۔ وقال فی هذا الباب والذی يظهر ان الكثير الغير المتلاحق غير مفسد ولا مكروه اذا كان لعذر مطلقاً اه

(۲۰۷) ایک نیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نیت کے ساتھ گیارہ رکعات نماز بھی پڑھی ہیں، یہ کب اور کس سلسلے میں ہوا، کیا یہ صرف حضور ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا یا امت کیلئے بھی حسب ضرورت ایسا کرنا ممکن ہے؟ زیادہ سے زیادہ ایک نیت کے ساتھ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟ نفل یا سنت؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی نیت سے گیارہ رکعات پڑھی ہیں اس کی صراحت تو ہم کو نہیں ملی البتہ بعض احادیث میں یہ آیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رات کو گیارہ رکعات پڑھی ہیں، لیکن اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ایک نیت سے پڑھیں اور اس میں بھی فقہاء حضرات یہ فرماتے ہیں کہ دو دو رکعت ایک نیت سے پڑھی ہیں اور آخر

میں تین رکعت وتر ایک نیت سے پڑھی ہیں۔ لہٰذا گیارہ رکعات نماز ایک نیت سے پڑھنا کہیں صراحتاً ثابت نہیں ہے لہٰذا ایک نیت سے گیارہ رکعات نہیں پڑھنی چاہئیں اور دن میں ایک نیت سے چار رکعات نفل ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے اور رات میں زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات نفل ایک نیت سے ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے۔ البتہ افضل دونوں میں یہ ہے کہ چار رکعات نفل ایک نیت سے ادا کرے۔

لما فی اعلاء السنن(۷/۶۰): والاصل فی ذالك ان النوافل شرعت تبعا للفرائض والتبع لا يخالف الاصل فلوزيد على الاربع فى النهار لخالفت الفرائض وهذا هو القياس فى الليل الا ان الزيادة على الاربع الى الثمان او الى الست عرفناه بالنص وهو ماروى عن النبى عليه الصلوة والسلام انه كان يصلى بالليل خمس ركعات، سبع ركعات تسع ركعات، احدى عشرة ركعة ثلاث عشرة ركعة والثلاث من كل واحد من هذه الاعداد الوتر (والظاهر لفظ الحديث وان كان يشعر بوصل الوتر بالتطوع وانه صلاهما جميعاً بتسليمة واحدة ولكن حديث عائشة رضى الله عنها عن احمد وابي داؤد (كان عليه الصلوة والسلام يوتر باربع وثلاث وست وثلاث، وثمان وثلاث وعشرة وثلاث'' صريح فى انه كان يفصل ثلاث الوتر عن التطوع وقد مرانه حسن الاسناد وركعتان من ثلاثة عشر سنة الفجر...الخ۔

وفى الهندية (۱/۱۱۳): وكره الزيادة على أربع فى نوافل النهار وعلى ثمان ليلاً بتسليمة واحدة والافضل فيهما رباع لانه ادوم تحريمة فيكون اكثر مشقة وازيد فضيلة ولهذا لونذر ان يصلى اربعاً بتسليمة لايخرج عنه بتسليمتين وعلى القلب يخرج كذا فى التبيين۔

(۲۰۸) پیشاب کی تھیلی جسم پر بندھے ہونے کی حالت میں مریض کا نماز پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے مثانہ کا آپریشن ہوا ہے اور پیشاب کیلئے ایک نلکی لگی ہوئی ہے۔ جس کے ذریعے سے پیشاب جا کر ایک تھیلی میں جمع ہوجاتا ہے اور وہ تھیلی جسم کے کسی حصے کے ساتھ باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ زید نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ بمع اس تھیلی کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں کیونکہ تھیلی کو نکالنا ممکن نہیں، اگر پڑھ سکتا ہے تو تھیلی کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب تھیلی کو جسم سے ہٹانا ممکن نہیں اور حرج لازم آتا ہے تو اسی لگی ہوئی تھیلی کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز سے پہلے اس کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے کیونکہ عذر کی وجہ سے نجاست کو معاف قرار دیا گیا ہے اور عذر میں نجاست کو جس قدر کم کرنا ممکن ہو تو وہ ضروری ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۳۰۷): وكذا مريض لايبسط ثوبا الا تنجس فوراً له تركه۔

وفی الدر المختار (۱/۳۰۷): يجب ردّ عذره أو تقليله بقدر قدرته۔

(۲۰۹) گندگی اور نجاست کا جیب میں موجود ہونا اور اسی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کچھ عرصہ پہلے بیمار ہوگیا ڈاکٹر نے کہا کہ کل صبح جب نیند سے بیدار ہو تو اس وقت پیشاب ایک بوتل میں لے آنا تاکہ ٹیسٹ کرکے بیماری کا پتہ چلایا جاسکے صبح میں نے شیشی میں پیشاب کرکے بند کردیا اور پھر جیب میں ڈال کر ہسپتال آیا لیکن کافی دیر ہوگئی اتنے میں ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نے نمازِ ظہر پڑھ لی اور پیشاب والی شیشی میری جیب میں تھی کیا میری نماز صحیح ہوگئی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کسی نجاست اور گندگی کا اپنی جگہ اور محل میں موجود ہونے سے اُس کو اپنے محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار نہیں کیا جاتا ہے، جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں انڈا ہو، جس کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا ہو، اُس کی موجودگی میں نماز درست ہوجاتی ہے، اگر وہ نجاست اپنے غیر محل اور غیر جگہ میں ہو تو اس نجاست کو اپنے غیر محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں شیشی ہو، اور اُس میں خون یا شراب وغیرہ ہو تو اُس شیشی کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اس نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا۔ مذکورہ مسئلہ میں جیب میں پیشاب والی شیشی کی موجودگی میں نماز ادا نہیں ہوئی، لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری ہے۔

لمافی التاتارخانية (۱/۲۰۴): وهذه المسائل يبتنى على اصل ان الحيوانات التى لا تعيش الا فى الماء... فالماء معدن هذه الحيوانات ومكانها والشئ فى معدنه ومكانه لا يعطى له حكم النجاسة. الاترى ان الرجل اذا صلى وفى كمه بيضة حال محها دماً فصلاته جائزة. ولو صلى وفى كمه قارورة بول لايجوز۔

وفى الهندية (۱/٦۲): إذا صلى وفى كمه بيضة مذرة قد حال محها دماً جازت صلاته وكذا البيضة التى فيها فرخ ميت كذا فى فتاوىٰ قاضيخان۔ رجل صلى وفى كمه قارورة فيها بول لا تجوز الصلوة سواء كانت ممتلئة اولم تكن. لان هذا ليس فى مظانه ومعدنه بخلاف البيضة المذرة لانه فى معدنه ومظانه وعليه الفتوىٰ۔

وفى الشامية(۱/۴۰۳): ونجاسة باطنه فى معدنها فلا يظهر حكمها كنجاسة باطن المصلى. كما لو صلى حاملا بيضة مذرة صار محها دما جاز. لأنه فى معدنه، والشى مادام فى معدنه لايعطى له حكم النجاسة. بخلاف مالو حمل قارورة مضمومة فيها بول فلا تجوز صلاته لانه فى غير معدنه كمافى

البحر عن المحيط۔

(۲۱۰) امام کے بھول جانے پر لقمہ دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے ایک مسجد میں نماز پڑھی اور نماز میں امام صاحب قراءت میں بھول گئے اب نہ وہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی رکوع کرتے تھے تو میں نے لقمہ دیا پھر امام صاحب نماز مکمل کرنے کے بعد مجھ پر غصہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ تم اپنی نماز کا اعادہ کرو تمہاری نماز فاسد ہوگئی ہے۔قریب میں ایک اور صاحب بھی کھڑے تھے جو بظاہر عالم لگتے تھے انہوں نے کہا کہ نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن امام صاحب ماننے کو تیار نہیں۔اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ امام صاحب کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟ کیا میرے لئے نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے یا نماز ادا ہوگئی نیز نماز میں امام کو لقمہ دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جب امام نماز پڑھاتے ہوئے قراءت میں بھول جائے اور مقتدی لقمہ دے تو مقتدی کے لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا مقتدی سے یہ کہنا کہ وہ نماز کا اعادہ کرے درست نہیں، بلکہ دونوں کی نماز ادا ہوگئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ مقتدیوں کو چاہیئے کہ وہ بلاضرورت امام کو لقمہ نہ دیں۔ہاں اگر نماز کے فساد کا اندیشہ ہو یا امام دوران قراءت بالکل رک جائے اور رکوع میں بھی نہ جاتا ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں تو لقمہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔اور امام صاحب کو بھی چاہیئے کہ وہ مقتدیوں کو لقمہ دینے کا موقع نہ دیں، دوران نماز ان سورتوں کی قراءت کریں جو اچھی طرح یاد ہوں اور اگر امام قراءت میں بھول جائے اور اتنی مقدار قراءت کرلی ہے کہ جس سے نماز ادا ہوجائے تو رکوع کرلینا چاہیئے۔

لمافی الهداية (۹۶،۹۷/۱): وإن فتح على امامه لم يكن كلاما استحسانا لانه مضطر الى اصلاح صلاته فكان هذا من اعمال صلاته معنى وينوى الفتح على امامه دون القراءة هو الصحيح لانه مرخص فيه وقراء ته ممنوع عنها۔

وفى الهندية (۹۹/۱): وأما اذ اقرأ أو تحول ففتح عليه تفسد صلاة الفاتح والصحيح انها لا تفسد صلاة الفاتح بكل حال ولا صلاة الامام لو أخذ منه على الصحيح، هكذا فى الكافى۔

وفى الدر المختار مع رد المحتار(۶۲۲/۱):(بخلاف فتحه على امامه) فانه لا يفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بكل حال۔

قال الشامى رحمه الله: (قوله مطلقا) فسره بما بعده (قوله بكل حال)اى سواء قرأ الامام قدر ما تجوز به الصلاة أم لا انتقل الى آية اخرى ام لا تكرر الفتح ام لا هو الاصح۔

(۲۱۱) مقتدی اگر نماز میں اللہ اکبر کہہ دے تو اس کی نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مسجد میں عصر کی نماز پڑھی امام صاحب قعدہ اولی میں بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو گئے تو پیچھے سے ایک شخص نے آواز دی ''اللہ اکبر'' بعد میں جب امام نے سلام پھیرا تو کہا کہ جس شخص نے آواز دی تھی وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ یہ کہاں تک درست ہے تفصیل سے جواب مطلوب ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر امام سے نماز میں سہو ہو جائے مثلاً چار رکعت یا تین رکعت والی نماز میں امام قعدہ اولی میں بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہو جائے اور مقتدی پیچھے سے اصلاح نماز کیلئے تسبیح پڑھتا ہے تو اس صورت میں مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی بالکل یہی صورت آپ کے اس مسئلہ میں ہے کہ امام صاحب قعدہ کئے بغیر تیسری رکعت میں کھڑے ہو گئے مقتدی نے پیچھے سے اللہ اکبر کہا تو اس سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی، لہٰذا دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ مقتدی کیلئے بہتر یہ تھا کہ ''اللہ اکبر'' کے بجائے ''سبحان اللہ'' کہتا۔

لمافی البخاری(۱/۹۴): فقال رسول اللہ ﷺ مالی رأیتکم اکثر تم التصفیق من نابه شئ فی صلوته فلیسبح فانه اذا سبح التفت الیه وانما التصفیق للنساء۔

وفی الهندیة (۱/۹۹) : ولو عرض للامام شئ فسبح الماموم لاباس به لان القصد به اصلاح الصلوة ولا یسبح للامام اذا قام الی الأخریین لانه لا یجوز له الرجوع اذا کان الی القیام اقرب فلم یکن التسبیح مفیداً۔

وفی الشامیة(۱/۶۲۱): لو سبح لمن استاذنه فی الدخول علی قصد اعلامه انه فی الصلوة کما یأتی او سبح لتنبیه امامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما الا انه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت احدکم نائبة وهو فی الصلوة فلیسبح۔

(۲۱۲) پہلے بائیں طرف سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا اب میں بہت پریشان ہوں کہ میری وہ نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سلام پھیرنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف سلام پھیرا جائے پھر بائیں طرف اور اگر کسی نے بھول کر پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا۔ پھر دائیں طرف تو اسے دوبارہ بائیں طرف سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں تاہم قصداً ایسا کرنا اور اس کی عادت بنالینا خلاف سنت ہے۔

لما فی الهنديه(۱/۷۷): ولوسلم اولا عن يساره فانه يسلم عن يمينه مالم يتكلم ولا يعيد السلام عن يساره۔

وفی الدرالمختار (۱/ ۵۲۴): ثم يسلم عن يمينه ويساره حتى يرى بياض خده، ولوعكس سلم عن يمينه فقط۔

وفی الشامية تحته: (قوله ولوعكس) بأن سلم عن يساره أولا عامدا أوناسيا بحر(قوله فقط) اى فلايعيد التسليم عن يساره۔

(۲۱۳) امام کے سلام سے پہلے سلام پھیرنے والے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ اگر امام کے سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے مقتدی نے سلام کے الفاظ پورے کرلیے تو اس کی جماعت سے نماز ادا نہ ہوگی گویا اس نے اکیلے نماز پڑھی ہے اور عمرو کہتا ہے کہ اگر مقتدی نے امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلئے تو اس کی نماز فاسد ہے دوبارہ نماز پڑھے گا۔ مولوی صاحب ان دونوں مسئلوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب.....مقتدی اگر امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' سے قبل اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلے تو بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ مقتدی کی اقتداء امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' تک کہنے پر پوری ہوتی ہے البتہ اس صورت میں اس کی نماز جماعت سے ہی ادا ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ دونوں قول زید وعمرو کے کہ اس کی نماز اکیلے ادا ہوگی یا فاسد ہوجائے گی درست نہیں ہیں۔

لمافی الدر المختار (۱/۵۲۵): ولو أتمه قبل امامه فتكلم جاز وكره۔ وفی الشامية (تحت قوله ولوأتمه الخ) أى لو أتم المؤتم التشهد، بأن أسرع فيه وفرغ منه قبل إتمام امامه فأتى بما يخرجه من الصلاة كسلام أو كلام أو قيام جاز: أى صحت صلاته لحصوله بعد تمام الأركان، لأن الإمام وإن لم يكن أتم التشهد لكنه قعد قدره، لأن المفروض من القعدة قدر أسرع ما يكون من قراءة التشهد وقد حصل، وانما كره للمؤتم ذالك لتركه متابعة الإمام بلاعذر۔

وفی الدر المختار (۱/۴۶۸): وتنقضى قدوة بالأول قبل عليكم على المشهور عندنا۔ وفی الشامية (قوله وتنقضى قدوة بالأول) أى بالسلام الأول۔ قال فی التجنيس: الإمام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدیٰ به قبل أن يقول عليكم لا يصير داخلاً فی صلاته. لأن هذا سلام، ألا ترى أنه لو أراد أن يسلم على احد فی صلاته ساهياً فقال السلام ثم علم فسكت

تفسد صلاته۔

(۲۱۴) مکہ مکرمہ میں زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب میں عمرہ کے لیے گیا تھا وہاں کوئی ایسا وقت نہیں جاتا تھا کہ نماز نہ پڑھتے ہوئے دیکھا گیا جیسے ہمارے یہاں زوال کا وقت ہے لیکن وہاں پر ان کے کسی بھی نماز کے نقشے میں زوال کا وقت نہیں ہے۔اب ہم وہاں پر زوال کا وقت کس طرح معلوم کریں یا وہاں پر زوال کا وقت نہیں ہوتا۔

الجواب بعون الملک الوھاب......سورج جب بالکل آسمان کے بیچ میں آجائے تو اس وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ زوال ہوجائے اور یہ حکم احناف کے نزدیک عام ہے تمام نمازوں کیلئے اور تمام مقامات کیلئے لیکن دیگر ائمہ کرام اس حکم سے چند نمازوں کا استثناء کرتے ہیں مثلاً فرض نمازوں کی قضاء کرنا، طواف کی دو رکعت پڑھنا اور نذر کی نماز وغیرہ اور اسی طرح شوافع مکہ مکرمہ کی تخصیص بھی کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہہ میں نوافل بھی پڑھنا جائز ہے اس لیے لوگ وہاں اس وقت میں بھی نماز پڑھتے ہیں البتہ ہمارے نزدیک مکہ مکرمہ میں بھی اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس کے تعین کا طریقہ یہ ہے کہ وقتِ زوال طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کے کل وقت کا نصف ہے اس سے پانچ منٹ پہلے اور پانچ منٹ بعد تک نماز نہ پڑھے تاکہ مکروہ وقت نکل جائے۔

لمافی جامع للترمذی(۱/۲۰۰): عن عقبة بن عامر الجهنی رضی اللہ عنہ قال ثلث ساعات كان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ينهانا أن نصلى فيهن أو نقبر فيهن موتاناحين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل وحين تضيف للغروب حتى تغرب۔

وفی عمدة القاری(۵/۷۷،۷۸): احتج به ابو حنيفة على انه يكره أن يتنفل بعد صلاة الفجر حتى تطلع الشمس وبعد صلاة العصر حتى تغرب الشمس... وزعم ابن العربي أن الصلاة فی هذين الوقتين تؤدى فيهما فريضة دون النافلة عند مالك وعند الشافعی تؤدى فيهما الفريضة والنافلة التی لها سبب ومذهب آخر لا يصلى فيهما بحال لا فريضة ولانافلة ومذهب آخر تجوز بمكة دون غيرها وزعم الشافعی فی كتاب اختلاف الحديث و ذكر الصلاة التی لها سبب وعددها ثم قال وهذه الصلاة واشباهها تصلى فی هذه الأوقات بالدلالة عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم حيث قال من نسى صلاة فليصلها اذا ذكرها وصلى ركعتين كان يصلّيهما بعد الظهر شغل عنهما بعد العصر وأمرأن لايمنع أحد طاف بالبيت أى ساعة شاء والاستثناء الوارد فی حديث عقبة الابمكة وله فی الجمعة حديث أبي سعيد انه صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن الصلاة فی نصف النهار الا يوم الجمعة... الخ۔

وفی الشامية (۱/۳۵۹): (ووقت الظهر من زواله أى ميل ذكاء عن كبد السماء) اى وسطها بحسب

مايظهر لنا۔

وفی الشامية (۳۷۲/۱): وقد قال أصحابنا: ان الصلاة فی هذه الاوقات ممنوع منها بمكة وغيرها اهـ ورأيت فی البدائع ايضاً مانصه: ما ورد من النهی إلا بمكة شاذ لا يقبل فی معارضة المشهور، وكذا رواية استثناء يوم الجمعة غريب فلا يجوز تخصيص المشهور به اهـ۔

(۲۱۵) دوسورتوں کے درمیان سورت چھوڑنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ خامسہ میں پڑھتا ہوں ہمارے اساتذہ نے مسئلہ بیان کیا جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو اس کے بعد ایک سورت چھوڑ کر دوسری سورت شروع نہ کرے یعنی درمیان میں ایک سورت کا فرق نہ کرے۔ یہ مسئلہ میرے ذہن پر نہیں لگتا کہ پڑھنا تو قرآن ہی ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے معاذ اللہ جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو پھر دوسری سورت چھوڑ کر تیسری پڑھتا ہے قرآن ہی تو پڑھتا ہے کوئی ناجائز کام تو نہیں کرتا پھر منع کیوں؟ پھر بڑی اور چھوٹی سورتوں میں کوئی فرق ہے مثلاً بقرہ پڑھ کر سورۂ نساء پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر فرق ہے تو کتنی آیت والی سورت پڑھ سکتا ہے کتنی والی نہیں پڑھ سکتا۔ میں اس مسئلہ کے بارے میں کافی پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر ضرور ایسا حل عنایت فرمائیں کہ میرے تردد کو دفع کردے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً کراہت نہیں ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے پڑھے اور درمیان میں کوئی سورت نہ چھوڑے۔

لمافی المحيط البرهانی (۴۷/۲): وأما فی ركعتين فإن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة هل يكره؟ اختلف المشائخ فيه قال بعضهم يكره وقال بعضهم ان كانت السورة طويلة لا يكره وقال بعضهم لايكره أصلاً۔

وفی مراقی الفلاح (ص۲۸۷): (و) يكره (فصله بسورة بين سورتين قرأهما فی ركعتين) لمافيه من شبهة التفضيل والهجر وقال بعضهم لا يكره إذا كانت السورة طويلة كما لوكان بينهما سورتان قصيرتان۔

وفی الهندية (۷۸/۱): وأما فی ركعتين إن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة قال بعضهم يكره وقال بعضهم إن كانت السورة طويلة لا يكره هكذا فی المحيط كما اذا كان بينهما سورتان قصيرتان كذا فی الخلاصة، وقال بعضهم لايكره أصلاً۔

وفی الشامية (۵۴۶/۱): (قوله ويكره الفصل بسورة قصيرة) أما بسورة طويلة بحيث يلزم منه إطالة

الركعة الثانية إطالة كثيرة فلايكره شرح المنية كما اذا كانت سورتان قصيرتان وهذا لو في ركعتين أما في ركعة فيكره الجمع بين سورتين بينهما سور أو سورة فتح۔

(۲۱۶) دورانِ نماز انگڑائی یا جمائی لینے سے نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام یا مقتدی نماز میں انگڑائی اور جمائی کثرت کے ساتھ لیں تو اِن کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں نماز میں انگڑائی اور جمائی لینا ویسے بھی مکروہ ہے اس لئے اس کو حتی الامکان دفع کیا جائے اور اگراتنی زیادہ ہوجائے کہ عمل کثیر بن جائے تو اس وقت نماز فاسد ہوجائے گی۔

لمافي خلاصة الفتاوى(۱/۵۷): وقوله اذا تثاوب احدكم في الصلاة فليغط فاه دليل على انه لا يباح في غير تلك الحالة وهذا اذاكان بحال لايمكنه الامتناع عن التثاوب اما اذا امكنه ان ياخذ شفتيه باسنانه فلم يفعل وغطى فاه بيده او بثوبه يكره۔

وفي الهندية(۱/۱۰۷):ويكره التلثم وهو تغطية الانف والفم في الصلاة والتثاوب فان غلبه فليكظم ما استطاع فان غلبه وضع يده او كمه على فيه۔

وفي الهندية(۱/۱۰۲): انه لو نظر اليه ناظر من بعيد ان كان لا يشك انه في غير الصلاة فهو كثير مفسد وان شك فليس بمفسد وهذا هو الاصح هكذا في التبيين وهو احسن كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة۔

(۲۱۷) پینٹ شرٹ میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے لوگ جدت کی طرف مائل ہیں حتیٰ کہ لباس میں بھی جدت ہے شہروں میں لوگ پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھتے ہیں تو کیا پینٹ شرٹ پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......پینٹ اگر چست ہونے کی بنا پر مخفی اعضاء کو ظاہر کرتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اگر چست اور باریک نہ ہو، اور پائنچے ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں، تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے مگر ایک مسلمان کو صلحاء کا لباس ہی اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ وہی سنت ہے۔

لمافي الدر المختار(۱/۴۱۰،۴۰۹):(والشرط سترها عن غيره) ولو حكماً كمكان مظلم (لا) سترها

(عن نفسه) به یفتی فلو راٰها من زیقه لم تفسدو.ان کره (وعادم ساتر) لایصف ماتحته ولا یضرالتصاقه وتشکله... (ص۴۱۱) (یصلی قاعداً)۔

وفی الشامیة تحته : (قوله ولا یضرالتصاقه) ای بالالیة مثلا وقوله وتشکله من عطف المسبب علی السبب وعبارة الشرح المنیة أما لو کان غلیظاً لایری منه لون البشرة إلا أنه التصق بالعضو وتشکل بشکله فصار شکل العضو مرئیاً فینبغی أن لا یمنع جواز الصلوٰة لحصول الستر۔ اھ۔

(۲۱۸) دورانِ نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا کیسا ہے اور نماز کے علاوہ عام حالت میں نیچے رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ آیا شلوار کو اوپر سے اور پینٹ کو نیچے سے فولڈ کرنے سے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ اور پینٹ کو باہر کی طرف فولڈ کریں یا اندر کی طرف؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

الجواب بعون الملک الوھاب......مردوں کیلئے شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا جائز نہیں۔ خواہ نماز کی حالت ہو یا نماز کے علاوہ۔ احادیث میں شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنے والوں سے متعلق بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ لہٰذا مردوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رکھیں خواہ اوپر سے فولڈ کریں یا نیچے سے، باہر کی طرف کریں یا اندر کی طرف دونوں طرح درست ہے یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کیلئے ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۸۶۱/۲): عن ابی هریرة (رضی الله عنه) عن النبی ﷺ قال ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار۔

وفی تکملة فتح الملهم(۱۲۳/۴): والحاصل عند هذا العبد الضعیف عفا الله عنه ۔ ان العلة الاصلیة من وراء تحریم الاسبال هی الخیلاء کما صرح به رسول الله ﷺ فی حدیث الباب ولکن تحقق الخیلاء أمر مخفی ربما لا یطلع علیه من ابتلی به فأقیم سببه مقام العلة وهو الاسبال الی ان قال۔ کلما تحقق الاسبال تحت الکعبین جاء المنع الافی غیر حالة الاختیار فان انتفاء الخیلاء فی ذلک متیقن۔

(۲۱۹) محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام محراب کے اندر کھڑا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟۔

(۲)۔نماز کتنے سال میں فرض ہوتی ہے اس میں مرد وعورت کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۳) میں ۱۱/سال کی عمر سے نماز پڑھ رہا ہوں کیا میرے اوپر قضائے عمری ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اصل حکم یہ ہے کہ دورانِ امامت امام ایسی جگہ کھڑا ہو کہ صف کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔ اور اکثر محراب مسجدوں کے درمیان ہی میں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور محراب مسجد ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔ امام کو عام حالات میں محراب سے باہر ہی کھڑے ہو کر نماز پڑھانی چاہیے اور اگر ضرورت ہو جیسے جمعہ کے دن میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو محراب کے اندر بھی امام کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا خلاف اولیٰ ہے، بہر صورت ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔

۲)۔مرد اور عورت جب پندرہ سال کے ہو جائیں اگر چہ ان میں بلوغت کی علامات (مثلاً مرد میں احتلام کا ہو جانا، عورت کو حاملہ کر دینا، اور بیداری کی حالت میں انزال ہو جانا اور لڑکی میں حیض کا آنا، احتلام کا ہو جانا، حاملہ ہو جانا) نہ پائیں جائیں تو پندرہ سال کی عمر میں ان پر نماز فرض ہو جاتی ہے اور اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے یا لڑکی میں مذکورہ علامات ظاہر ہو گئیں تو جس وقت بلوغت کی علامت ظاہر ہو نگی اس وقت سے ان پر نماز فرض ہو جائے گی۔

۳)۔نماز کے فرض ہونے کیلئے بلوغت شرط ہے اور لڑکے کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر ۱۲ سال ہے اور زیادہ سے زیادہ عمر ۱۵ سال ہے۔ اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے میں بلوغت کی علامات ظاہر ہو جائیں تو اسی وقت سے نماز فرض ہو جاتی ہے لہٰذا اگر بالغ ہونے کے بعد آپ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی تو آپ پر قضاء عمری نہیں ہے۔

لما فی الهندية(۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده فی الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا فی التبيين، واذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلا بأس بان يقوم فی الطاق كذا فی فتاوی البرهانية۔

وفی الشامية(۱/۶۴۷): وحكى الحلوانی عن ابی الليث: لايكره وقيام الامام فی الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم...

وفی الدر المختار(۶/۱۵۴،۱۵۳): (بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شئ(فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا

وفی الشامية تحته: (قوله به يفتى) هذا عندهما وهو رواية عن الإمام وبه قالت الأئمة الثلاثة۔ (وأدنى مدته له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنين) هو المختار كما فی أحكام الصغار۔

(۲۲۰) آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس حالت میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں بھی کیا نماز میں کراہت آئے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ لیکن اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں نماز میں کراہت نہیں آئے گی۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ آستینوں کو کلائیوں سے بھی اوپر نہ چڑھائے۔

لما فی الدر المختار (۱/۶۴۰): (و) کره (كفه) أى رفعه ولو لتراب كمشمر كم أوذيل۔

وفى الشامية تحته: (قوله كمشمر كم أوذيل) أى كما لو دخل فى الصلوة وهو مشمر كمه أوذيله واشار بذالك الى ان الكراهة لاتختص بالكف وهو فى الصلوة كما افاده فى شرح المنية لكن قال فى القنية۔ واختلف فيمن صلى و قد شمر كميه لعمل كان يعمله قبل الصلوة او هيئته ذالك ومثله مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراك الركعة مع الامام: واذا دخل فى الصلوة كذالك وقلنا بالكراهة فهل الأفضل ارخاء كميه فيها بعمل قليل اوتركهما؟ لم اره والاظهر الاول بدليل قوله الاتى ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل تامل هذا وقيد الكراهة فى الخلاصة و المنية بان يكون رافعا كميه الى المرفقين وظاهره انه لايكره الى مادونهما قال فى البحر والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل ونحوه فى الحلية وكذا قال فى شرح المنية الكبير ان التقييد بالمرفقين اتفاقى۔ قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلوة ثم شرع فيها كذالك امالو شمر وهو فيها تفسد لانه عمل كثير۔

(۲۲۱) نماز میں کہنیوں کو کھلا رکھنے اور مچھروں کی وجہ سے ٹخنے ڈھانپنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دورانِ نماز کہنیوں کو کھلا رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مچھروں سے بچاؤ کے لئے اپنے ٹخنوں کو ڈھانپے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح نماز کیلئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس حد تک؟ مدلل طور پر جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب..... نماز کے دوران کہنیوں کا ڈھانپنا سنت ہے اوران کو کھلا رکھنا مکروہ ہے۔ مردوں کیلئے ٹخنوں سے

نیچے اپنی شلوار وغیرہ کا کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں کیونکہ احادیث میں اس کے بارے میں بہت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ البتہ مچھروں سے بچنے کیلئے جرابوں وغیرہ کا استعمال کریں۔

نماز کے درست ہونے کیلئے کپڑوں کا مکمل پاک ہونا ضروری ہے البتہ اگر کسی شخص نے نماز پڑھی اور اس کے کپڑوں میں نجاست غلیظہ (مثلاً پیشاب، منی، پاخانہ، شراب، خون وغیرہ) لگی ہوئی تھی اب اس نجاست کو دیکھا جائے گا کہ کونسی نجاست ہے اگر ذو جرم (یعنی جسم والی) جیسے پاخانہ وغیرہ نجاست لگی ہوئی ہے اور مبتلی بہ کا گمان یہ ہے کہ اس کا وزن ایک درہم کے وزن کے برابر یا اس سے کم ہوگا جو گراموں کے اعتبار سے تقریباً 4.374 گرام بنتا ہے تو نماز ہوگئی ہے اور اگر وزن درھم سے زائد ہے تو نماز درست نہیں ہے۔

اور اگر کپڑے پر لگی ہوئی نجاستِ غلیظہ ذو جرم (جسم والی) نہیں ہے بلکہ مائع نجاست ہے جیسے پیشاب وغیرہ تو اس میں مساحتِ درھم کا اعتبار ہوگا لہٰذا اگر اس نجاست کی مقدار مساحتِ درھم (جو تقریباً ہتھیلی کے بقدر ہوتا ہے) کے برابر یا کم ہے تو نماز ہوگئی ہے اور اگر زیادہ ہے تو نماز درست نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر (یعنی نجاست کے معاملہ میں) درھم سے درھم کبیر مراد ہے جو ۲۰ قیراط کے برابر ہوتا ہے اور یہ عام درھم شرعی سے ۶ قیراط بڑا ہوتا ہے یعنی درھم شرعی ۱۴ قیراط کے برابر ہوتا ہے۔

اور اگر کپڑے پر لگی ہوئی نجاست، خفیفہ ہے (مثلاً ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے جیسے گائے، بکری وغیرہ) تو اس کی مقدار اس مخصوص حصے مثلاً آستین پر نجاست خفیفہ لگی ہے اگر اس کے چوتھائی سے کم ہے تو نماز ہوگئی ہے اور اگر زیادہ ہے تو نماز نہیں ہوئی ہے۔

لما فی مشکوۃ المصابیح(۲۴۳/۱): عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم قال ابو ذر: خابوا وخسروا من هم؟ یا رسول الله! قال. المسبل، والمنان. والمنفق سلعته بالحلف الکاذب۔

وفی الدرالمختار (۶۴۰/۱): وکره کفه أی رفعه ولو لتراب کمشمرکم أو ذیل

وفی الشامیة تحته: ای کما لو دخل فی الصلاة وهو مشمرکمه أو ذیله وأشار بذلك الى ان الکراهة لاتختص بالکف وهو فی الصلاة کما أفاده فی شرح المنیة لکن قال فی القنیة واختلف فی من صلی وقد شمر کمیه لعمل کان یعمله قبل الصلاة او هیئته ذلك اهـ۔ ومثله ما لو شمر للوضوء ثم عجل لادراك الرکعة مع الامام واذادخل فی الصلاة کذلك وقلنا بالکراهة فهل الأفضل ارخاء کمیه فیها بعمل قلیل أو ترکهما؟ لم أره: والاظهر الأول بدلیل قوله الاتی ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل۔

هذا وقید الکراهة فی الخلاصة والمنیة بأن یکون رافعا کمیه الی المرفقین وظاهره أنه لا

يكره الى مادونهما قال فى البحر: والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل اهـ ونحوه فى الحلية وكذا قال فى شرح المنية الكبير: ان التقييد بالمرفقين اتفاق قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلاة ثم شرع فيها كذلك أما لو شمر وهو فيها تفسد لانه عمل كثير۔

وفى الدرالمختار(۳۲۱/۱):(وعفى دون ربع)جميع بدن و(ثوب) ولوكبيرا هو المختار ذكر الحلبى، ورجحه فى النهر على التقدير بربع المصاب كيد وكم، وان قال فى الحقائق وعليه الفتوىٰ۔ (من) نجاسة (مخففة كبول مأكول)ومنه الفرس وطهره محمد۔

(۲۲۲)نجاست غلیظہ میں خشک اور تر میں فرق کا بیان

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نجاست غلیظہ اگر جسم یا کپڑے پر لگی ہوتو درہم کی مقدار سے زیادہ ہوتو نماز جائز نہیں ورنہ معفوعنہ ہے یہ مائع نجاست سے متعلق ہے یا خشک سے بھی؟ ہماری معلومات کے مطابق تو مائع میں مساحتِ درہم اور خشک میں وزنِ درہم کا اعتبار ہے؟ کیا یہ درست ہے؟ نیز درہم کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ کیسے اندازہ لگایا جائے؟ کیونکہ مساحتِ درہم کا تو پانچ کے سکے یا ہتھیلی کے وسط سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں معفوعنہ نجاست کی مقدار فقہاء کی تصریحات کے مطابق مائع نجاست غلیظہ میں مساحت درہم اور ذی جرم (جسم والی) نجاست غلیظہ میں وزن درہم کا اعتبار ہے لہٰذا آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔

جہاں تک وزن درہم کا تعلق ہے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اس مقام پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ درہم سے درہمِ کبیر مراد ہے جو ۲۰ قیراط کے برابر ہو حساب سے معلوم ہو کہ ۲۰ قیراط گراموں کے اعتبار سے 4.374 گرام اور ماشہ کے اعتبار سے 4.5 ماشہ اور رتی کے اعتبار سے 36 رتی بنتے ہیں۔

یہ مطلوبہ درہم عام درہم شرعی سے ۶ قیراط بڑا ہوتا ہے کیونکہ عام درہم شرعی ۱۴ قیراط کے برابر ہوتا ہے جو گراموں کے اعتبار سے 3.0618 گرام اور ماشہ کے اعتبار سے 3.15 ماشہ اور رتی کے اعتبار سے 25.2 رتی کے برابر ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر ذو جرم (یعنی جسم والی) نجاست کا وزن مبتلی بہ کے گمان کے مطابق 4.374 گرام سے زائد بن رہا ہو تو معاف نہیں ہے ورنہ معاف ہے۔ اسی طرح اگر مائع نجاست میں مبتلی بہ کا گمان یہ ہو کہ یہ مساحت درہم سے زیادہ ہوگی تو معاف نہیں ورنہ معاف ہے۔

لمافى المحيط البرهانى (۳۷۱/۱) كتاب الطهارة/الفصل السابع الخ /النوع الثانى، ادارة القرآن والمجلس العلمى: ۷۵۵۔ يجب ان يعلم بان القليل من النجاسة عفو عندنا لما روى عن عمر

رضى الله تعالىٰ عنه سئل عن قليل النجاسة فى الثوب فقال: اذا كان ظفرى هذا لا يمنع جواز الصلوة ... فالغليظة: اذا كانت قدر الدرهم او اقل، فهى قليلة لاتمنع جواز الصلوة ... ويعتبر الدرهم الكبير، دون الدرهم الصغير۔ قال محمد رحمه الله تعالىٰ فى "الجامع الصغير" الدرهم الكبير اكبر ما يكون من الدراهم، ولم يبين انه اراد به الكبير من حيث العرض والمساحة او من حيث الوزن، وزكر فى النوادر ان الدرهم الكبير اكبرما يكون من الدراهم، كالدراهم الزبرقانية درهم اسود كبير، ضربه الزبرقان۔

٧٥٧۔ وقال فى موضع آخر الدرهم الكبير ما يكون عرض الكف كالدرهم الشهليلى وهذا اعتبار التقدير من حيث العرض۔ ومن المشائخ من قال: انما يعتبر اكبر ما يكون من الدراهم من نقودزمانهم۔ اما ما كان من النقود وانقطع لا يعتبر وذكر فى كتاب الصلوة واعتبر الكبير من حيث الوزن

٧٥٨۔ قال الشيخ ابو جعفر رحمه الله: يوفق بين الفاظ محمد رحمه الله تعالىٰ فنقول: اراد بالتقدير من حيث العرضى تقدير النجاسة الرقيقة، واراد بالتقدير من حيث الوزن تقدير النجاسة الغليظة وهو الصحيح من المذهب ان فى الرقيقة يعتبر الدرهم من حيث العرض، وفى الغليظة يعتبر الدرهم من حيث الوزن۔

وفى ردالمحتار (٣١٨/١) باب الانجاس(ايچ ايم سعيد):قوله (وهو مثقال) هذا هو الصحيح وقيل يعتبر في كل زمان درهمه بحر وأفاد أن الدرهم هنا غيره في باب الزكاة فإنه هناك ما كان كل عشرة منه وزن سبعة مثاقيل قوله (في نجس كثيف) لما اختلف تفسير محمد للدرهم فتارة فسره بعرض الكف وتارة بالمثقال اختلف المشايخ فيه ووفق الهندواني بينهما بما ذكره المصنف واختاره كثير منهم وصححه الزيلعي والزاهدي وأقره في الفتح أن إعمال الروايتين إذا أمكن أولى وتمامه في البحر والحلية ومقتضاه أن قدر الدرهم من الكثيفة لو كان منبسطا في الثوب أكثر من عرض الكف لا يمنع كما ذكره سيدي عبد الغنى قوله (له جرم) تفسير للكثيف وعد منه في الهداية الدم وعده قاضيخان مما ليس له جرم ووفق في الحلية بحمل الأول على ما إذا كان غليظا والثاني على ما إذا كان رقيقا۔

(۲۲۳) سود کے پیسوں سے بنائے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست سود کا کاروبار کرتے ہیں اور سودی رقم سے مکان بنایا ہے تو اب پوچھنا یہ ہے کہ سود کی رقم سے بنے ہوئے مکان میں نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں سودی کاروبار کرنے والا گناہ کبیرہ میں مبتلا ہے، اسے چاہیئے کہ کوئی جائز کاروبار شروع کرے۔اوران پیسوں سے جو مکان بنایا ہے اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

لمافی الهندية(۱۴۲/۵): فی المنتقی قال ابو يوسف رحمه الله اذا غصب رجل أرضاوبناها حوانيت و حماما و مسجدا فلا بأس بالصلوة فی ذلك المسجد فأما الحمام فلا يدخل ولا يستأجر الحوانيت قال ولابأس بان يدخل الحوانيت لشراء المتاع قال هشام وأنا أكره الصلوة فيه حتى يطيب بذلك اربابه۔

وفی الفقه الاسلامی(۹۸۴/۲): الصلوة فی الارض المغصوبة حرام بالاجماع لان اللبث فيها يحرم فی غير الصلاة فلان يحرم فی الصلوة اولی ۔ والله اعلم بالصواب۔

(۲۲۴) ٹی وی اور آلات موسیقی والے کمرے میں نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں ٹی وی رکھا ہوا ہے اس کمرے میں کوئی اور سامان نہیں ہے بالکل خالی ہے تو ہمارے گھر والے اور ہم لوگ اس کمرے میں نماز پڑھتے رہتے ہیں۔آیا جس کمرے میں ٹی وی رکھا ہو، اس میں نماز پڑھنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر ٹی وی چل رہا ہو پھر تو یہ انتہائی مکروہ فعل ہے کیونکہ اس میں تصویروں کی عبادت کرنے والوں سے مشابہت لازم آئے گی لیکن نماز کراہت کے ساتھ ہوجائے گی اور اگر ٹی وی بند ہو تو پھر بھی نماز ہوجائے گی لیکن خلاف اولیٰ ہے کیونکہ عموماً ایسی جگہوں پر نماز میں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

لما فی الهندية(۶۳/۱): وتكره الصلاة فی تسع مواطن فی قوارع الطريق ومعاطن الابل والمزبلة والمجزرة والمخرج والمغتسل والحمام والمقبرة وسطح الكعبة ولا بأس بالصلاة والسجود على الحشيش والحصير والبسط والبوارى هكذا فی فتاوىٰ قاضيخان۔

وفيه ايضاً(۹۸۱/۲): الكنيسة(معبد النصارى) والبيعة (معبد اليهود) ونحوهما من أماكن الكفر تكره الصلاة فيها عند الجمهور وابن عباس مطلقا عامرة أو دارسة الا لضرورة كحر أو برد أو مطر

أو خوف عدّو او سبع فلا کراهة، وحکمة الکراهة إنها ماوی الشیاطین لأنها لا تخلو من التماثیل والصور ولأنها موضع فتنة وأهواء مما یمنع الخشوع... قال النووی فی المجموع۔ وتکره الصلاة فی مأوی الشیاطین کالخمارة وموضع المکس ونحو ذلك من المعاصی الفاحشة۔

(۲۲۵) آئینہ کے سامنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایسی جگہ نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں نمازی کے سامنے بڑا سا آئینہ ہو جس میں اسکی تصویر دکھائی دے رہی ہو، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... آئینہ کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے البتہ اگر اسکی وجہ سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہو رہا ہو تو آئینے کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہوگا، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنا بھی درست ہے جبکہ استقبال قبلہ درست ہو، اگر قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو کسی سے پوچھ کر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور اگر کوئی بتانے والا نہ ہو تو خود تحری کر کے نماز پڑھ لے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۲۹۳): (و)تکره بحضرة کل (مایشغل البال) کزینة (و) بحضرة ما (یخل بالخشوع) کلهو ولعب ولذا نهی النبی ﷺ عن الاتیان للصلاة سعیا بالهرولة۔

وفی الشامیة(۱/۴۳۱):فان کان عاجزا بالاشتباه وهوان یکون فی المفازة فی لیلة مظلمة ولاعلم له بالامارات الدالة علی القبلة فان کان بحضرته من یسئله عنها لایجوز له ان یتحری بل یجب ان یسئل لماقلنا ای من ان السوال أقوی من التحری۔

(۲۲۶) آئینے کے سامنے نماز پڑھنا تصویر کے حکم میں نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے سامنے بڑا آئینہ لگا ہوا ہو تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں جبکہ اس کی تصویر آئینے میں مکمل طور پر نظر آتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... آئینے میں جو چیز نظر آتی ہے اس کو تصویر نہیں کہا جاتا بلکہ عکس کہا جاتا ہے اس لئے یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آئینے کے سامنے نماز پڑھنے میں فی نفسہٖ کوئی کراہت نہیں جیسا کہ مصلی کا سایہ بحالت نماز سامنے پڑنا موجب کراہت نہیں البتہ آئینہ اور اس جیسی اشیاء جن سے نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہو سامنے کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لمافی الخانیة(۱/۱۶۸): ولو نظر فی مرأة ورأی فیها فرج امرأة فنظر عن شهوة لا یحرم علیه أمها وابنتها لانه لم یر فرجها وإنما رأی عکسها۔ ولو کانت المرأة علی شط حوض او علی قنطرة فنظر

الرجل فی الماء فرأی الرجل فرجها فنظر عن شهوة لا يثبت الحرمة۔

وفی الشامية(۱/۶۵۸): قوله لانه يلهى المصلى: أى فيخل بخشوعه من النظر الى موضع سجوده ونحوه، وقد صرح فی البدائع فی مستحبات الصلوة أنه ينبغى الخشوع فيها ويكون منتهى بصره إلى موضع سجوده الخ وكذا صرح فى الاشباه أن الخشوع فى الصلوة مستحب والظاهر من هذا ان الكراهة هنا تنزيهية فافهم۔

وفيه ايضاً(صـ۴۰۳): وفى القنية: لو صلّى على زجاج يصف ماتحته قالوا جميعا يجوز۔

وفی المفصل فی احكام المرأة والبيت المسلم(۱/۲۲۹): مايكره فى الصلاة: يكره للمصلى فى صلوته العبث بثوبه او بدنه او... يرفع بصره الى السماء أو... إلى ما يشغله عن الصلوة أو... ان يصلى بحضرة الطعام أو... ان يترك شيأ من سنن الصلوة۔

(۲۲۷) اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے بڑے فرماتے ہیں کہ جب نماز پڑھی جائے تو روشنی کا انتظام پہلے کر لینا ضروری ہے، اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی۔کیا ان حضرات کی بات صحیح ہے یا اندھیرے میں بھی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......آپ کے بڑوں کا یہ کہنا کہ ''اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی'' صحیح نہیں ہے۔اندھیرے میں نماز بلا کراہت درست ہے۔

لما فی الهندية(۱/۶۴): رجل صلى فى المسجد فى ليلة مظلمة بالتحرى فتبيّن انه الى غير القبلة جازت صلوته۔

وفى الطحطاوى على الدر(۱/۱۹۲): اما بالليل فيصلى قائماً لان ظلمة الليل تستر عورته۔

وفى الدر المختار(۱/۴۳۳): وان علم به فى صلوته او تحول رايه ...... ولو بمكة او مسجد مظلم ولا يلزمه قرع ابواب ومس جدران۔

وفى الشامية تحته: وفى الخلاصة اذا لم يكن فى المسجد قوم والمسجد فى مصرٍ فى ليلةٍ مظلمةٍ (قوله ومس جدران) لان الحائط لو كانت منقوشة لا يمكنه تمييز المحراب من غيره وعسى ان يكون ثم هامة مؤذيةً ......وهذا انما يصح فى بعض المساجد فاما فى الاكثر فيمكن تمييز المحراب من غيره فى الظلمة بلا ايذاء۔

(۲۲۸) سامنے موم بتی یالالٹین وغیرہ رکھ کرنماز پڑھنے کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موم بتی اور لالٹین وغیرہ سامنے رکھ کرنماز پڑھنا کیسا ہے؟ نماز میں کراہت تونہیں آتی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگرکوئی شخص موم بتی یالالٹین وغیرہ سامنے رکھ کرنماز پڑھےتونماز درست ہےاورنماز میں کوئی کراہت نہیں آتی۔البتہ بہتر یہ ہے کہ نماز کی حالت میں موم بتی یالالٹین وغیرہ جانبین میں سے کسی جانب رکھیں۔

لمافی الهندية (۱۰۸/۱): ولو توجه الى قنديل أو الى سراج لم يكره۔

وفي الدر المختار (۶۵۱/۱):(و) لايكره (صلاة الى ظهر قاعد) أو قائم ولو (يتحدث) الااذا خيف الغلط بحديثه (و) لا الى (مصحف أو سيف مطلقا أو شمع أو سراج) أونار توقد لأن المجوس انما تعبد الجمر لا النار الموقدة۔

(۲۲۹) چشمہ لگا کرنماز پڑھنے کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ایک صاحب مجھ سے الجھ پڑے کےنماز چشمہ اتار کر پڑھنا چاہیے، یہی اولیٰ اور افضل ہے۔آنجناب سے گذارش یہ ہے آپ میری صحیح بات کی طرف راہنمائی فرمادیں کہ کیا صحیح ہےاورکیاغلط ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں فی نفسہ چشمہ لگانا جائز ہےالبتہ اگر سجدہ وغیرہ کرتے وقت ڈھیلا ہونے سے الجھنے کا گمان ہو یااس سے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہوتو چشمہ لگانا نماز میں مکروہ ہے،اس کواتار دینا افضل ہےاوراگراس کی وجہ سے خشوع وخضوع میں اضافہ ہوتا ہوتو چشمہ لگا کرنماز ادا کرنا بلاکراہت درست ہے۔نیز ایسے امور میں آپس میں بحث ومباحثہ اورالجھنا اچھا نہیں۔

وفي الهندية(۱۰۹/۱): ولا بأس ان يصلى متقلداً للقوس والجعبة الا ان يتحركا عليه حركة تشغله فحينئذ مكروه ويجزيه۔

وفي الدر المختار(۶۴۰/۱):(و) كره(كفه)أى رفعه ولولتراب كمشمركم أوذيل (وعبثه به) اى بثوبه (وبجسده) للنهى الالحاجة ولا بأس به۔

وفي الشامية تحته:(قوله وعبثه) هو فعل لغرض غير صحيح قال فى النهاية :وحاصله ان كل عمل هو مفيد للمصلى فلا بأس به اصله ماروى ان النبى ﷺ عرق فى صلاته فسلت العرق عن

جبینه ای مسحه لانه کان یؤذیه فکان مفیداً۔ وفی زمن الصیف کان اذاقام من السجود نفض ثوبه یمنة أو یسرةً لانه کان مفیدا کی لاتبقی صورة فأما ما لیس بمفید فهو العبث۔

وفی فتاویٰ اللجنة(۱۷۳/۶): س: ماحکم الصلاة فی النظارات الطبیة:

ج: یجوز للانسان ان یصلی بالنظارات الطبیة الا اذا کان استعمالها یمنع من تمکین المصلی جبهته او انفه من الارض فلا یجوز۔

(۲۳۰)بغیر عمامہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا پڑھانا کیسا ہے، آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی نماز بغیر عمامہ کے پڑھنا ثابت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عمامہ باندھنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک سنت ہے اوراحادیث مبارکہ میں عمامہ باندھنے کی بڑی فضیلت آئی ہے اورعمامہ باندھنا اجروثواب کا باعث ہے۔چنانچہ بغیر عمامہ نماز پڑھنا اور پڑھانا اگرچہ جائز ہے لیکن (بعض روایات کے مطابق اگرچہ وہ ضعیف ہیں) عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز کا ثواب بغیر عمامہ پہنے پڑھی گئی نماز کے مقابلے میں پچیس گنا زیادہ ہے لہٰذا بغیر عمامہ کے پڑھی گئی نماز میں پچیس گنا ثواب سے محرومی ہے۔نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا تتبع کے باوجود نہ مل سکا البتہ ننگے سر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوائے حالت احرام کے کبھی نماز نہیں پڑھی۔

لمافی المرقاة (۲۵۰/۸): وروی ابن عساکرعن ابن عمرمرفوعاصلاة تطوع او فریضة بعمامة تعدل خمسا وعشرین صلاة بلاعمامة وجمعة بعمامة تعدل سبعین جمعة بلا عمامة فهذاکله یدل علی فضیلة العمامة مطلقاً۔

وفی حاشیة ملتقی الابحر(۲۳۲/۲):العمامة سنة نبویة شریفة غفل عنهاکثیرمن العلماء بل زهدواحتی فی تغطیة الرأس ممالیس من شعار الکفرةوقدقال علی القاری رحمه الله ان رسول الله ﷺ ماصلی حاسر الرأس الافی احرامه۔

فصل فی السنن والنوافل

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

(۲۳۱) سنتوں کو اذان سے پہلے پڑھ لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی اذان سے قبل چار سنتیں پڑھنا کیسا ہے چاہے بعض مساجد میں اذان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یہ سنتیں وقت کی تابع ہیں یا اذان کے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... اذان شریعت میں فرض نماز کیلئے مشروع ہوئی ہے اور یہ نماز کے دخول وقت کی علامت ہے البتہ نوافل اور سنتیں فرائض کے تابع ہیں لہٰذا ان کو فرض نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد ادا کیا جاسکتا ہے اگرچہ ابھی اذان نہ ہوئی ہو۔

لما فی الدر المختار(۳۸۴/۱): (و) سببه (بقاء دخول الوقت، وهو سنة) للرجال فی مكان عال (مؤكدة) هی كالواجب فی لحوق الاثم (للفرائض) الخمس(فی وقتها ولوقضاء) لأنه سنة للصلاة حتی یبرد به لا للوقت (لا) یسن (لغیرها) كعید۔

(۲۳۲) صبح صادق کے بعد ”نفل“ سنت فجر شمار ہوگی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی نیت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع ہوگئی ہے تو کیا یہ دو رکعت سنت فجر سے کفایت کرے گی؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... اگر کوئی شخص تہجد کی نفل کی نیت کر کے نماز شروع کر دے بعد میں معلوم ہو جائے کہ صبح صادق طلوع ہو چکی ہے تو یہ دو رکعت فجر کی سنت ہی شمار ہوگی۔

لمافی الهندیة(۱۱۲/۱): لوصلی ركعتین وهو یظن أن اللیل باق فاذا تبین أن الفجر قد كان طلع ... قال المتأخرون یجزیه عن ركعتی الفجر ذكر الشیخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی فی شرح كتاب الصلاة ظاهر الجواب أنه یجزیه عن ركعتی الفجر لان الاداء حصل فی الوقت۔

(۲۳۳) اگر جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو سنت فجر کب پڑھی جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اور امام نماز پڑھا رہا ہو تو بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی طرح یہ یقین یا ظنِ غالب ہو جائے کہ ایک رکعت جماعت سے مل جائے گی تو پھر فجر کی سنتوں کو پڑھ لینا چاہیے اور بعض فرماتے ہیں کہ اگر تشہد ہی مل جانے کی امید ہو تو پھر بھی پڑھ لینا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کونسا قول راجح ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... آپ کے ذکر کردہ اقوال میں دوسرا قول راجح ہے یعنی اگر مقتدی کو صرف تشہد مل جانے کی امید ہو، تب بھی فجر کی سنتیں پڑھ لینی چاہئیں نیز اس صورت میں اس کو دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں گی، سنت فجر کی بھی اور جماعت کی بھی لہٰذا یہی بہتر ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۰): ولم يذكر فى الكتاب أنه ان كان يرجو ادراك القعدة كيف يفعل فظاهر ما ذكر فى الكتاب أنه ان خاف أن تفوته الركعتان يدل على أنه يدخل مع الامام وحكى عن الفقيه أبي جعفر أنه قال على قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ يصلى ركعتى الفجر لأن ادراك التشهد عندهما كادراك الركعة كذا فى الكفاية۔

وفى الشامية(۲/۵۶): (وقيل التشهد) أى اذا رجا ادراك الامام فى التشهد لا يتركها بل يصليها وان علم أن تفوته الركعتان معه ... قلت: لكن قواه فى فتح القدير بما سيأتى من أن من ادرك ركعة من الظهر مثلا فقد أدرك فضل الجماعة وأحرز ثوابها كما نص عليه محمد وفاقا لصاحبيه وكذا لو ادرك التشهد يكون مدركا لفضيلتها على قولهم قال: وهذا يعكر على ماقيل إنه لورجا ادراك التشهد لايأتى بسنة الفجر على قول محمد والحق خلافه لنص محمد على ما يناقضه أى لان المدار هنا على ادراك فضل الجماعة وقد اتفقوا على ادراكه بادراك التشهد فيأتى بالسنة اتفاقا كما أوضحه فى الشرنبلالية ايضا وأقره فى شرح المنية الخ۔

(۲۳۴) فجر کی سنت کس وقت چھوڑ سکتا ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی سنتیں کس وقت چھوڑنا جائز ہے نیز اگر مقتدی کو معلوم نہ ہو کہ کونسی رکعت ہے تو اس وقت سنت چھوڑنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... فجر کی سنت اس وقت چھوڑ سکتا ہے جبکہ فرض کی دونوں رکعات فوت ہو جانے کا خدشہ ہو، اور اگر

یہ یقین ہو کہ امام کے ساتھ تشہد میں شریک ہو سکتا ہوں تو سنت چھوڑنا درست نہیں ہے۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۶۴۷): اذا کان یرجوا دراك القعدة مع الامام صریحا انه یشتغل برکعتی الفجر: واشار الی انه یدخل مع الامام فانه قال: اذا خشی ان تفوته الرکعتان مع الامام دخل فی صلاة الامام وبه اخذ بعض المشایخ... ومنهم من قال علی قیاس قول ابی حنیفة و ابی یوسف رحمهما الله یجب ان یشتغل برکعتی الفجر اذا کان یرجوادراك الامام فی التشهد۔

وفی حلبی کبیر(ص۳۹۷): بخلاف سنة الفجرالفجر فانه یجوز اداؤها اذا علم انه یدرکه فی التشهد عندهما وعند محمد اذا علم انه یدرك الرکعة الثانیة۔

(۲۳۵)سنت فجر کی انفراداً قضاء کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کارخانے میں ملازمت کرتا ہوں اللہ کے فضل سے نمازوں کی پابندی کرتا ہوں کبھی میری صبح جلدی آنکھ نہیں کھلتی جس کی وجہ سے صبح کی سنت رہ جاتی ہیں دن میں مصروفیت کی وجہ سے قضاء بھی نہیں کر پاتا تو کیا صبح کے فرائض کے فوراً بعد میرے لیے سنت پڑھنے کی گنجائش ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سنت فجر کی احادیث میں بہت تاکید وارد ہوئی ہے، اور سنن نماز میں سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے۔ اس لیے سنتِ فجر کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ اگر امام کے ساتھ تشہد ملنے کی امید ہو، اور جماعت فوت ہونے کا خوف نہ ہو تو سنت ادا کر کے جماعت میں شامل ہونا چاہیے، تاہم اگر کبھی سنت فجر قضاء ہو جائے تو اصولی طور پر سنت کی قضاء نہیں ہے۔ البتہ سنت فجر کی تاکید بہت زیادہ وارد ہونے کی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر سنت فجر فرض کے ساتھ رہ جائے تو طلوع آفتاب کے بعد زوال سے پہلے پہلے اس کی قضاء بالاتفاق درست ہوگی۔ اور اگر فجر کی سنتیں انفراداً بغیر فرض کے قضاء ہو جائیں تو بھی زوال سے قبل اسکی قضاء کر لینا بہتر ہے اور بعد از زوال صرف فرض کی قضاء ہوگی، سنت کی قضاء ساقط ہو جائے گی۔

لمافی الهندیة(۱/۵۳): ومنها ما بعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس هکذا فی النهایة والکفایة ولو افسد سنة الفجر ثم قضاها بعد صلوة الفجر لم یجزه الخ۔

(۱/۱۱۲)اقوی السنن رکعتا الفجر... والسنن اذا فاتت عن وقتها لم یقضها الارکعتی الفجر اذا فاتتا مع الفرض یقضیهما بعد طلوع الشمس الی وقت الزوال ثم یسقط هکذا فی محیط السرخسی وهو الصحیح هکذا فی البحرالرائق، واذا فاتتا بدون الفرض لایقضی عندهما خلافا لمحمد رحمه الله تعالیٰ

وفی المراقی(ص۲۱۴): رکعتان قبل صلوة الفجر وهی اقوی السنن، وفی حاشیة الطحطاوی

(ص۳۱۵) لكثرة ما ورد فيها من المرغبات ... وتقضى اذا فاتت مع الفرض دون غيرها الخ۔
وفی الشامية على الدر المختار(۱۴/۲): والسنن آكدها سنة الفجر اتفاقاً، فيه ايضاً(ص۱۵) ولا يجوز تركها لعالم صار مرجعاً فى الفتاوىٰ ... وتقضى اذا فاتت معه۔
وفی الشامية تحته: (قوله فله تركها الخ) الظاهر ان معناه انه يتركها وقت اشتغاله بالافتاء ... وظاهر التفرقة بين سنة الفجر وغيرها، انه ليس له ترك الجماعة لانها من الشعائر فهى آكد من سنة الفجر ولذا يتركها لوخاف فوت الجماعة۔
وفی الشامية تحته: (قوله وتقضى) اى الى قبيل الزوال وقوله معه تنازعه قوله تقضى وفاتت فلا تقضى الامعه حيث فات وقتها، أما اذا فاتت وحدها فلا تقضى ولا تقضى قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولو تبعاً على الصحيح۔

(۲۳۶) ظہر اور جمعہ سے پہلے کی سنتوں کی قضاء کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اردو فتاویٰ کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا۔اس میں جمعہ کی سنت قبلیہ کے بارے میں لکھا تھا کہ اگر یہ کسی عذر کی بناء پر نماز جمعہ پڑھنے سے پہلے کوئی نہ پڑھ سکا تو وہ ساقط ہوجائیں گی۔ان کی قضاء نہیں۔اس لئے کہ اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں اور ظہر کی سنت قبلیہ فوت ہونے کی صورت میں قضاء کرنے کے بارے میں روایت سے صراحت ثابت ہے جبکہ بعض دوسرے فتاویٰ میں قضاء کرنے کی ترتیب لکھی ہے کہ جمعہ کے فرض پڑھنے کے بعد پہلے چار سنتیں پڑھ لے پھر وہ شروع والی فوت شدہ چار سنتیں پڑھ لے جبکہ شروع میں بندہ نے خود اس پہلے قول کے مطابق عمل شروع کیا اب دوسرے فتاویٰ دیکھنے سے تردد میں پڑ گیا کیونکہ دوسرے قول سے قضاء کرنا معلوم ہوتا ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ قول راجح اور مفتی بہ کی طرف رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔بینوا توجروا

الجواب بعون الملک الوھاب......فقہاء کرام کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نماز کا قضا کرنا فرض یا واجب کے ساتھ مختص ہے۔اس لئے اگر سنن اپنے محل سے فوت ہوجائیں تو ان کی قضاء نہیں ہے۔تاہم صبح کی سنتیں زوال تک تبعاً للفرض قضاء کرنا درست ہے اسی طرح اگر کوئی شخص ظہر سے قبل کی چار رکعت سنت جماعت سے پہلے نہ پڑھ سکے تو جماعت کے بعد ان کی قضاء درست ہے۔ان دو وقت کی سنتوں کو نص کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، جمعہ سے قبل کی سنتوں کے متعلق بھی بعض فقہاء کی یہی رائے ہے چنانچہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وحكم الاربع قبل الجمعة كالاربع قبل الظهر** "بعض دوسرے فقہاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنے وقت سے فوت ہوجائیں تو جمعہ پڑھنے کے بعد نہیں پڑھی جائیں گی۔علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ ظہر کی سنتوں کی قضاء کے بارے میں نص موجود ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "**كان رسول الله ﷺ اذا فاتته الاربع قبل الظهر**

صلاها بعد الرکعتین بعد الظهر ''(ابن ماجہ، ص۸۰) ''یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جاتیں تو ان کو ظہر کے بعد کی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے تھے'' جبکہ جمعہ سے قبل کی سنتوں کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے کہ وہ جمعہ کے بعد پڑھی گئی ہیں اور سنتوں میں اصل یہ ہے کہ ان کی قضاء نہ کی جائے اس لئے جمعہ سے پہلے کی سنتیں اگر فوت ہوجائیں تو نماز جمعہ پڑھنے کے بعد ان کی قضاء نہ کی جائے لہٰذا جن مفتیان کرام نے قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے ظہر سے قبل کی چار سنتوں پر قیاس کیا ہے اور بعض فقہاء کرام کا یہ قول بھی ہے اور جن حضرات نے عدم قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے اصول کو پیش نظر رکھا ہے البتہ احتیاط اس میں ہے کہ پڑھ لی جائیں۔

لمافی البحر الرائق(۲/۷۵):(وقضی التی قبل الظهر فی وقته قبل شفعه) بیان لشیئین احدهما القضاء والثانی محله اما الاول ففیه اختلاف والصحیح انها تقضی کما ذکره قاضیخان فی شرحه مستدلا بما عن عائشة رضی الله عنهاان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضا هن بعده وظاهر کلام المصنف انها سنة لا نفل مطلق الی ان قال وحکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی۔

وفی الدرالمختار(۲/۵۸،۵۷): ولا یقضیها الا بطریق التبعیة لقضاء فرضها قبل الزوال لا بعده فی الاصح لورود الخبر بقضائها فی الوقت المهمل، بخلاف القیاس فغیره علیه لا یقاس بخلاف سنة الظهر وکذا الجمعة فانه ان خاف فوت رکعة یترکها ویقتدی ثم یاتی بها علی انها سنة فی وقته ای الظهر۔

وفی الشامیة تحته: (قوله وکذا الجمعة) ای حکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی بحر، وظاهره انه لم یره فی البحر منقولا صریحاً وقد ذکره القهستانی لکن لم یعزه الی احد، وذکر السراج الحانوتی ان هذا مقتضی مافی المتون وغیرها لکن قال فی روضة العلماء انها تسقط لما روی انه علیه الصلاة والسلام قال ''اذا خرج الامام فلا صلاة الا المکتوبة'' اقول وفی هذا الاستدلال نظر لانه انما یدل علی انها لا تصلی بعد خروجه لاعلی انها تسقط بالکلیه ولا تقضی بعد الفراغ من المکتوبة والالزم ان لا تقضی سنة الظهر ایضاً۔ فانه ورد فی حدیث مسلم وغیره اذا اقیمت الصلوة فلا صلاة الا المکتوبة نعم قد یستدل للفرق بینهما بشی اخر وهو ان القیاس فی السنن عدم القضاء کما مر وقد استدل قاضیخان لقضاء سنة الظهر بما عن عائشة رضی الله عنها ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضاهن بعده'' فیکون قضاؤها ثبت بالحدیث علی خلاف القیاس کمافی سنة الفجر، کماصرح به فی الفتح فالقول بقضاء سنة الجمعة یحتاج الی دلیل خاص، وعلیه فتنصیص المتون علی سنة الظهر نص علی ان سنة

الجمعة لیست کذالک فتأمل۔

(۲۳۷) تحیۃ المسجد سنتوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی، سنت ظہر کی قضاء کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی ظہر یا جمعہ کی چار رکعات، فرضوں سے پہلے نہ پڑھ سکے تو آیا فرضوں کے بعد کی دوسنتوں کے بعد پڑھے گا یا پہلے؟ اسیطرح اگر کوئی شخص ظہر کی چار رکعات کی جگہ تحیۃ المسجد پڑھ لے تو یہ سنتوں کے قائم مقام ہوجائینگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اولاً یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ظہر کی چار سنتوں اور تحیۃ المسجد میں سے چار سنتوں کا مرتبہ اعلیٰ ہے اور یہ اصول ہے کہ اعلیٰ ادنیٰ کی طرف سے قائمقام ہوسکتا ہے لیکن ادنیٰ اعلیٰ کی طرف سے قائمقام نہیں بن سکتا لہٰذا تحیۃ المسجد کی نیت سے ادا کی گئی نماز سے ظہر کی چار سنتیں ادا نہ ہوں گی البتہ اگر ظہر کی چار سنتوں کی نیت سے نماز پڑھتا ہے تو اس سے تحیۃ المسجد بھی ادا ہوجائے گی۔ نیز اسی طرح اگر چار رکعات سنتیں فرضوں سے پہلے رہ جائیں تو ان کو فرضوں کے بعد ادا کیا جائے گا البتہ دوسنتوں کے بعد ادا کرنا بہتر ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۵۹): قوله وبه یفتی (اقول وعلیه المتون لکن رجح فی فتح القدیر تقدیم الرکعتین وقال وفی الامداد، فی فتاوی العتابی أنه المختار، وفی مبسوط شیخ الاسلام أنه الاصح لحدیث عائشة رضی الله عنها(انه علیه الصلاة والسلام کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر یصلیهن بعد الرکعتین) وهو قول الامام الاعظم ابی حنیفة رحمه الله تعالی۔

(۲۳۸) فجر، ظہر اور عصر کی سنتوں کا فرض کے بعد پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں رہ جائیں اور وہ فرض باجماعت پڑھ لے تو یہ سنتیں بعد میں پڑھی جاسکتی ہیں یا نہیں، اگر ادا کی جاسکتی ہیں تو کب تک؟ نیز ظہر، عصر کی چار رکعات جو پہلے ادا کی جاتی ہیں اگر ادا نہ ہوسکیں تو انہیں بعد میں ادا کیا جاسکتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر کسی کی فجر کی صرف سنتیں رہ جائیں تو طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک انکی قضا کر لینا بہتر ہے اسی طرح اگر ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو ان کو ظہر کے وقت میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر عصر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو انہیں ادا نہیں کریگا کیونکہ عصر کی نماز کے بعد نوافل مکروہ ہیں۔

لمافی الشامیة(۲/۵۷): (قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة الخ) ای لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فیقضیها تبعا لقضائه لو قبل الزوال واما اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس

بالاجماع لكراهة النفل بعدالصبح واما بعد طلوع الشمس فكذالك عندهما وعند محمد رحمه الله احب الیّ ان يقضيها إلى الزوال كمافى الدرر. قيل هذاقريب من الاتفاق۔

وفى الدر المختار(۵۸/۲): (بخلاف سنة الظهر) وكذا الجمعة (فإنه) إن خاف فوت ركعة (يتركها) ويقتدى (ثم يأتى بها) على أنها سنة (فى وقته) اى الظهر (قبل شفعه) عند محمد وبه يفتى

وفى الشامية تحته : (قوله فى وقته) فلا تقضى بعده لا تبعا ولا مقصودا بخلاف سنة الفجر۔

وفى الشامية (۳۷۵/۱): (قوله بعد صلوة فجر وعصر) متعلق بقوله وكره اى وكره نفل الخ بعد صلاة فجر وعصر أى إلى ما قبيل الطلوع والتغير الخ۔

(۲۳۹) فجر کی سنتوں کی قضا کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی سنتوں سے متعلق مسئلہ دریافت کرنا ہے۔ اس سلسلے میں راجح اور مفتی بہ کیا ہے؟ شیخین اور امام محمد رحمہم اللہ میں کیا اختلاف ہے؟ اگر شیخینؒ کے نزدیک قضاء نہیں تو پھر شامیہ میں "وھذا قریب من الاتفاق " کیسے کہا گیا ہے؟ کیونکہ اگر قضاء نہیں تو پھر یہ تو صریح اختلاف ہی ہے۔ از راہِ کرم فجر کی سنتوں کی انفراداً قضاء سے متعلق مسائل کی مفصل تشریح فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں فجر کی سنتیں اگر فجر کے فرضوں کے ساتھ رہ جائیں تو بالاتفاق زوال سے قبل تک ان سنتوں کو مع الفرض قضاء کیا جاسکتا ہے۔ اصولاً تو سنتوں کی قضاء نہیں اسی لیے فجر کے علاوہ اور کسی نماز کی سنتیں قضاء نہیں ہوتیں البتہ فجر کی سنتوں کی تاکید زیادہ ہے نیز لیلۃ التعریس میں آپ نے فجر کی نماز کی قضاء میں فرض کے ساتھ ساتھ سنتیں بھی قضاء فرمائی تھیں۔ لہٰذا یہ فجر کی سنتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسی دن کے زوال تک مع الفرائض بالاتفاق قضاء کی جاسکتی ہیں۔

البتہ اگر صرف فجر کی سنتیں قضاء ہوجائیں اور فرض کو وقت کے اندر ہی ادا کرلیا جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد زوال تک اس کی قضاء ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلے میں شیخین اور امام محمد رحمہم اللہ کا اختلاف ہے شیخینؒ کے نزدیک فجر کی سنتوں کی انفراداً قضاء نہیں امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک انفراداً بھی زوال تک قضاء کرنا بہتر ہے۔

شیخین اور امام محمد رحمہم اللہ کے اس اختلاف کو ذکر کرکے ہی علامہ شامی رحمہ اللہ نے "وھذا قریب من الاتفاق "یعنی" یہ اختلاف اتفاق کے قریب ہے" کے الفاظ استعمال کئے ہیں اسے اتفاق کے قریب ہونے کی وجہ بھی خود علامہ رحمہ اللہ نے تحریر فرمائی ہے:

"قيل هذا قريب من الاتفاق لان قوله "احب الى" دليل على انه لو لم يفعل لا لوم عليه وقالا لا يقضى وان قضى فلا بأس به كذا فى الخانية"

”کہا گیا ہے کہ یہ اتفاق کے قریب ہے کیونکہ امام محمدؒ کا قضاء کر لینے کو زیادہ بہتر کہنا اس بات پر دلیل ہے کہ اگر قضاء نہیں کی تو کوئی ملامت نہیں اور شیخین کا یہ کہنا کہ ”قضاء نہیں کی جائے“ اور اگر قضاء کر لی تو کوئی حرج نہیں یہی خانیہ میں ہے۔“

(شامیۃ ۲/۵۷)

یعنی شیخین کے نزدیک اصل یہ ہے کہ انفراداً فجر کی سنتیں قضاء نہ کی جائیں لیکن اگر کر لے تو کوئی حرج نہیں اور امام محمدؒ کے نزدیک انفراداً قضاء کر لینا بہتر ہے لیکن اگر قضاء نہ کی تو کوئی ملامت نہیں یعنی اختلاف فرض اور حرام کا نہیں فقط اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا ہے لہٰذا یہ اختلاف تقریباً لفظی ہے اور نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انفراداً بھی قضاء کر لینا ہی بہتر ہے کیونکہ یہ شیخینؒ کے نزدیک بھی حرام فعل نہیں لہٰذا قضاء ہی بہتر ہے۔

گویا فجر کی سنتوں کی قضاء سے متعلق چار صورتیں ہیں تین اتفاقی ہیں اور ایک میں صورتاً اختلاف ہے تین اتفاقی صورتیں یہ ہیں:

(۱)۔طلوعِ آفتاب سے قبل بالاتفاق قضاء جائز نہیں چاہے فرض کے ساتھ ہوں یا انفراداً۔ کیونکہ طلوع سے قبل تو نوافل وغیرہ مکروہ ہیں۔

(۲)۔زوال کے بعد بھی بالاتفاق ان سنتوں کی قضاء نہیں چاہے فرض کے ساتھ قضاء ہو یا انفراداً اس دن کے زوال کے بعد قضاء نہ ہوگی۔

(۳)۔طلوعِ آفتاب کے بعد اور زوال سے قبل تبعاً للفرض بالاتفاق قضاء ہوگی۔ یعنی فجر کی سنتیں اگر فرض کے ساتھ قضاء ہو جائیں تو طلوع کے بعد اور زوال سے قبل بالاتفاق ان سنتوں کی قضاء ہوگی۔ یہ تین صورتیں اتفاقی ہیں۔ چوتھی صورت میں صورتاً اختلاف ہے۔

(۴)۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ فجر کی سنتیں انفراداً قضاء ہو جائیں۔ یعنی فرض وقت میں ادا کر لیا جائے سنتیں فقط قضاء ہو جائیں اور ان سنتوں کو طلوع کے بعد، زوال تک قضاء کیا جائے تو اس میں اختلاف ہے شیخینؒ کے نزدیک زوال سے قبل بھی ان کی قضاء نہیں اور امام محمدؒ کے نزدیک طلوع کے بعد اور زوال سے قبل تک انفراداً بھی ان سنتوں کی قضاء کر لینا بہتر ہے۔ لیکن شیخینؒ کے نزدیک اگر قضاء کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں اور امام محمدؒ کے نزدیک اگر قضاء نہیں کی تو کوئی ملامت نہیں۔ لہٰذا یہ صورت بھی اتفاقی ہی ہے اور بہر حال انفراداً سنتوں کو بھی زوال سے قبل قضاء کر لینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۲) (الباب التاسع فی النوافل): ”والسنن اذا فاتت عن وقتها لم يقضها الا ركعتی الفجر اذا فاتتا مع الفرض يقضيهما بعد طلوع الشمس الی وقت الزوال ثم يسقط هكذا فی محيط السرخسی وهو الصحيح هكذا فی البحرالرائق“ واذا فاتتا بدون الفرض لا يقضی عندهما خلافا لمحمد رحمه الله كذا فی محيط السرخسی۔

وفی الشامیة (۲/۵۷) باب ادراك الفريضة :(قوله: ولا يقضيها الا بطريق التبعية الخ) ای لا يقضى سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فيقضيها تبعا لقضائه لو قبل الزوال واما اذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالاجماع لكراهة النفل بعد الصبح واما بعد طلوع الشمس فكذا عندهما وقال محمد احب الى ان يقضيها الى الزوال كما فى الدرر قيل هذا قريب من الاتفاق لان قوله احب الى دليل على انه لو لم يفعل لا لوم عليه وقالا لا يقضى وان قضى فلا باس به كذا فى الخانية۔ ومنهم من حقق الخلاف وقال الخلاف فى انه لوقضى كان نفلا مبتدا او سنة كذا فى العناية يعنى نفلا عندهما سنة عنده كذا ذكره فى الكافى اسماعيل۔

(۲۴۰) سنتوں کی تیسری رکعت میں خطبہ شروع ہو جائے تو کیا کرے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے چار رکعت سنتیں پڑھ رہا تھا۔ جب وہ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا، تو امام صاحب نے خطبہ شروع کیا۔ تو اس نے فوراً قعدہ کی طرف واپس آ کر سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دیا۔ تو ایک مولوی صاحب اس کے قریب کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو بعد میں اس سے کہا۔ ایسی صورت میں آپ پر سجدہ سہو واجب نہیں ہے کیونکہ یہاں آپ سے سہو نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تو شریعت کی طرف سے آپ کو حکم ہے۔ تو کیا مولوی صاحب کی یہ بات صحیح ہے یا ایسے آدمی پر سجدہ سہو لازم ہوگا؟ دلائل کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......کوئی شخص جمعہ کے دن چار رکعت سنتیں پڑھ رہا ہو، اسی دوران خطبہ شروع ہو جائے تو اگر وہ ایک رکعت پڑھ چکا ہے تو دوسری رکعت ملا کر دو رکعت مکمل کر کے سلام پھیر دے اگر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا تو اس صورت میں چار رکعت پوری پڑھنا لازم ہے۔ لہٰذا مذکورہ شخص کو چار رکعت سنت پوری کرنی چاہیے تھی جو کہ اس نے پوری نہیں کی اس لئے اس کے ذمے اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافی المحيط البرهانی (۲/۴۶۴): وان افتتح الصلاة بعد ما خرج الامام خففها و اتمها قال الشيخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی رحمه الله ابهم الجواب فى الاصل فسره فى النوادر فقال ان كان صلى ركعة اضاف اليها اخرى وسلم وان كان نوى اربعا عند التكبير فان قيد الثالثة بالسجدة اضاف اليها الرابعة وسلم وخفف القراءة فيها فيقرأ بفاتحة الكتاب وسورة قصيرة وان كان له ورد فى القراءة ترك الورد فى هذه الصورة واذا لم يقيد الثالثة بالسجدة ماذا يصنع؟ لم يذكر هذا الفصل فى النوادر والمتاخرون فى هذا على قولين منهم من قال يمضى فيها ويتمها اربعا ويخفف القراءة ومنهم من قال يعود الى القعدة وكان هذا القائل قاس هذه

لسنة بمسألة باب الحنث۔

وفی الشامية (۲/۲): (قوله ولا يصلی الخ) أقول قال فی البحر فی باب صفة الصلاة: إن ما ذكر مسلم فيما قبل الظهر، لما صرحوا به من أنه لا تبطل شفعة الشفيع بالانتقال إلى الشفع الثانی منها ولو أفسدها قضى أربعا الخ۔

وفی الدر المختار (۲/۱۵۹): (اذا خرج الامام) من الحجرة ان كان والا فقيامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا كلام الى تمامها) وان كان فيها ذكر الظلمة فی الاصح (خلا قضاء فائتة لم يسقط الترتيب بينها وبين الوقتية) فانها لا تكره سراج وغيره لضرورة صحة الجمعة والا لا ولو خرج وهو فی السنة او بعد قيامه لثالثة النفل يتم فی الاصح ويخفف القراءة۔

وفی الشامية (۲/۱۵۹): عزاه فی البحر الى الولوالجية والمبتغی ولم يذكر مسئلة النفل فی الشرنبلالية عن الصغرى وعليه الفتوى۔ قال فی البحر وما فی الفتح من أنه لو خرج وهو فی السنة يقطع على رأس ركعتين ضعيف وعزاه قاضيخان الى النوادر۔

(۲۴۱) شرعی سفر میں سنت ونوافل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر سفر پر جانا ہوتا ہے تو مجھ پر فرائض کے علاوہ سفر کے دوران سنتیں اورنوافل بھی پڑھنا ضروری ہے یا صرف فرائض پر اکتفاء کرنا کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......شرعی سفر میں گاڑی وغیرہ کے نکلنے کا خوف ہو، یا جلدی ہو یا حالتِ سیر (یعنی چلنے کی حالت) ہوتو پھر صرف فرائض کی ادائیگی کافی ہے اور اگر حالتِ نزول (یعنی ٹھہرنے کی حالت) اور امن ہو، جلدی بھی نہ ہو تو اس حالت میں سنت مؤکدہ کا حکم وہی ہے جو حالتِ اقامت میں ہے۔البتہ سنن غیر مؤکدہ اور نوافل پڑھ لینا افضل ہے۔

وفی الهندية (۱/۱۳۹): وبعضهم جوزوا للمسافر ترك السنن والمختار انه لا يأتی بها فی حال الخوف ويأتی بها فی حال القرار والامن۔

وفی الدر المختار (۲/۱۳۱): (ويأتی) المسافر (بالسنن) ان كان (فی حال امن وقرار والا) بأن كان فی خوف وفرار (لا) يأتی بها هو المختار لانه ترك لعذر، تجنيس، قيل الا سنة الفجر۔

وفی الشامية تحته: (قوله ويأتی المسافر بالسنن) ای الرواتب... (قوله هو المختار) وقيل الافضل الترك ترخيصا، وقيل الفعل تقربا، وقال الهندوانی: الفعل حال النزول والترك حال السير...

قلت: والظاهر ان ما فی المتن هو هذا وان المراد بالامن والقرار النزول وبالخوف والفرار

السير لكن قدمنا فی فصل القراء ة أنه عبر عن الفرار بالعجلة لانها فی السفر تكون غالبا من الخوف تامل۔

(۲۴۲) سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ماموں کے گھر کے پاس جو مسجد ہے اس میں ہر نماز کے بعد خصوصاً جن نمازوں کے بعد سنتیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں۔ ان نمازوں میں امام صاحب سنتوں سے فارغ ہوکر اجتماعی دعا کرواتے ہیں اور سب لوگ ان کے ساتھ شریک ہوکر آمین آمین باآواز بلند کہتے ہیں، آنجناب سے اسی مسئلہ کے متعلق یہ معلوم کرنا تھا کہ سنتوں کے بعد اس طرح اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ کہ امام باآواز بلند دعا کرتا ہے اور سارے مقتدی آمین آمین کہتے ہیں اور بعض جگہ اس کو واجب اور اتنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر امام سے دعا میں تاخیر ہوجائے تو اس پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کے نہ کرنے والے پر ملامت کی جاتی ہے یہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔لہٰذا شرعاً سنتوں کے بعد دعا کا اس طرح التزام درست نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لمافی اعلاء السنن (۲۰۵/۳): ورحم الله طائفة من المبتدعة فی بعض اقطار الهند حيث واظبوا على ان الامام ومن معه يقومون بعد المكتوبة بعد قرائتهم اللهم انت السلام ومنك السلام الخ۔

ثم اذا فرغوا من فعل السنن والنوافل يدعوالامام عقب الفاتحة جهراً بدعاء مرة ثانيةً والمقتدون يؤمنون على ذلك وقد جرى العمل منهم بذلك على سبيل الالتزام والدوام حتى ان بعض العوام اعتقدوا ان الدعاء بعد السنن والنوافل باجتماع الامام والمأمومين ضرورى واجب حتى انهم اذا وجدوا من الامام تاخيراً لاجل اشتغاله بطويل السنن والنوافل اعترضوا عليه قائلين: انا منتظرون للدعاء ثانياً وهو يطيل صلاته وحتى ان متولى المساجد يجبرون الامام الموظف على ترويج هذا الدعاء المذكور بعد السنن والنوافل على سبيل الالتزام ومن لم يرض بذلك يعزلونه عن الامامة ويطعنونه ولا يصلون خلف من لايصنع بمثل صنيعهم، وايم الله! ان هذا امر محدث فی الدين... وايضاً ففی ذلك من الحرج مالا يخفى وايضاً فقد مرّ ان المندوب ينقلب مكروهاً اذا رفع عن رتبته لأن التيمن مستحب فی كل شئ من امور العباداة لكن لماخشی ابن مسعودرضی الله عنه ان يعتقدوا وجوبه اشار الى كراهته۔

فكيف بمن اصرّ على بدعة اومنكر؟... كان ذلك بدعة فى الدين محرمة... (وفى ص ٢٠٧) ويستحب ان يستقبل بعده اى بعد التطوع الناس ويستغفرون الله ثلاثاً۔۔۔۔۔ ثم يدعون لانفسهم وللمسلمين رافعى ايدهم الخ فانه لادلالة فيه على قرائة كل ذلك والدعاء بعدها مجتمعين۔

وفى مرقاة المفاتيح(٣/٢٦): وقال الطيبى:وفيه ان من اصر على امر مندوب وجعله عزماً ولم يعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشيطان من الاضلال فكيف من اصر على بدعة او منكر۔

(۲۴۳)دن اور رات میں نفل نمازیں، ان کی تعدادِ رکعات اور ان کے اوقات کا بیان

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مزدور آدمی ہوں اور پہلے نمازوں میں بہت کوتاہی کرتا تھا اب ایک دوست کی دعوت پر تبلیغ میں ایک چلہ لگایا جس سے زندگی میں کافی تبدیلی رونما ہوئی چنانچہ اب پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہوں اور چلہ کے دوران امیر صاحب نے دو نفل نمازیں بتائی تھیں، اشراق اور تہجد اس کے پڑھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔سوال یہ ہے کہ فرض نمازوں کے علاوہ دن رات میں کتنی نفل نمازیں ہوتی ہیں اور ان کے کیا اوقات ہیں اور کتنی کتنی رکعات ادا کی جاتی ہیں؟ جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......دن ورات میں فرض نمازوں کے علاوہ آپ نفل نمازیں جتنی چاہیں پڑھ سکتے ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو البتہ چند نفل نمازیں مخصوص ہیں ان میں:

(۱)۔نماز تہجد ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں ہیں اس کا وقت نصف شب کے بعد شروع ہوتا ہے (سویا ہو یا نہ سویا ہو، ہاں سو کر اٹھنے کے بعد پڑھنا بہتر ہے) صبح صادق تک رہتا ہے۔

(۲)۔اشراق کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار رکعتیں ہیں اس کا وقت طلوعِ آفتاب ہونے کے بعد احتیاطاً پندرہ منٹ بعد شروع ہوتا ہے اور چاشت کی نماز تک رہتا ہے۔

(۳)۔چاشت کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں اس کا وقت بھی مکروہ وقت کے بعد سے شروع ہو کر زوال تک رہتا ہے لیکن افضل ومختار یہ ہے کہ ایک چوتھائی دن گزرنے کے بعد پڑھی جائیں۔

(۴)۔زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعت

(۵)۔عصر کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۶)۔مغرب کی سنتیں پڑھنے کے بعد اوابین کی چھ رکعت

(۷)۔عشاء کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۸)۔صلوۃ التسبیح کی چار رکعت روزانہ دن میں مکروہ وقت کے علاوہ اور رات میں جب بھی پڑھ لی جائیں وگرنہ ہفتے یا مہینے یا سال یا زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لی جائیں۔

(۹)۔دو رکعت تحیۃ الوضو

(۱۰)۔دو رکعت تحیۃ المسجد

(۱۱)۔عشاء کے بعد صلوۃ التوبہ دو رکعت

(۱۲)۔صلوۃ الحاجات دو رکعت

(۱۳)۔دو رکعت صلوۃ الاستخارہ

لمافی الهندية(۱/۱۱۲): ومن المندوبات صلوة الضحیٰ واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها۔

وفی الدر المختار(۲/۲۲): وندب اربع فصاعدا فی الضحیٰ علی الصحیح من بعد الطلوع الی الزوال ووقتها المختار بعد ربع النهار وفی المنية اقلها ركعتان واكثرها اثنی عشر واوسطها ثمان وهو افضلها كما فی الذخائر الاشرفية الخ۔

وفی الهندية (۱/۱۱۲): وندب الاربع قبل العصر والعشاء وبعدها والست بعد المغرب كذا فی الكنز... ومنها (ای المندوبات) تحية المسجد وهی ركعتان ومنها ركعتان عقب الوضوء ومنها صلاة الاستخارة وهی ركعتان ومنها صلاة الحاجة وهی ركعتان ......واما صلوة التسبيح فذكرها فی الملتقط يكبر ويقرأ الثناء ثم يقول سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشرة الخ۔

وفی الدر المختار (۲/۱۳): ويستحب اربع قبل العصر وقبل العشاء وبعدها بتسليمة ... وست بعد المغرب ليكتب من الاوابين بتسليمة اوثنتين او ثلاث والاول ادوم واشق:

وفی الشامية تحته: (قوله من الاوابين) جمع اواب: ای رجاع الی الله تعالیٰ بالتوبة والاستغفار (قوله بتسليمة اوثنتين او ثلاث) جزم بالاول فی الدرر، وبالثانی فی الغزنوية و بالثالث فی التجنيس كمافی الامداد لكن الذی فی الغزنوية مافی التجنيس ... فكان المستحب فيه ثلاث تسليمات ليكون علی نسق واحد قال هذا ماظهرلی ولم اره لغيری۔

وفی الشامية (۱/۳۷۳): واعلم ان الاوقات المكروهة نوعان الاول الشروق والاستواء والغروب والثانی مابين الفجر والشمس وما بين صلوة العصر الی الاصفرار: فالنوع الاول

لاينعقد فيه شئ من الصلوات التی ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأ عليها الا صلاة جنازة حضرت فيها وسجدة تليت آيتها فيها وعصر يومه والنفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنعقد هذه الستة بلا كراهة اصلا فی الاولی منها ومع الكراهة التنزيهية فی الثانية والتحريمية فی الثالثة وكذا فی البواقی لكن مع وجوب القطع والقضاء فی وقت غير مكروه: والنوع الثانی ينعقد فيه جميع الصلوات التی ذكرناها من غير كراهة الاالنفل والواجب لغيره فانه ينعقد مع الكراهة فيجب القطع والقضاء فی وقت غير مكروه اهـ

وفی الدر المختار (۲/۲۴): وصلاة الليل واقلها علی مافی الجوهرة ثمان ولو جعله اثلاثا فالاوسط افضل ولو انصافا فالاخير افضل

وفی الشامية تحته: (قوله ولو جعله اثلاثا الخ) ای لو اراد ان يقوم ثلثة وينام ثلثيه فالثلث الاوسط افضل من طرفيه لان الغفلة فيه اتم والعبادة فيه اثقل ولو اراد ان يقوم نصفه وينام نصفه فقيام نصفه الاخير افضل لقلة المعاصی فيه غالبا الخ۔

(۲۴۴) میت کیلئے بطور ایصالِ ثواب نوافل پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے ان کے جو کپڑے وغیرہ ہیں یہ کپڑے کن کو دینا جائز ہیں مؤذن یا مدرسہ میں اوران کیلئے نوافل پڑھی جائے تو اس کی کیا نیت ہوگی؟

(۲)۔جس وقت یہ نوافل پڑھی جاتی ہے تو اسی وقت کی نسبت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔آپ کے والد صاحب کے کپڑے ان کے ترکے میں شامل ہوں گے یہ تمام ورثاء کی ملکیت ہوں گے البتہ اگر سب ورثاء اپنی رضامندی سے کسی ضرورت مند کو صدقہ کردیں تو درست ہے بشرطیکہ ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

(۲)۔عام نفل کی طرح نیت کر کے میت کو ایصالِ ثواب کریں، اس وقت کی طرف منسوب کرنا ضروری نہیں، اس کے علاوہ کسی مدرسہ میں یا محتاج کو صدقہ وغیرہ کر کے بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۷۷۲۶): التركة لغة مايتركه الشخص ويبقيه، واصطلاحاً عند الحنفية الاموال والحقوق المالية التی كان يملكها الميت فتشمل الاموال المادية من عقارات ومنقولات وديون علی الغير .والحقوق العينية التی ليست مالاً، ولكنها تقوم بمال أو تتصل به۔

وفی الشامیة (۲/۲۴۳): تنبیه: صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلاة أو صوماً أو صدقة أوغیرها کذا فی الهدایة، بل فی زکاة التتارخانیة عن المحیط: الافضل لمن یتصدق نفلاً أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لانها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شئ اھ هو مذهب اهل السنة والجماعة۔

وفی الدرالمختار (۱/۴۱۷): ولا عبرة بنیة متأخرة عنها علی المذهب وجوزه الکرخی رحمه الله الی الرکوع و کفی مطلق نیة الصلاة وان لم یقل لله لنفل وسنة راتبة وتراویح علی المعتمد اذ تعیینها بوقوعها وقت الشروع. والتعیین احوط. ولا بد من التعیین عند النیة

وفی الشامیة تحته: (قوله وکفی الخ) أی بان یقصد الصلوة بلا قید نفل أو سنة أو عدد (قوله لنفل) هذا بالاتفاق۔

(۲۴۵) نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھ لی تو اب میں کیا کروں، نماز کو دوبارہ لوٹا دوں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو، اور زبان سے تلفظ کرنا اگرچہ مستحسن ہے مگر نماز کے صحیح ہونے کیلئے شرط نہیں، اس لئے دل کے ارادے کا اعتبار ہوگا۔ لہٰذا اگر نیت سے مقصود فرض نماز تھی لیکن غلطی سے زبان سے نفل نکل گیا تو اس سے نماز کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ دل کے قصد کا اعتبار کر کے نماز کو درست کہا جائے گا۔

لمافی الهندیة (۱/۶۵): (الفصل الرابع فی النیة) النیة ارادة الدخول فی الصلواة والشرط ان یعلم بقلبه ای صلاة یصلی وادناها مالو سئل لامکنه ان یجیب علی البدیهة وان لم یقدر علی ان یجیب الا بتامل لم تجز صلاته ولا عبرة للذکر باللسان۔

وفی الشامیة (۱/۴۱۵): (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهواً اجزأه کما فی الزاهدی قهستانی۔

(۲۴۶) سنت نماز یا دوگانہ نماز کے تحیۃ المسجد وتحیۃ الوضو کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی چار سنتیں پڑھ کر مسجد میں جائے تو تحیۃ المسجد پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان چار رکعت کے بعد تحیۃ الوضو پڑھنا کیسا ہے؟ اسی طرح تحیۃ الوضو وتحیۃ المسجد دونوں کی نیت کر کے صرف دو رکعت پر

اکتفا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ظہر کی سنتیں پڑھ کر مسجد پہنچنے کے بعد اگر وقت باقی ہو تو تحیۃ المسجد پڑھنا درست ہے۔تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو دونوں کے لئے ایک نماز کافی ہے، بلکہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ المسجد ادا ہو جائے گی اسی طرح وضو کرنے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ الوضو ادا ہو جائے گی۔

لمافی الدر المختار(۲۲/۲): (وندب رکعتان بعد الوضوء) یعنی قبل الجفاف، کما فی الشرنبلالية عن المواهب۔

وفی الشامية تحته: (قوله وندب رکعتان بعد الوضو)... وانظر هل تنوب عنهما صلاة غيرهما کالتحية ام لا؟ ثم رأيت فی شرح لباب المناسك ان صلاة رکعتی الاحرام سنة مستقلة کصلاة استخارة وغيرها مما لا تنوب الفريضة منا بها بخلاف تحية المسجد وشکر الوضوء فانه ليس لهما صلاة علی حدة کما حققه فی الحجة۔

(۲۴۷) سنت اور نفل نماز گھر میں پڑھنا لازمی نہیں، بلکہ افضل ہے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چار بھائی ہیں سب سے بڑا بھائی سعودیہ میں رہتا ہے اور سال، دو سال بعد گھر آتے ہیں حال ہی میں وہ سعودیہ سے آئے جب نماز کا وقت ہو گیا ہم مسجد چلے گئے جماعت سے فارغ ہو کر وہ گھر واپس آئے اور میں نے سنت اور نفل وہاں مسجد میں پڑھی جب میں گھر آیا تو اس نے مجھے تاکید کی کہ فرض نماز مسجد میں ادا کیا کریں اور باقی تمام سنت اور نوافل گھر پر ادا کیا کرو کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور اپنے گھروں میں نماز ادا کرو، لہٰذا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان اپنے بھائی جان کی زبانی سنا تو میں بھی اسی پر عمل کرتا ہوں جس کا مجھے حکم ملا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی نہیں بلکہ افضل ہے حدیث شریف میں ہے کہ "آدمی کا سوائے فرض نمازوں کے باقی نمازیں گھر میں پڑھنا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے" بشرطیکہ سنت اور نفل پڑھنے کیلئے گھر لوٹ کر جانے سے نمازی کو کسی کام میں مشغول ہو جانے کا خوف نہ ہو، گھر میں نماز پڑھنے سے نمازی کے خشوع وخضوع میں کمی واقع ہونے کا خوف نہ ہو تو گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد ہی میں پڑھنا چاہیے۔

لمافی اعلاء السنن(۶۵/۷): والامر للاستحباب لان الاجازة وردت فی التطوع فی المسجد ايضاً کما يدل عليه الحديث الثانی من الباب وسيأتی تقريره قال المؤلف: النوافل التی فيها الجماعة مستثناة من هذا العموم. وکذلك تحية المسجد للاحاديث التی وردت فيها۔

قوله عن انس الخ' قال المؤلف دلالته على الجزء الثانى من الباب كماقرره النووى ونصه: وفيه جواز النفل فى المسجد. فانها كانت تصلى النافلة فيه فلم ينكر عليها۔(۲۶۶/۱)

وفى الهندية(۱۱۳/۱): الافضل فى السنن والنوافل المنزل لقوله عليه السلام صلاة الرجل فى المنزل افضل الا المكتوبة الخ۔

وذكر الحلوانى الافضل ان يوڈى كله فى البيت الا التراويح ومنهم من قال يجعل ذلك احيانا فى البيت والصحيح ان كل ذلك سواء فلا تختص الفضيلة بوجه دون وجه ولكن الافضل ما يكون ابعد من الرياء واجمع للاخلاص والخشوع كذا فى النهاية۔

وفى الشامية(۲۲/۲): (قوله والافضل فى النفل الخ) شمل ما بعد الفريضة وما قبلها، لحديث الصحيحين "عليكم الصلاة فى بيوتكم فان خير صلاة المرء فى بيته الا المكتوبة" واخرج ابو داؤد "صلاة المرء فى بيته افضل من صلاته فى مسجدى هذا الا المكتوبة" وتمامه فى شرح المنية وحيث كان هذا افضل يراعى مالم يلزم منه خوف شغل عنها لوذهب لبيته، او كان فى بيته ما يشغل باله ويقلل خشوعه فيصليها حينئذ فى المسجد لان اعتبار الخشوع ارجح

(قوله غير التراويح) اى لانها تقام بالجماعة ومحلها المسجد، واستثنى فى شرح المنية ايضا تحية المسجد وهو ظاهر۔

(۲۴۸)نفل نماز میں قراءۃ سبعہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے لاہور سے قرأت سبعہ مکمل پڑھ لی جس میں ہمیں بعض قرأت شاذہ بتاتے ہیں بعض مشہورہ اور بعض متواترہ میرا ارادہ ہوا کہ ہرایک قرأت میں نوافل میں ختم کروں لیکن مسائل سے ناواقف ہوں میں نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ نیکی کے بجائے گناہ سرلوں، اس لئے آپ سے التماس ہے کہ میری رہنمائی فرمائیں کہ میں اس طرح پڑھ سکتا ہوں میری نماز میں تو کوئی خلل نہ آئے گا اس لئے کہ اگران کو نماز میں پڑھنا گناہ ہو، اس سے باز رہوں لیکن ساتھ ذہن میں خدشہ ہوتا ہے جب ان سے نماز فاسد ہوتی پھران کو پڑھنا کیسے جائز ہوگا قراءاس کی تعلیم بھی نہ دیں؟ اسی طرح قاری عاصم کوفی کے علاوہ دیگر ائمہ کی قرأت کو پڑھنا نماز میں کیسا ہے؟ جلد جواب عنایت فرمائیں بندہ اپنے معمولات شروع کرنے کیلئے آپ کے جواب کا منتظر ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......قراءۃ سبعہ نماز میں پڑھنا جائز ہے۔البتہ جماعت کی نماز میں امام نہ پڑھے اور یہ کہ جماعت کی نماز میں عام لوگوں کا قرأت کے بارے میں تشویش میں پڑھنے کا قوی اندیشہ ہے عام لوگ اس بارے میں جاہل ہوتے ہیں۔ایک

قرأت مشہورہ کے علاوہ دوسری قراءتوں کا ان کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر وہ دوسری قرأت سنیں گے۔ تو بعض مرتبہ جہالت کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قرأت ہونے کا انکار کردیتے ہیں، یا مذاق اڑانا شروع کردیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے جماعت کی نماز میں قرأت مشہورہ (روایت حفصؒ) میں تلاوت کرے۔ ہاں اگر دوسری قرأت پڑھنا چاہے تو نفل نماز میں پڑھ سکتے ہیں، ان قرأت کے پڑھانے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس کے پڑھانے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اجر وثواب ملے گا اور یہ قرأت سبعہ فصیح اور صحیح ہیں۔

لمافی الهندية(۱/۷۹): وفی الحجة قرائة القرآن بالقرا آت السبعة والروايات كلها جائزة ولكنى أرى الصواب أن لا يقرأ القرأة العجيبة بالإمالات والروايات الغريبة۔

وفي الدر المختار (۱/۵۴۱): ويجوز بالروايات السبع، لكن الأولى ان لا يقرأ بالغريبة عند العوام صيانةً لدينهم

وفي الشامية تحته: أى بالروايات الغريبة والإمالات، لأن بعض السفهاء يقولون مالا يعلمون فيقعون فى الإثم والشقاء ولا ينبغى للأئمة أن يحملوا العوام على مافيه نقصان دينهم، ولا يقرأ عندهم مثل قرائة ابي جعفر وابن عامر وعلى بن حمزة والكسائى صيانة لدينهم فلعلهم يستخفون أو يضحكون وإن كان كل القراء ات والروايات صحيحة: فصيحة ومشائخنا اختار واقراء ة أبي عمرو حفص عن عاصم۔

وفى حاشية الطحطاوى على الدر (۱/۲۳۶): (قوله ويجوز بالروايات السبع) لاوجه للتقييد بالسبع بل يجوز الى العشر كما نص عليه اهل الأصول (قوله صيانةً لدينهم) لأن بعض السفهاء ربما يقع فى الإثم فلا يقرأ عند العوام بقرائة أبي جعفر وابن عامر وحمزة و الكسائى صيانةً لدينهم فربما يستخفون أو يضحكون وإن كانت كلها صحيحة فصيحة ومشائخنا اختار واقراء ة أبي عمرو وحفص عن ابن عامر أبو السعود عن شارح المنية۔

(۲۴۹) بغیر عذر کے نوافل نہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری دلی خواہش تھی کہ میرا کوئی بیٹا عالم بن جائے تو میں نے ایک بیٹے کو پڑھنے کیلئے کراچی بھیج دیا وہ اس سال فراغت حاصل کرکے مفتی بن رہا ہے جب وہ گھر آتا ہے تو نمازوں کے وقت صرف فرائض وسنن پڑھ کر چلا جاتا ہے نوافل نہیں پڑھتا اور کہتا ہے نوافل لازمی نہیں ہیں پڑھو تو ثواب ہے نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا واقعی اس کی بات صحیح ہے کہ نوافل لازم نہیں اگر کوئی بغیر عذر کے نوافل چھوڑ دے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نوافل اور مستحبات کی دین میں بڑی اہمیت ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرائض کی کمی بیشی کو پورا فرمادیں گے اور ان میں سستی بھی نہیں کرنی چاہیے تاہم اگر کوئی نوافل کو بغیر عذر کے بھی ترک کرتا ہے تو وہ قابل عتاب اور مواخذہ نہیں۔لہٰذا آپ کے بیٹے کی بات درست ہے۔

لمافی ردالمحتار(۱/۱۰۲): اعلم ان المشروعات اربعة اقسام. فرض وواجب وسنة ونفل فما كان فعله اولى من تركه مع منع الترك ان ثبت بدليل قطعي ففرض او بظني فواجب. وبلا منع الترك ان كان مما واظب عليه الرسول ﷺ أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة والا فمندوب ونفل والسنة نوعان: سنة الهدى، وتركها يوجب اساءة وكراهية كالجماعة والاذان والاقامة ونحوها۔ وسنة الزوائد وتركها لايوجب ذالك كسير النبى عليه الصلوٰة والسلام فى لباسه وقيامه وقعوده. والنفل ومنه المندوب يثاب فاعله ولا يسيئى تاركه، قيل وهو دون سنن الزوائد۔

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۰۵۵): ’’فصلاة التطوع: هى ما طلب فعلها من المكلف زيادة على الفرائض طلباً غير جازم، وتكمل به صلاة الفرض يوم القيامة. ان لم يكن المصلى اتمها. وفيه حديث صحيح مرفوع رواه احمد فى المسند…وحكمها: أنه يثاب على فعلها ولايعاقب على تركها‘‘۔

(۲۵۰)اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک طالبعلم ہوں درجہ ثانیہ میں پڑھتا ہوں اللہ کے فضل سے تہجد، اشراق اور اوابین کا اہتمام کرتا ہوں لیکن پڑھائی کی وجہ سے چاشت ادا نہیں کر پاتا چونکہ اساتذہ کرام چھٹی نہیں دیتے ۔ جمعرات اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا آپ چاشت کو اشراق کے ساتھ ادا کرلیا کرو۔ چونکہ وہ عالم نہیں ہیں اس لئے ان کی بات سے دل مطمئن نہیں ہوا، اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اشراق اور چاشت دونوں نمازوں کا وقت ایک ہے، البتہ سورج نکلنے کے فوراً بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے بعض حضرات نے اس کو اشراق کہا ہے۔اور جو تھوڑی دیر بعد جبکہ سورج بلند ہوجائے پڑھی جاتی ہے اس کو چاشت کہا ہے۔لہٰذا اشراق اور چاشت کو ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے۔

لمافى الهندية (۱/۱۱۲): (ومن المندوبات صلوٰة الضحى) واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها۔

وفی الدر المختار(۲/۲۲): (و) ندب (اربع فصاعدا فی الضحی) علی الصحیح من بعد الطلوع الی الزوال، ووقتها المختار بعد ربع النهار۔

وفی الشامیة تحته: (قوله من بعد الطلوع) عبارة شرح المنیة من ارتفاع الشمس۔ (قوله ووقتها المختار) ای الذی یختار ویرجح لفعلها وهذاعزاه فی شرح المنیة الی الحاوی، وقال: لحدیث زید بن ارقم ان رسول الله ﷺ قال ((صلاة الاوابین حین ترمض الفصال'' رواه مسلم۔ وترمض بفتح التاء والمیم ای تبرك من شدة الحر فی اخفافها اھ۔

(۲۵۱) کیا عورت اپنے گھر میں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے اس جمعرات کو ہمارے محلے کی مسجد میں بیان فرمایا جس کے اندر مرد اور خواتین کی اکثریت نے شرکت کی مولانا صاحب نے فرمایا کہ جب انسان مسجد آئے تو وضو کرنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ اس کے انہوں نے کافی فضائل سنائے تو محلے کی عورتیں فضائل سن کر پڑھنے کو تیار ہوگئیں لیکن ان کو علم نہیں کہ عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟ یا صرف یہ نمازیں مردوں کیلئے ہیں۔ آپ حضرات صحیح رہنمائی فرمائیں کہ عورتیں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......جس طرح مرد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں البتہ خوف وفتنہ کی وجہ سے عورت کا مسجد میں جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے تو گھر میں جو جگہ نماز کیلئے مخصوص کی ہو جس طرح اس میں اعتکاف کیلئے بیٹھ سکتی ہے اسی طرح اگر اس جگہ میں تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں تو انشاء اللہ اجر ملے گا اور تحیۃ الوضوء کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اس لئے عورت بھی تحیۃ الوضوء پڑھ سکتی ہے۔

لمافی مسند احمد(۷/۴۲۱): عن ام سلمة(رضی الله تعالیٰ عنها) عن رسول الله ﷺ أنه قال ''خیر مساجد النساء قعر بیوتهن''۔

وفی الهندیة(۱/۱۱۲): (ومن المندوبات صلاة الضحی) الی ان قال (ومنها) تحیة المسجد وهی رکعتان (ومنها) رکعتان عقیب الوضوء۔

وفی الدر المختار مع الشامیة(۲/۱۸،۱۹): (ویسن تحیة) رب (المسجد وهی رکعتان وأداء الفرض) أو غیره وکذا دخوله بنیة فرض أو اقتداء وتکفیه لکل یوم مرة ولا تسقط بالجلوس عندنا بحر۔

وفیه ایضاً(۲۲): (قوله وندب رکعتان بعد الوضوء) لحدیث مسلم ''ما من أحد یتوضاء فیحسن الوضوء ویصلی رکعتین یقبل بقلبه ووجهه علیهما الا وجبت له الجنة'' خزائن۔

(۲۵۲) بیٹھ کر نوافل پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہو کر؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر پرانے وقت کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ظہر کے بعد مغرب کے بعد اسی طرح عشاء کے بعد کے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے یا بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب برابر ملے گا؟ حالت صحت اور بیماری میں حکم یکساں ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... نفل نماز میں شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ عام حالات میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں پورا ثواب ملتا ہے اور بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب کم ہوگا۔ اس کے برخلاف بیماری کی حالت میں آدمی کو اپنی عبادت کا پورا ثواب ملتا ہے۔ خواہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرے یا بیٹھ کر یا جس طرح ممکن ہو، اور اگر مریض تحمل مشقت کرتے ہوئے کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے تو ایسی صورت میں اس مریض کو مشقت برداشت کرنے پر جو کامل اجر وثواب ملے گا، اسی طرح کا مریض اگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کو کھڑے ہونے والے مریض کی بہ نسبت آدھا ثواب ملے گا جو کہ عام تندرست آدمی کی کامل نماز کے پورے ثواب کے برابر ہوگا۔ اور عذر کی وجہ سے اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

لمافی فتح الباری (۴۶۷/۲): قال: قال الخطابي كنت تأولت هذا الحديث على ان المراد به صلاة التطوع يعني للقادر لكن قوله من صلى نائما يفسده لان المضطجع لايصلي التطوع كما يفعل القاعد، لانى لا احفظ عن احد من اهل العلم انه رخص فى ذلك... وقد رأيت الآن ان المراد بحديث عمران المريض المفترض الذى يمكنه ان يتحامل فيقوم مع مشقة فجعل اجر القاعد على النصف من اجر القائم ترغيباً له فى القيام مع جواز قعوده... فمن صلى فرضا قاعدا وكان يشق عليه القيام اجزأه وكان هو ومن صلى قائما سواء كما دل عليه حديث انس رضی اللہ عنہ وعائشة رضى الله عنها فلو تحامل هذا المعذور وتكلف القيام ولو شق عليه كان أفضل لمزيد اجر تكلف القيام فلا يمتنع ان يكون اجرہ على ذلك نظير اجره على الصلاة فيصح ان اجر القاعد على النصف من اجر القائم ومن صلى النفل قاعدا مع القدرة على القيام اجزأه وكان اجرہ على النصف من اجر القائم بغير اشكال الخ۔

وفى اعلاء السنن(۱۲۵،۱۲۶،۱۲۷/۶): اجعلوا اخر صلوتكم من الليل وترا الخ... وقد ورد مايخالفه ايضاً ففى صحيح مسلم فى حديث طويل ثم يصلى النبى صلی اللہ علیہ وسلم بعد الوتر ركعتين بعد ما يسلم وهو قاعد۔ واخرج الدار قطنى فى سننه عن ام سلمة رضى الله عنها ان النبى صلی اللہ علیہ وسلم كان يصلى

رکعتین خفیفتین بعد الوتر وهو جالس... واخرج الدارمی والطحاوی والدار قطنی واللفظ لهما عن ثوبان مولی رسول الله ﷺ قال کنا مع رسول الله ﷺ فی سفر فقال ''ان السفر جهد وثقل فاذا اوتر احد کم فلیرکع رکعتین فان استیقظ والا کانتا له، وفی التعلیق المغنی اسناده جید وفی آثار السنن اسناده حسن ... وأخرج الطحاوی عن ابی امامة رضی الله عنه'' ان النبی ﷺ کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما، اذا زلزلت وقل یآیها الکٰفرون، واسناده حسن:

والتطبیق بینهما وبین حدیث الباب بوجوه منها ماذکره الحافظ فی الفتح بما نصه، وقد ذهب الیه (ای الی مشروعیة التنفل بعد الوتر)بعض اهل العلم وجعلوا الامر فی قوله اجعلوا اخر صلاتکم من اللیل وتراً۔ مختصاً بمن اوتر آخر اللیل۔ وقال العبد الضعیف: معناه اوتروا فی اللیل مرة لامرتین لتکون اخر صلوتکم باللیل وترا فان من اوتر مرتین فقد جعل آخر صلاته باللیل شفعاً... وحمل بعضهم حدیث الرکعتین بعد الوتر علی الجواز، وامر الایتار اخر اللیل علی الاستحباب...

قال النووی فی شرح مسلم هذا الحدیث (ای حدیث الرکعتین بعد الوتر) اخذ بظاهره الاوزاعی واحمد فیما حکاه القاضی عنهما۔ فأباحا رکعتین بعد الوتر جالساً... قلت والصواب ان هاتین الرکعتین فعلهما علیه السلام بعد الوتر جالسا لبیان جواز الصلاة بعد الوتر، وبیان جواز النفل جالسا، ولم یواظب علی ذلک بل فعله مرة او مرتین او مرات قلیلة۔ وانما تأولنا حدیث الرکعتین جالسا لان الروایات المشهورة فی الصحیحین وغیرهما عن عائشة مع روایة خلائق من الصحابة فی الصحیحین مصرحة بان اخر صلاته ﷺ فی اللیل کان وتراً۔ وفی الصحیحین احادیث کثیرة مشهورة بالامر بجعل اخر صلاة اللیل وترا فکیف یظن به علیه السلام مع هذه الاحادیث واشباهها انه یداوم علی الرکعتین بعد الوتر ویجعلهما اخر صلاة اللیل؟

وانما معناه ماقدمناه من بیان الجواز وهذا الجواب هو الصواب۔

(۲۵۳) بیٹھ کر نماز پڑھنے میں آدھے ثواب کا حکم فرائض یا نوافل سب میں ہے یا صرف نوافل میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے اگر معذوری نہ ہوتو؟ مثلاً ایک شخص بخار کی حالت میں ہے یا بدن، ہاتھ میں اچھا خاصا درد ہو، یا تھکاوٹ بہت لگ رہی ہو، اس صورت میں

بھی نماز کھڑے ہوکر پڑھنی چاہیئے، کیا صرف فرض نماز میں ثواب آدھا ہوجاتا ہے یا سنت اور نفل میں بھی آدھا ہوجاتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......فرض نماز میں رکوع اور سجدہ کی طرح قیام بھی فرض ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر عذر کے فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی اور اگر کوئی شخص معذور ہو، مثلاً قیام پر قدرت نہ رکھتا ہو، یا قیام کرنے سے بیماری بڑھنے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اس کو نماز کا پورا ثواب ملے گا، البتہ نوافل مین قیام فرض نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر نفل پڑھے گا تو اس کو نماز کا آدھا ثواب ملے گا اور اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھے گا تو پورا ثواب ملے گا۔

لمافی الصحیح لمسلم(۲۵۳/۱): وعن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه قال: حدثت أن رسول الله ﷺ قال صلوة الرجل قاعداً نصف الصلاة، قال فأتيته فوجدته يصلى جالسا فوضعت يدى على رأسه فقال: مالك يا عبدالله بن عمرو قلت حدثت يا رسول الله أنك قلت ''صلوة الرجل قاعدا على نصف الصلاة'' وأنت تصلى قاعدا قال اجل ولكنى لست كأحد منكم

وفی جامع الترمذی(۸۵/۱): (باب ماجاء ان صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم) عن عمران بن حصين قال سألت رسول الله ﷺ عن صلاة الرجل وهو قاعد فقال من صلى قائما فهو افضل ومن صلاها قاعدا فله نصف أجر القائم ....وقال سفيان الثورى فى هذا الحديث من صلى جالسا فله نصف أجر القائم قال هذا للصحيح ولمن ليس له عذر فأما من كان له عذر من مرض أوغيره فصلى جالسافله مثل أجرالقائم۔

وفی الشامية (۴۴۵/۱): (قوله القادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر أو حكما كما لوحصل له به ألم شديد أوخاف زيادة المرض وكالمسائل الآتية فى قوله وقد يتحتم القعود الخ فإنه يسقط۔

(۲۵۴) سنت فجر گھر میں پڑھ کر آنے والے کیلئے تحیۃ المسجد کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں گھر میں پڑھے اور پھر مسجد میں آئے تو کیا وہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تمام سنتوں کی طرح سنت فجر بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے اور طلوع فجر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا جو شخص گھر میں سنت فجر پڑھ کر مسجد آئے تو اس کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنا درست نہیں بلکہ اسے چاہیئے کہ تیسرا کلمہ اور درود شریف پڑھے یہ پڑھنے سے اسے تحیۃ المسجد پڑھنے کا ثواب مل جائے گا اور اگر مسجد میں آتے ہی فرض نماز میں مشغول ہوگیا تو پھر فرض نماز تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہوجائے گی اگر چہ اس نے تحیۃ المسجد کی نیت نہ کی ہو۔

لمافی قاضی خان(۳۶/۱): وركعتى الطواف وتحية المسجد أولم يكن لها سبب بعد طلوع الفجر

قبل صلوة الفجر لايجوز إلا سنة الفجر وبعد الفريضة قبل طلوع الشمس۔

وفی الهندية(۵۲/۱): منها مابعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر كذا فی النهاية والكفاية يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر۔

وفی الشامية(۱۸/۲): وركعتان أو اربع وهی أفضل لتحية المسجد الا اذا دخل فيه بعد الفجر أو العصر فإنه يسبح ويهلل ويصلی علی النبی ﷺ فإنه حينئذ يؤدی حق المسجد كما اذا دخل للمكتوبة فانه غير ما مور بها حينئذ كمافی التمرتاشی۔

(۲۵۵) تہجد کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی کم تعداد کتنی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم سے کم تہجد کتنی رکعات پڑھیں، دو یا چار رکعات تہجد ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... تہجد کی اقل مقدار کی احادیث میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اقل مقدار دو رکعت ہے۔

لمافی الشامية(۲۵/۲): وهذا بناء علی ان اقل تهجده ﷺ كان ركعتين وان منتهاه كان ثمانی ركعات الی ان قال اقول فينبغی القول بان اقل التهجد ركعتان واوسطه اربع واكثره ثمان۔

(۲۵۶) صلاۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں انہوں نے میری درخواست قبول کر لی اور مجھے کچھ معمولات بتائے جن میں سے ایک صلوٰۃ التسبیح بھی ہے، انہوں نے فرمایا کہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح ضرور پڑھا کرو اب مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ اب آپ حضرات اس کے پڑھنے کا طریقہ بتادیں نیز یہ بھی بتائیں کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... صلاۃ التسبیح بڑی اہم نماز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ نماز بڑی تاکید کے بعد بطور تحفہ سکھائی تھی۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر یہ دلیل ہے کہ تبع تابعین کے زمانہ سے ہمارے زمانہ تک مقتداء حضرات اس پر مداومت کرتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں۔ یہ چار رکعات والی نماز ہے جس میں تین سو مرتبہ تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔

۱...... نیت: چار رکعت صلوۃ التسبیح کی نماز پڑھ رہا ہوں ''اللہ اکبر'' پھر ہاتھ ناف کے نیچے باندھ لے اور حسب معمول ثناء پڑھے، ثناء یہ ہے:

"سبحانك اللهم وبحمدك، وتبارك اسمك وتعالى جَدُّك، ولا إله غيرك"

پھر أعوذ بالله من الشيطان الرجيم اور بسم الله الرحمٰن الرحيم پڑھ کر سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھے پھر پندرہ مرتبہ یہ تسبیح پڑھے:

"سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر"

۲...... رکوع میں جانے کے بعد حسب معمول تین مرتبہ "سبحان ربي العظيم" پڑھے پھر دس مرتبہ مذکورہ بالا تسبیح پڑھے اس کے بعد رکوع سے اٹھے۔

۳...... رکوع سے اٹھتے ہوئے پہلے حسب معمول "سمع الله لمن حمده" کہے اور کھڑا ہو کر "ربنا لك الحمد" کہے پھر کھڑے کھڑے دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھے۔

۴...... پھر "الله أكبر" کہتے ہوئے سجدے میں جائے اور حسب معمول "سبحان ربي الأعلى" تین مرتبہ پڑھے پھر سجدے میں دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھے اس کے بعد "الله أكبر" کہہ کر سجدے سے اٹھے۔

۵...... سجدے سے اٹھ کر بیٹھے اور بیٹھے بیٹھے دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھے پھر "الله أكبر" کہہ کر دوسرے سجدے میں جائے۔

۶...... دوسرے سجدے میں جا کر حسب معمول پہلے "سبحان ربي الأعلى" تین مرتبہ پڑھے پھر سجدے میں دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھے۔

۷...... دوسرے سجدے کے بعد بیٹھ کر مذکورہ بالا تسبیح دس مرتبہ پڑھے، پھر دوسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے۔

اس طرح ایک رکعت میں پچھتر (۷۵) مرتبہ یہ تسبیحات پڑھی گئیں اسی طرح باقی تین رکعتیں بھی پڑھ لے۔ یوں چار رکعتوں میں کل تین سو تسبیحات ہو جائیں گی دوسری اور چوتھی رکعت کے قعدے میں یہ تسبیحات التحیات پڑھنے کے بعد پڑھے۔

٭...... حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک اور طریقہ بھی ثابت ہے، وہ طریقہ یہ ہے:

''نیت باندھنے کے بعد ثناء پڑھے اور اس کے بعد پندرہ مرتبہ یہ تسبیحات پڑھے پھر أعوذ باللہ، بسم اللہ، سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کی قراءت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے ان تسبیحات کو دس مرتبہ پڑھے پھر دوسرے سجدے تک دس دس مرتبہ پڑھتا رہے، دوسرے سجدے سے اٹھتے ہوئے ان تسبیحات کو نہ پڑھے بلکہ سجدے سے براہ راست ''اللہ اکبر'' کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہو جائے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان دونوں طریقوں سے صلوۃ التسبیح پڑھنی چاہیئے کبھی پہلے طریقے سے کبھی دوسرے طریقے سے۔ یہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سکھائی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہے یا نہیں یہ بات تتبع کے باوجود نہیں مل سکی۔

لمافی المشکوۃ (ص۱۱۷): صلوۃ التسبیح ۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للعباس بن عبدالمطلب یا عباس یا عماہ الا اعطیك الا امنحك الا اخبرك الا افعل بك عشر خصال اذا انت فعلت ذالك غفراللہ لك ذنبك اوله واخره قدیمه وحدیثه خطأه وعمده صغیره وكبیره سره وعلانیته ان تصلی اربع ركعات تقرء فی كل ركعة فاتحة الكتب وسورة فاذا فرغت من القرائة فی اول ركعة وانت قائم قلت سبحان اللہ والحمد للہ ولا اله الا اللہ واللہ اكبر خمس عشرة مرة ثم تركع فتقولها وانت راكع عشرا ثم ترفع راسك من الركوع فتقولها عشرا ثم تهوی ساجدا فتقولها وانت ساجد عشراً ثم ترفع راسك من السجود فتقولها عشرا ثم تسجد فتقولها عشرا ثم ترفع راسك فتقولها عشرا فذالك خمس وسبعون فی كل ركعة تفعل ذالك فی اربع ركعات ان استطعت ان تصلیها فی كل یوم مرة فافعل۔۔الخ۔

وفی مرقاۃ المفاتیح(۳/۳۷۷): وینبغی للمتعبد ان یعمل بحدیث ابن عباس تارة ویعمل بحدیث ابن مبارك أخری۔

(۲۵۷) صلوٰۃ التسبیح میں چھوٹ جانے والی تسبیح کو دوسرے رکن میں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح پڑھا کرو میں نے معمول بنالیا کہ جمعہ والے دن اذان کے فوراًبعد پڑھا کروں گا اس جمعہ کو میں نے پڑھنا شروع کی تو پہلی رکعت میں رکوع سے اٹھنے کے بعد کی تسبیحات بھول گیا پھر میں نے سجدے میں دوگنی پڑھ دیں گویا کہ تین سو تعداد مکمل ہوگئی آیا میری نماز صحیح ہوگئی یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہوگا صلوٰۃ التسبیح میں تسبیحات پڑھنا واجب ہیں یا مسنون یا مستحب ان کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صلوٰۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے اور احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے جن کی تعداد چار رکعات میں ۳۰۰ بنتی ہے اور اس میں اصل مطلوب ۳۰۰ کا عدد پورا کرنا ہے اور ان تسبیحات کا پڑھنا مسنون عمل ہے اگر کسی سے ایک رکن میں تسبیح ادا کرنا رہ گئی تو وہ دوسرے رکن میں دگنی ادا کر کے تعداد پوری کرسکتا ہے پس صورت مسئولہ میں جب آپ نے رکوع سے اٹھنے کی تسبیحات کو سجدے میں ادا کرلیا تو تسبیحات کی تعداد مکمل ہوگئی اس لیے آپ کی نماز درست ہے دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لمافی الھندیة(۱/۱۱۲): (ومن المندوبات)... واما صلوة التسبیح فذكرها فی الملتقط یكبرو یقرأ الثناء ثم یقول سبحان اللہ والحمدللہ ولا اله الا اللہ واللہ اكبر خمس عشر مرة ثم یتعوذ ویقرأ فاتحة الكتاب وسورة ثم یقرأ هذه الكلمات عشرا وفی الركوع عشرا وفی القیام عشرا وفی كل

سجدة عشرا وبين السجدتين عشرا ويتمها اربع ركعات۔

وفی الشامية(۲/۲۷): والطعن فی ندبها بأن فيها تغييرا لنظم الصلوة انما يتاتی علی ضعف حديثها فاذا ارتقی الی درحة الحسن اثبتها۔۔۔ قال الملا علی فی شرح المشكاة مفهومه انه سها ونقص عددا من محل معين ياتی به فی محل آخر تكملة للعدد المطلوب قلت و استفيد انه ليس له الرجوع الی المحل الذی سها فيه وهو ظاهر وينبغی كما قال بعض الشافعية ان ياتی بما ترك فيما يليه ان كان غير قصير فتسبيح الاعتدال ياتی به فی السجود اما تسبيح الركوع فياتی به فی السجود ايضا لافی الاعتدال لانه قصير قلت وكذا تسبيح السجدة الاولی ياتی به فی الثانية لافی الجلسة لان تطويلها غير مشروع عندنا علی مامر فی الواجبات۔

(۲۵۸) مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا حکم

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ(۱).....اکثر لوگ عموماً مغرب کی دوسنت کے بعد دورکعت نفل پڑھتے ہیں، آیا مغرب کی دوسنت کے بعد دورکعت نفل پڑھنا مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے یانہیں؟

(۲).....صلوٰۃ الاوابین کی کل کتنی رکعت ہیں فرض کے بعد والی دورکعت سنت کو بھی صلوٰۃ الاوابین میں شمار کرسکتے ہیں یانہیں مثلاً دورکعت سنت کے ساتھ چاررکعت اور ملالیں تو چھ رکعت صلوٰۃ الاوابین بن گئی یادورکعت سنت کے علاوہ چھ رکعت پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔نمازِ مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا پڑھنا یقیناً باعث اجر وثواب ہے، جیسا کہ متعدد روایات میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن سنتوں کی ادائیگی کے بعد دورکعت نفل پڑھنے کو مسنون قرار دینے کی صراحت بندہ کو نہ مل سکی البتہ مستحب کہہ سکتے ہیں۔

(۲)۔متعدد روایات میں صلاۃ الاوابین کی رکعات کی تعداد چھ(۶) ملتی ہے اگرچہ اس سے کم وبیش کی بھی صراحت موجود ہے۔ چنانچہ افضل صورت یہی ہے کہ دورکعت سنت مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد چھ(۶) رکعت صلاۃ الاوابین کی مستقل ادائیگی کی جائے البتہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے چاررکعت پر اکتفا کر کے دورکعت سنت مؤکدہ کو بھی ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔

لما فی كنز العمال(۷/۳۸۶):۱۹۴۲۱۔ من صلی بعد المغرب ركعتين قبل أن يتكلم كتبتا فی عليين۔

وفيه ايضاً(۷/۳۹۲): ۱۹۴۵۱۔ من صلی أربع ركعات بعد المغرب كان كمن عقب غزوة بعد غزوة فی سبيل الله عزوجل (أبو الشيخ عن ابن عمر)۔

وفی الشامية(۲/۱۳): (قوله وهل تحسب المؤكدة) أی فی الأربع بعد الظهر وبعد العشاء والست بعد المغرب بحر (قوله إختار الكمال) نعم ذكر الكمال فی فتح القدير أنه وقع إختلاف بين أهل

عصره فی أن الأربع المستحبة هل هی أربع مستقلة غیر رکعتی الراتبة أو أربع بهما؟ وعلی الثانی هل تؤدی معهما بتسلیمة واحدة أو لا، فقال جماعة لا، واختار هو أنه إذا صلی أربعا بتسلیمة أو تسلیمتین وقع عن السنة والمندوب. وحقق ذلك بما لا مزید علیه وأقره فی شرح المنیة والبحر والنهر۔

(۲۵۹) دو رکعت نماز نفل میں متعدد نوافل کی نیت کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ساتھی نے بتایا نفل دو رکعت میں جتنے دوسرے نوافل کی نیت کرو سب ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دو رکعت نفل نماز میں اگر کوئی شخص حاجت کی نماز، توبہ کی نماز، شکرانے کی نماز، اشراق چاشت کی نماز کی نیت کرتا ہے تو دو رکعت نفل پڑھنے سے سب نمازیں ادا ہو جائیں گی۔ کیا ان کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دو رکعت نفل مطلقاً ادا ہو جائیگی یا ان میں سے جس کی نیت پہلے کی ہوگی وہ ادا ہوگی یا کوئی بھی ادا نہ ہوگی۔ کیا اس طرح نیت کرنا صحیح ہے زیادہ ادا نہ ہوں ایک دو ادا ہو جائے مثلاً دو رکعت میں توبہ شکرانے کی نماز کی نیت کر لے یا توبہ حاجت کی نماز کی نیت کر لے۔ جلدی جواب دیں اللہ آپ کو ثواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......آپ کے ساتھی کی بات صحیح ہے کہ دو رکعت نفل میں جتنی نوافل کی نیت کرو سب ادا ہو جاتی ہیں۔ البتہ وہ نوافل جو کسی وقت کے ساتھ موقت ہیں یا ذوات الاسباب ہیں تو ان کے ادا ہونے کیلئے وقت اور سبب کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً دو رکعت نفل میں اشراق کی نیت کی جائے تو اشراق تب ادا ہوگی جب اشراق کا وقت موجود ہو یا دو رکعت نفل میں تحیۃ المسجد کی نیت کی جائے تو تحیۃ المسجد تب ادا ہوگی جب دخول مسجد ہو۔

لما فی الصحیح للبخاری (۲/۱): .... علقمة ابن وقاص اللیثی یقول سمعت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنه علی المنبر یقول سمعت رسول اللہ ﷺ یقول انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ مانوی۔

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۲۱۶): ثم انه ان جمع بین عبادات الوسائل فی النیة صح کما لو اغتسل لجنابة وعید وجمعة اجتمعت ونال ثواب الکل وکما لو توضا لنوم وبعد غیبة وأکل لحم جزور وکذا یصح لو نوی نافلتین او اکثر کما لو نوی تحیة مسجد وسنة وضوء وضحی وکسوف۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۷۷۹/۱): وان کانت الصلاة نافلة: فیجب تعیینها ان کانت معینة او موقتة بوقت کصلوة الکسوف والاستسقاء والتراویح والوتر والسنن الرواتب۔

(۲۶۰) موٹر سائیکل پر نفل پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے چند روز قبل دوران مطالعہ میں نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے حالات میں پڑھا ہے کہ انہوں نے دوران سفر سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کئے تو کیا آج بھی سواری پر بیٹھ کر اشارہ سے نوافل پڑھنا جائز ہے؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے روزانہ دو ڈھائی گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے اگر میں بھی دوران سفر سواری پر نفل نماز اشارے سے پڑھتا رہوں تو میرے لئے جائز ہوگا؟ نیز اگر میں موٹر سائیکل خود چلاؤں تو پھر نفل پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں نفل نماز حالتِ سفر میں سواری پر پڑھنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لہٰذا ہمارے فقہاءِ کرام نے شہر سے باہر نفل نماز اشارہ سے پڑھنے کے جواز کے قول کو اختیار کیا ہے۔ البتہ اگر سواری خود چلا رہا ہے تو شرط یہ ہے کہ عمل کثیر نہ پایا جائے اگر سواری چلاتے وقت عمل کثیر پایا گیا تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور چونکہ موٹر سائیکل چلاتے وقت عام طور سے عمل کثیر پایا جاتا ہے اس لیے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے نماز پڑھنا درست نہیں۔

لمافی الشامیة (۳۸/۲): (قوله خارج المصر) هذاهوالمشهور، وعندهمايجوزفی المصر. لكن بكراهة عندمحمدلانه يمنع من الخشوع وتمامه فی الحلية۔

(قوله محل القصر) : بالنصب بدل من خارج المصروفائدته شمول خارج القرية وخارج الاخبية ح ای المحل الذی يجوز للمسافر قصر الصلاة فيه وهو الصحيح بحر......

(قوله ولوسيرها):ذكره فی النهربحثااخذامن قولهم اذاحرك رجله أوضرب دابته فلابأس به اذالم يكن كثيرا۔

(۲۶۱) وتروں کے بعد دو رکعت کا مخصوص سورتوں کے ساتھ ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتوں کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو تو ان کی ترتیب اور فضیلت بھی بیان فرمادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتیں، سورۃ الزلزال اور سورۃ الکافرون کے ساتھ پڑھنا حدیث سے ثابت ہے۔ البتہ ان کو لازم نہ سمجھا جائے۔ کبھی کبھار ترک بھی کردینا چاہیئے تاکہ واجب کا اعتقاد نہ رہے۔ ابن خزیمہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ تم رات کے قیام کو لازم پکڑو کیونکہ بے شک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کا طریقہ رہا ہے اور قربت کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے کا ذریعہ ہے اور طبرانی میں ہے کہ جو نماز، نمازِ عشاء کے بعد سونے سے پہلے پڑھی جائے وہ صلوۃ اللیل میں شمار ہوتی ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح (ص۱۱۳): عن ام سلمة ان النبی ﷺ کان یصلی بعد الوتر رکعتین۔
وفیه ایضاً: عن ثوبان عن النبی ﷺ قال ان هذا السهر جهد وثقل فاذا اوتراحدکم فلیرکع رکعتین فان قام من اللیل والا کانتا له۔
وفیه ایضاً: عن ابی امامة (رضی الله عنه) ان النبی ﷺ کان یصلّیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت وقل یایها الکفرون۔
وفی الشامیة(۲۴/۲): قال فی البحر، فمنها مافی صحیح مسلم مرفوعاً افضل الصلاة بعد الفریضة صلاة اللیل، وروی الطبرانی مرفوعاً ((لابد من صلاة بلیل ولو حلب شاة وما کان بعد صلاة العشاء فهو من اللیل)) وهذا یفید ان هذه السنة تحصل بالتنفل بعد صلاة العشاء قبل النوم۔
وفیه ایضاً(۳۸۱/۶):وکذا قالوا بسنیة قرائة السور الثلاثة فی الوتر مع الترک احیاناً لئلا یعتقد وجوبها۔

(۲۶۲)فوت شدہ نماز کے بارے میں یادنہیں کہ کونسی تھی تو اس کی قضا کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار سال قبل میں ساتھیوں کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے گیا تھا اور میں نے قصداًاورسستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی،لیکن اب میں اس پر بہت نادم ہوں اور مجھے وہ نماز بھی یادنہیں ہے کہ ظہر کی نماز چھوڑی تھی یا عصر کی تو اب میں کیا کروں کوئی شرعی حل بتائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اگرکسی سے کوئی نماز فوت ہوجائے لیکن اس کو یہ یادنہ ہو کہ کونسی نماز فوت ہوئی ہے تو یہ آدمی پورے دن کی نمازوں کی قضا کرے۔صورت مسئولہ میں آپ کو چونکہ صرف ظہر اورعصر میں تردد ہے اس لئے صرف ان دونوں کی قضاء کر لیں۔

لمافی فتاویٰ سراجیة(ص۱۶): رجل فاتته صلاة من یوم ولیلة ولا یدری ایة صلاة هی اعاد صلاة یوم ولیلة احتیاطاً۔
وفی الهندیة(۱۲۴/۱): رجل نسی صلاة ولا یدریها ولم یقع تحرّیه علی شئ یعید صلاة یوم ولیلة عندنا کذا فی الظهیریة۔

(۲۶۳)چھوڑی ہوئی نمازوں اور روزوں کی قضاء کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عمر پچاس سال ہے اللہ پاک نے کافی مال سے

نوازا ہے اور اولاد بھی دی ہے لیکن آج تک میں احکام خداوندی سے دور تھا نماز اکثر چھوڑ دیتا تھا روزے بھی کبھی رکھ لیے اور کبھی چھوڑ دیے اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک جماعت والے آئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے میں نے ایک چلہ جماعت کے ساتھ لگایا تو اب ندامت ہوتی ہے میں نے ساری عمر ضائع کی ہے تو اسی وقت اللہ پاک سے توبہ کرلی اور آئندہ نماز نہ چھوڑنے کا عزم کیا ہے۔ کیا جتنے روزے اور نمازیں چھوڑ دیں معاف ہوجائیں گی یا ان کیلئے مزید کوئی اور حکم ہے؟ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں میں انتہائی پریشان ہوں۔

الجواب بعون الملک الوهاب...... جتنے روزے اور نمازیں آپ نے چھوڑی ہیں ان سب کی قضاء آپ پر لازم ہے۔ قضاء کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت سے استغفار بھی کریں اس لیے کہ بغیر عذر نماز، روزہ، وغیرہ کو چھوڑنا بہت سخت گناہ ہے۔

لمافی مصنف ابن ابی شیبه(۳۴۷/۲): عن سعید بن المسیب قال جاء رجل النبی ﷺ فقال انی افطرت یوماً فی رمضان فقال له النبی ﷺ تصدق واستغفر الله وصم یوماً مکانه۔

وفی الدر المختار(۶۵/۲): والقضاء فعل الواجب بعد وقته۔ (وفیه ،۶۲/۲) اذ التاخیر بلا عذر کبیرة لاتزول بالقضاء بل بالتوبة او الحج

وفی الشامیة تحته: قوله (لاتزول بالقضاء) وانما یزول اثم الترك فلا یعاقب علیها اذا قضاها واثم التاخیر باق بحر۔

(۲۶۴) وقتی اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کی فجر، ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں قضا ہوجائیں تو ترتیب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھنا ضروری ہے یا بغیر ترتیب بھی پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے فجر کی نماز رہ گئی تو ظہر کی جماعت کا وقت ہوجانے پر کیا پہلے فجر کی نماز پڑھنا ضروری ہے یا ظہر کی نماز پڑھ کر پھر فجر پڑھ لیں، امام ومقتدی کے اعتبار سے اس مسئلے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱)۔ کسی کی فجر، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضاء ہوجائیں، اگر وہ شخص صاحب ترتیب ہے (صاحب ترتیب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمے چھ نمازیں باقی نہ ہوں، چاہے پرانی ہوں یا نئی مسلسل ہوں یا متفرق، اگر کسی کے ذمے چھ نمازوں کی قضاء باقی ہو تو وہ صاحب ترتیب نہیں) تو ترتیب کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔ اگر صاحب ترتیب نہیں تو ترتیب کا لحاظ رکھنا بہتر ہے اور بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ابھی تک ادا نہیں کرسکا تھا کہ ظہر کی جماعت کا وقت ہوگیا اگر وہ امام ہے اور صاحب ترتیب بھی ہے تو اس صورت میں اگر مقتدی حضرات امام کے قضاء نماز ادا کرنے تک انتظار کو گوارا کرتے ہوں تو امام پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں جماعت کرائے، اگر مقتدی حضرات انتظار کو گوارا نہیں کرتے تو

کسی اور شخص سے جماعت کروائے اور خود پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں وقتی نماز، اگر وہ شخص امام نہیں بلکہ عام آدمی ہے تو صاحب ترتیب ہونے کی صورت میں اس کیلئے بھی پہلے قضاء نماز ادا کرنا ضروری ہوگا بعد میں وقتی نماز پڑھے گا۔ صاحب ترتیب نہ ہونے کی صورت میں پہلے وقتی نماز پڑھ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ترتیب آدمی کیلئے وقتی نمازوں اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب قائم رکھنا ضروری ہے، غیر صاحب ترتیب کے لئے ضروری نہیں۔

لما فی الدر المختار (۲/۶۸،۶۹): (اوفاتت ست اعتقادیة) لدخولها فی حد التکرار المتقضی للحرج (بخروج وقت السادسة) علی الاصح ولو متفرقة او قدیمة علی المعتمد۔

وفی الشامیة تحته: ولا یسقط الترتیب الا بفوت ست صلوات.......... (قوله ولو متفرقة) ای یسقط الترتیب بصیرورة الفوائت ستا ولو کانت متفرقة۔

(۲۶۵) امدادی کاروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں زلزلہ آ گیا تھا اور اکثر آبادی اپنے گھروں میں دب گئی تھی (تقریباً ۳۰۰/افراد) لیکن ہم ۸ دوست زلزلے میں دبنے سے رہ گئے تو کیا ہم امدادی کارروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کر سکتے ہیں کیونکہ ہم نے لوگوں کو ملبے سے نکالنے کیلئے اپنی کافی ساری نمازیں قضا کر دی تھیں اور کافی لوگوں کو ملبے سے زندہ نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ تمام نمازیں بروقت باجماعت ادا کرے تاہم اگر کسی عذر شرعی کی بناء پر نماز میں تاخیر ہو جائے اور وقت میں ادا نہ ہو سکے تو اس کی قضاء کرنے میں تاخیر نہ کرنی چاہیے لہٰذا آپ سے اگر امدادی کارروائیوں میں شریک ہو کر دوسرے مسلمانوں کی جان بچاتے ہوئے نمازیں قضاء ہو گئی ہیں تو امید ہے کہ عنداللہ مؤاخذہ نہ ہوگا البتہ آپ کیلئے ضروری ہے کہ آپ ان نمازوں کی جلد از جلد قضاء کریں۔

لما فی البخاری (۱/۷۶): سألت النبی ﷺ ای العمل احب الی الله قال الصلوٰة علی وقتها قال ثم ای قال ثم برالوالدین قال ثم ای قال الجهاد فی سبیل الله قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی۔

وفی الدر المختار مع الشامیة (۲/۶۲): ومن العذر العدو وخوف القابلة موت الولد لأنه علیه الصلاة والسلام اخرها یوم الخندق۔

قال الشامی رحمه الله تعالیٰ تحته: قوله ومن العذر ای لجواز تأخیر الوقتیة عن وقتها ...قوله العدو کما اذا خاف المسافر من اللصوص او قطاع الطریق جاز له أن یؤخر الوقتیة لأنه بعذر۔

وفی مراقی الفلاح (ص۳۷۱): من تأخیر الصلوٰة وترکها (یجب قطع الصلوٰة) ولو فرضاً باستغاثة

شخص ملهوف لمهم أصابه كما لو تعلق به ظالم أو وقع فی ماء أو صال عليه حيوان فاستغاث بالمصلی۔

(۲۶۶) دورانِ نماز دورہ پڑ جائے تو اس نماز کی قضاء کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا چھوٹا بھائی اسلم جس کی عمر تقریباً ۲۰ سال ہے گزشتہ رات عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک دورہ پڑ گیا اور گر گیا تقریباً ۲۴ گھنٹے بعد بحمد اللہ ہوش میں آ گیا۔ اب جو نمازیں اس کی رہ گئی ہیں ان کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو کیا وہ نماز جس کو شروع کیا تھا دورہ پڑ گیا تو اس کی قضاء بھی واجب نہیں یا اس کی قضاء واجب ہے؟ اس لئے کہ اس کو شروع کیا تھا، اور جب نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑ دیا جائے تو احناف کے نزدیک اس کی قضاء واجب ہے لہٰذا مفتی صاحب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کوئی شخص دورانِ نماز بے ہوش ہو جائے اور پانچ نمازوں تک بے ہوش رہے تو قضاء واجب ہوگی۔ البتہ اگر پانچ نمازوں سے زائد وقت گزر جائے تو قضاء واجب نہ ہوگی۔ صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی اسلم اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت بے ہوش رہے تو ان پر قضاء واجب نہ ہوگی اور اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت میں یا اس سے کم بے ہوش رہے تو شروع کی ہوئی نماز سمیت تمام نمازوں کی قضاء واجب ہوگی۔

لما فی الهندية(۱/۱۳۷): ومن أغمی عليه خمس صلوات قضی ولو أكثر لا يقضی والجنون كالإغماء وهو الصحيح ثم الكثرة تعتبر من حيث الاوقات عند محمد رحمه الله تعالىٰ وهو الاصح۔

وفی الدرالمختار(۲/۱۰۲): (ومن جن أو اغمی عليه) ولو بفزع من سبع أو ادمی (يوما وليلة قضی الخمس وإن زاد وقت صلوٰة) سادسة (لا) للحرج۔

وفی الشامية تحته: (ومن جن أو أغمی عليه) الجنون افة تسلب العقل والاغماء أفة تستره الی ان قال: واعتبر الزيادة بالأوقات علی قول الثالث وهو الأصح۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷۲۸،۷۲۷): فلو جن البالغ أو أغمی عليه أو حاضت المرءة أو نفست فی أول الوقت أو أثناء ه بحيث يمكنه أداء الصلاة وجب عليه عند الجمهور غير الحنفية قضاء تلك الصلوٰة ان مضی قدر الفرض مع الطهر، ولا تجب الصلاة الثانية التی تجمع معها لأن وقت الاولی لا يصلح للثانية الا اذا صلاهما جمعاً بخلاف العكس الی ان قال: وقال الحنفية لا تجب صلاة ذلك الوقت علی أصحاب الأعذار هؤلاء۔ لأن سبب ايجاب الصلوة: هو الجزء الذی يتصل به الأداء من الوقت فان لم يؤد تعين الجزء الاخير الذی يسع الواجب للسببية. وبعد خروج الوقت تضاف السببية الی جملة الوقت۔

فصل فی التراویح

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۶۷) تعدادِ رکعاتِ تراویح کی بحث

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں تراویح صرف آٹھ رکعت ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول بھی آٹھ ہی کا تھا بیس تراویح کا ثبوت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں آٹھ تراویح کے بارے میں کافی روایات ہیں کیا واقعی ان لوگوں کی بات صحیح ہے یا بیس رکعت کا ثبوت احادیث میں ہے اگر ہے تو ان روایات کو ذکر کریں بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیس رکعت تراویح کا ثبوت ہو تو اس کو ضرور بیان فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......حدیث مرفوع صحیح سے صرف دو امر ثابت ہیں اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو تراویح کی ترغیب فرمایا کرتے تھے۔ دوم یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذاتِ خود تین دن تراویح کی جماعت کا اہتمام فرمایا حتی کہ لوگوں کو اور گھر والوں کو بھی جمع فرمایا لیکن پھر فرضیت کے خوف کی بنا پر جماعت ترک فرمادی، اس سے تراویح کی سنیت اور جماعت کا ثبوت بوجہ احسن ہوتا ہے البتہ تعدادِ رکعات مذکور نہیں، تعدادِ رکعات کیلئے حدیث حسن لغیرہ اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بکثرت موجود ہیں بیس رکعاتِ تراویح سے متعلق ایک حدیث سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور چونکہ تراویح کا تعلق فرائض سے تو ہے نہیں تطوعات سے ہے اور تطوعات میں ضعیف روایات بھی قابلِ قبول ہوتی ہیں جبکہ کوئی اور روایت اس کے معارض نہ ہو خصوصاً جبکہ جمہور صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بیس رکعات پر اتفاق واجماع ہے۔

اور آٹھ رکعات والی روایات تراویح سے متعلق نہیں ان کا تعلق تہجد سے ہے جیسا کہ فتح الباری میں صراحت مذکور ہے اس لئے ان سے تراویح کی تعدادِ رکعات پر استدلال کرنا لغو ہے اور اگر بالفرض مان بھی لیا جائے تب بھی ان میں آٹھ رکعات سے زائد کی نفی مذکور نہیں بلکہ یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ رکعات گھر ہی میں ادا فرمالی ہوں اور آٹھ رکعات باہر تشریف لاکر جماعت سے ادا فرمائی ہوں ''اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال''۔

لمافی السنن الکبریٰ للبیھقی(۴۹۶/۲): عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی شهر رمضان فی غیرجماعة بعشرین رکعة والوترتفردبه ابو شیبة ابراهیم بن عثمان العبسی

الكوفى وهو ضعيف۔

وفى فتح الملهم (۵/۱۱۵): روى ابن خزيمة وابن حبان عن جابر رضي الله عنه ''صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فى رمضان ثمان ركعات، ثم اوتر، فلما كانت القابلة اجتمعنا فى المسجد ورجونا أن يخرج إلينا حتى اصبحنا ثم دخلنا فقلنا يا رسول الله... فهذا كما تراه ليس فيه الابيان فعله الجزئى فى ليلة واحدة فقط دون سائر الليالى بل ليس فيه التصريح بنفى الزائد على الثمان فى تلك الليلة أيضاً فإنه يمكن ان يكون هو صلى الله عليه وسلم قد صلى قبل الخروج اليهم منفرداً عنهم ماشاء الله من الركعات ثم صلى بهم ثمان ركعات والوتر۔

وفيه ايضاً (۵/۱۱۷): واحاديث الزيادة على فعله فى بعض الاوقات نادراً وحينئذ فلا منافاة بين حديث عائشة وبين ماروى ابن ابى شيبة والطبرانى والبيهقى من حديث ابن عباس رضي الله عنه باسناد ضعيف ''أنه عليه الصلاة والسلام كان يصلى فى رمضان عشرين ركعة سوى الوتر'' أى فى بعض الليالى، لا فى اكثرها والمسئلة ليست من الفرائض والواجبات بل هى من الفضائل والتطوعات والحديث الضعيف مقبول فيها اذا لم يعارضه حديث صحيح وقدبينا أنه لا معارضة بين حديث العشرين وحديث عائشة اذا حمل حديثها على الاوقات الغالبة والأحوال الاكثرية ولاسيما اذا اتفق جمهور الصحابة والتابعين على العشرين فى اخر الامر قال البيهقى ''ثم استقر الأمر على العشرين فإنه المتوارث۔''

وفى فتح البارى (۳/۱۶): وظهر لى أن الحكمة فى عدم الزيادة على احدى عشرة أن التهجد والوتر مختص بصلاة الليل وفرائض النهار الظهر وهى أربع والعصر وهى أربع والمغرب وهى ثلاث وتر النهار فناسب ان تكون صلوة الليل كصلاة النهار فى العدد جملة وتفصيلاً وأما مناسبة ثلاث عشرة فبضم صلاة الصبح لكونها نهارية إلى ما بعدها۔

(۲۶۸) بغیر روزہ رکھے تراویح کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سانس کا مریض ہوں روزے رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ایک روز تراویح کیلئے چلا گیا تو ایک صاحب نے کہا کہ تراویح اس شخص پر لازم ہے جو روزے رکھ رہا ہو، چونکہ آپ روزے نہیں رکھ رہے اس لئے آپ کو تراویح نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیا اس شخص کی بات صحیح ہے؟ اور کیا روزے نہ رکھنے والا تراویح ادا کرسکتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تراویح سنت مؤکدہ ہے، اس کا چھوڑنا اور بغیر عذر کے چھوڑنے پر اصرار کرنا جائز نہیں اور تراویح

رمضان کے روزوں کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ رمضان کے روزے اور رمضان میں رات کا قیام یعنی تراویح دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔ لہٰذا جو شخص روزہ رکھنے سے معذور ہے اور تراویح پڑھنے پر قادر ہے، تو اس کو تراویح پڑھنی چاہیے۔ اگر چہ روزہ نہ رکھتا ہو۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۶): وهی سنة رسول الله ﷺ وقيل هی سنة عمر رضی الله عنه، والاول اصح كذا فی جواهر الاخلاطی، وهی سنة للرجال والنساء جميعاً، كذا فی الزاهدی ونفس التراويح سنة على الاعيان عندنا كما روى الحسن عن ابی حنيفة رحمه الله وقيل تستحب والاول أصح۔

وفی الدر المختار(۲/۴۳): (التراويح سنة) مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) اجماعاً۔

وفی الشامية(۲/۱۲): ولهذا كانت السنة المؤكدة قريبة من الواجب فی لحوق الأثم كمافی البحر، ويستوجب تاركها التضليل واللوم كمافی التحرير ای على سبيل الاصرار بلاعذر۔

(۲۶۹) تراویح میں امام کو کھانسی وغیرہ کے ذریعے غلطی پر متنبہ کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید تراویح پڑھاتا ہے اور عمرو سامع ہے، زید عمرو سے کہتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی تلاوت میں ہو جائے تو آپ صرف کھانسی یا کھنکارنے کے ذریعے مجھے مطلع کیجئے اگر پھر بھی صحیح نہ کر سکوں تو پھر بھلے آپ بتا بھی سکتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بات یادر ہے کہ یہ ساری کہانی جو حضرت قاری صاحب نے بنا رکھی ہے، اس لئے کہ مقتدیوں کو پتہ نہ چلے کہ کیسا حافظ ہے۔ آپ علماء سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہوگا آیا نماز میں کچھ فساد تو نہیں آئے گا۔

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز میں کسی عذر (مثلاً گلے میں خراش وغیرہ) کی وجہ سے کھانسنا یا غرضِ صحیح (مثلاً تحسین صوت یا مقتدی کا امام کو غلطی پر متنبہ کرنے پر) کھانسنا یہ مفسدِ صلوۃ نہیں اور اگر بلا عذر اور بلاوجہ کھانسا جائے تو اس سے نماز ٹوٹ جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں سامع کا قاری کی تلاوت میں غلطی آنے پر اس وجہ سے کھنکارنا کہ دوسرے لوگ غلطی پر مطلع نہ ہوں اور قاری صاحب کو پتہ چل جائے اس سے نماز تو فاسد نہ ہوگی البتہ اس طرح کرنا ایک نامناسب حرکت ہے اس سے گریز کرنا چاہیئے۔

لما فی الشامية (۱/۶۱۹): (قوله على الصحيح) لانه يفعله لاصلاح القراءة فيكون من القراءة معنى كالمشى للبناء فانه وإن لم يكن من الصلاة لكنه لاصلاحها فصار منها معناً شرح المنية عن الكفاية، لكنه لايشمل مالوكان لاعلام انه فی الصلاة اوليهتدى امامه الى الصواب۔ والقياس الفساد فی الكل الافی المدفوع اليه كما هو قول ابی حنفية ومحمد لانه كلام، والكلام مفسد على كل حال كما مر وكأنهم عدلوا بذلك عن القياس وصححوا عدم الفساد به اذا كان لغرض صحيح لوجود نص۔

وفی الفقه الاسلامی (۱۰۲۳/۲): وتبطل بالتنحنح بحرفین بلاعذر. فان وجد عذر. کان نشأ من طبعه فلا تفسد، کمالا تفسد ان کان لغرض صحیح کتحسین الصوت، اولیھتدی امامه الی الصواب، اوللاعلام انه فی الصلاۃ، فلا فساد علی الصحیح. وھکذا فإن التنحنح عن عذر لا یفسد الصلاۃ۔

(۲۷۰) نمازِ تراویح کی بیس رکعات کا دو اماموں کا پڑھانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح کیلئے دو امام ہوتے ہیں ایک امام صاحب سولہ رکعت پڑھاتے ہیں اور دوسرے چار رکعت پڑھاتے ہیں دونوں مل کر قرآن پاک مکمل سناتے ہیں معلوم یہ کرنا ہے کہ نماز تراویح دو امام پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تراویح کی نماز دو امام پڑھا سکتے ہیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۶۴/۱): اذا صلی الترویحة الواحدة امامان کل امام رکعتین اختلف المشایخ فیه والاصح انه لایستحب لکن کل ترویحة یؤدیھا امام واحد۔

وفی الھندیة(۱۱۶/۱): واذا جازت التراویح بامامین علی ھذا الوجه جاز ان یصلی الفریضة احدھما ویصلی التراویح الاخروقد کان عمر رضی اللہ عنہ یؤمھم فی الفریضه والوتر وکان اُبیّ رضی اللہ عنہ یؤمھم فی التراویح کذا فی السراج الوھاج۔

(۲۷۱) تراویح میں ایک امام کا بارہ رکعات، دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں دو سال سے یہ معمول ہو گیا ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح دو امام پڑھاتے ہیں۔ ایک بارہ رکعات اور دوسرا آٹھ رکعات، تو کیا ایک مصلّٰی پر دو امام ایک قرآن سنا سکتے ہیں؟ یا ایک ہی کو سنانا چاہیئے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اور افضل صورت کیا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک امام کا بارہ رکعات اور دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا درست ہے جبکہ ایک امام پورا ایک ترویحہ پڑھائے۔ رہی یہ بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اس کی کوئی مثال تو اس کے متعلق صاحب الجوھرۃ النیرۃ علامہ ابوبکر بن محمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز اور وتر پڑھاتے اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز تراویح پڑھاتے تھے۔ لہٰذا دو اماموں کا نماز پڑھانا اور انصراف جائز ہے۔

لمافی الجوھرۃ النیرۃ طبع مکتبه رحمانیه(۲۴۶/۱): والأفضل أن یصلّی التراویح بامام واحد

لأن عمر رضی الله عنه جمع الناس علی قارئ واحد، وهو أبی بن كعب رضی الله عنه، فان صلواها بإمامين فالمستحب ان يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة فإن انصرف على تسليمة، لا يستحب ذلك وكان عمر رضی الله عنه يؤمهم فی الفريضة والوتر، وكان أبی بن كعب رضی الله عنه يؤمهم فی التراويح۔

وفی فتاویٰ قاضی خان(۱/۱۱۲): ولو أقاموا التراويح بإمامين فصلّى كل امام تسليمة بعضهم جوّزوا ذلك والصحيح أنّه لا يستحب وانما يستحب ان يصلی كل امام ترويحة ليكون موافقا عمل أهل الحرمين۔

وفی الهندية(۱/۱۱۶): والأفضل أن يصلّی التراويح بإمام واحد فان صلّوها بإمامين فالمستحب ان يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة فان انصرف على تسليمة لا يستحب ذلك فی الصحيح۔

(۲۷۲) فلیٹ میں نماز پنجگانہ اور تراویح پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ ماریہ لگژری اپارٹمنٹ میں ابھی حال ہی میں رہائش پذیر ہوئے ہیں یہاں سارے فلیٹ ہیں کیونکہ یہاں نہ کوئی مسجد بنائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی مسجد کی جگہ دی ہے لہٰذا ہم لوگ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ماریہ فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز تراویح اور پانچوں وقت کی نماز ادا کرسکتے ہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب..... صحت نماز کیلئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ زمین کے ہر ہر جزء اور موضع میں نماز جائز ہے اگرچہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز پنجگانہ اور تراویح جائز ہے۔ البتہ اس جگہ کی حیثیت شرعاً مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ مسجد کیلئے ضروری ہے کہ مالک اس جگہ میں ہمیشہ کیلئے لوگوں کو نماز کی اجازت دیتے ہوئے اس کو اپنی ملکیت سے خارج کردے چنانچہ پھر یہ جگہ اس کی میراث میں بھی تقسیم نہ ہوگی جبکہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے۔

لما فی البخاری(۱/۶۲): باب قول النبی جعلت لی الارض مسجدا وطهورا۔ عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اعطيت خمسا لم يعطهن احد من الأنبياء قبلی، نصرت بالرعب مسيرة شهر وجعلت لی الارض مسجدا و طهورا الخ۔

وفی البحر الرائق(۵/۴۱۶): ولا قال المصنف ومن جعل ارضه مسجدا بدل قوله ومن بنى لكان اولى لأنه لو كان له ساحة لابناء فيها فأمر قومه ان يصلوا فيها بجماعة قالوا ان امرهم بالصلوة فيها ابدا او أمرهم بالصلوة فيها بالجماعة ولم يذكر ابدا الا أنه ارادبها الأبد ثم مات

لايكون ميراثا عنه وان امرهم بالصلاة شهرا او سنة ثم مات تكون ميراثا عنه لأنه لابدمن التابيد والتوقيت ينافى التابيد كذا فى الخانية۔

(۲۷۳) نمازتراویح میں ہر چار رکعت کے بعد قہوہ پینا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب نمازِتراویح میں چار رکعت کے بعد قہوہ پیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس سے میرا گلہ صاف ہوجاتا ہے؟ توکیا تراویح کی نماز کے دوران اس عذر پر قہوہ پینا درست ہے؟ نماز تراویح مکروہ تونہیں ہوتی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگرکوئی میٹھی چیز پی کرنماز کے اندرداخل ہوجائے جبکہ اس کے منہ میں مٹھاس باقی ہو، اوروہ اس کونگلتا ہےتو اس سے نماز کی صحت پر کچھ فرق نہیں آئے گا۔لہٰذاصورت مسئولہ میں تراویح کی نماز کے دوران جبکہ عذر بھی ہےقہوہ پیناجائز ہے۔

لمافى الهندية(۱/۱۰۲):اذا كان بين اسنانه شئ من الطعام فابتلعه ان كان قليلاً دون الحمصة لم تفسد صلوته الا أنه يكره، وان كان مقدار الحمصة فسدت...

...ولو أكل شيأً من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلوٰة فوجد حلاوتها فى فيه فابتلعها لا تفسد صلوته ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلى والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته۔

وفى الشامية(۱/۶۲۳): قوله كسكر الخ، أفاد ان المفسد اما المضغ الكثير أو وصول عين المأكول الى الجوف بخلاف الطعم۔ قال فى البحر عن الخلاصة: ولو أكل شيأً من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلاة فوجد حلاوتها فى فيه وابتلعها لاتفسد صلاته، ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلى والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته۔

(۲۷۴) نمازتراویح کے بعد اجتماعی دعامانگنے کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نماز اور تراویح اوراسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان المبارک میں ادا کی جاتی ہے۔اس کے بعد دعا انفرادی طور پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن اس دعا کوایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اُٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کی ادلہ اربعہ شرعیہ سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......حضور اکرم ﷺ سے فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا مانگنا ثابت ہے البتہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا پر ایسا التزام ودوام کرنا کہ جو شخص اس اجتماعی دعا میں شامل نہ ہو رہا ہو اس پر طعن و تشنیع کی جائے درست نہیں نیز تراویح کے بعد اجتماعی طور پر دعا ثابت تو نہیں البتہ تلاوتِ قرآن کے بعد دعا کے قبول ہونے کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں اس لئے کبھی کبھار ترک کے ساتھ سنت سمجھے بغیر اگر تراویح کے بعد دعا کر لی جائے تو حرج نہیں اور اکابرین سے یہ متوارث بھی ہے تاہم رمضان کے وتر کی جماعت کے بعد بھی اسی اجتماعی ہیئت سے دعا مانگنا صحیح نہیں۔

لمافی اعلاء السنن(۱۹۳/۳): واعلم انه قد وقع العرف فی دیارنا ان الامام والقوم یدعون مستقبل القبلة رافعی ایدیهم عقیب السلام معافی الظهر والمغرب والعشاء ولا ینحرف الامام فی هذه الاوقات عن القبلة وبعد العصر والفجر ینحرف یمینا وشمالا ویقرأ شیئاً من الورد جالسا۔ وکذا القوم معه ثم یدعون فانکر بعض الناس علی ذلك بوجهین اما اولا فلعدم انحراف الامام یمینا وشمالا فی الظهر والمغرب والعشاء ودعائه مستدبرا للمأمومین۔ وقد ثبت انه ﷺ کان ینحرف دائما، واما ثانیا فلان الدعاء بعد السلام من الصلاة لم یثبت عنه ﷺ بل عامة الادعیة المتعلقة بالصلاة انما فعلها فیها، وامر بها فیها۔ والجواب عن الاول بانه قد ثبت عنه ﷺ انه دعا فی بعض الاحیان مستقبل القبلة مستدبرا القوم ... وعن الثانی بان الدعاء بعد السلام ثبت عنه ﷺ، قولا وفعلا، وانکار ذلك مکابرة الخ...

وفیه ایضاً(ص۱۹۴): قوله عن ابی امامة الخ، قلت فیه اثبات الدعا بعد الصلاة فاندحض به ماأورده ابن القیم ان الدعاء بعد السلام من الصلاة مستقبل القبلة او المأمومین۔ فلم یکن من هدیه ﷺ اصلا ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن... قلت قد ثبت ذلك عنه ﷺ قولا وفعلا فهذا حدیث ابی امامة فیه ارشاد الامة بالدعاء بعد الصلوات المکتوبات واما تاویله بان المراد من دبر الصلوات ما قبل السلام کما زعمه ابن القیم فباطل... فان فیه یسبحون دبر کل صلاة وهو بعد السلام جزماً...

وفی سنن الدارمی(۵۶۱/۲): عن مجاهد قال بعث الی قال انما دعوناك انا اردنا ان نختم القرآن وانه بلغنا ان الدعاء یستجاب عند ختم القران قال فدعوا بدعوات۔

(۲۷۵) تراویح کی جماعت ثانی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچازاد بھائی امریکہ میں رہتے ہیں انہوں نے ایک

مسئلہ معلوم کروایا ہے کہ امریکہ میں بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں محراب میں تھوڑے وقفے سے دو الگ تراویح کی جماعت ہوتی ہیں، دراصل لوگوں کی ڈیوٹی ٹائمنگ کچھ ایسی ہے کہ یوں کرنا پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......فرض نماز میں جماعت ثانی جماعت اولیٰ کی تبدیل ہیئت کے باوجود مکروہ ہے لیکن تراویح میں فرائض کی بہ نسبت توسع ہے اس لئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے تراویح کی جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ درست ہے اور ہمارے اسلاف رحمہ اللہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ امداد الاحکام (۱/ ۶۳۴) میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ چونکہ آپ کے مسئلہ میں جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت پر ہے اس وجہ سے یہ دوسری جماعت مکروہ ہے نیز اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی دوسری مرتبہ تراویح کی جماعت کرواتے ہیں تو یہ جماعت ثانی مکروہ ہے خواہ مسجد میں پڑھیں یا مسجد سے باہر پڑھیں۔

لمافی الشامية(۱/۵۵۳): عن ابي يوسف رحمه الله انه اذا لم تكن الجماعة على الهيئة الاولى لا تكره والا تكره وهو الصحيح وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية۔

وفي كبيرى(ص۳۸۹): ولو امّ في التراويح مرّتين في مسجد واحد كره۔

وفي حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح(ص۳۳۵) : وكره ان يؤم في التراويح مرّتين في ليلة واحدة وعليه الفتوى لان السنة لاتتكرر في الوقت الواحد فتقع الثانية نفلا مضمرات۔

وفي قاضي خان(۱/۱۱۲): ولو صلى التراويح مرّتين في مسجد واحد يكره كما لو اذّن واقام مرّتين في مسجد واحد واختار الفقيه ابو الليث قول ابي بكر هذا اذا امّ للناس مرّتين۔

وفي الهندية(۱/۱۱۶): ولو صلى التراويح مرّتين في مسجد واحد يكره۔

(۲۷۶) عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت چھوڑنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک بچپن کے دوست ہیں ہم دونوں کلاس فیلو بھی رہے ہیں ان بیچاروں کو ڈکار کا مرض ہے، اور ڈکاریں بھی گیس کی آتی ہیں۔ نماز تراویح میں انہیں بڑی پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آیا اس صورت میں وہ نماز تراویح چھوڑ سکتے ہیں؟ یا تنہا گھر پر پڑھ لیا کریں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......اگر گیس کی ڈکاریں ایسی ہوں کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو مثلاً ان میں بدبو ہو یا ڈکاریں ایسی باآواز ہوں کہ جن کی وجہ سے پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہو، تو ایسی صورت میں تراویح کی نماز گھر پے ادا کرسکتا ہے۔ البتہ بغیر عذر کے تراویح کی نماز کو بالکل چھوڑ دینا جائز نہیں کیونکہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور بغیر عذر کے سنت مؤکدہ کے چھوڑنے پر اصرار کرنے میں گناہ ہے۔

لمافی الشامية(۲/۱۲): (قوله سن مؤكدا)... زيادة على بقية النوافل ولهذا كانت السنة المؤكدة

قريبة من الواجب فى لحوق الاثم كمافى البحر، ويستوجب تاركها التضليل واللوم... اى على سبيل الاصرار بلاعذر۔

وفى الشامية(۱/۶۶۱): كل ماله رائحة كريهة مأكولا او غيره... وكذلك الحق بعضهم بذلك من بفيه بخراوبه جرح له رائحة وكذلك القصاب والسماك والمجذوم والابرص اولى بالإلحاق وقال سحنون لاأرى الجمعة عليهما۔

وفى الهندية(۱/۸۳): وتسقط الجماعة بالاعذار حتى لا تجب على المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذى لا يستطيع المشى والشيخ الكبير العاجز والاعمى عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ والصحيح انها تسقط بالمطر والطين والبرد الشديد والظلمة الشديدة كذا فى التبيين وتسقط بالريح فى الليلة المظلمة... أو كان اذا خرج يخاف أن يحبسه غريمه فى الدين أو يريد سفرا واقيمت صلاة فيخشى ان تفوته القافلة أو كان قيما لمريض أو يخاف ضياع ماله۔

وفى الدرالمختار(۱/۵۵۶،۵۵۵،۵۵۴): (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر فى الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج) ولو فاتته ندب طلبها فى مسجد آخر الا المسجد الحرام ونحوه (فلا تجب على مريض ومقعدوزمن ومقطوع يدورجل من خلاف) او رجل فقط... (وبرد شديد وظلمة كذلك) وريح ليلا لانهارا، وخوف على ماله او من غريم او ظالم أو مدافعة أحد الأخبثين الخ۔

(۲۷۷) بیس رکعات تراویح کا دورانیہ کتنا ہو؟

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں حفاظ نمازتراویح مختلف انداز اور رفتار سے پڑھاتے ہیں۔کوئی تو ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیتا ہے اور کوئی آدھ پَون گھنٹے میں فارغ کردیتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ بیس رکعات نمازتراویح کتنی دیر میں ختم ہونا چاہیئے؟اس بارے میں شریعت کا کوئی حکم ہے؟اگر ہے تو براہ کرم مرحمت فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......بیس رکعات نمازِتراویح ختم کرنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں قاری کی اس رفتار کا اعتبار ہے جو شریعت میں معتبر ہے لہٰذا شرعاً اتنی مقدار پڑھنے کی اجازت ہے جس سے لوگ تراویح کی جماعت میں آنے سے متنفر نہ ہوں اور اتنی سرعت کے ساتھ پڑھنا کہ الفاظ پوشیدہ رہ جائیں یا اپنے مخارج سے ادانہ ہوسکیں مکروہ ہے بلکہ بین بین ہو یعنی نہ تو اتنی تیز رفتاری ہو کہ سمجھ میں ہی نہ آئے ،اور نہ اتنی سست روی کہ لوگ اکتا جائیں۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۸): والافضل فی زماننا أن يقرأ بما لا يؤدی إلى تنفير القوم عن الجماعة لكسلهم لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة۔

وفی الشامية(۱/۵۴۱): (قوله وفی الحجة) اسم كتاب من كتب الفتاوى(قوله بين بين) أی بأن تكون بين الترسل والاسراع۔

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۲/۱۰۹۰): قال احمد رحمه الله! يقرأ الامام بالقوم فی شهر رمضان ما يخف على الناس ولا يشق عليهم۔

(۲۷۸) نمازِ تراویح کے بعد قرآن مجید کا خلاصہ بیان کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان میں پورے مہینے میری رات کی ڈیوٹی رہی میں اپنی فیکٹری کے قریب جا کر ہی ایک مسجد میں تراویح پڑھتا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی کا وقت تھوڑی دیر میں شروع ہوتا تھا اس لئے تراویح کے بعد کچھ دیر وہیں تلاوت کا معمول بنانے کا سوچا تھا لیکن اس مسجد میں تراویح کے بعد تھوڑی دیر خلاصہ سنایا جاتا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوجاتا تھا، مجھے یہ انداز بہت اچھا لگا، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ بدعت میں تو شمار نہیں ہوتا؟ آپ مجھے اس بارے میں صحیح صحیح بتادیں کہ آئندہ میں اسی کے مطابق عمل کروں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......ہر وہ کام جو دین نہ ہو پھر اسے دین سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔لہٰذا تراویح کے بعد خلاصہ بیان کرنا بدعت نہیں۔ بلکہ یہ اشاعت للدین کے زمرہ میں آتا ہے اور اس کے لئے ہر وہ صورت جو کہ قواعد شرع کے خلاف نہ ہو اختیار کرنا جائز ہے۔ جبکہ دیگر موانع موجود نہ ہوں، مثلاً نمازیوں کو اس طور سے پابند کرنا نہ پایا جاتا ہو کہ جس سے وہ دین کی بات سننے سے اکتا جائیں۔حاصل کلام یہ کہ جو نمازی اپنی خوشی سے آسانی کے ساتھ بیٹھ کر سننا چاہیں ان کیلئے مناسب مقدار میں بیان کردینا چاہیئے۔

لمافی مرقاة المفاتيح(۱/۲۱۶): قال النووی رحمه الله: البدعة كل شئ عمل على غير مثال سبق وفی الشرع احداث مالم يكن فی عهد رسول الله ﷺ۔

وفی فتح الباری(۱/۱۳۳): قال: كان عبدالله يذكر الناس فی كل خميس فقال له رجل يا ابا عبدالرحمن لوددت انك ذكرتنا كل يوم قال أما إنه يمنعنی من ذلك أنی أكره أن املكم وإنی أتخولكم بالموعظة كما كان النبی ﷺ يتخولنا بها مخافة السامة علينا۔

ويستفاد من الحديث استحباب ترك المداومة فی الجد فی العمل الصالح خشية الملال وان كانت المواظبة مطلوبة لكنها على قسمين اما كل يوم مع عدم التكلف واما يوما بعد يوم فيكون يوم الترك لاجل الراحة ليقبل على الثانی بنشاط واما يوما فی الجمعة ويختلف

باختلاف الاحوال والاشخاص والضابط الحاجة مع مراعاة وجود النشاط۔

(۲۷۹) تراویح میں دوسرے ختم کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں ایک قاری صاحب نے قرآن مجید کا ختم کیا اپنی مسجد میں دوسرا ختم وہ اسی مسجد میں نہیں کرسکتا جبکہ مقتدین حضرات کہتے ہیں کہ دوسرا ختم بھی سناؤ کیونکہ تین ختم مسنون ہوتے ہیں آپ حضرات تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ تین ختم کرنا اس قاری صاحب کیلئے ضروری ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب بعون الملک الوھاب……واضح رہے کہ رمضان المبارک میں ایک مرتبہ تراویح میں قرآن پاک ختم کرنا سنت ہے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل ضرور ہے لیکن لازمی اور ضروری نہیں۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں مقتدین حضرات کا قاری صاحب کے اوپر زبردستی کرنا (کہ آپ دوسرا ختم بھی سنائیں) درست نہیں تاہم اگر وقت ہو، اور قاری صاحب اپنی خوشی سے سنانا چاہیں تو افضل اور بہتر ہے ورنہ ایک ہی ختم کافی ہے۔

لما فی الهندیة(۱/۱۱۷):السنة فی التراویح انما هو الختم مرّة فلا یترك لكسل القوم… والختم مرتین فضیلة والختم ثلاث مرات افضل كذا فی السراج الوهاج۔

وفی الدر المختار(۲/۴۶): (والختم) مرّة سنة ومرتین فضیلة وثلاثا افضل (ولا یترك) الختم (لكسل القوم)۔

فصل فی الوتر

(وتر سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۸۰) دعائے قنوت کے وقت ہاتھ کانوں تک اٹھانا، اور قنوت نازلہ پڑھنے کا وقت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا قرآن وحدیث میں وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اور قنوت کے وقت ہاتھ کہاں باندھے؟ اور قنوت نازلہ کن کن نمازوں میں پڑھی جاسکتی ہے، اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھ باندھنے ہیں یا چھوڑنے ہیں؟ کن حالات میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہیئے؟ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین ثابت ہے البتہ اگر وتر فوت ہوجائے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھنا ہوتو ہاتھ نہ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو اس کی سستی پر علم نہ ہو، اور قنوت کے وقت ہاتھوں کو زیر ناف باندھے اور قنوت نازلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف نمازِ فجر میں مسلمانوں پر سخت حالات مثلاً (قحط، وباء، خوف) کے وقت پڑھنی چاہیئے اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۱): اذا فرغ من القراءة فی الرکعة الثالثة کبرورفع یدیه حذاء اذنیه ویقنت قبل الرکوع۔۔۔۔۔۔ واختلفوا انه یرسل یدیه فی القنوت امر یعتمد و المختار انه یعتمد۔

وفی الدرالمختار(۲/۶): (ویکبر قبل رکوع ثالثته رافعا یدیه) کما مر ثم یعتمد وقیل کالداعی (وقنت فیه) (فی رد المحتار قوله رافعایدیه) ای سنة الی حذاء اذنیه کتکبیرة الاحرام وهذا کما فی الامداد عن مجمع الروایات لوفی الوقت اما فی القضاء عند الناس فلا یرفع حتی لایطلع احد علی تقصیره... (قوله ثم یعتمد) ای یضع یمینه علی یساره کما فی حالة القراءة (قوله وقیل کالداعی) ای عن ابی یوسف انه یرفعهما الی صدره وبطونهما الی السماء امداد والظاهر انه یبقیهما کذلك الی تمام الدعاء علی هذه الروایة تأمل۔

وفی تنویر الابصار مع الدر(۲/۸.۹): (ویاتی الماموم بقنوت الوتر لاالفجر بل یقف ساکتا علی

الاظھر) مرسلایدیہ قال الشامی تحت(قولہ مرسلاید یہ) لان الوضع سنة قیام طویل فیہ مسنون وھذا الذکر لیس بمسنون عندنا۔

(۲۸۱) دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صلوٰۃ وتر میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا کہاں سے ثابت ہے آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور احادیث نبوی سے مزین جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا احادیث نبوی اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعامل سے ثابت ہے۔

لمافی السنن الکبری(۲/۲۱۱): عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال إن اللہ حیی کریم یستحیی اذا رفع الرجل إلیہ یدیہ ان یردھما صفرا خائبتین۔ رفعہ جعفر بن میمون ھکذا وقفہ سلیمان التیمی عن أبی عثمان فی احدی الروایتین عنہ والحدیث فی الدعاء جملة الا ان عددا من الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنھم رفعوا أیدیھم فی القنوت مع مارویناہ عن انس بن مالک عن النبی ﷺ۔

وفی اعلاء السنن(۶/۸۶): عن أبی عثمان: ''کان عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یرفع یدیہ فی القنوت۔

وفی شرح معانی الآثار(۱/۴۱۷): وقدروی فی ذلک عن ابراھیم النخعی ماحدثنا سلیمٰن بن شعیب بن سلیمٰن عن ابیہ عن ابی یوسف عن ابی حنیفة عن طلحة بن مصرف عن ابراھیم النخعی قال ترفع الایدی فی سبع مواطن فی افتتاح الصلوٰة وفی التکبیر للقنوت فی الوتر وفی العیدین وعند استلام الحجر وعلی الصفا والمروة وبجمع وعرفات وعند المقامین عند الجمرتین۔

(۲۸۲) دعائے قنوت کیلئے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھنے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتر میں دعائے قنوت کے وقت جو ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں آیا یہ کانوں تک اٹھا کر باندھنا کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعا کی صورت میں اٹھانا چاہیے، ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، اور دعائے قنوت کیلئے کانوں کی لوتک ہاتھوں کو

اٹھانا اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا سنت ہے۔صورت مسئولہ میں دعائے قنوت کیلئے دونوں ہاتھوں کو اُٹھانا یہ حدیث مبارکہ سے ثابت ہے حدیث مبارکہ یہ ہے:

(۱)۔’’عن ابراھیم قال: ارفع یدیک للقنوت‘‘۔(مصنف ابن ابی شیبہ، ۴/۵۳۱)

(۲)۔’’عن لیث، عن ابن الاسود، عن ابیه، عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: أنه کان یرفع یدیه إذا قنت فی الوتر‘‘۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ۴/۵۳۱)

لیکن ہاتھوں کو اٹھانے میں دو طرح کے احتمال موجود ہیں ایک یہ کہ کانوں کی لوتک ہاتھ اٹھایا جائے دوسرا یہ کہ فقط دعا کی طرح ہاتھ اٹھالیا جائے۔لہٰذا ان مطلق احادیث کو بطور استدلال پیش نہیں کیا جاسکتا البتہ عند الحنفیہ ہاتھوں کے کانوں کی لوتک اٹھانے کا استدلال قیاساً راجح اور ثابت ہے۔احنافؒ اسے تکبیر تحریمہ پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں رفع یدین سے کانوں کی لوتک ہاتھ اٹھانا مراد ہے اسی طرح قنوت میں بھی وارد رفع یدین کے الفاظ سے کانوں کی لوتک ہاتھ اٹھانا مراد ہوگا۔

نیز کانوں کی لوتک ہاتھ اٹھانے کے بعد ہاتھوں کو باندھ لیا جائے گا یا ارسال (باندھے نہ جائیں) کیا جائیگا؟ تو اسے حنفیہ نے قیام پر قیاس کیا ہے۔یعنی جس طرح قیام میں ہاتھ باندھے جاتے ہیں کیونکہ جب قیام میں ذکرِ طویل ہو تو خشوع کا حصول ہاتھ باندھنے میں ہے لہٰذا قنوت میں بھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیے جائیں گے۔

یہاں یہ اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ رکوع کے بعد قومہ وغیرہ میں بھی تو بہت سے ذکر مسنون منقول ہیں جو کہ بہت طویل ہیں تو پھر وہاں بھی قیام للقراءۃ پر قیاس کر کے ہاتھ باندھ لینا چاہیے جبکہ کوئی بھی قومے میں ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ قومہ میں ذکر مسنون کا اقل ’’ربنا لک الحمد‘‘ ہے جو کہ ذکر طویل نہیں جبکہ قنوت وتر میں مسنون قنوت ’’اللھم انا نستعینک الخ‘‘ ذکر طویل ہے لہٰذا قنوت میں ہاتھ باندھے جائیں گے لیکن قومہ میں نہیں باندھے جائیں گے۔

لمافی المصنف لابن ابی شیبة(۵۳۱/۴): ۵۹۴۔ فی رفع الیدین فی قنوت الوتر۔

۷۰۲۶۔ حدثنا ابو الاحوص، عن مغیرة، عن ابراھیم قال: ارفع یدیك للقنوت۔

۷۰۲۷۔ حدثنا معاویة بن ھشام قال: حدثنا سفیان، عن لیث، عن عبدالرحمن بن الأسود، عن ابیه، عن عبدالله بن مسعود: انه کان یرفع یدیه فی قنوت الوتر۔

۷۰۲۸۔ حدثنا عبدالرحمن بن محمد المحاربي: عن لیث: عن ابن الاسود. عن ابیه. عن عبدالله بن مسعود: انه کان یرفع یدیه اذا قنت فی الوتر۔

وفی الدرالمختار (۶/۲): (ویکبر قبل رکوع ثالثته رافعا یدیه) کمامر ثم یعتمد. وقیل کالداعی (وقنت فیه) ویسن الدعاء المشھور، ویصلی علی النبی ﷺ به یفتی۔

وفی الشامیة تحته: (قوله رافعاً یدیه) أی سنة الی حذاء أذنیه کتکبیرة الاحرام وھذا کما فی الامداد

عن مجمع الروايات لوفى وقت. أما فى القضاء عند الناس فلا يرفع حتى لا يطلع احد على تقصيره اهـ (قوله كما مر) أى فى فصل اذا اراد الشروع فى الصلوٰة عند قوله ولا يسن رفع اليدين الا فى سبع۔ (قوله ثم يعتمد) أى يضع يمينه على يساره كمافى حالة القراءة ح (قوله وقيل كالداعى) أى عن أبي يوسف انه يرفعهما الى صدره وبطونهما الى السماء امداد. والظاهر أنه يبقيهما كذلك الى تمام الدعاء على هذه الرواية تامل (قوله وقنت فيه) اى فى الوتر او الضمير الى ماقبل الركوع۔

وفى اعلاء السنن(١٢٢/٦): وأما السادس: فلم أرفقهائنا تعرضوا له خصوصاً. نعم مقتضى اطلاقهم ان من محال الرفع القنوت وهو يعم قنوت النوازل أيضاً ان يرفع يديه عنده. ولكن الدليل الذى استدل به الحنفية للرفع فى قنوت الوتر لايعم غيره. بل يختص به. هو أثر ابراهيم النخعى بسند صحيح عند الطحاوى. قال''ترفع الايدى فى سبع مواطن. فى افتتاح الصلاة وفى التكبير للقنوت فى الوتر الخ۔

وفيه ايضاً(صـ١٢٤. ١٢٣): بقى أنه لا دليل فيه ولا فى أثر غيره على أنه ﷺ كان يضع يديه بعد رفعهما حيال منكبيه او يرسلهما. فمن اين قال ابو حنيفة وابو يوسف رحمهما الله بالوضع فى القنوت بعده؟ والجواب: أن الوضع والارسال بعد الرفع مسكوت عنهما فى الاحاديث. فجرى محمد رحمه الله على الأصل وهو الإرسال، لأن الوضع عمل حادث يحتاج الى الدليل. وأخذ الشيخان بالقياس وقالا: إن ارسال اليدين زمانا طويلا ينافى الخشوع. وإنما السنة أن نقول وضع الكف على الكف تحت السرة كما مر فى باب صفة الصلاة. وكان مقتضى ذلك ان نقول بالوضع فى القومة بين الركوع والسجدة أيضاً. لكن فى الوضع للقيام اليسير وتركه معا حرج. فقلنا بأن الوضع سنة قيام فيه ذكر مسنون طويل. فيضع يديه فى القنوت للنازلة أيضاً. لكونه ذكر اطويلا. ولا يرفعهما حذاء الوجه. فقدروى مسلم عن حصين عن عمارة بن رويبة: ''رأى بشر بن مروان على المنبر رافعاً يديه، فقال، قبح الله هاتين اليدين. لقد رأيت رسول الله ﷺ مايزيد على أن يقول بيده هكذا. وأشار باصبعة المسبحة اهـ (٢٨٧/١) فلما أنكر على الرفع فى حال الخطبة التى هى مشابهة بالصلاة فكيف فى عين الصلاة؟ فما ورد عن النبى ﷺ أنه رفع يديه يدعو فى القنوت للنازلة. وما ورد عن عمر مثله محمول على الرفع القصير الذى يكون قبل القنوت وهذا هو الأمر التاسع فافهم۔

... وايضاً(صـ١٢٣): والحاصل: أنه يضع عند الشيخين فى القنوت سواء كان قبل الركوع أو بعده.

وعند محمد یرسل ولا یرفع یدیه فی خلال القنوت حذاء الوجه او الصدر کرفعهما فی الدعاء خارج الصلاۃ عندهم اتفاقاً. فإن المشروع عندهم بعد رفعهما فی افتتاح الصلاۃ أو عند القنوت، إما الوضع وإما الإرسال لا إبقائهما مرفوعتین الخ۔

(۲۸۳) قنوت میں ہاتھ باندھنے اور قومہ میں نا باندھنے کا ثبوت

سوال...... مفتی صاحب آپ مسجد اکبری کے بورڈ پر سنت کے مطابق نماز شائع کر رہے ہیں بہت مفید سلسلہ ہے لیکن ایک بات دریافت کرنی ہے کہ قنوت میں ہاتھ باندھنے کا کوئی نص ہے؟ نیز قومہ میں ہاتھ نہ باندھنے کا کسی حدیث سے ثبوت ہے یہ دونوں مسئلے نماز کے انتہائی اہم ہیں لیکن قیاس پر چلتے ہیں آپ نص ذکر کردیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اولاً یہ بات ذہن نشین رہے کہ فقہاء مجتہدین نے قرآن وحدیث کے نصوص کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف قواعد بنائے ہیں ان قواعد کے مؤیدات ومستندات نصوص فقہاء کے سامنے ہوتے تھے لہٰذا اس اصول کے مطابق کسی جزیئے کا حکم بیان کرنا قیاس یا عقل نہیں کہلائے گا بلکہ یہ نقل اور منصوص اصول پر تفریع ہوگی لہٰذا زیر بحث مسئلے میں فقہاء کا طے کردہ یہ اصول ہے کہ

"الوضع سنة قیام فیه ذکر مسنون طویل فیضع یدیه فی القنوت ایضا لکونه ذکرا طویلا"

(اعلاء السنن ۶/۱۲۳۔ ۱۲۴)

"یعنی وضع (ہاتھ پر ہاتھ باندھنا) ایسے قیام میں جس میں مسنون طویل ذکر ہو سنت ہے پس قنوت نازلہ میں بھی ہاتھ باندھے جائیں گے کیونکہ اس میں ذکر طویل ہے۔"

یہ اصول نصوص سے مستنبط ہے اس کے نصوص درج ذیل ہیں:

۱)۔"وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ" "یعنی قیام میں خشوع کے ساتھ کھڑے ہو اس آیت قرآنی میں قیام میں خشوع وخضوع کا حکم ہے اب جس قیام میں طویل ذکر ہو وہاں ہاتھ کھولے رکھنا (ارسال) خشوع کے خلاف بلکہ تواضع سے بھی کچھ بعید ہے جبکہ ایسا مختصر قیام جس میں قرار وثبات نہ ہو اس میں ارسال ہاتھ نہ باندھنا خشوع کے خلاف نہیں۔ لہٰذا اس قرآنی نص سے بھی یہ قاعدہ مستنبط ہوتا ہے۔

۲)۔ جنازے کی نماز میں جو قیام ہے اس میں ہاتھ باندھنا صریح منصوص ہے:

"عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ ان النبی ﷺ صلی علی جنازۃ فوضع یدہ الیمنی علی یدہ الیسری"

وعن ابی ھریرۃ کان رسول اللہ ﷺ اذا صلی علی الجنازۃ رفع یدیه فی اول تکبیرۃ ثم وضع یدہ الیمنی علی الیسری" (دار قطنی ۲/۶۱)

آپ علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت یہ صریح نصوص بھی اس قاعدے کے مؤید ہیں کیونکہ جنازے میں تکبیر افتتاح کے بعد ذکر مسنون طویل ہے لہٰذا ہاتھ باندھے گئے ہیں اسی وجہ سے سلام سے قبل کی تکبیر کے بعد چونکہ ذکر نہیں لہٰذا ہاتھ چھوڑ دیئے جاتے ہیں گویا کہ جنازے کی نماز میں تکبیر افتتاح کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ باندھ لینا بھی ذکر مسنون طویل اور ذکر قصیر کا فرق اور اس قاعدے کے لیے شاہد ہے۔

۳)۔عمل متوارث بھی ایک بڑی دلیل ہے جمیع امت کا قومہ میں ہاتھ نہ باندھنا متوارث رہا ہے اور اب بھی اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں لہٰذا یہ عمل متوارث بھی قومے میں ہاتھ نہ باندھنے اور اس بیان کردہ قاعدے کیلئے مؤید ہے۔

لہٰذا فقہاء نے اسی قاعدے کی بنیاد پر ثناء، قنوت، نماز جنازہ اور وہ مقامات جہاں ذکر مسنون طویل ہو اس میں ہاتھ باندھنے کو سنت قرار دیا ہے اور قومہ، تکبیرات عیدین کے درمیان اور دیگر وہ مواقع جہاں ذکر مسنون طویل نہ ہو ارسال یعنی ہاتھ چھوڑنے کا حکم مسنون قرار دیا ہے، لہٰذا نصوص، روایت اور درایت کو مدنظر رکھتے ہوئے قومے میں ہاتھ نہ باندھنا ہی سنت ہے اور یہ فقہاء کے ذکر مسنون طویل کے قاعدے پر متفرع ہے جو کہ نصوص کی روشنی میں بنایا گیا چنانچہ قرآنی آیت "وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" جنازے میں ہاتھ باندھنے کا نص اور امت کا عمل متوارث قومہ میں ہاتھ چھوڑنے کے دلائل ہیں لہٰذا اسے قیاس محض کہنا بے جا اور محل نظر ہے نیز قیام کی طرح قنوت میں ہاتھ باندھنا بھی اس میں موجود ذکر مسنون طویل کی بنیاد پر سنت ہے۔

لمافی الدار القطنی (۶۱/۲): عن ابی هريرة رضی الله عنه ان النبی صلى الله عليه وسلم صلى على جنازة فوضع يده اليمنى على يده اليسرىٰ۔

وفی المحيط البرهانی (۱۰۹/۲۔ ۱۱۰): وكان الشيخ الاجل شمس الائمة الحلوانی يقول: كل قيام فيه ذكر مسنون فالسنة فيه الاعتماد كمافی حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كمافی تكبيرات العيد فالسنة فيه الارسال وبه كان يفتی الشيخ الامام شمس الائمة السرخسی والصدر الامام الاجل الكبير برهان الدين الاجل الشهيد۔

وفی اعلاء السنن (۱۲۲/۶۔ ۱۲۳): واما الثامن فحكمه ما ذكره الطحطاوی على مراقی الفلاح تحت قول الماتن: ويسن وضع الرجل يده اليمنى على اليسرىٰ بما نصه ولا بدفی ذلك القيام ان يكون فيه ذكر مسنون ومالا فلا مالم يطل فحينئذ يضع كما فی السراج وغيره وقال محمد لا يضع حتى يشرع فی القراءة فهو عندهما ای الشيخين سنة قيام فيه ذكر مسنون وعنده سنة للقراءة فيرسل عنده حالة الثناء والقنوت وفی صلاة الجنازة وعندهما يعتمد فی الكل واجمعوا على انه يرسل فی القومة بين الركوع والسجود وبين تكبيرات العيدين لعدم الذكر والقراءة فی هذه المواضع فان قيل فی القومة من الركوع ذكر مشروع وهو التسبيح والتحميد فينبغی الوضع فيها

علی قولهما: اجیب بان المراد قیام له قرار وهذا لا قرارله...... والحاصل انه یضع عند الشیخین فی القنوت سواء کان قبل الرکوع او بعده وعند محمد یرسل ولا یرفع یدیه فی حال القنوت حذاء الوجه او الصدر کرفعهما فی الدعاء خارج الصلوة .... بقی انه لا دلیل فیه ولا فی اثر غیره انه صلی اللہ علیہ وسلم کان یضع یدیه بعدرفعهما حیال منکبیه اویرسلهما فمن این قال ابو حنیفة وابو یوسف بالوضع فی القنوت بعده؟ والجواب ان الوضع والارسال بعد الرفع مسکوت عنها فی الحدیث فجری محمد فی الاصل وهو الارسال لان الوضع عمل حادث یحتاج الی الدلیل واخذ الشیخان بالقیاس وقالا ان ارسال الیدین زمانا طویلا ینافی الخشوع وانما السنة ان نقول وضع الکف علی الکف تحت السرة کما مر فی باب صفة الصلاة وکان مقتضی ذلك ان نقول بالوضع فی القومة بین الرکوع والسجود ایضاً لکن فی الوضع للقیام الیسیر وترکه معا حرج فقلنا بان الوضع سنة قیام فیه ذکر مسنون طویل فیضع یدیه فی القنوت النازلة ایضاً لکونه ذکرا طویلاً۔

(۲۸۴) دعائے قنوت کی جگہ سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جن عورتوں کودعائے قنوت نہیں آتی وہ اس کی جگہ ''سورہ اخلاص'' پڑھتی ہیں توکیااس سے دعائے قنوت کاوجوب اداہوجائے گایانہیں؟اگرجواب نفی میں ہےتوکیاان عورتوں پر ان سب وترنمازوں کی قضاءکرناواجب ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......وتر کی تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے کوئی مخصوص دعا پڑھناواجب نہیں بلکہ کوئی بھی دعا پڑھ سکتے ہیں البتہ احنافؒ کے نزدیک مشہوردعا''اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونومن بک... الخ'' پڑھناسنت ہے۔لیکن اگر کسی شخص کویہ دعایادنہیں تواسے چاہیے کہ اس کویادکرےاورجب تک یہ دعایادنہیں ہوتی اس کی جگہ دوسری دعامثلاً''رَبَّنَاآتِنَافِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّفِی الآخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَاعَذَابَ النَّار''یا''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ''تین مرتبہ پڑھنےسےنمازدرست ہوجائےگی۔

لہٰذاصورت مسئولہ میں جن عورتوں کومذکورہ دعایادنہیں توان کوچاہیےکہ اس کویادکرنےکی کوشش کریں اورجب تک یادنہ ہوتومذکورہ دعاؤں میں سےکوئی دعاپڑھ سکتی ہیں اس سےنمازدرست ہوجائےگی۔عام حالت میں حکم یہی ہےتاہم اگرکسی شخص کودعائےقنوت یاکوئی دعایادنہیں تواگروہ اس کی جگہ تین مرتبہ''سورۂ اخلاص''پڑھ لیتاہےتواس کی نمازدرست ہوجائےگی۔

لمافی الشامیة (۲/۴۰۷): (قوله ویسن الدعاء المشهور) قد منافی بحث الواجبات التصریح بذلك عن النهر. وذکر فی البحر عن الکرخی ان القنوت لیس فیه دعاء مؤقت. لانه روی عن الصحابة

ادعية مختلفة. لانّ المؤقت من الدعا يذهب برقة القلب... ومن لا يحسن القنوت يقول۔ ربنا اتنا فی الدنيا حسنه۔ الآية۔ وقال ابو ليث يقول: اللهم اغفرلی يكررها ثلاثا، وقيل يقول يارب ثلاثا. ذكره فی الذخيرة۔

وفی السعاية فی كشف مافی شرح الوقاية، باب صفة الصلاة(۱۳۹/۲): وفی مقدمة الغزنوية: ان كان لايحسن القنوت يقرأ ثلاث مرات ''قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ'' او ثلاث مرات ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ولِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ''۔

وفی حاشية الطحطاوی على الدر المختار (۲۸۰/۱): (وقوله ويسن الدعاء المشهور) وهو اللهم انا نستعينك ونستهديك ونستغفرك ونتوب اليك ونومن بك...الخ ويجوز ان يقتصر فی دعا القنوت على نحو قوله رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ او يقول يا رب ثلاثا او اللهم اغفرلی ثلاثا لانه غير مؤقت فی ظاهر الرواية مطلقا سواء كان يحسن الدعا اولا...

(۲۸۵)وتر کی تیسری رکعت کے رکوع سے قنوت کیلئے لوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وتر کی نماز پڑھ رہا تھا، تیسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، جب رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی تو وہ واپس کھڑا ہوگیا اور دعائے قنوت پڑھ کر دوبارہ رکوع کیا، اب پوچھنا یہ تھا کہ آیا یہ شخص سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دے تو نماز درست ہوجائے گی یا نہیں؟ یا پھر اسے دوبارہ سے نماز پڑھنا چاہیے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر سجدہ سہو کرلیا جائے تو نماز درست ہوجائے گی۔البتہ اس صورت میں قیام کی طرف واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔

لمافی الشامية(۸۱/۲): والحاصل ان مايقرؤه يلتحق بما قبل الركوع ويلغو هذا الركوع فتلزم اعادته. حتى لو لم يعده بطلت صلاته بل ذكر فی شرح المنية انه لو قام لاجل القراءة ثم بدا له فسجد ولم يقرأ ولم يعد الركوع قال بعضهم تفسد لانه لما انتصب قائماً للقراءة ارتفض ركوعه وان كان البعض يقول لا تفسد اهـ وهذا كله بخلاف مالو تذكر القنوت فی الركوع فالصحيح انه لايعود. ولو عاد وقنت لا يرتفض ركوعه وعليه السهو لان القنوت اذا اعيد يقع واجباً لا فرضاً۔

وفی الھندیۃ (۱/۱۲۷): وکذا اذا سجد فی موضع الرکوع أو رکع فی موضع السجود أو کرّر رکناً أو قدم الرکن أو أخرہ ففی ھذہ الفصول کلھا یجب سجود السھو۔

(۲۸۶)رمضان میں عشاء کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کاوتر باجماعت پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے رمضان المبارک میں نمازِ عشاء جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی آیا یہ آدمی وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ مفتی بہ قول ذکر کریں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھی ہو، وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے۔یہی مفتی بہ قول ہے۔

لمافی حلبی کبیری(ص۴۱۰): واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمۃ الکرابیسی انہ لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذا لم یتابعہ فی التراویح لا یتابعہ فی الوتر. وقال ابویوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وکذا اذا لم یدرك معہ شیئا منھا وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وھو الصحیح ذکرہ ابو اللیث وکذا قال ظھیر الدین المرغینانی الخ۔

وفی حاشیۃ طحطاوی علی الدر المختار(۱۰/۲۹۷): قولہ فلیراجع قضیۃ التعلیل فی المسئلۃ السابقۃ بقولھم لانھا تبع أن یصلی الوتر بجماعۃ فی ھذہ الصورۃ لانہ لیس بتبع للتراویح ولا للعشاء عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ انتھیٰ حلبی۔

وفی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند(۴/۱۵۲): جماعت وتر میں شریک ہوسکتا ہے۔ کذا صرح بہ فی الطحطاوی. اورعلامہ شامی نے بے شک عدم جواز نقل کیا ہے لیکن طحطاوی کی عبارت میں جواز کی تصریح ہے، اور قاعدہ بھی مقتضی جواز کو ہے اس لئے ہمارے اکابر اساتذہؒ وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ وجہ عدم جواز کی کچھ نہیں ہے۔

(۲۸۷)صرف رمضان میں وتر جماعت سے ادا کرنے کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے مہینہ میں وتر باجماعت ادا کیے جاتے ہیں دوسرے مہینوں میں انفرادی طور پر ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے نیز رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں فرض ہیں یا واجب یا سنت؟

الجواب بعون الملک الوھاب......رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

سے اثر سے ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور دوسرے مہینوں میں انفرادی اس لئے ادا کیے جاتے ہیں کہ ان مہینوں میں کوئی اثر وارد نہیں ہے۔ وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں یہ مستحب ہے۔

لمافی البحر الرائق(۲/۶۹): (قوله ویوتر بجماعة فی رمضان فقط) أی علی وجه الاستحباب وعليه اجماع المسلمين كمافى الهداية واختلفوا فى الافضل ففى الخانية الصحيح ان اداء الوتر بجماعة فى رمضان أفضل لان عمر رضی اللہ عنہ كان يؤمهم فى الوتر الخ۔

وفى الشامية(۲/۴۸،۴۹): أن جماعة الوتر تبع لجماعة التراويح وان كان الوتر نفسه أصلا فى ذاته لان سنة الجماعة فى الوتر انما عرفت بالأثر تابعة للتراويح......

(ص۴۹) فالوتر كالتراويح فكما أن الجماعة فيها سنة فكذلك الوتر بحر وفى شرح المنية والصحيح أن الجماعة فيها أفضل الا ان سنيتها ليست كسنية جماعة التراويح الخ۔

(۲۸۸) وتر میں نو سورتیں پڑھی جانے والی حدیث پر عمل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں (۹) سورتیں تلاوت فرماتے تھے پہلی رکعت میں سورۃ التکاثر، سورۃ القدر، سورۃ الزلزال، دوسری رکعت میں سورۃ العصر، النصر، الکوثر اور تیسری رکعت میں سورۃ الکافرون، اللھب اور سورۃ الاخلاص، اب اگر کوئی اتباع سنت کی نیت سے ان (۹) سورتوں کو پڑھے تو جو ترتیب حدیث میں وارد ہوئی ہے اس طرح پڑھنا مسنون ہوگا یا قرآن شریف کی ترتیب پر پڑھنا مسنون ہوگا۔ کیا ذخیرہ احادیث میں اس مضمون کی حدیث ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......فرض اور واجب نماز میں ترتیب سے قرأت کرنا قرأت کے واجبات میں سے ہے اور اس کی مخالفت کرنا مکروہ ہے البتہ نوافل کے اندر اس کی گنجائش ہے اور چونکہ وتر کی نماز ہمارے ہاں واجب ہے اور واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب بھی صحیح قول کے مطابق توقیفی ہے لہٰذا اس کی رعایت کرنا ضروری ہے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے نمازِ وتر کے اندر پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص پڑھنے والی روایت کو سنیت پر محمول کیا ہے لہٰذا یہی طریقہ سنت ہے البتہ مسند احمد کی روایت سے ان ''۹'' سورتوں کا پڑھنا بھی ثابت ہے لیکن اس میں چونکہ ترتیب توقیفی (جس کی رعایت واجب ہے) کا عکس ہے اس لئے اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وتر کی نماز میں سورۃ الاعلی، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص پڑھنا ہی مسنون ہے البتہ یہ روایت (کہ جس میں ان ۹ سورتوں کا پڑھنا مذکور ہے) جواز پر محمول ہے۔ اگر کبھی کبھار اس طرح پڑھ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور بعض حضرات نے وتر میں مسنون قرأت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(۱)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الاعلی، دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

(۲)۔پہلی میں سورۃ التکاثر، دوسری میں سورۃ العصر، تیسری میں سورۃ الکافرون۔
(۳)۔پہلی رکعت میں سورۃ القدر، دوسری رکعت میں سورۃ النصر، تیسری میں سورۃ اللھب۔
(۴)۔پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال، دوسری میں سورۃ الکوثر اور تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

اگر اس تاویل کو لے لیا جائے تو اس میں سورتوں کی ترتیب کی بھی رعایت ہوجاتی ہے اور تمام روایات پر عمل بھی ہوجاتا ہے لیکن اس میں بھی پہلا طریقہ زیادہ راجح ہے لانہ اکثر عملاً، البتہ وتر کی جماعت میں (جو کہ صرف رمضان میں ہوتی ہے) اس پر بھی التزام نہ کیا جائے۔

لما فی الترمذی (۱/۱۰۶): عن عبدالعزیز بن جریج قال سالت عائشة بأی شئ کان یوتر رسول الله ﷺ قالت کان یقرأ فی الاولی بسبح اسم ربك الاعلی وفی الثانیة بقل یایها الکافرون وفی الثالثة قل هو الله احد والمعوذتین۔

وفی تحفة الاحوذی (۱/۳۴۱): والذی اختاره اکثر اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعدهم ان یقرأ بسبح اسم ربك الاعلی وقل یاایها الکفرون وقل هو الله احد ویقرأ فی کل رکعة من ذلك بسورة وبه قال الحنفیة۔

وفی المسند للامام احمد(۱/۱۴۳):عن علی رضی الله تعالیٰ عنه قال کان رسول الله ﷺ یوتر بتسع سور من المفصل، قال اسود: یقرأ فی الرکعة الأولی الهاکم التکاثر.وإنا انزلناه فی لیلة القدر. واذا زلزلت الارض وفی الرکعة الثانیة والعصر واذا جاء نصر الله والفتح وانا اعطینالك الکوثر وفی الرکعة الثالثة قل یاایها الکافرون وتبت یدا ابی لهب وقل هو الله احد۔

وفی الموسوعة الفقهیة(۲۷/۲۹۸): اتفق الفقهاء علی انه یقرأ فی کل رکعة من الوتر الفاتحة ... ثم ذهب الحنفیة الی انه لم یوقت فی القراءة فی الوتر شئ غیر الفاتحة فما قرأ فیه فهو حسن. وما ورد عن النبی ﷺ: انه قرأ به فی الأولی بسورة سبح اسم ربك الاعلی وفی الثانیة الکافرون. وفی الثالثة بالاخلاص فیقرأ به احیانا. ویقرأ بغیره احیانا للتحرز عن هجران باقی القرآن۔

وفی الهندیة (۱/۷۹): هذا کله فی الفرائض اما فی السنن فلا یکره هکذا فی المحیط۔

وفی الشامیة (۱/۵۴۴): لان الشارع إذا لم یعین علیه شیئا تیسیرا علیه کره له ان یعین... لما فیه من هجر الباقی وایهام التفضیل... وهذا اذا صلی الوتر بجماعة وان صلی وحده یقرأ کیف شاء اهـ...... فیستحب ان یقرا ذلك احیانا تبرکا بالماثور

وایضاً ذکر فی وتر البحر عن النهایة انه لا ینبغی ان یقرأ سورة متعینة علی الدوام لئلا یظن بعض الناس انه واجب... اما لو قرأه للتیسیر علیه او تبرکا بقراءته علیه السلام فلا کراهة ولکن

بشرط ان یقرأ غیرها احیانا لئلا یظن الجاهل ان غیرها لا یجوز...

وفی الشامية (۶/۲): والسنة السور الثلاث ای الاعلی والکافرون والاخلاص لکن فی النهاية ان التعیین علی الدوام یفضی الی اعتقاد بعض الناس أنه واجب وهو لا یجوز فلو قرأ بما ورد به الآثار احیانا بلا مواظبة یکون حسنا...

وفی الدر المختار (۵۴۶/۱): ویکره الفصل بسورة قصیرة وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرة... وفی الشامية تحته (وقوله وان یقرأ منکوسا) بأن یقرأ فی الثانية سورة اعلی مما قرأ فی الاولی لان ترتیب السور فی القراة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهیلا لضرورة التعلیم...

وفی مرقاة المفاتیح (۱۱۱/۵): بخلاف ترتیب السور فانه لما کان مختلفا فیه کرهت مخالفته لغیر عذر. ولما ورد أنه ﷺ قرا النسآء قبل آل عمران لبیان الجواز او نسیانا لیعلم الصحة به، مع ان الا سح ان ترتیب السور توقیفی۔

(۲۸۹) وتر کی نماز دو سلاموں سے پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ارادہ انشاء اللہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کے ائمہ وتر کی نماز میں دو رکعات پر سلام پھیرتے ہیں پھر اسکے بعد ایک رکعت پڑھ کر دوبارہ سلام پھیرتے ہیں، آیا میرے لئے اسطرح انکی اقتدا میں نماز پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو کیا انفرادا وتر کی نماز پڑھوں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں اصح قول کی بنا پر کسی حنفی المسلک کو ایسے امام کی اقتداء درست نہیں بلکہ انفرادی نماز پڑھ لی جائے۔

لمافی الشامية (۸/۲): ولم یذکر الشارح تعلیل اشتراط عدم الفصل بسلام اکتفاءً بما اشار الیه قبله من ان الاصح اعتبار اعتقاد المقتدی والسلام قاطع فی اعتقاده فیفسد اقتدائه وان صح شروعه معه اذ لا مانع منه فی الابتداء کما افاده ح

(۲۹۰) وتر میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ عربوں کے یہاں وتر دو اور ایک رکعت کر کے پڑھی جاتی ہے، حنفی ایک نیت کے ساتھ تینوں رکعت پڑھتے ہیں، اگر شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھی جائے (رمضان میں) تو پھر حنفی ان کے

ساتھ نماز پڑھیں یا نہیں؟ اکثریت حنفی کی پڑھتی ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟
(۲)۔ دوسری بات یہ ہے کہ نیت کیا کرنی چاہیئے امام نماز سے پہلے بولتا ہے کہ دو رکعت نماز عشاء ہے اور پھر بعد میں کہتا ہے کہ ایک رکعت نماز وتر ہے، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ نیت کس نماز کی کرنی چاہیئے لہٰذا اکثر حنفی یہ نیت کرتے ہیں کہ ''جو نیت امام کی وہ میری'' کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ احناف کے ہاں وتر تین رکعات ہیں جو کہ ایک سلام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شافعی امام وتر میں پہلی دو رکعات کے بعد سلام پھیرتا ہے اور اس کے بعد ایک رکعت پڑھ کر آخر میں پھر سلام پھیرتا ہے تو ایسے شافعیؒ امام کے پیچھے حنفی کی اقتداء شرعاً درست نہیں ہے۔
(۲)۔ اگر شافعی امام دو رکعات کے بعد سلام نہیں پھیرتا ہے بلکہ تینوں رکعات کیلئے آخر ہی میں سلام پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے حنفی کی اقتداء درست ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ حنفی وتر کی نیت میں مطلقاً وتر کا ذکر کرے۔

لما فی الدر المختار(۷/۲): (وصح الاقتداء فیه) ففی غیره اولی ان لم یتحقق منه مایفسدها فی اعتقاده فی الاصح کما بسطه فی البحر(بشافعی) مثلاً(لم یفصله بسلام) لا ان فصله(علی الاصح) فیهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد (و) لذا (ینوی الوتر لاالوتر الواجب کما فی العیدین) للاختلاف۔

(۲۹۱) حنفی کا شافعی امام کے پیچھے وتر میں لفظ واجب ملانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے یہ مسئلہ سنا ہے کہ حنفی آدمی شافعی آدمی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ امام اس حنفی مقتدی کے مسائل اختلافیہ میں اس کی رعایت رکھتا ہو، اب میرے ذہن میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی حنفی وتر یا عیدین شافعی امام کے پیچھے پڑھتا ہے تو چونکہ احناف کے نزدیک یہ نمازیں واجب ہیں اور شوافع کے نزدیک غیر واجب ہیں، آیا اس صورت میں اقتداء درست ہوجائے گی؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وتر کے ساتھ واجب کا لفظ نہ کہو تو پھر ہوجائے گی کیا یہ درست ہے؟ اس صورت میں بھی تو عملاً نماز بہرحال مقتدی کی واجب ہی رہے گی تو اس کا کیا جواب ہوگا؟
براہ کرم تفصیل سے دلائل کے ساتھ میرے اس مسئلے کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... حنفی آدمی کا شافعی مسلک امام کی اقتداء میں وتر ادا کرنا درست ہے اس شرط کے ساتھ کہ امام وتر کی دوسری رکعت میں سلام نہ پھیرے اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ امام نے مطلق وتر کی نیت کی ہو، وتر سنت کی نیت نہ کی ہو، اور اس دوسری شرط کا علم چونکہ قدرے دشوار ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ وتر الگ سے یا حنفی امام کے پیچھے پڑھے اور یہ بات کہ شافعی امام کے پیچھے جب وتر پڑھے تو لفظ واجب وتر کے ساتھ نہ کہے جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے (وینوی الوتر لا الواجب) استحباب پر محمول ہے جیسا کہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاوی (۱/ ۳۰۲) میں تصریح کی ہے۔ اگر کوئی لفظ واجب ساتھ کہہ دے تو اس سے صحت اقتداء پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ احناف کے نزدیک وتر اور عید کی نماز واجب ہے اور شوافع کے نزدیک سنت ہے اور فرض یا واجب پڑھنے والے کیلئے نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرنا درست نہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں اقتداء کرنا درست نہ ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عقیدہ میں شافعی امام اور حنفی کا اختلاف ہے حنفی کے نزدیک وتر واجب اور شافعی کے نزدیک سنت ہے لیکن نیت دونوں کی ایک نماز یعنی وتر یا عید کی ہے پس اس نیت کے اتحاد کا اعتبار کرتے ہوئے اقتداء درست ہے اور وتر میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وتر کا وجوب ضعیف ہے کیونکہ بہت سی چیزوں میں وتر کی سنت سے مشابہت ہے مثلاً ایک یہ کہ وتر کیلئے باقی فرائض کی طرح مستقل وقت نہیں بلکہ عشاء کے تابع ہے اور اس کیلئے اذان ہے اور نہ ہی اقامت، یہی وجہ ہے کہ سنت کی طرح وتر کی بھی تمام رکعات میں قرأت فرض ہے پس ان وجوہات کی بنا پر اقتداء کرنا درست ہے۔

وفی الهندية(۱/۸۴): قال الفضلی یصحّ اقتداء الحنفی فی الوتر بمن یری مذهب ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ هكذا فی الخلاصة۔

وفيه ايضاً(۱/۱۱۱): ولو صلی الوتر بمن يقنت فی الوتر بعد الركوع فی القومة والمقتدی لا يری ذالك تابعه فيه هكذا فی فتاوی قاضيخان۔

وفی الدر المختار(۲/۸-۷): (وصح الاقتداء فيه) ففی غيره أولی ان لم يتحقق منه ما يفسدها فی اعتقاده فی الأصح كما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلاً (لم يفصله بسلام) لا ان فصله (علی الاصح) فيهما للاتحاد وان اختلف اعتقاد (و) لذا (ينوی الوتر لا الوتر الواجب كمافی العيدين) للاختلاف۔

وفی الشامية تحته: (قوله للاتحاد الخ) علة لصحة الاقتداء۔ ورد علی مامرّ من الإرشاد بما نقله أصحاب الفتاوی عن ابن الفضل أنه يصح الاقتداء لأن كلا يحتاج إلی نية الوتر، فأهدر اختلاف الاعتقاد فی صفة الصلاة، واعتبر مجرد النية اهـ...... ورده فی البحربما صرّح به فی التجنيس ايضاً من ان الامام ان نوی الوتر وهو يراه سنة جاز الاقتداء كمن صلی الظهر خلف من يری ان الركوع سنة وان نواه بنية التطوع لايصح الاقتداء لانه يصير اقتداء المفترض بالمتنفّل اهـ......

(قوله لا الوتر الواجب) الذی ينبغی ان يفهم من قولهم انه لا ينوی انه واجب انه لا يلزمه تعيين الوجوب لامنعه من ذالك لانه ان كان حنفياً ينبغی ان ينويه ليطابق اعتقاده وان كان غيره فلا تضره تلك النية بحر (قوله للاختلاف) ای فی الوجوب والسنيّة وهو علة للعيدين

فقط۔

(۲۹۲) وتر کے بعد دو رکعت کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک دیندار انسان ہے تمام نمازیں باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہے چنانچہ وہ روزانہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھتا ہے لیکن عمرو کہتا ہے کہ کھڑے ہوکر پڑھنا چاہیے کیونکہ بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا ملے گا، اب پوچھنا ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے؟ بینوا توجروا

الجواب بعون الملک الوھاب......نفل نماز مطلقاً چاہے وتر کے بعد کی دو رکعت ہوں یا دیگر نوافل، کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے اور اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھے تو اس کو آدھا اجر ملے گا۔

لمافی مشکوۃ المصابیح (ص۱۱۳): وعن أبي امامة أن النبی ﷺ کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما إذا زلزلت وقل یاأیها الکفرون رواه احمد۔

وفی النسائی (۱/۱۱۸): عن عبدالله بن عمرو قال رأیت النبی ﷺ یصلی جالساً فقلت حدثت انك قلت ان صلوة القاعد علی النصف من صلوة القائم وأنت تصلی قاعداً قال أجل ولکنی لست کأحد منکم۔

وفی هامشه (ص۵): قوله لست کأحد منکم یفید انه مخصوص بینهم بأن لا ینقص له فی الاجر فی صلاته قاعداً وقائماً کذا قال السندی۔

وفی الدر المختار(۲/۳۶): (ویتنفل مع قدرته علی القیام قاعداً)... وفیه أجر غیر النبی ﷺ علی النصف الا بعذر۔

وفی الشامیة تحته: (قوله أجر غیر النبی ﷺ) أما النبی ﷺ فمن خصائصه أن نافلته قاعداً مع القدرة علی القیام کنافلته قائماً... (قوله علی النصف الا بعذر) أما مع العذر فلا ینقص ثوابه عن ثوابه قائماً۔

وفی شرح النووی علی هامش الصحیح المسلم(۱/۲۵۴): قلت الصواب أن هاتین الرکعتین فعلهما ﷺ بعد الوتر جالساً لبیان جواز الصلوة بعد الوتر وبیان جواز النفل جالساً ولم یواظب علی ذالك بل فعله مرة أو مرتین أو مرات قلیلة ولا تغتر بقولها کان یصلی فإن المختار الذی علیه الأکثرون والمحققون من الأصولیین أن لفظة کان لایلزم منها

الدوام ولا التكرار وانما هى فعل ماض يدل على وقوعه مرة فان دل دليل على التكرار عمل به وإلا فلا تقتضيه بوضعها وقد قالت عائشة رضى الله عنها كنت أطيب رسول الله ﷺ لحله قبل أن يطوف ومعلوم أنه ﷺ لم يحج بعد أن صحبته عائشة الاحجة واحدة وهى حجة الوداع فاستعملت كان فى مرة واحدة۔

فصل فی سجود السھو والتلاوۃ

(سجدۂ سہو اور سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

(۲۹۳) سجدۂ سہو کے واجب ہونے کی صورتیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر نماز میں یہ پریشانی لاحق ہوجاتی ہے کہ کچھ چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، کبھی رکوع وسجدے کی تسبیحات چھوٹ جاتی ہیں اور کبھی کیا، میں اس پر سجدہ سہو کرلیا کرتا تھا، پھر میرے ایک دوست نے کہا کہ ہر غلطی پر سجدۂ سہو نہیں ہوتا بلکہ بعض مخصوص صورتیں ہیں کسی عالم دین سے اس کی تفصیل پوچھ لو۔ براہ کرم آپ مجھے اس تحریر کے ذریعے بتادیں کہ سجدہ سہو کن کن صورتوں میں کرنا ضروری ہوتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سجدہ سہو کسی واجب کے چھوٹ جانے یا واجب یا فرض میں تاخیر یعنی دیر ہوجانے یا کسی فرض کو اس کی جگہ سے ہٹا کر پہلے کردینے یا کسی فرض کو دوبارادا کردینے سے واجب ہوجاتا ہے اور سجدہ سہو سے اس بھول کی تلافی ہوجاتی ہے اگر قصداً ایسا کرے تو سجدۂ سہو سے کام نہ چلے گا بلکہ نماز کا دوہرانا لازم ہوگا اور اگر کوئی فرض چھوٹ جائے تو اس کی تلافی سجدۂ سہو سے نہ ہوگی۔ اور تسبیحات وغیرہ جو سنت اور مستحب کی قبیل سے ہیں ان کے چھوٹنے پر کچھ واجب نہیں۔

لمافی المحیط البرھانی(۳۰۸/۲): تکلم المشائخ فی ھذا و اکثرھم علی انه یجب بستة اشیاء بتقدیم رکن وتاخیر رکن وبتکرار رکن وبتغیر واجب وبترك واجب وبترك سنة تضاف الی جمیع الصلاة۔ اما تقدیم الرکن نحو ان یرکع قبل ان یقرأ ویسجد قبل ان یرکع وتاخیر الرکن ان یترك سجدة صلبیة سھوا فیذکرھا فی الرکعة الثانیة فیسجد ھا أو یؤخر القیام الی الثالث بالزیادة علی قدر التشھد وتکرار رکن۔ ان یرکع رکوعین أو یسجد ثلاث سجدات وتغییر الواجب ان یجھر فیما یخافت او یخافت فیما یجھر وترك الواجب نحو ان یترك القعدة الاولی (فی الفرائض وترك السنة الاضافة الی جمیع الصلاة نحو ان یترك التشھد فی القعدة الاولی۔

وفی الھندیة(۱۲۶/۱):ولایجب بترك التعوذ والبسملة فی الاولیٰ والثناء وتکبیرات الانتقالات

الخ۔

وفی الشامیة (۲/۷۹): والعمد لا یجبره سجود السهو بل تلزم فیه الاعادة۔

وفی شرح الوقایة (۱/۱۸۴): فی هامش (۱۲) بعد اسطر: ولا یجب ایضا بترك رکن عمدا کان او سهوا لان ترك الرکن مبطل للصلوٰة رأسا ولا یمکن جبر نقصان ثابت به ولو ترك الواجب عمدا لا یسجد لان الوارد فی الاحادیث هو السجود عند السهو لا عند العمد بل یعید الصلوٰة۔

(۲۹۴) امام کا قرأت کے دوران بھول کر خاموش رہنا پھر سجدہ سہو کرنا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں نے تبلیغی جماعت میں ۴ مہینے لگائے، جب گاؤں میں واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے نماز پڑھنے میں ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لئے اکیلے اکیلے نماز پڑھنے کے بجائے تم اور دوستوں کو بھی یہاں میری بیٹھک میں ہی لے آیا کرو، ہم سب مل کر جماعت سے نماز پڑھا کریں گے۔ الحمدللہ اب ہم سب جماعت سے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کی نسبت ماموں کو قرآن پڑھنا درست آتا ہے اسلئے وہ ہمارے امام بن جاتے ہیں لیکن قرأت کے دوران غلطیاں بہت کرتے ہیں کبھی پڑھتے پڑھتے بھول جاتے ہیں تو خاموش ہوجاتے ہیں یا پھر دوسری سورت شروع کردیتے ہیں اور آخر میں سجدہ سہو کرتے ہیں کیا اس طرح ہم سب کی نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہوجائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو، وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہو (یعنی مسجد میں) اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑنے والے ہوگے، اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہوجاؤ گے (مسلم شریف، ۱/۲۳۲)......دوسری حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوگی (کنز العمال، ۷/۶۵۰)، نیز اور بے شمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو بلا عذر اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں، ان تمام احادیث کی بنا پر آپ کے ماموں کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ یہ مسجد کو چھوڑ کر بیٹھک میں جماعت کروائیں لہٰذا ان کو چاہیے کہ تمام نمازوں کو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ ادا کریں ہاں اگر قریب میں کوئی مسجد نہیں تو کسی مسجد کی بنیاد رکھیں تا کہ ان وعیدوں سے بچ سکیں البتہ صورت مسئولہ میں اگر آپ کے ماموں قرأت کے دوران ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے معنی تبدیل نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں نماز فاسد نہ ہوگی، ہاں ان کا بھول جانا پھر خاموش

ہوجانا اگرایک رکن کی مقدار ہےتو اس صورت میں سجدہ سہو کرنے سے نماز درست ہوگی اور اگر اتنی مقدار سے کم خاموش رہے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا، اور نماز درست ہوگی۔

لمافی المسلم (۲۳۲/۱): عن عبدالله قال من سره ان يلقى الله تعالىٰ غدا مسلما فليحافظ على هولاء الصلوات حيث ينادىٰ بهن فان الله شرع لنبيكم سنن الهدى، وانهن من سنن الهدى ولو انكم صليتم فى بيوتكم كما يصلى هذا المتخلف فى بيته لتركتم سنة نبيكم ولوتركتم سنة نبيكم لضللتم . . . الخ۔

وفى سنن ابى داؤد(۸۱/۱): عن ابن عباس رضى الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من سمع المنادى فلم يمنعه من اتباعه عذر قالوا وما العذر قال خوف أو مرض لم تقبل منه الصلوة التى صلىٰ۔

وفى المحيط البرهانى(۳۱۴/۲): وشرح الكافى ''للصدر الشهيد: وكان الشيخ الامام الأجل ظهير الدين المرغينانى يقول: لا يجب سجود السهو بقوله : اللهم صل على محمد ونحوه. وانما المعتبر مقدار ما يؤدى فيه ركناً۔

وفى البحر الرائق(۶۰۶/۱): وسئل الحلوانى عمن يجمع باهله احيانا هل ينال ثواب الجماعة أولا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلاعذر۔

وفى التاتارخانية(۵۷۱/۱): سئل الحلوانى عمن يصلى جماعة مع اهله فى بيته أحيانا هل ينال فضل الجماعة؟ قال لا وسئل هل يكون بدعة ومكروها؟ قال نعم۔

وفى الهندية (۸۱/۱): وان غير المعنى تغيرا فاحشا بأن قرأ ''وعصى اٰدم ربه'' بنصب الميم ورفع الرب وما أشبه ذلك مما لو تعمد به يكفر اذا قرأخطأ فسدت صلاته فى قول المتقدمين واختلف المتأخرون قال محمد بن مقاتل. . . وشمس الائمة الحلوانى لاتفسد صلاته الخ۔

(۲۹۵) قیام میں پہلے التحیات پڑھے پھر فاتحہ یا قعدہ میں فاتحہ پڑھے تو کیا حکم ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی قیام میں التحیات للہ الخ پڑھ لیتا ہے پھر اس کو خیال آیا اور قرأت کی۔ آیا اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر تشہد میں سورۂ فاتحہ پڑھے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......کوئی شخص قعدہ میں تشہد سے پہلے فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور اگر قیام میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا، اور اگر قعدہ میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ تو بھی سجدہ سہو واجب

نہیں ہوگا۔

لمافی الخلاصة(۱/۱۷۷): وفی الفتاوی لو قرأ الفاتحة او آیة من القرآن فی القعدة اوفی الرکوع اوفی السجود او قرأ التشهد فی الرکوع اوفی السجود علیه السهو، ولو قرأ التشهد فی القیام قبل ان یشرع فی القرآءة عامداً او ناسیاً فلا سهو علیه۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۷): واذا قرأ الفاتحة مکان التشهد فعلیه السهو وکذالك اذا قرء الفاتحة ثم التشهد کان علیه السهو کذا روی عن ابی حنیفة رحمة الله تعالیٰ علیه فی الواقعات الناطفیة وذکر هنالك اذا بدأ فی موضع التشهد بالقرآءة ثم تشهد فعلیه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقرآءة فلا سهو علیه۔

(۲۹۶) سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ لیا تو سجدہ سہو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نماز میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ لیا تو اس شخص پر سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مذکورہ صورت میں سجدہ سہو لازم نہیں۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۷۱۵): واما الاذکار کل ذکر لم یقصد لنفسه ... لا یلزمه السهو... و کتسبیحات الرکوع والسجود۔

وفی الشامیة (۲/۸۰): قوله بترك واجب) ...... واحترز بالواجب عن السنة، کالثناء والتعوذ ونحوهما۔

(۲۹۷) قعدہ اولیٰ نہ کرنے کا حکم

سوال......جناب حضرت مفتی صاحب ایک مسئلہ پوچھنا ہے کہ اگر چار رکعات والی سنتوں میں یا وتر میں کوئی قعدہ اولیٰ بھول جائے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز ہو جائیگی؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سنتوں اور وتر میں قعدہ اولیٰ فرض ہے لہٰذا بھول جانے پر سجدہ سہو کافی نہیں، نماز نہیں ہوگی اعادہ واجب ہوگا۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... چار رکعات والی سنتوں اور وتر میں قعدہ اولیٰ واجب ہے نہ کہ فرض، لہٰذا اگر کسی سے قعدۂ اولیٰ رہ گیا تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز ہو جائیگی اعادہ واجب نہ ہوگا۔

لمافی الدر المختار(۱/۴۶۵): (والقعود الاول) ولوفی النفل فی الاصح وکذا ترك الزیادة فیه علی

التشهد۔

(۲۹۸) غلطی سے قاعدہ اولی میں سلام پھیرنے کا حکم

سوال......ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا چار رکعات کی نیت باندھ لی تھی لیکن بھولے سے قعدہ اولی میں سلام پھیر دیا جب یاد آیا کہ یہ میری دوسری رکعت ہے تو فورا کھڑا ہو گیا اور باقی نماز پڑھ لی اور آخر میں سجدہ سہو بھی کر لیا آیا اس شخص کی نماز ہوگئی؟ نیز اگر مسبوق سے امام کے ساتھ یا امام کے فارغ ہونے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اسپر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں جب بھولے سے سلام پھیر لیا اور قبلہ کی طرف سینہ پھیرنے اور کسی مفسد صلاۃ کے ارتکاب سے پہلے بقیہ رکعات پڑھ کر سجدہ سہو کر لیا تو نماز ہوگئی، نیز مسبوق اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے کوئی واجب چھوڑ دے تو اسپر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اسپر سجدہ سہو واجب ہوگا۔

لما فی الشامیة(۹۲/۲): در: ویسجد للسهو ولو مع سلامه ناویا للقطع لان نية تغير المشروع لغو... مالم يتحول عن القبلة اويتكلم... سلم مصلى الظهر مثلا على راس الركعتين توهما اتمها اربعا وسجد للسهو لان ساهيا لايبطل لانه دعاء من وجه بخلاف مالو سلم على ظن۔

وفی الشامیة تحته: قوله لانه دعاء من وجه اى فلذا خالف الامام...

وفی الشامیة (۵۹۶/۱): قوله حتى يثنى، تفريع على قوله منفرد فيما يقضيه بعد فراغ امامه ------ ويلزمه السجود اذا سها فيما يقضيه۔

(۲۹۹) قعدۂ اولیٰ سہواً چھوٹ جانے کے بعد قیام سے دوبارہ واپس آنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ظہر کی پہلی چار سنتیں جماعت سے پہلے نہیں پڑھ سکا اور بعد میں چار سنتیں پڑھ رہا تھا۔ تو دوسری رکعت میں التحیات میں بیٹھنا بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا ابھی تک سورۃ فاتحہ شروع نہیں کی تھی کہ مجھے یاد آ گیا کہ میں التحیات پر بیٹھنا بھول گیا ہوں، تو میں فوراً التحیات میں بیٹھ گیا۔ پھر تیسری اور چوتھی رکعت پوری کی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا۔ کیا اس طرح میری نماز درست ہوگئی ہے یا سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی اور آپ نے جو سجدہ سہو کیا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ نہ بیٹھتے اور آخر میں سجدۂ سہو کر کے اپنی نماز کو مکمل کرتے۔

لما فی الفتاویٰ التاتارخانية(۴۳۸/۱): وفی الفتاوى العتابية وان كان فى التطوع قال بعضهم يعود مالم يقيد بالسجدة والصحيح انه لا يعود۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۳۱۲): (قوله واما النفل) ولو الرباعیة المؤكدة نهر (قوله فیعود) لان كل شفع صلاة علی حدة فی حق القراء ة فأمرنا بالعود الی القعدة احتیاطا ومتی عادتبین ان القعدة وقعت فرضا فیكون رفض الفرض لمكان الفرض فیجوز وقیل لا یعود لانه صار كالفرض حلبی عن البحر۔

وتحت (قوله ویسجد لتاخیر الواجب) الاولی ان یقول لتاخیر الفرض وهو القیام اویقول لترك الواجب وهو القعود۔

وفی الدر المختار(۲/۸۴): (وإلا) أی وإن استقام قائما (لا) یعود لاشتغاله بفرض القیام (وسجد للسهو) لترك الواجب (فلو عاد إلی القعود) بعد ذلك (تفسد صلاته) لرفض الفرض لما لیس بفرض وصححه الزیلعی (وقیل لا) تفسد لكنه یكون مسیئا ویسجد لتأخیر الواجب(وهو الأشبه) كما حققه الكمال وهو الحق بحر الخ۔

وفی الشامیة تحته: (قوله بعد ذلك) ای بعد ما استقام قائما ... (قوله لكنه یكون مسیئا) أی ویأثم۔

(۳۰۰) دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کیلئے منفرد کو دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہیئے یا ایک طرف بھی سلام پھیرنا کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب..... منفرد کو سجدۂ سہو میں ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا چاہیئے البتہ اگر دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کر لیا تو بھی نماز ہو جائے گی۔

لمافی الشامیة(۲/۷۸): والذی ینبغی الاعتماد علیه تصحیح المجتبی أنه یسلم عن یمینه فقط.... ویؤیده ماوجهوا به القول الواحدة من أن السلام الأول لشیئین: للتحلیل وللتحیة والسلام الثانی للتحیة فقط ای تحیة بقیة القوم لأن التحلیل لا یتكرر، وهنا سقط معنی التحیة عن السلام لأنه یقطع الإحرام فكان ضم الثانی إلیه عبثا ولو فعله فاعل لقطع الإحرام۔

(۳۰۱) سجدہ سہو کرنا بھول کر دونوں طرف سلام پھیر دینے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نے نماز میں غلطی کی اور سجدہ سہو کرنا تھا مگر بھول

کر سلام پھیر دیا اب اسے پوری نماز دھرانی پڑے گی یا کوئی اور طریقہ ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کسی وجہ سے سجدہ سہو کرنا تھا لیکن یاد نہ رہا اور بھول کر سلام پھیر دیا تو اس صورت میں اگر نمازی نے کوئی منافی صلاۃ عمل نہ کیا ہو، مثلاً اپنی جگہ سے ابھی اٹھا نہیں اور نہ ہی قبلہ سے رُخ پھیرا ہو کہ اس کو یاد آ گیا تو فوراً سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لے اور اگر کوئی عمل منافی صلاۃ کیا ہو تو اس صورت میں سجدہ سہو چھوڑ دینے کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافی الفتاوىٰ التاتارخانية (۷۳۲/۱): واذا سلم يريد به قطع الصلوة وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد للسهو... فقد شرط لاداء سجدتي السهو شرطاً زائداً وهو أن لا يتكلم ولا يقوم عن محله ذالك، فهذا اشارة الى أنه متى قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا يأتي بسجدتي السهو وان كان لم يخرج عن المسجد بعد۔

وفي الدر المختار (۴۵۶/۱): (ولها واجبات) لاتفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو إن لم يسجد له۔

(۳۰۲) سجدۂ سہو بھول کر سلام پھیرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے ہفتے میں کسی کام کے سلسلے میں صدر گیا ہوا تھا اور وہاں عشاء کی اذان ہوگئی تو میں نے اپنے کام کو مؤخر کیا اور مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گیا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کے بعد وتر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا۔ کیونکہ مجھے مسئلہ معلوم تھا کہ اب رکوع سے نہیں اٹھنا چاہیے بلکہ آخر میں سجدہ سہو کر لینا چاہیے۔ لیکن آخری قعدہ میں بھی سجدہ سہو کیے بغیر ہی بھول کر سلام پھیر دیا۔ جب سلام پھیرا تو مجھے یاد آیا کہ مجھ پر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا اور میں نے سجدۂ سہو نہیں کیا۔ اس لئے میں نے دوبارہ وتر ادا کیے۔ کیا اگر سجدۂ سہو واجب ہو، اور آدمی سجدہ سہو کرنا بھول جائے تو نماز نئے سرے سے پڑھنا ضروری ہے یا اس وقت صرف سجدۂ سہو کر لیں تو کیا نماز درست ہو جاتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، نہ پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ تاہم اگر کوئی شخص سجدۂ سہو بھول جائے اور نماز ختم کرنے کی نیت سے سلام پھیر دے تو اس صورت میں اگر قبلہ سے انحراف نہ پایا گیا ہو، اور بات چیت نہ کی ہو تو ترکِ واجب کے یاد آنے پر سجدۂ سہو کر لینے سے اس کی نماز بغیر نقصان کے درست ہو جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کر لیتے تو آپ کی نماز بغیر نقصان کے ٹھیک ہو جاتی اور دوبارہ پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی۔

لمافی الفتاوىٰ التاتارخانية (۷۳۲/۱): واذا سلم يريد به قطع الصلوة وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد للسهو... فقد شرط لاداء سجدتي السهو شرطاً زائداً وهو أن لا يتكلم ولا يقوم عن محله ذالك، فهذا اشارة الى أنه متى قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا يأتي بسجدتي السهو وان

كان لم يخرج عن المسجد بعد۔

وفی الشامية(۹۱/۲): قال فی الدر: (ويسجد للسهو ولو مع سلامه) ناوياً (للقطع) لأن نية تغيير المشروع لغو، (مالم يتحول عن القبلة او يتكلم) لبطلان التحريمة۔

قال فی الشامية: قيد بالسهو لأنه لو سلم ذاكراً أن عليه سجدة تلاوة او قراءة التشهد الأخير سقطت عنه، لأن سلامه عمد فيخرجه من الصلاة ولا تفسد صلاته لأنه لم يبق عليه ركن من أركان الصلوة بل تكون ناقصة لترك الواجب۔۔۔

(قوله لبطلان التحريمة) ای بالتحول أو التكلم، وقيل لا يقطع بالتحول مالم يتكلم أو يخرج من المسجد كما فی الدرر عن النهاية۔

(۳۰۳) سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ دوبارہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ پر بھی فاتحہ کو پڑھتا ہے تو اس شخص کی نماز کا کیا حکم ہے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......فرض کی آخری دو رکعتوں کے علاوہ چاہے فرض ہو یا واجب سنت ہو یا نفل ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت، تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ملانا واجب ہے۔

صورت مسئولہ میں دوبارہ فاتحہ پڑھنے سے واجب ادا نہ ہوا۔ پس اگر یہ فعل سہواً صادر ہوا ہو، تو سجدہ سہو کرنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر قصداً کیا ہے تو نماز کا اعادہ کرنا لازم ہوگا۔

لمافی القدوری (باب النوافل) (ص۲٦): القراءة واجبة فی الركعتين الاولين وهو مخير فی الاخريين ان شاء قرأ الفاتحة، وان شاء سكت وان شاء سبح والقراءة واجبة فی جميع ركعات النفل وجميع الوتر۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۲۵۸/۱): (قوله كذا ترك تكريرها) فلو قرأ الفاتحة مرتين قبل السورة وجب سجود السهو لتاخير السورة۔

وفی الشامية(۴۵٦/۱): (قوله وتعاد وجوباً) ای بترك هذه الواجبات او واحد منها وما فی الزيلعی والدرر والمجتبی من انه لو ترك الفاتحة يؤمر بالاعادة لالو ترك السورة رده فی البحر بان الفاتحة وان كانت آكد فی الوجوب للاختلاف فی ركنيتها دون السورة لكن وجوب الاعادة حكم ترك الواجب مطلقا لا الواجب المؤكد وانما تظهر الآكدية فی الاثم لانه مقول

بالتشکیک۔

(۳۰۴) سجدہ سہو ادا کرنے کے بعد قیام کی طرف لوٹنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نماز کے دوران سہو ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کیا اس کے بعد نماز کو پورا کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر سورہ فاتحہ پڑھنے لگا پھر سورہ فاتحہ پڑھتے وقت یاد آ جائے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مذکورہ صورت میں اگر یہ شخص سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھ کر کھڑا ہو گیا ہے تو قعدہ میں بیٹھ کر درود شریف اور دعا پڑھ کر سلام پھیر دے اور اگر سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھے بغیر کھڑا ہو گیا ہے تو بیٹھ کر تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیر دے۔ سجدہ سہو کے بعد سہو ہونے سے دوبارہ سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا۔

لمافی الدر المختار(۲/۷۸):(و) يجب أيضا (تشهد وسلام) لأن سجود السهو يرفع التشهددون القعدة لقوتها بخلاف الصلبية فإنها ترفعهما وكذا التلاوية على المختار ويأتي بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم والدعاء في القعود الأخير في المختار۔

وفيه ايضا (۲/۸۵): (ولو سها عن القعود الأخير كله أو بعضه، (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد، (مالم يقيدها بسجدة) لأن مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود،

وفى الشامية تحته: (قوله ولو سها عن القعود الأخير) اراد به القعود المفروض او ماكان آخر الصلاة فيشمل نحو الفجر.

وفى الهندية(۱/۱۳۰): السهو فى سجود السهو لا يوجب السهو لانه لايتناهى كذافى التهذيب...... ولو سها فى صلاته مرارا يكفيه سجدتان كذا فى الخلاصة۔

(۳۰۵) امام کا بھول کر سری نماز میں جہراً تلاوت کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور تجوید بھی کی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ عالم بھی بنوں گا لیکن گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ میں عالم نہیں بن سکا اب ایک مسجد میں امامت کراتا ہوں کل عصر کی نماز کے وقت جب میں امامت کرا رہا تھا تو بھول کر سورۃ فاتحہ زور سے پڑھنا شروع کر دی جب اھدنا الصراط تک پہنچا تو پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا (سبحان اللہ) تو مجھے یاد آیا کہ میں تو عصر کی نماز پڑھا رہا ہوں اور اس میں قرأت آہستہ کرنی ہوتی ہے اور میں نے زور

سے پڑھا ہے تو میں فوراً خاموش ہوگیا اور باقی سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت دل میں ہی پڑھی ہے۔ کیا اس طرح نماز درست ہوگئی ہے۔ یا پھر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... امام کیلئے جہری نمازوں میں جہراً اور سری نمازوں میں سراً قرأت کرنا واجب ہے۔ اگر امام بھول کر کسی سری نماز میں جہراً قرأت شروع کردے تو اگر ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیتوں کے بقدر تلاوت کردی تو ترک واجب کی بناء پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔ اب اگر امام سجدہ سہو کرلیتا ہے تو نماز بلا کراہت درست ہوجائے گی اور اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو ترک واجب کی بناء پر نماز مکروہ ہوگی اور نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

صورت مسئولہ میں آپ پر سجدہ سہو واجب تھا اگر آپ نے بغیر سجدہ سہو کئے سلام پھیر دیا تو اگرچہ فرضیت ادا ہوگئی مگر واجب ترک کرنے کی وجہ سے نماز مکروہ ہوگئی جس کا اعادہ آپ پر اور مقتدیوں پر واجب ہے۔ اعادہ نہ کرنے کی صورت میں گناہ گار ہوں گے۔

لما فی الهندیة(۱/۱۲۸): (ومنها الجهر و الإخفاء) حتی لو جهر فیما یخافت أو خافت فیما یجهر وجب علیه سجود السهو واختلفوا فی مقدار ما یجب به السهو منهما قیل یعتبر فی الفصلین بقدر ما تجوز به الصلاة وهو الأصح ولا فرق بین الفاتحة وغیرها۔

وفی الدر المختار (۲/۸۱): (والجهر فیما یخافت فیه)... (وعکسه) ... والأصح تقدیره (بقدر ما تجوز به الصلاة فی الفصلین۔ وقیل) قائله قاضیخان یجب السهو(بهما) أی باالجهر والمخافتة (مطلقا) أی قل أو کثر (وهو ظاهر الروایة)

وفی الشامیة تحته: (قوله والأصح الخ) صححه فی الهدایة والفتح والتبیین والمنیة لأن الیسیر من الجهر والإخفاء لایمکن الإحتراز عنه وعن الکثیر یمکن وما تصح به الصلاة کثیر غیر أن ذالك عنده آیة واحدة وعندهما ثلث آیات هدایة۔

وفی الدر المختار (۱/۴۵۶،۴۵۷): (ولها واجبات) لاتفسد بترکها وتعاد وجوباً فی العمد والسهو ان لم یسجد له، وإن لم یعدها یکون فاسقاً آثماً، وکذا کل صلاة أدیت مع کراهة التحریم تجب اعادتها۔

وفی الشامیة تحته: (قوله وتعاد وجوباً) أی بترك هذه الواجبات أو واحدمنها۔.........

(قوله إن لم یسجد له) أی للسهو. وهذا قید لقوله والسهو. إذ لا سجود فی العمد... وهل تجب الاعادة بترك سجود السهو لعذر کما لو نسیه أو طلعت الشمس فی الفجر؟ لم أره فلیراجع والذی یظهر الوجوب کماهو مقتضی اطلاق الشارح، لأن النقصان لم ینجبر بجابر. وإن لم یأثم بترکه فلیتأمل۔

وفی (ص۴۵۷) وأن النقص إذا دخل فی صلاۃ الإمام ولم یجبر وجبت الإعادۃ علی المقتدی أیضاً۔

(۳۰۶) فرض کے چھوٹ جانے کی کمی کو سجدۂ سہو سے پورا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ رات ہماری بستی کے امام صاحب عشاء کی نماز میں چوتھی رکعت میں بیٹھنا بھول گئے یعنی التحیات نہیں پڑھی اور کھڑے ہوگئے۔ پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ بھی دیا لیکن امام صاحب نے پانچویں رکعت پوری کی پھر چھٹی رکعت پوری کر کے سجدہ سہو کیا اور سلام پھیر دیا۔ ان کے سلام پھیرنے کے بعد کچھ لوگ کہنے لگے کہ اس طرح نماز نہیں ہوئی لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ میں بھول گیا اور جب کوئی بھول ہوجائے تو سجدہ سہو کرتے ہیں اور میں نے سجدہ سہو بھی کیا ہے، لہٰذا نماز درست ہے بلکہ چار رکعت فرض نماز ہوگئی اور دو رکعت نفل ہوگئی۔ آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا امام صاحب کی بات درست ہے اور سجدہ سہو کرنے سے نماز ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز میں واجب کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔ اور فرض کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری نہیں ہوتی ہے، بلکہ دوبارہ اس نماز کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔

چونکہ نماز میں قعدہ اخیرہ فرض ہے، اور امام صاحب نے قعدہ اخیرہ نہیں کیا، بلکہ پانچویں رکعت کیلئے کھڑے ہوگئے تو فرض کے چھوٹ جانے سے نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا پڑے گا، سجدہ سہو کرنے سے یہ نماز نہیں ہوئی، باقی امام صاحب کا یہ کہنا کہ ''بھول سے سجدہ سہو کرتے ہیں، اس لئے میں نے کیا'' یہ بات درست نہیں بلکہ سجدہ سہو اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی واجب چھوٹ جائے یا فرض اور واجب میں تاخیر ہوجائے لہٰذا امام سمیت سب مقتدیوں پر اس نماز کا اعادہ لازمی ہے۔

وفی الدرالمختار(۸۵تا۸۸/ ۲): (ولو سھا عن القعود الأخیر) کله أو بعضه (عاد) ویکفی کون کلا الجلستین قدر التشھد (مالم یقیدھا بسجدۃ) لان مادون الرکعة محل الرفض وسجد للسھو لتأخیر القعود. (وإن قیدھا) بسجدۃ عامدا أو ناسیا أو ساھیا او مخطئا (تحول فرضه نفلاً برفعه) الجبھة عند محمد، وبه یفتی، لأن تمام الشئ بآخرہ. فلو سبقه الحدث قبل رفعه توضأ وبنی خلافاً لأبي یوسف، حتی قال: صلاۃ فسدت أصلحھا الحدث والعبرۃ للإمام. حتی لو عاد ولم یعلم به القوم حتی سجدوا لم تفسد صلاتھم مالم یتعمدوا السجود۔ وفیه یلغز: أیّ مصلّ ترك القعود الأخیر وقید الخامسة بسجدۃ ولم یبطل فرضه. (وضم سادسة) ولو فی العصر والفجر (إن شاء) لاختصاص الکراھة والإتمام بالقصد (ولا یسجد للسھو علی الأصح) لأن النقصان بالفساد لا ینجبر (وإن قعد فی الرابعة) مثلاً قدر التشھد (ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح. ثم الاصح أن القوم ینتظرونه. فإن عاد تبعوہ (وإن سجد للخامسة

سلموا) لأنه تم فرضه، إذ لم يبق عليه إلا السلام (وضم إليها سادسة) لو فى العصر، وخامسة فى المغرب: ورابعة فى الفجر، به يفتى (لتصير الركعتان له نفلا) والضم هنا آكد، ولا عهدة لوقطع. ولا بأس بإتمامه فى وقت كراهة على المعتمد (وسجد للسهو) فى الصورتين لنقصان فرضه بتاخير السلام فى الأولى وتركه فى الثانية۔

(۳۰۷) مقتدی سے سہو کی صورت میں سجدۂ سہو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں اور کوئی غلطی ہوجائے تو سجدۂ سہو کرنا چاہیئے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر آپ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ سے کوئی سہو یا غلطی ہوجائے تو آپ سجدہ سہو نہیں کریں گے۔

وفی الهندية (۱۲۸/۱): سهو المؤتم لا يوجب السجدة۔

(۳۰۸) سجدۂ سہو میں تکرار نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کے بعد اگر دوبارہ غلطی کی تو دوبارہ سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورتِ مسئولہ میں جبکہ نمازی ایک مرتبہ غلطی کرنے پر سجدۂ سہو کر چکا ہو، تو دوسری بار غلطی کرنے پر دوبارہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ سہو کے دو سجدے تمام غلطیوں کا ازالہ کردیتے ہیں اور سجدۂ سہو میں تکرار نہیں ہے۔

وفی التجنيس (۱۴۸/۲): قال الشيخ الامام شمس الأئمة الحلوانى، القعدة بعد سجدتى السهو ليس بركن، وانما امرنا بها بعد سجود السهو ليقع ختم الصلوة بها۔ فيوافق ذالك موضع الصلوة ونظمها. فأما أن يكون ركناً فلا، حتى لو تركها، بان سجد سجدتين، بعد السلام ثم قام وذهب لم تفسد صلوته . . . ولو سجد قبل السلام لا يعيد، لانه مجتهد فيه، فاذا اداه، وقع جائزا وهذا لأنه لو أعاده يؤدى إلى تكرار سجود السهو ولم يقل به احد۔

وفى الطحطاوى على الدر (۳۱۰/۱): لو سجد قبل السلام لا يعيده. لأنه لو أعاده يتكرر وهو خلاف الاجماع۔

وفى الهندية (۱۳۰/۱): السهو فى سجود السهو لا يوجب السهو لأنه لا يتناهى كذا فى التهذيب۔

(۳۰۹) سجدہ تلاوت کے وجوب سے لاعلمی کی بناء پر سجدہ تلاوت نہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بچپن میں ایک حافظ صاحب سے قرآن پڑھا تھا تقریباً اس وقت میری عمر دس پندرہ سال تھی اب میں چالیس سال کے قریب ہوں مسئلہ یہ پیش آیا کہ میں نے سجدہ تلاوت کو کبھی بھی ادا نہیں کیا کیونکہ مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ اس طرح سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے اب چار ماہ لگائے تو پتہ چلا کہ سجدہ واجب ہوتا ہے میں بہت پریشان ہوں کہ پچیس سال میں نہ جانے کتنے سجدے چھوڑے اور نماز میں بھی سورۃ علق پڑھتا تھا کیونکہ مجھے میرے استاد نے بتایا تھا کہ یہ قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے مجھے بہت پسند ہے، اب ان نمازوں کی بھی تعداد یاد نہیں۔ برائے مہربانی آپ حضرات علماء ہیں رہنمائی فرمائیں کہ ان سجدوں اور نمازوں کا میں کیا کروں کوئی تاوان ہے یا قضاء ہے اگر قضاء ہے تو نمازوں کا کیا حکم ہے ان کی بھی قضاء ضروری ہے یا فقط ان سجدوں کی قضاء کافی ہے جو نماز میں نہیں کئے گئے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......قرآن کریم میں چودہ مقامات ایسے ہیں جن کے تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوجاتا ہے۔ اب آیت سجدہ تلاوت کرنے والا یا سننے والا، نماز میں ہوگا یا غیر نماز میں۔ اگر نماز میں ہو تو مقتدی ہوگا یا منفرد اگر مقتدی ہو تو اپنے امام سے آیت سجدہ سننے سے، سجدہ کرنے میں امام کا تابع ہوگا اگر کسی اور شخص سے سنے جو اس نماز میں شریک نہ ہو تو نماز کے بعد اس پر سجدہ کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر منفرد ہو تو آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے نماز میں سجدہ تلاوت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر نماز میں کسی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تو نماز کے بعد اس کو ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ ساقط ہوجائے گا (البتہ ترکِ واجب کا گناہ ہوگا)۔ جبکہ حالتِ نماز کے علاوہ آیت سجدہ خود پڑھنے یا دوسرے سے سننے پر سجدہ تلاوت واجب ہوجاتا ہے جو ادا کئے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو نمازیں آپ نے پڑھی ہیں اور ان میں سورۃ علق تلاوت کی ہے اور نماز میں سجدہ تلاوت ادا نہیں کیا ہے تو نمازیں درست ہیں ان کا اعادہ نہیں ہے اور سجدے بھی ساقط ہو گئے ہیں البتہ واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے گناہ ہوگا جس سے توبہ واستغفار ضروری ہے۔ جبکہ نماز کے علاوہ جتنے سجدے آپ پر، آیت سجدہ خود پڑھنے سے یا دوسروں سے سننے سے واجب ہوئے ہیں ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا بلوغت سے اب تک کا حساب لگا کر تمام سجدے اسی حساب سے ادا کئے جائیں۔ اور اگر حساب لگانا مشکل ہو تو اندازہ سے اداء کر لئے جائیں۔

لمافی الجوهرة النيرة (۲۱۱/۱): وفی رواية النوادر: ماوجب خارج الصلوة لا يسقط۔

وفی الهندية (۱۳۲/۱): والسجدة واجبة فی هذه المواضع على التالی والسامع سواء قصد سماع القران اولم يقصد كذا فی الهداية (وفی صـ۱۳۳) ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقا لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم......... ولو سمعها من الامام اجنبی ليس معهم فی الصلاة ولم يدخل معهم فی الصلاة لزمه السجود كذا فی الجوهرة النيرة وهو الصحيح كذا فی الهداية سمع من امام

فدخل معه قبل ان يسجد سجد معه وان دخل فی صلاة الامام بعد ما سجدها الامام لا يسجد ها.........ولو سمع المصلی من اجنبی يسجد بعد الفراغ۔ (وفی صـ ۱۳۴) والسجدة التی وجبت فی الصلاة لا تؤدی خارج الصلاة كذا فی السراجية وهكذا فی الكافی۔ (وفی صـ ۱۳۵) وفی الغياثية واداؤها ليس علی الفور حتی لو ادّاها فی ایّ وقت كان يكون مؤديا لا قاضيا كذا فی التتارخانية۔

وفی الدر المختار مع الشامية(۲/۱۰۹): (وهی علی التراخی) علی المختار ويكره تاخيرها تنزيها، ويكفيه ان يسجد عدد ما عليه بلا تعيين ويكون مؤديا۔

وفی الشامية تحته: (قوله علی المختار) كذا فی النهر: وينبغی ان يكون محل الخلاف فی الاثم وعدمه حتی لو اداها بعد مرة كان مؤديا اتفاقا لا قاضيا اهـ... (قوله تنزيها) لانه بطول الزمان قدينساها، ولو كانت الكراهة تحريمية لو جبت علی الفور وليس كذلك ولذا كره تحريما تاخير الصلا تية عن وقت القراء ة امداد واستثنی من كراهة التاخير ما اذا كان الوقت مكروها كوقت الطلوع۔

(۳۱۰) آیت سجدہ سننے والوں کو اگر علم ہو کہ آیتِ سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو سجدہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب رمضان قریب آتا ہے حفاظ دودو ہو کر ایک دوسرے کا قرآن دن کو سنتے ہیں، ہم بھی ساتھ بیٹھتے ہیں کبھی کبھی وہ سجدہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے میں نے ایک حافظ صاحب سے پوچھا اس نے کہا قرآن میں چودہ سجدے ہیں پڑھنے اور سننے والے پر جب بھی پڑھے یا سنے واجب ہے کہ سجدہ کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ آیت سجدہ ہے یا نہیں پھر ہمارے لئے آگے دو حالتیں ہوتی ہیں کبھی تو پڑھنے والا سجدہ کرتا ہے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت سجدہ تھی۔ لیکن کبھی پڑھنے والا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور وہ آیت سجدہ پڑھ رہا ہوتا ہے ہم گزر جاتے ہیں آیت سن لیتے ہیں مگر خبر نہیں ہوتی کہ آیت سجدہ تھی۔ کیا دونوں حالتوں میں سجدہ واجب ہوگا اور ترک پر گناہ ہوگا یا کچھ فرق ہوگا؟ تفصیل سے آسان اور واضح الفاظ میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ اللہ آپ کو دنیا وآخرت میں اجر عظیم عطا فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......سجدے کے وجوب کا تعلق نفسِ سماع سے ہے چاہے سننے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ البتہ جو شخص ان مقاماتِ سجدہ سے ناواقف ہو تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ اسے معلوم بھی ہو جائے کہ آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ترکِ واجب کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ کو جب اس بات کا علم ہو جائے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو آپ پر سجدہ کرنا واجب ہے، اور اگر آپ کو

علم نہ ہوسکا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے آپ پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کا علم ہوجائے لیکن جس شخص نے آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے اس کی ذمہ لازم ہے کہ یا تو آیت سجدہ کے مقام پر اپنی آواز کو پست رکھے تاکہ زیادہ لوگ مشقت میں نہ پڑیں یا پھر تلاوت کے بعد سامعین کو اس سے باخبر کردے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے۔

لما فی الخانیة(۴۲/۱): اما السامع إن علم انها آیة السجدة یلزمه السجدة والا فلا الخ۔

وفی الهندیة(۱۳۳/۱): اذا قرأ آیة السجدة بالفارسیة فعلیه وعلی من سمعها السجدة فهم السامع أولا اذا أخبر السامع انه قرأ آیة السجدة وعندهما ان کان السامع یعلم أنه یقرأ القرآن یلزمه والا فلا... ولو قرأ بالعربیة یلزمه مطلقاً لکن یعذر بالتاخیر مالم یعلم الخ۔

وفی الدر مع الشامیة(۱۰۵/۲): فی الدر: والسماع شرط فی حق غیر التالی ولو بالفارسیة اذا اخبر الخ۔

وفی الشامیة تحته: (قوله اذا أخبر) ای بأنها آیة سجدة سواء فهمها او لا وهذا عند الإمام، و عندهما ان علم السامع أنه یقرأ القرآن لزمته والا فلا بحر، وفی الفیض وبه یفتی. وفی النهر عن السراج أن الامام رجع الی قولهما وعلیه الاعتماد... أمّا لو کانت بالعربیة فانه یجب بالاتفاق فهم أو لا لکن لا یجب علی الأعجمی مالم یعلم کمافی الفتح أی وان لم یفهم الخ۔

وفیه ایضاً(۱۱۸/۲): واستحسن اخفاؤها عن سامع غیر متهیئ للسجود الخ۔

وفی الشامیة تحته: (قوله واستحسن اخفاء ها الخ) لأنه لو جهربها لصار موجبا علیهم شیئاً ربما یتکاسلون عن ادائه فیقعون فی المعصیة فان کانوا متهیئین جهربها بحر عن البدائع قال فی المحیط بشرط أن یقع فی قلبه أن لا یشق علیهم أداء السجدة فان وقع أخفاها وینبغی أنه اذا لم یعلم بحالهم أن یخفیها نهر۔

(۳۱۱) سجدۂ شکر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب بھی وتر سے فارغ ہوتا ہوں یا صلاۃ الضحیٰ سے فارغ ہوتا ہوں تو اس کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ اس طرح کرنا صحیح نہیں ہے، تو اب آپ حضرات سے یہ سوال ہے کہ میرا اس طرح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......کسی نعمت کے حصول یا مصیبت سے نجات پر سجدۂ شکر کرنا مستحب ہے۔ البتہ کسی بھی نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ ''اس طرح کرنا صحیح نہیں'' درست ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ تاہم دیگر اوقات میں سجدۂ شکر ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار(۲/۱۲۰،۱۱۹): وسجدة الشکر، مستحبة به یفتی. لکنها تکره بعد الصلاة، لأن الجهلة یعتقد ونها سنة أو واجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه۔

وفی الشامیة تحته : (قوله۔ وسجدة الشکر)... وهی لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالیٰ مالاً أو ولداً أو اندفعت عنه نقمة ونحوذلك، یستحب له أن یسجد لله تعالیٰ شکراً مستقبل القبلة یحمد الله تعالیٰ فیها ویسبحه ثم یکبّر فیرفع رأسه کما فی سجدة التلاوة، سراج۔

فصل فی صلوٰۃ المریض والمسافر

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

(۳۱۲) زخم سے مسلسل خون نکلنے کی صورت میں نماز کی صورت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے ایسا زخم ہو جس سے مسلسل خون رستا رہتا ہو تو اب وضو اور نماز کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر خون اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ اس شخص پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد خون بہنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کرسکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔اور اگر خون اس قدر مسلسل نہیں بہتا تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۳۰۵):(وصاحب عذر من به سلس) بول لا یمکنه امساکه(او استطلاق بطن ...ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة)بان لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث(ولو حکما)لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم(وهذا شرط)العذر (فی حق الابتداء وفی)حق(البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت)ولومرة(وفی)حق الزوال یشترط(استیعاب الانقطاع)تمام الوقت (حقیقة)لانه الانقطاع الکامل۔

(وحکمه الوضو)لا غسل ثوبه وفی(ص۳۰۶) ونحوه (لکل فرض)اللام للوقت کمافی لدلوك الشمس ثم یصلی به (فیه فرضا ونفلا)فدخل الواجب بالاولی(فاذا خرج الوقت بطل)۔

(۳۱۳) زخمی کیلئے لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید میرا خالہ زاد بھائی ہے پچھلے ہفتے وہ بذریعہ ٹرین ڈیرہ غازی خان سے آ رہا تھا راستہ میں ٹرین کے بعض ڈبے پٹری سے اترنے کی وجہ سے زید کی ٹانگ ٹوٹ گئی اب الحمدللہ آپریشن ہوا ہے جو کہ بظاہر کامیاب ہے۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ زید کھڑا تو نہیں ہوسکتا لیکن بیٹھنے میں بھی کافی تکلیف ہوتی ہے کیا زید کیلئے ایسی حالت میں لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر جائز ہے تو کیا نوافل اور سنن بھی لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں یا صرف فرائض جائز ہے لیٹ کر؟ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں زید اگر سہارا لگا کر بیٹھ سکتا ہو، اگرچہ بیٹھنے میں تھوڑی بہت مشقت ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اگر زید کو سہارا لگا کر بیٹھنے سے بھی شدید تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خوف ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا (سر اور ہاتھوں کے اشارہ سے) جائز ہے۔ خواہ فرض نماز ہو یا سنت یا نفل سب کا حکم یکساں ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۶،۱۳۷): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد وأصح الاقاويل فى تفسير العجز ان يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوى ... واذا لم يقدر على القعود مستوياً وقدر متكئا أو مستنداً الى حائط أو انسان يجب أن يصلى متكئا أو مستنداً ولا يجوز له أن يصلى مضطجعاً على المختار...... وان تعذر القعود أو ما بالركوع والسجود مستلقياً على ظهره وجعل رجليه إلى القبلة وينبغي أن يوضع تحت رأسه وسادة حتى يكون شبيه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود واضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة وأومأ جاز وا لاول أولى كذا فى الكافى وان لم يستطع على جنبه الايمن فعلى الايسر كذا فى السراج الوهاج ووجهه الى القبلة۔

وفى الدر المختار (۲/۹۵،۹۶،۹۷): (من تعذر عليه القيام) أى كله (لمرض) حقيقى وحده أن يلحقه بالقيام ضرر به يفتى، (قبلها أو فيها) أى الفريضة ...... (صلى قاعداً) ولو مستنداً إلى وسادة أو إنسان فإنه يلزمه ذلك على المختار۔ ...... وفى (ص۹۹): (وإن تعذر القعود) ولو حكماً (أومأ مستلقياً) على ظهره (ورجلاه نحو القبلة)۔

(۳۱۴) مسلسل قطرے آنے کی صورت میں نماز کیسے پڑھیں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کی تکلیف ہے جس کی وجہ سے اسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں اور وضو کر کے نماز پڑھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے، کیا ایسا شخص نماز پڑھے گا، اگر پڑھے گا تو

پڑھنے کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر پیشاب کے قطرے اس قدر مسلسل آتے ہوں کہ اس پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد قطرے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کرسکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور قطرے اگر اس قدر مسلسل نہیں آتے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما فی المصنف لعبدالرزاق (١/١٥١): عبدالرزاق عن معمر عن الزھری عن خارجة بن زید قال کبر زید حتی سلس منه البول فکان یداویه مااستطاع فاذا غلبه توضأثم صلی۔

بقیة الدلائل مر سابقاً فی السوال السابق

(۳۱۵) اگر اُٹھنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص پر نماز فرض ہے یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اتنا زخمی ہو چکا ہو کہ اس کا چارپائی سے اٹھنا بھی مشکل ہو، تو کیا ایسی حالت میں اس پر نماز واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہو، تو پھر وضو کس طرح کرے حالانکہ اس کا چارپائی سے اُٹھنا بھی مشکل ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مریض اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے گا اور اگر بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے نماز پڑھے گا اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو نماز کو مؤخر کرے گا صحیح ہونے تک، صحیح ہونے کے بعد اگر پانچ سے کم نمازیں قضا ہوئی ہوں تو ان کی قضا کرنا لازمی ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو اس سے قضا ساقط ہوگی لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، اس پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھے اور وضو اگر نہ خود کرسکتا ہے نہ ایسا شخص ہے جو اسے وضو کرائے تو تیمم کر کے نماز پڑھے۔الغرض نماز ایسے شخص پر بھی فرض ہے جو بیٹھ کر یا اشارہ سے پڑھ سکتا ہو۔

لمافی الطحطاوی علی الدر(١/١٢٥): (قوله یشتد) تقیید لاطلاق المصنف المرض فیعلم ان الیسیر لایبیح التیمم ولا فرق فی الاشتداد بین ان یشتد بالتحرك كالمبطون كما افاده بقوله ولو بتحرك او بالاستعمال كالجدری وجاز له التیمم اتفاقا ان كان لایجد من یوضئه ولا یقدر بنفسه وفیه ایضاً (١/٣١٩): (قوله بان زادت علی یوم ولیلة) ای بالساعات او بالاوقات علی وزان ماسیأتی فی مسئلة المجنون (قوله فی ظاهر الروایة) وقیل تؤخرولا تسقط وصحح

(قوله وعليه الفتوى) راجع الى المغيابه لاللمغيا عليه وهو اذا لم يفهم فانه لايقضى فيه إجماعاً ومحل الخلاف فيما اذا برى من مرضه۔۔۔۔۔ على الايماء بالرأس اما ان قدر عليه بعد عجزه فانه يلزمه القضاء وان كان القضاء يجب موسعا لتظهر فائدته فی الايصاء بالاطعام عنه بحر۔

وفی الشامية (۲/۹۹): (قوله بان زادت على يوم وليلة) أما لوكانت يوماً وليلة أو أقل وهو يعقل فلا تسقط بل تقضى اتفاقاً وهذا اذا صح فلو مات ولم يقدر على الصلاة لم يلزمه القضاء حتى لايلزمه الايصاء... (قوله فی ظاهر الرواية) وقيل لايسقط القضاء بل تؤخر عنه اذا كان يعقل وصححه فی الهداية وهو من اهل الترجيح لكن خالف نفسه فی كتابه التجنيس۔

(۳۱۶) معذور آدمی کا گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک معذور آدمی ہوں اور مسجد کے پڑوس میں رہتا ہوں لیکن مسجد میں عذر کی وجہ سے نہیں جاسکتا، تو کیا میں اپنے بیٹوں کے ساتھ گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......شریعت مطہرہ نے عذر شرعی، مثلاً بیماری، شدید بارش، شیخ فانی وغیرہ کا اعتبار کیا ہے اور معذور آدمی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ترک کرنے کی رعایت رکھی ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ مسجد کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی گھر میں اپنے تیماردار یا دیکھ بھال کرنے والے کسی فرد کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

لمافی الهندية(۱/۸۲): الجماعة سنة مؤكدة كذا فی المتون والخلاصة والمحيط ومحيط السرخسی ...(ص۸۳) وتسقط الجماعة بالأعذار حتى لاتجب على المريض والمقعد و الزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا يستطيع المشی والشيخ الكبير العاجز والاعمٰى عند أبی حنيفة رحمه الله تعالىٰ۔

وفی الدرالمختار (۱/۵۵۲):(والجماعة سنة مؤكدة للرجال... (وأقلها اثنان)... (وقيل واجبة وعليه العامة)... (فتسنّ أو تجب)... على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)... (فلا تجب على مريض ومقعد وزمن ومقطوع يدورجل من خلاف)... (ومفلوج وشيخ كبيرعاجز وأعمىٰ) وإن وجد قائداً... وقيامه بمريض الخ۔ قال الشامی رحمه الله تحته:(۱/۵۵۵) (قوله ولو فاتته ندب طلبها)... وذكر القدوری: يجمع بأهله ويصلی بهم، يعنی وينال ثواب الجماعة كذا فی الفتح۔

(۳۱۷) دورانِ نماز اگر قیام سے عاجز ہوجائے تو باقی نماز بیٹھ کر ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے دو ہفتوں سے میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب اللہ پاک کا فضل ہے صحت تھوڑی اچھی ہوگئی ہے لیکن چونکہ دو ہفتوں کے مسلسل بخار نے بہت کمزور کردیا ہے اب میری حالت یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو تھوڑی دیر کے بعد سر پر چکر آنا شروع ہوتا ہے تو گرنے لگتا ہوں تو کیا ایسی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں؟ یا کھڑے ہوکر نماز شروع کروں جب چکر آجائے پھر بیٹھ جاؤں۔ لہٰذا جو بھی صورت شرعاً جائز ہو، تحریر فرما کر اللہ کے حضور میں اجر کے مستحق بنئے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... نماز کے اندر قیام فرض ہے اور اگر کوئی عذر کی وجہ سے کھڑے ہوکر نماز ادا نہیں کرسکتا تو بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ البتہ جتنی دیر قیام پر قادر ہے اتنی دیر کھڑا رہے پھر بیٹھ جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کھڑے ہوکر نماز شروع کرنے پر قادر ہیں اس لئے کھڑے ہوکر نماز شروع کریں جب چکر آنا شروع ہوجائیں تو اس وقت بیٹھ جائیں۔

لمافی الفتاویٰ الهندية(۱۳۶/۱): ولو كان قادرا على بعض القيام دون تمامه يؤمر بان يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادرا على ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراءة او كان قادرا على القيام لبعض القرائة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلوانى رحمه الله تعالىٰ هو المذهب الصحيح ولو ترك هذا خفت ان لا تجوز صلاته كذا فى الخلاصة۔

وفی الشامية(۹۷/۲): وفى شرح الحلوانى نقلا عن الهندوانى: لو قدر على بعض القيام دون تمامه، أو كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد ان عجز وهو المذهب الصحيح لا يروى خلافه عن اصحابنا۔

(۳۱۸) بیمار آدمی کیلئے قبلہ رُخ کئے بغیر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ ہسپتال کی چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چارپائی مریضوں کے زیادہ ہوجانے کی وجہ سے ادھر ادھر بھی نہیں ہوسکتی تو کیا مریض بغیر قبلہ رخ کئے نماز ادا کرسکتا ہے کیونکہ چہرہ قبلہ کی طرف نہیں بلکہ شمال کی جانب ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورتِ مسئولہ میں مریض کے چہرے کو قبلہ کی طرف پھیرنے والا موجود ہے تو قبلہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھے اگر مریض کے پاس کوئی بھی موجود نہ ہو، اور وہ خود بھی نہیں پھیر سکتا تو جس طرف بھی اس کا منہ ہو اسی طرف منہ کرکے نماز

ادا کرلے۔

لمافی الهندية(۱/۶۳): مریض صاحب فراش لا یمکنه ان یحول وجهه ولیس بحضرته احد یوجهه یجزیه صلوته الی حیث ماشاء کذا فی الخلاصة وکذا اذا کان یجد من یحوله ولکن یضره التحویل هکذا فی الظهیرية۔

وفی الدر المختار(۱/۴۳۲): (وقبلة العاجز عنها) لمرض وان وجد موجها عند الامام اوخوف مال وکذا کل من سقط عنه الأرکان

وفی الشامية تحته: (وکذا کل من سقط عنه الارکان) أی تکون قبلته جهة قدرته ایضا۔

(۳۱۹) قیام، رکوع وسجدہ سے عاجز کا بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری والدہ جوڑوں کی مریض ہیں اور زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے، اب اگر وہ اس مجبوری کی بنا پر تخت یا چارپائی وغیرہ پر ہی بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہیں تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اگر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا چاہیں تو کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... صورت مسئولہ میں اگر آپ کی والدہ قیام، رکوع وسجدہ کرنے سے عاجز ہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتی ہیں، چاہے چارپائی پر پڑھیں یا تخت پر۔ اگر بیٹھ کر رکوع وسجدہ سے بھی عاجز ہوں تو پھر اشارے سے نماز پڑھ لیں لیکن سجدہ کا اشارہ رکوع سے ذرا جھک کر کریں۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۶) : اذا عجز المریض عن القیام صلی قاعدا یرکع ویسجد کذا فی الهداية وان عجز عن القیام والرکوع والسجود وقدر علی القعود یصلی قاعدا بایماء ویجعل السجود اخفض من الرکوع۔

وفی الدر المختار(۲/۹۷): (وان تعذرا)... وفی (ص۹۸) (أوما) بالهمز قاعدا وهو افضل من الایماء قائما لقربه من الارض (ویجعل سجوده اخفض من رکوعه)۔

(۳۲۰) تختہ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں ایسی کرسیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں آگے ایک تختی لگی ہوتی ہے اور کرسی پر بیٹھنے والا اس پر سجدہ کرتا ہے کیا فرش کے علاوہ کسی اور چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ اگر اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہو تو ضرور بیان کریں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہرایسی چیز پر سجدہ کرنا درست ہے جو کہ حجم رکھتی ہو، اور ٹھوس ہو کہ پیشانی اس پر ٹھہر سکے تو ایسی چیز زمین ہی کے حکم میں ہوگی۔ صورت مسئولہ میں معذور شخص جو کہ رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو، تو اس کیلئے اس مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سامنے نصب شدہ تختی پر سجدہ کرنا اور نماز کا پڑھنا بلا کسی کراہت کے جائز ہے اور ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

لما فی الشامية(۴۵۴/۱): (وشرط سجود) مبتدأو مضاف اليه (فالقرار) خبر بزيادة الفاء (لجبهة) أی يفترض أن يسجد على مايجد حجمه بحيث أن الساجد لوبالغ لايتسفل رأسه ابلغ مما كان عليه حال الوضع، فلا يصح على نحو الأرز والذرة، الا ان يكون فی نحو جوالق، ولا على نحو القطن والثلج والفرش الا ان وجد حجم الارض بكبسه۔

(۳۲۱) زمین یا کرسی وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر آج کل لوگ مساجد میں مخصوص کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور کتنے عذر کی بنا پر آدمی کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جو لوگ مخصوص کرسیوں وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں ان لوگوں کا ان کرسیوں پر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہوگا کہ یہ لوگ بغیر ضرر کے کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں لیکن اگر بغیر ضرر کے تکبیر تحریمہ کہنے کے بقدر بھی قیام پر قادر ہوں اور رکوع وسجدہ بھی کر سکتے ہوں تو تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر کہیں اور پھر بیٹھ جائیں یا جتنی مقدار بھی کھڑے ہونے پر بغیر ضرر کے قادر ہوں تو اس قدر کھڑے ہونا ان حضرات پر لازم ہے پھر جب عاجز ہو جائیں تو بیٹھ جائیں، اور اگر رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ رکھتے ہوں تو اگرچہ قیام پر بغیر ضرر کے بھی قادر ہوں تو پھر ان حضرات کیلئے یہ جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں اور قیام ان لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور جس شخص کیلئے کھڑا ہونا متعذر ہو یا کھڑا ہونے میں ان کو ضرر لاحق ہوتا ہو، تو اس شخص کو بیٹھ کر نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی الهندية(۱۳۶/۱): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا فی الهداية واصح الاقاويل فی تفسير العجز ان يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوىٰ كذا فی معراج الدراية وكذلك اذا خاف زيادة المرض او ابطاء البرء بالقيام او دوران الراس كذا فی التبيين او يجد وجعاً لذلك، فان لحقه نوع مشقة لم يجز ترك ذلك القيام كذا فی الكافی ولو كان قادراً على بعض القيام دون تمامه يؤمر بان يقوم قدر مايقدر حتى اذا كان قادراً على ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقرائة او كان قادراً على القيام لبعض القرآة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرء قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلوانی رحمه الله تعالىٰ

هو المذهب الصحيح ولو ترك هذا خفت ان لا تجوز صلا ته كذا فى الخلاصة ولو قدر على القيام متكئاً الصحيح انه يصلى قائما متكئاً ولا يجزيه غير ذلك وكذلك لو قدر على ان يعتمد على عصا او على خادم له فانه يقوم ويتكئ كذا فى التبيين ويكره للمؤمى ان يرفع اليه عوداً او وسادة ليسجد عليه ... فان كانت الوسادة موضوعة على الارض وكان يسجد عليها جازت صلوته۔

وفى الدر المختار (۹۷/۲): (وإن تعذرا) ليس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود كاف (لا القيام)

وفى الشامية تحته: وفى الذخيرة: رجل بحلقه خراج إن سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلى قاعدا يومئ، ولو صلى قائما بركوع وقعد وأومأ بالسجود أجزاه والأول أفضل، لان القيام والركوع لم يشرعا قربة بنفسها بل ليكونا وسيلتين الى السجود اهـ۔

وفيه ايضاً (۹۵/۲): (من تعذر عليه القيام) اى كله (لمرض) حقيقى و حدّه ان يلحقه بالقيام ضرر به يفتى (قبلها أو فيها) أى الفريضة (أو)حكمى بأن(خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه او دوران رأسه او وجد لقيامه الما شديداً) أو كان لوصلى قائما سلس بوله أو تعذر عليه الصوم كما مر (صلى قاعداً) ولو مستندا الى وسادة أو انسان فانه يلزمه ذلك على المختار (كيف شاء) على المذهب ... (بركوع وسجود وان قدر على بعض القيام) ولومتكئاً على عصا أو حائط (قام) لزوماً بقدر مايقدر ولو قدر آية أوتكبيرة على المذهب۔

و فى الشامية : (۹٦/۲) واختلفوا فى التعذر...فقيل ما يبيح الافطار وقيل التيمم وقيل بحيث لو قام سقط وقيل ما يعجزه والاصح ان يلحقه ضرربالقيام ... (قوله ولو مستنداً الخ) اى اذا لم يلحقه ضرربه بدليل مامر (وفى صـ۹۷) وبه ظهر ان المراد بالانسان من يطيعه اعم من الخادم والاجنبى ... (قوله كيف شاء) اى كيف تيسرله بغير ضرر من تربع او غيره (قوله على المذهب) جزم به فى الغرر ونور الايضاح وصححه فى البدائع وشرح المجمع واختاره فى البحر والنهر۔

(۳۲۲) نمازیوں کی مروجہ کرسیوں میں ۹ / انچ اونچائی رکھنے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ کی مسجد میں چند کرسیاں جو آجکل مساجد میں بزرگ حضرات نماز ادا کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں موجود تھیں۔ کچھ دن قبل یہ کرسیاں مذکورہ مسجد کے خطیب کے کہنے پر اٹھادی گئیں

تھیں، اُن کا کہنا تھا کہ ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن چند دن بعد دوبارہ رکھ دی گئیں اور کہا گیا کہ ان کرسیوں میں سے جن کی اونچائی ۹/انچ تھی ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح ہے اور جن کی اونچائی ۹/انچ نہیں ہے اُن کو ۹/انچ تک برابر کروا کر دوبارہ رکھ دیں گے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس ۹/انچ اونچائی کی کیا علت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... سجدہ کے لغوی معنی ہے پیشانی زمین پر رکھنا یعنی آدمی جس جگہ بیٹھا ہوا ہو، اس جگہ سے جھک کر پیشانی زمین پر رکھے یا وہ جو زمین کے قائم مقام ہو، مثلاً تخت وغیرہ پس اگر سجدہ والی جگہ بیٹھنے والی جگہ کی بہ نسبت اونچی ہو تو اس صورت میں سجدہ ادا ہوگا یا نہیں؟ اس کے لئے فقہاء کرام نے یہ حد مقرر کی ہے کہ اگر سجدہ والی جگہ نصف ذراع کے بقدر اونچی ہے تو سجدہ ادا ہو جائے گا اور اگر اس سے زیادہ اونچی ہے تو پھر سجدہ ادا نہ ہوگا اور نصف ذراع تقریباً ۹/انچ ہے کما صرّح بہ فی اوزان الشرعیۃ (صفحہ ٦٢) لہٰذا مذکورہ امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی المحیط البرھانی(۱۲۲/۲): واذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین (کہ زمین نشیب بود) قیل ذکر الشیخ الامام الاجل شمس الائمّة الحلوانی فی شرح کتاب الصلوۃ انّہ ان کان التفاوت بمقدار لبنة او لبنتین یجوز وان کان اکثر من ذلك لایجوز واراد باللبنة اللبنة المنصوبة دون المفروشة۔

وفی الدر المختار(۵۰۳/۱): ولو کان موضع سجودہ ارفع من موضع القدمین بمقدار لبنتین منصوبتین (ای موضوعة احدھما فوق الاخری) جاز سجودہ وان اکثر لا الالزحمة کمامر والمراد لبنة بخاری وھی ربع ذراع عرض ستة اصابع(ای مقدر بعرض ستة اصابع مضموم بعضھا الی بعض لا بطولھا) فمقدار ارتفاعھما نصف ذراع ثنتا عشرة اصبعاً ذکرہ الحلبی

وفیہ ایضاً(۴۰/۲): ولو صلی علی دابة فی شق محمل وھو یقدر علی النزول بنفسہ لاتجوز الصلاۃ علیھا اذا کانت واقفة الا ان تکون عیدان المحمل علی الارض بأن رکز تحتہ خشبة۔

وفی الکبیری(ص۲۷۸): والخامسہ من الفرائض السجدة وھی فریضة تتادی بوضع الجبھة علی الارض اوما یتصل بھا بشرط الانخفاض الزائد علی نھایة الرّکوع مع الخروج عن حدّ القیام لانہ لا یعد ساجداً لغة وعرفاً بما دونہ ویعدبہ۔

وفیہ ایضاً(ص۲۸۱): ولو کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین ان کان ارتفاعہ مقدار ارتفاع لبنتین منصوبتین جاز السجود علیہ والا فلا یجوز السجود واراد باللبنة لبنة بخاری وھی ربع ذراع عرض ست اصابع فمقدار ارتفاع اللبنتین المنصوبتین نصف ذراع طول اثنتی عشرة اصبعاً... وذکر الزاھدی لو سجد یعنی المریض علی دکان دون صدرہ یجوز کالصحیح انتھی

والاقرب ماذکر المصنف لما قدمناه فی اوّل بحث السجدة من حدادنی السجود المجزی فانه صادق فیما اذا کان الارتفاع هذا المقدار لافی الأزید فلیتامل۔

(۳۲۳) بیٹھ کرنماز پڑھنے والے کے رکوع کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹھ کرنماز پڑھنے والا سر کو کس قدر جھکائے تا کہ رکوع ادا ہو جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر کوئی شخص بیٹھ کرنماز پڑھتا ہے، اس کیلئے مناسب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے وہ اپنی پیشانی کو اپنے گھٹنے کے سرے کے قریب کرے۔

وفی الشامیة(۱/۴۴۷):وفی حاشیة الفتال عن البرجندی: ولو کان یصلی قاعداً ینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه لیحصل الرکوع اهـ قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والافقد لمت حصوله باصل طأطأة الراس ای مع انحناء الظهر تأمل۔

(۳۲۴) کرسی پر بیٹھ کرنماز پڑھنے والا سجدہ کی حالت میں کہاں تک سر جھکائے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں معذور حضرات کیلئے کرسیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں آگے تختہ لگا ہوا ہوتا ہے تا کہ اس پر سر رکھ کر سجدہ کیا جا سکے۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس تختہ پہ سر رکھ کر سجدہ کرنا درست ہے؟ یا ویسے ہی تھوڑا سا جھک کر سجدہ کیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سجدہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ زمین یا اس جیسی سخت چیز پر اپنی پیشانی کو اچھی طرح سے ٹکائے البتہ اگر کوئی شخص عذر کی بناء پر سجدہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔اور اس کے لئے کسی سہارے پر مثلاً تکیہ، میز وغیرہ پر سر رکھ کر سجدہ کرنا آسان ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے، اور اگر اس پر بھی قدرت نہیں تو صرف اشارہ سے سجدہ کرنا کافی ہے۔اور اگر زمین پر بھی نہیں بیٹھ سکتا بلکہ کسی اونچی چیز کرسی وغیرہ (جیسا کہ آج کل مساجد میں کرسیاں رکھی گئی ہیں سامنے تختہ لگا ہوا ہے) پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔لیکن تختہ پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرنا ضروری ہے ہاں اگر عذر ہو تو حسبِ طاقت اشارہ کرے۔لیکن یہ خیال رہے کہ سجدہ میں رکوع سے زیادہ جھکنا پایا جائے۔

بیٹھ کر زمین پر سجدہ کر کے نماز پڑھنے کی قدرت کے باوجود معمولی عذر کی بنا پر کرسیوں پر نماز پڑھنا درست نہیں۔

لما فی سنن الکبریٰ للبیهقی(۲/۳۰۷):عن الحسن عن امه قالت رأیت ام سلمة زوج النبی ﷺ تسجد علی وسادة من ادم من رمدبها۔

وفی الدر المختار(۹۶،۹۷،۹۸/۲): (صلی قاعدا) ولو مستندا إلی وسادة ... الی قوله... (وان تعذرا لیس تعذر هما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام أو ما) بالهمز (قاعدا)... (ویجعل سجوده اخفض من رکوعه)

وفی الشامية (۹۸/۲): (قوله فانه یکره تحریما) قال فی البحر: واستدل للکراهة فی المحیط بنهیه علیه الصلاة والسلام عنه، وهو یدل علی کراهة التحریم وتبعه فی النهر۔

اقول: هذا محمول علی ماذا کان یحمل الی وجهه شیا یسجد علیه بخلاف ماذا کان موضوعاً علی الارض یدل علیه مافی الذخیره حیث نقل عن الاصل الکراهة فی الاول ثم قال فان کانت الوسادة موضوعة علی الارض وکان یسجد علیها جازت صلاته، فقد صح ان ام سلمة کانت تسجد علی مرفقة موضوعة بین یدیها لعلة کانت بها ولم یمنعها رسول الله ﷺ من ذلک ھ۔

فان مفاد هذه المقابلة والاستدلال عدم الکراهة فی الموضوع علی الارض المرتفع ثم رأیت القهستانی صرح بذلک۔

وفیه ایضاً (۹۹/۲): انه لو کان قادرا علی وضع شئ علی الارض مما یصح السجود علیه انه یلزمه ذلک لأنه قادر علی الرکوع والسجود حقیقة ولا یصح الایماء بهما مع القدرة علیهما بل شرطه تعذرهما کما هو موضوع المسألة۔

(۳۲۵) خروج ریح کی صورت میں اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصہ سے ایک بیماری ہے جو نماز کیلئے پریشانی کا باعث بنتی ہے وہ یہ ہے کہ جب میں نماز کے دوران رکوع یا سجدہ کرتا ہوں تو ریح خارج ہو جاتی ہے۔ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ آپ نماز بیٹھ کر ادا کیا کریں اور رکوع اور سجدہ کرنے کی بجائے اشارہ کیا کریں۔آیا ایسی صورت میں میرے لئے بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں مذکورہ عذر (خروج ریح) کی وجہ سے آپ کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنا اور رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرنا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱۳۸/۱): کلّ من لا یقدر علی اداء رکن الا بحدث یسقط عنه ذالک الرکن کذا فی فتاوی قاضیخان۔ حتی لو کان به جراحة لا یستطیع ان یسجد الا وتسیل جراحته وهو صحیح فیما سوی ذالک یقدر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعداً ویؤمی ایماءً۔

وفی الشامیة (۲/۹۸): رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعداً ویومی۔

وفیه ایضاً(۱/۳۰۷): (قوله ولو بصلاته مؤمئا) ای کما اذا سال عند السجود ولم یسل بدونه فیؤمی قائما او قاعدا وکذا لو سال عند القیام یصلی قاعدا۔

(قوله وبرده لا یبقی ذاعذر) قال فی البحر: ومتی قدر المعذور علی رد السیلان برباط او حشو أو کان لوجلس لا یسیل ولو قام سال وجب وخرج برده عن ان یکون صاحب عذر، ویجب ان یصلی جالسا بایماء ان سال بالمیلار ، لان ترك السجود اهون من الصلاة مع الحدث۔

(۳۲۶) کبڑے شخص کے رکوع کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبڑا شخص نماز کے اندر رکوع کس طرح کرے جبکہ وہ عام حالات میں بھی اتنا جھکا ہوتا ہے جیسے رکوع کی حالت میں ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کبڑا پن اگر حالت رکوع تک پہنچ جائے تو پھر کبڑا شخص سر کے اشارے سے رکوع کرے گا۔

لمافی الخلاصة (۱/۵۳): الاحدب اذا بلغت حدوبته الرکوع یشیر براسه للرکوع۔

وفی الهندیة (۱/۷۰): والاحدب اذا بلغت حدوبته الرکوع یشیر براسه للرکوع۔

(۳۲۷) دوراستوں میں کم وزیادہ مسافت کے وقت سفر شرعی کیلئے ۴۸ میل کا اعتبار ہوگا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے اپنے سسرال جانے کیلئے دوراستے ہیں ایک ہموار اور دوسرا ناہموار۔ زید جب ہموار راستے سے اپنے سسرال جاتا ہے تو تین دن میں ۴۸ میل سفر طے کرتا ہے اور جب ناہموار راستے سے جاتا ہے تو تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اب وہ قصر نماز پڑھے گا یا مکمل نماز پڑھے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......فقہاء احناف کے یہاں سفر کی ادنیٰ مقدار مسافر شرعی بننے کیلئے وہ تین دن اور تین رات کا سفر ہے چاہے حقیقتاً تین دن پائے جائیں یا تین دن کی مسافت کے بقدر مسافت پائی جائے دونوں صورتوں میں انسان مسافر شرعی کہلاتا ہے اور اس پر سفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اصل مذہب کے اعتبار سے فرسخ کا اعتبار نہیں ہے بلکہ صرف تین دن کی مسافت کا اعتبار ہے اگرچہ بعد کے فقہاء نے فرسخ کا اعتبار کیا ہے جس کو موجودہ دور میں میل اور کلومیٹر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ان حضرات کا مقصد بھی فرسخ

وغیرہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تین دن میں انسان درمیانی چال (اونٹ یا پیدل سفر کرنے) سے اتنی مسافت طے کرتا ہے۔اب اگر کوئی شخص تین دن کا سفر کر کے کسی جگہ پہنچتا ہے زمین کے دشوار گزار ہونے کی بناء پر تو وہ بھی مسافر شرعی ہے اگر چہ فرسخ کے اعتبار سے کم ہی فاصلہ ہو،اس صورت میں فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا بوجہ نص کے کیونکہ نص میں تین دن کے الفاظ موجود ہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں جب زید نا ہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اس صورت میں وہ مسافر شرعی ہے اور وہ قصر نماز پڑھے گا کیونکہ تین دن کے سفر کی صورت میں میل اور فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے البتہ یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو کہ معتاد تین دن اور تین رات کا سفر کرے اور اگر کوئی شخص گاڑی وغیرہ میں سفر کرتا ہے جیسا کہ موجودہ زمانے میں کیا جاتا ہے تو وہاں ۴۸ میل کا ہی اعتبار ہوگا چاہے ۴۸ میل تین دن سے کم میں ہی مکمل ہو جائیں اس صورت میں دنوں کا اعتبار نہیں ہوگا اگر ۴۸ میل کا سفر طے کر لیا ہے تو قصر پڑھے گا ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۸): فاذا قصد بلدة والى مقصده طريقان أحدهما مسيرة ثلاثة ايام ولياليها والآخر دونها فسلك الطريق الابعد كان مسافرا عندنا هكذا فى فتاوىٰ قاضى خان وان سلك الا قصريتم كذا فى البحر۔

وفى فتح القدير(۲/۳۰): (قوله هو الصحيح) احتراز عما قيل يقدربها فقيل بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر بقدر منها اعتقد انه مسيرة ثلاثة ايام وانما كان الصحيح ان لا يقدر بها لانه لو كان الطريق وعراً بحيث يقطع فى ثلاثه ايام اقل من خمسة عشر فرسخا قصر بالنص وعلى التقدير باحد هذه التقديرات لايقصر فيعارض النص فلا يعتبر سوى سير الثلاثة وعلى اعتبار سيرا لثلاثة بمشى الاقدام لوسارها مستعجل كالبريد فى يوم قصر فيه وافطر لتحقق سبب الرخصة وهو قطع مسافة ثلاثة بسير الابل ومشى الاقدام۔

وفى الدرالمختار (۲/۱۲۳،۱۲۲): (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها) من أقصر أيام السنة ولا يشترط سفر كل يوم إلى الليل بل إلى الزوال ولا اعتبار بالفراسخ على المذهب (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لواسرع فوصل فى يومين قصر، ولو لموضع طريقان أحدهما مدة السفر والاخر اقل قصر فى الاول لا الثانى۔ قال العلامة الشامى عليه الرحمة فى رد المحتار: قال فى النهاية: أى التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة ايام لان المعتاد من السير فى كل يوم مرحلة واحدة خصوصا فى أقصر أيام السنة كذا فى المبسوط اھ وكذا مافى الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقد أنه مسيرة ثلاثة ايام اھ اى بناء على اختلاف البلدان فكل قائل قدر ما فى بلده من أقصر الأيام أو

بناء على اعتبار أقصر الأيام او أطولها او المعتدل منها وعلى كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ماتقطع فيها المراحل المعتادة فافهم ......(قوله على المذهب) لأن المذكور فی ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة ايام كمافی الحلية وقال فی الهداية: هو الصحيح احتراز عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ۔

وفی فتح الملهم(۵۳۷/۴): تنبيه: نبه ابن عابدين على ان المراد بالايام ما تقطع فيه المراحل المعتادة، وفی الدر المختار وغيره لو اسرع فوصل فی يومين الى مكان مسافة ثلثة ايام بالسير المعتاد: قصر۔ قال ابن عابدين وظاهره انه كذلك لو وصل اليه فی زمن يسير بكرامة لكن استبعده (ابن الهمام) فی فتح القدير بانتفاء مظنة المشقة وهی العلة فی القصر قلت: والظاهر ان هذا الاستبعاد من ابن الهمام يجری فی اسفار زماننا ايضا من سير البابورة والمواتر وغيرهما والله اعلم۔

(۳۲۸) مسافر شرعی کی تعریف

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر شرعی کسے کہتے ہیں؟ آج کل تبلیغی جماعت والے جب چلہ یعنی چالیس دن لگاتے ہیں تو ایک بستی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن تشکیل ہوجانے کی صورت میں بعض جماعتیں سفری نماز ہی پڑھتی ہیں حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ کسی شخص کا پندرہ دن یا اس سے زیادہ وقت اگر ایک جگہ پر رہنے کا ارادہ ہو تو وہ مسافر مقیم ہوجاتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جو شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرے جس کی مسافت تین دن پیدل چلنے یا اونٹ کے چلنے کے برابر ہو جس کا اندازہ فقہاء کرام نے ۴۸ میل/ ۷۷ء۸۵۴۲ کلومیٹر لگایا ہے اور وہاں پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو ایسا شخص مسافر شرعی کہلائے گا اور یہ شخص قصر کرے گا۔ پس صورتِ مسئولہ میں جن جماعتوں کی تشکیل ایک ہی بستی یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ہوجائے اور وہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت بھی ہو، یہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے ہاں اگر پندرہ دن سے کم ہو تو پھر یہ مسافر ہوں گے اور نماز قصر پڑھیں گے۔

وفی الهندية(۱۳۹/۱): ولايزال على حكم السفر حتى ينوی الاقامة فی بلدة أوقرية خمسة عشر يوما أو اكثر كذا فی الهداية۔

وفی الدر المختار(۱۲۵/۲): (اوينوی) ولو فی الصلوة اذا لم يخرج وقتها ولم يك لاحقا (اقامة نصف الشهر) حقيقة اوحكما لما فی البزازية وغيرها: لودخل الحاج الشام وعلم انه لايخرج الامع

القافلۃ فی نصف شوال أتم لانہ کناوی الاقامۃ۔

(۳۲۹) مسافت شرعی کی ابتداء وانتہا کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفر کی مسافت جو کہ ۴۸ میل ہے اس کا اعتبار وشمار کہاں سے ہوگا، شہر کی حدود کے باہر سے یا مسافر کے گھر سے؟ اسی طرح جس شہر کی طرف سفر کر رہا ہے، وہاں پر بھی اس شہر کی حدود تک مسافت کا اعتبار ہوگا یا اس خاص مقام تک کا اعتبار کیا جائے گا جہاں وہ قیام پذیر ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... سفر کی مسافت کا اعتبار اپنے شہر کی آبادی اور حدود کے ختم ہونے کے بعد سے کیا جاتا ہے۔ نیز جہاں کی طرف سفر کر رہا ہے اس سے متعلق صریح جزئیہ تو نہیں ملا لیکن ابتداء سفر پر قیاس کر کے کہا جا سکتا ہے کہ اس شہر کی حدود کی ابتداء کا اعتبار ہوگا نہ کہ اس مقام اور محلہ کا جہاں اسے جانا ہے۔ لہٰذا جس شہر کی طرف سفر کر رہا ہے اگر اس کی حدود میں اور اس کے شہر کی حدود میں مسافت شرعی سے زیادہ کا فاصلہ ہے تو یہ مسافر ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافی الدر المختار(۱۲۱/۲): (من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ) من جانب خروجہ وان لم یجاوز من الجانب الاخر۔

وفی الشامیۃ (۱۲۱/۲): (قولہ من جانب خروجہ الخ) قال فی شرح المنیۃ: فلا یصیر مسافراً قبل ان یفارق عمران ماخرج منہ من الجانب الذی خرج حتی لو کان ثمۃ محلۃ منفصلۃ عن المصر وقد کانت متصلۃ بہ لایصیر مسافراً مالم یجاوزھا، ولوجاوز العمران من جھۃ خروجہ وکان بحذائہ محلۃ من الجانب الاخر یصیر مسافراً اذ المعتبر جانب خروجہ۔

(۳۳۰) مسافت سفر کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوگی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مسافتِ سفر کے بارے میں ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص گوجرانوالہ سے لاہور شہر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی مسافت کی مقدار سفر شرعی کے برابر نہیں بنتی، لیکن وہ لاہور شہر ہی میں اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس کی مسافت کی مقدار سفرِ شرعی کی مقدار کے برابر ہو جاتی ہے تو آیا اس پر احکاماتِ سفر لازم ہوں گے یا نہیں، اور مقدار مسافت کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر گوجرانوالہ کی حدود سے لاہور شہر کی حدود تک سفرِ شرعی نہیں بنتا تو یہ شخص مسافر نہیں ہوگا۔ سفر کی ابتداء اور انتہاء دونوں میں شہر کی حدود کا اعتبار کیا جائے گا نہ کہ اس مقام اور محلہ کا جہاں یہ جا رہا ہے۔

لمافی الدر المختار(۱۲۱،۱۲۲/۲): (من خرج من عمارۃ موضع اقامتہ)... (قاصدا) (مسیرۃ ثلاثۃ

أیام ولیا لیھا) . . . (حتی یدخل موضع مقامه) ان سار مدة السفر. . .

وفی بدائع الصنائع(۱/۴۷۷): وفعل السفر لا یتحقق الا بعد الخروج من المصر فما لم یخرج لا یتحقق قران النیة بالفعل، فلا یصیر مسافراً۔

(۳۳۱) جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو تو وہ کب قصر کرے گا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں سڑک سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اگر ہمیں سفر کرنا ہو تو ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے گاڑی پر جا کر سوار ہوتے ہیں اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم سے کسی کو مسافت شرعی سے زیادہ کہیں سفر پر جانا پڑے تو راستے میں قصر ہوگی۔ اب یہ قصر گاؤں سے نکلتے ہی شروع ہوگی یا اڈے سے سوار ہونے کے بعد قصر کے احکامات شروع ہوں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو، تو جب وہ شہر کی آبادی اور فناء مصر سے نکل جائے گا تو اس پر سفر کے احکام جاری ہوں گے، لہٰذا اگر صورت مسئولہ میں اڈہ فناء مصر میں داخل ہے تو اڈے سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے اگر اڈہ فناء مصر میں داخل نہیں تو پھر آبادی سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے۔

لمافی الھندیة(۱/۱۳۹): قال محمد رحمة الله تعالیٰ یقصر حین یخرج من مصره ویخلف دور المصر کذا فی المحیط۔ وفی الغیاثیه هو المختار وعلیه الفتوی کذا فی التتارخانیة، الصحیح ما ذکر انه یعتبر مجاوزة عمران المصر لا غیر الا اذا کان ثمة قریة او قری متصلة بربض المصر فحینئذ تعتبر مجاوزة القری بخلاف القریة التی تکون متصلة بفناء المصر فانه یقصر الصلاة وان لم یجاوز تلك القریة کذا فی المحیط۔

وفی الدر المختار(۲/۱۲۱): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم یجاوز من الجانب الاخر۔

(۳۳۲) مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں عمرہ کرنے گیا۔ وہاں پر پہنچ کر عمرہ ادا کیا اس کے بعد آرام کرنے ہوٹل چلے گئے اور سو گئے آنکھ کھلی تو عصر کی نماز ہو رہی تھی۔ ہم نے جماعت سے نماز ادا کی۔ پھر اس کے بعد ظہر کی قضا نماز ادا کی۔ قصر نہیں پڑھی کسی نے ہمیں بتایا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیا یہ صحیح ہے۔ باقی سب جگہ پر قصر نماز صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جب کوئی مقیم شخص گھر سے سفر شرعی کے ارادے سے نکلتا ہے جو آجکل کے حساب سے اڑتالیس میل (۷۷ء۹۸ کلومیٹر) بنتا ہے۔ اپنے شہر یا بستی سے نکلنے کے بعد اس پر مسافر کے احکام جاری ہو جاتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز قصر پڑھے۔ اور یہ قصر نماز پڑھنا واجب ہے یعنی چار رکعت والی فرض نمازیں دو رکعت پڑھے گا۔ اور یہ حکم کسی خاص جگہ یا مقام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن کسی جگہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔ یا اپنے شہر لوٹ نہ آئے۔ اس پر وہی مسافر کے احکام جاری ہوں گے البتہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کی نیت کرنے کے بعد وہ شخص پوری نماز پڑھے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ عمرہ کیلئے پندرہ دن سے کم وقت کیلئے گئے تھے۔ تو آپ کا پوری نماز پڑھنا درست نہیں بلکہ آپ کیلئے قصر نماز پڑھنا ضروری تھا۔ البتہ جو نمازیں آپ نے پوری پڑھی ہیں وہ ادا ہوگئی ہیں بشرطیکہ ان نمازوں میں قعدہ اولیٰ کیا ہو۔ اور کسی کا یہ کہنا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر درست نہیں بلکہ پوری نماز پڑھی جائے گی یہ بات درست نہیں۔ بلکہ قصر کا حکم مسافر کیلئے ہر جگہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو، خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو مسجد حرام میں قصر نماز پڑھی ہے۔

لمافی الدر المختار(۲/۱۲۴،۱۲۳): (صلّی الفرض الرباعی رکعتین) وجوبا لقول ابن عباس رضی اللہ عنہ: ان الله فرض علی لسان نبیکم صلاة المقیم أربعا والمسافر رکعتین ولذا عدل المصنف عن قولهم قصر لان الرکعتین لیستا قصرا حقیقة عندنا بل هما تمام فرضه والاکمال لیس رخصة فی حقه بل اسائة۔

وفی الفتاوی الهندیة(۱/۱۳۹): والقصر واجب عندنا کذا فی الخلاصة. فان صلی أربعا وقعد فی الثانیة قدر التشهد أجزأته والأخریان نافلة ویصیر مسیئاً لتأخیر السلام وان لم یقعد فی الثانیة قدرها بطلت کذا فی الهدایة۔

(۳۳۳) 95 کلومیٹر مسافت پر پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک استفتاء کسی ساتھی کے توسط سے داخل کیا تھا (استفتاء نمبر ۲۲۱۳) جسکا جواب مل گیا لیکن اب مسئلہ یہ درپیش ہوا، ہمارا گھر اور کوئٹہ کے درمیان 95 کلومیٹر فاصلہ ہے پہلے والے میں (70 کلومیٹر) لکھا ہوا تھا جو کہ غلط تھا اب معلوم کرنے پر 95 کلومیٹر بنتا ہے۔

اب کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ جبکہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میں نے کوئٹہ میں ایک کرائے کا کمرہ لیا ہوا ہے، جب میں آتا ہوں تو ایک دو دن کیلئے ٹھہرتا ہوں پھر گھر جاتا ہوں پھر گھر سے واپس آ کر تین چار دن رہ کر پھر واپس گھر جاتا ہوں یعنی پندرہ دن سے کم رہتا ہوں تو اندازاً پندرہ دن میں میں دو تین مرتبہ گھر جاتا ہوں اور کرایہ کا مکان اس لئے لیا ہے تاکہ میرا سامان اور آرام کرنے کی جگہ معین ہو۔ تو اب ان تمام صورتوں میں میرے لئے کیا حکم ہے کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ اگر میں مسافر نہیں ہوں تو جو نمازیں میں نے مسافرانہ

پڑھی ہیں ان کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے گھر اور کوئٹہ شہر کے درمیان 95 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور آپ کوئٹہ شہر میں 15 روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں کرتے (اگر چہ آپ نے سامان وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے وہاں مکان کرائے پر لیا ہوا ہے) تو شرعاً آپ مسافر ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی مسافرانہ ہوگی کیونکہ سفر کی مسافت شرعیہ تین دن کی مسافت ہے جو کہ 48 میل کے برابر ہوتی ہے 48 میل کے تقریباً 77 کلومیٹر بنتے ہیں اور جو نمازیں آپ نے قصر یعنی مسافرانہ پڑھی ہیں وہ ادا ہوگئیں ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

لمافی التاتارخانیه (۱/۲): فی بیان ادنی مدة السفر الذی یتعلق به قصر الصلوة قال علمائنا ادناها مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها مع الاستراحات۔۔۔۔۔ وعن ابی حنیفة انه اعتبر ثلاث مراحل۔

وفی الشامیة (۱۳۳/۲) فاذا دخل المسافر بلدة ونوی ان یقیم بها یوما مثلا ثم خرج منها ثم رجع الیها قصر فیها کما کان یقصر قبل خروجه وعلیه یحمل کلام المحققین لقول البحر انهم قالوا لافائدة فیه لانه یبقی فیه مسافرا علی حاله۔

(۳۳۴) کوئٹہ سے قلات اگر پندرہ دن سے کم کیلئے جانا ہو تو قصر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغرضِ ملازمت میرا ضلع قلات آنا جانا رہتا ہے۔ ہمیشہ جب بھی جاتا ہوں ایک آدھ ہفتہ کی نیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد واپس اپنے وطن اصلی کوئٹہ آجاتا ہوں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قلات میں نماز قصر کروں یا پوری پڑھوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... چونکہ ضلع قلات اور آپ کے وطن اصلی کوئٹہ کے درمیان مسافت، شرعی مقدار مسافت سے زیادہ ہے اور وہاں پر آپ کی پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں ہوتی اس لئے آپ پر قلات میں اور حالت سفر میں قصر نماز پڑھنا لازم ہے۔

لمافی الهندیة(۱۳۹/۱): ولا یزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة او قریة خمسة عشر یوما أو اکثر کذا فی الهدایة هذا اذا سار ثلاثة ایام۔

وفی الشامیة(۱۳۱/۲): (قوله الوطن الاصلی) ویسمی بالاهلی ووطن الفطرة والقرار (قوله او تأهله) ای تزوجه قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینوالاقامة به فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وهو الاوجه ولو کان له اهل ببلدتین فأیتهما دخلها صارمقیما، فان ماتت زوجته فی احداهما وبقی له فیها دور وعقار قیل لایبقی وطناله اذا المعتبرا لاهل دون

الدار كما لو تاهل ببلدة واستقرت سكناله وليس له دار فيها وقيل تبقى (قوله او توطنه) أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل، فلو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتاهل به فليس ذلك وطناله الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله۔

(۳۳۵) دو شہروں میں رہائش ہو تو وطن اصلی کونسا ہو گا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا آبائی شہر سکھر ہے لیکن اب اس نے لاہور میں شادی کر لی ہے کبھی سکھر میں رہتا ہے اور کبھی لاہور میں تو اس کا وطن اصلی لاہور ہو گا یا سکھر؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکھر میں رہتا ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، اور کبھی لاہور میں اپنے اہل عیال کے ساتھ رہتا ہو، اور یہاں اپنا گھر بھی ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، تو دونوں جگہیں ان کا وطن اصلی ہو گا۔ اور اگر سسر کے ہاں بچوں کو ملنے ملانے کیلئے آیا ہو تو اگر پندرہ دن یا زیادہ دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو مقیم ہو گا۔

لمافی الهندية(۱۴۲/۱): ويبطل الوطن الاصلى بالوطن الاصلى اذا انتقل عن الاول بأهله واما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث اهلا ببلدة اخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما۔

وفى الخانيه على هامش الهندية(۱۶۶/۱): الكوفى اذا نوى الاقامة بمكة ومنى خمسة عشر يوما لم يكن مقيما وان لم يكن بينهما مسيرة سفر لانه لم ينو الاقامة فى احدهما خمسة عشر يوما وان تأهل بهما كان كل واحد من الموضعين وطنا اصليا له۔

وفى الشامية(۱۳۱/۲): ولو كان له أهل ببلدتين فايتهما دخلها صار مقيما۔

(۳۳۶) کسی دوسرے شہر کو وطن بنالیا تو کیا اب وطن اصلی میں پندرہ دن سے کم قیام پر قصر کریگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے اور کراچی میں ملازمت کرتا ہوں، اب صورت حال یہ ہے کہ میں اہلیہ کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہوں اور کم از کم پچیس سال ملازمت کے ہیں جن میں یہیں رہنے کا ارادہ ہے اور اپنا ذاتی مکان بنانے کا ارادہ بھی ہے جس کیلئے پلاٹ خرید لیا ہے جبکہ اپنا اصلی گھر جو پنجاب میں ہے وہاں والدین اور بھائی رہتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے بسا اوقات میں پندرہ دن سے کم مدت کیلئے پنجاب جاتا ہوں تو آیا جب میں اپنے وطن اصلی

میں جاؤں گا تو میں نماز مکمل پڑھوں گا یا قصر ہوگی؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں آپ نے اگر یہاں (کراچی میں) مستقلاً رہنے کا ارادہ کرلیا ہے اور یہاں سے مستقلاً پنجاب واپس جانے کا ارادہ نہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی کراچی منتقل کر دیا ہے تو اس صورت میں کراچی آپ کا وطن اصلی ہوگیا ہے پنجاب آپ کا وطن اصلی نہیں رہا، اگرچہ والدین وغیرہ وہاں ہیں۔ اب پنجاب جانے کی صورت میں اگر آپ کی وہاں ٹھہرنے کی نیت پندرہ دن سے کم کی ہو، تو اس صورت میں آپ قصر کریں گے۔

وفی الشامیة (۱۳۱/۲): (قوله الوطن الأصلی) ویسمی بالأهلی ووطن الفطرة والقرار ح عن القهستانی (قوله أوتأهله) أی تزوجه قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافر ببلدولم ینوالأقامة به فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما، وهو الأوجه ولو كان له أهل ببلدتین فأیتهما دخلها صار مقیما، فأن ماتت زوجته فی إحداهما وبقی له فیها دور وعقار قیل لایبقی وطناله اذ المعتبر الأهل دون الدار كما لو تاهل ببلدة واستقرت سكناله ولیس له فیها دار... وقیل تبقی (قوله أو توطنه) أی عزم علی القرار فیه و عدم الارتحال وإن لم یتأهل. فلو كان له أبوان ببلد غیر مولده وهو بالغ ولم یتأهل به فلیس ذلك وطناله الااذا عزم علی القرار فیه وترك الوطن الذی كان له قبله۔

(۳۳۷) قریب بستیوں میں تشکیل کی صورت میں قصر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام تبلیغی جماعت والوں کی تشکیل مثلاً سندھ یا پنجاب کے کسی دیہات میں ایک مہینے کی ہوئی وہاں بستی قریب قریب ہوتی ہیں مثلاً دو یا تین کلومیٹر کے فاصلے پر۔ دیہاتوں میں ہوتا یوں ہے کہ جس کی زمین ہوتی ہے وہ وہاں گھر بنا کر رہنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی علاقے میں کئی بستیاں وجود میں آجاتی ہیں تو پوچھنا یہ ہے کہ یہ جماعت والے بستیوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں یا دیہات کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے؟ جیسے بالفرض جماعت والوں کی تشکیل ایک مہینے کی نوابشاہ کے دیہاتوں میں ہوئی وہ نوابشاہ کے بھی قریب ہیں یعنی شرعی فاصلہ نہیں ہے اور آپس میں بھی دو یا تین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہیں تو اس صورت میں جماعت والے نوابشاہ کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا دیہاتوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں گے؟ جیسے کراچی کے چار ضلع ہیں جماعت والوں کی تشکیل بیس دن کی ایک ضلع میں ہوئی اب یہ تشکیل کے دوران دوسرے ضلع میں جاتے ہیں تو اس صورت میں جماعت والے کراچی شہر کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا اس کے ضلع کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمائیں اللہ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......اقامت کی نیت کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں پندرہ یا اس سے

زیادہ دنوں کی اقامت کی نیت کریں اور اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ سفر کو منقطع کریں۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے پنجاب یا نواب شاہ ہوئی، اب اگرانہوں نے وہاں ایک ہی جگہ میں پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت کی اب اس کے بعد اگر وہ اڑتالیس میل کے اندر اندر دن کو جاتے ہیں اور رات کو واپس آتے ہیں یا کبھی کبھار رات بھی گزارتے ہیں تو اس صورت میں وہ پوری نماز پڑھیں گے قصر نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا اور اگر جماعت والے ایک جگہ پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت نہیں کرتے ہیں بلکہ دو تین دن ایک بستی میں رہتے ہیں، دو تین دن دوسری بستی میں تو اس صورت میں مسافر شمار ہوں گے اور قصر نماز پڑھیں گے۔ پورے شہر کا حکم ایک ہوتا ہے چاہے کتنا ہی بڑا ہو، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے کراچی شہر میں ہوجائے، تو وہ پورے کراچی شہر میں چاہے جس ضلع میں جائیں نماز پوری پڑھیں گے۔

وفی المحیط البرهانی(۴۰۲/۲): خراسانی قدم بغداد وعزم علی الإقامة بها خمسة عشر یوما. ومکی قدم الكوفة وعزم علی الإقامة بها خمسة عشر یوما، ثم خرج كل واحد منهما من وطنه یرید قصر ابن هبیره، لیتلقی صاحبه بالقصر. فإنهما یصلیان أربعا فی الطریق وبالقصر لأنهما كانا متوطنین أحدهما ببغداد، والآخر بالكوفة، ولم یقصدا مسیرة مدة السفر، لأن من بغداد إلی الكوفة مسیرة أربع لیال، والقصر هو المنتصف فكان كل واحد منهما قاصداً مسیرة لیلتین. وبهذا لایصیر مسافراً۔

وفی الشامیة(۱۲۶/۲): (قوله كما لو نوی مبیته بأحدهما) فإن دخل أولا الموضع الذی نوی المقام فیه نهارا لا یصیر مقیما، وان دخل أولا مانوی المبیت فیه یصیر مقیما ثم بالخروج إلی الموضع الآخر لایصیر مسافرا لأن موضع إقامة الرجل حیث یبیت به۔

(۳۳۸) رہائش کراچی میں ہو، اور سسرال سجاول میں، تو سسرال میں نمازوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں خود کراچی میں رہتا ہوں اور میرے سسرال والے سجاول میں رہتے ہیں اور میرا اکثر سجاول آنا جانا رہتا ہے۔تو کیا میں جب سجاول جاؤں تو وہاں نماز قصر کرسکتا ہوں جبکہ کراچی سے سجاول تک مسافت شرعی پائی جاتی ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں جب آپ کی رہائش بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں ہے اور پھر آپ سسرال سجاول پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت سے جاتے ہیں تو پھر آپ وہاں پوری نماز پڑھیں گے اور اگر آپ کی نیت

سسرال پندرہ دن سے کم رہنے کی ہے تو وہاں آپ قصر کریں گے۔

لمافی الهندية (۱۴۲/۱): وطن أصلي وهو مولد الرجل أو البلد الذى تأهل به... ويبطل الوطن الأصلي بالوطن الاصلي اذا انتقل عن الاول بأهله وأما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما۔

وفي الهندية (۱۳۹/۱): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر كذا فى الهداية۔

(۳۳۹) عورت کا شادی کے بعد وطن اصلی کون سا ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدین کراچی میں رہتے ہیں میں بھی ان ہی کے ساتھ رہتی تھی اب میرے والدین نے میری شادی کوئٹہ کے ایک لڑکے کے ساتھ کردی اب میری رہائش بھی کوئٹہ ہی میں ہے اب میرا وطن اصلی کون سا ہوگا؟ اور میرے لئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......انسان کی جہاں پیدائش ہو وہ یا وہ شہر جہاں گھر بنالیا ہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرلی ہو وطن اصلی کہلاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ وطن اصلی باطل ہوتا ہے وطن اصلی سے۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی سفر واقامت میں اپنے شوہر کے تابع ہوتی ہے جبکہ وہ مہر معجّل ادا کرچکا ہو، اور عدم ادائیگی کی صورت میں حق زوجیت ادا کرنے سے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کوئٹہ آپ کے حق میں وطن اصلی ہے اپنے شوہر کے ہمراہ مستقل رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے۔ اور اب کراچی آپ کے حق میں وطن اصلی نہیں رہا۔

لمافى كبيرى (ص۵۰۱): فالاصلى وهو مولد الانسان او موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الارتحال عنه اما لو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له وفى المبسوط هو الذى نشأفيه او توطن فيه اوتأهل فقوله او توطن فيه يتناول ماعزم القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتاهل فعلى هذا لو عزم من له ابوان فى بلد على القرار فيه وترك الوطن الذى كان قبله له يكون وطناله ولو تزوج المسافر ببلدة ولم ينو الاقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما وهوا لاوجه لما مر من حديث عثمان رضي الله عنه۔

لمافى الشامية(۱۳۱/۲): (قوله الوطن الاصلى) ويسمى بالأهلى ووطن الفطرة والقرارح عن القهستانى (قوله أو تأهله) اى تزوجه قال فى شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما، وهو الاوجه۔

وفی الهندية(۱۴۱/۱): وکل من کان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما باقامته ومسافرا بنيته وخروجه الی السفر۔

(۳۴۰)۳۰ میل سفر کی نیت کے بعد ۲۵ میل آ گے اور جانا پڑ جائے تو نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر تین روز کیلئے جانا ہوا۔ وہاں جا کر کچھ مزید کام آ گیا اور اس مقام سے تقریباً ۲۵ میل دور اور سفر کرنا پڑا اور یہاں قیام تیرہ دن کا تھا اس کے بعد اپنے گھر جو کہ یہاں سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے آنا تھا۔ اب میں اس دوسرے مقام پر نمازیں قصر کروں یا نہیں؟ براہ کرم جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......سفر شرعی کیلئے مسافت سفر کی نیت کرنا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ اس دوسرے مقام پر بھی نماز پوری پڑھیں گے اس لئے کہ وہاں سے نکلتے وقت آپ کی نیت مسافت سفر شرعی سے کم مقدار طے کرنے کی تھی تو آپ شرعاً مسافر نہیں ہوں گے اور آپ پر احکام سفر لاگو نہ ہوں گے البتہ وہاں سے گھر لوٹتے وقت آپ قصر کریں گے کیونکہ واپسی کے وقت میں مسافت سفر پوری ہے۔

لمافی فتح القدير(۲۸/۲): السفر الذی يتعلق به تغير هذه الاحكام واخذ فيه مع المقدار الذی ذکره القصد فافادانه لوطاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة ايام لا يترخص وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه فی طلب العدو ولم يعلم اين يدرکهم فانهم يصلون صلوة الاقامة فی الذهاب وان طالت المدة وکذا المکث فی ذلك الموضع اما فی الرجوع فان کانت مدة سفر قصروا...

وعلى اعتبار القصد تفرع فی صبی ونصرانی خرجا قاصدين مسيرة ثلاثه أيام ففی اثنائها بلغ الصبی وأسلم الكافر يقصر الذی اسلم فيما بقی ويتم الذی بلغ لعدم صحة القصد والنية من الصبی حين أنشأ السفر بخلاف النصرانی و الباقی بعدصحة النية أقل من ثلاثة أيام۔

وفی الشامية(۱۲۲/۲): (قوله قاصداً) اشاربه مع قوله خرج الی أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافراً... (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للاقامة بها فلما بلغها بدا له ان يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرّاً۔ قال فی البحر وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه فی طلب العدو ولم يعلم اين يدركهم فانه يتم وان طالت المدة أو المكث، امّا فی الرجوع فان كانت مدة سفر قصر۔

فصل فی الجمعۃ والعیدین

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے بیان میں)

(۳۴۱) جمعہ کی نماز کی نیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرا دوست پابندی سے نماز پڑھتے ہیں آپ سے ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ جمعہ کی نماز کی کیا نیت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جمعہ کی نماز کی نیت کیلئے آپ امام صاحب کے پیچھے ان الفاظ سے نیت کرلیا کریں ''دو رکعت جمعہ کی ان امام صاحب کی اقتداء میں ادا کرتا ہوں۔''

وفی الدر المختار (۱/۴۲۱،۴۲۰): وینوی المقتدی المتابعة لم یقل ایضاً لانه لونوی الاقتداء بالامام أو الشروع فی صلاۃ الامام ولم یعین الصلاۃ صح فی الاصح وان لم یعلم بها لجعله نفسه تبعاً لصلوۃ الامام۔

(۳۴۲) نماز جمعہ کا مستحب وقت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی نماز اول وقت میں پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے اس میں جمعہ کی نماز بہت تاخیر سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات نمازیوں کو پریشانی ہوتی ہے خاص کر سردیوں کے موسم میں لہٰذا اس مسئلے کا شرعی حل بتلائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... سردی اور گرمی میں مطلقاً نماز جمعہ اوّل وقت ہی میں پڑھنا مستحب ہے، اس لئے ائمہ مساجد اور کمیٹی والوں کو چاہیئے کہ وہ مستحب اوقات میں ہی نماز جمعہ کا وقت مقرر کریں، البتہ اگر کسی مصلحت کے تحت نماز جمعہ کا وقت تھوڑا بہت تاخیر سے رکھا جائے تو اس میں فقہاء نے گنجائش رکھی ہے۔ لیکن اتنی تاخیر میں نماز جمعہ کا وقت مقرر کرنا کہ اگلی نماز کا وقت قریب ہونے لگے یا امام کا ''مقررہ وقت سے بلاوجہ اتنی زیادہ تاخیر کرنا کہ جس سے مقتدیوں کو پریشانی ہو، یہ طریقہ خلاف سنت ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

لما فی البخاری(۱/۱۲۳): عن أنس بن مالك رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ كان يصلی الجمعة حين تميل الشمس۔

وفی الدر المختار(۱/۳۶۷،۳۶۶): (وتاخير ظهر الصيف) بحيث يمشی فی الظل (مطلقا)... (وجمعة كظهر اصلا واستحبابا) فی الزمانين لأنها خلفه

وقال ابن عابدين رحمه الله تحته: (قوله واستحبابا فی الزمانين) أی الشتاء والصيف ح ...... وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض إلی الحرج ولا كذلك الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط اھ۔

(۳۴۳) سعی الی الجمعہ کونسی اذان پر واجب ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن اذان کے وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے تو اذان سے کون سی اذان مراد ہے آیا خطبے کے وقت کی اذان مراد ہے یا اس سے پہلے والی اذان مراد ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ سے قبل دو اذانیں دی جاتی ہیں ان دونوں میں جو پہلی اذان ہے اس وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۴۹): ويجب السعی وترك البيع بالاذان الاول وقال الطحاوی يجب السعی ويكره البيع عند أذان المنبر وقال الحسن بن زياد المعتبر هو الأذان علی المنارة والأصح ان كل أذان يكون قبل الزوال فهو غير معتبر والمعتبر أوّل الاذان بعد الزوال سواء كان علی المنبر أو علی الزوراء۔

وفی الشامية (۲/۱۶۱): وحاصله أن السعی نفسه فرض والواجب كونه فی وقت الأذان الأول۔

(۳۴۴) عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدگاہ سے واپسی پر راستے میں تکبیر پڑھنا مسنون ہے کہ نہیں؟ کوئی پڑھے تو نفس جواز کی وجہ سے جائز ہے کہ نہیں یا بدعت کہلائے گی؟ زید کہتا ہے کہ متون وشروح میں صرف جاتے ہوئے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم ہے، اس کے علاوہ واپسی پر پڑھنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے، لہٰذا واپسی پر پڑھنا صحیح نہیں۔ جبکہ بکر کا کہنا ہے کہ مصنف میں ان من السنة التكبير يوم العيد، اور اعلاء السنن میں زينوا اعيادكم بالتكبير اور انه ذكر مشروع سے استدلال کر کے جواز کا قول کیا جا سکتا ہے، ان دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟ اگر مع حوالہ جات عربی کتب جواب

عنایت فرمادیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... عید الاضحیٰ میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے زور سے تکبیر کہنا سنت ہے یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچ جائے اور عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر زور سے کہنا مسنون نہیں البتہ آہستہ کہنا جائز ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا یہ کہنا صحیح ہے کہ متون اور شروحات میں صرف جاتے ہوئے تکبیر کہنے کا حکم دیا گیا ہے البتہ عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم جو دیا گیا ہے وہ جہراً ترک کا حکم دیا گیا ہے اگر کوئی آدمی عیدگاہ سے واپسی پر آہستہ آواز سے تکبیر کہے تو جائز ہے اس لئے کہ یہ ذکر ہے اور ذکر میں اخفاء کا حکم دیا گیا ہے اور بکر نے جو کہا ہے کہ عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر کہنا جائز ہے تو اس کی بات صحیح ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تکبیر آہستہ آواز سے کہی جائے۔لیکن اس نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے اس کا استدلال کمزور ہے اس لئے کہ مصنف میں جو حدیث ہے کہ ان من السنة ان یکبر یوم العید اس سے کسی نے استدلال نہیں کیا ہے اور دوسری حدیث جو اعلاء السنن میں مذکور ہے زینوا اعیادکم بالتکبیر۔اس سے مراد جہری تکبیر ہے جو عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ واپسی پر البتہ تکبیر کہنا فی نفسہ جائز ہے اس لئے کہ یہ تکبیرات ذکر ہیں اور ذکر کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یذکر اللہ تعالیٰ فی کل احیانہ لہٰذا ان تکبیرات کو اگر کوئی آدمی آہستہ آواز سے کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ زور سے کہنا مسنون نہیں۔

لما فی المصنف لابن ابی شیبة(۱۹۲/۲): حدثنا عبد اللہ بن ادریس عن یحیی بن عبداللہ بن ابی قتادة قال: أراہ عن محمد بن ابراھیم: ان ابا قتادة کان یکبر یوم العید ویذکر اللہ۔

وفی اعلاء السنن(۱۱۸/۸): ویکبر عقب الصلاة جھراً ولا یجھر فیما سوی ذالک ای لایسن والا فھو ذکر مشروع ھذا محصل مافی (الشامیة،۸۷۵/۱)

وفی کتاب التجنیس والمزید(۲۳۵/۲): واذا توجه الی المصلی یکبر فی عید الاضحی لانه علیه الصلاة والسلام کان یکبر فی الطریق ولا یکبر فی عید الفطر جھراً عند ابی حنیفة خلافا لھما وھو معروف۔ وفی الھامش قال المؤلف فی الھدایة فی العنوان السابق(۶۴/۱) ویتوجه الی المصلی ولا یکبر عند ابی حنیفة فی طریق المصلی وعندھما: یکبر اعتباراً بالاضحی وله أن الأصل فی الثناء الاخفاء والشرع وردبه فی الاضحی لانه یوم تکبیر ولا کذالک یوم الفطر وروی عن ابن عمر رضی اللہ عنھما انه کان اذا غدا الی المصلی کبر فرفع صوته بالتکبیر وفی روایة اخری: کان یغدو الی المصلی یوم الفطر اذا طلعت الشمس فیکبر حتی یأتی المصلی ثم یکبر بالمصلی حتی اذا جلس الامام ترک التکبیر قال مجدّ الدین: رواھما الشافعی۔ المنتقی: باب الخروج الی العید ماشیأ والتکبیر فیه وما جاء فی خروج النساء(ص۲۶۲) رقم الحدیث(۱۶۵۳،۱۶۵۲) ونیل الاوطار(ص۲۸۶،۲۸۵) یستفاد من الحدیثین و حادیث الباب علی ان التکبیر سنة حال المشی الی

المصلى وفى المصلى الى ان يقيم الصلوٰة، اشار الى هذا ابن قدامه۔

وفى الطحطاوى على الدر(۱/۳۵۵): ويكبر جهراً اتفاقاً فى الطريق قيل وفى المصلى وعليه عمل الناس اليوم لافى البيت۔

وفى الدرالمختار(۲/۱۸۰): ولا بأس به عقب العيد لأن المسلمين توارثوه وفى الهامش: ''قوله لا بأس .... كلمة لا بأس قد تستعمل فى المندوب كمافى البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم(قوله فوجب) الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح عليه وفى البحر عن المجتبى والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد لانها تؤدى بجماعة فاشبهت الجمعة اهـ وهو يفيد الوجوب المصطلح عليه ط۔

(۳۴۵) خطبہ عید میں خطیب کے ساتھ تکبیرات پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے خطبہ کے دوران خطیب صاحب تکبیر پڑھتے ہیں تو سننے والا بھی خطیب کیساتھ تکبیر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی پڑھتا ہے تو اسکے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......سامعین کا سماع خطبہ کے وجوب کی وجہ سے تکبیرات پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگر کوئی پڑھتا ہے تو گنہگار ہوگا۔

لمافى حاشية الطحطاوى على المراق (ص۵۳۵): قال عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ، هو السنة ويكبر القوم معه ويصلون على النبى صلی اللہ علیہ وسلم فى أنفسهم امتثالاً للامر وسنة الانصات۔

وقال الطحطاوى تحته:(قوله فى انفسهم)المراد انهم يسرون به كماتقدم والظاهر انه متعلق بالتكبير والصلاة لانه يجب الانصات لجميعها وقوله سنة الانصات الاولى ان يقول وواجب الانصات۔

(۳۴۶) عید کے خطبوں میں تکبیرات کتنی مرتبہ اور کب کہی جائیں گی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدین کے پہلے خطبے میں نو بار اور دوسرے میں سات بار تکبیریں ہیں یہ تکبیریں مسلسل کہی جائیں یا پورے خطبے میں متفرق طور پر بھی کہی جاسکتی ہیں؟ اولیٰ وافضل کیا ہے؟ نیز تکبیر سے مراد صرف اللہ اکبر ہے یا پوری تکبیر تشریق ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عیدین میں جو دوران خطبہ تکبیریں کہی جاتی ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں لیکن مناسب یہ ہے

کہ تکبیر خطبہ سے زیادہ نہ ہو، اور عید الاضحیٰ کے خطبہ میں عید الفطر کے خطبے کے بنسبت زیادہ تکبیریں ہوں البتہ مستحب وافضل یہ ہے کہ پہلے خطبہ کے شروع میں مسلسل نو مرتبہ اور دوسرے خطبہ کے شروع میں مسلسل سات مرتبہ تکبیریں کہی جائیں نیز تکبیر سے پوری تکبیر تشریق (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) مراد ہے۔

لما فی الدرالمختار (۱۷۵/۲): (ویبدأ بالتکبیر فی) خمس (خطبة العیدین) ... (ویستحب ان یستفتح الاولی بتسع تکبیرات تترى) ای متتابعات (والثانیة بسبع) ھو السنة الخ۔

وفی الشامیة (۱۷۵/۲): (قوله ویستحب الخ) ذکر ذلك فی المعراج عن مجمع النوازل وقال فی الخانیة انه لیس للتکبیر عدد فی ظاھر الروایة لکن ینبغی ان لا یکون اکثر الخطبة التکبیر ویکبر فی الاضحی اکثر من الفطر اھ قلت: واطلاق العدد فی ظاھر الروایة لاینافی تقییده بماورد فی السنة وقال به الشافعی رحمه الله تعالیٰ۔

وفی الام (۲۷۳/۱): التکبیر فی الخطبة فی العیدین... عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة قال السنة فی التکبیر یوم الاضحیٰ والفطر علی المنبر قبل الخطبة ان یبتدیء الامام قبل ان یخطب وھو قائم علی المنبر بتسع تکبیرات تترى لا یفصل بینها بکلام ثم یخطب ثم یجلس جلسة ثم یقوم فی الخطبة الثانیة فیتفتحها بسبع تکبیرات تترى لا یفصل بینها بکلام ثم یخطب الخ۔

وفی المغنی (۲۴۴/۲): فان صفة الخطبتین کصفة خطبتی الجمعة الا انه یستفتح الاولی بتسع تکبیرات متوالیات والثانیة بسبع متوالیات قال القاضی وان ادخل بینهما تهلیلا او ذکرا فحسن الخ۔

رسالة

نافلة النجیب

فی الخطبة الأردویة امام الخطیب

جمعہ کے اردو عربی ملے خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے اوراس خطبے کی شرعی حیثیت کابیان

جمعہ کے دو خطبوں سے پہلے خطیب صاحب کے عربی اردو ملا خطبہ کے دوران نفل نماز پڑھنے

کی ممانعت سے متعلق ایک دارالافتاء کی تحقیق اوراس پر استدراک

(۳۴۷) جمعہ کی اردو تقریر کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم

سوال[1]...... حضرت مفتی صاحب! ایک مسئلہ کی تحقیق کی درخواست ہے براہ کرم فقہاء احناف کی معتبر کتب سے اس کا مدلل جواب چاہیئے۔

مسئلہ یہ ہے کہ نماز جمعہ کیلئے جامع مسجد کی پہلی اذان کے بعد خطیب صاحب خطبہ اور نماز جمعہ پڑھانے کی ہی نیت سے آتے ہیں لوگ بھی خطبہ سننے کی غرض سے مسجد میں جمع ہوتے ہیں، خطیب صاحب منبر پر تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے عربی کلمات میں حمد وثنا شہادۃِ توحید ورسالت صلاۃ وسلام علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ودیگر تمام مسلمانوں کے لئے دعا اور موضوعِ خطاب سے متعلق قرآن کریم سے چند آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اس کے بعد انہیں آیات سے متعلق تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اردو میں خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ ہندو پاک میں عام معمول ہے، پھر عربی میں بھی دو مستقل خطبے اذانِ ثانی کے بعد دیتے ہیں پھر نماز پڑھاتے ہیں۔

[1] یہ فاضل مستفتی کا تفصیلی سوال ہے جو مسئلہ ھذا کی بابت انہوں نے بھیجا تھا اس کا تفصیلی جواب اگلے صفحات میں ملاحظہ ہو۔ از مرتب فرحان حسن

خطبہ کی شرائط سنن ومستحبات کا مختلف عربی فتاوی مثلاً شامیہ، البحر الرائق، طحطاوی علی مراقی الفلاح، بدائع الصنائع، خلاصۃ الفتاویٰ ہندیہ، محیط البرھانی، اوران کے علاوہ بھی کئی فتاویٰ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دوخطبوں سے پہلے یہ عربی اردو ملا خطبے کا بھی وہی حکم ہے جوعربی خطبہ کا ہے اس پر بھی خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، چنانچہ کوئی شخص صرف اسی پر اکتفاء کرلے تو شرط کے درجہ میں نماز جمعہ کی صحت کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ، ص:۳۴۹)

اگر چہ ترک سنت کی وجہ سے مکروہ ہوگا اوراس کی اجازت نہیں ہے لیکن کم ازکم شرط کے درجہ میں خطبہ کا مقام اس کو بھی حاصل ہے لہٰذا اس دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے اوراس کی اجازت دینے میں شرائط وارکان کے وجود پر مشتمل عمل کے وجود کو تسلیم نہ کرنا لازم آتا ہے جو کہ فقہاء کرام کی تعریفات وتشریحات کے انکار کو مستلزم ہے۔

اس لئے کہ فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے، ان کی تعریفات جامع اور مانع ہوتی ہیں چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی مسئلہ کے متعلق علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں ''والالزم الحکم ببطلان الاولی بترک ما لیس برکن ولا شرط کما مر عن الفتح۔ (شامی، ص ۶۵ ج ۲)''

ذیل میں فقہی عبارات سے حوالے ملاحظہ ہوں استشہاد صحیح ہو تو براہ کرم تائید فرمائیں اور اگر ہم نے صحیح نہ سمجھا ہو تو اصلاح فرمائیں نوازش ہوگی۔

خطبہ کی تعریف وحقیقت واضح کرتے ہوئے ''مراقی الفلاح'' اوراس کی شرح ''حاشیۃ الطحطاوی'' میں لکھتے ہیں:

(والرابع الخطبۃ ولو بالفارسیۃ من قادر علی العربیۃ ویشترط لصحۃ الخطبۃ فعلھا قبلھا... وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (والرابع الخطبہ فعلۃ بمعنی مفعولۃ فھی اسم لما یخطب بہ غایۃ من الخطب وھو فی الاصل کلام بین اثنین قھستانی عن الازاھر وھی بالضم فی الموعظۃ الجمع خطب وبالکسر طلب التزوج (ص ۵۰۹، قدیمی کتب خانہ)

کذا فی جامع الرموز للقھستانی (ص ۲۶۴ ج ۱) وکذا فی قواعد الفقہ (ص ۲۷۶)

وفی المحیط البرھانی: ولان ما یشبہ الامر بالمعروف خطبۃ من حیث المعنی وان لم یکن خطبۃ من حیث النظم لان الخطبۃ فی الحقیقۃ وعظ وامر بالمعروف (المحیط البرھانی، ص ۴۵۹، ج ۲)

خطبہ کی شرائط نہایت جامع انداز میں ''مراقی الفلاح'' اوراس کی شرح حاشیۃ الطحطاوی میں بیان فرماتے ہیں:

فھذہ خمس شروط اوست لصحۃ الخطبۃ فلیتنبہ، قال الطحطاوی (۱) الاول ان تکون قبل الصلاۃ (۲) والثانی ان تکون بقصد الخطبۃ (۳) الثالث ان تکون فی الوقت (۴) والرابع ان یحضرھا واحد

(۵) الخامس ان یکون ذالک الواحد ممن تنعقد بھم الجمعة (٦) السادس عدم الفصل بین الخطبة و الصلاة بقاطع۔ (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰)

حضرت اقدس مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان و فرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں۔ جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ، ص:۳۴۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ''فرض صرف دو ہیں (۱) وقت جمعہ (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو پھر امام صاحب کے مذہب پر طویل ہو یا مختصر اور صاحبین کے مذہب پر ذکر طویل جس کو عرفاً خطبہ کہا جا سکے شرط ہے۔ کذا فی الھدایہ والفتح والبحر'' (جواہر الفقہ ص:۳۵۰)

اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ''اسی کے ساتھ ایک سولہویں سنت اور ہے.......... کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیر عربی میں نہ ہو۔ (جواہر الفقہ ص ۳۵۰)

اردو کے مذکورہ بیان پر فقہاء کرام کی وضاحت کے مطابق پوری طرح خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے کہ یہ ذکر تو ہے ہی جو کہ خطبہ کے لئے رکن ہے، اس کے علاوہ خطبہ کی تمام شرائط پر بھی مشتمل ہے اور یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں ہے ہاں سنت موکدہ ہے تو وجوب استماع کے لئے معلوم نہیں کونسی چیز مانع ہے؟ جبکہ احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب مبیح اور محرم دونوں دلائل متوجہ ہوں تو محرم کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور خطبہ کی سنن کو تفصیلا شمار فرمایا:

(وسنن الخطبة ثمانية عشر شينا بل يزاد عليها... منها الطهارة... والجلوس على المنبر قبل الشروع فى الخطبة والاذان بين يديه كالاقامة ثم قيامه والسيف بيساره وبدونه فى بلدة فتحت صلحا واستقبال القوم بوجهه وبداء ته بحمد الله والثناء عليه بما هو اهله والشهادتان وصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم والعظة والتذكير وقراء ة آية من القرآن والجلوس بين الخطبتين الخ

(مراقی الفلاح، ص ۵۱۴، ج ۱) و کذافی جامع الرموز للقهستانی (ص ۲۶۹، ج ۱)

و کذا الفقه الاسلامی وادلته (ص ۱۳۱۱، ج ۲) کذافی خلاصة الفتاویٰ (ص ۲۰۵، ج ۱)

خطبہ کا بڑا مقصد یعنی وعظ وتعلیم تو اس خطاب سے حاصل ہو رہا ہے۔ کمافی الدر (۳/۱۷۵): لان الخطبة شرعت للتعلیم۔

اور رکن وشرائط کے علاوہ کئی سنتوں پر بھی مشتمل ہے، لیکن تمام تر سنتوں کا امتثال چونکہ عربی خطبہ میں ہی ہوتا ہے اور اس کی اپنی اہمیت ہے جیسا کہ حضرت مفتی اعظم پاکستان نے اپنے رسالہ میں واضح فرما دیا ہے، اس لئے عربی خطبے مستقل دیئے جاتے ہیں تاہم شرط کے درجہ

میں اس سے خطبہ کی ضرورت بلاشبہ پوری ہوتی ہے، تو اس دوران نماز وتلاوت وغیرہ کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟ چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔

قال والطهارة سنة عندنا لاشرط حتى ان الامام اذا خطب جنبا او محدثا فانه يعتبر شرطا لجواز الجمعة۔

قال المحشی تحت هذا القول: قوله (فانه يعتبر شرطا) ای مافعله الامام من الخطبة جنبا او محدثا يعتبر ويعتدبه من حيث كونه شرطا لصحة الجمعة بمعنى انه يجزی ويكفی وان كان مرتكبا لمحرم لو كان بلاعذر۔ (شامی، ص ۱۵۰، ج ۲)

ان تمام دلائل سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ خطاب بھی خطبہ کے حکم میں ہے اور اس دوران استماع کے خلاف کوئی بھی عمل جائز نہیں اگرچہ عربی خطبہ کی طرح تمام صفات پر مشتمل نہ ہونے کی وجہ سے بدرجہ اتم نہیں ہے لیکن خطبہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کسی عمل کو فقہاء کرام کی تعریفات اور توضیحات پر ہی پرکھا جائے گا۔

عربی اور اس خطبہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اس کے شروع کا حصہ تو عربی ہے لیکن بعد کا حصہ زیادہ اردو پر مشتمل ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ عربی خطبوں کے لیے اذانِ ثانی دی جاتی ہے، تیسرا یہ کہ یہ خطبہ عموماً خطیب بیٹھ کر دیتا ہے اور عربی خطبے کھڑے ہوکر، چوتھا یہ کہ عربی خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خطیب بیٹھ کر دونوں خطبوں کے درمیان فصل دیتا ہے لیکن یہ تمام صفات ایسی نہیں ہیں کہ جن کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ خطبہ ہی نہ رہے، بلاشبہ شرط کے درجہ میں یہ بھی خطبہ ہے اگرچہ ناقص ہے اور عربی کے دونوں خطبے بدرجہ اتم واکمل ہیں اور اس کے لئے شواہد اور نظائر بھی ہیں طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ذکر کردیتے، اور اذان ثانی کو قاطع بھی نہیں قرار دے سکتے۔

چنانچہ عمل قاطع کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(وعمل قاطع) كما اذا جامع ثم اغتسل واما اذا لم يكن قاطعا كما اذا تذكر فائتة وهو فی الجمعة فاشتغل بالقضاء او افسد الجمعة فاحتاج الى اعادتها او افتتح التطوع بعد الخطبة لاتبطل الخطبة بذالك لانه ليس بعمل قاطع لكن الاولى اعادتها كمافی البحر۔ (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰ م قديمی) كذافی خلاصة الفتاوی (ص ۲۰۵، ج ۱)

بالفرض فقہاء کرام کی عبارات میں کوئی جزئیہ ملے جس سے یہ واضح ہو کہ اس کو خطبہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا حالانکہ کافی تلاش کے باوجود ہماری نظروں سے اب تک ایسا کوئی جزئیہ نہیں گزرا لیکن اصل موقف ”کہ اس خطاب کے دوران حاضرین کے لئے نوافل پڑھنا منع ہے“ کے ثبوت کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

”عن ابن عمر رضی الله عنهما قال سمعت النبی صلى الله عليه وسلم اذا دخل احدكم المسجد

والامام علی المنبر فلا صلاة ولا کلام حتی یفرغ الامام۔ رواہ الطبرانی بحوالہ اعلاء السنن

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ خروج الامام یوم الجمعة یقطع الصلاة وکلامہ یقطع الکلام (رواہ البیھقی بحوالہ اعلاء السنن، ج ۲/ص ۷۱) بھی کافی ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کے نکلنے کے ساتھ ہی نماز، ذکر تلاوت وغیرہ کو منع فرماتے ہیں اگر چہ منبر تک پہنچے نہیں ہیں اور خطبہ شروع نہیں کیا۔

کمافی مراقی الفلاح (واذا خرج الامام فلا صلاة ولا کلام) وھو قول الامام رحمہ اللہ تعالیٰ لانہ نص النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۵۱۸)

اور صاحبین بھی نماز کو امام صاحب کے نکلنے کے ساتھ ہی منع فرماتے ہیں البتہ ذکر و تلاوت منبر پر تشریف لانے کے بعد منع فرماتے ہیں۔

وقال ابو یوسف ومحمد رحمھما اللہ تعالیٰ لا باس بالکلام اذا خرج قبل ان یخطب واذا نزل قبل ان یکبر۔ واختلفا فی جلوسہ اذا سکت فعند ابی یوسف یباح وعند محمد لا یباح" مراقی الفلاح (ص ۵۱۸)

نماز کی ممانعت میں فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

فی الدر المختار: اذا خرج الامام) من الحجرۃ ان کان والا فقیامہ للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا کلام الی تمامھا) وان کان فیھا ذکر الظلمة فی الاصح

قال الشامی: واخرج ابن ابی شیبہ فی مصنفہ عن علی وابن عباس ﷺ وابن عمر رضی اللہ عنھم کانوا یکرھون الصلاة والکلام بعد خروج الامام والحاصل ان قول الصحابی حجة یجب تقلیدہ عندنا اذا لم ینفہ شئ آخر من السنة۔ (درمختار، ج ۲/ص ۱۵۸)

قال الطحطاوی اذا خرج من حجرتہ ان کانت والا فقیامہ للصعود قاطع کمافی شرح المجمع فیثبت المنع بمجرد ظھورہ ولو قبل صعودہ المنبر وقیل اذا صعد وعلیہ جری الکمال والزیلعی والعینی وقال بعد اسطر اختلف المشائخ علی قول الامام فی الکلام قبل الخطبة ... (مراقی ص ۵۱۹)

اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خطبہ ہی کی غرض سے حجرہ سے نکل آئے ہیں اور اب منبر پر بھی تشریف فرما ہیں لہٰذا تمام دلائل اس تائید میں ہیں کہ دوران اردو خطبہ نماز ذکر و تلاوت وغیرہ کو اب موخر کریں اور خطبہ کی طرف متوجہ ہوں نوافل اور تلاوت کے لئے پھر بھی موقع مل سکتا ہے اور یہ موقع خطبہ کے لیے ہے۔ نیز تمام فتاویٰ میں یہ حکم واضح فرما دیا ہے کہ وجوب استماع کا یہ حکم جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام خطبے سننا واجب ہے۔

(۱) چنانچہ مفتی اعظمؒ نے بھی جواہر الفقہ میں واضح فرمادیا ہے۔

خطبہ جمعہ وعیدین ونکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام وسلام یہاں تک کہ ذکر وتسبیح وغیرہ سب ناجائز ہوجاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سننا ضروری ہوجاتا ہے۔ (جواہر الفقہ، ص ۳۶۵)

وفی مراقی الفلاح: کذا استماع سائر الخطب کخطبة النکاح والختم (مراقی الفلاح ص ۵۱۹)

وفی قواعد الفقه: والخطب کثیرة کخطبة الجمعة والعیدین والاستسقاء والکسوف والنکاح وختم القرآن وغیر ذالک ویجب فی الجمیع الاستماع کذا فی الدرر۔ (ص ۲۷۸) کذا فی ردالمحتار (ص ۱۵۹، ج ۲)

(۲) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا فتویٰ ہے کہ ہر وعظ کے دوران انصات ضروری ہے۔

وفی التفسیر المظهری: قال عمر بن عبدالعزیز الانصات لقول کل واعظ (مظهری، ص ۴۵۰، ج ۳)

(۳) امام بخاریؒ اور اسی طرح دیگر محدثین نے اس موضوع پر مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اصغاء الجلیس لحدیث جلیسه الذی لیس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضری مجلسه (دلیل الفالحین، ۳/۱۴۷)

(۴) علماء کرام کے بیان کے لئے انصات کا حکم ہے۔ ”لما فی البخاری: باب الانصات للعلماء (بخاری، ۱/۲۳)“

علامہ بدرالدین عینیؒ عمدۃ القاری میں علماء کے بیان کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم دے رہے ہیں۔

هذا باب فی بیان الانصات لاجل العلماء واللام فیه للتعلیل والانصات بکسر الهمزة السکوت والاستماع للحدیث یقال نصت نصتا وانصت انصاتا اذا سکت واستمع للحدیث وجه المناسبة بین البابین من حیث ان العلم انما یحفظ من العلماء ولا بدفیه من الانصات لکلام العالم حتی لا یشذ عنه شیٔ

وفیه ایضا: بیان استنباط الاحکام۔ الاول قال ابن بطال علیه السلام فیه ان الانصات للعلماء والتوقیر لهم لازم للمتعلمین قال الله تعالیٰ لا ترفعوا اصواتکم الخ۔

ویجب الانصات عند قراة حدیث رسول الله (صلی الله علیه وسلم) مثل ما یجب له وکذالک یجب الانصات للعلماء لانهم الذین یحیون سنته ویقیمون بشریعته... الخ

(عمدة القاری، ۳/۳۷۰)

(۵) کسی بھی بیان کرنے والے کے سامنے نماز پڑھنا اس کے لئے تشویش کا باعث ہے بلکہ قریب میں سننے والے بھی متاثر ہوتے ہیں ایسی صورت میں ایذاء مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۶) ایک اصلاحی اجتماعی عمل سے بلاضرورت اعراض بلکہ ظاہری مخالفت ہے۔ اور اجتماعیت کی اہمیت شاید کسی عالم پر مخفی ہو۔

چند شبہات اور ان کے جوابات:۔

شبہ(۱):۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز منبر کے ساتھ کھڑے ہو کر احادیث بیان فرماتے تھے۔

لمافی المستدرک علی الصحیحین عن محمد عن ابیہ قال رأیت اباھریرۃ رضی اللہ عنہ یخرج یوم الجمعۃ فیقبض علی رمانتی المنبر قائما ویقول حدثنا ابو القاسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصادق المصدوق فلایزال یحدث حتی اذا سمع فتح باب المقصورۃ لخروج الامام لصلاۃ جلس (ص ۵۸۶، ج ۳)

وفیہ ایضا: عن ابی الزاھریۃ قال کنت جالسا مع عبداللہ بن بسر یوم الجمعۃ فمازال یحدثنا حتی خرج الامام (ص ۴۲۵، ج ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خطبہ سے پہلے احادیث بیان کرنا کوئی خطبہ نہیں ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ خطیب کے نکلنے سے پہلے تک احادیث بیان فرماتے تھے البتہ خطیب کے نکلنے کے ساتھ ہی درس ختم کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔

جواب:۔ مذکورہ دونوں حوالوں میں اس موقف کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اس سے مزید تائید مل رہی ہے چنانچہ صراحت ہے کہ خطیب کے نکلتے ہی درس کو ختم فرمادیتے تھے، اس میں اصل موقف کے خلاف کونسی بات ہے کہ اس دوران نماز پڑھنا جائز ہے یا یہ کہ دو خطبوں سے پہلے خود خطیب صاحب اگر وعظ کریں تو وہ خطبہ نہیں کہلائے گا؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام صاحب سے پہلے بھی کوئی دوسرا شخص درس یا وعظ کرے تو یہ جائز ہے۔

شبہ(۲):۔ عربی خطبہ کے لئے اذان دی جاتی ہے اور یہ عربی اردو ملا خطبہ اذان اوّل کے بعد شروع ہوتا ہے اگر اس کو خطبہ کا حکم دیں تو خطبوں کے درمیان اذان دینا لازم آتا ہے۔

جواب:۔ اذان ثانی کوئی شرط نہیں ہے جس کے انتفاء سے حکم بھی منتفی ہو اور خطبہ کے بعد یا درمیان میں دینے سے یہ کوئی عمل قاطع بھی نہیں ہے جیسا کہ حوالوں سے واضح ہے۔

شبہ(۳):۔ اس طرح تو تین خطبے ہو جائیں گے؟

جواب:۔ دو خطبے سنت ہیں ایک سے بھی شرط کے درجہ میں ضرورت پوری ہو جاتی ہے لیکن دو سے زیادہ خطبے دینے سے یہ تو

لازم نہیں آ تا کہ خطبہ قرار نہ دیں۔اور معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ علماء کرام صرف دو خطبوں پر ہی اکتفاء کرتے اگر پاک وہند کے عوام کی ضرورت سامنے نہ ہوتی تو یہ ضرورت کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔

شبہ(۴):۔درمختار میں ہے''فی المسجد عظۃ وقرآن فاستماع العظۃ اولی۔ص ۶۶۳،ج ۱''

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظ کا سننا اولی ہے،جس کے خلاف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جواب شبہ:۔حوالہ میں استماع قرآن کو بمقابلہ وعظ غیر اولیٰ قرار دیا ہے اور استماع وعظ کو اولیٰ قرار دیا ہے جبکہ استماع قرآن خارج نماز بھی مطلقاً واجب ہے۔

فی الدر (فروع) یجب الاستماع للقراءۃ مطلقا لان العبرۃ لعموم اللفظ۔

وفی الشامیۃ قولہ یجب الاستماع للقراءۃ مطلقا ای فی الصلاۃ وخارجھا لان الآیۃ وان کانت واردۃ فی الصلاۃ علی مامر فالعبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب وفی الفتح عن الخلاصۃ رجل یکتب الفقہ وبجنبہ رجل یقرء القرآن فلایمکنہ استماع القرآن فالاثم علی القاری (ص ۵۴۶،ج ۱)

وکذافی الطحطاوی علی الدر (ص ۲۳۷،ج ۱)

وفی روح المعانی: وفی کلام اصحابنا یدل علی وجوب الاستماع فی الجھر بالقرأن مطلقا الخ (ص ۲۰۳،ج ۹)

تو اولیٰ یعنی وعظ کا استماع حاضرین مجلس پر بطریقہ اولیٰ واجب ہے۔آسانی کے لئے ہم شکل اوّل جو کہ بدیہی النتیجہ ہے کو ترتیب دیتے ہیں۔

شکل اوّل:۔استماع الوعظ اولی من استماع التلاوۃ۔واستماع التلاوۃ واجب فاستماع الوعظ واجب۔

(۱) مقدمہ اولیٰ مسلمہ (جیسا کہ شبہ میں پیش کردہ حوالہ سے واضح ہے)

(۲) مقدمہ ثانیہ: شامی اور روح المعانی وغیرہ کے حوالہ سے واضح ہے۔

وجہ استدلال یا تلازم: مقدمہ مسلمہ عندالمعقولین: ماثبت لادنی فھو ثابت لاعلی طبعا بالضرورۃ۔

بدقسمتی سے عام لوگ اپنی مذہبی زبان''عربی'' کچھ نہیں جانتے اور خطبہ جس کا بڑا مقصد وعظ ونصیحت اور تعلیم ہے اگر صرف عربی خطبہ ہی رہے تو لوگ اس فائدہ سے محروم رہتے ہیں اسی ضرورت کے تحت تو یہ اردو بیان رائج ہوا ہے ورنہ عربی جیسے جامع خطبوں سے پورا استفادہ کرنے کی صورت میں اردو خطبوں کی کیا ضرورت تھی؟ تو عربی خطبے بدرجہ اتم خطبے ہیں اور اردو خطبہ کو بھی خطبہ کا مقام حاصل ہے ورنہ فقہاء کرام کی تصریحات وتشریحات سے انکار لازم آتا ہے۔

خلاصہ کلام

خطبہ جمعہ سے پہلے اردو وعظ کے دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے، بلکہ کوئی بھی مجلس وعظ ہو تو اس مجلس میں ہوتے ہوئے استماع کے خلاف کوئی عمل کرنا جائز نہیں ہے، ضرورت ہو تو اس مجلس سے نکلنا ضروری ہے۔

(۱) جمعہ کا یہ وعظ خطبہ کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ خطبہ کے تمام فرائض اور بعض سنتوں پر بھی مشتمل ہے۔

(۲) چونکہ امام صاحب منبر پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور خطبہ و نماز ہی کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں تو نفلی نماز و تلاوت وغیرہ کی اجازت دینے میں حدیث باب کے ظاہر کی مخالفت ہے۔

(۳) ہر خطبہ کے دوران نفل کا پڑھنا منع ہے جمعہ کے لئے یہ وعظ بھی ایک خطبہ ہی ہے۔

(۴) اس وعظ کا شروع حصہ عربی میں مسنون کلمات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

(۵) خطبہ جمعہ کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم معلول بالعلۃ ہے یہ علت ہر وعظ میں پائی جاتی ہے۔

(۶) درمختار میں ہے ''فی المسجد عظۃ و قرآن فاستماع العظۃ اولیٰ۔ (ص ۶۶۳، ج ۱)'' مفتی بہ قول کے مطابق وجوب استماع قرآن کا حکم مطلقاً واجب ہے، یعنی نماز کے علاوہ بھی واجب ہے خصوصاً کوئی قاری پہلے سے پڑھ رہا ہے تو اس کے پاس جا کر خلاف استماع کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے ملاحظہ ہو (حوالہ مذکورہ) تو وعظ جو کہ اولیٰ ہے اس مجلس میں شریک افراد کے لئے خلاف استماع عمل کرنا بطریقہ اولیٰ ناجائز ہے۔

(۷) شرح بخاری عمدۃ القاری میں ایک حدیث سے استنباط فرماتے ہوئے فیصلہ فرمادیا ہے کہ ہر عالم کی مجلس میں انصات کا حکم ہے۔

(۸) ریاض الصالحین میں ہے ''باب اصغاء الجلیس لحدیث جلیسه الذی لیس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضری مجلسه (دلیل الفالحین، ص ۱۴۷، ج ۳)''

تو ایک عام آدمی کی ایک عام بات کی طرف توجہ کرنے کا حکم ہے بالفرض اگر استحباب کے درجہ میں ہے تو دین کی بات (خصوصاً جب اجتماعی ہو) کو عام دنیوی بات پر بلاشبہ فوقیت عظمت اور اہمیت حاصل ہے تو اس کیلئے حکم بھی استحباب سے بڑھ کر ہی ہوگا جس کے خلاف کرنے میں کم از کم کراہت ضروری ہوگی۔

(۹) مجلس میں ہوتے ہوئے خلاف استماع کام کرنے میں واعظ کو اور دیگر مجلس والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس لئے اذیت مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۱۰) اجتماعی بات سے اعراض بلکہ مخالفت ظاہر ہے اور اجتماعیت کے خلاف کرنا ''من شذ شذ'' کے مصداق بننے کا اندیشہ ہے۔

تلک عشرۃ کاملۃ

علماء کرام سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحقیق سے فیض یاب فرمائیں۔

مذکورہ استفتاء پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا جواب

الجواب بعون الملک الوھاب......مکرمی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی......صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دوسرا تفصیلی مراسلہ نظرنواز ہوا مراسلہ کے بابت ہم نے اپنے مؤقف کی وضاحت اجمالاً کردی تھی اب قدرے تفصیل سے خدمت عالیہ میں عرض کرتے ہیں۔ ابتداء میں چندگزارشات بطور تمہید زیب قرطاس ہیں۔

تمہید(۱):......صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے۔

لمافی مراقی الفلاح (صـ ۵۱۰): والثانی ان تکون بقصد الخطبۃ۔

وفی البنایۃ (۲/۸۰۶): ثم اشترط عند ابی حنیفۃ ان یکون قولہ الحمدللہ علی قصد الخطبۃ حتی لو قال یرید الحمدللہ علی اعطاء لاینوب عن الخطبۃ وقیل ینوب، والاوّل اصح۔

وفی فتاویٰ الھندیۃ (۱/۱۴۶): ومنھا الخطبۃ... وکفت تحمیدۃ او تھلیلۃ ھذا اذا کان علی قصد الخطبۃ۔

وفی فتاویٰ الشامیۃ (۲/۱۴۸): (بنیتھا) ای نیۃ الخطب۔

تمہید(۲):......عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینے سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ ادا ہی نہیں ہوتا امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ جواز کے قائل ہیں لیکن بعض حضرات نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف اس مسئلہ میں رجوع ثابت کیا ہے اگر رجوع ثابت نہ بھی ہو تب بھی عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے۔

لمافی عمدۃ الرعایۃ (صـ ۲۰۰): فانہ لا شک فی ان الخطبۃ بغیر العربیۃ خلاف السنۃ المتوارثۃ من النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم والصحابۃ فیکون مکروھا تحریماً۔

وفی البنایۃ (۱/۱۹۵): ویروی رجوعہ فی اصل المسئلۃ (یعنی القراءۃ الفارسیۃ) إلی قولھما وعلیہ الاعتماد لتنزلہ منزلۃ الاجماع......والخطبۃ یوم الجمعۃ والتشھد علی ھذا الاختلاف۔

وفی جواھر الفقہ (۱/۳۵۵): وعلی ھذا الخلاف الخطبۃ وجمیع الاذکار

یعنی خطبہ اور تمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز، (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے۔)

تمہید(۳):......خروج امام مانع صلوۃ وکلام اس وقت ہے کہ جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو۔

لمافی العنایۃ بھامش فتح القدیر (۲/۶۷): واذا خرج الامام یوم الجمعۃ یعنی لأجل الخطبۃ۔

وفی البحر الرائق (٢/ ٢٧١): وفی شرح المجمع عبارة الخروج واردة علی عادة العرب من انهم یتخذون لامام مکانا خالیاً تعظیماً لشانه فیخرج منه حین اراد الصعود هکذا شاهدناه فی دیارهم والقاطع فی دیارنا یکون قیام الامام للصعود فالحاصل ان الامام ان کان فی خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والافقیامه للصعود۔

وفی البنایة (١/ ٨٥٣): ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لأجل الخطبة۔

وفی النهر الفائق (١/ ٣٦٣): و(اذا خرج الامام) ای صعد علی المنبر کذا فی معراج...... والقاطع فی دیارنا هو قیام الامام للصعود۔

مذکورہ بالا تمہیدات کی روشنی میں اردو ملے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے کیونکہ صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے جیسا کہ تمہید (١) کے حوالوں سے واضح ہے جبکہ وعظ و نصیحت سے قبل تحمید و تسبیح بنیت خطبہ نہیں ہوتی بلکہ اتباع حدیث کل امر ذی بال الخ اور تعامل و توارث کی بناء پر پڑھی جاتی ہے۔ نیز سابقہ تحریر کے شبہ اوّل کے جواب میں درج عبارت ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ جمعہ کی نیت سے یہ خطبہ نہیں دیتے تھے جو کہ خطبہ کیلئے شرط ہے'' بھی صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت پر دال ہے۔ نیز اشتراط نیت للخطبہ میں خطیب اور غیر خطیب کا حکم یکساں ہے۔ دونوں میں اس بابت فرق کرنا محتاج دلیل ہے۔ جس پر ہم مطلع نہ ہوئے۔

نیز خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار اس وقت ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ منبر و محراب کی آغوش میں امام کی عظمت الشان و مرتبت کیلئے واقع مقصورۃ (حجرہ) سے ہو جیسا کہ عرب میں دستور تھا۔

لمافی سیر اعلام النبلاء (٤/ ٢٠٠): عاصم بن محمد عن ابیه: رأیت اباهریرة یخرج یوم الجمعة، فیقبض علی رُمّانتی المنبر قائماً، ویقول: حدثنا ابو القاسم ﷺ الصادق المصدوق: فلا یزال یحدث حتی یسمع فتح باب المقصورة لخروج الإمامة فیجلس۔

جبکہ ہمارے دیار میں خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار اس وقت ہوگا جب امام صاحب خطبہ کیلئے منبر پر جلوہ افروز ہو جائے۔ کیونکہ ہماری مساجد میں مقصورہ ندارد۔

لمافی البحر الرائق (٢/ ١٥٥): وفی شرح المجمع عبارة الخروج واردةٌ علی عادة العرب من انهم یتخذون لإمام مکاناً خالیاً تعظیماً لشانه فیخرج منه حین اراد الصعود هکذا شاهدناه فی دیارهم والقاطع فی دیارنا یکون قیام الإمام للصعود فالحاصل ان الامام ان کان فی خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والافقیامه للصعود۔

وفیه ایضاً (٢/ ٢٧٠): فان لم یکن فی المسجد مقصورة یخرج منها لم یترکوا القراءة والذکر الا اذاقام الامام إلی الخطبة۔

وفی البنایة علی شرح الهدایة (۸۵۳/۱): ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لإجل الخطبة۔

وفی النهر الفائق (۳۶۳/۱): واذا خرج الامام: ای صعد علی المنبر...... والقاطع فی دیارنا هو قیام الامام للصعود۔

بالفرض اگر کہیں خروج امام مقصورہ (حجرہ) سے ہو تب بھی زیر بحث مسئلہ میں یہ خروج مانع صلوٰۃ واذکار نہیں ہوگا کیونکہ خروج امام من المقصورۃ پر ''فلا صلوٰۃ ولا کلام'' کا حکم اس وقت لاگو ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو کمافی البنایة (۱/۸۵۳) جبکہ زیر نظر مسئلہ میں خروج للوعظ ہوتا ہے۔

ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لاجل الخطبة۔

نیز اس خروج کو تشریک نیت پر محمول کرنا بایں معنی کہ یہ خروج للوعظ والخطبة دونوں ہو درست نہیں کیونکہ قصد اوّل کا اعتبار ہوتا ہے جبکہ خطیب صاحب کا قصد اوّل بالخروج وعظ کرنا ہوتا ہے۔

کتاب الفتاویٰ (۳/۷۴): یوں تو منبر پر اردو میں بیان وتقریر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے.....تاہم جمعہ میں چونکہ منبر پر کھڑے ہو کر اردو بیان میں اس کے خطبہ ہونے کا وہم ہوسکتا ہے حالانکہ خطیب کا مقصد اس سے خطبہ دینا نہیں ہے۔ انتھی

نیز اگر مطلقاً خروج مانع گفت وشنید اذکار وصلوٰۃ ہو تو سوال ہوگا کہ اردو تقریر کے بعد عربی خطبہ سے قبل چار رکعت سنتیں پڑھنا جبکہ امام تشریف لا چکا ہو جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ اکابرین واسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے عمل سے متصادم ہے اگر جواب اثبات میں ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر جبکہ امام مصلّی پر براجمان ہے۔

معلوم ہوا مطلقاً خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار نہیں۔

یہ مسئلہ چونکہ اچھنبا اور نیا نہیں بلکہ ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ میں بھی پیش آیا تھا الحمدللہ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی نوک قلم سے نکلی ہوئی تحقیقات وتدقیقات بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں۔ ذیل میں چند ایک ملاحظہ ہو۔

اردو ملے خطبہ کے وعظ ہونے پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا تفصیلی اور تحقیقی فتویٰ۔

سوال:......ایک مسجد کا خطیب بعد اذان اوّل جبکہ کچھ لوگ جمع ہوجاتے ہیں مسجد سے ملے ہوئے مکان سے مسجد میں آتا ہے سلام کرکے لکڑی کے منبر کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ ووعظ یعنی ''الحمدللہ ونحمدہ الخ'' کے بعد کوئی ایک یا چند آیات تلاوت کرکے اردو میں وعظ کرتا ہے یوں پون گھنٹہ یا کم وبیش وعظ کے بعد چار سنت ادا کرتا ہے اور دیگر مردم کچھ تو اذان اوّل کے بعد وعظ سے پہلے فارغ ہولیتے ہیں کوئی درمیان وعظ ہی میں پڑھ لیتا ہے باقی وعظ کے بعد پڑھ لیتے ہیں۔ خطیب سنت ادا کرنے کے بعد منبر پر بیٹھتا ہے اس کے سامنے اذان ثانی ہوتی ہے پھر خطبہ مسنونہ پڑھ کر نماز پڑھاتا ہے اس صورت مذکورہ کو ایک مولوی صاحب خلاف سنت بتاتے ہیں اور تین خطبوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

الجواب:...... یہ صورت جائز ہے اور تین خطبے نہیں ہوئے بلکہ اذانِ ثانی کے بعد جو خطبے وہ پڑھتا ہے وہی مسنون خطبے جمعہ کے ہوجاتے ہیں اور پہلا وعظ وعظ ہی ہوگا خطبہ میں شامل نہیں ہوگا۔

حضرت کا مذکورہ فتویٰ اردو ملے خطبے کے وعظ ہونے میں بے غبار ہے۔

حضرت کا اس کو وعظ فرمانا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''خطبہ کے ہمہ شرائط وارکان موجود ہیں'' سوائے اس کے کہ اس میں شرط خطبہ ''خطبہ بنیت خطبہ'' نہیں پائی جاتی اور کیا تبصرہ ہوسکتا ہے۔

اردو ملے خطبے کے دوران سنتیں پڑھنے کے جواز پر کتاب الفتاویٰ (۴۶/۳) ملاحظہ ہو۔

اصل وہ دونوں خطبے ہیں جو عربی زبان میں دیئے جاتے ہیں اس سے پہلے اگر خطیب اردو زبان میں اپنے اس خطبہ کا خلاصہ لوگوں کو سنائے اور بتائے تو یہ خطبہ کے حکم میں نہیں اس دوران سنت ادا کی جاسکتی ہے۔

البتہ مرسلہ تحریر میں درج جواہر الفقہ کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ فقط ذکر سے عبارت ہے قصد اور نیت شرط نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے جواہر الفقہ میں صرف خطبہ کے ارکان وفرائض وآداب کا تذکرہ فرمایا ہے شرائط خطبہ سے تعرض نہیں فرمایا۔

جواہر الفقہ کی عبارت ملاحظہ ہو (۳۴۹/۳):

فرض صرف دو ہیں: (۱) وقت جمعہ، (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو انتھی، جبکہ تمام متداول ومعتمد کتب میں خطبہ کیلئے قصد کو ضروری قرار دیا ہے۔

کمافی مراقی الفلاح (صـ ۵۱۰): والثانی ان تکون بقصد الخطبۃ۔

وفی فتاویٰ الشامیۃ (۱۴۸/۲): وکفت تحمیدۃ او تھلیلۃ... بنیتھا۔

قولہ کفت تحمیدۃ۔ شروع فی رکن الخطبۃ بعد بیان شروطھا قولہ بنیتھا ای نیۃ الخطب۔

مندرجہ بالا عبارت میں رکن خطبہ کے ساتھ اشتراط نیت کی صراحت بھی ہے۔

وفی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ (۳۹۱/۱): ثانیھا: نیۃ الخطبۃ فلو خطب بغیر النیۃ لم یعتد بخطبۃ عند الحنفیۃ۔

البتہ خانیہ میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اگرچہ ایک روایت عدم قصد کی ہے۔

لمافی فتاویٰ خانیۃ (۳۴۳/۴): ولو عطس فقال الحمد للہ یرید بہ التحمید علی العطاس فذبح لا یحل بخلاف الخطبۃ اذا عطس علی المنبر فقال الحمد للہ فانہ یجوز بہ الجمعۃ فی احد الروایتین۔

عن ابی حنیفۃ لان المامور بہ فی الجمعۃ ذکر اللہ مطلقاً وھھنا الشرط ذکر اللہ علی الذبح۔

لیکن بنایہ میں اشتراط نیت کو اصح قرار دیا ہے۔

لمافی البنایة (۱/۶۰۸): ثم اشترط عند ابی حنیفة ان یکون قوله الحمدللہ علی قصد الخطبة حتی لو قال یرید الحمدللہ علی اعطاء لا ینوب عن الخطبة وقیل ینوب، والاوّل اصح۔

نیز حموی علی الاشباہ والنظائر (۱/۷۵) پر اشتراط قصد کو مذہب ثابت کیا ہے۔

اما النیة فی الخطبة للجمعة فشرط لصحتها۔ لم تصح قیل ھذا ھو المذھب... وفی روایة یجزئه ذالک لکن المذھب ماتقدم۔

لمافی فتاویٰ الھندیة (۱/۱۴۶): ومنھا الخطبة... وکفت تحمیدة او تھلیلة۔ ھذا اذا کان علی قصد الخطبة۔

البتہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ کیلئے شرط ہے۔ جبکہ شرائط میں قطع نظر اشتراط نیت وغیرہ سے محض وجود کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

کمافی الحموی علی الاشباہ والنظائر (۱،۶۸): امّا اذا کان شرطا لحکم لا تشترط النیة فی ھذا الشرط لان الشرط یراعی وجوده مطلقاً لا وجوده قصداً۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطبہ محض شرط ہی نہیں بلکہ اس میں رکنیت کا بھی ادنیٰ شائبہ موجود ہے۔

لمافی البنایة (۱/۸۰۰): وعن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنه قال قصرت الصلوة لأجل الخطبة وعن عائشة مثله وعن سعید بن جبیر قال کانت الجمعة اربعاً فجعلت الخطبة، فکان رکعتین۔

نیز خطبہ نری شرط ہی نہیں بلکہ مشروط بھی ہے کیونکہ سعی کا حکم خطبہ کیلئے ہے۔

بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ خطیب ابتداء وعظ میں تحمید وتسبیح بنیت خطبہ پڑھتا ہے تب بھی اس اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے چہ جائیکہ اس کا استماع لازم ہو اور اس دوران صلوٰة، نوافل واذکار حرام ہوں۔

لمافی امداد المفتین (۱/۳۸۵): فالحاصل ان اختصاص اللغة العربیّة فی الخطبة وان کان فی الاصل من السنن إلا انه لحق بترکه امور اخر من ابتداع بدعة واثم الادمان علی ترک السنة وترک البدعة واجب: فجاء الوجوب من ھذا القبیل لا بمحض المواظبة علیه وبالجملة فالحکم بوجوب العربیّة واثم تارکھا فی خطبة الجمعة۔ وان ترجمتھا بغیر العربیّة بدعة حق لا ریب فیه۔

وفیه (۱/۳۸۴): والحاصل ان اللغة العربیّة فی الخطبة سنة مؤکدة عندنا ولکن ترک العربیّة وجعلھا بالعجمیّة مکروہ تحریماً وتارکھا آثم ولا سیما المدمن علیه۔

یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خالص اردو خطبہ کو بدعت فرمارہے ہیں جبکہ ہمارا کلام اردو ملے خطبہ کے بارے میں ہے۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک خالص اردو خطبہ اور اردو ملا خطبہ بدعت ہونے میں یکساں ہے۔

لمافی امداد المفتین (۱/۳۸۵):

سوال نمبر (۶۴):...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو نظم یا نثر میں اس کا مطلب بیان کیا جاتا ہے۔آیا اس طرح پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو میں ترجمہ خواہ نثر سے ہو یا نظم سے بدعت ہے اور ناجائز ہے۔قرون مشہود لھا بالخیر میں باوجود ضرورت اور قدرت اس کی کوئی نظیر نہیں۔ نیز مرسلہ تحریر میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں جبکہ یہ مؤقف فتاویٰ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ سے میل نہیں کھارہا۔ کیونکہ حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواہر الفقہ میں خطبہ کیلئے عربی کو شرط گردانا ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وقال النووی: فی کتاب الاذکار حمد اللہ تعالیٰ ویشترط کونها خطبة الجمعة وغیرها بالعربیة۔

نیز جواہر الفقہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا کالعدم قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام صاحب اگر چہ جواز کے قائل تھے لیکن ان کا صاحبین رحمہا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع منقول ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وعلی هذا الخلاف الخطبة وجمیع الاذکار...

یعنی خطبہ اور تمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے)۔انتھی کلامہ

اب نہ معلوم غیر خطبہ (جب خالص اردو میں) ہو یا خطبہ مبتدعہ (اردو ملا خطبہ) بنیت خطبہ کا استماع کیوں لازم ہے اور اس دوران نوافل کی ممانعت کس بناء پر ہے جبکہ اردو ملا خطبہ بنیت خطبہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے۔

مرسلہ تحریر میں خطبہ کا بڑا مقصد وعظ وتعلیم مرقوم ہے جبکہ اکابرین کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔

لمافی جواہر الفقہ (۱/۳۵۵): یہاں تک کل تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ خطبہ جمعہ کا اصلی رکن اور مقصد صرف ذکر اللہ ہے۔تبلیغ یا وعظ وتذکیر اس کے فرائض میں داخل نہیں حضرت چند سطر بعد رقم طراز ہیں۔اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہ تھا بلکہ وعظ وتبلیغ مقصود تھی تو وقت ظہر کی کیا تخصیص ہے۔

نیز فرماتے ہیں: اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہو گیا تو قول مختار کے موافق خطبہ کا اعادہ ضروری ہے۔اگر چہ سننے والے دوبارہ بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں......

اگر وعظ وپند ہی خطبہ کا مقصد ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے انتھی کلامہ۔

نیز اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں دو بدعتوں میں سے ایک کا ارتکاب لازم آئے گا.کیونکہ اگر اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کیا جائے تو باقی دو خطبے نفل ہوں گے جبکہ جمعہ میں خطبہ نفلاً مشروع نہیں۔

لمافی الاشباہ مع الحموی (۱/۱۳۵): وکذا الخطبة......ان شرطنا لها النیة لانها لا یتنفل بها۔

کی روشنی میں پڑھتے ہوئے تو اس صورت میں بھی ارتکاب بدعت سے بچنا ممکن نہیں کیونکہ السنۃ الخطبۃ ... خطبہ متوارثہ سے ہٹ کر بدعت ہی ہے۔

علاوہ ازیں ترجمہ وتفسیر کرنے کی صورت میں ایک تیسرا اختلاف سنت امر "تطویل خطبہ" کا ارتکاب لازم آئے گا جو کہ خلاف سنت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف ج ۱ ص ۲۸۶ میں ... حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ... سے روایت ہے ... میں اختصار خطبہ اور ... نماز ... تطویل خطبہ کا ذکر فرماتے ہیں۔

چنانچہ ... ہوئے ... کا ثبوت ہے۔

... خطبہ ... کا حکم ہے۔

... واجب ہے۔

... ترجمہ ... میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

... خطبہ کے احکام لاگو ہوں گے

... خطبہ ... پائی جاتی۔

... بدعت ... کا ترک واجب ہے

... واجب ہے ... سے ... کی وضاحت کرتے ہیں...... ہمارے ... خطبہ ... میں ... خطبہ کی طرح ... خطاب کے دوران ... ہوں گے ... ہے ... فی المسجد عظۃ ... عبارات سے ... ہے۔

لما فی فتاوی الہندیۃ ج ۱ ص ۳۱۷ ویکرہ من الفسوق ... یقرأ القرآن لا یلزمہ الاستماع۔

اس سے معلوم ہوا کہ استماع قرآن واجب علی الاطلاق نہیں۔

نیز شامی میں استماع العظۃ اولیٰ ... قرآن کے علاوہ دوسرے ... کیلئے ہے جبکہ قاری کیلئے کیا حکم ہے؟

فتاویٰ شامی ملاحظہ ہو (ج ۱ ص ۳۶۳)

قولہ فاستماع العظۃ اولیٰ الظاہر ان ہذا خاص بمن لا قدرۃ لہ علی فہم الآیات القرآنیۃ والتدبر فی معانیہا الشرعیۃ والاتعاظ بمواعظہا الحکمیۃ اذ لا شک ان من لہ قدرۃ علی ذالک یکون استماعہ اولیٰ بل اوجب بخلاف الجاہل فانہ یفہم من المعلم والواعظ ما لا یفہمہ من القاری فکان ذالک انفع لہ

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامع عالم ذی فہم معانی قرآن سے واقف ہو تو اس کیلئے استماع قرآن اولیٰ بلکہ واجب ہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب تلاوت جاری ہو جبکہ مرسلہ تحریر میں پیش کردہ دعویٰ دوران وعظ مطلقاً نوافل، تلاوت وغیرہ کی ممانعت کا ہے۔

نیز البحر الرائق (۲/۵۵) پر ہے:

ولھذا نقل الشارح عن الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھم ان بعضھم کانوا یقروون القرآن وبعضھم یتذاکرون العلم والمواعظ وبعضھم یصلون ولم ینھھم النبی ﷺ عن ذالک ولو کان مکروھاً لنھاھم۔

مذکورہ بالا عبارت سے صاحب بحر نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی نمازی سامنے بیٹھے شخص کی پشت کی طرف نماز پڑھ رہا ہو جبکہ وہ شخص محو کلام ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف حلقے لگتے تھے اس میں نماز پڑھنے والے، باہمی وعظ و پند کرنے والے اور ایک حلقہ تلاوت کرنے والوں کا تھا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرز عبادت وتلاوت سے منع نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تلاوت اور وعظ کا علی الاطلاق سننا واجب نہیں ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کو حلقہ تعلیم میں بیٹھنے یا استماع تلاوت کا حکم صادر فرماتے۔

نیز خارج نماز عدم استماع تلاوت کے وجوب پر ابن کثیر ملاحظہ ہو۔

تفسیر ابن کثیر (۲/۲۵۹): سورۃ الاعراف (آیۃ: ۲۰۴)

حدثنا الجریری عن طلحۃ بن عبید اللہ بن کریز قال رأیت عبید بن عمیر وعطاء بن ابی رباح یتحدثان والقاص یقص فقلت الا تستمعان الی الذکر، وتستوجبان الموعود؟ قال فنظرا إلیّ ثم اقبلا علی حدیثھما، قال فاعدت فنظرا إلیّ واقبلا علی حدیثھما، قال فاعدت الثالثہ قال فنظرا الی فقالا انما ذالک فی الصلوۃ۔

مذکورہ بالا حوالہ میں جہاں خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوۃ کی صراحت ہے وہاں وعظ و پند کے عدم وجوب استماع پر بھی "القاص یقص" کی بناء پر بین دلیل ہے۔

نیز ابن کثیر (۲/۲۵۹) ملاحظہ ہو۔

قال عبدالرزاق عن الثوری عن لیث عن مجاھد قال لا بأس اذا قرأ الرجل فی غیر الصلوۃ ان یتکلم وکذا قال سعید بن جبیر والضحاک وابراھیم النخعی وقتادۃ ان المراد بذالک فی الصلوۃ۔

کذافی تفسیر القرآن لصنعانی (۲/۲۴۷)

اس حوالہ بالا کی روشنی میں علی الاطلاق وجوب استماع تلاوت کا حکم دشوار ہے۔

تفسیر الدر المنثور میں (۹/۶۳۵) پر بھی اس کی تائید موجود ہے:

عن عبداللہ بن مغفل انہ سئل اکل من سمع القرآن یقرأ وجب علیہ الاستماع والانصات؟قال لا قال انما نزلت ھذہ الآیة۔۔۔۔۔فی قراءة الامام اذا قرأ الامام فاستمع لہ وانصت۔

نیز تفسیر مظہری میں خلاصة الفتاوی کے جزئیہ ''رجل یکتب الفقہ وبجنبہ یقرأ القرآن فلا یمکنہ الاستماع فالاثم علی القاری الخ'' پر محدثانہ تبصرہ ملاحظہ ہو۔

تفسیر مظہری(۴۵۱/۳): اختلف العلماء فی وجوب الاستماع والانصات علی من ھو خارج الصلٰوة یبلغہ صوت من یقرأ القرآن فی الصلٰوة او خارجھا۔ قال البیضاوی عامة العلماء علی استحبابھا خارج الصلٰوة۔۔۔قال فی الخلاصة رجل یکتب الفقہ الخ۔

قلت: وقد ثبت عنہ ﷺ انہ کان یقرأ القرآن باللیل جھراً بحیث یسمع من وراء حجرتہ وربما یسمعہ الجیران۔

وفی الصحیحین عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ انی لاعرف اصوات رفقة الاشعریین حین یرحلون واعرف منازلھم من اصواتھم بالقرآن باللیل۔۔۔ولا شک ان بعض الناس فی العسکر کانوا نیاما وقت قراءة الاشعریین۔

فھذا الاحادیث تدل علی فساد ما افتی بہ صاحب الخلاصة۔

حضرت کا یہ تبصرہ اگرچہ بظاہر وعلی ھذا لو قرأ علی السطح الخ کے متعلق ہے لیکن حضرت کا رجحان خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن مردویہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

اخرج ابن مردویہ فی تفسیرہ قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔قال عبداللہ بن مغفل اکل من سمع القرآن وجب علیہ الاستماع والانصات قال انما نزلت ھذہ الآیة اذا قرأ القرآن الخ فی القراءة خلف الامام۔

بلکہ حضرت مندرجہ ذیل الفاظ سے صاف صاف اپنی رائے کا اظہار فرمارہے ہیں۔

قلت واللام فی قولہ تعالیٰ اذا قرئ القرآن للعھد دون الجنس والمراد بہ القرآن المقرو لاستماعکم کالامام یقرأ حتی یسمع من خلفہ والخطیب یقرأ للتخاطب والمقری یقرأ علی التلمیذ۔

معلوم ہوا مطلقاً استماع تلاوت واجب نہیں۔

نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ خارج نماز استماع تلاوت کے بابت ملاحظہ ہو۔

امداد الفتاویٰ(۵۹/۴): الجواب۔۔۔۔۔سماع قرآن میں دونوں قول ہیں آسانی کیلئے میں اسی کو اختیار کرتا ہوں کہ خارج صلوٰة مستحب ہے۔

حضرت کے نزدیک جب وجوب استماع تلاوت علی الاطلاق نہیں تو اس پر مبنی مسئلہ وجوب استماع وعظ بھی یقیناً واجب نہیں ہوگا۔
نیز استماع تلاوت مطلقاً میں اتنا عموم اور توسیع کہ مجلس تلاوت میں بیٹھے ہمہ حاضرین وسامعین پر استماع واجب ہو پھر اس پر بناء کر کے مجلس وعظ میں موجود تمام سامعین پر وجوب وعظ کا حکم لاگو کرنا خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے متضاد ہے۔ کیونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ جہاں استماع تلاوت علی الاطلاق کے قائل ہیں وہاں استماع تلاوت خارج نماز فرض (واجب) کفائی کی تصریح فرمارہے ہیں۔
جبکہ مرسلہ تحریر میں مثبت دعویٰ اس کے خلاف ہے۔

فتاویٰ شامیۃ (۱/۵۴۶): وفی شرح المنیۃ: والاصل ان الاستماع للقرآن فرض کفایۃ لانہ لاقامۃ حقہ بأن یکون ملتفتا إلیہ غیر مضیع وذالک یحصل بانصات البعض، کمافی رد السلام حین کان لرعایۃ حق المسلم کفی فیہ البعض عن الکل۔

نیز بیان القرآن میں خارج نماز استماع تلاوت کے بابت مفصل اور فیصلہ کن کلام ملاحظہ ہو۔

بیان القرآن (۱/۳۶۳):...... اور اسی سے خارج عن الصلوٰۃ بھی قرأت کے وقت دوسرے کام میں مشغول ہونے کو ہمارے فقہاء حنفیہ نے ممنوع فرمایا ہے۔ اور اسی پر مشغول کے پاس بیٹھ کر پکار کر پڑھنے کو منع کیا ہے نقلہ فی الروح عن الخلاصۃ۔
اور مبنیٰ اس کا مسئلہ مشہورہ اصولیہ کے اعتبار سے عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا لیکن احقر کو اس میں شفاء نہیں۔ نہ اس مسئلہ اصولیہ میں اور نہ اس فرع فقہی میں کیونکہ ایسا عموم جو مراد متکلم سے بھی متجاوز ہو مراد لینا صحیح نہیں جیسا کہ حدیث ''لیس من البر الصیام فی السفر'' میں صیام کو کسی نے عام نہیں لیا اور یہاں مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تلاوت خارج صلوٰۃ اپنے ثواب یا یاد کیلئے ہو کسی کو تذکیر وتبلیغ کیلئے نہ ہو وہ آیت میں مراد نہیں۔

وایضاً فی السراج المنیر للخطیب الشربینی عن البیضاوی وظاہر اللفظ یقتضی وجوبھما حیث یقرأ القرآن مطلقاً وعامۃ العلماء علی استحبابھما خارج الصلوٰۃ۔

پس ظاہراً عامۃ العلماء میں حنفیہ بھی داخل ہیں اور یہ لفظ قریب اجماع ہے۔ پس اس قول کو حنفیہ کا قول محقق اور قول اوّل کو ان کا قول مشہور کہیں گے۔

ضمیمہ:...... بعد تحریر تحقیق بالا الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص:۱۰۸) میں یہ روایت نظر پڑی جس میں فرع مذکور میں بھی حنفیہ کے نزدیک گنجائش کی تصریح ہے۔

وفی الدر المنیفۃ عن القنیۃ یکرہ للقوم ان یقروا القرآن جملۃً لتضمنھا ترک الإستماع والانصات وقیل لاباس؟، انتھی کلام

حکیم الامت:...... نیز بزازیہ کی عبارت میں واشگاف الفاظ میں خارج نماز میں استماع قرآن کے بابت قول آخر (عدم استماع) کی طرف اشارہ موجود ہے۔

لمافی البزازیة(۱/۱/۴۱): یکتب الفقه وبحنبه رجل یقرأ القرآن...فالا ثم علی القاری......
وھذاعلی قول من قال استماع القرآن واجب خارج الصلوٰة۔
معلوم ہوامذہب میں دوسرے قول کی بھی گنجائش ہے۔
نیز فتاویٰ حقانیہ(۲/۱۷۰) پرخارج نماز استماع تلاوت کے بابت فتویٰ ملاحظہ ہو۔
الجواب:......اس بارے، میں دوطرح کے اقوال موجود ہیں، ایک وجوب کا اور دوسرا عدم وجوب کا، متاخرین فقہاء کرام نے آسانی اور سہولت کیلئے دوسرے قول کوترجیح دی ہے۔لہٰذا خارج نماز قرآن کریم کی تلاوت سننا واجب نہیں تاہم مستحب ضرور ہے۔
وحکی ابن المنذر: الاجماع علی عدم وجوب الاستماع والانصات فی غیر الصلوٰة والخطبة وذالک ان یجابهما علی کل من یسمع احدأیقرأفیه حرج عظیم لانه یقتضی ان یترک له المشتغل بالعلم علمه والمشتغل بالحکم حکمه الخ۔(تفسیر المنار، ۵۵۳/۹،۵۵۲)
نیز احکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کا خارج نماز استماع تلاوت کے متعلق مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کن اور محتاط کلام ملاحظہ ہو(احکام القرآن للجصاص، ۳۹/۳)۔
عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ (واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔ قال المؤمن فی سعة من الاستماع إلیه الافی صلاة مفروضة اویوم جمعة او فطر او اضحیٰ۔
مذکورہ بالا ہمہ حوالہ جات شکل اوّل کے کبریٰ اور اس سے اخذ شدہ نتیجہ سے ہماری نظر میں میل نہیں کھا رہے ہیں۔
البتہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے باب ''الانصات للعلماء'' کے تحت علامہ عینی اور علامہ ابن بطال رحمہما اللہ تعالیٰ کے کلام سے بظاہر ہر وعظ کے استماع کا وجوب معلوم ہوتا ہے لیکن خارج نماز سماع تلاوت کے بابت ذکر کردہ روایات اور تصریحات اکابر کے تناظر میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تاویل کی جائے گی کیونکہ جب کلام خالق جل جلالہ کا استماع علی الاطلاق واجب نہیں تو وجوب استماع کلام عالم وکلام الناس بدون نص صریح غیر معارض چہ معنی دارد۔
نیز اگر علماء کرام کے ہمہ کلام خواہ از قبیل خطبہ ہو یا وعظ و پند سننا واجب ہو تو پھر''یجب الاستماع لسائر الخطب'' کا محمل کیا ہوگا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے۔چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے الخ''۔
لہٰذا ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سوائے تاویل کے کوئی چارہ کار نہیں۔
وباب التاویل متسع
اوّلاً......وجوب انصات العالم اس وقت ہوگا جب وہ خطبہ دے رہا ہو جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب الانصات

للعالم کے تحت جو حدیث نکالی ہے اسی حدیث کیلئے (اگر چہ سند مختلف ہے) (۱/۴۳۳) پر باب باندھا ہے باب ''الخطبة بایام منی''
ورنہ انصات مستحب ہوگا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے مطلقاً عالم کیلئے انصات معلوم ہو رہا ہے کیونکہ ''جب کسی اسم مشتق پر حکم لگتا ہے تو مادہ اشتقاق اس کی علت بنتا ہے جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں ''الانصات لاجل العلماء واللام فیه للتعلیل''

جواباً ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر عالم کا ہر کلام خطبہ وغیر خطبہ سننا واجب ہو تو پھر یجب الاستماع لسائر الخطب کے مابین تعارض آئے گا اس تعارض کے دفیعہ کیلئے مذکورہ بالا تاویل کے علاوہ کوئی مخلص نہیں۔

ثانیاً......وجوب بمعنی ثبوت ہے کما ھو شائع ذائع۔

ثالثاً......محقق العصر محدث وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''الدر'' کی عبارت ''یجب الاستماع لسائر الخطب'' کے عموم پر گہری تشویش کا اظہار فرمایا ہے چہ جائیکہ ہر عالم کے کلام اور ہر وعظ کا سننا واجب ہو۔

لمافی فیض الباری (۲/۳۴۷): قوله (ترکوک قائماً) فان قلت کیف وھم اتقی الناس فی الارضین وازھدھم بعد الانبیاء والمرسلین قلت والجواب کمافی التوشیح للسیوطی۔ ان الخطبة فی الجمعة کانت علی شاکلة العیدین بعد الصلٰوة ثم قدمت علیها فلعلهم حملوا استماعها علی الاستحباب وظنوه کسائر الخطب ولم یروه عزیمةً علیهم سیما اذا کان عند النسائی ان النبی ﷺ کان ینادی بعد العیدین ان من شاء منکم ان یمکث فلیمکث ومن شاء ان یذھب فلیذھب وتردد فیه الحفاظ فدل علی التوسیع فی خطبة العیدین۔

وفی الدر المختار ان استماع جمیع الخطب واجب'' قلت ولا یناسب ھذا التوسیع بل ینبغی ان یفصل فی الامر۔

وفیه تحت باب کلام الامام والناس فی خطبة العید الخ۔

(۲/۳۶۳) کلام الامام الناس)...... لعل المصنف رحمه اللہ تعالیٰ یشیر الی ان فی خطبة العیدین سعة بالنسبة إلی خطبة الجمعة وھو المختار عندی وان کان فی کتبنا انهما سواء۔

وفی النسائی (۱/۱۷۸) مع حاشیة للسیوطی

ان النبی ﷺ صلی العید قال من احب ان ینصرف فلینصرف ومن احب ان یقیم للخطبة فلیقم۔

قوله من احب ان یقیم۔ وعلم منه ان استماع خطبة العید غیر واجب۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تحقیق کے تناظر میں ہر وعظ کے وجوب استماع کا حکم لگانا یقیناً دشوار ہے۔ نیز قاعدہ مسلّمہ ''المشقة تجلب التیسیر'' بھی عدم وجوب کا متقاضی ہے۔

یہ تو اس مسئلہ کا علمی اور فقہی پہلو تھا جس کے بابت ہم نے اپنے مؤقف کی وضاحت کردی البتہ عملی نقطۂ نظر سے علماء کرام کی توقیر، عزت واحترام اوران کے کلام، وعظ اور پند کو ہمہ تن، دلجمعی اور یکسوئی سے سننے سے کسی کو انکار کی مجال نہیں بلکہ اس پہلو کو عوام الناس میں ترغیبی انداز میں اجاگر کرنے کی اشد ضرورت اور عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے کیونکہ افادہ اور استفادہ کا دارومدار اعتقاد اور باہمی الفت ومحبت پر ہے۔عوام الناس کے قلوب میں علماء کرام کا اعتقاد، تعظیمی اور توقیری شعور بیدار کرنے کیلئے اس مسئلہ کو منصۂ شہود پر لانا انتہائی قابل ستائش اور مستحسن اقدام ہے۔اس مسئلہ کو عملی جامہ پہنانے سے میڈیا، مغرب زدہ طبقہ اور سازشی عناصر کے ہاتھوں عوام اور علماء کرام کے مابین پھیلائی انارکی، فساد، نفرت اور قائم خلیج کے فاصلے رفو ہو کر علماء کرام عوام الناس کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بہتر انداز میں صحیح دینی اور اخلاقی رہنمائی کرسکیں گے اور کافی حد تک عریانی اور فحاشی سے آلودہ معاشرہ کا مداوا ہو سکے گا۔

(۳۴۸) خطبہ اور جماعت کے درمیان خطیب صاحب کا مخصوص اعلان کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے خطیب صاحب جمعہ کے خطبہ کے بعد اقامت سے پہلے دو چار باتوں کا اعلان کرتے ہیں، وہ یہ ہیں ''صفیں درست فرمالیں، چھوٹے بچوں کو پچھلی صفوں میں، یا صفوں کے دائیں بائیں کردیں، اپنے سروں کو ڈھانپ لیں اپنے پائنچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا کیجئے اور اپنے موبائل فونز بند کرلیں'' اس اعلان کے بعد اقامت ہوتی ہے اور پھر نماز۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ آیا اس طرح کے اعلان سے خطبہ جمعہ اور نماز میں فصل واقع نہیں ہوتا؟ آیا اس طرح کا اعلان کرنا خطیب صاحب کیلئے درست ہے؟ میں نے کئی بڑے بڑے بزرگوں کے پیچھے نماز جمعہ پڑھی ہے انہیں اس طرح کے اعلانات کرتے کبھی نہیں سنا، ازراہ کرم اگر بزرگوں میں سے کسی سے متعلق بھی معلوم ہوجائے کہ ان کی یہ عادت تھی تو بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......امر بتسویۃ الصفوف یعنی نماز کے لئے جب صفیں بنائی جائیں توصفوں کو سیدھا کرنے کا حکم کرنا نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، خدا کے بعد سب سے بڑے بزرگ حضرت محمد ﷺ جب نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو تکبیر کہنے سے پہلے صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم فرماتے۔ کتب احادیث اس قسم کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں جواباً عرض ہے کہ خطیب صاحب کا یہ اعلان کرنا جائز ومستحسن اور سنن صلوۃ میں سے ایک سنت کو پورا کرنا ہے، جہاں تک خطبہ اور اقامت کے درمیان فصل کا تعلق ہے جس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیاوی باتوں کے ذریعہ ہو، اگر دینی باتوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا کسی عذر شرعی کی بنا پر فصل آجائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ خطیب صاحب مذکور فی السوال کا یہ اعلان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہے لہٰذا یہ فصل مضر نہیں۔ آپ کا کسی سے نہ سننا ان کے خلاف حجت نہیں۔

لمافی سنن النسائی(۹۳/۱): مایقول الامام اذا تقدم فی تسویة الصفوف، اخبرنا بشر بن خالد... عن أبي مسعود رضی الله عنه قال کان رسول الله ﷺ یمسح عواتقنا ویقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم ولیلینی منکم اولو الاحلام والنهی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم... عن انس قال اقبل علینا رسول الله ﷺ بوجهه حین قام الی الصلوة قبل ان یکبر فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری۔

وفی صحیح البخاری(۱۰۰/۱): قال انس بن مالك رضی الله عنه اقیمت الصلوة فاقبل علینا رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقیموا صفوفکم وتراصّوا فانی اراکم من وراء ظهری۔

وفی عمدة القاری(۲۵۴/۵): ذکر ما یستفاد منه فیه الامر بتسویة الصفوف وهی من سنة الصلوة عند ابي حنیفة والشافعی ومالك رحمهم الله تعالیٰ. وزعم ابن حزم انه فرض لان اقامة الصلوة فرض وما کان من الفرض فهو فرض۔

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۱۶۱/۲): فاذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل بامر الدنیا ذکرہ العینی، قولہ اقیمت، بحیث یتصل اول الاقامۃ باٰخر الخطبۃ وتنتھی الاقامۃ بقیام الخطیب مقام الصلوۃ... قولہ بامر الدنیا اما بنھی عن منکراو امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لو ظھرانہ محدث او جنب کما مر بخلاف اکل أوشرب۔

(۳۴۹) خطبہ اور جمعہ میں فصل کی شرعی حیثیت

سوال.....کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ میں فصل ہوجائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......خطبہ اور نماز جمعہ میں وصل سنت ہے۔ پھر اگر فصل اخروی امور کی وجہ سے ہو۔ جیسے وضو کرنا وغیرہ تو دوبارہ خطبہ دینا مستحب ہے۔ اگر خطبہ نہ دے، پھر بھی جائز ہے۔ لیکن اگر فصل دنیاوی امور کی وجہ سے ہو، جیسے کھانا پینا وغیرہ تو مکروہ ہے اور اگر فصل لمبا ہوجائے تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہوگا۔

لمافی الدر المختار علی ھامش الطحطاوی(۳۴۳/۱): ولو خطب جنبا ثم اغتسل وصلی جازولو فصل باجنبی فان طال بان رجع لبیتہ فتغدی أو جامع واغتسل استقبل خلاصۃ ای لزوما لبطلان الخطبۃ۔

وقال الطحطاوی تحتہ : (قولہ جاز) أی ولا یعد الغسل فاصلا لانہ من اعمال الصلاۃ (فان طال) الظاھر انہ یرجع فی الطول الی نظر المبتلی۔

وفیہ ایضاً(ص۳۴۸): (فاذا اتم) الامام الخطبۃ (أقیمت ویکرہ الفصل بامر الدنیا) یفھم منہ انہ لایکرہ الفصل بامر الآخرۃ کذکروھو کذلك لان الخلاف علی الاصح انما ھو فی کلام الدنیا کما قدمناہ ولکن مالم یلزم منہ تاخر۔

وفی الشامیۃ (۱۵۱/۲):(قولہ جاز)أی ولا یعد الغسل فاصلا لانہ من اعمال الصلاۃ و لکن الاولی اعادتھا کما لو تطوع بعدھا اوافسد الجمعۃ او فسدت بتذکرفائتۃ فیھا۔ وفی (ص۱۶۱): (قولہ فاذا أتم) ای الامام الخطبۃ (قولہ أقیمت) بحیث یتصل اول الاقامۃ بآخر الخطبۃ ....

وفی (ص۱۶۲):(قولہ بامر الدنیا) اما بنھی عن منکر او امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لوظھر انہ محدث او جنب کما مر بخلاف اکل وشرب حتی لوطال الفصل استأنف الخطبۃ۔

(۳۵۰) عربی میں خطبہ پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے وقت عربی زبان میں جوخطبہ پڑھا جاتا ہے اس کا عربی زبان میں پڑھنا فرض ہے واجب یا سنت؟ اگر کوئی عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھتا ہے یا عربی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی ہوتا ہے تو اس خطبے کا کیا حکم ہوگا؟ اور اس صورت میں نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اس مسئلے میں جواز اور عدم جواز کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں ان کو مفصلاً ومدللاً بیان فرمادیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......جمہور ائمہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے خطبہ پڑھنا فرض اور عربی زبان میں پڑھنا واجب ہے، حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کا پہلے یہ قول تھا کہ قراءت بالفارسیہ جائز ہے اس شخص کیلئے جو عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو، پھر انہوں نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کرلیا اور اب احنافؒ کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ قرأت بالفارسیہ جائز نہیں، اور شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں بھی یہی اختلاف ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں جائز نہیں اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک (کراہت کے ساتھ) جائز ہے، اور فقہاء کرام شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ کے اس اختلاف کو مدار بنا کر نماز کے تمام اذکار، دعاءِ قنوت اور خطبے وغیرہ کو قیاس کرتے ہیں۔ البتہ قراءت کے علاوہ مسائل میں امام صاحب رحمہ اللہ نے رجوع نہیں فرمایا۔ بلکہ اس میں امام صاحبؒ کا مذہب ہی راجح ہے لہذا شروع فی الصلاۃ، خطبہ اور جمیع اذکارِ صلوۃ کراہت کے ساتھ اداء ہوجائیں گے۔

چنانچہ اگر کوئی خطیب عربی زبان میں خطبے پر قادر ہوتے ہوئے کسی اور زبان میں خطبہ دیتا ہے تو امام صاحبؒ کے نزدیک اس کا خطبہ کراہت کے ساتھ اداء ہوجائے گا۔ چونکہ خطبہ کا بدل نہیں لہذا اس کا اعادہ بھی نہ ہوگا۔ البتہ یہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب ہے اسے اس پر توبہ واستغفار کرنا چاہیئے۔

نوٹ: اس مسئلے کی مزید تفصیل نجم الفتاوی کی اسی جلد کے (فصل فی مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا) کے مسئلے بعنوان (غیر عربی میں دعا کا حکم) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

وفی الهندية (۱۴۶/۱): (ومنها الخطبه قبلها) حتی لو صلوا بلا خطبة أو خطب قبل الوقت لم يجز كذا فی الكافی۔

وفی الشامية(۴۸۳/۱): (قوله ايضاً الخ) أی كما صح شروعه بالتكبير السابق صح ايضاً بالتسبيح ونحوه، لكن مع كراهة التحريم، لأن الشروع بالتكبير واجب، وقدمنا ان الواجب لفظ الله اكبر من بين الفاظ التكبير الأتية، وقال فی الخزائن هنا، وهل يكره الشروع بغير الله اكبر؟ تصحيحان، والراجح انه مكروه تحريما، وان وجوبه عام لاخاص بالعبد كماحرره فی البحر للمواظبة التی لم تقترن بترك اهـ... ... وفيه أيضاً (ص۴۸۴) (قوله وجميع اذكار الصلاة) فی

التتارخانية عن المحيط: وعلى هذا الخلاف لوسبح بالفارسية فى الصلاة او دعا أو أثنى على الله تعالىٰ او تعوذ اوهلل او تشهد او صلى على النبى صلى الله عليه وسلم بالفارسية فى الصلاة اى يصح عنده لكن سيأتى كراهة الدعاء بالاعجمية۔

وفى الفقه الاسلامى (٢/٨٤٠): وقد اجمع الفقهاء على انه لا تجزئ القراءة بغير العربية. ولا الإبدال بلفظها لفظاً عربياً آخر، سواء احسن قراءتها بالعربية أو لم يحسن، لقوله تعالىٰ: (قرآناً عربياً) (يوسف.٢/١٢)۔ وقوله سبحانه: ''بلسان عربي مبين'' (الشعراء:٢٦/١٩٥) ولا القرآن معجزة بلفظه ومعناه، فإذا غيرّ خرج عن نظمه، فلم يكن قرآناً ولا مثله. وإنما يكون تفسيراً له. والتفسير غير المفسر الخ۔

وفى الدرالمختار (١/٥٢١): (ودعا) بالعربية، وحرم بغيرها نهر. لنفسه وابويه واستاذه المؤمنين۔ وفى الشامية تحته: (قوله وحرم بغيرها) الى قول لكن المنقول عندنا الكراهة. فقد قال فى غرر الافكار شرح دررالبحار فى هذا المحل: وكره الدعاء بالعجمية. لأن عمر رضى الله عنه نهى عن رطانة الأعاجم اهـ والرطانة كمافى القاموس: والكلام بالاعجمية. ورأيت فى الولوالجية فى بحث التكبير بالفارسية ان التكبير عبادة لله تعالىٰ، والله تعالىٰ لايحب غير العربية، ولهذا كان الدعاء بالعربية اقرب الى الاجابة، فلايقع غيرها من الألسن فى الرضاء والمحبة لها موقع كلام العرب اهـ وظاهر التعليل أن الدعاء بغير العربية خلاف الاولىٰ، وان الكراهة فيه تنزيهية. الى قول ولا يبعد ان يكون الدعاء بالفارسية مكروها تحريما فى الصلوة وتنزيها خارجها، فليتامل وليراجع۔

وفى مجموعة الفتاوىٰ هامش خلاصة الفتاوىٰ(١/١٥٠): سوال: چه ميفرمايند علماء دين متين اندرين مسئله كه خطبه جمعه بر زبان اردو يا فارسى يا باشعار اردو يا فارسى خواندن جائز ودرست است يا نه؟ واگر جائز است پس دركدام كتاب مذكور است بينوا توجروا، هو العليم الخبير خطبه جمعه بر زبان اردو نثر باشد يا نظم وہمچنان برزبان فارسى نثر باشد يا فارسى وعلى هذا القياس خطبه كه قدرى عبارتش بلغت عربي باشد وقدرى بزبان اردو يا فارسى نثر يا نظم باشد مكروه بكراهت تحريمى است چرا كه مخالف سنت هدىٰ است زيراچه پيغمبر خدا عليه التحية والثناء وصحابه كرام رضى الله عنهم على الدوام خطبه بزبان عربي خوانده است ودرآن وقت از كسى خواندن خطبه بغير زبان عربي منقول نيست

چنانکه درکتاب آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس مسطورست وهذه عبارته ''الكراهة انما هی لمخالفة السنة لان النبی ﷺ واصحابه قد خطبوا دائما بالعربية ولم ينقل عن احد منهم أنهم خطبوا ولو خطبة غير الجمعة بغير العربية انتهی. وپوشيده نماندكه باعث احداث خطبه غير عربيه نيست مگر نفهميدن عجم عبارات عربيه راحالانكه اين امردر قرون ثلاثه هم موجود بود چرا كه ہر گاه بلاد وامصار در اطراف مختلفه مفتوح شدند واكثر مردمان فارس وحبش وروم وغيره مشرف باسلام شدند وايشان درمجالس شعائر الاسلام مثل جمعه وعيد وغيرها حاضر ميشدند وظاہر است كه آن مرد مان رابوجه عدم وقوف از لغت عربي شعور فهم عبارات عربيه نبود با اين ہمه كسے شخصے بنا بر رعايت فهم اشخاص عجميه خطبه در غير زبان عربي نخوانده باوجوديكه تعليم وتفهيم كه از شان خطبا وعلماست مقتضی اين بود ہر گاه در آن وقت چنين نه شده پس دركراهت خطبه غير عربيه كه ادنی مرتبه ضلالت ست. ہيچ شكے نماند. چنانكه دركتاب آكام النفائس فی اداء الأذكار بلسان الفارس مذكور ست. الخطبة بالفارسية التی احد ثوها واعتقدوا حسنها ليس الباعث اليها الاعدم فهم العجم اللغة العربية وهذا الباعث قد كان موجود فی عصر خير البرية وان كان فی اشتباه فلا اشتباه فی عصر الصحابة والتابعين ومن تبعهم من الائمة المجتهدين حيث فتحت الامصار الشاسعة والديار الواسعة واسلم اكثر الحبش والروم والعجم وغيرهم من الاعجام وحضروا مجالس الجمع والاعياد وغيرها من شعائر الاسلام وقد كان اكثرهم لايعرفون اللغة العربية ومع ذلك لم يخطب احد منهم بغير العربية ولما ثبت وجود الباعث فی تلك الازمنة وفقدان المانع والتكاسل ونحوه معلوم بالقواعد المبرهنة لم يبق الا الكراهة التی هی ادنی درجات الضلالة انتهی. الی قول (صـ١٥١) چنانچه ہم درآن كتاب مرقوم است. وقدوردان النبی ﷺ لما فرغ من الخطبة فی بعض الاعياد وظن انها لم تصل الی اذان النساء لبعدهن حضرهن ووعظهن وخطبهن ولم يروولومن رواية الافراد أنه عقدين ألم يكن يفهم العربي مجلساً عليحدة ووعظهم وخطبهم بلغة غير عربية ولا يتوهم انه لم يكن النبی ﷺ يعلم اللغة العجمية وغيرها من اللغات الغير العربية ولو كان علمها لخطب بها لأنا نقول بعد تسليم ذلك ان بعض الصحابة كزيد بن ثابت قد كان يعلم اللسان العجمی والرومی والحبشی وغيرها من الا لسنة كماصرح به فی الاعلام بسيرة النبی ﷺ وغيره من كتب

الاعلام فلم لم يامره النبى ﷺ بان يخطبهم ويعظهم بالسنتهم وبالجملة فالاحتياج الى الخطبة بغير العربية لتفهيم اصحاب العجمية كان موجودا فى القرون الثلثة ومع ذلك فلم يرو واحد من احد فى تلك الأزمنه وهذا اول دليل على الكراهة انتهى۔

وفى اعلاء السنن(١/١١٣): هذا هو قول أبي حنيفة رحمه الله أولا ثم رجع عنه إلى قولهما، وقال بأن القرآن اسم للفظ والمعنى جميعا لا للمعنى فقط۔ وقال: لا تجوز الصلوة بالعجمية للقادر على العربية، وتجوز للعاجز عنها، قال فى البحر: وهو الحق لأن المفهوم من القرآن باللام انما هو العربي فى عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالىٰ: ''فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ''۔

وفى كتاب الفقه على مذاهب الاربعة(١/٣٩٢،٣٩١): يشترط لخطبتى الجمعة امور: احدها: أن تتقدما على الصلاة، فلا يحتدبهما إن تاخرتا عنها... ثالثها أن تكون بالعربية على تفصيل فى المذاهب۔

(حاشية نمبر٢): الحنابلة: قالو الا تصح الخطبة بغير العربية إن كان قادراً عليها، فإن عجز عن الاتيان بها أتى بغيرها مايحسنه، سواء كان القوم عرباً أو غيرهم، لكن الآية التى هى ركن من اركان الخطبتين لا يجوز له ان ينطق بها بغير العربية۔ فيأتى بدلها بأى ذكر شاء بالعربية، فان عجز سكت بقدر قراءة الآية۔

الشافعية: قالوا: يشترط ان تكون اركان الخطبتين باللغة العربية: فلا يكفى غير العربية متى امكن تعلمها، فإن لم يمكن خطب بغيرها، هذا إذا كان القوم عرباً، أما إن كانوا عجماً فإنه لايشترط اداء أركانهما بالعربية مطلقاً، ولو أمكنه تعلمها ماعدا الآية، فإنه لابدأن ينطق بها بالعربية، الا اذا عجز عن ذلك، فإنه يأتى بدلها بذكر أو دعاء عربي، فان عجز عن هذا ايضاً فعليه ان يقف بقدر قراءة الآية، ولا يترجم، وأما غير اركان الخطبة فلا يشترط لها العربية بل ذلك سنة۔

المالكية: قالوا: يشترط فى الخطبة ان تكون باللغة العربية، ولو كان القوم عجماً لايعرفونها، فإن لم يوجد فيهم من يحسن اللغة العربية بحيث يودى الخطبة بها سقطت عنهم الجمعة۔

(۳۵۱) خطبہ میں طہارت شرط نہیں

سوال...... ہمارے امام صاحب کچھ عرصے سے سلسل البول کے مرض میں مبتلا ہیں، اس سال عید کے روز لوگ دور دراز سے انکی تقریر سننے آگئے تو امام صاحب نے کہا کہ میں معذور ہوں لہٰذا نماز انکے بیٹے نے پڑھائی اور انہوں نے صرف خطبہ دیا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ معذور شخص خطبہ دے سکتا ہے؟ کیا خطبہ کیلئے طہارت ضروری ہے؟ نیز جو شخص خطبہ دیگا وہی نماز پڑھائیگا یا نہیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... خطبہ کیلئے طہارت شرط نہیں بلکہ سنت ہے، اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے خطبہ دیدے تو خطبہ تو ہو جائیگا لیکن مکروہ ہوگا، لہٰذا معذور شخص بوجہ کراہت کے صرف تقریر کر لے خطبہ نہ دے بلکہ خطبہ اور نماز کوئی اور پڑھا لے نیز خطبہ ایک شخص دے اور نماز دوسرا شخص پڑھادے تو یہ بھی جائز ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک ہی شخص خطبہ بھی دے اور نماز بھی پڑھائے۔

لما فی الھندیۃ(۱/۱۴۶) واما سننہا فخمسۃ عشر احدھا الطھارۃ حتی کرھت للمحدث والجنب۔

وفیہ ایضاً(۱/۱۴۷): ولا ینبغی ان یصلی غیر الخطیب۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳۵۲) خطبہ میں ''السلطان المسلم الخ'' کے الفاظ پڑھنے کی ابتداء اور شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر خطیب خطبہ میں السلطان المسلم ظل اللہ فی الارض من اھان سلطان اللہ فی الارض اھانہ اللہ کے الفاظ پڑھتے ہیں تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کہیں سے ثابت نہیں، خلفاء راشدین کے بعد کے بادشاہوں کے من گھڑت ہیں، انہوں نے اپنی عزت کرانے کیلئے خطبہ میں ان الفاظ کو شامل کیا ہے، تو اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ کا ثبوت کہاں سے ہے اور کب یہ خطبہ میں شامل کئے گئے نیز آج کل کے دور میں ان کا خطبہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ موجودہ دور کے حکمران ان کو اپنے حق میں لیتے ہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورتِ مسئولہ میں مذکورہ الفاظ بادشاہوں کے من گھڑت نہیں بلکہ دو مختلف احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں۔ ہمیں تتبع بسیار کے بعد یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ الفاظ خطبہ میں کب شامل کئے گئے البتہ موجودہ دور میں بھی ان الفاظ حدیث کو خطیب خطبہ میں پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ ظالم اور جابر بادشاہ جس سے دین اسلام کو نقصان اور کفر کو فائدہ ہو رہا ہو تو وہ اس حدیث کا مصداق ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس حدیث کو اپنے حق میں مراد لے۔ کیونکہ اہانت سے مراد جائز امور میں سلاطین کی نافرمانی کرنا ہے۔ لہٰذا ناجائز امور میں ان کی فرمانبرداری جائز ہی نہیں ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم (۲/۱۲۵): عن ابن عمر عن النبی ﷺ انہ قال علی المرأ المسلم السمع والطاعۃ فیما أحب وکرہ الاأن یؤمر بمعصیۃ فاذا أمر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔

وفی الجامع للإمام الترمذی (۲/۴۲): عن زیاد بن کسب العدوی قال کنت مع أبی بکرۃ تحت منبر

ابن عامر وھو یخطب وعلیه ثیاب رقاق فقال ابو بلال انظروا الی امیرنا یلبس ثیاب الفساق فقال ابوبکرۃ اسکت فسمعت رسول اللہ ﷺ یقول من أھان سلطان اللہ فی الارض اھانه اللہ۔

(۳۵۳) دورانِ خطبہ چندے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطبہ کے دوران چندہ مانگنا کیسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے، مسئلے کو وضاحت سے تحریر فرمائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جب امام خطبہ شروع کردے تو تمام نمازیوں کو چاہیئے کہ خاموشی کے ساتھ خطبہ سنیں کیونکہ خطبہ سننا واجب ہے اور خطبہ سننے میں خلل ڈالنے والے تمام کاموں سے اجتناب کریں کیونکہ دوران خطبہ ایسے کاموں کا کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا دورانِ خطبہ چندہ نہ کیا جائے کیونکہ اس سے خطبہ سننے میں خلل ہوگا۔ مصالح مسجد کیلئے چندہ کرنا ہو تو خطبہ سے پہلے یا نماز کے بعد کیا جائے البتہ اگر لوگوں کا مسجد میں جمع ہونا وقت خطبہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ممکن نہ ہو، اور مسجد کیلئے چندہ کی بھی اشد ضرورت ہو تو ایسی صورت میں دوران خطبہ چندہ کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ خطبہ سننے میں مخل نہ ہو۔

لما فی الترمذی(۱/۱۱۴): عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال من قال یوم الجمعۃ والامام یخطب انصت فقد لغا۔

وفی سنن ابی داؤد(۱/۱۵۹): عن ابی الزاھریۃ قال کنا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی ﷺ یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبداللہ بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی ﷺ یخطب فقال له النبی ﷺ إجلس فقد اٰذیت۔

وفی سنن النسائی(۱/۱۵۸): (باب حث الامام علی الصدقۃ یوم الجمعۃ فی خطبته) عن عیاض بن عبداللہ قال سمعت ابا سعید الخدری (رضی اللہ عنه) یقول جاء رجل یوم الجمعۃ والنبی ﷺ یخطب بھیأۃ بذّۃ فقال له رسول اللہ ﷺ اصلیت قال لا قال صل رکعتین وحث الناس علی الصدقۃ فالقوا ثیاباً فاعطاہ منھا ثوبین فلما کانت الجمعۃ الثانیۃ جاء ورسول اللہ ﷺ یخطب فحث الناس علی الصدقۃ فالقی احدثوبیه فقال رسول اللہ ﷺ جاء ھذا یوم الجمعۃ بھیأۃ بذّۃ فامرت الناس بالصدقۃ فالقوا ثیاباً فامرت له منھا بثوبین ثم جاء الآن فامرت الناس بالصدقۃ فالقی احدھما فانتھرہ وقال خذ ثوبك۔

وفی حاشیته (قوله صل رکعتین) قیل امرہ لیری الناس ھیئته فیترحمون علیه لکن مقتضی السوال

بقوله اصليت الخ انه ماقصد بالامر ذلك ثم كلامه ﷺ وكذا كلام المجيب ليس من باب الكلام حالة الخطبة فلا يشمله النهى لان الامام اذا شرع فى الكلام فما بقيت الخطبة تلك الساعة كذا قال السندى قلت والظاهر انه ﷺ امره ليرى الناس هيئته يدل عليه حثه ﷺ بالصدقة۔

(۳۵۴) خطبہ جمعہ کے علاوہ اس سے پہلے کی جانے والی تقریر کی شرعی حیثیت

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن بہت سے ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ پہلے ایک شخص منبر کے علاوہ دوسری جگہ کھڑا ہو کر خطبہ دیتا ہے یہ خطبہ اسلامی احکام کے بجائے عام طور پر وہاں کے مسلمانوں کے مسئلے مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ میں دنیاوی باتیں کی جائیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور حضور ﷺ سے لے کر ہمیشہ دنیاوی باتیں بھی مسجدوں میں زیر بحث آتی رہی ہیں جب پہلا شخص تقریر ختم کرتا ہے تو دوسرا شخص جو امام ہوتا ہے وہ بھی خطبہ دیتا ہے اور نماز پڑھاتا ہے یہ عام طور پر امریکہ، کینیڈا اور یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی کسی حد تک یہ طریقہ رائج ہے مگر یہاں عام طور پر امام نہیں بدلتا ہے، شرعی حکم بتا کر ممنون فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

الجواب بعون الملک الوھاب...... جمعہ کا خطبہ واجبہ اصلاً تو وہی عربی خطبہ ہے جو کہ دوسری اذان کے متصل بعد دیا جاتا ہے اور اسی خطبہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس میں دنیاوی باتیں اور نماز جائز نہیں ہے البتہ عرب ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں چونکہ لوگ عربی کو نہیں سمجھتے اور خطبہ کا ایک مقصد وعظ ونصیحت بھی ہے لہٰذا اگر پہلی اذان کے بعد مقامی زبان میں بیان کیا جائے اور وعظ ونصیحت کیا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے۔

لما فی المستدرك على الصحيحين (۱/۱۹۰): أخبرنا أحمد بن سلمان الفقيه------- كان ابوهريرة رضی اللہ عنہ يقوم يوم الجمعة الى جانب المنبر فيطرح اعقاب نعليه فى ذراعيه ثم يقبض على رمانة المنبر يقول قال ابو القاسم ﷺ قال محمد ﷺ قال رسول الله قال الصادق المصدوق ﷺ ثم يقول فى بعض ذلك، ويل للعرب من شرٍ قد اقترب فاذا سمع حركة باب المقصورة بخروج الامام جلس۔

وفى المصنف لعبدالرزاق(۳/۲۱۹): عبدالرزاق عن معمر عن الزهرى قال اوّل من قصّ تميم الدارى على عهد عمر استأذ نه فى كل جمعة مقاماً فاذن له فكان يقوم قال: ثم استزاده مقاما آخر فزاده، فلما كان عثمان استزاده مقاما آخر فكان يقص فى الجمعة ثلاث مرات قال معمر وسمعت غير الزهرى يقول كان عمر اذا مرّ به وهو يقصّ امر على حلقه السيف۔

(۳۵۵) جمعہ کی تقریر اگر جمعہ کی سنتوں میں مخل ہو تو سنتوں کو کب ادا کیا جائیگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور نماز جمعہ فیکٹری میں واقع جامع مسجد میں ادا کرتا ہے۔ نماز جمعہ اور کھانے کیلئے ایک بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ جبکہ نماز جمعہ کی جماعت ایک بج کر پینتالیس منٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ زید پہلے کھانا کھاتا ہے اور پھر مسجد میں نماز پڑھنے آجاتا ہے۔ اس وقت سوا ایک بج رہا ہوتا ہے یا ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے ہوتے ہیں۔ مسجد میں امام صاحب تقریر جمعہ سوا ایک بجے شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ اب زید سنتِ جمعہ جب ادا کرتا ہے تو جمعہ کی تقریر سنت میں مخل ہوتی ہے اور سنت پڑھنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ تو کیا زید سنتِ جمعہ دورانِ تقریر ادا کرے یا بعد جمعہ ادا کرے؟ واضح رہے کہ زید کی ڈیوٹی ٹائم دو بجے پھر شروع ہو جاتی ہے اور بعد جمعہ وقت کی تنگی کی وجہ سے سنت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت دیا جاتا ہو، تو تقریر کے بعد سنت ادا کرے، اور یہی طریقہ بہتر ہے۔ اس لئے امام کو چاہیئے کہ تقریر کے بعد سنت ادا کرنے کا وقت دیا کریں ورنہ سنت میں خلل واقع ہونے یا سنت میں تاخیر کی وجہ سے امام گنہگار ہوگا۔ اور مقتدیوں کو چاہیئے کہ اس بات کی اصلاح کریں۔ اور اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت نہ ہو تو پھر مسجد سے باہر کسی جگہ میں سنت ادا کرلے تاکہ سنت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور اگر ایسی جگہ بھی نہ ہو کہ وہاں آرام سے سنتیں ادا کی جائیں تو پھر سنتیں تقریر کے دوران مسجد ہی میں پڑھی جائیں۔

لمافی الشامیة (۴۷۴/۱): و تارکھا یستوجب اساءۃ: ای التضلیل واللوم: وفی التلویح ترك السنة المؤکدۃ قریب من الحرام، وقد یوفق بأن مرادھم بالکراھه التحریمیة ... قلت: لکن کونه سنة مؤکدۃ لایستلزم الاثم بترکه مرۃ واحدۃ بلاعذر، فیتعین تقیید الترك بالاعتیاد والاصرار توفیقا بین کلامھم۔ کما قدمناہ۔

(۳۵۶) آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے دورِ حاضر میں جمعہ کی شرائط

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا بسا اوقات جماعت تبلیغ کا سفر ہوتا ہے اور بعض اوقات سندھ، بلوچستان تشکیل ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ جماعت جب وہاں پہنچتی ہے تو اگر کوئی عالم صاحب جماعت میں ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ جمعہ پڑھاؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں تو شرائط ہی پوری نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ

(۱)۔ ہم نے پوچھا ہے مفتیوں سے کہ جہاں پہلے سے (پاک وہند کی تقسیم سے پہلے سے، یا بعد میں بھی) جمعہ شروع ہو چکا ہے وہاں جمعہ بند نہ کیا جائے اور نئی جگہ جہاں شرائط نہ ہوں وہاں شروع نہ کیا جائے۔ گاؤں کے لوگ پورا ہفتہ نمازوں کیلئے نہیں آتے۔ صرف ایک دن جمعہ کے عنوان سے آتے ہیں اگر جمعہ بند ہو گیا تو یہ اس دن بھی نہ آئیں گے۔ اس بہانے چلو مسجد میں آتو جاتے ہیں اور

خطبہ سے پہلے بیان بھی سن لیتے ہیں شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔چلو نمازِ جمعہ نہ ہوتی ہو۔اگر ظہر پڑھیں تو بھی وہ نہ آئیں گے۔ جمعہ میں فائدہ ہی ہے نا۔گاؤں والے یہ دلائل بیان کرتے ہیں۔اس صورت حال میں کہ وہاں جماعت والے کیا کریں ان کو سمجھائیں تو مقامی علماء جن کا فتوی ان کے پاس ہے اس سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور اگر پڑھائیں تو کیسے؟ آپ سے راہنمائی طلب کی جاتی ہے۔

(۲)۔اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے کیا ہیں؟

(۳)۔کیا جمعہ کی شرائط میں موجودہ دور میں بھی سلطان اور قاضی کی شرط ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ موجودہ دور میں تو ناظم، نائب ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔

(۴)۔جمعہ سلطان قائم کرتا ہے جبکہ آجکل تو امام مسجد ہی پڑھاتے ہیں۔آپ پورے مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جمعہ کے درست ہونے کیلئے شہر یا قصبہ ہونا ضروری ہے جس میں تمام حوائج اصلیہ پورے ہوں وہاں گلی کوچے ہوں محلے ہوں، ضروریات ہمیشہ میسر ہوں۔حکیم یا ڈاکٹر ہو، ڈاکخانہ ہو، حاکم یا پنچایت کا انتظام ہو، ضروری پیشہ ور موجود ہوں۔مذکورہ سہولیات جتنی تعداد کی آبادی میں میسر ہوں وہاں جمعہ درست ہے تعداد کی متعین مقدار منقول نہیں ہے۔

(۱)۔لہٰذا جہاں ان شرائط کے فقدان کے باوجود جمعہ شروع کیا گیا وہاں نماز جمعہ ادا نہیں ہوگی بلکہ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے اور صرف انتشار کے خوف سے یا یہ کہ لوگ پھر مسجد آنا چھوڑ دیں گے خروج عن المذہب درست نہیں بلکہ لوگوں کو حکمت و مصلحت سے سمجھائیں اور ظہر کی نماز پڑھنے کیلئے تیار کریں۔

(۲)۔اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے وہی ہیں جو کہ اوپر مذکور ہیں۔

(۳)۔جمعہ کی شرائط میں سلطان اور قاضی کی جو شرط رکھی گئی تھی وہ رفع منازعت کیلئے تھی لیکن اگر سلطان اور قاضی ان امور میں سستی سے کام لیتے ہیں جیسا کہ آجکل ہے تو پھر لوگ جس امام پر متفق ہو جائیں وہی نماز جمعہ پڑھائے اور سلطان یا قاضی کی اجازت ضروری نہیں۔

(۴)۔آجکل کے حکمران چونکہ دینی امور میں سستی سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان میں امامت کی شرائط نہیں پائی جاتیں لہٰذا امام مسجد ہی نماز جمعہ پڑھائے۔

لما فی احکام القرآن للجصاص(۴۴۵/۳): إتفق فقهاء الأمصار على أن الجمعة مخصوصة بموضع لايجوز فعلها فی غيره لأنهم مجمعون على أن الجمعة لاتجوز فی البوادی ومناهل الأعراب فقال أصحابنا هی مخصوصة بالامصار ولاتصح فی السواد... قال أبو بكر روى عن النبی ﷺ أنه قال لا جمعة ولا تشريق إلا فی مصر جامع وروى عن على مثله وايضاً لو كانت الجمعة جائزة فی القرى لو رد النقل به متواترا كوروده فی الأمصار لعموم الحاجة إليه وايضاً لما اتفقوا على امتناع جوازها فی البوادی لأنها ليست بمصر وجب مثله فی السواد وروى أنه قيل للحسن أن الحجاج

أقام الجمعة بالأهواز فقال لعن الله الحجاج يترك الجمعة فى الأمصار ويقيمها فى حلاقيم البلاد۔

وفى الفقه النافع(۱/۲۷۴):لاتصح الجمعة إلافى مصر جامع للحديث لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا فى مصر جامع ويجوز فى مصلى المصر لإتصاله به ولا يجوز فى القرى ولا تجوز إقامتها إلا للسلطان أو من أمره السلطان لأن كل واحد يتقدم أو يقدم رجلا فيؤدى إلى المنازعة المبطلة للجمعة۔

وفى الشامية(۲/۱۳۸): وعبارة القهستانى تقع فرضاً فى القصبات والقرى الكبيرة التى فيها أسواق ... وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز فى الصغيرة التى ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما فى المضمرات والظاهر أنه اريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة الا ترى أن فى الجواهر لوصلوا فى القرى لزمهم أداء الظهر۔

وفى الدر المختار مع الشامية(۲/۱۴۳): (ونصب العامة) الخطيب (غير معتبر مع وجود من ذكر) أمامع عدمهم فيجوز للضرورة۔ وفى الشامى تحت (قوله فيجوز للضرورة) ومثله مالومنع السلطان أهل مصر أن يجمعوا إضراراً وتعنتاً فلهم أن يجمعوا على رجل يصلى بهم الجمعة۔

وفى الشامية تحته: (قوله مالو منع السلطان الخ) ونقل شيخنا عن عقد اللآلى أنه لو تعذر الا ستئذان من السلطان كما فى هذا الزمان من عدم إلتفات السلاطين لمثل تلك الأمور فاجتمعت الناس على شخص ليصلى بهم جاز۔

(۳۵۷) جمعہ کی نماز کی صحت کیلئے شہر ہونا ضروری ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی نماز کی صحت کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ شہر ہو۔ شہر کی تعریف کیا ہے؟ علامہ شامی رحمہ اللہ نے مسجد میں افراد کے سماجانے کے اعتبار سے شہر ہونے کا قول بھی ذکر کیا ہے کیا یہ قول لینا زیادہ بہتر نہیں؟ اس میں توسیع زیادہ ہے۔ بنسبت دوسری شرائط والے قول کو لینا اس میں تعین مشکل ہوتا ہے۔ ازراہِ کرم جمعہ کے گاؤں میں یا شہر میں احکام اور شہر کے تعین میں راجح قول کا تعین کردیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......احناف کے نزدیک اصح قول کے اعتبار سے شہر اس علاقے کو کہا جائے گا، جہاں پر گلی کوچے ہوں، محلے ہوں، بازار ہوں جہاں پر ضروریات کی اشیاء ہر وقت میسر ہوں، آس پاس کے دیہات والے بھی ان سے اپنی ضروریات پوری کرتے ہوں ڈاکٹر یا حکیم ہو، ضروری پیشہ ور ہوں حاکم یا پنچائیت کا انتظام ہو تا کہ علاقے والے اپنی مشکلات میں اس کی طرف رجوع کریں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے مسجد میں افراد سما جانے کے اعتبار سے شہر ہونے کا قول نقل کیا ہے۔لیکن شرح المنیہ کے حوالے سے صاحب ہدایہ کے قول کی ترجیح نقل کی ہے۔

باقی سوال میں مذکورہ تعریف میں کئی وجوہات سے سقم پایا جاتا ہے۔(۱) مذکورہ قول میں کوئی تعین نہیں ہے کہ وہ مسجد کتنی وسیع ہونی چاہیے۔(۲) اگر اس قول پر عمل کیا جائے تو بہت سارے شہر بھی شہر کی تعریف سے خارج ہوجائیں گے کیونکہ عموماً شہروں کی مساجد نمازیوں کی تعداد سے زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔اور بہت سارے دیہات شہر کے حکم میں داخل ہوجائیں گے۔کیونکہ بعض بستیوں میں مساجد بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔تو اس قول پر عمل کرنے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی بستیوں میں، جہاں پر سو دو سو افراد ہوں وہاں پر تو جمعہ پڑھنا جائز ہوگا اور بڑے بڑے شہروں میں جہاں پر ہزاروں کی تعداد میں نمازی ہوں وہاں پر جمعہ کی ادائیگی درست نہیں ہوگی، جو کہ نزاع کا سبب بن سکتا ہے۔

(۳)۔آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے مبارک دور سے آج تک مسجد نبوی اور مسجد حرام میں جمعہ پڑھا یا جارہا ہے۔حالانکہ مذکورہ قول کے اعتبار سے ان مساجد میں بھی جمعہ پڑھنا درست نہیں ہوگا جو کہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔اور اگر صاحب ہدایہؒ کے قول پر عمل کیا جائے تو مذکورہ خرابی لازم نہیں آتی۔جبکہ اس تعریف کی شرائط اور علاقے کی نوعیت دیکھ کر شہر کی تعیین کرنا مشکل بھی نہیں ہے۔

لمافی التاتارخانیة، شرائط الجمعه، (۴۹/۲) مکتبه ادارة القرآن: وفی التحفة: وروی عن ابی حنیفة وهو بلدة کبیرة فیها سکك واسواق ولهارساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره ویرجع الناس الیه فیما وقع لهم من الحوادث وهذا هو الاصح۔

وفی الشامیة ، باب الجمعة، (۱۳۷/۲) (مکتبه سعید):قوله (وظاهر المذهب إلخ) قال في شرح المنية والحد الصحيح ما اختاره صاحب الهداية أنه الذي له أمير وقاض ينفذ الأحكام ويقيم الحدود وتزييف صدر الشريعة له عند اعتذاره عن صاحب الوقاية حيث اختار الحد المتقدم بظهور التواني في الأحكام مزيف بأن المراد القدرة على إقامتها على ما صرح به في التحفة عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس إليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح اه إلا أن صاحب الهداية ترك ذكر السكك والرساتيق لأن الغالب أن الأمير والقاضي الذي شأنه القدرة على تنفيذ الأحكام وإقامة الحدود لا يكون إلا في بلد كذلك اه قوله (له أمير وقاض) أي مقيمان فلا اعتبار بقاض يأتي أحيانا يسمى قاضي الناحية ولم يذكر المفتي اكتفاء بذكر القاضي لأن القضاء في الصدر الأول كان وظيفة المجتهدين حتى لو لم يكن الوالي والقاضي مفتيا اشترط المفتي كما في الخلاصة۔

(۳۵۸) گاؤں میں ۴۰، ۵۰ سال سے جاری جمعہ موقوف کرنے پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو کیا کرے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں صوبہ سرحد ضلع کوہاٹ کے نواح میں پنڈی روڈ پر واقع ہے جس کی آبادی تقریباً 1500 کے لگ بھگ ہے جس میں ضروریات زندگی کیلئے چھ دوکانیں، ایک میڈیکل کلینک، ایک موچی کی اور ساتھ ہی ایک ٹیلرز کی دوکان بھی ہے۔ تین مسجدیں جن میں سے دو میں نمازیں ہوتی ہیں اور ایک بالکل ویران ہے۔ اور گاؤں میں گاڑیوں کی سہولت کے ساتھ فون کی سہولت بھی میسر ہے اور اس کے علاوہ آٹے کی مشینیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود اکثر ضروریات زندگی کیلئے شہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مریضوں کو شہر لے جایا جاتا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس گاؤں میں تقریباً ۴۰۔۵۰ سال سے جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں، آیا اس گاؤں میں جمعہ کی نماز کے بارے میں کیا حکم ہے ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض مفتیان صاحبان نے عدم جواز کا حکم دیا ہے جبکہ اس کے روکنے میں فتنہ اور فساد کا قوی اندیشہ ہے اس لئے کہ اس گاؤں میں فرقہ مخالف کے لوگ (یعنی بریلوی حضرات) موجود ہیں اگر اس کو روکا جائے اگرچہ روکنا ممکن نہیں لیکن بالفرض پھر بھی اگر روکا جائے تو فرقہ مخالف والے اپنی مسجد میں جمعہ شروع کردیں گے جس سے مزید فتنہ اور فساد پھیلنے کا سخت اندیشہ ہے، اس کا خیال رکھتے ہوئے اس مذکورہ مسئلے کا تفصیلی جواب ارسال کر کے احسان فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں نمازِ جمعہ ادا کی جارہی ہے شہر ہو، اور شہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہزاروں کے لگ بھگ لوگ بستے ہوں، مختلف محلے اور بازار ہوں، ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے سہولیات میسر ہوں، لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ اس جگہ پر جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے شہر کی تعریف صادق نہیں آتی جیسا کہ سوال سے واضح ہے۔ اس لئے وہاں جمعہ کی نماز از روئے فقہ حنفی جائز نہیں ہے۔

(۲)...... اگر نماز جمعہ کی ادائیگی سے روکنے میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہو تو اس صورت میں حکومتِ وقت یا اُس کے نائب سے اجازت لے کر نمازِ جمعہ کی ادائیگی جائز ہوجائے گی۔

لما فی المصنف لعبد الرزاق(۱۶۷/۳): عن الحارث عن علی قال: لاجمعة ولاتشریق الا فی مصر جامع۔

وفی الدر المختار(۱۳۸/۲): وفی القهستانی: اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقاً علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحکم صار مجمعاً علیه فلیحفظ۔

(۳۵۹) چھوٹی بستی میں قائم نماز جمعہ کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں تقریباً پندرہ بیس سال سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً بالغ افراد ۳۵۰ ہوں گے اور ۱۱۰ گھر ہیں۔ اور دو دکانیں ایک پی سی او، ایک میڈیکل اسٹور اور پن چکی ہیں، نیز لڑکوں کا ہائی اسکول اور لڑکیوں کا مڈل اسکول بھی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ

(۱)۔ کیا مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲)۔ بصورت عدم جواز کیا اس نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کرنا درست ہے یا منع نہ کیا جائے۔ جبکہ اس ممانعت میں لوگوں کے انتشار کا خوف اور اندیشہ ہو۔ تو کیا ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں؟

(۳)۔ بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کفایت المفتی وغیرہ میں توسع سے کام لیا ہے۔ تو کیا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست ہے؟ جبکہ اس صورت میں چند خرابیاں لازم آتی ہیں جیسے کہ احسن الفتاویٰ میں مذکور ہیں۔

۱) نفل کی جماعت کا التزام لازم آتا ہے۔ ۲) نفل نہار میں جہر۔ ۳)۔ غیر لازم کا التزام۔ ۴) ترک جماعت نماز ظہر جبکہ جمعہ درست نہ ہو۔ ۵)۔ اگر کوئی ظہر نہ پڑھے تو ترک فریضہ لازم آتا ہے جو کہ فسق ہے۔

نیز احتیاطاً ظہر اداء کرنا کیسا ہوگا جائز یا ناجائز؟ قرآن وسنت اور فقہ حنفی سے مدلل جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب…… جمعہ کے واجب ہونے کیلئے شہر کا ہونا شرط ہے۔ قصبات اور بڑی بستیاں بھی شہر کے حکم میں ہیں۔ قصبہ اور بڑی بستی کی فقہاء کرام نے مختلف علامات بیان کی ہیں۔ جیسا کہ بدائع میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

(۱)۔ صورت مسئولہ میں، چونکہ آپ کے گاؤں میں ان علامات میں سے کوئی علامت موجود نہیں ہے لہٰذا یہ بڑی بستی میں داخل نہیں ہے بلکہ قریہ صغیرہ (چھوٹی بستی) ہے اور چھوٹی بستی میں باتفاق فقہاءِ احناف جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ ادا کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر حاکم اجازت دے دے تو پھر جمعہ درست ہوسکتا ہے۔

(۲)۔ بحالت موجودہ، جب جمعہ درست نہیں ہے تو لوگوں کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کیا جائے۔ اس لئے کہ جمعہ کے ادا کرنے سے ظہر کی نماز ذمہ سے ساقط نہ ہوگی بلکہ ظہر کا ادا کرنا لازم ہوگا۔ ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست نہیں ہے اس لئے کہ مذہبِ غیر پر فتویٰ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور اس مسئلہ میں حنفیہ کو بمذہب دیگر ائمہ عمل کرنے کی فقہاء نے اجازت نہیں دی۔

(۳)۔ اور کفایت المفتی میں جواز کے بارے میں توسع سے کام لینا حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتی رائے اور تفرد ہے۔ حضرت کے علاوہ کسی نے بھی جواز کا قول نہیں کیا ہے بلکہ سب عدم جواز کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست نہیں ہے۔

رہا احتیاط الظہر کا مسئلہ! تو اس کا پڑھنا وہاں ہوتا ہے جہاں جمعہ کے جواز میں شہر وغیرہ ہونے یا نہ ہونے میں شک واقع ہو جائے اور وہاں کے لوگوں نے جمعہ قائم کرنا شروع کر دیا ہو، جبکہ یہاں پر یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا گاؤں شہر یا بڑی بستی نہیں ہے بلکہ چھوٹی بستی ہے لہٰذا ظہر کی نماز ہی پڑھی جائے گی۔

لمافی الفقه النافع (۱/۲۷۴): لاتصح الجمعة الافی مصر جامع للحديث: ((لاجمعة ولا تشريق (ولا فطر ولا اضحی) الافی مصر جامع)) ويجوز فی مصلی المصر لاتصاله به ولا يجوز فی القری۔

وفی بدائع الصنائع(۲/۱۹۰،۱۸۹،۱۸۸): اما المصر الجامع: فشرط وجوب الجمعة، وشرط صحة ادائها عند اصحابنا... فلا تجب علی اهل القری التی ليست من توابع المصر، ولا يصح اداء الجمعة فيها ...(ص۱۸۹) اما المصر الجامع: فقد اختلفت الاقاويل فی تحديده۔ ذكر الكرخی ان المصر الجامع ما اقيمت فيه الحدود. ونفذت فيه الاحكام۔ وعن ابی يوسف روايات، ذكر فی ''الاملاء'': كل مصر فيه منبر وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود، فهو مصر جامع، تجب علی اهله الجمعة۔ وفی رواية: قال: اذا اجتمع فی قرية من لايسعهم مسجد واحد۔ بنی لهم الامام جامعا، ونصب لهم من يصلی بهم الجمعة۔ وفی رواية: ((لو كان فی القرية عشرة آلاف اواكثر۔ امرهم باقامة الجمعة فيها)) وقال بعض اصحابنا: المصر الجامع مايتعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة الی سنة، من غير ان يحتاج الی الانتقال الی حرفة اخری۔ وعن ابی عبدالله البلخی، انه قال: احسن ما قيل فيه: اذا كانوا بحال لو اجتمعوا فی اكبر مساجد هم لم يسعهم ذلك، حتی احتاجوا الی بناء مسجد الجمعة. فهذا مصر تقام فيه الجمعة، وقال سفيان الثوری: المصر الجامع مايعده الناس مصرا عند ذكر الامصار المطلقة۔ وسئل ابو القاسم الصفار عن حد المصر الذی تجوز فيه الجمعة، فقال: ان تكون لهم منعة لوجاء هم عدو قدروا علی دفعه، فحينئذ جاز ان يمصر، وتمصره ان ينصب فيه حاكم عدل يجری فيه حكما من الاحكام، وهو ان يتقدم اليه خصمان فيحكم بينهما و روی عن ابی حنيفة رحمه الله : انه بلدة كبيرة، فيها سكك واسواق، ولهارساتيق، وفيها وال يقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره، والناس يرجعون اليه فی الحوادث، وهو الاصح۔

وفی الدر المختار(۲/۱۳۷):(ويشترط لصحتها) سبعة اشياء: الاول: (المصر وهو مالايسع اكبر مساجده اهله المكلفين بها) وعليه فتوی اكثر الفقهاء مجتبی لظهور التوانی فی الاحكام، وظاهر المذهب انه كل موضع له امير وقاض يقدر علی اقامة الحدود كما حررناه فيما علقناه علی الملتقی۔

وفی القهستانی: اذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقا علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه فليحفظ۔ وقال العلامة ابن عابدين الشامی رحمه الله تحته (قوله وفی القهستانی الخ) تأييد للمتن۔ وعبارة القهستانی تقع فرضافی القصبات والقری الكبيرة التی فيها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالی او القاضی ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه، وفيما ذكرنا اشارة الی انه لا تجوز فی الصغيرة التی ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كمافی المضمرات والظاهر انه اريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة، الاتری ان فی الجواهر لوصلوافی القری لزمهم اداء الظهر الخ۔

وفی الصفحة ۱۴۵ من باب الجمعة: فيصلی بعدها اخر ظهر وكل ذلك خلاف المذهب، فلا يعول عليه كما حرره فی البحر۔ وقال العلامة الشامی تحته (قوله فيصلی بعدها اخرظهر)... وقال فی البحر: انه لا احتياط فی فعلها لانه العمل باقوی الدليلين اه اقول : وفيه نظر بل هو الاحتياط بمعنی الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوی دليلا، لكن فيه شبهة قوية لان خلافه مروی عن ابی حنيفة ايضا...(ص۱۴۶) نعم ان ادی الی مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسی نحن لانامر بذلك امثال هذه العوام بل ندل عليه الخواص ولو بالنسبة اليهم اه والله تعالیٰ اعلم۔

(۳۶۰) گاؤں میں نمازِ جمعہ درست نہیں

سوال.....کیافرماتے ہیں علماءکرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جوازصلوٰۃ الجمعہ کے بارے میں درج ذیل صفات سے موصوف بستی کان مہترزئی جوکہ پہاڑ کے دامن میں کوئٹہ، ژوب شاہراہ پر واقع ہے بلوچستان کے سردترین علاقوں میں سے ہے اور سردیوں میں کافی برف باری ہوتی ہے۔قریہ ہذا تقریباًایک مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے۔جن میں کل ۳۹۳ گھر جن میں ۱۶ مساجد ہیں۔اورگاؤں کے وسط میں ایک بڑی پکی مسجد جس کی لمبائی ۹۱ فٹ اور چوڑائی ۴۵ فٹ ہےتعمیر کی گئی ہے۔اوران میں بالغ مردکی تعداد ۱۴۵۴، بالغ عورتیں ۱۳۷۷، اورنابالغ بچوں کی تعداد ۲۲۸۵ ہے۔کہیں کہیں گھروں میں اتصال اورگلیاں موجودہیں۔لیکن اکثر جگہوں پرگلیاں اورکوچےنہیں باغات اورزرعی زیرکاشت رقبہ گھروں کےدرمیان فاصل بن رہاہے۔دوتین گھروں کےعلاوہ تمام مکانات کچی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔پندرہ سےبیس گھروں کے مکانوں کی چھت سٹیل کی چادراور باقی مکانوں کی چھت جڑی بوٹیوں کی بنی ہوئی ہے۔ اراضی کے سیرابی باغات کیلئے ایک قدرتی چشمہ بہتاہےجس کے پانی کے لئے نالیاں بستی کے وسط تک پکی بنائی گئی ہیں۔اور

اس کے علاوہ دوسو سے زائد ٹیوب ویل سیرابی باغات کیلئے مصروف عمل ہیں۔ بستی میں تین دینی مدارس ہیں جن میں مقامی اور باہر کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ لڑکوں کی عصری تعلیم کیلئے ایک ہائی اسکول اور پانچ پرائمری اسکول ہیں۔ جبکہ لڑکیوں کیلئے ایک ہائی اسکول اور تین پرائمری گرلز اسکول ہیں۔ اور عوام کی سہولت کیلئے ایک ہزار لائن کا ڈیجیٹل سسٹم ایکسچینج ہے جس سے تین سو کے قریب ٹیلیفون کنکشن لگے ہوئے ہیں۔

صحت کیلئے ایک ڈسپنسری بنائی گئی ہے۔ جس میں ایک مستند ایم بی بی ایس ڈاکٹر ایک LHV اور ڈسپنسر کام پر مامور ہیں۔ یہاں ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام نہیں اس لئے وہ ۲۵ کلومیٹر مسلم باغ سے آتا جاتا ہے۔ اور ایمبولینس بھی ساتھ رکھتا ہے لیکن ادویات کے فقدان کی وجہ سے کم لوگ اس سے استفادہ کررہے ہیں۔ بستی کے باشندوں کی ضروریات کیلئے آب نوشی سکیم کے تحت تین ٹیوب ویل حکومت کی طرف سے لگے ہوئے ہیں جو کہ اب معطل ہیں۔

بستی کے وسط میں پانچ سے زائد میڈیکل اسٹور ہیں جن میں ڈسپنسر لوگوں کے معمولی علاج معالجے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ادویات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پانچ دوکانیں گوشت کی اور تقریباً دس سے زائد سبزی فروش موجود ہیں ایک کشیدہ کاری اور پانچ درزی ٹیلرز دس پرچون اسٹورز ہیں جبکہ پانچ سے زائد گیس سلنڈر میں لاکر فروخت کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ کل تقریباً ۲۵ سے زائد دکان جن میں اتصال نہیں علاوہ ازیں بستی میں متفرق جگہوں پر عوام کی ضروریات کیلئے ۱۵ دکانیں اور ایک میڈیکل اسٹور ان میں تین آٹا فروش کی دکان موجود ہے۔ جن میں دوسابق راشن ڈیلر رہ چکے ہیں۔ لیکن مکمل ضروریات پورا کرنے کیلئے وہ اور بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ نیز آہنگر، دوحمام، موٹر سائیکل مرمت، ویلڈنگ، گاڑی مرمت کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور کپڑے کی دو دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور پیٹرول، ڈیزل کے تقریباً پانچ پمپ موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک بیکری اور دو چائے کے ہوٹل مستقل موجود ہیں۔ اور تین پی سی او موجود ہیں۔

جنوباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر قومی شاہراہ گزرتی ہے۔ جس پر موسم گرما میں عوام کی ضروریات کیلئے عارضی طور پر کریٹ گودام اور فروٹ کی ترسیلی کمپنیاں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ چند ہوٹل اور تندور بھی کھل جاتے ہیں۔ اور یہ چھ مہینے تک تقریباً کھلے رہتے ہیں۔ بستی سے ضرورت آمدورفت قومی شاہراہ سے بستی کی طرف مختلف فاصلوں پر کچی اور پکی سڑکیں جاتی ہیں۔ جن میں دو مستقل اور تین سیلاب نہ ہونے کی صورت میں سیلابی ندیاں بطور سڑک استعمال کی جاتی ہیں۔ نیشنل ہائی وے پر گاؤں کے زرعی آبادی کے متصل ایک لیویز تھانہ جو مذکورہ گاؤں کے نام سے موسوم ہے (اور پولیس تھانہ نہیں ہے) جو روڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں گاؤں میں مداخلت کرتے ہیں اور روڈ کے حفاظت کیلئے ایک اور لیویز چوکی موجود ہے اور یہ حکومت کو مطلع کرتی ہیں اور مذکورہ بستی سے روزانہ ایک بس اور دو ویگن کوئٹہ جاتی ہیں اور متعدد کار اور موٹر قریبی بازاروں میں جاتے ہیں۔ البتہ حکومت کی طرف سے عوام کے درمیان کوئی انصاف دار شخصیت نہیں اور اسی گاؤں کے علماء اور ملک وسردار یہ معاملے حل کرتے ہیں یا پچیس کلومیٹر دور بازار جاتے ہیں اور مذکورہ بستی میں ڈاکخانہ نہیں۔ دھوبی نہیں اور کسی نام سے موسوم گلی کوچے نہیں البتہ عرف میں کان مہترزئی ایک بڑے گاؤں کے نام

سے مشہور ہے۔ اورآس پاس کے لوگ بھی ضروریات کیلئے رجوع کرتے ہیں۔لیکن حکومت کی طرف سے اس کو شہر یا قصبہ نہیں کہا جاتا۔

بعض پیشے والے لوگ جیسے موچی، لوہار، ترکھان وغیرہ سال بھر کا گزارہ اپنے پیشے پر نہیں کر سکتے اس لئے وہ اور طرح کی محنت میں بھی مشغول ہوتے ہیں۔ اور صنعت وحرفت کیلئے بھی کام شروع ہے۔اور مسافر خانہ نہیں، مستقل ہوٹل کھانے کا نہیں، پولیس تھانہ نہیں۔ لہٰذا مذکورہ تفصیل کے مطابق بستی مذکورہ کان مہترزئی میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ بستی کا شمار شرعی قریہ کبریٰ ہے یا صغریٰ؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... جمعہ قائم کرنے کی شرائط میں سے شہر یا بڑی بستی (جس میں گلیاں، عدالت، حکومت کی طرف سے قاضی، مستقل پولیس تھانہ، بازار، محلے، ڈاکخانہ، حکیم یا ڈاکٹر، اور لوگوں کی تمام ضروریات زندگی سہولت کے ساتھ میسر ہوں) کا ہونا ضروری ہے۔ وگرنہ جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بستی کان مہترزئی کا شمار بڑی بستی میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر نہیں ہو سکتا اور وہ یہ ہیں کہ (۱) اکثر جگہوں میں گلیاں نہیں ہیں۔ (۲) عدالت نہیں ہے۔ (۳) حکومت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہیں ہے۔ (۴) مستقل پولیس تھانہ نہیں ہے۔ (۵) بازار، محلے، ڈاکخانہ، اور حکیم یا ڈاکٹر اس طور پر نہیں ہیں کہ ان سے لوگوں کی ضروریات سہولت کے ساتھ پوری ہو جائیں نیز ادویات کی فراہمی اور ایمرجنسی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ اور یہ ساری وجوہات ضرورت اصلیہ میں شامل ہیں۔ اسی بناء پر یہاں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔

لما فی مصنف عبدالرزاق (۱۶۷/۳): عن علی رضی الله تعالیٰ عنه قال: لاجمعة ولاتشریق الافی مصر جامع۔

وفی الفتاویٰ التاتارخانیة(۴۹/۲): ظاهر المذهب ان المصر الجامع ان یکون فیه جماعات الناس وجامع واسواق التجارات وسلطان وقاض یقیم الحدود وینفذ الاحکام... وروی عن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ وهو بلدة کبیرة فیها سکك واسواق ولهارساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره ویرجع الناس الیه فیما وقع لهم من الحوادث وهذا هو الاصح۔

وفی الشامیة (۱۳۷/۲): ''قوله وظاهر المذهب'' قال فی شرح المنیة والحد الصحیح ما اختاره صاحب الهدایة انه الذی له امیر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود .... عن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ انه بلدة کبیرة فیها سکك واسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح۔

وفیه ایضاً(۱۳۸/۲): قوله وفی القهستانی الخ تأیید للمتن وعبارة القهستانی تقع فرضا فی القصبات والقری الکبیرة التی فیها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالی او القاضی ببناء

المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فيه فاذا اتصل به الحكم صار مجمعا عليه وفيما ذكرنا اشارة الى انه لا تجوز فى الصغيرة التى ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كمافى المضمرات والظاهر انه اريد به الكراهة ... الا ترى ان فى الجواهر لو صلوا فى القرى لزمهم اداء الظهر وهذا اذا لم يتصل به حكم۔ وفى (ص۱۳۹) فقد نص الائمة على ان الفناء ما اعد لدفن الموتى وحوائج المصر كركض الخيل والدواب وجمع العساكر والخروج للرمى وغير ذلك واى موضع يحد بمسافة يسع عساكر مصر ويصلح ميدانا للخيل والفرسان ورمى النبل و البندق البارود واختيار المدافع...فظهران التحديدبحسب الامصار...وقد جزم فيها بصحة الجمعة فى مسجدسبيل علان الذى بناه بعض امراء زمانه وهو فى فناء مصربينه وبينها نحو ثلاثة ارباع فرسخ وشئ۔

وفى الموسوعة الفقهية(۲۳/۱۶۱): المصر فى اللغة: اسم لكل بلد محصور اى محدود تقام فيها الدور والاسواق والمدارس وغيرها من المرافق العامة ويقسم فيها الفئ والصدقات۔ واختلفوا فى معناها الاصطلاحى، فعن ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ: ان المصر بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره والناس يرجعون فى الحوادث اليه... وقال القليوبى: المصر العمارة المجتمعة الذى فيه حاكم شرعى وشرطى واسواق للمعاملات والمصر اعظم من القرية۔

(۳۶۱) جس عذر کی وجہ سے نمازِ جمعہ ترک کرنا جائز نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر بجلی وغیرہ کے بل کی آخری تاریخ آجائے اور دن جمعہ کا ہو، اور بل بھرنے کی قطار بھی کافی طویل ہو، اور جمعہ کی نماز پڑھنے جانے کی صورت میں نمبر نکل جانے اور پھر کافی مشقت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہو تو اس عذر کی بنا پر جمعہ کی نماز چھوڑنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز جمعہ ہر اس مسلمان مرد پر فرض ہے جس میں چند شرائط موجود ہوں، آزاد ہونا مقیم ہونا، تندرست ہونا، خوف کا نہ ہونا۔ اس لئے صورت مسئولہ میں نمازِ جمعہ مذکورہ عذر کی وجہ سے چھوڑنا جائز نہیں۔

لمافى الطحطاوى على الدر(۱/۳۴۵): (قوله فلا يكره) أى صلوة الظهروااما تفويت الجمعة فحرام. بحر:

وفى رد المحتار(۲/۱۵۵): (قوله وحرم الخ) عدل عن قول القدورى والكنز وكره لقول ابن الهمام

لابد من كون المراد حرم لانه ترك الفرض القطعي باتفاقهم الذى هو آكد من الظهر غير أن الظهر تقع صحيحة وان كان مأمورا بالإعراض عنها۔ وأجاب في البحر بان الحرام هو ترك السعي المفوت لها... (قوله فلا يكره) بل هو فرض عليه لفوات الجمعة قال في البحر فنفس الصلوة غير مكروهة وتفويت الجمعة حرام و هو مؤيد لما قلنا. يعني ان الكراهة ليست لذات الصلوة بل لخارج عنها وهو كونها سببا. لتفويت الجمعة بدليل انه لو صلاها بعد فوت الجمعة لم يكره فعلها بعدها بل يجب۔

(۳۶۲) عذر کی وجہ سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نمازِ جمعہ قائم کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز جو امریکہ میں ہیں ان سے بات ہوتی رہتی ہے۔انہوں نے میری وساطت سے ایک مسئلہ آپ حضرات سے معلوم کرایا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر ممالک میں مسجدیں جہاں بہت کم ہیں یا چھوٹی ہیں تو عام طوران مسجدوں میں نماز دوبار ہوتی ہے جو لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے سے ہوتی ہے ایک مسجد میں دوبارہ نماز جمعہ وخطبہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ براہ کرم مسئلہ کا جواب بحوالہ جلد مرحمت فرما کر ممنون ہوں، تاکہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں یا غلط کرتے ہیں وہ صحیح مسئلہ سے واقف ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جمہور حضرات فقہاء کے نزدیک مسجد کے اندر ایک نماز خواہ وہ جمعہ کی ہو یا کوئی اور اس کی جماعت ثانیہ مکروہ ہے۔البتہ اگر کوئی مسجد جو کسی راستے وغیرہ پر واقع ہو یا وہ مسجد ایسی ہو، جس میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں تو ایسی مساجد میں تکرار جماعت جائز ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں مساجد بہت کم ہیں یا بہت چھوٹی ہیں ان میں ایک ہی مرتبہ جماعت کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔وہ اس طرح کہ دوسری جماعت کی صورت پہلی جماعت سے کچھ مختلف ہو۔اس کی صورت یہ ہوگی پہلی جماعت جہاں ہوئی ہے دوسری جماعت اس سے ذرا ہٹ کر ادا کی جائے۔

لما في بدائع الصنائع(۱/۱۵۳): ولو صلى في مسجد باذان واقامة هل يكره أن يؤذن ويقام فيه ثانياً هذا لا يخلو من احد وجهين، اما ان كان مسجداً له اهل معلوم او لم يكن فان كان له أهل معلوم فان صلّى فيه غيرأهله باذان واقامة لا يكره لاهله ان يعيد والاذان والاقامة وان صلى فيه أهله باذان واقامة أو بعض اهله يكره لغير أهله وللباقين من اهله ان يعيد والاذان والاقامة۔ وان كان مسجداً ليس له اهله معلوم بان كان على شوارع الطريق لا يكره تكرار الاذان واقامة۔

لنا ما روى عبد الرحمن بن ابي بكرة رضي الله تعالى عنه عن ابيه ان رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار لتشاجر بينهم فرجع وقد صلى في المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ في منزل بعض اهله فجمع اهله فصلى بهم جماعة ولو لم يكره تكرار الجماعة في المسجد لما ترك رسول الله ﷺ مع علمه لفضل الجماعة في المسجد

وروى انس بن مالك رضي الله تعالى عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم جماعة صلوا في المسجد فرادى ولان التكرار يؤدي الى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا انهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعة واذا علموا انها لا تفوتهم يتأخرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه الخ

وفي الشامية (١/ ٥٥٣): (وتكرار الجماعة) لما روى عبد الرحمن بن ابي بكرة عن ابيه رضي الله تعالى عنهما ان رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار فرجع وقد صلى في المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ في منزل بعض اهله فجمع اهله فصلى بهم جماعة. ولو لم يكره تكرار الجماعة في المسجد لصلى فيه وروى عن انس رضي الله عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى. ولان التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا انهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر والا تأخروا. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى فيه اهله فانهم يصلون وحدانا وهو ظاهر الرواية الخ وعن ابي يوسف رحمه الله تعالى اذا لم تكن على الهيئة الاولى لا تكره والا تكره وهو الصحيح وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية اهـ وفي التاتارخانية عن الولوالجية. وبه نأخذ فقط

وفيه ايضاً (١/ ٥٥٤): (قوله ويكره) اى تحريما لقول الكافي لا يجوز. والمجمع لا يباح. وشرح الجامع الصغير انه بدعة كما في رسالة السندي (قوله بأذان واقامة الخ) عبارته في الخزائن: اجمع مما هنا ونصها: يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان واقامة. إلا اذا صلى بهما فيه أولا غير أهله او اهله لكن بمخافتة الاذان. ولو كرر اهله بدونهما او كان مسجد طريق جاز اجماعا. كما في مسجد ليس له امام ولا مؤذن ويصلي الناس فيه فوجا فوجا. فان الافضل ان يصلي كل فريق بأذان واقامة على حدة كما في امالي قاضيخان اهـ

(۳۶۳) عیدین میں سجدہ سہو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم صاحب فرما رہے تھے کہ اگر عیدین کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو سجدۂ سہو کرنا لازمی نہیں ہے حالانکہ میں نے سنا ہے کہ تکبیرات واجب ہیں اور واجب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے تو کیا ان عالم کی بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تکبیرات عیدین چونکہ واجب ہیں اس لئے ان کے چھوٹ جانے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے لیکن جمعہ وعیدین میں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کرنے میں انتشار اور فتنہ کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک سجدہ سہو کرنا لازم نہیں، اور بظاہر عالم صاحب کی مراد بھی یہی معلوم ہوتی ہے تاہم اگر فتنہ اور انتشار کا خدشہ نہ ہو یا مجمع چھوٹا ہو تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا لازم ہوگا۔

لمافی الهندية(۱۲۸/۱): ويستوى فى الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روى عن الحسن عن ابي حنيفة رحمه الله اذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة فى صلاة العيد يسجد للسهوكذا فى الذخيرة السهو فى الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لايسجد للسهو فى العيدين والجمعة لئلايقع الناس فى فتنة۔

وفى الدر المختار(۹۲/۲): (والسهو فى صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه فى الأولين لدفع الفتنة۔

وفى الشامية(۹۲/۲): (قوله عدمه فى الأولين) الظاهر ان الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه بعضهم وكذا بحثه الرحمتى وقال خصوصاً فى زماننا وفى جمعة حاشية ابي السعود عن العزمية انه ليس المراد عدم جوازه بل الاولى تركه لئلا يقع الناس فى فتنة (قوله وبه جزم فى الدرر) لكنه قيده محشيها الوانى بما اذا حضر جمع كثير وإلا فلا داعى الى الترك۔

(۳۶۴) شافعی امام کے پیچھے نمازِ عید کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ عید میں حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز عید پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ امام مواضع اختلاف میں حنفی مقتدی کے مذہب کی رعایت کرتا ہو۔

لمافی الهندية(۱/۸۴): والاقتداء بشافعی المذهب انما يصح اذا كان الامام يتحاشی مواضع الخلاف بان يتوضأ من الخارج النجس من غير السبيلين كالفصد وان لا ينحرف عن القبلة انحرافاً فاحشاً... قال الفضلی يصح اقتداء الحنفی فی الوتر بمن يری مذهب أبي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ۔

وفی الشامية(۲/۷): (قوله ان لم يتحقق الخ) فلو راه احتجم ثم غاب فالاصح انه يصح الاقتداء به لانه يجوز ان يتوضأ احتياطا وحسن الظن به اولی بحر عن الزاهدی (قوله كما بسطه فی البحر) حيث ذكر ان الحاصل انه ان علم الاحتياط منه فی مذهبنا فلا كراهة فی الاقتداء به وان علم عدمه فلا صحة وان لم يعلم شيئاً كره۔

(۳۶۵) خواتین کیلئے جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خواتین جمعے کے دن مسجد میں آ کر جمعہ کی نماز پڑھتی ہیں حالانکہ ان پر ظہر واجب ہے تو انکا جمعہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے اوران کی ظہر اس سے ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عورتوں کا نماز جمعہ کے لئے باہر جانا خوف فتنہ کی وجہ سے ناجائز ہے البتہ اگر انہوں نے نماز جمعہ باجماعت ادا کی تو ظہر ان سے ساقط ہوجائیگی۔

وفی خلاصة الفتاویٰ (۱/۲۱۴): ولا يخرج الشاب من النساء فی جميع الصلوات واما العجوز فتخرج فی العيدين والفجر والعشاء... وقد ذكرنا الجواب المختار فی زماننا انهن لا يخرجن۔

وفی الهندية (۱/۱۴۵،۱۴۴): لاتجب الجمعة علی العبيد والنسوان والمسافرين والمرضیٰ كذا فی محيط السرخسی...... ومن لا جمعة عليه ان أدّاها جاز عن فرض الوقت كذا فی الكنز۔

(۳۶۶) عورتوں کیلئے عیدگاہ جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں چند سالوں سے غیر مقلدین آئے ہوئے ہیں پورے گاؤں کو خراب کررہے ہیں کافی لوگ ان کے چکر میں پھنس گئے ہیں اس مرتبہ انہوں نے اپنی عورتوں کو بھی نمازِ عید پڑھنے کا حکم دیا کہ جس طرح مردوں پر نماز عید واجب ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے اگر عورتیں نماز عید نہیں پڑھیں گی تو گناہگار ہوں گی کیا واقعی عورتوں پر نمازِ عید واجب ہے؟ اور عورتوں کے نماز عید کیلئے عیدگاہ جانے کا ثبوت کسی روایت سے ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عید کی نماز مردوں پر واجب ہے عورتوں پر عید کی نماز واجب نہیں۔رہی یہ بات کہ عورتوں کا عیدگا

میں جانا، تو اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ امن تھا اور کوئی فتنے کا خوف نہ تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو مساجد اور عیدگاہ میں جانے کی اجازت دی تھی۔ بخاری وترمذی کی روایت ہے کہ حضرت امّ عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمیں عیدگاہ جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جب فتنوں کا دور بڑھا تو عورتوں کو مساجد جانے سے روک دیا گیا اور گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عورتوں کو مساجد جانے سے روکا تو عورتوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی تو حضرت عائشہ نے فرمایا اگر حضور علیہ الصلاۃ والسلام یہ جان لیتے جو عمر کو معلوم ہے تو وہ تمہیں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ اگر ان حالات کو پالیتے جو آج عورتوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں تو آپ ﷺ ان کو ضرور مسجد جانے سے منع فرمادیتے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں نہ عورتوں پر عید کی نماز واجب ہے اور نہ ہی ان کا عیدگاہ جانا درست ہے۔

لما فی اعلاء السنن(۴/۲۶۱): عن امّ سلمة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: صلاة المرأة فی بیتها خیر من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی حجرتها خیر من صلاتها فی دارها وصلاتها فی دارها خیر من صلاتها فی مسجد قومها۔

وفی المحیط البرهانی(۲/۴۸۵): ولیس علی النّساء خروج فی العیدین، وکان یرخّص لهنّ فی ذالك۔ قال: وقال أبو حنیفة رحمه الله تعالیٰ: وامّا الیوم فانّی أکره لهنّ ذلك، وأکره لهنّ شهود الجمعة الخ۔

وفیه ایضاً قال... واعلم بانّ النساء امرن بالقرار فی البیوت، قال الله تعالیٰ ''وقرن فی بیوتکن'' ونهین عن الخروج، قال الله تعالیٰ: ''ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولیٰ'' الا انه ابیح لهن الخروج فی الابتداء الی الجماعات، لقوله علیه السلام ''لاتمنعوا إماء الله مساجد الله ولتخرجن اذا خرجن تفلات'' أی غیر متطیّبات، ثم منعن بعد ذلك لمافی خروجهن من الفتنة: قال الله تعالیٰ''ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستأخرین'' قیل فی تفسیر الآیة: نزلت فی شان النسوة کان المنافقون یتأخرون حتی یطلعوا علی عورات النساء. فمنعن بعد ذالك۔ وقال النبی علیه الصلاة والسلام ''صلاة المرأة فی دارها أفضل من صلاتها فی مسجد وصلاتها فی بیتها افضل من صلاتها فی دارها)) وعن عمر رضی الله عنه انه نهی النساء عن الخروج إلی المساجد فشکون إلی عائشة رضی الله عنها، فقالت عائشة رضی الله تعالیٰ عنها: ((لو علم النبی علیه الصلاة والسلام ما علمه عمر ما أذن لکنّ فی الخروج۔

وفی الدر المختار(۱/۵۶۶): (ویکره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعید ووعظ (مطلقا) ولو

عجوزا لیلا(علی المذہب) المفتی بہ لفساد الزمان۔

وفی الشامی۔ (قولہ علی المذہب المفتیٰ بہ) أی مذہب المتأخرین۔ قال فی البحر: وقد یقال ہذہ الفتویٰ التی اعتمدہا المتأخرون مخالفۃ لمذہب الامام وصاحبیہ. فانہم نقلوا أن الشّابۃ تمنع مطلقاً اتفاقاً۔

(۳۶۷) تکبیراتِ تشریق مرد اور عورت دونوں پر واجب ہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے مسائل کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ تکبیرات تشریق مرد وعورتوں دونوں کو پڑھنا چاہیئے۔ اپنے امام صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دراصل اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک صرف مردوں پر ہی ہے۔ البتہ آپ کسی مفتی صاحب سے اس اختلاف کو سمجھ لیں اور فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی معلوم کرلیں۔ آنجناب سے پہلے بھی کئی مسائل کے سلسلے میں رجوع کر چکا ہوں، مہربانی فرما کر اس مسئلے کو بھی واضح اور تفصیل سے لکھ کر دیدیں، نیز فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی بتادیں بندہ آپ کا بہت ممنون ہوگا۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... تکبیراتِ تشریق کس پر واجب ہے؟ اس میں امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ) کی صبح سے عید (دسویں ذی الحجہ) کے عصر تک ایک دفعہ تکبیر تشریق کہنا ہر مرد، عاقل، مقیم، آزاد اور شہر میں رہنے والے پر (جبکہ اس نے نماز، جماعت کے ساتھ پڑھی ہو) واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق عورت، بچے، مجنون، مسافر اور دیہات میں رہنے والے پر اور اس شخص پر جس نے نفل نماز یا فرض نماز اکیلے پڑھی ہو، تکبیر تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے۔ اور صاحبینؒ (امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک ۹/ ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳/ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز پڑھنے والے پر چاہے جو بھی ہو اور جس جگہ بھی نماز پڑھی ہو، ایک دفعہ تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق مرد اور عورت دونوں پر تکبیر تشریق کہنا واجب ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱۷۹/۲): ووجوبہ (علی امام مقیم) بمصر (و) علی مقتد (مسافر او قروی او امرأۃ) بالتبعیۃ لکن المرأۃ تخافت ویجب علی مقیم اقتدی بمسافر (وقالا بوجوبہ فور کل فرض مطلقا) ولو منفردا او مسافرا او امرأۃ لانہ تبع للمکتوبۃ (الی) عصر الیوم الخامس (آخر ایام التشریق وعلیہ الاعتماد) والعمل والفتوی فی عامۃ الامصار وکافۃ الاعصار۔ الدر المختار وقال ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ تحتہ (قولہ تخافت) لان صوتہا عورۃ کمافی الکافی والتبیین... قولہ فور کل فرض) بان یاتی بہ بلا فصل یمنع البناء کمامرط (قولہ لانہ تبع للمکتوبۃ) فیجب علی کل من تجب علیہ الصلوٰۃ المکتوبۃ بحر(قولہ وعلیہ الاعتماد الخ) ہذا بناء علی انہ اذا

اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الاصح كمافى اخر الحاوى القدسى اوعلى ان قولهما فى كل مسألة مروى عنه ايضا والافكيف يفتى بقول غير صاحب المذهب۔ وبه اندفع مافى الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوى المشائخ بقولهما بحر۔

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۳۰۸): فقال الحنفية: يجب على الرجال والنساء تكبير التشريق فى الاصح مرة، وان زاد عليها يكون فضلا، عقب كل فرض عينى بلا فصل يمنع البناء على الصلاة (كالخروج من المسجد او الكلام او الحدث عامدا) ويؤدى بجماعة او منفردا، ولو قضاء، ويكون التكبير للرجال جهرا، وتخافت المرأة بالتكبير، ولا يكبر عقب الوتر وصلاة العيد۔

ومدته: من فجر يوم عرفة الى عصر يوم العيد عند ابى حنيفة، والى صلاة العصر من آخر ايام التشريق عند الصاحبين، وبقولهما يفتى، فهى ثلاث وعشرون صلاة۔

باب فی تقدیر الاوزان الشرعیة بالمساحة الجدیدة

(شرعی اوزان کی مقدار کا ازسرنو تحقیق کے ساتھ بیان)

(۳٦۸) الاصبع کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتب میں پیمائش کے پیمانوں میں سے ایک الاصبع ذکر کیا ہوا ہے آجکل چونکہ جدید پیمانے آچکے ہیں ان قدیم کو کوئی بھی نہیں جانتا حالانکہ اصل مداران جدید پیمانوں کا قدیم پیمانوں ہی کے اوپر ہے تو الاصبع کس پیمانے کا نام ہے اور اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک ذراع میں چھ قبضہ ہوتا ہے اور ایک قبضہ چار اصبع (انگشت) کا ہوتا ہے۔ اور چار اصبع ۳ انچ کے برابر ہوتے ہیں۔ اور ۳ انچ ۷ء۶۲ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے ایک انچ ۲ء۵۴ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک اصبع (انگشت)، ۰ء۷۵ انچ یا ۱ء۹۰۵ سینٹی میٹر کے برابر ہے۔ اور ایک سینٹی میٹر میں ۱۰ ملی میٹر ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے ایک اصبع (انگشت) تقریباً ۱۹ء۰۵ ملی میٹر ہے۔

لمافی منحة الخالق علی ھامش البحر الرائق(۲۲۳/۱): قال صاحبنا ابو العباس احمد شھاب الدین ابن الھائم رحمه الله وإلیه یرجع فی ھذا الباب البرید اربعة فراسخ والفرسخ ثلثة امیال والمیل الف باع والباع أربعة أذرع والذراع أربعة وعشرون إصبعا والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرذون۔

وفی الفتاویٰ الھندیة (۱۸/۱): والمعتبر ذراع الکرباس کذا فی الظھیریة وعلیه الفتوی کذا فی الھدایة۔ وھو ذراع العامة ست قبضات اربع وعشرون إصبعا کذا فی التبیین۔

وفی الشامیة(۱۹۶/۱): قال فی البحر: وفی الخانیة وغیرھا ذراع المساحة وھو سبع قبضات فوق کل قبضة اصبع قائمة (الی قوله) وفی البحر أن فی کثیر من الکتب انه ست قبضات لیس فوق کل قبضة اصبع قائمة فھو اربع وعشرون اصبعا بعدد حروف ''لا اله الا الله محمد رسول الله'' والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابھام کمافی غایة البیان والمراد بالقبضة اربع أصابع

مضمومة۔

(۳۶۹) الشبر کی تحقیق

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لمبائی کے پیمانوں کے اندر ایک الشبر نامی پیمانہ ہے تو یہ پیمانہ جدید پیمانوں کے لحاظ سے کتنا ہوگا اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک ذراع ۱۸/ انچ کا ہوتا ہے اور دو"۲" شبر ایک ذراع ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر"۹" انچ کا ہوا، اور ایک انچ ڈھائی سینٹی میٹر کا ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر تقریباً ۲۳ سینٹی میٹر ہوا، اور ایک سینٹی میٹر دس ملی میٹر ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر ۲۳۰ ملی میٹر ہوا۔

لمافی منحة الخالق علی هامش البحرالرائق(۲۴۳،۲۴۵/۱): والميل ألف باع، والباع اربعة اذرع، والذراع أربعة وعشرون أصبعاً، والاصبع ست شعيرات مرصوصة بالعرض، والشعير ست شعرات بشعر البرزون... (الی قوله) ...قلت يمكن ان يقال لا خلاف لحمل كلام ابن شجاع على ان مراده بالذراع ما فيه اصبع قائمة عند كل قبضة فيبلغ ذراعاً ونصفاً بذراع العامة۔

وفی الشامية(۱۹۶/۱): (قوله وهو سبع قبضات فقط) ای بلااصبع قائمة، وهذا مافی الولوالجية، وفی البحران فی كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة أصبع قائمة، فهو اربع وعشرون أصبعاً بعدد حروف (لا اله الا الله محمد رسول الله) والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام كمافی (غاية البيان) اهـ والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة نوح، أقول وهو قريب من ذراع اليد، لانه ست قبضات وشئی، وذالك شبران۔

(۳۷۰) فرسخ کی تحقیق

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اگر کوئی سولہ فرسخ سفر پر جانے کا ارادہ کریگا تو وہ قصر کرے گا مسئلہ یہ ہے آجکل میل اور فرسخ نہیں بلکہ کلومیٹر اور میٹر ہیں۔ تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک فرسخ میں کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک فرسخ=۳ شرعی میل، ایک میل=۴۰۰۰ ذراع

ایک ذراع ڈیڑھ(۱ء۵) فٹ=۱۸ انچ، ۴۰۰۰ X ۱۸=۷۲۰۰۰ انچ

ایک میٹر=۳۹ء۹ انچ، ÷۷۲۰۰۰=۱۸۴۶=۱۸۴۶ء۱۵۳۸ شرعی میل میں میٹر ÷۱۸۴۶ء۱۵۳۸=۱۱۰۰۰=۸۴۶۱۵۳۸ = شرعی میل

میں کلومیٹر

ایک فرسخ میں کلومیٹر=۱ء۸۴۶۱۵۳۸=۳ x۵ء۵۳۸۴۶۱۴ کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک فرسخ میں ۵ء۵۳۸۴۶۱۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۵۵۳۸ء۴۶۱۴ میٹر ہوتے ہیں۔

ایک فرسخ میں انگریزی میل

ایک انگریزی میل میں فٹ=۱۷۶۰=۳x۵۲۸۰ فٹ

ایک انگریزی میل میں انچ=۱۲ x۵۲۸۰=۶۳۳۶۰ انچ

ایک انگریزی میل میں میٹر=۶۳۳۶۰÷=۱۶۲۴۳۹ء۶۱۵۴ میٹر

ایک انگریزی میل میں کلومیٹر=۱۶۲۴ء۶۱۵۴ ۱۰۰۰÷=۱ء۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

ایک فرسخ میں انگریزی کلومیٹر=۱ء۶۲۴۶۱۵۴=۳x۴ء۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک انگریزی میل کے ایک فرسخ میں ۴ء۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸۷۳ء۸۴۶۲ میٹر ہوتے ہیں۔ البتہ آجکل مفتی بہٖ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷ء۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے لہٰذا جو شخص ۴۸ میل انگریزی کی مسافت کے بقدر سفر کرے تو وہ شخص قصر کرے گا۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): کذا فی الصحاح والمغرب والمراد هنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر ألف خطوة، کل خطوة ذراع ونصف بزراع العامة وهو اربع وعشرون اصبعاً۔

وفی منحة الخالق علی هامش البحر(۱/۲۴۳): والفراسخ ثلثة اميال والميل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعاً والاصبع ست شعيرات مرصوصة بالعرض والشعير ست شعرات بشعر البرزون۔

(۱۷۳) میل کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتب میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص اڑتالیس میل سفر پر جانے کا ارادہ کرے تو وہ نماز قصر کرے گا آجکل تو میل نہیں کلومیٹر اور میٹر ہیں تو یہ وضاحت فرمادیں کہ ایک میل میں کتنے میٹر اور کلومیٹر ہوں گے اور اڑتالیس میل کے کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... سفر شرعی کی مسافت کی تعیین میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مذاہب مختلف ہیں۔ جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی اس بارے میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظم کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن تین رات میں جس قدر مسافت

انسان پیدل چل کر بآسانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کرے وہ مقدار مسافت سفر شرعی ہے۔فتح القدیر،عمدۃ القاری،البحرالرائق،درمختار اور شامی وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔

اس کے برخلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے۔اور یہی امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے،اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے،جبکہ مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے تریسٹھ میل شرعی بنتے ہیں،بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چون میل بنتے ہیں اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل بنتے ہیں مسافت قصر قرار دی ہے،شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے، اس لئے محققین علماء ہند نے (۴۸) اڑتالیس میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دیا ہے اور فقہائے حنفیہ کے اقوال میں سے جو قول ائمہ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے برابر ہے، کیونکہ پندرہ فرسخ کے پینتالیس میل شرعی بنتے ہیں، اور شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس وجہ سے پینتالیس میل شرعی اڑتالیس میل انگریزی سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں، بہ نسبت دیگر اقوال کے کہ ان میں اور پینتالیس میل شرعی میں فرق بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

پینتالیس میل شرعی کے اعتبار سے مسافت قصر کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی میل دوہزار گز انگریزی کا ہوتا ہے اور انگریزی میل سترہ سوساٹھ گز کا تو گویا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے، اس فرق کی وجہ سے اصل مسافت قصر جو کہ پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت جو کہ اڑتالیس میل ہے، میں فرق کا ہونا ظاہر ہے کہ پینتالیس میل شرعی کے...... ۵۱ء۱۳۶۳۶۴ میل انگریزی بنتے ہیں یعنی اصل مسافت جو شرعاً پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت میں تقریباً ۳ء۱۳۶۳۶۴ میل کا فرق آتا ہے۔لیکن اس فرق کے ہوتے ہوئے حالات زمانہ اور چند دیگر ضرورتوں کی بناء پر محققین متاخرین نے اڑتالیس میل انگریزی کو پینتالیس میل شرعی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔اور یہی قول مفتی بہ ہے۔پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سفر شرعی اڑتالیس میل انگریزی کے حساب سے بنتے ہیں۔لہٰذا ہم اس کے میٹر اور کلومیٹر کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

ایک ذراع شرعی=۱۸انچ، ایک فٹ=۱۲انچ

ذراع انگریزی=۳۶انچ، ایک میٹر=۳۹انچ

ایک کلومیٹر=۱۰۰۰میٹر

۱۷۶۰ گز شرعی=۳۵۲۰x۲ گز انگریزی

۳۵۲۰x ۵ء۱=۵۲۸۰فٹ

۵۲۸۰فٹ= ۱۲ x۶۳۳۶۰انچ

۶۳۳۶۰÷۳۹=۱۶۲۴ء۶۱۵۴میٹر

۱۶۲۴ء۶۱۵۴÷۱۰۰۰=۱ء۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

۱ء۶۲۴۶۱۵۴x۴۸=۷۷ء۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ ایک میل میں ۱۶۲۴ء۶۱۵۴ میٹر اور ۱ء۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸ میل میں ۷۷۹۸۱ء۵۳۹ میٹر اور ۷۷ء۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر ہوتے ہیں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): المیل فی کلام العرب منتھی مدالبصر، وقیل للاعلام المبنیة فی طریق مکة امیال، لانھا بنیت علی مقادیر منتھی البصر کذا فی الصحاح والمغرب، والمرادھنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر الف خطوة کل خطوة ذراع ونصف بذراع العامة وھو اربع وعشرون اصبعاً۔

وفی الھندیة(۱/۲۷): وأقرب الاقوال أن المیل وھو ثلث الفرسخ اربعة آلاف ذراع طول کل ذراع اربع وعشرون اصبعاً، وعرض کل اصبع ست حبات شعیر ملصقة ظھر البطن۔

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۳۳): فی الدر من عجز عن استعمال الماء لبعده میلاً اربعة آلاف ذراع۔ وقال ابن عابدین رحمه الله قوله اربعة آلاف ذراع الخ کذا فی الزیلعی والنھر والجوھرة، وقال فی الحلیة انه المشھور کما نقله غیر واحد منھم السروجی فی غایته، وفی شرح العینی ومسکین و البحر عن الینابیع انه اربعة آلاف خطوة، قال الرملی والاول ھو المعول علیه۔

(۳۰۷) برید کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مصنف عبدالرزاق (۲/ ۵۲۵) میں ذکر ہے کہ چار برید سفر کرنے سے قصر کے احکام لاگو ہوں گے اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اب الجھن یہ ہے کہ آجکل نہ برید ہیں نہ فرسخ بلکہ کلومیٹر یا میٹر ہیں، تو اب یہ بتائیے گا کہ ایک برید کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر کا ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ایک برید میں ۴ فرسخ ہوتے ہیں ایک فرسخ ۳ میل کا ہوتا ہے تو ایک برید میں ۱۲ میل ہوں گے پھر ایک میل میں ۴۰۰۰ ذراع ہوتے ہیں، ایک ذراع میں ۱۸ / انچ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ایک میل میں ۷۲۰۰۰ / انچ ہوں گے اور ایک میٹر میں ۳۹ / انچ ہوتے ہیں اس اعتبار سے ایک میل میں ۱۸۴۶ء۱۵۳۸ میٹر جو ۱ء۸۴۶۱۵۳۸ کلومیٹر کے برابر ہوگا اور جب ایک برید میں ۱۲ میل ہوتے ہیں تو ایک برید ۲۲۱۵۳ء۸۴۶۱۵ میٹر کا اور ۲۲ء۱۵۳۸۴۶۱۵ کلومیٹر کا ہوگا۔

لمافی البخاری (۱/۱۴۷): وسمی النبی ﷺ السفر یوما ولیلة وکان ابن عمروابن عباس یقصران ویفطران فی اربعة برد وھو ستة عشر فرسخاً۔

وفی الھندیة(۱/۲۷): واقرب الاقوال ان المیل وھو ثلث الفرسخ اربعة الاف ذراع طول کل

ذراع اربع وعشرون اصبعا وعرض كل اصبع ست حبات شعير ملصقة ظهر البطن۔

وفي منحة الخالق بهامش البحرالرائق(۱/۲۴۳،۲۴۴): البريد اربعة فراسخ والفراسخ ثلثة اميال والميل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعا والاصبع ست شعيرات مرصوصة بالعرض والشعير ست شعرات بشعر البرزون

ان البريد من الفراسخ اربع ولفرسخ فثلاث اميال ضعوا
والميل الف اى من الباعات قل والباع اربع اذرع تتتبع
ثم الذراع من الاصابع اربع في بعدها العشرون ثم الاصبع
ست شعيرات فظهر شعيرة منها الى بطن لاخرى توضع
ثم الشعيرة ست شعيرات فقل من شعر بغل ليس فيها مدفع

(۳۷۳) مرحلہ کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں سفر کے مسائل میں مراحل کا لفظ آتا رہتا ہے تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک مرحلہ کتنا ہوتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے میٹر اور کلومیٹر کے لحاظ سے کتنا ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......مرحلہ کہتے ہیں ایک دن میں طے کردہ فاصلے کو اور عموماً ایک دن میں آدمی درمیانی رفتار میں پانچ فرسخ طے کرسکتا ہے۔اور ایک فرسخ تین (۳) میل شرعی بنتا ہے۔اور پانچ فرسخ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتے ہیں۔تو اس لحاظ سے ایک مرحلہ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے ایک مرحلہ ۲۷،۶۹۲ کلومیٹر یا ۲۷۶۹۲ میٹر۔لہٰذا اس اعتبار سے تین مراحل میں ۴۵ میل شرعی۔۸۳۰۷۶ میٹر اور ۸۳،۰۷۶ کلومیٹر بنتے ہیں۔البتہ آجکل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷،۲۵۳۹۸۱ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے۔

مرحلہ کی تحقیق......

ایک مرحلہ=۵ فرسخ

ایک فرسخ=۳ میل شرعی

ایک میل شرعی=۴۰۰۰ گز اور ایک گز=ڈیڑھ فٹ یا ۱۸/انچ۔

ایک میل شرعی میں فٹ=(۴۰۰۰ x ۱۸=۷۲۰۰۰(انچ)÷۱۲=۶۰۰۰ فٹ)

ایک میل شرعی میں ۶۰۰۰ فٹ ہوتے ہیں

ایک میل شرعی میں میٹر(۶۰۰۰÷۳،۲۵)=۱۸۴۶،۱۵۳۸ میٹر

ایک میل شرعی میں کلومیٹر (۱۰۰۰÷۱۸۴۶٫۱۵۳۸)=۱٫۸۴۶ کلومیٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں فٹ =۶۰۰۰=۳x۱۸۰۰۰ فٹ

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں میٹر (۳ x۱۸۴۶٫۱۵۳۸)=۵۵۳۸٫۴۶۱۴ میٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں کلومیٹر (۱۰۰۰÷۵۵۳۸٫۴۶۱۴)=۵٫۵۳۸ کلومیٹر

تین مراحل =۱۵ فرسخ =۴۵ میل شرعی

تین مراحل میں میٹر (۴۵ x۱۸۴۶٫۱۵۳۸)=۸۳۰۷۶٫۹۲۱ میٹر

تین مراحل میں کلومیٹر (۱۰۰۰÷۸۳۰۷۶٫۹۲۱)=۸۳٫۰۷۶ کلومیٹر

میل انگریزی کے حساب سے ایک مرحلہ میں ۱۶ میل انگریزی =۲۵٫۷۴۸ کلومیٹر اور ۲۵۷۴۸ میٹر بنتے ہیں۔

تین مراحل میں ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۲۴۵۱۸۹ کلومیٹر ۷۷۲۴۵٫۱۸۹ میٹر بنتے ہیں۔

میل انگریزی اور میل شرعی میں فرق

میل انگریزی میل شرعی سے ۷۲۰ فٹ، ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

وجہ فرق = اسلئے کہ میل شرعی ۴۰۰۰ گز شرعی =۶۰۰۰ فٹ کا ہوتا ہے۔ جبکہ میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی =۵۲۸۰ فٹ کا ہوتا ہے۔

میل شرعی اور میل انگریزی میں اس طور پر فرق اس لئے آ رہا ہے کہ میل شرعی ۴۰۰۰ گز شرعی کا ہوتا ہے اور ایک گز ۱۸/ انچ کا ہوتا ہے۔ اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے اور ایک گز انگریزی ۳۶/انچ کا ہوتا ہے فرق معلوم کرنے کے لئے میل شرعی کے گز کو انگریزی گز میں تبدیل کر دیا تو میل شرعی انگریزی گز کے اعتبار سے ۲۰۰۰/انگریزی گز کا ہوگا، اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے لہٰذا ۲۰۰۰ میں سے ۱۷۶۰ نفی کیا تو ۲۴۰ گز کا فرق آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ میل انگریزی میل شرعی سے ۲۴۰ گز چھوٹا ہوتا ہے۔

لمافی معجم لغة الفقهاء (ص۴۲۱): المرحلة: بفتح الميم، مسيرة نهار بسيرا لابل المحملة وقدرها أربعة وعشرون ميلا هاشميا، او ثمانية فراسخ او ۴۴۳۵۲ متراً۔ وفيه ايضاً (ص۴۷۰) الميل بالكسرجمع اميال: مقدار مد البصر الميل الشرعى الهاشمى الف باع والباع قدر مد اليدين ۴۰۰ زراعاً = ۱۸۴۸ مترا...

وفى الهندية(۱۳۸/۱): أقل مسافة تتغير فيها الاحكام مسيرة ثلاثة ايام... وهل يشترط سيركل يوم الى الليل اختلفوا فيه الصحيح انه لا يشترط حتى لو بكر فى اليوم الاول ومشى الى الزوال وبلغ المرحلة ونزل وبات فيها ثم بكر فى اليوم الثانى كذلك ثم فى اليوم الثالث كذلك يصير

مسافرا كذا فی السراج الوهاج ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح كذا فی الهداية۔

وفی الشامية(٢/١٢٢): (قوله ولا يشترط الخ) إذلا بد للمسافر من النزول للأكل والشرب والصلاة ولأكثر النهار حكم كله فإن المسافر إذا بكر فی اليوم الاول وسار الی وقت الزوال حتی بلغ المرحلة فنزل بها للاستراحة وبات بها ثم بكر فی اليوم الثانی وسار الی ما بعد الزوال ونزل ثم بكر فی اليوم الثالث ومشی الی الزوال فبلغ المقصد قال شمس الأئمة السرخسی الصحيح أنه يصير مسافراً عند النية كما فی الجوهرة۔

وفيه ايضاً(صـ١٢٣): قال فی النهاية۔ ای التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة أيام لأن المعتاد من السير فی كل يوم مرحلة واحدة خصوصاً فی أقصر ايام السنة كذا فی المبسوط وكذا مافی الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقدانه مسيرة ثلاثة ايام۔ ای بناء علی اختلاف البلدان فكل قائل قدّر مافی بلده من أقصر الأيام او بناء علی اعتبار أقصر الأيام أو أطولها أو المعتدل منها وعلی كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ما تقطع فيها المراحل المعتادة فافهم... (قوله ولا اعتبار بالفراسخ) الفرسخ ثلاثة أميال، والميل أربعة الأف ذراع... (قوله علی المذهب) لأن المذكور فی ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة أيام كما فی الحلية وقال فی الهداية هو الصحيح احترازا عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ۔

ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل ثمانية عشر وقيل خمسة عشر، والفتوی علی الثانی لأنه الأوسط وفی المجتبی فتوی أئمة خوارزم علی الثالث وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق فی السهل والجبل والبر والبحر بخلاف المراحل معراج۔

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

(۳۷۴) فریضۂ صلوۃ قرض ہے یا فرض؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا قرض ہے یا فرض؟ میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ قرض ہے؟ آپ صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... پانچوں نمازیں ہر ''عاقل، بالغ، مسلمان مردوعورت'' پر ان کے اوقات مقررہ میں ادا کرنا قرآن وحدیث اوراجماع امت کی رو سے فرض عین ہے قرض نہیں۔

اس لئے کہ قرض کہا جاتا ہے کسی دوسرے کو مال دینا اس شرط پر کہ قرض داروہ مال قرض خواہ کو واپس لوٹائے گا جہاں تک آپ کے دوست کا کہنا ہے کہ فریضہ صلوۃ ''قرض'' ہے، تو یہ اس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ مقصود لزوم ادائیگی ہو۔ اور عام طور پر مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ جس طرح ادائیگی قرض بہر صورت ضروری ہے، ایسے ہی ادائیگی فرض بھی ضروری ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز فرض نہیں۔

لمافی الھندیة(۱/۵۰): الصلاة فریضة محکمة لایسع ترکھا ویکفر جاحدھا کذا فی الخلاصة۔

وفی المعجم الوسیط (صـ ۷۲۷): ''القرض'' ماتعطیه غیرك من مال علی ان یردہ الیك ـــــ ''ج'' قروض۔

(۳۷۵) فقہاء نے ''نماز کے ارکان وشرائط'' کے اعتبار سے جو تقسیم فرمائی ہے اس کا مقصد

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء نے جو تقسیم فرمائی ہے نماز کے ارکان وشرائط کے اعتبار سے اس کا کیا مقصد ہے، آیا نماز کی صحت کیلئے ضروری ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ مراقی الفلاح والے کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا: ویشترط التحریمة ولیست رکناًوعلیه عامة المشایخ المحققین علی الصحیح...(صـ۱۷۴ باب شروط الصلوۃ)

الجواب بعون الملک الوهاب......فقہاء نے جو تقسیم کی ہے اس کا مقصد نماز کے ''ارکان اور شرائط'' کے درمیان فرق کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''شرط'' وہ عمل ہے کہ خارج نماز اس کو پورا کرنا صحت نماز کیلئے ضروری ہے اور ''رکن'' وہ عمل ہے کہ نماز کے اندر اس کو انجام دینا صحت نماز کیلئے ضروری ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شرط، نماز کا جز اور حصہ نہیں ہوتی بلکہ نماز سے الگ اور باہر جداگانہ عمل ہے جیسے نماز کیلئے وضو شرط ہے۔ ''نماز'' اور ''وضو'' دونوں الگ الگ عمل ہیں۔ جبکہ نماز کا ''رکن'' خود نماز کا ایک جزء ہوتا ہے جیسے ''رکوع'' ''سجود'' نماز کے ''ارکان'' ہیں البتہ حکماً دونوں فرض ہیں چنانچہ اگر کوئی آدمی ان میں سے ایک کو بھی انجام نہ دے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اور مراقی الفلاح کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ عند الاحناف شروط میں سے ہے کیونکہ خارج نماز ادا ہو جاتی ہے۔

لمافی الحلبی (ص۱۲): ثم اعلم بان للصلوة شرائط جمع شريطة بمعنى الشرط وهو فى اللغة العلامة اللازمة وفى الشرع مايتعلق به الوجود دون الوجوب والثبوت قبلها صفة موضحة وبيان للواقع اذ شرط الشى لا يكون فيه ولا بعده وانما يكون قبله... واعلم ان للصلوة اركانا جمع ركن وهو فى اللغة الجانب الاقوى و فى الاصطلاح الجزء الذاتى الذى تتركب الماهية منه ومن غيره۔

وفى المراقى(۱/۱۶۶): شروط جمع شرط... وفى الشريعة هو مايتوقف على وجوده الشى، وهو خارج عن ماهيته، والاركان جمع ركن: وهو فى اللغة...الجانب الاقوى وفى الاصطلاح الجزء الذاتى الذى تتركب الماهية منه ومن غيره۔

وفى الهندية(۱/۶۸): الفصل الاول فى فرائض الصلوة وهى ست منها التحريمة، وهى شرط عندنا حتى ان من يحرم للفرائض كان له ان يودى بها التطوع۔

وفى الدر المختار مع الشامية (۱/۴۴۲): (من فرائضها) التى لا تصح بدونها (التحريمة) قائماً (وهى شرط)

وفى الشامية تحته: (قوله من فرائضها) جمع فريضة اعم من الركن الداخل الماهية والشرط الخارج عنها ... (قوله وهى شرط) وانما لم يذكرها مع الشروط المارة لاتصالها بها بمنزلة الباب للدار ... (قوله به يفتى)، الضمير راجع الى الحكم عليها بالشرطية۔

(۳۷۶) فرض نماز پڑھتے ہوئے یاد آئے کہ میں پہلے یہ نماز پڑھ چکا ہوں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص عشاء کی فرض نماز پڑھ کر بھول جائے اور رات گئے دوبارہ نماز پڑھنے کے ارادے سے کھڑا ہوا اور ایک رکعت پڑھنے پر یاد آئے کے میں تو نماز اور وتر سب پڑھ چکا ہوں تو اسے

۱)۔کیا کرنا چاہیے؟

۲)۔ہمارے دوست کے ساتھ ایسا ہوا تو اس نے دوسری رکعت میں اپنی نیت فرض سے نفل کی کرلی اور دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیئے کیا اس نے صحیح کیا؟

نیز دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص قسم کھاتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا پھر جھوٹ بولتا ہے تو اس پر کفارہ آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں یاد آنے پر نماز کو ختم کردینا جائز ہے البتہ چونکہ حقیقتاً اس کے لیے یہ نماز نفل ہے لہٰذا اگر تکمیل کرلے تو بہتر ہے۔تکمیل کی صورت میں دو رکعت اور چار رکعت دونوں کا اختیار ہے۔

(۲)۔صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھا کر اگر جھوٹ بولے گا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

لمافی الهندية (۵۶/۲) الباب الثانی فیما یکون یمینا الخ: اذا حلف الرجل علی امر لا یفعله ابدا ......ثم فعله کانت علیه کفارة۔

وفی الشامية (۳۰/۲) باب الوتر والنوافل: قوله (أو في صلاة ظان) معطوف علی قوله متنفلا فهو مستثنى أيضا وصورته كما في التاترخانية عن العيون برواية ابن سماعة عن محمد بن الحسن قال رجل إفتتح الظهر وهو يظن أنه لم يصلها فدخل رجل في صلاته يريد به التطوع ثم تذكر الإمام أنه ليس عليه الظهر فرفض صلاته فلا شيء عليه ولا على من اقتدى به

(۷۷۳) حرم سے باہر سمتِ قبلہ کا تعین

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل مسجد حرام کے باہر سمت قبلہ کا تعین کیسے کیا جائے جبکہ اونچی اونچی عمارتیں حائل ہیں برائے مہربانی مسئلہ کی پوری وضاحت فرمادیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......کعبہ اگر نمازی کے سامنے ہو تو عینِ قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے البتہ اگر نمازی ایسی جگہ پر ہو جہاں قبلہ نظروں کے سامنے نہ ہو تو جہت قبلہ کا رخ کرلینا کافی ہے لیکن اگر قبلہ نمازی کی نظروں کے سامنے نہ ہو اور سمت قبلہ کے بارے میں بھی شبہ ہو جائے تو وہ مقامی لوگوں سے دریافت کریگا، اگر کوئی شخص ایسا نہ ملے جو اسے سمت قبلہ بتا سکے تو غور وفکر کر کے جس طرف بھی غالب گمان ہو جائے اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کریگا۔

لمافی محیط البرهانی (۲۱/۲):وکل من کان بحضرة الکعبة یجب علیه اصابة عینها ومن کان غائبا عنها ففرضه جهة الکعبة لا عینها وهذا قول الشیخ الامام ابی الحسن الکرخی والشیخ الامام ابوبکر الرازی لانه لیس فی وسعه سوی ذالك والتکلیف بحسب الوسع۔

وفی الهندية (۶۴/۱): وان اشتبهت علیه القبلة ولیس بحضرته من یسئله عنها اجتهد وصلی کذافی

الهداية ... واذاكان بحضرته من يسئله عنها وهومن اهل المكان عالم بالقبلة فلا يجوزله التحري۔

(۳۷۸) مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے

سوال......ایک شخص اللہ کے راستہ میں (مراداس سے دعوت وتبلیغ ہے) نماز پڑھتا ہے جبکہ دوسرا وہ شخص ہے جو مسجد حرام میں نماز پڑھتا ہے، ان دونوں میں کس کو زیادہ ثواب ملے گا۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... جواب کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھئے کہ حضرات مفسرین نے، فی سبیل اللہ، میں تبلیغ کے علاوہ اور بھی بہت سے امور داخل کئے ہیں جیسا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے تفسیر مظہری (۲/۲۱۱) میں لکھا ہے کہ، طلبِ علم، جہاد، اطاعت، تقوی کیلئے نکلنا اور اسی طرح رزق حلال کے حصول کیلئے نکلنا یہ سب، فی سبیل اللہ میں داخل ہیں جبکہ بعض حضرات اسکے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں نکلنے کو صرف تبلیغ کیساتھ خاص کرتے ہیں حالانکہ اسکے علاوہ اور نیک کاموں میں نکلنے والے بھی اللہ کے راستہ میں نکلنے والے ہیں۔اب جواب کو سمجھ لیجئے کہ اللہ کے راستہ میں عبادت کرنا تو بہت ہی سعادتمندی کی بات ہے احادیث میں اسکے متعلق بہت فضائل مروی ہیں لیکن جو شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اسکا ثواب سب سے بڑھ کر ہے بلکہ مسجدِ نبوی علی صاحبہ الصلاۃ و السلام میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

لمافی الشامية(۱/۶۵۸): وفی تسهيل المقاصدللعلامة احمدبن العماد: ان افضل المساجدالارض الكعبةلان اول بيت وضع للناس ثم المسجدالمحيط بهالانه اقدم مسجد بمكة ثم مسجد المدينة لقوله ﷺ صلاة فی مسجدی هذاتعدل الف صلاة فيماسواه الا المسجدالحرام۔

(۳۷۹) نماز کا پڑھنا ہی اخلاق کی درستگی کا سبب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مفتی صاحب میں ابھی جماعت کے ساتھ چلہ لگا کر آیا ہوں اللہ کے فضل سے تمام اعمال میں جڑتا ہوں ہماری مسجد میں بدھ کے دن گشت ہوتا ہے ہم باہر گئے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بظاہر نیک دیندار معلوم ہوتے تھے ہم نے ان سے بات کی تو فرمانے لگے پہلے اخلاق کی درستی ہونی چاہیے پھر نماز پڑھنی چاہیے، سارے ساتھی ان کی بات سن کر حیران ہو گئے کہ یہ بات ہم نے پہلی مرتبہ سنی ہے کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز چونکہ اہم ترین عبادت ہے قرآن اور احادیث نے جابجا اس کی تاکید فرمائی ہے لہٰذا اس کو کسی حال میں ترک نہیں کیا جائے گا اخلاق کی درستی بھی شریعت میں مطلوب ہے لیکن اس کی وجہ سے نماز کو نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ نماز ہی کی برکت سے رفتہ رفتہ اخلاق کی درستگی بھی ہو جائے گی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز فحاشی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اسی طرح

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک صاحب کے بارے میں پوچھا گیا کہ نماز بھی پڑھتا ہے اور چوری بھی کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نماز اس کو اس کام سے روک دے گی لہٰذا ان صاحب کا یہ کہنا کہ پہلے صرف اخلاق کی درستگی ہو پھر نماز ہو تو یہ بات از روئے شریعت درست نہیں۔

لما فی احکام القرآن للجصاص(۳/۳۵۰): روی عن ابن مسعود وابن عباس تأمر بالمعروف وتنهی عن المنکر... وقیل أن النبی ﷺ قیل له إن فلانا یصلی باللیل ویسرق بالنهار فقال لعل صلاته تنهاه الخ۔ وقوله تعالیٰ وأقیموا وجوهکم عند کل مسجد۔ (آلایة، سورة الاعراف)

وفی الفقه علی المذاهب الأربعة(۱/۱۷۳): فهذه هی الصلوة فی نظر الدین وهی بهذا المعنی لها احسن الأثر فی تهذیب النفوس وتقویم الأخلاق فان فی کل جزء من اجزائها تمریناً علی فضیلة من الفضائل الخلقیة وتعویدا علی صفة من الصفات الحمیدة......

(۳۸۰) موبائل میں گانے والی ٹونز لگوانے اور دوران نماز موبائل کی گھنٹی بند کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موبائل فون میں گانے کی ٹونز لگوانا کیسا ہے؟ نیز نماز پڑھنے کے دوران اگر موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے تو کیا نماز کے اندر اس کو بند کیا جا سکتا ہے تا کہ دوسروں کی نماز میں خلل نہ آئے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... دین اسلام میں موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا موبائل پر گانا یا کسی بھی ایسی گھنٹی کا لگانا جس میں موسیقی کی آمیزش پائی جاتی ہو، ناجائز ہے۔ تاہم موبائل میں عام اور سادہ گھنٹی لگانی چاہیئے جس میں موسیقیت کا پہلو ظاہر نہ ہو۔ اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی موبائل بند کر دیا جائے البتہ اگر کسی وقت بند کرنا بھول جائیں اور نماز میں گھنٹی بجنے لگے تو اولاً کوشش کریں کہ بغیر عمل کثیر کے اسے ایک ہاتھ سے بند کریں البتہ اگر بغیر عمل کثیر کے اسے بند کرنا مشکل ہو یا گھنٹی کے بار بار بجنے کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کی نماز بھی خراب ہوتی ہو تو بار بار بند کرنے کے بجائے نماز توڑ کر گھنٹی بند کر دیں، تا کہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بچا جا سکے مثلاً۔

۱)...... گھنٹی کا بجتے رہنا نمازیوں کی نماز میں خلل عظیم کا باعث ہے۔

۲)...... گھنٹی کا بجتے رہنا تقدس مسجد کے پامال ہونے کا باعث ہے۔

۳)...... گھنٹی کا بجتے رہنا نماز کی کامل ادائیگی میں نقصان کا باعث ہے۔

۴)...... گھنٹی کا بجتے رہنا مسلمانوں کی ایذا رسانی کا باعث ہے۔

۵)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے کسی حد تک مشرکین کے افعال قبیحہ سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بیت اللہ میں دورانِ طواف اور مسلمانوں کی نماز میں خلل پیدا کرنے کیلئے سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔

۶)......حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال سے گھنٹی کی مذمت فرمائی ہے، اور اس کو شیطان کا آلہ فرمایا ہے۔
۷)......گھنٹی کے بجتے رہنے سے جہری نمازوں میں امام صاحب کی تلاوت اور مقتدیوں کی سماعت میں حرج پیدا ہوتا ہے۔
۸)......گھنٹی کے بجتے رہنے سے گرجا گھروں میں کی جانے والی عبادت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔ آج بھی نصاریٰ گرجا گھروں میں عبادت بجتی گھنٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔
۹)......گھنٹی کا بجتے رہنا لغویات میں شامل ہے اور نماز میں لغویات سے پرہیز از حد ضروری ہے۔
۱۰)......گھنٹی کا بجتے رہنا فرشتوں کیلئے منافرت کا باعث ہے۔ تلک عشرة کاملة

نیز نماز توڑنے کے بعد نئی تکبیر تحریمہ باندھ کر نماز میں شریک ہوجائے۔ اور امام صاحب کی ادائیگی سلام کے بعد فوت شدہ نماز کو مکمل کرے، اور ادائیگی نماز کے بعد خوب توبہ واستغفار کرے۔ اور آئندہ اس طرح کی غفلت سے اجتناب کرے۔

لمافی مجمع الانھر(۱/۲۰۸): والاصل فيه ان نقض العبادة قصداً وبلا عذر حرام واما اذا كان لامر شرعي مثل الاكمال فيجوز وان كان نقضا صورة فهو اكمال معنى كهدم المسجد لتجديده۔

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۶۰): ويكره ان يدخل في الصلاة وبه غائط اوبول فلوشرع في الصلاة مع هذا وشغله عن الصلوة قطعها جاز فان مضى جازوأساء وسواء كان به وقت الافتتاح اوحصل في الصلوة۔

(۳۸۱)فرض نمازوں کی رکعات کا احادیث مبارکہ سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں کی رکعتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ کونسی احادیث مبارکہ ہیں جو ان رکعتوں کی تعیین پر دلالت کرتی ہیں، برائے مہربانی مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب بعون الملکْ الوھاب......قرآن پاک سورۃ الروم آیت نمبر ۱۷، ۱۸ سے پانچ نمازوں کے نفس ثبوت کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم بالتفصیل: فرض نماز اور ان کی رکعات کا ذکر کتب احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فجر کی دو رکعت فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۶، ۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۶) وابوداؤد (۱/۱۱۸) ''باب الرجل يعيد سورة واحدة في الركعتين'' پر موجود ہے۔

ظہر وعصر، مغرب اور عشاء کی فرض رکعات کا اکٹھا ذکر: بخاری (۱/۷۷) وابوداؤد (۱/۱۷۱) پر موجود ہے۔ اور اسی طرح ظہر، عصر اور مغرب کی فرض رکعات کا الگ الگ ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ ظہر کی چار رکعات فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۵) و ابوداؤد (۱/۱۴۵) ترمذی (۱/۹۱) پر موجود ہے۔

عصر کی چار رکعات فرض کا ذکر: مسلم (۱/۲۲۵) پر موجود ہے۔ مغرب کی تین رکعات فرض کا ذکر بخاری (۱/۱۴۸) پر موجود ہے۔ اور

پانچوں نمازوں کی تمام فرض رکعات کا ایک ساتھ ذکر السنن الکبری للبیہقی (۱/۳۶۱) اور اعلاء السنن (۲/الجزء ۴، صفحہ ۷) پر موجود ہے۔

لمافی القرآن الکریم (سورة الروم:۱۷، ۱۸): (قال الله تعالیٰ) ''فَسُبْحٰنَ اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝

وفی التفسیر الکبیر (۱۳/۱۰۴) الجزء ۲۵: وأما المعنی فقال بعض المفسرین: المراد منه الصلوة، أی صلوا. وذکروا انه أشار الی الصلوات الخمس۔

وفی التفسیر روح المعانی (۲۸/۷): وقیل: المراد بالتسبیح الصلاة۔ واخرج عبدالرزاق والفریابي وابن جرید وابن النذر.........الی ان قال جاء نافع ابن الازرق الی ابن عباس فقال هل تجد الصلوات الخمس فی القرآن؟ فقال: نعم فقرأ (فسبحان الله حین تمسون) صلاة المغرب (وحین تصبحون) صلاة الصبح (وعشیا) صلاة العصر (وحین تظهرون) صلاة الظهر وقرء (ومن بعد صلاة العشاء) واخرج ابن ابي شیبة، وابن جریر، وابن المنذر عنه قال: جمعت هذه الآیة مواقیت الصلاة (فسبحان الله حین تمسون) المغرب والعشاء (وحین تصبحون) الفجر (وعشیا) العصر (وحین تظهرون) الظهر... الخ۔

(۳۸۲) کسی مسجد کو مسجد ضرار کہنا درست نہیں

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں منافقین نے مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد تعمیر کی تھی تو قرآن پاک میں اس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرانے کا حکم دیا تھا اب سوال یہ ہے کہ آجکل اگر کوئی شخص ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد تعمیر کر لیتا ہے تو یہ مسجد ضرار کے زمرے میں آئے گی یا نہیں؟ نیز اس میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....قرآن کریم میں جس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جسے منہدم کر کے جلا دیا گیا، درحقیقت وہ مسجد نہ تھی، بلکہ منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے اور انکے خلاف سازشیں کرنے کیلئے مسجد کا نام رکھ کر ایک عمارت بنائی تھی، جس کے چار مذموم ومکروہ مقاصد قرآن کریم نے بیان کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کرنا، مسلمانوں کے اتحاد اور جماعت میں تفریق پیدا کرنا، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغی (ابوعامر) کو پناہ گاہ فراہم کرنا۔ اس سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

(۱).....اگر کچھ مسلمان کسی مسجد کے مقابلے میں اس کے قریب دوسری مسجد ریاء ونمود یا ضد وعناد کی وجہ سے بنالیں اور بنانے کا مقصد یہی

باہم تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گنہگار ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور مسجد کے تمام آداب اور احکام اس پر جاری ہوں گے۔

(۲)......اس طرح کی مسجد کو اصطلاح میں قرآن والی مسجد ضرار کہنا درست نہیں۔

(۳)......ایسی مسجد میں نماز نہ پڑھنا بہتر ہے اگر پڑھ لی گئی تو ہو جائے گی۔

لما فی الدر المنثور فی التفسیر المأثور(۲۸۴/۴): اخرج ابن الجریر وابن المنذر و ابن ابی حاتم وابن مردویۃ والبیھقی فی الدلائل عن ابن عباس فی قولہ(والذین اتخذوا مسجدا ضرارا) قال: ھم اناس من انصار ابتنوا مسجدا. فقال لھم ابوعامر. ابنو مسجدکم واستمدوا ما استطعتم من قوۃ و سلاح فانی ذاھب الی قیصر ملك التروم فآتی بجندہ من الروم فاخرج محمدا واصحابہ۔ فلما فرغوا من مسجدھم اتوا النبی ﷺ فقالوا: قد فرغنا من بناء مسجدنا. فنحب ان تصلی فیہ وتدعو بالبرکۃ. فانزل اللہ: (لا تقم فیہ ابدا)

وفی التفسیر المظھری(۲۹۵/۴): والذین اتخذوا مسجدا ضرارا ای مضارۃ للمومنین......... وفی (ص۲۹۶): وکفرا باللہ ورسولہ ﷺ وتفریقا بین المومنین لانھم کانوا یصلون فی مسجد قبا فبنوا مسجد الضرار لیصلی فیہ بعضھم فیودی ذالك الی الاختلاف وافتراق الکلمۃ الخ. وارصادا ای انتظارا واعدادا لمن حارب اللہ ورسولہ۔ الخ

(۳۸۴) ایک طرف سے آکر نمازی کے آگے بیٹھ جانے کے بعد پھر اٹھ کر دوسری طرف جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرو نماز پڑھ رہا تھا کہ زید دائیں طرف سے آیا عمرو کے سامنے قبلہ رو بیٹھ گیا، دو تین منٹ بیٹھا تھا دو تین منٹ کے بعد بائیں طرف گیا، تو آیا زید کا اس طرح کرنا اعراض میں شمار ہے یا کہ مرور میں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں زید کا یہ فعل مرور (نمازی کے سامنے سے گزرنا) شمار ہوگا۔

لمافی صحیح البخاری(۷۲/۱):باب الصلوۃ الی السریر: عن عائشۃ (رضی اللہ عنھا) قالت: اعدلتمونا بالکلب والحمار لقد رأیتنی مضطجعۃ علی السریر فیجئ النبی ﷺ فیتوسط السریر فیصلی فأکرہ ان اسنحہ فانسل من قبل رجلی السریر حتی انسلّ من لحافی۔

وفیہ ایضاً(۷۳/۱): قال رسول اللہ ﷺ لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیہ لکان ان یقف

اربعین خیر اله من ان یمر بین یدیه الخ۔

وفی فیض الباری(۸۳/۲): قوله ((فأكره أن أسنحه)) (یعنی آری آجاؤل) وعلم ان مسألة المرور فی الفقه فیما اذا مرامامه من جانب الی جانب ولا تفصیل فیه فیما اذا کان قاعدا فصلی خلفه رجل هل ینسل ام لا قلت: فلیعمل بهذا لحدیث ولا شك ان الانسلال أفید وهو الخروج من التحت خفیة والسنوح اقرب من المرور فلذا كانت تكرهه۔

وفی الشامیة(۶۳۶/۱): ولو مر إثنان یقوم أحدهما أمامه ویمرالاخر ویفعل الاخر هکذا یمران۔

(۳۸۴) سترہ کی مقدار اور اس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی صحرا میں ایک امام ہے اور اس کے پیچھے مقتدی بھی ہیں، اب جماعت پڑھنے کے دوران صرف امام کے سامنے کا سترہ کافی ہے یا مقتدی بھی سترہ لگائیں گے، اور سترے کی مقدار کتنی ہونی چاہیئے؟

الجواب بعون الملك الوهاب...... امام کا سترہ مقتدیوں کیلئے کافی ہے اور سترہ کی مقدار کم از کم ایک ذراع لمبی اور ایک انگلی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے۔

لمافی معارف السنن(۳۴۹/۳): واتفق الثلاثة علی ان سترة الإمام سترة لمن خلفه۔

معارف السنن(۳۵۰/۳): ونقح فقهاؤنا الحنیفة قدر السترة بالذراع طولا وبالمسبحة ثخنا وغلظا كما هو فی عامة كتبنا۔ وفی (۳۵۳/۳) أنه اذا صلی خاشعا رامیا بصره الی موضع سجوده لا یقع بصره علیه واختار ابن الهمام فی الفتح (۲۸۸/۱) فی الخلاصة وهو الصحیح وفی البدائع: وهو الأصح، وفی النهایة وهو الأشبة، وراجع ''الفتح'' للتفصیل اهـ۔

وفی البحر الرائق (۱۰/۲): واختار فخر الاسلام فانه قال اذا صلی رامیابصره إلی موضع سجوده فله یقع علیه بصره له یكره وهذا حسن وفی البدائع وقال بعضهم قدر ما یقع بصره علی المار لوصلی بخشوع وفیما وراء ذلك لایكره وهو الأصح ورجحه فی النهایة بأنه اشبه الصواب۔

(۳۸۵) حضور ﷺ کیسے درود پڑھتے تھے؟ کیا آپ پر درود پڑھنا واجب تھا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کس طرح درود پڑھا کرتے تھے اور

آپ کیلئے درود کا کیا حکم تھا؟ براہ کرم بحوالہ جواب جلد از جلد مرحمت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں درج ذیل درود پڑھا کرتے تھے۔

اللھم صل علی محمد و اٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم و اٰل ابراھیم و بارک علی محمد و اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم و اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ (السنن الکبری للبیھقی ۲/۱۴۷، مطبع ادارہ تالیفات اشرفیہ)

نیز اس کے علاوہ بھی الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ، مختلف روایات میں درود پڑھنے کا حکم ہے۔ جیسے اللھم صل علی محمد و علی اٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید اللھم بارک علی محمد و علی اٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔ (ابن ماجہ ص۶۵، مستدرک حاکم علی الصحیحین ۳/۱۶۰) جہاں تک "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود کے حکم" کی بات ہے تو آپ کے لئے اپنے اوپر درود بھیجنا واجب نہیں تھا۔

لمافی السنن الکبری للبیھقی (۲/۱۴۷): عن کعب بن عجرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یقول فی الصلوۃ اللھم صل علی محمد واٰل محمد کما صلیت علی ابراھیم واٰل ابراھیم وبارك علی محمد واٰل محمد کما بارکت علی ابراھیم واٰل ابراھیم انك حمید مجید۔

وفی الدر المختار (۱/۵۱۵): وفی المجتبی: لا یجب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یصلی علی نفسہ۔

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ لا یجب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یصلی علی نفسہ) لانہ غیر مراد بخطاب صلوا ولا داخل تحت ضمیرہ کما ھو المتبادر من ترکیب۔ صلوا علیہ۔ وقال فی النھر: لا یجب علیہ بناء علی ان۔ یایھا الذین امنوا۔ لا یتناول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، بخلاف۔ یایھا الناس۔ یا عبادی کما عرف فی الاصول اھ۔

وفی النھر الفائق (۱/۲۲۳): قال فی ((المجتبی)) معزیا الی ((خزانۃ الاکمل)): ھذا فی حق الامۃ اما ھو فلا یجب علیہ ان یصلی علی نفسہ انتھی بناء علی ان (یایھا الذین امنوا) لا تتناول الرسول بخلاف (یایھا الناس) (یاعبادی) کما عرف فی الاصول۔

(۳۸۶) "ہر وہ نماز جو کراہت تحریمیہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے" کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ یہ جو قاعدہ ذکر کیا گیا ہے کل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟ اور جو بھی نماز مکروہ تحریمی ہو جائے اور جس طرح بھی کراہت تحریمی آئی ہو، اس صورت

میں نماز کا اعادہ واجب ہے یا اس میں تخصیص ہے اور کیا یہ وجوب وقت کے اندر ہے یا وقت کے بعد بھی اس کا اعادہ واجب ہے؟

(۲)۔ نیز اگر تصویر سامنے ہو، اور نماز ادا کرلی تو علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ جو کراہت ماہیت صلاۃ میں آئی ہو، اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے ورنہ نہیں اور کیا تصویر اگر سامنے ہو، اور نماز پڑھ لی تو جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب بعون الملک الوھاب...... مذکورہ قاعدہ کلی ہے اور کراہت، ماہیتِ صلوۃ میں داخل ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ اس میں علامہ شامیؒ نے ماہیت اور خارج از ماہیتِ صلوۃ سے اعادے اور عدم اعادے کا فرق کیا ہے اور اسے ''الاقرب'' قرار دیا ہے۔ (اگرچہ آخر میں وہ خود اس پر مطمئن نہیں۔) لیکن درست بات یہ ہے کہ ہر وہ نماز جو کراہت تحریم کے ساتھ اداء ہو وہ واجب الاعادہ ہوگی اور اس میں ماہیت اور خارج از ماہیت کا فرق نہ کیا جائے۔

تصویر والے کپڑوں میں نماز چونکہ مکروہ تحریمی ہے لہٰذا اس کا اعادہ کیا جائے گا کیونکہ ہر مکروہ تحریمی کے ساتھ اداء نماز کا اعادہ واجب ہے۔ علامہ شامیؒ بحث کے آخر میں ماہیت اور غیر ماہیت کے فرق پر مطمئن نہیں وہ فرماتے ہیں:

لكن قولهم كل صلاة أديت مع كراهة التحريم يشمل ترك الواجب وغيره ويؤيده ما صرحوا به من وجوب الإعادة بالصلاة في ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلي وهو حامل الصنم۔

(شامية ۱/۴۵۷)

البتہ علامہ رافعیؒ نے یہ (ماہیت اور غیر ماہیت کا) فرق لیا ہے لیکن انہوں نے تصویر والے کپڑوں میں نماز کو ماہیت صلوۃ میں ہی داخل فرما دیا ہے اور نماز کو واجب الاعادہ قرار دیا ہے۔ علامہ رافعیؒ کی عبارت یہ ہے:

(قوله : ويؤيده ما صرّحوا الخ) قد يقال ان ذلك ليس من واجبات اللباس بل يقال خلوّ المصلى عن ثوب فيه صورة أو عن حمله صنماً من واجبات الصلاة۔ (التحرير المختار ۱/۵۷)

نیز وقت کے اندر اور گزرنے کے بعد دونوں صورتوں میں کراہت تحریمی کے ساتھ اداء نماز کا اعادہ واجب ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۴۵۷): وكذا كل صلوٰة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها والمختار انه جابر للاول۔

وفی الشامية: وان النقص اذا دخل فی صلاة الامام ولم يجبر وجبت الاعادة على المقتدى ايضا: وانه يستثنى منه الجمعة والعيد اذا اديت مع كراهة التحريم الا اذا اعادها الامام والقوم جميعا...... بقى هنا شى وهو ان صلاة الجماعة واجبة على الراجح فی المذهب او سنة موكدة فی حكم الواجب كمافی البحر وصرحوا بفسق تاركها وتعزيره وانه يأثم ومقتضى هذا انه لو صلى مفردا يومر باعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرحوا به فی باب ادراك الفريضة من انه لو صلى

ثلاث ركعات من الظهر ثم اقيمت الجماعة يتم ويقتدى متطوعا فانه كالصريح فى انه ليس له اعادة الظهر بالجماعة مع ان صلاته منفردا مكروهة تحريماً او قريبة من التحريم۔ فيخالف تلك القاعدة، الا ان يدعى تخصيصها بان مرادهم بالواجب والسنة التى تعاد بتركه ما كان من ماهية الصلاة واجزائها فلا يشمل الجماعة لانها وصف لها خارج عن ماهيتها او يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدى متطوعا بما اذا كانت صلاته منفردا لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفردا مكروهة والاقرب الاول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لانها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة ويويده ايضاً انهم قالوا يجب الترتيب فى سور القرآن، فلو قرأ منكوساً اثم لكن لا يلزمه سجود السهو لان ذالك من واجبات القراءة لا من واجبات الصلاة كماذكر فى البحر فى باب السهو لكن قولهم كل صلوة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترك الواجب وغيره ويويده ما صرحوا به من وجوب الاعادة بالصلاة فى ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلى وهو حامل الصنم۔[1]

(۳۸۷) دونمازوں کوایک وقت میں جمع کرکے ادا کرنے کا حکم اوراس کی شرائط

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں مجھے بتارہے تھے کہ حج کے موقع پرایک دن ایسا ہوتا ہے کہ ظہر وعصر کی نماز ظہر کے وقت جماعت سے پڑھی جاتی ہے، اگرکسی کی جماعت نکل گئی تو پھر ظہر کی ظہر کے وقت اور عصر کی عصر کے وقت ہی پڑھی جاتی ہے، اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء، عشاء کے وقت میں ایک ساتھ پڑھی جاتی ہے خواہ جماعت سے پڑھو یا اکیلے اکیلے۔ ہم نے تو آج تک کبھی ایسے نہیں پڑھی، کیا یہ صرف حج کے موقع پرسب جگہ پڑھی جاسکتی ہے یا صرف حاجیوں کواس کی اجازت ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اوراس کی شرائط کیا ہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے اس مسئلہ کوذکر کردیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب..... نماز صحیح ہونے کیلئے وقت شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں نماز کواس کے مقررہ وقت میں پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَوْقُوْتاً۔ (بے شک نماز مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے) (سورۂ نساء: ۱۰۳)۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونمازوں کوایک وقت میں جمع کرکے ادا کرنے سے لوگوں کومنع کیا اور فرمایا کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ اورامام محمد رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں

---

[1] نوٹ: مسئلہ ھذا کی مکمل تحقیق نجم الفتاوی، کتاب الصلوۃ کے مسئلہ ۱۸۷ میں مدلل فتوے'' الافاضة فى قاعدة الفقهاء كل صلوة اديت مع الكراهة تجب الاعادة'' کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ازمرتب فرحان حسن عفی عنہ

کہ عرفات میں ظہر اور عصر کو اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کرنے کے علاوہ ہم دونمازوں کو ایک وقت میں جمع نہیں کرتے لہٰذا معلوم ہوا کہ عرفات اور مزدلفہ کے علاوہ باقی کہیں بھی دونمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا جائز نہیں۔اور جوازِ جمع بھی صرف حاجیوں کیلئے ہے۔ وہ بھی چند شرائط کے ساتھ جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔اس کی وجہ حضور ﷺ کا عمل ہے جو کہ احادیث سے ثابت ہے اور دوسری وجہ جماعت کی حفاظت ہے۔عصر کو ظہر کے وقت میں ظہر کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔(۱) امام اعظم یا اس کے نائب کا نماز پڑھانا۔(۲) ظہر کی ادائیگی سے قبل ہی احرام حج میں ہونا۔(۳) ظہر کو عصر سے پہلے ادا کرنا۔(۴) عرفات کا دن ہونا۔(۵) عرفات کا میدان ہونا۔(۶) امام اعظم کی اقتداء میں دونوں نمازوں کو باجماعت ادا کرنا۔مغرب کو عشاء کے وقت میں عشاء کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔(۱) احرام حج۔(۲) وقوف عرفہ کو مقدم کرنا۔(۳) عیدالاضحیٰ کی رات ہونا۔(۴) مزدلفہ کا میدان ہونا۔(۵) عشاء کا وقت ہونا۔

لمافی الهندية(٢٢٨،٢٢٩/١): ثم لجواز الجمع أعنى تقديم العصر على وقتها وادائها فى وقت الظهر شرائط ((منها)) ان تكون مرتبة على ظهر جائز استحسانا...... ((ومنها الوقت)) وهو ان يكون يوم عرفة ((والمكان)) وهو عرفات كذا فى الكفاية((ومنها احرام الحج)) قالوا ينبغى ان يكون محرما بالحج عند اداء الصلاتين... ثم لابد من الاحرام بالحج قبل الزوال فى رواية تقديما للاحرام على وقت الجمع وفى اخرى يكتفى بالتقديم على الصلاة لان المقصود هو الصلاة هو الصحيح كذا فى الهداية ...((ومنها الجماعة)) عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وعندهما ليست بشرط۔ فمن صلى الظهر وحده فى رحله صلى العصر فى وقته عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وقالا يجمع بينهما المنفرد كذا فى الهداية والصحيح قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ۔ كذا فى الزاد ولو فاتتا مع الامام او فاتته واحدة منهما صلى العصر لوقته ولا يجوز له تقديم العصر على قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ۔ ولا يشترط الامام لجميع اداء الظهر... فاذا ادرك مع الامام ركعة واحدة من الصلاتين او شيئا من الصلاتين جاز الجمع اجماعاً كذا فى الجوهرة النيرة۔ ولو نفرالناس عن الامام فصلى وحده الصلاتين جاز... ((ومنها)) ان يكون الامام هو الامام الاعظم او نائبه وهو شرط عند ابى حنيفة رحمه الله۔ فلو صلى الظهر بجماعة لامع الامام والعصر مع الامام لم يجز العصر عند ابى حنيفة رحمه الله والصحيح قوله هكذا فى البدائع۔ ولو مات الامام وهو الخليفة جمع نائبه او صاحب شرطته ولو لم يكن نائب ولا صاحب شرطته صلوا كل واحدة منهما فى وقتها كذا فى التبيين۔

وفيه ايضاً(ص٢٣٠): والافضل ان يصلى مع الامام بالجماعة كذا فى الايضاح۔ ذكر الامام

المحبوبی ولا یشترط فی جمع المزدلفة الخطبة و السلطان والجماعة والاحرام کذا فی الکفایة وفی الشامیة(۲/۵۰۴): (تنبیه) اقتصر من الشروط علی الإمام والإحرام وزاد فی اللباب تقدیم الظهر علی العصر حتی لو تبین للإمام وقوع الظهر قبل الزوال أو بغیر وضوء والعصر بعده او بوضوء اعادهما جمیعا والزمان وهو یوم عرفة والمکان وهو عرفة وما قرب منها والجماعة فالشروط ستة۔

(۳۸۸) داڑھی منڈوانے والے شخص کو صف اول سے پیچھے کر دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص شیو کرتا ہو تو کیا اس کو صف اوّل میں نماز پڑھنے سے روکا جائے گا یا نہیں؟ آیا شیو کی وجہ سے اس کو صف اوّل سے محروم کیا جائے گا یا نہیں؟ کراچی کے ایک بہت بڑے عالم ہیں، وہ اپنی مسجد میں شیو کرنے والوں کو صف اول سے نکال دیتے ہیں آیا ان کا یہ فعل درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل فرمائیں عین نوازش ہوگی۔شکریہ

الجواب بعون الملک الوهاب......داڑھی رکھنا واجب ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور داڑھی کو منڈوانا حرام ہے۔جو لوگ اس حرام کام میں مبتلا ہوں ان کو چاہیے کہ اس سے اجتناب کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کریں۔اور جماعت سے نماز پڑھتے وقت ایسے لوگوں کو چاہیے کہ علماء وصلحاء سے بڑھ کر پہلی صف میں کھڑے نہ ہو جائیں بلکہ پہلی صف میں ایسے لوگ کھڑے ہو جائیں جو علماء وصلحاء ہوں جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں (لیلینی منکم اولو الاحلام والنھی) علامہ شعرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ صف اول میں وہ لوگ کھڑے ہو جائیں جن کا ظاہر وباطن اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ورنہ ان کیلئے آخری صفوں میں کھڑا ہونا بہتر ہے (اعلاء السنن، ۴/۳۶۶)۔البتہ ایسے لوگوں کے کھڑے ہو جانے کے بعد بھی اگر پہلی صف میں کوئی خلاء باقی رہ جائے تو پھر اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ پہلی صف کو مکمل کریں اور اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ جس کو اپنے علاقے میں لوگ اپنا مقتداء مانتے ہوں اور اسکی بات کی وجہ سے لوگ دین سے متنفر نہ ہوتے ہوں تو ایسا عالم اگر اصلاح کیلئے زجراً ان لوگوں کو جو داڑھی منڈاتے ہوں پہلی صف سے ہٹادے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۲/۸۷۵): عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ خالفوا المشرکین او فروا اللحی واحفوا الشوارب۔

وفی البدایة والنهایة (۴/۲۶۹): ودخلا علی رسول الله ﷺ وقد حلقا لحاهما وأعفیا شواربهما فکره النظر الیهما وقال، ویلکما من أمر کما بهذا؟ قالا امرنا ربنا یعنیان کسری، فقال رسول الله ﷺ ولکن ربي أمرني بإعفاء لحیتي وقص شاربي۔

وفى الصحيح لمسلم (١/١٨١): عن ابن مسعود قال كان رسول الله ﷺ يمسح مناكبنا فى الصلاةويقول استوو اولا تختلفوا فتختلف قلوبكم وليلنى منكم اولو الاحلام والنُّهى ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم۔

وفى اعلاء السنن (٣٦٥،٣٦٦/٤): قلت وعلى هذا، فيجوز إيثار العالم وكبير السن بالصف الأول بل يجب نظرا إلى الأمر. فإن الجاهل والصغير مأمور بالتأخر عن اهل الحلم والنهى، ويؤيده مارواه الحاكم فى مستدركه عن أبي بن كعب مرفوعا ''لا يقوم فى الصف الاول الا المهاجرون والانصار'' ذكره فى كنز العمال بلا تعقب (٤:١٣٥) فهو صحيح على قاعدته، وهو صريح فى النهى لغير هؤلاء عن التقدم الى الصف الأول. وتخصيص الانصار والمهاجرين بالذكر لكونهم أولى الأحلام والنهى اذ ذاك فى الأغلب. وكونهم افضل من غيرهم۔ وأفاد هذا الحديث أن أمر المسارعة الى الصف الاول ليس على إطلاقه بل هو مختص بأولى الفضل و الصلاح، وكذا الوعيد الوارد على التأخر عنه مختص بهم أيضا نعم ايشمل الوعيد غيرهم اذا بقى فى الصف الأول فرجة فلم يسدوها فافهم. فلو تأخر أحد عن الصف الاول لخلوه عن الصلاح والفضل والتقوى بشرط أن يرجوا كمال الصف بغيره ممن هو اهله فله ذلك ولا لوم عليه. بل ذلك متعين فى حقه۔

قال العلامة الشعرانى فى العهود المحمدية. أخذ علينا العهد إذا صفت سرائرنا من جميع ما يسخط الله عزوجل بحيث لم يبق فى سرائرنا وظواهرنا الا ما يرضى ربنا أن نواظب على الصلوة فى الصف الأول عملا بقوله ﷺ ليلنى منكم اولو الاحلام و النهى اى العقل ولا يكون العبد عاقلا الا اذا كان بهذا الوصف الذى ذكرناه فإن من كان فى ظاهره أو باطنه صفة يكرهها الله تعالىٰ فليس بعاقل كامل ولا يتقدم للصف الأول بين يدى الله فى المواكب الإلهية الا الأنبياء والملائكة ومن كان على اخلاقهم وأما من تخلف عن اخلاقهم فيقف فى آخريات الناس۔

وفى الشامية(٤١٨/٢): وأما الأخذ منها وهى دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد۔

(۳۸۹) فرض نماز اور تراویح کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں اور تراویح اوراسی طرح جب وتر نماز جماعت

کے ساتھ رمضان میں ادا کی جاتی ہے، اس کے بعد دعا انفرادی طور پر تو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کو ادلہ شریعہ سے واضح کریں۔ شکریہ

الجواب بعون الملک الوھاب......دعا ایک عبادت ہے، کثرت سے احادیث مبارکہ دعا کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جن سے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ تاہم بعض حضرات نماز کے بعد دعا کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرض نمازوں اور تراویح کے بعد امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ اس طور پر التزام کہ امام کے ساتھ دعا کے شروع کرنے اور ختم کرنے کو لازم سمجھنا یا بغیر دعا مانگے اٹھنے والے کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اور اسی طرح اس بے جا التزام کی آڑ میں نفس دعا ہی کا انکار کر دینا دونوں امر حد سے متجاوز اور غلو فی الدین کے مترادف ہیں۔ ان سے اجتناب انتہائی ضروری ہے خاص طور پر ہمارے زمانے میں جبکہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ اور فقط چند عبادات میں امت کی اجتماعیت کی اک کرن باقی ہے۔ اس میں بھی اختلاف وانتشار کا دروازہ کھول لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

لمافی البخاری(۹۳۷/۲): باب الدعاء بعد الصلوۃ: ...عن ورّاد مولی المغیرۃ بن شعبۃ قال کتب المغیرۃ الی معاویۃ ابن ابی سفیان ان رسول اللہ ﷺ کان یقول فی دبر صلوتہ اذا سلّم لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر. اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد۔

وفی فتح الباری(۱۱۱/۱۱): (قولہ باب الدعاء بعد الصلوۃ) ای المکتوبۃ.وفی ھذہ الترجمۃ رد علی من زعم أن الدعاء بعد الصلوۃ لا یشرع متمسکا بالحدیث الذی اخرجہ مسلم والجواب ان المراد بالنفی المذکور نفی استمرارہ جالسا علی ھیئتہ قبل السلام الا بقدر ان یقول ما ذکر۔ فقد ثبت انہ کان اذا صلی أقبل علی أصحابہ فیحمل ماورد من الدعاء بعد الصلوۃ علی انہ کان یقول بعد ان یقبل بوجھہ علی اصحابہ۔

وفی فیض الباری علی صحیح البخاری(۴۱۷/۴): باب ''الدعاء بعد الصلاۃ'' لا ریب ان الادعیۃ دبر الصّلوات قد تواترت تواترا لا ینکر, اما رفع الأیدی فثبت بعد النافلۃ مرۃ او مرتین, فالحق بھا الفقھاء المکتوبۃ ایضا, وذھب ابن تیمیۃ وابن القیم إلی کونہ بدعۃ بقی ان المواظبۃ علی امر لم یثبت عن النبی ﷺ الامرۃ او مرتین, کیف ھی فتلک ھی الشاکلۃ فی جمیع المستحبات فانھا تثبت طورا فطورا, ثم الامۃ تواظب علیھا, نعم نحکم بکونھا بدعۃ اذا افضی الامر إلی النکیر علی من ترکھا۔

وفی اعلاء السنن(۳/۱۸۳): قال الحافظ فی الفتح: قال ابن المنير: ان المندوبات قد تنقلب مكروهات اذا رفعت عن رتبتها، لان التيامن مستحب فی كل شئ من أمور العبادة لكن لما خشی ابن مسعود ان يعتقدو لوجوبه اشار الی كراهته۔ والله اعلم اھ۔

وليتنبه لهذا من يصر علی القيام عند ذكر الولادة الشريفة ويطعن فی من لا يقوم وكذا كل من رفع المباح او المندوب عن رتبتهما وطعن فی تاركهما فافهم۔

وفی مجموعة الفتاوی علی خلاصة الفتاوی(۱/۱۰۰): الجواب صحيح والرای نجيح ويؤيد ما رواه ابو بكر بن ابي شيبة فی المصنف عن الاسود العامری عن ابيه قال صليت مع رسول الله ﷺ الفجر فلما سلم انصرف ورفع يديه ودعا الحديث۔ فثبت بعد الصلوة المفروضة رفع اليدين فی الدعا عن سيد الانبياء و اسوة الاتقياء صلعم كما لا يخفی علی العلماء الأذكياء۔

باب احكام المساجد

(مساجد کے احکام کا بیان)

(۳۹۰) مسجد میں کسی جگہ رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّے کی مسجد میں دو چار آدمی ایسے ہیں جو کہ پہلی صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرتے ہیں اور خود وضو وغیرہ کیلئے چلے جاتے ہیں تو کیا اس طرح صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... جو شخص پہلے آکر مسجد میں نہ بیٹھا ہو وہ اپنا رومال کسی جگہ مسجد میں قبضہ کرنے کی غرض سے رکھ دے یہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس سے اس کا حق بھی قائم نہیں ہوتا، خواہ وضو کیلئے جائے یا اور کسی غرض سے جائے۔ ہاں وہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا، لیکن کسی عذر کی وجہ سے چلا جائے تو پھر گنجائش ہے۔

لمافی الهندية(١٠٨/١): ويكره للانسان ان يخص لنفسه مكانا فى المسجد يصلى فيه۔

وفى الشامية(٦٦٢/١): قوله وتخصيص مكان لنفسه: لانه يخل بالخشوع كذا فى القنية اى لانه اذا اعتاده ثم صلى فى غيره يبقى باله مشغولا بالاوّل بخلاف ما اذا لم يالف مكانا معينا (قوله وليس له) قال فى القنية له فى المسجد موضع معين يواظب عليه وقد شغله غيره قال الاوزاعى له ان يزعجه وليس له ذلك عندنا اى لان المسجد ليس ملكا لاحد۔ بحر عن النهاية قلت: وينبغى تقييده بما إذا لم يقم عنه على نية العود بلا مهلة، كما لو قام للوضوء مثلا ولا سيما إذا وضع فيه ثوبه لتحقق سبق يده تأمل۔

(۳۹۱) سرکاری زمین میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع اور اس میں نماز پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع کرنا اور اور اس میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد بنائے اوران کی توسیع کرے اگرحکومت اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو وہ گناہگار ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ سرکاری زمینیں دوقسم کی ہیں پہلی قسم وہ زمینیں جوصرف حکومت کی ملکیت میں ہوں اور عوام کا اس میں کوئی حق نہ ہو، مثلاً حکومت نے اس کو ہسپتال یا اسکول کیلئے خاص کیا ہو، تو ایسی زمینوں میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا یا اس کی توسیع کرنا جائز نہیں اور اگر بنائی گئی تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

دوسری قسم وہ زمینیں جو رفاہی ہوں جیسے مویشیوں کی چراگاہ، بچوں کے کھیل کے میدان وغیرہ تو اس میں ضرورت کے وقت حکومت کی اجازت کے بغیر بھی مسجد کی توسیع کرنا جائز ہے، اوراس میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

لمافی الهندية(٣٥٣/٢): ومنها الملك وقت الوقف حتى لوغصب ارضافوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه اوصالح على مال دفعه اليه لاتكون وقفا كذا فى البحر الرائق۔

وفيه ايضاً(٤٥٦/٢): ارض وقف على مسجد والارض بجنب ذلك المسجد وارادوا ان يزيدوا فى المسجد شيئا من الارض جاز لكن يرفعون الامرالى القاضى ليأذن لهم۔

وفى الفقه الاسلامى(٤٦٠٧/٦): الأراضى نوعان ارض مملوكة وارض مباحة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة نوعان ايضا نوع هو من مرافق البلد للاحتطاب ورعى المواشى ونوع ليس من مرافقها وهو الارض الموات اوما يسمى الآن املاك الدولة العامة۔

وفيه ايضاً(٤٦٠٨/٦): ما كان من مرافق أهل بلدة تستعمل مرعى للمواشى ومحتطبا لهم أو مقبرة لموتاهم أو ملعباً لصغارهم، سواء كانت داخل البلدة أم خارجها فيكون حقالهم لامواتا فلا يجوز للإمام أن يقطعه لأحد۔

رسالة

بيان الغرائب في الأراضي المتصلة بالمساجد

مساجد سے متصل S.T پلاٹ جو نفع عامہ کیلئے ہوں کوئی ان کا مالک نہ ہو ایسے پلاٹوں کا حکم

(۳۹۲) مسجد سے متصل جنازہ گاہ کے .S.T پلاٹ کا حقدار کون ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں ہمارا گاؤں قصور سے قریب واقع ہے چند دن قبل ایک مسئلہ پیش آیا آپ کو تفصیل سے لکھ کر بھیج رہا ہوں ازراہِ کرم تحقیقی جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

مسئلہ یہ پیش آیا کہ ہمارے علاقے کی مسجد S.T پلاٹ پر بنی تھی آج سے تقریباً 35 سال قبل مسجد کی تعمیر ہوئی لیکن 18 سال قبل 1995ء میں ایک شخص نے مسجد کے آگے کے حصے میں موجود تقریباً 33 گز جگہ جو کہ مسجد کے کل احاطے میں تو شامل ہے البتہ اسے خالی چھوڑا گیا تھا یہ جگہ جنازہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس شخص نے اس جنازہ گاہ کی جگہ پر ملکیت کا دعویٰ کر دیا اور KDA کی طرف سے جاری کردہ کاغذات بھی لے آیا۔

مسجد کے کمیٹی کے ارکان جب KDA پہنچے اور ان سے پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ پلاٹ ہم نے ریزرو کیا تھا اور یہ مسجد کے S.T پلاٹ سے ریزرو کردہ جگہ تھی اس لیے ہم نے یہ جگہ اس شخص کو فروخت کر دی ہے۔

ہمارے علاقے میں چونکہ عدالتی نظام نہیں فیصلے پنچائیت یا جرگوں میں ہوتے ہیں لہٰذا یہ مسئلہ بھی پنچائیت میں آیا تو پنچائیت نے حکومت کے حق میں فیصلہ دے دیا اور کمیٹی والوں کے زعم کے برخلاف اس خرید وفروخت کو منعقد قرار دیا۔ کمیٹی والوں نے (میں بھی کمیٹی کا رکن ہوں) اس فیصلے پر احتجاج کیا اور اسے شرعی دلائل سے متضاد قرار دیا کیونکہ پلاٹ مسجد سے متصل تھا البتہ پنچائیت والوں کا کہنا تھا کہ مسجد نبوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر بنائی تھی اس لیے مساجد کیلئے زمینیں خریدنا چاہیے اور یہ مسجد والوں کی کوتاہی ہے کہ جب K.D.A اس پلاٹ کو بیچ رہا تھا تو وہ آگے بڑھ کر اسے خرید لیتے لیکن انہوں نے نہیں خریدی لہٰذا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب آپ سے درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

۱)۔ کسی کی شخصی ملکیت میں مسجد بنانا درست ہے یا نہیں؟ یا شخصی ملکیت کو جنازہ گاہ کے طور پر استعمال کرنا کیسا ہے؟

۲)۔ رفاہی S.T پلاٹ پر مسجد بنانا کیسا ہے؟ یا ایسے پلاٹ پر پارک بنانا کیسا ہے؟ یا اسے جنازہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا کیا حکم

ہے؟

۳)۔S.T پلاٹ سے ریزروکردہ پلاٹ کا کیا حکم ہے؟

۴)۔S.T پلاٹ یا اس سے ریزروکردہ پلاٹ کو بیچنا کیسا ہے؟

۵)۔S.T یا اس سے ریزروکردہ پلاٹ اگر 35 سال سے جنازہ گاہ کے طور پر استعمال ہورہا ہو تو حکومت یا کے ڈی اے کا اسے بیچنا درست ہے؟ کیا اس کی بیع یا ہبہ نافذ ہوگا یا اسے بدستور جنازہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہے گا؟

۶)۔مسجدِ نبوی کا معاملہ کیا ہے؟ پنچائیت والوں کا اسے بیچ میں لانا درست ہے؟

۷)۔اگر مسجد کی توسیع کی جائے تو شخصی مکان خریدنے کی کیا حیثیت ہے؟ کیا جبراً کسی کو اپنا ذاتی مکان بیچنے پر تیار کیا جاسکتا ہے؟

۸)۔حرمین شریفین کی جو توسیع ہوئی تھی وہ میلوں پر محیط ہے اور ظاہر ہے شخصی مکان بھی خریدے گئے ہیں وہ کس طرح حاصل کئے گئے؟

ازراہِ کرم مسئلے کی مفصل تنقیح فرماتے ہوئے مدلل ومبرہن جواب عنایت فرمائیں اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں آپ کے سوالوں کے جوابات سے قبل چند باتوں کا ملحوظِ نظر ہونا ضروری ہے:

۱)۔حکومت کے پاس دوطرح کی زمینیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کی ملکیت دینے کا حکومت کے پاس اختیار ہوتا ہے۔یہ وہ شخصی پلاٹ ہیں جنہیں KDA شخصی ملکیت کے طور پر فروخت کرکے الاٹمنٹ کردیتی ہے دوسری قسم کی زمینیں وہ ہوتی ہیں جنہیں حکومت S.T یعنی رفاہی کاموں کیلئے خاص کردیتی ہے اور یہ مصالحِ عامہ یعنی مساجد، پارک وغیرہ کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔

پھران رفاہی پلاٹوں کی بھی دوقسمیں ہیں ایک وہ جو کسی خاص مقصد کیلئے نامزد ہوں یعنی اس خاص پلاٹ پر وہی مخصوص کام انجام دینا طے پایا ہو اور دوسری وہ قسم جو کسی خاص مقصد کیلئے نامزد نہ ہو بلکہ عامۃ المسلمین کیلئے خالی چھوڑ دی گئی ہو اور یہ زمین بھی رفاہی کاموں کیلئے استعمال ہوگی۔حکومت ان میں سے پہلی قسم کی زمینوں کو تو بیچنے کی مجاز ہے اور وہ انہیں شخصی ملکیت میں بھی دے سکتی ہے لیکن S.T پلاٹ (چاہے خاص مقصد کیلئے نامزد ہو یا نہ ہو) کا بیچنا یا ہدیہ کرنا حکومت یا متعلقہ محکمے کے اختیار میں نہیں چنانچہ ایسی بیع منعقد نہ ہوگی کیونکہ S.T پلاٹ اب ذاتی ملکیت میں نہ رہا اور نہ اسے کسی کی ذاتی ملکیت میں دیا جاسکتا ہے۔S.T پلاٹ سے ریزروکردہ پلاٹ کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ رفاہی کاموں کیلئے مخصوص ہوگا اس کی خرید وفروخت جائز نہیں۔

حکومت کا اس طرح زمینوں کو رفاہی کاموں کیلئے خاص کرنا شرعی اصطلاح میں "ارصاد" کہلاتا ہے یہ بھی ایک طرح کا وقف ہے اگرچہ وقفِ حقیقی نہیں فقہاء نے یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر حکومت نے زمین کو کسی خاص مقصد مثلاً پارک کیلئے مخصوص کردیا تو اگلی حکومت اس رفاہی کام کی جہت بھی تبدیل نہیں کرسکتی بلکہ اب اس زمین کو پارک کیلئے ہی استعمال کیا جائے گا، فتاویٰ ردالمحتار المعروف بالشامیہ میں علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں:

وحاصل ما ذكره صاحب البحر في رسالته التحفة المرضية في الأراضي المصرية أن الواقف لأرض من الأراضي لا يخلو إما أن يكون مالكا لها من الأصل ---- وإن كان الواقف لها

السلطان من بيت المال من غير شراء فأفتى العلامة قاسم بأن الوقف صحيح أجاب به حين سئل عن وقف السلطان جقمق فإنه أرصد أرضا من بيت المال على مصالح مسجد وأفتى بأن سلطانا آخر لا يملك إبطاله۔حاصل ما في الرسالة.... مراد العلامة قاسم بقوله إن الوقف صحيح أي لازم لا ينقض على وجه الأرصاد المقصود منه وصول المستحقين إلى حقوقهم ولم يرد حقيقة الوقف...قوله (ويؤجر) لأن بيت المال معد لمصالح المسلمين فإذا أبده على مصرفه الشرعي يثاب لا سيما إذا كان يخاف عليه أمراء الجور الذين يصرفونه في غير مصرفه الشرعي فيكون قد منع من يجيء منهم ويتصرف ذلك التصرف ذكره العلامة عبد البر ط ومفاده أنه إرصاد لا وقف حقيقة۔

"صاحب بحر نے رسالہ التحفۃ المرضیۃ فی الاراضی المصریۃ میں جو ذکر کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ زمین کو وقف کرنے والا لامحالہ یا تو اس زمین کا مالک ہوگا............... اور اگر اس کو وقف کرنے والا بادشاہ (حکومت) ہے اور وہ بیت المال سے خریدے بغیر وقف کرتا ہے تو علامہ قاسمؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ وقف صحیح ہے، علامہ قاسمؒ نے یہ جواب تب دیا جب ان سے سلطان جقمق کے وقف سے متعلق سوال کیا گیا کیونکہ انہوں نے بیت المال سے ہی مسجد کے مصالح کیلئے زمین وقف کی تھی اور علامہ نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ دوسرا بادشاہ اس وقف کو باطل کرنے کا اہل نہیں یہ رسالہ میں موجود تحریر کا خلاصہ ہے۔
علامہ قاسمؒ کی مراد یہ ہے کہ یہ وقف صحیح اور لازم ہے اور اس سے جو مقصود ہے یعنی مستحقین تک ان کے حق کو پہنچانا اسے باطل نہیں کیا جاسکتا، علامہؒ نے حقیقی وقف مراد نہیں لیا.......... (مصنف کا قول: ویؤجر اور اسے اجر ملے گا) کیونکہ بیت المال مصالح مسلمین کیلئے بنایا جاتا ہے اور جب وہ اسے اس کے شرعی مصرف کیلئے ہمیشگی کے طور پر خاص کر دیتا ہے تو اس پر اسے ثواب ملے گا خاص طور پر اس وقت جب اس زمین پر ظالم حکمرانوں کا خوف ہو کہ وہ اس زمین کو غیر شرعی مصرف میں استعمال کریں گے تو گویا اس نے غلط تصرف کرنے والے کیلئے مانع کا کردار ادا کیا، یہ علامہ عبدالبر نے ذکر کیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ارصاد ہے وقفِ حقیقی نہیں۔"
(ردالمحتار علی الدرالمختار ۴/ ۳۹۳)

اسی طرح الفقہ الاسلامی وادلتہ میں علامہ وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

وقف الارصاد: الارصاد: ان يقف احد الحكام ارضا مملوكة للدولة لمصلحة عامة كمدرسة او مستشفى۔ وقد عرف ان هذا جائز بحكم الولاية العامة، ولكن يسمى هذا ارصادا لا وقفاً حقيقة۔

"ارصاد یہ ہے کہ کوئی حاکم حکومت کی ملکیت میں سے کوئی زمین مصلحتِ عامہ مثلاً مدرسہ یا ہسپتال وغیرہ کیلئے وقف کر دے اور یہ معروف ہے کہ ولایتِ عامہ کی وجہ سے یہ جائز ہے لیکن یہ ارصاد کہلاتا ہے نہ کہ حقیقی وقف"

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، وقف الارصاد۔ ٤/ ٧٦١٤)

اور موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں ہے:

اذا ارصد الامام اونائبه شيئا من اموال المسلمين ترتب على ذلك الآثار التالية: أ۔ تأبيد هذا الارصاد واستمرار صرفه على المصرف الذى عينه المرصد۔ فلا يجوز لامام يأتى بعده نقضه ولا ابطاله باتفاق الفقهاء

"جب امام یا اس کا نائب مسلمانوں کے مال میں سے کسی زمین کو ارصاد کردے تو اس پر درج ذیل آثار مرتب ہوتے ہیں ایک یہ کہ یہ ارصاد ہمیشہ باقی رہے گا اور جس کام کیلئے ارصاد کرنے والے نے اسے خاص کیا تھا وہ اسی پر باقی رکھا جائے گا دوسرے امام (حکومت) کیلئے جو بعد میں آئے اس مقصد کو ختم کرنا یا کالعدم قرار دینا جائز نہیں اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔"

(الموسوعۃ الفقہیہ ٣/ ١١١، ارصاد)

اسی طرح درمختار میں علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو وقف السلطان من بيت مالنا لمصلحة عمت يجوز ويؤجر قلت وفى شرحها للشرنبلالى وكذا يصح إذنه بذلك إن فتحت عنوة لا صلحا لبقاء ملك مالكها قبل الفتح۔

"اگر بادشاہ (حکومت) ہمارے بیت المال میں سے مصلحتِ عامہ کیلئے زمین وقف کرتا ہے تو یہ جائز ہے اور اس پر اسے اجر ملے گا میں کہتا ہوں کہ اس کی شرح (جو کہ علامہ شرنبلالی کی ہے) میں ہے کہ وہ اس میں اذن بھی دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ شہر قہراً فتح ہوا ہو نہ کہ صلحاً کیونکہ صلحاً فتح ہونے کی صورت میں فتح سے قبل والے مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے۔"

(الدرالمختار ٤/ ٣٩٣)

زمین میں حکومت کے کسی بھی تصرف کیلئے ضروری ہے کہ حکومت اس زمین کی مالک ہو وگرنہ حکومت اس زمین کے بیچنے یا وقف کرنے کی اہل نہیں۔ فتاویٰ شامیہ میں ہے:

مطلب أرض اليتيم وأرض بيت المال فى حكم أرض الوقف ثم إن أرض اليتيم فى حكم أرض الوقف كما ذكره فى الجوهرة وأفتى به صاحب البحر و المصنف كذا أرض بيت المال كما أفتى به فى الخيرية وقال من كتاب الدعوى إن أراضى بيت المال جرت على رقبتها أحكام الوقوف المؤبدة

"یتیم کی زمین وقف شدہ زمین کے حکم میں ہے یہی جوہرہ میں ہے اور اسی پر صاحب بحر اور مصنفؒ نے فتویٰ دیا ہے اور اسی طرح بیت المال کی زمینیں بھی وقف شدہ زمین کے حکم میں ہیں جیسا کہ خیریہ میں فتویٰ ہے اور خیریہ کے کتاب الدعوی میں ہے کہ بیت المال کی زمینوں پر دائمی وقف شدہ زمینوں کے احکام جاری ہوں گے۔" (ردالمحتار علی الدرالمختار ٤/ ٤٠١)

رفاہی کاموں کیلئے خاص کردہ S.T پلاٹ وقف شدہ زمینوں کی طرح ہوتے ہیں اور وقف شدہ زمین کا حکم یہ ہے:

(فاذا تم ولزم لا یملك ولا یملّك ولا یعار ولا یرهن) قال الطحطاوی: (قوله: لا یملك) ای لا یصیر ملکا لصاحبه ،منح، (قوله: لا یملّك) ای لا یقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه (ولا یعار ولا یرهن) لاقتضائهما الملك

"(جب وقف تام اور لازم ہو جائے تو وہ جگہ مالک کی ملکیت نہیں رہتی اور نہ اس جگہ کا کسی کو مالک بنایا جا سکتا ہے اور نہ رہن پر دیا جا سکتا ہے اور نہ عاریت پر)

علامہ طحطاوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں (لا یملک) یعنی اب یہ زمین مالک کی ملکیت نہیں رہی (لا یملک) یعنی اب یہ زمین خرید و فروخت کے ذریعے مالک بنائے جانے کے بھی قابل نہیں رہی کیونکہ جو چیز اپنی ملکیت سے باہر ہو اس کا دوسرے کو بھی مالک نہیں بنایا جا سکتا (ولا یعار ولا یرھن) کیونکہ عاریت پر دینے اور رہن رکھوانے کیلئے بھی ملک ضروری ہے (اور یہ وقف شدہ زمین کسی کی ملک نہیں رہی)" (الطحطاوی علی الدر المختار ۲/ ۵۳۴)

مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہوا کہ S.T زمین ناقابلِ فروخت ہے یہ رفاہی کاموں کیلئے خاص کردی گئی ہے اب یہ حکومت کی ملکیت سے خارج ہو چکی ہے۔

۲)۔ مسئلہ سے متعلق دوسری اہم بات یہ ہے کہ مساجد بنانا فرضِ کفایہ ہے موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں ہے:

یجب بناء المساجد فی الامصار والقری والمحال. جمع محلة. ونحوها حسب الحاجة وهو من فروض الکفایة

"مساجد بنانا شہروں، گاؤں اور محلوں وغیرہ میں حسبِ ضرورت واجب ہے اور یہ فرضِ کفایہ کاموں میں سے ہے۔"

(الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۷/ ۱۳۹)

مسجد بنانا اولاً حکومت کی ذمہ داری ہے اور گزشتہ زمانے میں حکومت یہ کام حسنِ اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی رہی ہے اب بھی حکومت مختلف جگہوں پر مساجد کیلئے زمینیں وقف کرتی ہے البتہ مساجد کی تعمیر میں کوتاہی کے باعث اب مساجد عموماً عوام کے چندوں سے ہی تعمیر ہوتی ہیں نیز بعض اہلِ دل مسلمان اپنی ذاتی ملکیت سے بھی مساجد کیلئے زمینیں وقف کرتے ہیں۔

لہٰذا عوام کے چندوں سے جب مسجد بنتی ہے تو اگر ذاتی ملکیت کی زمین پر مسجد بنانے کا ارادہ ہو تو اس کا خریدنا بہر حال شرعاً ضروری ہے شخصی ملکیت میں بغیر خریدے مسجد بنانا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر مسجد S.T پلاٹ پر بن رہی ہو تو اگر وہ پلاٹ مسجد کیلئے نامزد ہو تو عوام اپنے چندے سے بلاشبہ اس پلاٹ پر مسجد تعمیر کر سکتے ہیں اور اگر وہ پلاٹ مسجد کیلئے نامزد نہ ہو (یا محکمے کے بقول ریزرو ہو) اور علاقے میں مسجد یا مسجد کی توسیع کی ضرورت ہو تو اس پلاٹ کو استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ بھی رفاہی پلاٹ ہے۔

۳)۔ پنچائیت والوں کا مطلقاً یہ کہنا کہ "آپ ﷺ نے مسجدِ نبوی کیلئے زمین خریدی تھی لہٰذا مسجد کیلئے زمین خریدنا ضروری

ہے" یہ درست نہیں بلکہ زمین اگر شخصی ملکیت ہو تو اسے خریدا جائے گا ورنہ وقف شدہ یا S.T پلاٹ کا خریدنا ضروری نہیں۔ مسجدِ نبوی کی زمین خریدنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ یہ مسجد کی جگہ بچوں کی ذاتی ملکیت تھی اور وہ بچے یتیم تھے، اور یتیم بچوں کی زمین کو وہ یتیم بچے اور نہ اس کے ولی ہبہ کرسکتے ہیں اور نہ اس کا وقف ممکن ہے لہٰذا مجبوراً قیمت ادا کر کے لینا ضروری تھا اور گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ شخصی ملکیت کی زمین کو خریدے (یا مالک کی طرف سے ہبہ کئے) بغیر مسجد بنانا درست نہیں۔ بخاری شریف میں ہے:

ثم ركب راحلته، فسار يمشي معه الناس حتى بركت عند مسجد الرسول صلى الله عليه وسلم بالمدينة، وهو يصلي فيه يومئذ رجال من المسلمين، وكان مربدا للتمر، لسهيل وسهل غلامين يتيمين في حجر أسعد بن زرارة.

"پھر آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار ہوئے لوگ آپ کے ساتھ چلنے لگے یہاں تک کہ وہ سواری مسجدِ رسول کے قریب رک گئی، وہاں ان دنوں کچھ مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے اور وہ جگہ سہل اور سہیل کی تھی وہاں وہ کھجور خشک کیا کرتے تھے یہ دونوں اسعد بن زرارہ کی پرورش میں یتیم لڑکے تھے۔" (الصحیح للامام البخاریؒ، ۱/۵۵۵)

لہٰذا مسجد نبوی کی زمین جب ذاتی ملکیت تھی اور ہبۃً اسے لینے کی گنجائش نہ تھی اور تکوینی طور پر وہی جگہ مسجدِ نبوی کیلئے خاص تھی لہٰذا اسے خریدنا ضروری تھا S.T یا وقف شدہ پلاٹ کو اس پر قیاس کرنا درست نہیں یہ قیاس مع الفارق ہے جو مفیدِ استدلال نہیں، مسجدِ نبوی کے معاملے کا زیرِ بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا اسے پیش کرنا محلِ نظر ہے۔

۴) مسجد میں توسیع کی ضرورت ہو اور مسجد سے متصل پلاٹ خالی ہو تو اس سلسلے میں بھی وہی تفصیل ہے کہ اگر وہ پلاٹ شخصی ہے تو اسے خریدنا بہرحال ضروری ہے اور اگر وہ S.T پلاٹ ہے تو اگر وہ مسجد کیلئے نامزد ہے تو اس میں توسیع کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اگر وہ غیر نامزد عام رفاہی پلاٹ ہو اور مسجد کو توسیع کی ضرورت ہو تو اس پلاٹ پر توسیع کرنا جائز ہے وہ مسجد کا حق شمار ہوگا اور مسجد سے متصل بھی ہے اس لیے اس کا مسجد میں شامل کرنا شرعاً درست ہے اور اس میں اہلِ علاقہ کی اہم دینی اور اجتماعی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ فتاویٰ خانیہ میں ہے:

قوم بنوا مسجداً واحتاجوا الى مكان ليتسع المسجد فاخذوا من الطريق وادخلوه في المسجد ان كان يضر ذلك باصحاب الطريق فلا يجوز والا فلا باس به ...... ولو كان بجنب المسجد ارض وقف على المسجد فارادوا ان يزيدوا شيئاً في المسجد من الارض جاز ذلك بامر القاضي

"ایک جماعت نے مسجد بنوائی اور پھر انہیں مسجد کی توسیع کیلئے جگہ کی ضرورت پڑی لہٰذا انہوں نے راستے میں سے کچھ حصہ مسجد میں شامل کرلیا، اگر راستے سے گزرنے والوں کو ضرر ہوتا ہو تو یہ جائز نہیں ورنہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں .... اگر مسجد سے متصل زمین ہو جو مسجد کیلئے وقف ہو اب اگر اہلِ علاقہ مسجد میں توسیع کرنا چاہتے ہوں تو قاضی کی اجازت سے وہ یہ کرسکتے ہیں۔" (خانیہ ۴/۲۹۸)

۵)۔مسجد میں توسیع کیلئے اگر شخصی مکان خریدنے پڑیں اوران کے مالک بخوشی اس خرید وفروخت پر راضی نہ ہوں تو جبراً بھی ان سے یہ مکان خریدے جاسکتے ہیں۔فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

ولو ضاق مسجد علی الناس وبجنبه ارض لرجل يؤخذ ارضه بالقيمة كرهاً وقد صح عن عمر رضی اللہ عنہ و كثير من الصحابة انهم اخذوا ارضين بكره من اصحابها وزادوا فی المسجد الحرام حين ضاق بهم

"اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہوجائے اور مسجد سے متصل کسی شخص کی زمین ہوتو اسے زبردستی خریدا جائے گا،حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے جبراً بھی زمینیں خریدی ہیں اور مسجدِ حرام جب تنگ ہوئی تو اس میں اضافہ کیا ہے۔"(التاتارخانیہ ۸/۱۶۰)

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو ضاق المسجد على الناس وبجنبه ارض لرجل تؤخذ ارضه بالقيمة كرها

"مسجد سے متصل کسی کی جگہ ہوتو اسے قیمت کے عوض جبراً بھی خریدا جاسکتا ہے۔"(الفتاوی الهندیہ ۲/۴۵۶)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ شخصی ملکیت کو مسجد کی توسیع کے لیے جبراً خریدنا جائز ہے اور مسجدِ حرام میں یہ صورتِ حال پیش آئی ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ کے سوالوں کے بالترتیب جوابات درج ذیل ہیں:

۱)۔کسی کی شخصی ملکیت میں مسجد بنانا درست نہیں اس سے زمین کا خریدنا ضروری ہے۔نیز کسی کی ذاتی ملکیت کو جنازہ گاہ کے طور پر اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا درست نہیں۔

۲)۔رفاہی S.T پلاٹ اگر مسجد کیلئے نامزد ہے تو اس پر مسجد بنانا یا جنازہ گاہ بنانا بلاشبہ جائز ہے اور اگر وہ پارک وغیرہ کیلئے نامزد ہے تو اس پر وہی کام کرنا ضروری ہے جس کے لیے وہ نامزد ہے اور اگر وہ S.T پلاٹ غیر نامزد ہے اور اہل علاقہ کو مسجد یا جنازہ گاہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو اسے مسجد کے استعمال میں لانا درست ہے۔

۳)۔S.T پلاٹ سے ریزرو کردہ پلاٹ بھی S.T پلاٹ کے حکم میں ہے یہ بھی رفاہی کاموں کیلئے خاص ہوگا،حکومت کا اسے بیچنا یا ھبہ کرنا درست نہیں۔

۴)۔S.T پلاٹ سے ریزرو کردہ پلاٹ کی خرید وفروخت درست نہیں۔

۵)۔S.T یا اس سے ریزرو کردہ پلاٹ رفاہی کاموں کیلئے مخصوص ہے اور جب سالوں سے اسے جنازہ گاہ کے طور پر استعمال بھی کیا جارہا ہے تو وہ پلاٹ جنازہ گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوگا کیونکہ عامۃ المسلمین کی ایک اہم اجتماعی اور دینی ضرورت ہے حکومت کا اسے بیچنا یا شخصی ملکیت میں دینا درست نہیں۔

٦)۔مسجدِ نبوی کی زمین ذاتی ملکیت تھی اور یتیم بچے اس کے مالک تھے جن کی طرف سے ہبہ یا وقف کی گنجائش نہ تھی لہٰذا اسے خریدنا ضروری تھا، S.T زمین کو اس پر قیاس کرنا درست نہیں لہٰذا مسجدِ نبوی کو اس معاملے میں لانا بے جا ہے اور یہ کہنا کہ مسجد کیلئے زمین کا خریدنا ہی ضروری ہے درست نہیں۔

٧)۔اگر مسجد کی توسیع کی جائے اور مسجد کی توسیع کی ضرورت ہو تو جبراً بھی ذاتی مکان خریدے جاسکتے ہیں۔

٨)۔حرمین شریفین کی جو توسیع ہے وہ ذاتی مکان خرید کر ہوئی ہے اس میں جبراً بھی ذاتی مکان خریدے گئے ہیں۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حکومت یا محکمے کا مسجد سے متصل پلاٹ (جو حکومت کے بقول S.T سے ریزرو کردہ تھا) کا بیچنا جائز نہیں یہ بیع منعقد نہیں ہوئی۔وہ پلاٹ اہلِ علاقہ کا حق ہے اور چونکہ مسجد سے متصل ہے اور مصالحِ مسجد جنازہ گاہ وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے لہٰذا مسجد اس پلاٹ کی حقدار ہے اور شرعاً وہ پلاٹ جنازہ گاہ کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا رہے گا اس کی خرید وفروخت منعقد نہیں ہوگی۔

(۳۹۳) مساجد میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد (جیسا کہ ہماری مسجد) میں ایکو ساؤنڈ لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے جب مؤذن یا امام ایک مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے تو ایک مرتبہ کہنے کی وجہ سے تین چار مرتبہ آواز سنائی دیتی ہے کیا اس سے نماز میں کراہت نہیں آتی؟ نیز یہ آواز جتنی مرتبہ سنائی دیتی ہے اتنی مرتبہ ہی شمار ہوگی یا ایک مرتبہ شمار ہوگی؟ بخاری (۱/۸۵) پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اثر ہے کہ ''اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا'' اور سمحا کا مطلب یہ ہے کہ سہل وبلانغمہ ہو، آواز میں طرب (یعنی درجہ بدرجہ) نہ ہو، کیا ایکو (Echo) والی آواز میں طرب نہیں ہے اگر ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی رُو سے تحقیقی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......عبادات کی ادائیگی کا جو طریقہ عہد نبوی سے تا حال چلا آرہا ہے وہ شریعت میں آج بھی ممدوح و مطلوب ہے جیسا کہ باجماعت نماز کی ادائیگی میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مکبّرین کا تقرر جو کہ قدیم سنت ہے، اس پر عمل پیرا ہونا افضل ہے۔ جبکہ سائنس کی نئی نئی ایجادات جن میں آلہ مکبر الصوت ''لاؤڈ اسپیکر'' بھی داخل ہے جس کے ہوتے ہوئے مکبّرین کے تقرر کی طرف احتیاج باقی نہیں رہتی، تو حضرات مفتیان کرام نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو سہولت اور عموم بلوی کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔

جہاں تک مساجد میں ایکو ساؤنڈ کا استعمال ہے تو اس سے مقصود تحسین صوت ہے کہ اذان وقرأت کی ادائیگی قلوب پر اثر انداز ہو کے خشوع کی زیادتی کا باعث بنے جو کہ غرض صحیح ہے۔ ایکو ساؤنڈ کے ذریعہ کلمات کا تکرار جو سننے میں آتا ہے تو وہ بمنزلہ صدائے بازگشت کے ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک ہی تکبیر شمار ہوگی البتہ اگر یہ گونج اس قدر زیادہ ہو کہ جس سے نمازی کے خشوع میں خلل واقع ہو، اور قرأت ہی سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مؤذن کو ''اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا'' ارشاد فرمانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ اذان کے کلمات میں زائد تکرار کررہے تھے بلکہ وہ تصنع اور گاگا کر اذان دیا کرتے تھے اس تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس مقولہ کو (جو کہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً ذکر ہے) ابن ابی شیبہ نے موصولا روایت کیا ہے جس میں لفظ تطریب کی صراحت ہے۔ (۱/۲۰۷)

وفي الدر المختار (۱۰۸/۲): (لا) تجب (بسماعه من الصدى والطير)

وفي اللجنة الدائمة (۶۵/۶): س: هل صح قول من قال: بعدم استحباب الأذان بمكبرات الأصوات باعتبارها المولدة لمضاعفات الأصوات عن الحجم الصغير يلقيه المؤذن في الأصل، ذلك لالحاقه بالأذان بالراديو أو التلفاز،

ج: ألأذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه، لما في ذلك من المصلحة العامة۔

(۳۹۴) مسجد میں نمازیوں کے سامنے کی طرف ہیٹر لگانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں ہیٹر لگانا کیسا ہے؟ نیز اگر ہیٹر نمازیوں کے سامنے صف میں یا اکیلے آدمی کے سامنے پڑا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا؟ یا اگر دیوار پر اوپر سامنے لگا ہوا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا یا نہیں؟ کیا اس میں تشبہ بالمجوس ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسجد میں ضرورت کی وجہ سے ہیٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے سامنے ہونے سے تشبہ بالمجوس بھی لازم نہیں آتا۔

لمافي الشامية (۱/۶۵۲): وفي شرح المنية: وجه عدم الكراهة أن كراهة استقبال بعض الأشياء باعتبار التشبه بعبادها... (قوله أوشمع)... وعدم الكراهة هو المختار كما في غاية البيان وينبغي الاتفاق عليه فيما لوكان على جانبيه كما هو المعتاد في ليالي رمضان بحر:۔۔۔۔۔۔(قوله قنية) ذكر ذلك في القنية في كتاب الكراهية ونصه: الصحيح أنه لايكره أن يصلّي وبين يديه شمع أو سراج لأنّه لم يعبدهما أحد والمجوس يعبدون الجمر لاالنّار الموقدة، حتّى قيل لايكره إلى النّار الموقدة وظاهره أنّ المراد بالموقدة التي لها لهب، لكن قال في العناية: أن بعضهم قال: تكره إلى شمع أو سراج كما لو كان بين يديه كانون فيه جمرأو نار موقدة اهـ وظاهره انّ الكراهة في الموقدة متّفق عليها كما في الجمر تأمّل۔

وفي اللجنة الدائمة(۷/۸۸):س۵: هل يجوز توليع الدفايات الكهربائية أمام المصلّين أولا۔

ج۵: يجوز ذلك لمسيس الحاجة إلى ذلك۔

(۳۹۵) مسجد کے پودوں کے مالی کو مسجد کی آمدنی سے تنخواہ دینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک متولی مسجد نے مسجد کی رقم سے مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ سبزہ و پودے لگوائے ہیں۔ کچھ عرصہ تک ایک مالی کو رکھ کر اس کو بھی مسجد سے تنخواہ ادا کرتا رہا ہے اب مالی کی چھٹی کردی گئی ہے جس سے وہ سبزہ وغیرہ خشک ہورہا ہے۔ اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے سبزہ پودے وغیرہ لگانا اور مالی کو تنخواہ دینا جائز ہے؟ اور وہ متولی مسجد اللہ کے ہاں مجرم ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... مسجد میں سبزہ و پودے لگانے سے مسجد کا ماحول پر رونق وخوشگوار بنتا ہے۔ اس لئے یہ مصالح

مسجد میں داخل ہے اور اس کیلئے مالی رکھنا اور اس کو مسجد کی رقم سے تنخواہ دینا درست ہے، مسجد کے مصارف میں تعاون کرنے والوں کی طرف سے دلالۃً اس کی اجازت ہوتی ہے۔لیکن اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، اسراف ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

لمافی الولوالجیة(٣/٨٨): رجل غرس فی المسجد ھھنا اربع مسائل احداھا ھذہ: (بعد ثلاثة اسطر) ففی المسئلة الاولی: الشجر یکون للمسجد، لانه بمنزلة بناء المسجد۔

وفی الخانیة علی الھندیة (٣/٣١٠): ولوغرس فی المسجد یکون للمسجد لانه لایغرس لنفسه فی المسجد۔۔۔۔۔ مسجد فیه شجرۃ التفاح قال بعضھم یباح للقوم ان یفطروا بھذا التفاح والصحیح انه لایباح لان ذالك صار للمسجد، یصرف الی عمارۃ المسجد۔

(٣٩٦) جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور انہی میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی جوتے پہن کر مسجد میں آ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(٢)۔گھر وغیرہ میں ان جوتوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جوتے اگر ایسے ہوں کہ سجدے میں وہ پیروں کی انگلیاں زمین پر لگنے سے مانع نہ ہوں، اور ناپاک نہ ہوں تو ایسے جوتوں میں اگر نماز پڑھ لی جائے اگر چہ مسجد میں ہی کیوں نہ ہو، درست ہوجائے گی البتہ آجکل عرفاً یہی مناسب ہے کہ جوتوں کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آجکل مساجد میں فرش اور قالین ہوتا ہے جوتوں میں نماز پڑھنے کی وجہ سے عام طور پر مسجد کی تلویث کا خطرہ رہتا ہے۔

(٢)۔اسی طرح گھر وغیرہ میں بھی جوتوں میں نماز پڑھنا درست ہے مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ۔

لمافی فتح الملھم(٤/١٢٩): قوله قال نعم،الخ فیه جواز الصلوۃ فی النعال والخفاف، ای اذا تحقق طھارتھا، ویتمکن معھا من تمام السجود، بأن یسجد علی جمیع اصابع رجلیه کما قاله الخطابی۔

وفی الدر المختار مع رد المحتار(١/٦٥٧): وینبغی لداخله تعاھد نعله وخفه وصلوته فیھما افضل (لا) یکرہ۔ (قوله وصلاته فیھما) ای فی النعل والخف الطاھرین افضل مخالفة للیھود... قلت لکن اذا خشی تلویث فرش المسجد بھا ینبغی عدمه وان کانت طاھرۃ واما المسجد النبوی فقد کان مفروشا بالحصی فی زمنه صلی اللہ علیه وسلم بخلافه فی زماننا الخ۔

وفی الشامیة(١/٤٤٧): (قوله وقدمیه) یجب اسقاطه لان وضع اصبع واحد منھما یکفی کما ذکرہ بعدح وأفاد انه لو لم یضع شیئاً من القدمین لم یصح السجود۔

وفى الفقه الاسلامی (۱/۵۵۳): السنة لمن اراد دخول المسجد أن يتفقد نعليه ويمسح ما فيهما من اذى قبل دخوله لحديث، ((اذا جاء احدكم المسجد فلينظر فان رأى فى نعليه قذرا اواذى فليمسحه وليصل فيهما۔

كتاب الجنائز والشهيد

(نماز جنازہ، تجہیز وتکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

(۳۹۷) میت کو غسل دیتے وقت کان وناک کے سوراخوں میں روئی رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس وقت میت کو غسل کیلئے تختے پر لٹایا جائے تو پہلے میت کے ناک وکان کے سوراخوں میں روئی کی پھریری رکھنے کا جو دستور ہے اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ظاہر الروایات سے تو اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن غیر ظاہر الروایت میں امام ابو حنیفہؒ سے ایک قول مروی ہے کہ غسل کے وقت روئی کی پھریری میت کے اعضائے مذکورہ میں رکھ دے۔

لما فی الدر المختار(۱۹۸/۲): ولا بأس بجعل القطن علی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل واذن وفم۔

وفی الشامية(۱۹۸/۲): (قوله ولا باس الخ) کذا فی الزيلعی واشار الی ان ترکه اولیٰ قال فی الفتح وليس فی الغسل استعمال القطن فی روايات الظاهرة وعن ابی حنيفة انه يجعل فی منخريه وفمه وقال بعضهم فی صماخه ايضاً وقال بعضهم فی دبره ايضاً قال فی الظهيرية واستقبحه عامة العلماء لکن فی الحلية انه منقول عن الشافعی وابی حنيفة فاطلاق انه قبيح ليس بصحيح الخ۔

(۳۹۸) میت کو غسل دیتے وقت سر کے مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دیتے وقت سر کا مسح کرنا بھی سنت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صحیح قول کے مطابق میت کو غسل سے پہلے وضو کراتے وقت اس کے سر پر مسح کیا جائے گا۔

لما فی الدر المختار(۱۹۶/۲): ويبدأ بوجهه ويمسح رأسه۔ وقال ابن عابدين تحت قوله يمسح رأسه ای فی الوضوء وهو ظاهر الرواية کالجنب بحر۔

وفی الهندية(۱۵۸/۱): واختلفوا فی مسح رأسه والصحيح انه يمسح رأسه۔الخ۔

(۳۹۹) میت کو غسل دینے کے بعد اگر نجاست خارج ہو جائے تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر میت کو کفن دینے کے بعد کوئی نجاست خارج ہو تو کیا اسے دوبارہ غسل دیا جائے گا یا یہی غسل کافی ہے اور صرف نجاست کو دھو دیا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... صورت مسئولہ میں دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں پہلے والا غسل کافی ہے صرف محل نجاست کو دھولیا جائے جہاں پر نجاست لگی ہے اس مقام کو دھولیا جائے۔

لمافی الهندية (۱/۱۵۸): ويمسح بطنه مسحاً رفيقاً تحرزاً عن تلويث الكفن فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوء ه ثم ينشفه بثوب كيلا تبتل اكفانه الخ۔

وفی ملتقى الابحر(۱/۱۵۶): فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوئه وينشفه بثوب الخ۔

وفی الدر المختار مع الشامية (۲/۱۹۷): ولا يعاد غسله ولا وضوء ه بالخارج منه لان غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية الا ان المسلم يطهر بالغسل كرامة له وقد حصل بحر۔

وفی الشامية تحته: (قوله وقد حصل) اى الغسل وبطروالنجاسة بعده لايعاد بل يغسل موضعها۔

(۴۰۰) کوئی شخص کسی حادثہ میں مرجائے اور اعضاء متفرق ہو جائیں تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص آگ میں جھلس کر مر گیا اس کے بعض اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے اور بعض راکھ بن گئے۔ اسی طرح سے ایک شخص گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا اور اس کے بھی اعضاء اس حادثے میں بکھر گئے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ اس کا سر کہاں ہے؟ ایسے اشخاص کے بارے میں غسل اور ان کی نمازِ جنازہ کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر میت کے جسم کے اکثر اعضاء یا آدھا جسم سر کے ساتھ موجود ہو تو اس صورت میں اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی لیکن اگر میت کا آدھا جسم بغیر سر کے یا آدھے سے بھی کم جسم (اگرچہ سر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) پایا گیا تو اس کو نہ ہی غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ بلکہ اس کو یونہی دفن کر دیا جائے گا۔

لمافی الهندية(۱/۱۵۹): ولو وجد اكثر البدن او نصفه مع الراس يغسل ويكفن ويصلى عليه كذا فى المضمرات...... وان وجد نصفه من غير الرأس او وجد نصفه مشقوقاً طولا فانه لايغسل ولا يصلى عليه ويلف فى خرقة ويدفن فيها كذا فى المضمرات۔

وفی الدر المختار و رد المحتار(۱۹۹/۲): (وجد رأس آدمی) او احد شقیه (لایغسل ولا یصلی علیه) بل یدفن الاان یوجد اکثر من نصفه ولو بلا رأس الخ۔

وفی الشامیة تحته: (قوله ولو بلا رأس) وکذا یغسل لو وجد النصف مع الرأس بحر۔

(۴۰۱) عورت کی میت کو نہلاتے وقت اس کے ستر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مُردہ عورت کو نہلاتے وقت پورے بدن پر کپڑا ڈالنا ضروری ہے یا مرد کی طرح صرف گھٹنوں اور ناف تک چھپانا کافی ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں عورت کو عورت سے اس قدر پردہ ہے جتنا مرد کو مرد سے اس لئے عورت کو نہلاتے وقت صرف ناف سے زانو تک کپڑا ڈالنا کافی ہے۔

لمافی الدر المختار (۱۹۵/۲): عبارة الزیلعی حتی یغسل وعبارة النھر قبل غسله (وتستر عورته الغلیظة فقط علی الظاھر) من الروایة (وقیل مطلقا) الغلیظة والخفیفة (وصحح) صححه الزیلعی وغیره (ویغسلها تحت خرقة) السترة (بعد لف) خرقة (مثلها علی یدیه)

وفی الشامیة تحته: (قوله صححه الزیلعی وغیره) والاوّل صححه فی الهدایة وغیرها لکن قال فی شرح المنیة ان الثانی هو الماخوذ به لقوله علیه الصلوۃ والسلام لعلی ''لاتنظر الی فخذ حی ولا میت'' لان ماکان عورة لا یسقط بالموت... وھذا شامل للمرأة والرجل لان عورة المرأة للمرأة کالرجل للرجل۔

(۴۰۲) عورت کو کفن دیتے وقت بالوں کو کس طرح رکھا جائے؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفن کے وقت عورت کے سر کے بالوں کو کیسے رکھا جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں عورت کے سر کے بالوں کو دو حصے کر کے سینہ کے اوپر دائیں بائیں رکھا جائے۔

وفی الھندیة(۱۶۱/۱): ویجعل شعرھا ضفیرتین علی صدرھا فوق الدرع۔

وفی الدر المختار(۲۰۴/۲): ویجعل شعرھا ضفیرتین علی صدرھا فوقه ای الدرع۔

(۴۰۳) آبِ زمزم سے احرام کی چادریں دھو کر کفن کے لئے رکھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری خالہ جو کہ میری ساس بھی ہیں نے ایک نصیحت کی ہے کہ بیٹا اس سال آپ حج پر جارہے ہو، اپنے احرام کو مائے زمزم میں ضرور دھولینا، اور پھر آکر اس کو محفوظ کر کے کفن کی نیت سے رکھ لینا، کیا اس طرح کرنا بدعت تو نہیں ہوگا؟ اور اس میں کوئی شرعی مانع تو نہیں ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... اپنے لئے مرنے سے پہلے کفن تیار کرنا اور اسی طرح مقدس چیزوں سے تبرک حاصل کرنا شرعاً جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ احرام کی چادروں کو آبِ زمزم سے دھو کر اپنے کفن کے لیے رکھ سکتے ہیں، نہ یہ بدعت میں شامل ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مانع ہے۔

لمافی مرقاۃ المفاتیح(۱۰۶/۴): وعن عبداللہ بن عباس قال ان رجلا کان مع النبی ﷺ فوقصتہ ناقتہ وھو محرم فمات فقال رسول اللہ ﷺ((اغسلوہ بماء سدر وکفنوہ فی ثوبیہ ولا تمسوہ بطیب ولا تخمّروا راسہ فانہ یبعث یوم القیامۃ ملبّیا)) متفق علیہ۔ وقد قال علیہ الصلوۃ والسلام فی ذلک المحرم کفنوہ فی ثوبیہ وھما ثوبا احرامہ ازارہ ورداؤہ ومعلوم ان ازارہ من الحقو وکذا حدیث ام عطیۃ۔

وفی عمدۃ القاری(۶۱،۶۳/۸): (باب من استعد الکفن فی زمن النبی ﷺ فلم ینکر علیہ) واستفید من ذلک جواز تحصیل مالا بد للمیت منہ من کفن ونحوہ فی حال حیاتہ لان افضل ماینظر فیہ الرجل فی الوقت المھمل وفسحۃ الاجل الاعتداد للمعاد۔ وفیہ التبرک بآثار الصالحین وفیہ جواز اعداد الشئ قبل وقت الحاجۃ الیہ۔

وفی فتح الباری(۱۰۷-۸-۳/۱۱): (قولہ باب الکفن فی القمیص الذی یکف اولایکف) ...وکذا رایتہ فی اصل ابی القاسم بن الورد قال والذی یظھر لی ان البخاری لحظ قولہ تعالیٰ استغفر لھم اولا تستغفر لھم ای ان النبی ﷺ البس عبداللہ بن ابی قمیصہ سواء کان یکف عنہ العذاب اولا یکف استصلاحا للقلوب المولفۃ فکأنہ یقول یوخذ من ھذا التبرک بآثار الصالحین سواء علمنا انہ مؤثر فی حال المیت اولا۔ واستنبط منہ الاسما عیلی جواز طلب آثار اھل الخیر منھم للتبرک بھا وان کان السائل غنیا فیستفاد منہ جواز تحصیل مالا بدللمیت منہ من کفن ونحوہ فی حال حیاتہ۔

(۴۰۴) نمازِ جنازہ کی ترتیب اور تکبیرات کا حدیث سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی ترتیب کیا ہوگی؟ نیز بتائیں تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟ حدیث سے چار کا ثبوت ملتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز جنازہ میں چار تکبیرات ہوتی ہیں، پہلی تکبیر کہہ کر سبحانک اللّٰھم الخ پڑھا جائے پھر دوسری تکبیر کہہ کر درود شریف پڑھا جائے، پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کیلئے دعا پڑھی جائے اور تمام مسلمانوں کیلئے دعا کی جائے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اللھم اغفر لحینا و میتنا الخ ثابت ہے۔اور اگر میت چھوٹا بچہ ہے تو دعا میں اللھم اجعلہ لنا فرطاً و جعلہ لنا اجراً و ذخراً و اجعلہ لنا شافعاً و مشفعاً پڑھے، اور اگر چھوٹی بچی ہو تو اللھم اجعلھا لنا فرطاً الخ پڑھے پھر چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں طرف سلام پھیر دے، اور جنازے میں چار تکبیروں کا ثبوت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی احادیث سے ہوتا ہے، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لما فی الترمذی (۱/۱۹۸):لما جآء عن ابی هريرة رضی الله عنه: أن النبی صلى الله عليه وسلم صلى على النجا شی فکبر اربعاً، وفی الباب عن ابن عباس رضی الله عنه وابن ابی اوفی رضی الله عنه وجابر رضی الله عنه وانس رضی الله عنه ويزيد بن ثابت... قال ابو عیسیٰ حديث ابی هريرة رضی الله عنه هذا حديث حسن صحيح''

وفی الهندية(۱/۱۶۴): وصلاة الجنازة اربع تكبيرات ولو ترك واحده منها لم تجز صلاته هكذا فی الكافی فيكبر للافتتاح ويقول سبحانك اللهم الخ ثم يكبر اخرىٰ ويصلّی على النبی صلى الله عليه وسلم ثم يكبر أخرىٰ ويدعو للميت وجميع المسلمين وليس فيها دعآء موقت وعن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه كان يقول، اللهم اغفر لحينا وميتنا الخ فان كان الميت صغيراً عن ابی حنيفة رحمه الله انه يقول اللهم اجعله لنافرطاً الخ... ثم يكبر الرابعة ثم يسلم تسليمتين۔

وفی الدر المختار مع التنوير (۲/۲۱۲):وهی اربع تكبيرات كل تكبيرة قائمة مقام ركعة يرفع يديه فی الأولیٰ فقط... ويثنی بعدها وهو سبحانك اللهم وبحمدك'' ويصلی على النبی صلى الله عليه وسلم كما فی التشهد بعد الثانية... ويدعو بعد الثالثة... ويسلّم بلا دعاء بعد الرابعة''۔

(۴۰۵) نمازِ جنازہ کی ثناء میں اور درود شریف میں زیادتی کا حدیث سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے جس میں و جل ثناؤک کی زیادتی ہے اسی طرح درود شریف میں زیادتی ہے، آیا یہ حدیث سے ثابت ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......ثناء کے متعلق جومشہور روایات ہیں ان میں وجل ثناؤک کے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح درود شریف میں بھی کوئی زیادتی نہیں ہیں لیکن بعض شاذ روایات میں یہ زیادتی موجود ہے، لہٰذا اگر کہہ دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی فتح القدير(۲۹۰/۱): وان كان روى فى الجملة عن ابن عباس فى حديث طويل من قوله وذكره ابن ابي شيبة وابن مردوية فى كتاب الدعا له ورواه الحافظ ابو شجاع فى كتاب فردوس عن ابن مسعود رضي الله عنه ان من أحب الكلام الى الله عزوجل ان يقول العبد سبحانك اللهم وبحمدك و تبارك اسمك وتعالى جدك وجل ثناؤك ولا اله غيرك وابغض الكلام الى الله ان يقول الرجل للرجل اتق الله فيقول عليك نفسك۔

وفى فتح القدير(۳۱۷/۱): وروى البيهقى عن يحيى بن السباق عن رجل من بنى الحارث عن ابن مسعود عنه صلى الله عليه وسلم اذا تشهد أحدكم فى الصلاة فليقل اللهم صل على محمد وعلى آل محمد وبارك على محمد وعلى آل محمد وارحم محمدا وآل محمد كما صليت وباركت وترحمت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم إنك حميد مجيد۔

(۴۰۶) نمازِ جنازہ مکروہ اوقات میں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کن کن اوقات میں مکروہ ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نمازِ جنازہ کا پڑھنا سورج کے طلوع وغروب کے وقت اور عین دوپہر کے وقت مکروہ ہے البتہ جنازہ اُسی وقت تیار ہوجائے تو صحیح ہے۔

لمافى نور الايضاح(ص۵۷): ثلاثة أوقات لايصح فيها شئ من الفرأض والواجبات التى لزمت فى الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الى ان ترتفع وعند استوائها إلى ان تزول وعند اصفرارها إلى أن تغرب ويصح أداء ماوجب فيها مع الكراهة۔ كجنازة حضرت وسجدة آية تليت فيها كما صح عصراليوم عند الغروب مع الكراهة۔

وفى الهندية(۵۲/۱): ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة ولا صلاة الجنازة ولا سجدة تلاوة... أما لو وجبتا فى هذا الوقت واديتا فيه جاز لأنها أديت ناقصة كما وجبت۔ كذا فى السراج الوهاج۔

وفى الشامية(۳۷۴/۱): (قوله وصلاة جنازة) فيه أنها تصح مع الكراهة كمافى البحر... (قوله فلو وجبتا فيها)، أى بأن تليت الآية فى تلك الأوقات أو حضرت فيها الجنازة. قوله أو تحريما) افاد ثبوت الكراهة التنزيهية اهـ

رسالة

تعجيل الفرائض في انتقال الميت والاسراع بالجنائز

جنازہ اوراس کی تدفین میں جلدی، نیز میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا

اور مسئلہ ھذا میں فقہاء کے اقوال اور راجح کا بیان

(۴۰۷) جنازہ میں جلدی اور انتقال میت سے متعلق تحقیقی فتوی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی تدفین میں جلدی کرنے سے متعلق شامیہ کی مندرجہ ذیل عبارات میں بظاہر تضاد معلوم ہو رہا ہے۔

۱۔ قوله (ويسرع في جهازه) لما رواه أبو داود عنه لما عاد طلحة بن البراء وانصرف قال ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت فإذا مات فآذنوني حتى أصلي عليه وعجلوا به فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله والصارف عن وجوب التعجيل الاحتياط للروح الشريفة فإنه يحتمل الإغماء۔ (شامية، كتاب الجنائز ۲/۱۹۲)

۲۔ قال في الدر المختار: (وكره تأخير صلاته ودفنه ليصلي عليه جمع عظيم بعد صلاة الجمعة) إلا إذا خيف فوتها بسبب دفنه۔

وفي الرد تحته: قوله (إلا إذا خيف الخ) فيؤخر الدفن ۔۔۔۔۔ ومقتضاه أن الكراهة تحريمية۔

مذکورہ بالا پہلی عبارت میں تدفین میں جلدی کرنے کو واجب نہیں کہہ رہے اور گویا مستحب فرما رہے ہیں (جیسا کہ دیگر اصحاب فتاوی نے مستحب فرمایا ہے) اور دوسری عبارت میں نمازِ جنازہ میں بسبب کثرت جماعت، تاخیر کو مکروہ تحریمی کہہ رہے ہیں جبکہ ترک استحباب کا حکم مکروہ تحریمی کا نہیں ہوتا (اور بظاہر تدفین میں جلدی اور نماز جنازہ میں جلدی کے حکم میں کوئی فرق نہیں)۔

ثانیاً میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں جو تاخیر ہوتی ہے اس تاخیر کو علماء خلاف اولی فرماتے ہیں جبکہ یہ تاخیر نماز جنازہ میں لوگوں کی تعداد بڑھانے کی غرض سے کی جانے والی تاخیر سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے لہٰذا براہ کرم اس تعارض اور درپیش اشکال کو دور فرما کر ممنون فرمائیں اور اس میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل کیا تھا۔ ثالثاً یہ بھی بتائیں کہ اگر تاخیر مکروہ تنزیہی ہے تو ہم تو اسے تشدید اور

احادیث کی بناء پر حرام سمجھتے رہے ہیں۔اس کا کیا حکم ہے؟؟؟ان مسائل میں ابتلاء عام ہے لہذا ان کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا......سوال میں دو مسئلے پوچھے گئے ہیں ایک تاخیرِ جنازہ اور دوسرا انتقال میت۔

پہلے ہم تاخیر جنازہ کے مسئلے پر بحث کریں گے۔تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ وغیرہ میں تعجیل یعنی جلدی کرنے سے متعلق متعدد نصوص وارد ہوئے ہیں اولاً ان پر ایک نظر کر لی جائے۔

عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه: أن النبي صلى الله عليه و سلم قال له يا علي ثلاث لا تؤخرها الصلاة إذا أتت والجنازة إذا حضرت والأيم إذا وجدت لها كفؤا (سنن الترمذی۱/۲۰۵)

باب ما جاء الجنازة لا توخر اذا حضرت الخ

عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه و سلم قال لا تؤخروا الجنازة إذا حضرت۔ (سنن ابن ماجة ۱/۱۰۷)

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة فخير تقدمونها إليه وإن تك غير ذلك فشر تضعونه عن رقابكم. (مصنف ابن ابی شیبة۷/۲۲۰)

من كان يرى التعجيل بالميت ولا يحبس:

عن عروة، قال: كان ابن الزبير إذا مات له الميت من أهله، قال: عجلوا عجلوا, أخرجوا أخرجوا قال: فيخرج أي ساعة كان.

حدثنا أبو خالد الأحمر، عن هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة قالت: مات أبو بكر ليلة الثلاثاء, ودفن ليلة الثلاثاء.

حدثنا يحيى بن سعيد عن سفيان عن معمر عن الزهرى عن عروة ان علياً دفن فاطمة رضى الله عنها ليلاً۔ (مصنف ابن ابی شیبة ۷/۳۳۷)

ان نصوص کو مدنظر رکھا جائے تو جنازے اور تجہیز و تدفین کی مطلقاً تعجیل واجب معلوم ہوتی ہے اور اس میں تاخیر کا مکروہ تحریمی ہونا لازم ہونا چاہیے لیکن فقہاء نے ان اوامر کو وجوب پر نہیں لیا بلکہ اس سے فقط استحباب اور افضلیت ثابت کی ہے اور تاخیر کو مکروہ تنزیہی فرمایا ہے۔

لما فی مراقی الفلاح ص۴۹۸: قوله (وكذا يستحب الإسراع بتجهيز كله) أي من حين موته فلو جهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تأخير الصلاة عليه۔

وفی الدر المختار ۲/۱۹۳: ويسرع فی جهازه ويقرأ عنده القران۔

وفی الشامية تحته: (قوله ويسرع في جهازه) لما رواه أبو داود عنه صلى الله عليه وسلم لما عاد طلحة

بن البراء وانصرف قال ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت فإذا مات فآذنوني حتى أصلي عليه وعجلوا به فإنه لاينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله۔ والصارف عن وجوب التعجيل الاحتياط للروح الشريفة فإنه يحتمل الإغماء . وقد قال الأطباء: إن كثيرين ممن يموتون بالسكتة ظاهرا يدفنون أحياء لأنه يعسر إدراك الموت الحقيقي بها إلا على أفاضل الأطباء فيتعين التأخير فيها إلى ظهور اليقين بنحو التغير إمداد ؛ وفي الجوهرة وإن مات فجأة ترك حتى يتيقن بموته .

وفی الطحطاوی علی الدر۱/۳۸۰: (وکره تاخیر صلاته . . . الخ) فالافضل ان یعجل بتجهیزه بتمامه من حین یموت بحروظاهره ان الکراهة تنزیهیة . . . (قوله: ودفنه) ولو بعد الصلاة علیه۔

ان عبارات سے مستفاد ہوا کہ تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں جلدی کرنا مستحب اور افضل ہے اور اس کے مقابلے میں تاخیر مکروہ تنزیہی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اتنے سارے نصوص جن میں تاکیداً امر کے ساتھ جلدی کا کہا جا رہا ہے نیز صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس معاملے میں جلدی فرمایا کرتے تھے رات انتقال ہوا تو صبح ہونے سے قبل ہی تدفین کردی جاتی تو پھر فقہاء نے اسے وجوب پر کیوں نہ لیا؟ اس سے متعلق دیگر فقہاء نے کوئی صراحت نہیں کی البتہ علامہ ابن عابدینؒ کے مطابق اس کی وجہ احتمال اغماء ہے یعنی ممکن ہے کہ وہ شخص سکتہ میں ہو اور حاذق اطباء کے علاوہ اس کی موت کا یقین نہیں کیا جا سکتا لہٰذا جب تک میت میں تغیر نہیں آ جاتا اس وقت تک انتظار کیا جائے گا اور یہ تغیر اس کی موت کی یقین دہانی کرائے گا۔ نیز اس تغیر میں موسم کے اعتبار سے فرق بھی آ سکتا ہے لہٰذا تدفین میں جلدی ایک زندہ کو دفنانے کا سبب بن سکتی ہے اس لیے ہم جلدی کو صرف مستحب ہی قرار دیں گے واجب نہیں۔ عام اردو فتاوی میں بھی تقریباً تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ میں جلدی کو مستحب ہی قرار دیا گیا ہے۔ نیز سوال میں آپ کا علامہ شامیؒ کی عبارات میں تضاد بتانا درست نہیں، علامہ شامیؒ نے اسے صرف مکروہ تنزیہی لکھا ہے آپ کی ذکر کردہ دو میں سے ایک عبارت تو گذر چکی جس میں علامہ کے الفاظ ہیں۔

(قوله ويسرع في جهازه) . . . . والصارف عن وجوب التعجيل الاحتياط للروح الشريفة فإنه يحتمل الإغماء . (شامية ۲/۱۹۲)

دوسری عبارت جو آپ نے ذکر کی جس میں "ومقتضاه ان الکراهة تحریمیة" کا ذکر ہے اس کا تعلق جنازے میں تاخیر سے نہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے اولاً ہم درمختار اور شامیہ کی مکمل عبارات تحریر کرتے ہیں۔

قال الحصکفی فی الدر المختار(۲/۲۳۲)(وكره تأخير صلاته ودفنه ليصلي عليه جمع عظيم بعد صلاة الجمعة) إلا إذا خيف فوتها بسبب دفنه، قنية (كما كره) لمتبعها (جلوس قبل وضعها) وقيام بعده۔

وقال ابن عابدين تحتها:(قوله إلا إذا خيف إلخ) فيؤخر الدفن وتقدم صلاة العيد على صلاة

الجنازة . والجنازة على الخطبة والقياس تقديمها على العيد ، لكنه قدم مخافة التشويش ، وكي لا يظنها من في أخريات الصفوف أنها صلاة العيد بحر عن القنية .

ومفاده تقديم الجمعة على الجنازة للعلة المذكورة ولأنها فرض عين ، بل الفتوى على تقديم سنتها عليها ، ومر تمامه في أول باب صلاة العيد (قوله : جلوس قبل وضعها) للنهي عن ذلك كما في السراج نهر . ومقتضاه أن الكراهة تحريمية رملي (قوله وقيام بعده) أي يكره القيام بعد وضعها عن الأعناق كما في الخانية والعناية .وفي المحيط خلافه حيث قال : والأفضل أن لا يجلسوا حتى يسووا عليه التراب .

قال في البحر : والأول أولى . لما في البدائع : لا بأس بالجلوس بعد الوضع . لما روي عن عبادة بن الصامت " { أنه صلى الله عليه وسلم كان لا يجلس حتى يوضع الميت في اللحد . فكان قائما مع أصحابه على رأس قبر فقال يهودي : هكذا نصنع بموتانا ، فجلس صلى الله عليه وسلم وقال لأصحابه : خالفوهم } أي في القيام . فلذا كره ، ومقتضاه أنها كراهة تحريم . وهو مقيد بعدم الحاجة والضرورة رملي۔

درمختار میں دو مسئلے ذکر ہیں ایک جنازے کی نماز وتدفین میں جلدی دوسرا مسئلہ جنازہ کندھے سے رکھے جانے سے قبل بیٹھنا یا رکھے جانے کے بعد کھڑا رہنا۔ درمختار میں دونوں کو مکروہ قرار دیا ہے اور ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی ہے " و کرہ کما کرہ" البتہ شامیہ میں نماز جنازہ وغیرہ کی تاخیر سے متعلق کراہت میں تنزیہی یا تحریمی کی کوئی صراحت نہیں البتہ ''جلوس قبل الوضع او القیام بعدہ'' میں کراہت تحریمی ہونے کی تصریح ہے۔آپ نے جلوس قبل الوضع سے متعلق علامہ شامیؒ کے " ومقتضاه ان الكراهة تحريمية " کو تاخیر جنازہ کے ساتھ ملا دیا ہے جو کہ خلطِ مبحث ہے۔" ومقتضاه ان الكراهة تحريمية "میں علامہ ؒ نے جنازہ رکھنے سے قبل بیٹھنے اور رکھنے کے بعد کھڑا ہونے کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے اس کے درج ذیل دلائل ہیں۔

(۱) علامہؒ نے ''وکرہ تاخیر صلاتہ'' کے تحت بحث میں کراہتِ تحریم کی صراحت نہیں کی بلکہ جلوس قبل الوضع میں کی ہے۔

(۲) کراہتِ تحریم کے قول کی بناء ''للنہی عن ذلک'' پر ہے اور جلوس قبل الوضع میں تو علامہ شامیؒ نے نہی کی احادیث ذکر کی ہیں جبکہ تاخیر جنازہ میں نہیں کی (اگر چہ اس میں بھی فی الواقع نہی کی روایات موجود ہیں)، لہٰذا ''للنہی عن ذلک'' میں ذکر نہی کے الفاظ سے بھی کراہت تحریمی کے قول کا جلوس قبل الوضع سے متعلق ہونا معلوم ہوتا ہے۔

(۳) علامہؒ نے خود چند صفحات قبل جب کراہت کے تنزیہی اور تعجیل کے فقط مستحب ہونے کی صراحت کی ہے تو یہاں اگر چہ تصریح نہیں لیکن جلوس قبل الوضع مشبہ بہ کی کراہت تحریم کو تاخیر جنازہ مشبہ میں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ علامہؒ کا اپنا مذہب خود مصرح ہے تو اسے ہی مقدم کیا جائے گا۔

(۴) نیز "ومقتضاه ان الکراهة تحریمیة" کے صرف جلوس قبل الوضع سے متعلق ہونے پر سب سے بڑی دلیل درمختار کی اس عبارت کے تحت علامہ طحطاویؒ کی تصریحات ہیں علامہ طحطاوی نے صراحتاً پہلے کو مکروہ تنزیہی اور دوسرے کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے اگر بالفرض علامہ شامیؒ تاخیر کو مکروہ تحریمی سمجھتے تو یہاں علامہ طحطاوی سے اختلاف فرماتے لیکن ان کا سکوت بھی اسے کراہت تنزیہی قرار دینے پر دال ہے۔ نیز ماقبل میں صراحت بھی ہے لہٰذا مکروہ تحریمی کو تاخیر جنازہ سے متعلق نہیں کیا جائے گا۔

علامہ طحطاوی کی عبارت درج ذیل ہے:

(وکره تاخیر صلاته ... الخ) فالافضل ان یعجل بتجهیزه بتمامه من حین یموت بحر وظاهره ان الکراهة تنزیهیة... (قوله کما کره جلوس قبل وضعها) لانه قد تقع الحاجة الی التعاون والقیام امکن منه ولان الجنازة متبوعة وهم اتباع والتبع لا یقعد قبل قعود الاصل اه بحر (قوله: وقیام بعده) ای بعد وضعه عن الرقاب لما روی عن عبادة بن الصامت ان النبی ﷺ کان لا یجلس حتی یوضع المیت فی اللحد ... وقال ﷺ لاصحابه خالفوهم اه والظاهر ان الکراهة تحریمیة (طحطاوی علی الدر، جلد ۱/۳۸۰)

علامہ طحطاویؒ نے درّ کی اسی عبارت کے تحت جنازہ میں تاخیر کو مکروہ تنزیہی اور قیام بعد الوضع کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے لہٰذا علامہ شامیؒ کی کراہت تحریمی کی صراحت کو بھی جلوس قبل الوضع وغیرہ سے متعلق مانا جائے گا اور ماقبل میں ان کی اپنی صراحت "والصارف عن وجوب التعجیل" کی بنیاد پر تاخیر جنازہ کو مکروہ تنزیہی قرار دیا جائے گا۔

بندہ ناچیز اس مقام پر کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہے اول یہ کہ یہاں تک آپ کے پہلے مسئلے جنازے میں تاخیر سے متعلق شامیہ کی عبارات کا بظاہر تضاد اور مسئلہ کی نوعیت اور فقہاء کا رجحان ذکر کر دیا گیا لیکن بندہ یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہے کہ اگرچہ فقہاء نے تاخیر سے متعلق صرف کراہت تنزیہی اور تعجیل کے استحباب کا قول کیا ہے لیکن بندہ کو اس پر اطمینان نہیں۔ اردو فتاوی میں بھی اس معاملے میں انتہائی نرم انداز اختیار کیا گیا ہے حد سے حد فتاوی رحیمیہ میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ:

''جب کسی کی موت کا یقین ہو جائے تو جس قدر ممکن ہو اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں جلدی کی جائے ...... لہٰذا شرعی عذر اور قانونی مجبوری کے بغیر میت کی تجہیز و تکفین و تدفین میں تاخیر کرنا غلط اور موجب گناہ ہے'' (فتاوی رحیمیہ جلد ۶ / ۷)

جبکہ فتاوی محمودیہ وغیرہ میں اس طرح کی عبارات ہیں۔

عنوان: جنازہ کو جمعہ تک موخر کرنا

میت کو محض اس لیے اتنی دیر تک روکے رکھنا مکروہ ہے مستحب اور افضل یہ ہے کہ اس کے دفن میں جلدی کی جائے۔ کذا فی طحطاوی

(محمودیہ جلد ۸ / ۵۷۳)

جبکہ بندہ سمجھتا ہے کہ فقہاء کا اسے مطلقاً مکروہ تنزیہی قرار دینا ہی محل نظر ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

(۱) بے شمار نصوص اور قرونِ اولیٰ کا عمل اس پر شاہد بیّن ہے کہ نماز جنازہ اور تدفین میں جلدی کی جائے لہٰذا تعجیل واجب اور تاخیر مکروہ تنزیہی نہیں بلکہ تحریمی ہونی چاہیے۔

(۲) اگر یہ وجہ بتائی جائے کہ احتمال اغماء اور سکتہ ہے تو یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جس کی بنیاد پر صریح نصوص میں وجوب کے بجائے استحباب مراد لیا جائے اولاً اتنی جلدی کا تو کوئی بھی قائل نہیں کہ مرنے کے فوراً بعد وہیں قبر کھود کر دفنا دیا جائے بلکہ دو سے چار گھنٹے تو عموماً لگتے ہی ہیں۔

ثانیاً آج کل موت کی تصدیق ڈاکٹر حضرات بالیقین کر دیتے ہیں بلا کسی ادنی شک کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص مر گیا ہے لہٰذا وجوب سے عدول کی علت ہی مخدوش ہوگئی تو پھر استحباب مراد نہ لینا چاہیے۔

ثالثاً اگر علامہ ابن عابدینؒ کی بات کو منقح کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حدیث میں تو تعجیل آئی ہے جس سے مراد فوراً دفن کر دینا ہے اور اس کا واجب ہونا امر سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں احتمال اغماء کا عارض ہے لہٰذا اتنی تعجیل صرف مستحب ہے اور نہ کرنا مکروہ تنزیہی ہے جب کہ مسئلہ اتنی زیادہ تعجیل (جلدی) سے متعلق ہی نہیں، اصل مسئلہ تو موت کا اطمینان ہونے کے بعد آرام سے تجہیز و تکفین کرنے کا ہے کہ اس میں جلدی کرنا نصوص سے واجب معلوم ہوتا ہے [حدیث میں وارد تعجیل سے یہی مراد ہے] اور اگلا دن یا کئی دن لگانا مکروہ معلوم ہوتا ہے اور اس کی کراہت تحریمی ہونی چاہیے۔ لہٰذا ایک ایسا عارض جو کہ اتنی زیادہ جلدی سے متعلق ہے کہ منٹوں میں تدفین کر دی جائے اس کی بنیاد پر احادیث میں وارد امر سے استحباب مراد لینا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

بندہ ناچیز یہاں انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہے کہ علامہؒ کی توجیہ کے مطابق تو اتنی جلدی تدفین کرنا کہ احتمال اغماء ہو مستحب ہے (اگرچہ واجب نہیں) جب کہ اس سے تاخیر مکروہ تنزیہی ہے۔ لیکن بندہ سمجھتا ہے کہ اتنی تعجیل کہ موت کی تصدیق ہی نہ ہو اسے مستحب قرار دینا محل نظر ہے اتنی تعجیل تو بحث سے خارج ہے۔ اتنی زیادہ تعجیل کو تو مکروہ ہونا چاہیئے نہ کہ مستحب۔ حاذق ڈاکٹر جب تک موت کی تصدیق نہ کرے تدفین کی اجازت نہیں دی جا سکتی لہٰذا بندہ یہ عرض کرتا ہے کہ احتمال اغماء کی علت محل نظر ہے اس پر ہم عصر مفتیان کرام بھی غور کریں۔ چنانچہ امر کو وجوب پر ہی لیا جائے لیکن اتنی جلدی مراد نہ لی جائے کہ موت سے پہلے ہی تدفین ہو جائے بلکہ اطمینان سے موت کی تصدیق کے بعد معروف طریقے سے تمام اقدامات کر کے تدفین کر دی جائے جو کہ چند گھنٹوں کا کام ہے۔ یہاں کئی گھنٹوں، دنوں اور ہفتوں تک لوگوں کا انتظار کرنا یا کسی اور غیر شرعی عذر کی بناء پر تاخیر کرنا یہ مکروہ تحریمی اور سخت گناہ قرار دیا جائے۔ احتمال اغماء کے ختم ہونے کے بعد دنوں کی تاخیر کو مکروہ تنزیہی قرار دینا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اتنی تاخیر فقہاء کے نزدیک بھی مکروہ تحریمی ہے تو یہ مخدوش ہے کیونکہ فقہاء کا صراحت کے ساتھ مطلقاً اسے مکروہ تنزیہی قرار دینا اس سے اباء کرتا ہے۔

(۳) ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تاخیرِ جنازہ کے مستحب قرار دینے میں بہت سے مفاسد ہیں اور ان کا تدارک ناممکن ہے کیونکہ اگر آپ تاخیر کو مکروہ تنزیہی قرار دیتے ہیں تو پھر یہ مطلق ہے چاہے دنوں کی ہو یا ہفتوں کی تو پھر یہ لازم آئے گا کہ جو لوگ سرد خانوں میں میتیں رکھ کر کئی کئی دن رشتہ داروں کا انتظار کرتے ہیں وہ کوئی حرام کام نہیں کرتے۔ نیز شہر سے باہر یا شہر میں ہی زیادہ مجمع اکٹھا کرنے

کے لیے جو تاخیر کی جاتی ہے وہ بھی کوئی ممنوع کام نہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسرعوا بالجنازۃ" (جنازہ کے ساتھ جلدی کرو) "والجنازۃ اذا حضرت" (یعنی جنازہ حاضر ہو جائے تو تاخیر نہ کرو) وغیرہ ارشادات بے معنی رہ جاتے ہیں ایک ایسی علت کی بنیاد پر جو کہ مخدوش ہے تعجیل کے اوامر ونواہی کو استحباب اور تاخیر کو کراہت تنزیہی مراد لے لینا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ نیز درمختار میں ذکر "و کرہ تاخیر صلاتہ ... کما کرہ لمتبعھا جلوس قبل الوضع" بھی مطلق ہے اس میں جلوس قبل الوضع کو مکروہ تحریمی اور تاخیر کو تنزیہی قرار دینا بھی محل نظر ہے جلوس سے متعلق نہی کی احادیث تو علامہ شامیؒ لائے ہیں لیکن تاخیر میں بھی تو نہی کی احادیث اور امر کے صیغے وارد ہیں اس سے چشم پوشی کیوں؟ نیز جلوس قبل الوضع کو تو آداب میں سے بھی شمار کیا گیا ہے نیز اس کی کراہت کو بعض فقہاء نے مکروہ تنزیہی قرار دیا گیا ہے چنانچہ اعلاء السنن میں ہے:

"قوله: "تأمل" لعله اشارة الى تضعيف القول بكراهة التحريم، واختار كراهة التنزيه فانّه من الآداب" (اعلاء السنن ۸/۲۹۹)

جبکہ تاخیر سے متعلق نصوص کثیرہ کا ورود اس کراہت کا تحریمی ہونا بتاتا ہے۔

(۴) علامہ طحطاویؒ صراحتاً تاخیر کو مکروہ تنزیہی قرار دینے کے باوجود اور علامہ شامی بھی تاخیر پر بحث کرتے ہوئے یہ مسائل لائے ہیں کہ جنازے کو جمعہ سے پہلے پڑھا جائے گا اور جمعہ کی نماز تک اس لئے انتظار کرنا کہ نمازی زیادہ ہوں گے درست نہیں ہاں اگر نماز جنازہ پڑھنے سے جمعہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو جمعہ پہلے پڑھا جائیگا نیز یہاں ایک مسئلہ یہ بھی اٹھایا ہے کہ نماز عید کو نماز جنازہ سے قبل پڑھا جائے گا البتہ نماز عید کے فوراً بعد خطبہ عید سے قبل پڑھیں گے، اس پر یہ اشکال اٹھایا ہے کہ قیاس تو یہ کہتا ہے کہ نماز عید سے بھی پہلے پڑھا جائے پھر تاخیر کیوں؟ پھر جواب دیا کہ پچھلی صفوف والوں کو نماز جنازہ پر نماز عید ہونے کا شبہ ہو جائے گا اس لئے عید پہلے پڑھی جائے گی البتہ نماز عید کے فوراً بعد خطبہ سے قبل نماز جنازہ پڑھیں گے۔ بندہ یہاں یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ تعجیل اگر صرف مستحب ہے تو پھر جمعہ اور عید سے قبل نماز جنازہ پڑھنے پر زور کیوں؟ نماز عید کے فوراً بعد خطبہ عید سے قبل نماز جنازہ پڑھنا کیوں ضروری ہے؟ اتنے اہم امور پہلے انجام دے لیے جائیں جنازے میں تعجیل صرف مستحب ہے اس کے لیے اتنا تکلف کیوں۔ اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعجیل جنازہ واجب ہونی چاہیے ورنہ فقط ایک استحباب کے واسطے اتنے مراتب بنانے کی بظاہر کیا ضرورت ہے؟؟؟

لما فی الطحطاوی علی الدر ۱/۳۸۰

(وكره تاخير صلاته ... الخ) فالافضل ان يعجل بتجهيزه بتمامه من حين يموت بحر وظاهره ان الكراهة تنزيهية ... (قوله ودفنه) ولو بعد الصلاة عليه (قوله: الا اذا خيف فوتها) اى فتقدم على الدفن وتقدم صلاة العيد على صلاة الجنازة وصلاة الجنازة على خطبته والقياس ان تقدم على صلاة العيد لكنه قدم صلاة العيد مخافة التشويش ولئلا يظن من فى آخر الصفوف انها صلاة العيد۔

نیز شامیہ میں ہے:

(قوله إلا إذا خيف إلخ) فيؤخر الدفن وتقدم صلاة العيد على صلاة الجنازة ، والجنازة على الخطبة والقياس تقديمها على العيد ، لكنه قدم مخافة التشويش ، وكي لا يظنها من في أخريات الصفوف أنها صلاة العيد بحر عن القنية . ومفاده تقديم الجمعة على الجنازة للعلة المذكورة ولأنها فرض عين ، بل الفتوى على تقديم سنتها عليها ۔

(۵) نماز جنازہ سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی کتب میں ذکر ہے کہ مکروہ اوقات میں بھی وہ میت جو مکروہ وقت میں جنازے کے لیے حاضر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا بلا کراہت جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ مکروہ وقت میں جنازہ اداء کرلیا جائے اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ جب مکروہ وقت میں جنازہ حاضر ہو تو اس کا حضور مکروہ وقت میں ہی ہے اور حضور سے وجوب ہوتا ہے نیز تاخیر بوجہ نصوص مکروہ ہے لہٰذا فوراً پڑھ لیا جائے۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ جب تاخیر کے مکروہ ہونے کی بناء پر فوراً جنازہ اداء کیا جارہا ہے تو یہ تاخیر مکروہ تحریمی تو ہونی چاہیے ورنہ وقت گذرنے کے بعد بھی اداء کیا جاسکتا ہے نیز جنازے کی نماز میں جلدی کی تاکید اگر اتنی زیادہ ہے کہ مکروہ وقت میں بھی اداء کرلیا جارہا ہے تو اسے واجب کہا جائے۔

لمافی تبيين الحقائق : قال رحمه الله (ومنع عن الصلاة وسجدة التلاوة وصلاة الجنازة عند الطلوع والاستواء والغروب إلا عصر يومه) .... وكذا المراد بصلاة الجنازة ما حضرت قبل هذه الأوقات فإن حضرت فيها جازت من غير كراهة ۔ لأنها أديت كما وجبت إذ الوجوب بالحضور وهو أفضل والتأخير مكروه لقوله عليه الصلاة والسلام { ثلاث لا يؤخرن وذكر منها الجنازة }۔

وفى الدر المختار ۳۷۴/۱:(وسجدة تلاوة ،وصلاة جنازة تليت) الآية (في كامل وحضرت) الجنازة (قبل) لوجوبه كاملا فلا يتأدى ناقصا ، فلو وجبتا فيها لم يكره فعلهما أي تحريما وفي التحفة : الأفضل أن لا تؤخر الجنازة .

وقال ابن عابدين تحتها: قوله (فلو وجبتا فيها) أي بأن تليت الآية في تلك الأوقات أو حضرت فيها الجنازة قوله (أي تحريما) أفاد ثبوت الكراهة التنزيهية قوله(وفي التحفة الخ) هو كالاستدراك على مفهوم قوله أي تحريما فإنه إذا كان الأفضل عدم التأخير في الجنازة فلا كراهة أصلا وما في التحفة أقره في البحر والنهر والفتح والمعراج لحديث ثلاث لا يؤخرن منها الجنازة إذا حضرت وقال في شرح المنية والفرق بينها وبين سجدة التلاوة ظاهر لأن التعجيل فيها مطلوب مطلقا إلا لمانع وحضورها في وقت مباح مانع من الصلاة عليها في وقت مكروه

بخلاف حضورها في وقت مكروه وبخلاف سجدة التلاوة لأن التعجيل لا يستحب فيها مطلقا اهـ أي بل يستحب في وقت مباح فقط فثبتت كراهة التنزيه في سجدة التلاوة دون صلاة الجنازة۔

الغرض ان تمام وجوہات پر غور کرتے ہوئے اور احادیث میں وارد صریح امر کے صیغوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نیز علت عدول عن الوجوب یعنی احتمال اغماء پر وارد تحفظات اور تاخیر کے کراہت تنزیہی والے قول سے پیدا شدہ مفاسد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بندہ یہ سمجھتا ہے کہ تاخیر جنائز اور تدفین جو بلا کسی شرعی عذر یا قانونی پیچیدگی کی بنیاد پر ہو وہ مکروہ تحریمی ہونی چاہیے۔ قانونی پیچیدگی تو یہ کہ مثلاً رات قبرستان بند ہو یا کوئی دیگر قانونی کاروائی ہو، ڈاکٹر صاحب تصدیق وفات نہ کر رہے ہوں۔ عذر مثلاً نہلانے والے کا انتظام یا دیگر کوئی شرعی امر کا انتظام زیر نظر ہو جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین میں تاخیر شرعی عذر کی بنیاد پر تھی ایک تو کوئی امامت نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ پڑھنی تھی نیز خلافت جیسے اہم امر کا تعین کیا جانا ضروری تھا لہٰذا ان اعذار کی بنیاد پر تدفین وغیرہ میں تاخیر ہوئی تھی لہٰذا بلاوجہ تاخیر لوگوں کے انتظار کے لیے یا مجمع بڑھانے کے لیے کئی گھنٹے یا دن سرد خانوں میں میت رکھنا جائز نہ ہونا چاہیے لہٰذا بندہ احتیاط کی بناء پر نماز جنازہ میں بے جا تاخیر جو بلا کسی شرعی یا قانونی عذر کے ہو اسے مکروہ تحریمی سمجھتا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ **انتقال میت** سے متعلق ہے یعنی میت کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنا یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے البتہ فقہاء کی ایک جماعت نے اس کے صراحۃً مکروہ اور علامہ طحطاویؒ نے مکروہ تحریمی ہونے کی صراحت فرمائی ہے شامیہ میں ہے:

قال الحصكفي: يندب دفنه في جهة موته وتعجيله ... ولا بأس بنقله قبل دفنه۔

وفي الشامية تحته: قوله (يندب دفنه في جهة موته) أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل وإن نقل قدر ميل أو ميلين فلا بأس شرح المنية ويأتي الكلام على نقله۔ قلت ولذا صح أمره بدفن قتلى أحد في مضاجعهم مع أن مقبرة المدينة قريبة ولذا دفنت الصحابة الذين فتحوا دمشق عند أبوابها ولم يدفنوا كلهم في محل واحد وتعجيله أي تعجيل جهازه عقب تحقق موته ولذا كره تأخير صلاته ودفنه ليصلي عليه جمع عظيم بعد صلاة الجمعة كما مر قوله ---۔ قوله (ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا وقيل إلى ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال في النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر اه وأما نقله بعد دفنه فلا مطلقا (شامية ۲/۲۳۹)

علامہ سرخسیؒ نے بھی انتقال میت کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ لایعنی فعل ہے نیز اس میں تاخیر دفن کی وجہ ہی فقط ہوتی تو بھی اس کی کراہت کے لیے کافی تھی جبکہ یہاں تو اور بھی وجوہات ہیں۔

وفي هذا بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه لانه قدر المسافة التي لا يكره النقل فيها بميل

او ميلين وهذا لانه اشتغال بمالا يفيد فالارض كلها كفات للميت قال الله تعالىٰ الم نجعل الارض كفاتا احياء واموا تاالاان الحی ينتقل من موضع الى موضع لغرض له فى ذلك وذلك لايوجد فى حق الميت ولو لم يكن فى نقله الا تاخير دفنه أيا ما كان كافيا فى الكراهة

(شرح السير الكبير ١/٢٣٧)

انتقال میت کے ممنوع ہونے سے متعلق صریح نصوص منقول ہیں مشکوۃ شریف میں حدیث ہے۔

''عن جابر قال لما كان يوم احد جاءت عمتى بابي لتدفنه فى مقابرنا فنادى منادى رسول الله ﷺ ردّوا القتلىٰ الى مضاجعهم''(مشكوة، باب دفن الميت ١/١٤٨)

اسکی شرح میں ہے:

'' وكذا من مات فى موضع لا ينقل الى بلد آخر قاله بعض علمائنا وقال فى الازهار الأمر فى قوله ﷺ ردّوا القتلىٰ للوجوب''(مرقاة: ٤/١٤٣)

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو انہیں دوسرے مقام پر لے جا کر دفن کیا گیا تھا حضرت عائشہ صدیقہؓ جب ایک سفر میں اپنے بھائی کی قبر سے گذریں تو فرمانے لگیں اگر میرا بس چلتا تو تم یہاں دفن نہ ہوتے بلکہ جہاں انتقال ہوئے تھے وہیں دفن کیے جاتے۔

اس کے علاوہ امام محمدؒ سے مسئلہ منصوص ہے کہ ایک میل اور دو میل تک انتقال میں تو حرج نہیں لیکن اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں یہ بھی کراہت پر دال ہے۔ اسی بنیاد پر جب مسئلہ واضح اور کراہت متعین ہے نیز انتقال میت جو بسا اوقات کئی دنوں کی تاخیر کا سبب بنتا ہے اسکی گنجائش معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہ شرعی مزاج اور تدفین میں منقول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلدی کرنے سے متعلق نصوص سے اعراض ہے تب ہی علامہ طحطاویؒ نے اسے مکروہ تحریمی قرار دے کر جن کتب میں اس بارے میں تخفیف معلوم ہوتی ہے ان پر رد کیا ہے علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں:

قوله (بيان أن النقل من بلد إلى بلد مكروه) أي تحريما لأن قدر الميلين فيه ضرورة ولا ضرورة في النقل إلى بلد آخر وقيل أيجوز ذلك إلى ما دون مدة السفر وقيل في مدة السفر أيضا۔۔۔ قوله (فإن نقل إلى مصر آخر لا بأس به) وظاهره عدم كراهة النقل من بلد إلى بلد مطلقا ۔ قوله (لما روي أن يعقوب الخ) وموسى عليه السلام نقل تابوت يوسف عليه السلام من مصر إلى الشام بعد زمان ۔ قوله (قلت الخ) أصله للكمال فإنه قال في رده كلام صاحب الهداية في التجنيس أنه لا إثم في النقل من بلد إلى بلد لما نقل أن يعقوب الخ ما نصه أن ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه من شرعنا ولأن أجساد الأنبياء عليهم السلام أطيب

ما يكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضي الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم أشد نتنا من جيفة البهائم فلا يلحق بهم اھ

(طحطاوی علی مراقی الفلاح ص۶۱۴)

الغرض نصوص احادیث اور تصریحات فقہاء کے بعد مسئلہ انتقال میت میں کسی قسم کی گنجائش باقی نہیں رہتی یہ مکروہ تحریمی اور منکر عمل ہے اس پر تنبیہ اور اصلاح کی جانی چاہیے یہ شرعی مزاج کے خلاف اور ''اسرعوا بالجنازۃ'' سے متصادم رواج ہے اس کا التزام کیا جانے لگا ہے جو مفاسد کثیرہ کا سبب ہے اس میں لایعنی فعل اور اسراف مال کی قباحت بھی موجود ہے اپنے وطن اور قبرستان میں دفن کا التزام بدعت اور دیگر قبیح خیالات کا سبب یہ فعل ہے اس میں جنازے کی تدفین میں حد سے زیادہ تاخیر ہے لہٰذا ہر شخص کو اس عمل سے دور رہنا لازم ہے ہمارے اکابر اس ڈر سے مدینہ سے باہر نہیں جاتے تھے کہ مدینہ میں تدفین نصیب نہ ہوگی اگر انتقال میت جائز ہوتا پھر کیا ڈر تھا فرمادیتے کہ مجھے واپس مدینۃ الرسول لاکر دفن کردینا لہٰذا اس مسئلے میں کوئی نرم پہلو نکالنا مفاسد قبیحہ کا التزام ہے۔

بعض حضرات نے مسئلے کو اختلافی اور مجتہد فیہ بنا کر اس میں کراہت کو تنزیہیہ اور مسئلہ کو تخفیف میں داخل کردیا ہے جو عوام وخواص میں اس رجحان کو تقویت دے گا۔ بندہ اس عمل کو کراہت تنزیہی قرار دینے کو محلِ نظر سمجھتا ہے اس مسئلہ میں ابتلاء تو اس کو حرمت تک پہنچاتا ہے صغیرہ پر اصرار بھی اسے کبیرہ بنادیتا ہے پھر ایک ایسا عمل جو احادیث اور فقہاء کے نصوص اور تصریحات کی روشنی میں مکروہ تحریمی ہے جو خود حرام کے اقرب ہے اسے ابتلاء کے باوجود مکروہ تنزیہی کے درجے میں لانے کی کوشش کرنا بندہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے مسئلہ اگرچہ مجتہد فیہا ہو لیکن جانبِ حرمت کے رجحان اور مفاسد کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے اور یہاں مفاسد عظیمہ موجود ہیں۔ فقہاء اولی اور استحباب کا لفظ بھی مسائل میں نقل کردیتے ہیں اولاً تو مسئلہ ہذا میں ان پر ابن الھمام اور طحطاوی رحمھا اللہ کا رد نقل کردیا ثانیاً صراحۃً کراہت تحریمی کے قول کے بعد اس اولی کے لفظ کو لیکر سارے مسئلے کو تنزیہی بنادینا کہاں درست ہوسکتا ہے، ثالثاً امام مذہب امام محمدؒ سے دو میل سے زیادہ کی کراہت منقول ہے اور اس سے مراد بتصریح فقہاء تحریمی ہے پھر مسئلہ کو کراہت تنزیہی کے درجے میں لانے کی کوئی وجہ نہیں۔

انتقال میت سے متعلق حضرت فقیہ العصر مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ، دارالافتاء بنوری ٹاؤن اور دارالافتاء والارشاد کا احسن الفتاوی میں مطبوع فتوی میں بھی یہی رائے اختیار کی گئی ہے کہ یہ عمل مکروہ تحریمی ہے۔

(۴۰۸) نماز جنازہ میں تکبیرات چھوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر نماز جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیرات چھوٹ جائیں تو اب وہ انہیں کیسے ادا کرے گا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱)۔نمازِ جنازہ اگر مکروہ وقت میں حاضر ہو جائے اس کو مکروہ وقت میں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر جنازہ مکروہ وقت سے پہلے حاضر کر دیا جائے پھر اس کو مکروہ وقت میں ادا کرنا جائز نہیں۔

(۲)۔اگر نمازِ جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیریں چھوٹ جائیں تو وہ ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے گا پھر اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف نہ ہو تو تکبیرات کے ساتھ ساتھ دعا ماثورہ وغیرہ بھی پڑھنی چاہیئے اور اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف ہو تو پھر صرف تکبیرات کہہ لے دعا وغیرہ نہ پڑھے۔

لمافی الشامية(۳۷۳/۱): واعلم أن الاوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب ، والثانى مابين الفجر والشمس وما بين صلاة العصر الى الاصفرار۔ فالنوع الأول لاينعقد فيه شئ من الصلوات التى ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأعليها الاصلاة جنازة حضرت فيها و سجدة تليت آيتها فيها وعصر يومه و النفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنعقد هذه الستة بلا كراهة أصلا فى الأولىٰ منها، ومع الكراهة التنزيهية فى الثانية والتحريمية فى الثالثة وكذا فى البواقى۔

وفى الدر المختار(۲۱۷/۲): (فلوجاء) المسبوق (بعد تكبيرة الامام لرابعة فاتته الصلاة) لتعذر الدخول فى تكبيرة الامام وعند ابى يوسف يدخل لبقاء التحريمة فاذا سلم الامام كبر ثلاثا كمافى الحاضر وعليه الفتوى۔

(۴۰۹) نماز جنازہ میں امامت کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اور عصبہ کا شرعی معنی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ عصبہ کا شرعی معنی کیا ہے ان کی ترتیب کیا ہے وہ کتنے افراد پر مشتمل ہے نیز اگر کسی شخص کا دوسرے شہر میں انتقال ہو جائے تو اس میت کو اپنے وطن اصلی میں لا کر دفن کرنا، نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز جنازہ کی امامت میں سب سے زیادہ مستحق بادشاہ یا اس کا نائب ہے بشرطیکہ یہ موجود ہوں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو قاضی اس کے بعد شہر کا امیر ہے اگر امیر شہر نہ ہو تو اس کا نائب یعنی قائم مقام اور اگر یہ نہ ہو تو پھر قاضی کا خلیفہ اگر یہ

بھی نہ ہو تو پھر امامت کا زیادہ استحقاق میت کے محلے کی مسجد کے امام کو حاصل ہے اور اس کے بعد میت کا ولی قریب نکاح میں ولایت کی ترتیب کی طرح یعنی اولاً میت کے سب سے زیادہ قریب کو درجہ بدرجہ آخر تک جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

(2)......شریعت میں عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کیلئے کوئی متعین حصہ مال وراثت میں مقرر نہ کیا گیا ہو بلکہ ذوی الفروض (جن کے متعین حصے بیاں کیے گئے ہیں) کے حصے سے جو مال بچ جائے ان کو ملتا ہو، البتہ جب ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال ان کو ملتا ہو پھر عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔(۱)۔عصبہ بالنسب،(۲)۔عصبہ بالسبب اور عصبہ بالنسب کی تین قسمیں ہیں۔(۱)۔عصبہ بنفسہ،(۲)۔عصبہ بغیرہ، (۳)۔عصبہ مع غیرہ۔اب مذکورہ بالا اقسام میں جنازہ کی امامت میں عصبہ بنفسہ کا اعتبار ہوتا ہے جس کی چار قسمیں ہیں۔

(۱)۔میت کا جزء جیسے بیٹا، (۲)۔میت کا اصل جیسے باپ، (۳)۔میت کے باپ کا جزء جیسے میت کا بھائی

(۴)۔میت کے باپ کے باپ کا جز جیسے میت کا چچا۔

(3)......اگر کسی شخص کا انتقال دوسرے شہر میں ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ اسی شہر میں دفن کر دیا جائے البتہ اگر میت کو اپنے وطن میں واپس لا کر اپنے وطن میں دفن کیا جائے تب بھی شرعاً جائز ہے البتہ ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن(۲۵۱/۸): عن الحسین بن علی(مرفوعا) ''اذا حضرت الجنازۃ فالامام احق بالصلاۃ علیھا عن غیرہ، رواہ ابن منیع۔

وفی الشامیۃ(۲۳۹/۲): (قولہ ولا بأس بنقلہ قبل دفنہ) قیل مطلقا، وقیل الی مادون مدۃ السفر وقیدہ محمد بقدر میل اومیلین لان مقابرالبلد ربما بلغت ھذہ المسافۃ فیکرہ فیمازاد قال فی النھر عن عقد الفرائد وھو الظاھر واما نقلہ بعد دفنہ فلا مطلقا۔

وفی الدر المختار (۷۶/۳): (الولی فی النکاح العصبۃ بنفسہ) وھو من یتصل بالمیت حتی المعتقۃ

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ العصبۃ بنفسہ) خرج بہ العصبۃ بالغیر کالبنت تصیر عصبۃ بالا بن ولا ولایۃ لھا علی امھا المجنونۃ وکذا العصبۃ مع الغیر کالاخوات مع البنات ولا ولایۃ للاخت علی اختھا المجنونۃ۔

وفی مراقی الفلاح مع الطحطاوی (ص۵۰۶): (فان نقل قبل الدفن قدر میل اومیلین) ونحوذلک (لابأس بہ) لان المسافۃ الی المقابر قد تبلغ ھذا المقدار (وکرہ نقلہ لأکثرمنہ) ای اکثر من المیلین کذا فی الظھیریۃ وقال شمس الائمۃ السرخسی: وقول محمد فی الکتاب لابأس ان ینقل بالمیت قدر میل اومیلین بیان ان النقل من بلد الی بلد مکروہ قالہ قاضیخان وقد قال قبلہ لومات فی غیر بلدۃ یستحب ترکہ فان نقل الی مصر آخر لابأس بہ لما روی ان یعقوب صلوات اللہ علیہ مات بمصر ونقل الی الشام وسعد بن ابی وقاص مات فی ضیعۃ علی اربعۃ فراسخ

من المدينة ونقل على اعناق الرجال الى المدينة قلت: يمكن الجمع بان الزيادة مكروهة فى تغير الرائحة اوخشيتها وتنتفى بانتفائها لمن هو مثل يعقوب عليه السلام او سعد رضی اللہ عنہ لانهما من احياء الدارين (قوله أى اكثر من الميلين) كثرة فاحشة اما الزيادة عليهما بقدر يسير فلا تضر فلا ينافى قوله قبل ونحوذلك (قوله بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه) اى تحريما لان قدر الميلين فيه ضرورة ولا ضرورة فى النقل الى بلد آخر وقيل: يجوز ذلك الى مادون مدة السفر وقيل فى مدة السفر ايضا كذا فى حلبى وفيه ان كلام محمد مطلق عن قيد لضرورة وايضا لاتظهر الكراهة فى نقله من بلد الى بلد الا اذا كانت المسافة اكثر من ميلين ...قوله(فان نقل الى مصرآخر لابأس به) وظاهره عدم كراهة النقل من بلد الى بلد مطلقا، قوله (لما روى ان يعقوب الخ) وموسىٰ عليه السلام نقل تابوت يوسف عليه السلام من مصر الى الشام بعد زمان قوله (قلت الخ) اصله للكمال فانه قال فى رده كلام صاحب الهداية فى التجنيس انه لا اثم فى النقل من بلد الى بلد لما نقل ان يعقوب الخ مانصه ان ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه من شرعنا ولان اجساد الانبياء عليهم السلام اطيب مايكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضى الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم اشد نتنا من جيفة البهائم فلا يلحق بهم۔

(۴۱۰) نومولود جورویا نہیں اور تین گھنٹے بعد مرگیا اس کی نماز جنازہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بچہ پیدا ہوا اور رویا بھی نہیں تین گھنٹے کے بعد فوت ہوگیا کیا اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں بچہ جب زندہ پیدا ہوا یعنی اس میں ایسے اثرات تھے، جو اس کی زندگی پر دلالت کرتے ہوں، مثلاً کھانسے، جمائی لے، روئے یا کسی اندام کو حرکت دے (صرف نفس اندام کے سمیٹنے اور پھیلانے کا اعتبار نہیں ہے) پھر فوت ہوا تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

لمافى الشامية مع الدر المختار(۲۲۷/): ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه، قوله أى وجد منه مايدل على حياته أى من بكاء أو تحريك عضو أو طرف ونحوذلك بدائع، وهذا معناه فى الشرع كمافى البحر: وقال فى الشرنبلالية: يعنى الحياة المستقرة، ولا عبرة لانقباض وبسط اليد وقبضها۔ لأن هذه الاشياء حركة المذبوح ولا عبرة بها الخ۔

رسالة

الأوابد فی اداء صلوة الجنازة داخل المساجد

مسجد کے اندر نماز جنازہ کی ادائیگی سے متعلق مختلف صورتیں اور ان کے احکام

نیز مسئلہ ھذا میں موجود گنجائش کا بیان

(۴۱۱) مسجد کے اندر نماز جنازہ کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازے کی نماز مسجد میں پڑھنے کا کیا حکم ہے نیز کچھ لوگ مسجد میں اور کچھ باہر ہوں تو کیا یہ صورت جائز ہے؟ عالمگیری سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی غلط ہے اور ابوداؤد کی حدیث بھی عدمِ جواز بتاتی ہے۔ برائے مہربانی ہمیں احناف کا مفتی بہ مذہب بتائیں نیز امام باہر اور مقتدی مسجد میں ہوں یہ گنجائش کن فقہ کی کتابوں میں ذکر ہے۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ اس مسئلے میں شوافع اور حنابلہ کا کیا مذہب ہے؟ چونکہ ہمارے گھر کے نزدیک ایک مسجد ہے جس میں جنازہ کو مسجد کے اندر رکھ کر جنازہ پڑھاتے ہیں کیا ان کا یہ فعل صحیح ہے؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث اور فقہاء کی عبارات سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... احناف کے ہاں مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں عدم جواز کی صراحت ہے، حدیث کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ نماز جنازہ مع المیت کے مسجد میں ادا ہو چنانچہ مسئلہ کی مندرجہ ذیل صورتیں بنیں گی۔ (۱) تینوں مسجد کے اندر ہوں (میت، امام، مقتدی)۔ (۲) میت، امام باہر اور مقتدی اندر ہوں، (۳) سب اندر میت باہر ہو (۴) میت، امام اور بعض مقتدی باہر اور بقیہ اندر ہوں ان چاروں صورتوں میں پہلی تین صورتوں پر من صلی علی جنازۃ فی المسجد کا اطلاق من کل وجہ ہو رہا ہے۔ اس لیے ائمہ احناف کے نزدیک یہ تین صورتیں ناجائز ہیں جبکہ چوتھی صورت من کل وجہ حدیث میں داخل نہیں ہے صرف وہ نمازی جو مسجد میں ہیں ان پر اس کا اطلاق ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ احناف میں سے امام سرخسی، صاحب محیط، علامہ عینی، صاحب عنایۃ کبیری، مراقی الفلاح اور صاحب مجمع رحمھم اللہ وغیرہ نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے جو ائمہ احناف سے منصوص ہے کہ جنازہ فی المسجد کی کراہت تلویث مسجد کی بناء پر ہے اور میت کے باہر ہونے کی صورت میں یہ علت نہیں پائی جاتی۔

(۲) جب امام، میت اور بعض مقتدی باہر ہیں تو نماز جنازہ حقیقتاً باہر ہی منعقد ہو رہی ہے نہ کہ مسجد کے اندر۔ البتہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ اگر چہ جو لوگ مسجد سے باہر ہیں تو ان پر یہ حدیث صادق نہیں آرہی، لیکن جو لوگ مسجد میں ہیں ان پر من صلی علی جنازۃ کا اطلاق ہو رہا ہے ان کے لیے پھر بھی مکروہ ہوگی۔ جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے البتہ آج کل الگ سے جنازہ گاہ نہ ہونے کی وجہ سے اگر بعض لوگ مسجد میں جنازہ پڑھ لیں (چوتھی صورت میں) اس کو علامہ شامی رحمہ اللہ نے مکروہ تنزیہی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ جنازہ گاہ موجود ہو لیکن تنگ ہو یا سڑک وغیرہ پر نماز ادا کی جارہی ہو اور اگر ایسی جگہ بھی موجود نہ ہو تو پھر علامہ شامی رحمہ اللہ نے ضرورت کی بناء پر چوتھی صورت کو بغیر کراہت کے جائز قرار دیا ہے لہٰذا چاہے نماز جنازہ فی المسجد کی علت تلویث ہو یا ضرورت ہو۔ ہر دو صورت میں چوتھی صورت جائز ہے۔

رہا اس بارے میں شوافع اور حنابلہ کا مذہب ان کے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ درست ہے بشرطیکہ تلویث مسجد کا خوف نہ ہو، اگر تلویث مسجد کا خوف ہے تو پھر ان کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

(۳)۔ آپ کے محلے والوں کا یہ فعل اگر بلا عذر ہے تو درست نہیں ہے۔

لمافی کبیری فصل فی الجنائز (۵۸۸/۱): ولو وضعت خارج المسجد والامام وبعض القوم معها والباقی فی المسجد والصفوف متصلة لا یکره واعلم ان لفظ حدیث ابی هریرة محتمل لکل من الکراهة فی هذه الصور۔

وفی مراقی الفلاح. فصل السلطان احق بصلاته (ص۵۹۶): لما اورده النسفی من ان الامام اذا کان خارج المسجد مع بعض القوم لا یکره بالاتفاق لما علمت من الکراهة علی المختار۔

وفی مجمع الانهر فصل الصلاة علیه فرض کفایة (۲۷۲/۱): (خارجه) ای المسجد وقام الامام خارج المسجد معه صف والباقی فی المسجد کذا فی اکثر الکتب لکن فی الاصلاح ولو کانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد وباقی القوم فی المسجد کما هو المعهود فی جوامعنا لا یکره باتفاق اصحابنا۔

وفی الشامیة. مطلب فی کراهة صلاة الجنازة فی المسجد (۲۲۵/۲): قوله (بناء علی أن المسجد الخ) أما إذا عللنا بخوف تلویث المسجد فلا یکره إذا کان المیت خارج المسجد وحده أو مع بعض القوم اهـ ح قال في شرح المنیة وإلیه مال في المبسوط و المحیط وعلیه العمل وهو المختار اهـ قلت بل ذکر في غایة البیان و العنایة أنه لا کراهة فیها بالاتفاق لکن رده في البحر وأجاب في النهر بحمل الاتفاق علی عدم الکراهة في حق من کان خارج المسجد وما مر في حق من کان داخله ---- وبعد صفحة: وانظر هل یقال إن من الحذر ما جرت به العادة في بلادنا من الصلاة

عليها في المسجد لتعذر غيره أو تعسره بسبب اندراس المواضع التي كانت يصلى عليها فيها فمن حضرها في المسجد إن لم يصل عليها مع الناس لا يمكنه الصلاة عليها في غيره ولزم أن لا يصلي في عمره على جنازة نعم قد توضع في بعض المواضع خارج المسجد في الشارع فيصلى عليها ويلزم منه فسادها من كثير من المصلين لعموم النجاسة وعدم خلعهم نعالهم المتنجسة مع أنا قدمنا كراهتها في الشارع وإذا ضاق الأمر اتسع فينبغي الإفتاء بالقول بكراهة التنزيه الذي هو خلاف الأولى كما اختاره المحقق ابن الهمام وإذا كان ما ذكرناه عذرا فلا كراهة أصلا والله تعالى أعلم.

(۴۱۲) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا اور اس کی جائز صورتیں کون کون سی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر یہاں دیکھا جاتا ہے کہ جنازہ محراب کے اندر رکھ کر محراب کے سرے پر امام کھڑے ہو جاتے ہیں اور مقتدی حضرات مسجد میں صف آرا ہوتے ہیں بعد میں نماز جنازہ پڑھا دی جاتی ہے، کیا یہ طریقہ صحیح ہے اور عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھنے کی تین صورتیں ہیں احناف کے نزدیک تینوں مکروہ ہیں، البتہ ایک صورت کو احناف نے مستثنیٰ کیا وہ یہ ہے کہ جنازہ باہر ہو، اور امام اور بعض افراد بھی باہر ہوں، تو جائز ہے کیونکہ علت عدم جواز نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ باقی صورتیں ناجائز ہیں۔

لما فی الهندية(۱/۱۶۵): وصلاة الجنازة فی المسجد الذی تقام فيه الجماعة مكروهة۔ سواء كان الميت والقوم فی المسجد او كان الميت خارج المسجد والقوم فی المسجد او كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقی فی المسجد او الميت فی المسجد والامام والقوم خارج المسجد، هو المختار كذا فی الخلاصة ولاتكره بعذر المطر ونحوه الخ۔

وفی شرح العناية علی هامش فتح القدير(۲/۱۲۸): وان كانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد۔ والباقی فيه لم تكره بالاتفاق الخ۔

(۴۱۳) جو شخص جل گیا صرف ہڈیاں رہ گئیں تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص جل گیا گوشت پوست وغیرہ سب کچھ ختم ہو گیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں ڈھانچہ بالکل ختم ہو گیا اس پر جنازہ وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صرف ہڈیوں پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں اس لئے کہ نمازِ جنازہ پورے جسم یا جسم کے اکثر حصہ پر مشروع ہے اور پورا جسم گوشت پوست ہڈیوں کے مجموعہ کا نام ہے صرف ہڈیوں کو جسم اور بدن نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بدن پھولا پھٹا نہ ہو بدن سلامت ہو تو پھر قبر کے سامنے میت پر نمازِ جنازہ پڑھا جائے گا اگر پھول پھٹ جائے تو پھر اس پر جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اس لئے کہ وہ پھر پورے بدن کے حکم میں نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کے حکم میں ہوتا ہے۔

وفی البحر الرائق (۲/۱۸۲): لأنه لا يصلی عليه بعد التفسخ لان الصلوة شرعت علی بدن الميت فاذا تفسخ لم يبق بدنه قائماً۔

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ امداد الاحکام (۱/ ۸۳۰) میں اس قسم کے سوال کے بارے میں لکھتے ہیں:

قلت والظاهر ان البدن يطلق على مجموع اللحم والعظام لا على العظام وحدها۔

خیر الفتاویٰ (۳/ ۲۷۸) پر ہے: ”ہڈیوں کے ڈھانچے پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ......الخ“

(۴۱۴) خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک عورت اپنے آشنا کے ساتھ شہر فرار ہوگئی، اب اس کے بھائی وغیرہ کو لوگ عار دلاتے ہیں اور مختلف طعنے دیتے ہیں۔ گزشتہ روز اس عورت کے بھائی نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلی ہے۔ کیا اس شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا شرعاً درست ہے؟ اور گاؤں والوں کا اس عورت کے گھر والوں کو اس طرح طعنہ وغیرہ دینا از روئے شریعت کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب...... صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی مگر اس نمازِ جنازہ میں اہلِ علم وفضل کا شریک ہونا مناسب نہیں ہے خواہ مقتدی کی حیثیت سے ہو، یا امام کی حیثیت سے، گاؤں والوں کا اس طرح طعن وتشنیع کرنا از روئے شرع ناجائز ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایسے طعنہ دینے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

لمافى القرآن الكريم(النور:۱۹): إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

وفى الشامية (۲/ ۲۱۲،۲۱۱): قد يقال لادلالة فى الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى أنه عليه الصلاة والسلام لم يصل عليه، فالظاهر أنه امتنع زجرا لغيره عن مثل هذا الفعل كما امتنع عن الصلاة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلاة أحد عليه من الصحابة، اذا لا مساواة بين صلاته وصلاة غيره۔

وفى الفقه الاسلامى(۲/ ۱۵۰۹): ومن قتل نفسه عمداً يغسل ويصلى عليه، على المفتى به عند الحنفية وعند الشافعية وان كان اعظم وزراً من قاتل غيره لأنه فاسق غير ساع فى الأرض بالفساد وان كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين۔ ورأى قوم كابي يوسف وابن الهمام انه لا يصلى عليه لما فى صحيح مسلم انه عليه السلام اتى برجل قتل نفسه فلم يصل عليه...

وقال المالكية ايضاً وينبغى لاهل الفضل ان يجتنبوا الصلاة على المبتدعة ومظهرى الكبائر ردعاً لامثالهم۔

(۴۱۵) نومولود بغیر جنازے کے مدفون بچی کے جنازے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دوست کے گھر لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی تو زندہ پیدا ہوئی لیکن اس کو جان بوجھ کر مارا گیا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں مع حوالہ جات۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... مذکورہ واقعہ کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایک مسلمان نے ایسی حرکت کی، جس کے سبب وہ حیوانیت کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بچیوں کو مارنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، مشرکین عرب زمانۂ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے بلکہ اُس وقت بھی شرفاء عرب یہ حرکت نہیں کرتے تھے، رذیل اور جاہل اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ یہ حرکت عملاً کفر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے جو کہ حکیم ذات ہے ناراضگی کا اظہار ہے اس پر توبہ واستغفار کیا جائے اور دل سے ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا اور رویا جائے وگرنہ سخت پکڑ کا اندیشہ ہے اگر باپ نے قتل کیا ہے تو دیت بھی لازم ہوگی، اسی طرح نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے جو گناہ لازم آیا اس کیلئے بھی کثرت سے توبہ واستغفار کیا جائے۔

تنبیہ......اگر باپ کے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہے تو قتل کی کیفیت اور وضاحت لکھ کر حکم دریافت کرلیا جائے۔

لما فی القرآن الکریم(بنی اسرائیل:۳۱):وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيْرًا۝

وفی الدر المختار (۶/۵۳۵،۵۳۴): أی لایقتص الأصول وإن علوا مطلقا ولو إناثا من قبل الأم فی نفس أو أطراف بفروعھم وإن سفلوا لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام((لایقاد الوالد بولدہ)) وھو وصفٌ معلل بالجزئیة فیتعدی لمن علا لأنھم أسباب فی إحیائه فلا یکون سببا لإفنائھم وحینئذ فتجب الدیة فی مال الاب فی ثلاث سنین لأن ھذا عمد والعاقلة لاتعقل العمد۔

(۴۱۶) بچے کے کفن اور احرام کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ والدین بچے کو اپنے ساتھ حج پر لے کر جائیں تو اس کا احرام کیسا ہوگا؟ یعنی تین سال کا لڑکا ہے ماں باپ اپنے ساتھ اسے بھی حج کروانے لے جا رہے ہیں تو بچہ کو کس طرح کا احرام باندھیں یعنی مرد کی طرح دو چادریں ہوں گی یا کون سا کپڑا ہوگا احرام میں۔

نیز مفتی صاحب یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ اگر چھوٹا بچہ خدانخواستہ اللہ نہ کرے سو دفعہ نہ کرے تین سال کی عمر میں انتقال کر جائے تو اس چھوٹے بچے کا کفن کیسا ہوگا؟ شریعت اور فقہ اس بارے میں کیا کہتی ہے کیا اسے بھی تین کپڑوں ازار، قمیص، لفافہ میں کفن دیا جائے گا

اور اسے بھی سفید رنگ کا ہی کفن دینا ضروری ہے یا دیگر کوئی طریقہ ہے؟ برائے مہربانی بچے کے بارے میں حج کے احرام اور کفن دونوں کے احکام مفصل ومدلل بیان فرما کر شکریہ اور تہنیت کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... اگر والدین اپنے ساتھ بچے کو حج کرانے لے جا رہے ہیں تو ان کو چاہیے کہ بچے کو دو چادریں بطور احرام کے پہنائیں۔ صورت مسئولہ میں بچے کا کفن بڑوں کے کفن کی طرح تین کپڑوں (یعنی قمیص، لفافہ، ازار) میں دینا بہتر ہے دو اور ایک کپڑے میں کفن دینا جائز ہے سفید رنگ کا کفن دینا مستحب ہے۔

لمافی جامع الترمذی ابواب الجنائز (۱/۱۹۳): عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم البسوا من ثيابكم البياض فإنها خير ثيابكم وكفنوا فيها موتاكم۔

وفی الشامية، باب صلاة الجنازة (۲/۲۰۴): قوله (ومن لم يراهق الخ)۔۔۔ قال في الزيلعي وأدنى ما يكفن به الصبي الصغير ثوب واحد والصبية ثوبان اه وقال في البدائع وإن كان صبيا لم يراهق فإن كفن في خرقتين إزار ورداء فحسن وإن كفن في إزار واحد جاز وأما الصغيرة فلا بأس أن تكفن في ثوبين اه أقول في قوله فحسن إشارة إلى أنه لو كفن بكفن البالغ يكون أحسن لما في الحلية عن الخانية و الخلاصة الطفل الذي لم يبلغ حد الشهوة الأحسن أن يكفن فيما يكفن فيه البالغ وإن كفن في ثوب واحد جاز اه

(۴۱۷) نمازِ جنازہ جوتوں کے ساتھ پڑھنا نیز سلام پھیرتے وقت امام کس کی نیت کریگا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز جوتوں کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟ نیز امام کو سلام پھیرتے وقت کس کی نیت کرنی چاہیئے میت کی یا دیگر لوگوں کی یعنی مقتدیوں کی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... (۱)۔ جنازے کی نماز جوتے پہن کر پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے اور وہ جگہ جہاں کھڑا ہے پاک ہو، اور اگر جوتے پاؤں سے نکال کر اس کے اوپر کھڑا ہوا جائے تو پھر صرف جوتوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔

(۲)۔ جنازے کی نماز میں سلام پھیرتے وقت امام مقتدیوں کی نیت کرے گا، میت کی نیت نہیں کرے گا کیونکہ میت خطاب کا اہل نہیں ہے۔

لمافی البحر (۲/۱۷۹): لو قام على النجاسة وفی رجليه نعلان لم يجز ولو افترش نعليه وقام عليهما جازت وبهذا يعلم مايفعل فی زماننا من القيام على النعلين فی صلاة الجنازة لكن لابد من طهارة النعلين۔

وفی الهندية (۱/۱۶۴): ولاينوى الميت فی التسليمتين بل ينوى بالاولىٰ من عن يمينه وبالثانية من عن شماله كذا فی سراج الوهاج۔

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۶۵۷): وصلاته فیهما افضل۔ (قوله وصلاته فیهما) ای فی النعل والخف الطاهرین افضل مخالفة للیهود تاتارخانیة، وفی الحدیث صلوا فی نعالکم ولا تشبهوا بالیهود۔

وفیه ایضاً(۲/۲۱۳): قوله ناویا المیت مع القوم) کذا فی الفتح... وظاهره أنه ینوی الملئکة الحفظة أیضا ثم رأیته صریحاً فی شرح درر البحار وذکر فی الخانیة والظهیریة والجوهرة انه لا ینوی المیت قال فی البحر وهو الظاهر لأن المیت لا یخاطب بالسلام حتی ینوی به اذ لیس اهلا له وأقره فی النهر۔

(۴۱۸) نمازِ جنازہ میں سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہیئے یا پہلے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......تکبیرات کے ختم ہونے پر سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۵۵):والاعتماد سنة وانما یعتمد کما فرغ من التکبیر بالیمنی علی الیسری ...وعند محمد رحمه الله الاعتماد سنة القراء ة حتی اذا فرغ من التکبیر یرسل فاذا شرع فی القراء ة یعتمد وفی القنوت فی الوتر اختلف المشائخ فیه والاصح هو الاعتماد وفی القومة بین الرکوع والسجود یرسل ولا یعتمد وکذا فی کل قیام لا ذکر فیه ولا یطول کتکبیرات العیدین وفی صلوة الجنازة یعتمد۔

وفی الهندیة (۱/۷۳): کل قیام فیه ذکر مسنون فالسنة فیه الاعتماد کما فی حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وکل قیام لیس فیه ذکر مسنون کمافی تکبیرات العیدین فالسنة فیه الارسال کذا فی النهایة وهو الصحیح کذا فی الهدایة فیه کان یفتی شمس الائمة السرخسی۔

(۴۱۹) نماز جنازہ کی چوتھی تکبیر پر ہاتھ چھوڑ دینے چاہیئے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔چھوٹی ہوئی رکعتوں والا شخص اپنی نماز پوری کرنے کیلئے کس وقت اٹھے، امام کے ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد یا دونوں طرف کے بعد؟

(۲)۔اور نماز جنازہ میں ہاتھ کس وقت چھوڑے جائیں امام کے سلام کہنے سے پہلے یا بعد؟ جوابات دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔مسبوق اپنی بقیہ رکعتوں کوادا کرنے کیلئے اس وقت اٹھے جب امام دوسری جانب سلام پھیر لے۔

(۲)۔نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

وفی الشامیة (۵۹۷/۱): (قوله وینبغی أن یصبر الخ) أی لا یقوم بعد التسلمیة أو التسلمتین بل ینتظر فراغ الامام بعدهما کمافی الفیض والفتح والبحر... قال فی الحلیة: ولیس هذا بلازم بل المقصود مایفهم أن لا سهو علی الإمام أو یوجد له ما یقطع حرمة الصلاة اهـ وقیده فی الفتح بحثاً بما إذا اقتدی بمن یری سجود السهو بعد السلام أما اذا اقتدی بمن یراه قبل السلام فلا۔

وفی خلاصة الفتاویٰ (۲۲۵/۱): ولا یجوز الاستخلاف ولا یعقد بعد تکبیر الرابع لانه لا یبقی ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح أنه یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین هکذا فی الذخیرة۔

(۴۲۰)امام کامحراب میں کھڑے ہوکرنماز جنازہ پڑھانا

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے باہر جنازہ رکھا گیااورامام صاحب محراب کے اندر کھڑے تھے؟ کیاامام صاحب کامحراب میں کھڑے ہوکرنماز جنازہ پڑھانا صحیح ہے؟اور کیامحراب کاحکم مسجد کاحکم ہے یامسجد سے خارج ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز جنازہ کیلئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کوئی جگہ الگ مقرر کی جائے اورنماز جنازہ مسجد کی حدود(اگر چہ محراب ہی کیوں نہ ہو) میں پڑھنا مکروہ ہے۔کیونکہ محراب مسجد کے حکم میں ہے البتہ اگر کوئی عذر مثلاً جگہ کی تنگی وغیرہ ہوتو اُس صورت میں بہتر یہ ہے کہ امام کچھ مقتدیوں کے ساتھ محراب کے باہر کھڑے ہوکرنماز جنازہ پڑھاسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار(۲۲۵/۲): (واختلف فی الخارجة) عن المسجد وحده أو مع بعض القوم (والمختار الکراهة) مطلقا خلاصة بناء علی أن المسجد انما بنی للمکتوبة الخ۔

(ص۲۲۶) وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ تحته: إنما تکره فی المسجد بلا عذر، فإن کان فلا

(۴۲۱)دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کاحکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب یہاں پر کوئی میت ہوتی ہے توبسااوقات اس کوگاؤں لے جاتے ہیں۔کبھی میت کے''ولی'' بیٹاوغیرہ یہاں بھی ہوتے ہیں اورگاؤں میں بھی ہوتے ہیں توآیاشریعت کی روشنی میں میت کادوبارہ جنازہ پڑھانا کیسا ہے؟جبکہ یہاں پر بھی بیٹے نے نمازِ جنازہ پڑھائی ہو،اوروہاں پر بھی بیٹا ہے جس نے جنازہ نہیں پڑھا ہے۔مفصل بیان

فرما کرعنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......مسلمان میت پر اس کے ولی بیٹے وغیرہ کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے تو دوبارہ (چاہے ولی موجود ہو یا نہ ہو) نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیئے، اس لئے کہ ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے فرض ساقط ہوجاتا ہے۔

لمافی فتاویٰ الھندیۃ (۱/۱۶۴): وإن صلی علیه الولی لم یجزلأحد أن یصلی بعده ولو أراد السلطان أن یصلی علیه فله ذلك لانه مقدم علیه ولو صلی علیه الولی وللمیت اولیاء أخر بمنزلته لیس لهم أن یعیدوا کذا فی الجوهرة النیرة۔

وفی رد المحتار (۲/۲۲۳): فإن صلی غیر الولی او السلطان أعاد الولی لأن الحق للأولیاء وان صلی الولی لم یجز لأ حد أن یصلی بعده ونحوه فی الکنز وغیره فقوله لم یجز لأحد یشمل السلطان ثم رأیت فی غایة البیان قال مانصه هذا علی سبیل العموم حتی لا تجوز الإعادة لا للسلطان ولا لغیره۔

(۴۲۲) قبر کے اندر صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کے اندر سے صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں اسی طرح اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......میت کو دفن کرنے کے بعد نہ نکالا جائے ہاں اگر کسی عذر کی بنا پر میت کو قبر سے صحیح سلامت نکالا جائے تو ان پر دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اسی طرح اس کو غسل بھی نہیں دیا جائے گا۔

لمافی الدر المختار (۲/۲۰۵): (و) آدمی (منبوش طری) لم یتفسخ (یکفن کالذی لم یدفن) مرة بعد اخری (وان تفسخ کفن فی ثوب واحد)

وفی الشامیة (۲/۲۰۵): (قوله کالذی لم یدفن) ان یکفن فی ثلاثة اثواب... ای لو نبش ثانیا وثالثا واکثر کفن کذلك مادام طریا من اصل ماله عندنا۔

(۴۲۳) نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ امام نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ گاہ میں چارپائی کا ایک پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر دوسرا پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر تیسرا پھر چوتھا کیا ایسا کرنا صحیح ہے۔ نیز اس کو لازم سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں دس دس قدم چلنا صحیح ہے لیکن امام کا چار پائی کا پایا پکڑ کر وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا ثابت نہیں ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کا دائیں طرف والا پایا اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلیں پھر اس کے پیچھے والا پایا پکڑ کر دس قدم چلیں پھر میت کے بائیں طرف والا پایا اپنے بائیں کندھے پر آگے کی طرف سے دس قدم چلیں اسی طرح پیچھے والا پایا دس قدم چلیں اسطرح چالیس قدم ہو جائیں گے اور یہ چلنا قبرستان کی طرف ہے نہ کہ وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا۔اور اس کو لازم بھی نہ سمجھا جائے اگر اس طریقے سے چلا جائے تو صحیح ہے صرف امام کا چار پائی کا پایا پکڑنے والا طریقہ خلاف سنت ہے۔

لمافی الھندیة(۱/۱۶۲): ثم ان فی حمل الجنازة شیئین نفس السنة وکمالها اما نفس السنة فهی ان تاخذ بقوائمها الاربع علی طریق التعاقب بان تحمل من کل جانب عشر خطوات وهذا یتحقق فی حق الجمع واما کمال السنة فلا یتحقق الافی واحد وهو ان یبدأ الحامل بحمل یمین مقدم الجنازة کذا فی التاتارخانیة فیحمله علی عاتقه الایمن ثم الموخرالایمن علی عاتقه الایمن ثم المقدم الایسر علی عاتقه الایسر ثم المؤخر الایسر علی عاتقه الایسر هکذا فی التبیین۔

وفی الشامیة (۲/۲۳۱): وفی شرح المنیة ویستحب ان یحملها من کل جانب اربعین خطوة للحدیث المذکور رواه ابوبکر النجار الخ...... (قوله کذلك)ای عشر خطوات وهی معنی کذلك الثانیة ویمین الحامل یمین المیت ویسار الجنازة ویساره یساره ویمین الجنازة قهستانی ط۔

(۴۲۴)عورت کیلئے جنازہ میں شرکت کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت نمازِ جنازہ میں شرکت کرسکتی ہے؟ یعنی جماعت کے پیچھے عورتیں کھڑی ہوسکتی ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......عورتیں نمازِ جنازہ میں فتنے کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکتیں البتہ اگر ساتھ کھڑی ہوگئیں تو نماز درست ہوجائے گی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۸۰): وأما مایفسدها فما أفسد الصلاة أفسدها الا المحاذة...

وفی جوهر النیرة(۱/۱۳۰): وان قامت امرأة الی جانب رجل لم تفسد علیه صلاته۔

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۲۴۶): (ولا یحضرن الجماعات لمافیه من الفتنة والمخالفة) (قوله ولا یحضرن الجماعات) لقوله ﷺ ''صلاة المرأة فی بیتها أفضل من صلاتها فی حجرتها وصلاتها فی مخدعها أفضل من صلاتها فی بیتها''۔قال الطحطاوی تحته: فالأفضل لها ماکان استرلها لافرق بین الفرائض وغیرها کالتراویح الاصلاة الجنازة فلا تکره جماعتهن فیما

لأنها لم تشرع مكررة فلو انفردت تفوتهن۔

(قوله والمخالفة) أى مخالفة الأمر لان الله تعالىٰ امرهن بالقرار فى البيوت فقال تعالىٰ وقرن فى بيوتكن وقال ﷺ ''بيوتهن خير لهن لوكن يعلمن''

وفى الدرالمختار(۱/۵٦٦): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيدووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (على المذهب المفتى به لفساد الزمان واستثنىٰ الكمال بحثا العجائز المتفانية۔

وفى الشامية (۱/۵٦٦): (قوله على المذهب المفتى به) أى مذهب المتاخرين قال فى البحر: وقد يقال هذه الفتوى التى اعتمدها المتأخرون ... وفيه نظر بل هو مأخوذ من قول الإمام وذلك أنه انما منعها لقيام الحامل وهو فرط الشهوة بناء على أن الفسقة لا ينتشرون فى المغرب... الخ۔ (قوله واستثنىٰ الكمال الخ) أى مما افتى به المتأخرون لعدم العلة السابقة فيبقى الحكم فيه على قول الإمام فافهم۔

(۴۲۵)عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں کیونکہ درمختار (۱/۵٦۵) پرایک عبارت ہے جس سے جواز کی صورت معلوم ہوتی ہے عبارت ملاحظہ ہو''ویکرہ تحریما (جماعة النساء) ولو فى التراويح فى غير صلاة جنازة'' اب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ کیا یہ بات درست ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس عبارت کو کہاں منطبق کریں گے اور اس کا محمل کیا ہوگا؟ کیا کسی خاص صورت میں فقہاء کہتے ہیں یا یہ بات مطلقاً ہے اگر اس جنازے میں مرد بھی شریک ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟! اگر اکیلی عورتیں ہیں تو اس صورت میں جواز معلوم ہو رہا ہے تو باقی فرائض اور تراویح میں اس کی کیوں ممانعت ہے؟ پھر تو کچھ سال پہلے جو امریکہ میں واقعہ پیش آیا تھا کہ عورت نے امامت کرائی تھی کیا وہ درست ہے اس عبارت کے نتیجے میں، براہ کرم تمام پہلوؤں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں کہ کوئی جز میرے سوال کا باقی نہ رہے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطاء کرے، آمین۔

الجواب بعون الملک الوهاب......نماز جنازہ میں عورت صرف خواتین کی امامت کر سکتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں مکروہ ہے چاہے خواتین کی امامت ہی کیوں نہ ہو۔ سوال میں درج ''درمختار'' کی عبارت کا مطلب اور محمل یہی ہے۔ نیز نمازِ جنازہ میں اگر مرد حضرات عورت کی اقتداء میں شریک ہوجائیں تو مردوں کی نماز باطل ہوجائے گی کیونکہ مرد کیلئے کسی بھی نماز میں عورت کی اقتداء درست نہیں، البتہ اس صورت میں نماز جنازہ ادا ہوجائے گی اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ عورت کی نماز درست ہونے کی بناء پر سب کی طرف سے فریضہ ادا ہوگیا۔

نیز سوال میں مذکور ''امریکہ میں پیش آمدہ واقعہ'' کا جواز سوال میں درج ''الدر'' کی عبارت سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس عبارت سے فقط نماز جنازہ میں عورت کی امامت کا جواز صرف خواتین کیلئے ثابت ہوتا ہے۔ نماز جنازہ میں صرف خواتین کیلئے عورت کی امامت کا جواز اور دیگر نمازوں میں ممانعت کی وجہ فرق یہ ہے کہ اگر کسی نمازِ جنازہ میں صرف خواتین ہوں تو نماز جنازہ پڑھنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱)۔ بغیر جماعت کے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کرلیں۔ (۲)۔ کسی خاتون کی اقتداء میں جماعت کرالیں۔

اول الذکر صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز جنازہ پوری کرتی ہے تو اس کی نماز سے فریضہ ادا ہوجائے گا کیونکہ نماز جنازہ فرض علی الکفایہ ہے کسی ایک فرد کے پڑھنے سے فریضہ ادا ہوجاتا ہے لہٰذا دیگر خواتین کی نمازیں نفل بن جائیں گی جبکہ نماز جنازہ نفلاً مشروع نہیں ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ میں جبکہ صرف خواتین موجود ہوں مؤخر الذکر صورت متعین ہے۔ نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک پر الگ الگ فرض یا سنت ہوتی ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے کی صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز سے فارغ ہوتی ہے تو دیگر خواتین کی نمازیں نہ تو نفل بن جاتی ہیں اور نہ ہی ان سے فریضہ ساقط ہوتا ہے۔ لہٰذا نمازِ جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں عورت کی امامت مطلقاً مکروہ ہے۔

لما فی المدونة الكبرى(۱/۱۷۸): عن ابن ابي ذئب عن مولى لبني هاشم اخبره عن علی بن ابی طالب انه قال: لا تؤم المرأة۔

وفی الدرالمختار (۱/۵۶۵): ويكره تحريماً (جماعة النساء) ولو فی التراويح فی غير صلاة جنازة۔ لانها لم تشرع مكررة فلو انفردن تفوتهن بفراغ احداهن ولو امت فيها رجالاً لا تعاد لسقوط الفرض بصلاتها

وفی الشامية تحته: قال فی الفتح، واعلم ان جماعتهن لا تكره فی صلاة الجنازة لا نها فريضة وترك التقدم مكروه فدار الامر بين فعل المكروه لفعل الفرض او ترك الفرض لتركه فوجب الاوّل۔ بخلاف جماعتهن فی غيرها، ولو صلين فرادى فقد تسبق احداهن فتكون صلاة الباقيات نفلاً والتنفل بها مكروه، فيكون فراغ تلك موجباً لفساد الفرضية لصلاة الباقيات كتقييد الخامسة بالسجدة لمن ترك القعدة الاخيرة ...ومفاده ان جماعتهن فی صلاة الجنازة واجبة، حيث لم يكن غيرهن ولعل وجهه الاحتراز عن فساد فرضية صلاة الباقيات اذا سبقت احداهن، وفيه ان الرجال لو صلوا منفردين يلزم فيها مثل ذلك فيلزم عليه وجوب جماعتهم فيها مع ان المصرح به ان الجماعة فيها غير واجبة فتأمل۔

وفی تقريرات الرافعی علی حاشية ابن عابدين(۱/۷۲): انما يتم بارجاع ضمير ''لانها'' فريضة للجماعة كما فعل فی حاشية البحر وهو خلاف الظاهر بل هو راجع لصلاة الجنازة فانها فرض

كفاية على كل منهن قال السندى نقلاً عن شرح المنية و يستحب ان يصلين منفردات وتجوز جماعتهن۔ فمراد الفتح وغيره من الوجوب معناه اللغوى اى ثبت الاوّل ويكون مقدما على الترك لا على الانفراد المستحب۔

(۴۲۶) متوفیہ عورت کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ یا خاوند؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زن متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ کے ذمہ ہے یا خاوند کے ذمہ؟ محقق جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......زوجہ متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچہ خاوند کے ذمہ لازم ہے۔

لما فی حلبی کبیر(۱/۵۸۲): وكفن الزوجة على الزوج عند ابي يوسف رحمه الله وفى شرح السراجية لمصنفهاواماالمرأة اذا لم يكن لها مال فكفنها و مؤنتها على الزوج عند ابي حنيفة وابي يوسف الخ۔

وفى الهندية (۱/۱۶۱): وعلى قول ابي يوسف رحمه الله يجب الكفن على الزوج وان تركت مالا وعليه الفتوى الخ۔

(۴۲۷) میت کو اپنے آبائی گاؤں میں منتقل کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک شہر کے اندر وفات پائی اس کو اس کے آبائی گاؤں لے جاتے ہیں کیا میت کو منتقل کرنا جائز ہے جبکہ اس نے اس شہر کی وصیت بھی کی ہو، کہ مجھ کو یہاں ہی دفن کرنا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اگر میت کا آبائی گاؤں ایک دو میل سے زیادہ دور ہے تو پھر منتقل کرنا مکروہ ہے۔

لما فی الشامية(۲/۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا وقيل إلى مادون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال فى النهر عن عقد الفرائد: وهو الظاهر۔

وفى الفقه الاسلامى(۲/۱۵۳۷): وقال الحنفية والمالكية: لا بأس بنقل الميت من بلد إلى آخر إن كان لم يدفن، والنقل عند الحنيفة جائز قدر ميل أو ميلين لكن يندب دفنه فى جهة موته أى فى مقابر أهل المكان الذى مات فيه أو قتل ،انتهى۔

(۴۲۸) قبر کتنی گہری کھودی جائے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کتنی گہری کھودی جائے؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....قبر کی گہرائی کم از کم نصف قدِ آدم ہونی چاہیئے اور اگر آدمی کے قد کے برابر کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لمافی حلبی کبیر(ص۵۹٦): مقدار عمق القبر قدر نصف قامة ذكره فی الروضة وفی الذخيرة الی صدر الرجل او وسط القامة فان زادوا فهو افضل وان عمقوا مقدار قامة فهو احسن فعلم بهذا ان الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما بينهما۔

وفی بحرالرائق(۲/۱۹۳): واختلفوا فی عمق القبر فقيل قدر نصف القامة وقيل الی الصدر وان زادوا فحسن۔

وفی النتف فی الفتاوىٰ(ص۸۴): واما القبر فالمستحب فيه خمس خصال والمكروه فيه عشر خصال امّا المستحب فيه فاولها ان يحفر القبر الی مبلغ السرة۔

وفی طحطاوی (۱/۳۸۱): ويحفر القبر... طوله علی قدر طول الميت وعرضه علی قدر نصف طوله قوله فان زاد فحسن فلو كان علی قدر قامته فهو احسن۔

وفی الدرالمختار(۲/۲۳۴،۲۳۳): (وحفر قبره) فی غيرداره (مقدار نصف قامة) فان زاد فحسن

وفی الشامية تحته: (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الی حد الصدر وان زاد الی مقدار قامة فهو احسن كما فی الذخيرة فعلم انّ الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما شرح المنية وهذا حدالعمق والمقصود منه المبالغة فی منع الرائحة ونبش السباع۔

(۴۲۹) قبر کی گہرائی کتنی ہو؟ میت کو گھر میں رکھا جائے یا مسجد میں؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر جب شق کی صورت میں ہو تو میت کو دفن کرنے کے بعد، جو اوپر بانس یا پتھر وغیرہ رکھ کر مٹی ڈالی جاتی ہے، اس میں یعنی پتھروں/ بانس اور میت کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے ہاں میت اوران پتھروں یا بانس کے درمیان بہت فاصلہ رکھا جاتا ہے، تقریباً یہ پتھر اور بانس زمین کے برابر ہوتے ہیں اور میت بہت نیچے، شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کیا اس کی کوئی حد متعین ہے، ازروئے شریعت اس کا کیا حکم ہے، جبکہ اس مٹی کے کم ڈالنے کی وجہ سے قبر کی چھت گرنے کی صورت میں بعض اوقات میت نظر بھی آتی ہے۔

(۲)......نماز جنازہ مسجد کے کمپاؤنڈ یا صحن میں پڑھنا افضل ہے یا قبرستان میں جبکہ قبرستان میں جنازہ پڑھنے کی جگہ بھی ہوتی ہے، لیکن مسجد میں جنازہ پڑھنے سے کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں جبکہ قبرستان میں لوگ کم شرکت کرتے ہیں؟

(۳)......بعض مقامات پر میت کو گھر میں جگہ تنگ ہونے یا کسی اور مصلحت کی بنا پر، لاکر مسجد کے احاطہ میں رکھ دیا جاتا ہے، میت کو اپنے عزیز واقارب کے گھروں میں رکھنا اچھا ہے یا مسجد کے احاطہ میں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔صورت مسئولہ میں جب قبر شق کی صورت میں ہو تو اس کی گہرائی قامت الرجل (آدمی کے قد کے برابر) کے برابر مستحب ہے، البتہ بانس پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے کی جگہ کی صراحت نہیں ہے لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب گہرائی متعین ہے تو یہ چیزیں اوپر ہی رکھی جائیں گی البتہ بانس، پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے میں احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ کھلنے کا اندیشہ نہ ہو، اگر پھر بھی کسی وجہ سے کھل جائیں تو دوبارہ اچھی طرح بند کر لی جائیں۔

(۲)۔اگر شدید عذر ہو مثلاً بارش ہو رہی ہو یا باہر جنازہ پڑھنا ممکن نہ ہو تو پھر تو مسجد کے اندر بھی جنازہ پڑھنا درست ہے البتہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو پھر اگر میت اور امام سمیت کچھ مقتدی مسجد سے باہر ہوں تو بھی جنازہ پڑھنا بلا کراہت کے درست ہوگا واضح رہے کہ لوگوں کا کثیر تعداد میں شرکت نہ کرنا کوئی عذر نہیں ہے۔

(۳)۔میت کو نہ گھر میں رکھنا درست ہے اور نہ ہی مسجد میں بلکہ فوراً کفن دفن کے انتظامات کرنے چاہئیں۔

لما فی البخاری(۱/۱۷۶):عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اسرعوا بالجنازة فان تك صالحة فخير تقدمونها وان تك سوى ذلك فشر تضعونه عن رقابكم۔

وفی أبي داؤد(۲/۹۸):عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلى على جنازة فی المسجد فلاشئی له۔

وفی مسلم(۱/۳۱۳): عن عائشة انها لما توفی سعد بن ابی وقاص ارسل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن يمروا بجنازته فی المسجد فيصلين عليه ففعلوا فوقف به على حجرهن يصلين عليه... فبلغهن ان الناس عابوا ذلك وقالوا ماكانت الجنائز يدخل بها المسجد۔(الحديث)

عن ابی سلمة بن عبدالرحمن ان عائشة لما توفی سعد بن ابی وقاص قالت ادخلوا به المسجد حتى اصلى عليه فأنكر ذلك عليها۔(الحديث)

وفی المبسوط للسرخسی(۲/۶۸): وعندنا اذا كانت الجنازة خارج المسجد لم يكره ان يصلى الناس عليها فی المسجد انما الكراهة فی ادخال الجنازة۔

وفی شامية (۲/۲۳۴): (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الى حد الصدر وان زاد الى مقدار قامة فهو احسن۔

(۴۳۰) قبر کھودنے کی گہرائی میں مردوعورت کی قبر میں فرق ہے یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے لئے قبر کتنی گہری کھودنی چاہیئے اس کی حد کیا ہے اور مردوعورت کی قبر کا ایک ہی حکم ہے یا ان کی قبروں میں فرق ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......قبر کی گہرائی انسان کے نصف قد تک ہونی چاہیئے اگر زیادہ ہوتو اور بہتر ہے، مردوعورت کا کوئی خاص فرق گہرائی میں ضروری نہیں۔

وفی التاتارخانية(۲/۱۷۲): وفی بعض النوادر عن محمد رحمه الله انه قال ينبغي ان يكون مقدار العمق الى صدر رجل وسط القامة قال وكلما ازداد فهو أفضل۔

وفی الشامية (۲/۲۳۴): قوله نصف قامة او الىٰ حد الصدر، وان زاد الى مقدار قامة فهو أحسن كمافی الذخيرة۔

(۴۳۱) میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک میت کے اعضاء کو انتشار کے خوف سے اگر صندوق میں بند کر کے قبر میں رکھیں، آیا شرعاً مذکورہ عذر کی وجہ سے میت کو اس طرح قبر میں دفنانا جائز ہے، فقہاء کرام کی عبارات سے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کر کے دفنانا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۶۶): وحكى عن الشيخ الامام ابي بكر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ تابوت من حديد لا بأس به لكن ينبغي ان يفرش فيه التراب ويطين الطبقة العلياء الخ۔

وفی الشامية(۲/۲۳۴): التنوير مع الدر: (ولا بأس باتخاذ التابوت) ولو من حجر او حديد (له عند الحاجة كرخاوة الارض۔

(۴۳۲) بلاضرورت میت کو تابوت میں دفن کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو تابوت کے اندر رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بلاضرورت میت کوتابوت کے اندر رکھنا اور جنازہ پڑھانا مکروہ ہے، اگر ضرورت ہوتو جائز ہے مثلاً زمین گیلی ہو یا کوئی اور ضرورت ہوتو بلا کراہت جائز ہوگا۔

لما فی الهندية(۱/۱۶۶): وحكى عن الشيخ الامام ابي بكر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ التابوت من حديد لا بأس به لكن ينبغي ان يفرش فيه التراب ويطين الطبقة العليا مما يلي الميت ويجعل اللبن الخفيف على يمين الميت وعلى يساره ليصير بمنزلة اللحد

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۲۶): وعن الامام ابي بكر محمد بن الفضل رحمه الله، انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذوا تابوتاً من حديد فلا باس به۔

(۴۳۳) میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانے کا حکم اور نبی ﷺ کیلئے چٹائی بچھانے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سننے میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا انتقال جس چٹائی پر ہوا تھا وہی چٹائی آپ کیلئے لحد میں بچھائی گئی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانا جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں تو پھر آپ ﷺ کیلئے کیوں بچھائی گئی؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... میت کے لئے قبر میں چٹائی بچھانا درست نہیں، آپ نے جو سنا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے لحد میں چٹائی بچھائی گئی یہ آپ نے غلط سنا ہے اصل میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک سرخ رنگ کی چادر تھی جس کو آپ علیہ السلام کبھی نیچے بچھایا کرتے تھے اور کبھی اس کو اوپر لیا کرتے تھے جب آپ علیہ السلام کا وصال ہوا تو حضرت شقران صالح رضی اللہ عنہ (جو کہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) نے یہ سوچ کر کہ اب آپ کے بعد اس چادر کو پہننے کا کوئی اہل نہیں رہا اس لئے یہ فرما کر اسے قبر میں ڈال دیا۔ واللہ لا یلبسھا احد بعدہ ابدا یعنی آپؐ کے بعد کوئی دوسرا اس چادر کو نہیں اوڑھ سکتا۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا کہ اس چادر کو مٹی ڈالنے سے پہلے ہی نکال لیا تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ حضور ﷺ کی خصوصیت ہے۔

لما فی المرقاة(۴/۶۷): عن ابن عباس رضي الله عنه قال جعل فی قبر رسول الله ﷺ قطيفة حمراء فی النهاية القطيفة هي كساء له خمل وهو المهدب ومنه الحديث تعس عبدالقطيفة اى الذى يعمل لها ويهتم بتحصيلها قال النووى وهذه القطيفة ألقاها شقران مولى من موالى رسول الله ﷺ وقال كرهت ان يلبسها احد بعده عليه الصلوة السلام وقدنص الشافعى وغيره من الفقهاء على كراهة وضع القطيفة والمخدة ونحوهما تحت الميت فى القبر فقيل ان ذلك من خواصه عليه الصلوة السلام فلا يحسن فى غيره قال الدار قطنى نقلا عن وكيع ان ذلك من خصائصه عليه الصلوة

السلام قال التوربشتی رحمه الله وذلك انه عليه الصلوة السلام كما فارق اهل الدنيا فی بعض أحكام حياته فارقهم فی بعض احكام مماته فان الله تعالىٰ حرم على الارض لحوم الانبياء وحق لجسد عصمه الله عن البلى والاستحالة ان يفرش له فی قبره لان المعنى الذى يفرش للحی له لم يزل عنه صلى الله عليه وسلم بحكم الموت وليس الامر فی غيره على هذا النمط وقال بعضهم تنازع على رضی الله عنه وعباس رضی الله عنه فقصد شقران بوضعها دفع ذلك ذكره ابن حجر وهو بعيد جدا...... قال ابن عبد البر فی الاستيعاب انما أخرجت قبل اهالة التراب۔

وفی البحر الرائق(۲/۱۹۳): وذكر فی الظهيرية معزيا الى السرخسی فی الجامع الصغير انه لايجوز ان تطرح المضربة فی القبر ومارو ی عن عائشة رضی الله عنها فغير مشهور۔

وفی الدر المختار(۲/۲۳۴): (ولا) يجوز ان (يوضع فيه مضربة) وما روی عن علی رضی الله عنه فغير مشهور لا يوخذبه۔ وفی الشاميه (قوله ولا يجوز الخ) ای يكره ذلك قال فی الحلية ويكره ان يوضع تحت الميت فی القبر مضربة او مخدة او حصيرا ونحو ذلك ولعل وجهه انه اتلاف مال بلا ضرورة فالكراهة تحريمية ولذا عبر بلا يجوز۔ (قوله ومارو ی عن علی رضی الله عنه) يعنی من فعل ذلك نهر ثم ان الشارح تبع فی ذلك المنصف فی منحه والذی وجدته فی الظهيرية عن عائشة رضی الله عنها وكذا عزاه الى الظهيرية فی البحر والنهر، قال فی شرح المنية وما روی انه جعل فی قبره عليه الصلوة والسلام قطيفة۔ قيل لان المدينة سبخة وقيل ان العباس وعليا رضی الله عنهما تنازعاها فبسطها شقران تحته لقطع التنازع وقيل كان الصلاة والسلام يلبسها ويفترشها فقال شقران رضی الله عنه والله لايلبسك احد بعده أبداً فالقاها فی القبر۔

(قوله فغير مشهور) ای غير ثابت عنه او المراد انه لم يشتهر عنه فعله بين الصحابة ليكون اجماعا منهم بل ثبت عن غيره خلافه ففی شرح المنية وكره ابن عباس رضی الله عنه ان يلقى تحت الميت شئ رواه الترمذی وعن أبی موسىٰ لا تجعلوا بينی وبين الارض شيئاً۔

(۴۳۴) عورت کو قبر میں اتارتے وقت پردہ ڈالنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورتوں کو دفن کرتے وقت ان کی قبر پر پردہ ڈالنا کیسا ہے؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں پردہ ڈالنا سنت ہے۔

وفی اعلاء السنن(۳۱۳/۸): عن الثوری عن ابی اسحاق رضی الله عنه قال شهدت جنازة الحارث فمد واقبره ثوباً فجبذه عبدالله بن يزيد وقال انما هو رجل رواه ابن ابی شيبة فهذا هو الصحيح۔

وفی البدائع(۳۱۹/۱): ويسجی قبر المرأة بثوب لماروی ان فاطمة رضی الله عنها سجی قبرها بثوب ونعش علی جنازتها لان مبنی حالها علی الستر فلو لم يسج ربما انكشفت عورة المرأة فيقع بصر الرجال عليها۔

وفی رد المحتار(۲۳۶/۲): ويسجی قبرها ای بثوب ونحوه استحباباً حال ادخالها القبر حتیٰ يسوی اللبن علی اللحد كذا فی شرح المنية والامداد۔

(۴۳۵) قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل قبروں کے اردگرد دلکڑیوں سے چاردیواری بنائی جاتی ہیں جس کا مقصود قبر کو مزین کرنا بھی ہوتا ہے اور قبر کی حفاظت بھی، اور اگر صرف حفاظت کیلئے ہو تو کیسا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ قبر کی حفاظت مقصود ہو۔ اور اگر چاردیواری بنانے سے مقصود زیب وزینت ہو تو اس صورت میں مکروہ ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۵۰۳): انما يكره الاجر اذا اريد به الزينة اما اذا اريد به دفع اذی السباع او شی آخر لا يكره۔

وفی حاشية الطحطاوی(ص۵۰۴): وقد اعتاد اهل مصروضع الاحجار حفظا للقبور عن الاندراس والنبش ولا باس به وفی الدرر ولا يجصص ولا يطين ولا يرفع عليه بناء وقيل لا بأس به هو المختار۔

وفی حاشية الطحطاوی علی الدر(۳۸۲/۱): قوله وقيل لا بأس به) ينبغی تقييد الجواز علی هذا القول بما اذا . . .

(۴۳۶) حفاظت کی غرض سے قبر پر بغیر چھت کے چاردیواری بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر پر چار پانچ فٹ بلند صرف چاردیواری بغیر چھت کے بغرضِ حفاظت بنانا جائز ہے یا نہیں، نیز چبوترہ بنا کر اس کے اوپر قبر بنانا تاکہ بارش کے سیلاب سے حفاظت رہے اور زائرین کے بیٹھنے

کیلئے صفائی رہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں بغرض حفاظت چار دیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ فخر ونمود، ریا کاری، زینت مقصود نہ ہو، نیز سیلاب وغیرہ سے جو خطرہ قبر کو لاحق ہے وہی خطرہ چبوترے کو بھی لاحق ہوسکتا ہے جو مناسب معلوم نہیں ہوتا البتہ اگر واقعی اس میں قبر کی حفاظت ہے اور زیب وزینت، اسی طرح زائرین کے لئے بیٹھنے کا اہتمام مقصود نہ ہو تو ضرورۃً جائز ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۵۰۳، ۵۰۴):انمایکره الآجراذااريد به الزينة امااذا اريد به دفع أذى السبَاع اوشئ آخر لايكره ... (ويكره) البناء عليه (للإحكام بعد الدفن) لأنه للبقاء والقبر للفناء... اهـ۔

وفى الدرالمختار(۲/۲۳۷): (ولا يجصص) للنهى عنه، (ولا يطين) ولا يرفع عليه بناء وقيل لا بأس به وهو المختار) .وفى الشامية:(قوله لا يرفع عليه بناء) اى يحرم لوللزينة ...اهـ۔

وفى الدرالمختار(۲/۲۳۶): (ويسوى اللبن عليه والقصب لا الآجر) المطبوخ والخشب لوحوله...

وفى الشامية تحته: وقال مشايخ بخارى لايكره الآجر فى بلدتنا للحاجة اليه لضعف الأراضى۔

(۴۳۷) قبر کے اوپر میت کے نام کا کتبہ لگانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبروں کے اوپر اہل قبور کے ناموں کے کتبے لگانا جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر ضرورت اس کی ہو کہ قبر کا نشان رہ جائے قبر کا اثر مٹ نہ جائے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

لمافى رد المحتار(۲/۲۳۷): (قوله لا بأس بالكتابة الخ) لان النهى عنها وان صح فقد وجد الاجماع العملى بها فقد اخرج الحاكم النهى عنها من طرق ثم قال هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من المشرق الى المغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف... نعم يظهر ان محل هذا الاجماع العملى على الرخصة فيها ما اذا كانت الحاجة داعية اليه فى الجملة كما اشار اليه فى المحيط بقوله وان احتيج الى الكتابة حتى لا يذهب الاثر ولا يمتهن فلا بأس به فاما الكتابة بغير عذر فلا حتى انه يكره كتابة شئ عليه من القران او الشعر او اطراء مدح له ونحو ذلك حلية ملخصا۔

وفى الهندية (۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر او يقعد اوينام عليه او يوطأ عليه او يقضى حاجة الانسان من بول او غائط او يعلم بعلامة من كتابة ونحو كذا فى التبيين۔

(۴۳۸) قبروں پر نام، تاریخ وغیرہ لکھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی قبر کو بطور نشان باقی رکھنے اور اس خیال سے کہ قبر کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو، لوگ اس کو پامال نہ کریں، تو اس پر نام اور تاریخ وفات لکھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....قبر پر بوقت ضرورت نام، تاریخ وغیرہ لکھی جاسکتی ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۵۰۵): (ولا بأس) ایضاً (بالکتابة فی حجرصین به القبر ووضع (علیه لئلا یذهب الاثر) فیحترم للعلم بصاحبه۔

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): لا بأس بالکتابة ان احتیج الیها حتی لا یذهب الاثر ولا یمتهن۔

(۴۳۹) پکی اور خوبصورت قبر بنانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ قبریں عموماً شوق میں سیمنٹ کی خوبصورت بناتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پکی قبر منع ہے آپ بتائیں کہ کیا پکی اور خوبصورت قبر بنانا جائز نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....قبر کو پکا کرنا اور خوبصورت کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۶): ویسنم القبر قدر الشبر ولایربع ولا یجصص ولا بأس برش الماء علیه ویکره أن یبنی علی القبر۔

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): (ولا یجصص) للنهی عنه (ولا یطین ولا یرفع علیه بناء) (قال ابن عابدین رحمه الله تحت قوله ولا یجصص) ای لا یطلی بالجص بالفتح ویکسر قاموس (قوله ولا یرفع علیه بناء) ای یحرم لو للزینة. ویکره لو للاحکام بعدالدفن۔

(۴۴۰) پرانی یا نئی قبر گر جائے اس کو دوبارہ بنانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قبرستان میں ایک پرانی قبر یا نئی قبر گر جائے تو دوبارہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....قبر گرنے کی صورت میں دوبارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی التاتارخانیة(۲/۱۷۱،۱۷۰): وفی النوازل سئل ابو نصر عن تطیین القبر: قال: لا بأس به وفی الغیاثیة وعلیه الفتوی:... الحجة واذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لماروی ان النبی علیه

السلام مرّ بقبر ابنه ابراهيم فرأى فيه حجرا سقط منه فسده واصلحه ثم قال : من عمل عملا فليتقنه:... وفی كفاية الشعبی: كان عصام بن يوسف يطوف حول المدينة يعمر القبور الخربة۔

وفی الهندية(۱/۱۶۶): واذا خربت القبور فلا باس بتطيينها كذا فی التاتارخانية: وهو الاصح وعليه الفتویٰ كذا فی جواهر الاخلاطی۔

وفی الشامية(۲/۲۳۷): وفی شرح المنية عن منية المفتی: المختار انه لا يكره التطيين۔

(۴۴۱) قبر پر سبز پتی پھول اور خوشبو رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ قبروں پر سبز پتی یا پھول اور خوشبو وغیرہ رکھتے ہیں، یہ فعل سنت ہے، مستحب ہے یا مباح ہے یا بالکل بے فائدہ ہے؟ شرعی دلیل سے جو ثابت ہو مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......قبروں پر سبز پتی، پھول اور خوشبو وغیرہ رکھنا یہ نہ سنت ہے اور نہ مستحب، بلکہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے اور شریعت میں اس کی کوئی اصل اور ثبوت نہیں ہے اور آج کل لوگ اس کام کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔

لمافی شرح مسلم(۱/۱۴۱): قال النووی، ففيه انه رضی الله عنه تبرك بفعل مثل فحل النبی ﷺ وقد انكر الخطابي مايفعله الناس على القبور من الاخواص ونحوها متعلقين بهذا الحديث وقال لا اصل له ولا وجه له، والله اعلم۔

وفی عمدة القاری (۳/۱۲۱): وكذلك مايفعله اكثر الناس من وضع مافيه رطوبة من الريا حين والبقول ونحوهما على القبور ليس بشی وانما السنة الغرز.

وفی معارف السنن(۱/۳۲۶): قال الشيخ المحدث الاكبر العلامة محمد يوسف بنوری نور الله مرقده: اتفق الخطابي والطرطوشی والقاضی عياض على المنع وقولهم اولى بالاتباع حيث اصبح مثل تلك المسامحات والتعللات مثاراً للبدع المنكرة والفتن السائرة فترى العامة يلقون الزهور على القبور و بالأخصّ على قبور الصلحاء والاولياء والجهلة منهم از دادوا اصراراً على ذلك وتغالوا فيه واوضحت ذلك منشاء فی الجهة لعقائد فاسده تأباها الشريعة النقية وظنوا ذلك سببا للثواب والاجر الجزيل فالمصلحة العامة فی الشريعة تقتضی منع ذلك بتاتا استئصالاً لشأفة البدع وحسماً لمادة المنكرات المحدثة وبالجملة هذه بدعة مشرقية منكرة وبجنبها بدعة اخرى مغربية قدراجت فی كثير من البلاد المشرقية التی تدعی بلاد اسلامية الخ وكل هذه بدع

ومنکرات لااصل لھا فی الدین ولا مستندلھا من الکتاب والسنة ویجب علی اھل العلم ان ینکروھا وان یبطلوا ھذہ العادات ما استطاعوا انتھی۔

(۴۴۲) پوسٹ مارٹم وغیرہ کی غرض سے میت کو قبر سے نکالنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض اوقات پوسٹ مارٹم کرنے کیلئے میت کو قبر سے نکالا جاتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور وہ کونسا عذر ہے جس کی وجہ سے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکالا جا سکتا ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد بلا عذر شرعی نکالنا جائز نہیں۔ اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ میت کی توہین ہے نیز یہ کوئی عذر شرعی بھی نہیں اس لئے پوسٹ مارٹم کیلئے میت کو قبر سے نکالنا درست نہیں اور وہ عذر جس کی بنا پر میت کو دفن کے بعد نکالنا جائز ہے یہ ہے کہ مثلاً وہ زمین مغصوبہ ہو یا شفیع نے شفعہ کر کے لی ہو، اور وہ اس کا مطالبہ کر رہا ہو تو پھر میت کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔

لمافی الھندیة (۲/۴۷۰): المیت بعدما دفن بمدة طویلة اوقلیلة لایسع اخراجه من غیر عذر ویجوز اخراجه بالعذر والعذر أن یظھر ان الأرض مغصوبة اواخذھا الشفیع بالشفعة کذا فی الواقعات الحسامیة ... الخ۔

(۴۴۳) میت گھر میں موجود ہو تو اس جگہ تلاوت کلام پاک کرنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی میت جب تک گھر میں موجود ہوتی ہے تو اس جگہ تلاوت قرآن شریف کرنی چاہیئے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......غسل سے پہلے میت کے پاس قرآن پاک کی تلاوت مکروہ ہے البتہ جب میت کو غسل دیدیا جائے تو پھر اس کے پاس تلاوت کرنا درست ہے۔

لما فی الھندیة (۱/۱۵۷): ویکرہ قراءة القران عندہ حتی یغسل کذا فی التبیین الخ۔

وفی حاشیة الطحطاوی علی الدر(۱/۳۶۵): (قوله تکرہ القراءة) ای تحریما اخذا من التعلیل الآتی (قوله عندہ) ای بعد موته (قوله تنزیھا) ای تبعیدا والاولیٰ فی التعبیر زیادة بقوله۔

(۴۴۴) نمازِ ظہر، نمازِ جنازہ اور کسوف میں کون سی نماز مقدم ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ، کسوف اور صلاۃ ظہر جمع ہوگئیں تو ان میں سے کس کو مقدم کیا جائے گا؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں سب سے پہلے فرض پڑھ لے، اس کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ لے، اس کے بعد صلاۃ کسوف پڑھے۔

لمافی خلاصة الفتاوىٰ(۱/۲۲۳): اما بعد غروب الشمس بدؤا بالمغرب ثم بصلوة الجنازة ثم بسنة المغرب كذا افتی شمس الائمة الحلوانی۔

وفی الهندية(۱/۱۵۳): وأن غربت كاسفة أمسك عن الدعآء واشتغل بصلاة المغرب وان اجتمع الكسوف والجنازة بدأ بالجنازة۔

(۴۴۵)نمازِ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا

سوال......مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق پوچھنا تھا:

(۱)۔جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲)۔جنازہ کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ لوگ بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن مجید کے نیچے روپے باندھ لیتے ہیں اور یہ روپے ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو جمع ہوتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۳)۔پھر چالیس دن تک یہ لوگ قبرستان میں جا کر مردے کی قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۴)۔پھر یہ لوگ چار جمعے یا سات جمعے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن مجید ختم بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں خیرات بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن مجید کے ایک یا دو پارے پڑھنے پر ان کو دس یا بیس روپے دیتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۵)۔اور یہ لوگ اپنے مُردے کے سال پورا ہونے کے بعد خیرات کرتے ہیں اس میں غریب بھی ہوتے ہیں جس کی وصیت نہیں ہوتی لیکن رواج کے مارے یہ لوگ پھر بھی اس کو کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۶)۔ایک آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے اور پھر آٹھ نو سال اس کی کوئی اولاد نہ ہو، اور وہاں کا رواج اس طرح کا ہے کہ ایک بابا وہاں گھوڑے پر آتا ہے اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو کہتا ہے کہ پانچ سو یا ہزار روپے دیدو اسی طرح میرے ماں باپ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ بابا کے پاس جاؤ یا دوسری شادی کرو مگر میرا یہ یقین تھا کہ جس اللہ نے پہلے بچے دیئے ہیں وہ اللہ پاک اب بھی دے سکتے ہیں۔مگر گھر میں اگر ماں باپ اور بھائی کہیں تو ان کا کہنا ماننا کیا گناہ ہوگا اس بارے میں مطلع فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......استفتاء میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱)۔یہ بات تو حقیقت اور مسلم ہے کہ قرآن مقدس ایک مبارک اور برکت والی کتاب ہے۔اس کا اپنے پاس رکھنا موجب برکت وثواب ہے، لیکن شریعت اسلامی میں مسلمان اپنے ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پابند ہے کسی بھی دینی معاملے میں اپنی طرف سے بنایا ہوا بے اصل فعل شریعت میں قابل قبول نہیں ہے اور نہ ہی شریعت ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ شریعت نے ایسے کاموں کو ضلالت

اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔لہٰذا مذکورہ مروجہ طریقہ یعنی قرآن مجید کو جنازے سے پہلے لے کر جانا چونکہ نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، خیر اور دین کے معاملے میں بہت حریص تھے، کسی بھی کام میں اگر ذرا سی خیر اور نیکی ہوتی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ کام ضرور سرانجام دیتے۔لیکن مذکورہ مروجہ طریقہ نہ تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور نہ ہی سلف صالحین سے ثابت ہے لہٰذا یہ طریقہ من گھڑت اور بدعت ہے اور اس کو ترک کرنا لازمی ہے۔

لمافی تفسیر ابن کثیر (۱۴۱/۴): کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابة رضی الله عنهم هو بدعة، لأنه لو کان خیراً لسبقونا الیه لأنهم لم یترکو خصلةً من خصال الخیر إلا وقد بادروا الیها۔

وفی مشکوٰۃ(ص۲۷): ولما جاء فی الحدیث النبوی، عن عائشة رضی الله عنها، قالت ، قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ، من أحدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ۔

وفی المرقاة(۲۱۶/۱) :قال النووی.البدعة کل شئ عمل علیٰ غیر مثال سبق، وفی الشرع، إحداث مالم یکن فی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲)۔مذکورہ مروجہ طریقہ کہ قرآن مقدس کے نیچے کچھ روپے باندھے جاتے ہیں، یہ طریقہ نہ تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی امام مجتہد سے نقل ہے لہٰذا یہ طریقہ خالص بدعت ہے اور قابل ترک ہے۔

لمافی المشکوۃ(ص۲۷):لماجاء فی الحدیث،عن عائشة رضی الله عنها، قالت، قال، رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من أحدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردّ۔

(۳)۔میت کے ایصال ثواب کیلئے قرآن مجید کی تلاوت گھر میں اور قبر پر دونوں جگہ جائز ہے اور موجب ثواب ہے، لیکن اس میں اپنی طرف سے دنوں کی تخصیص اور تعین کرنا کہ چالیس دن تک ہی پڑھیں گے یہ درست نہیں ہے، کسی بھی عبادت میں اپنی طرف سے دن اور وقت کا تعین اور تخصیص کرنا بدعت ہے، ورنہ فی نفسہ قبر پر تلاوت کرنا جائز بھی ہے اور میت کو اس کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور اس سے عذاب میں کمی بھی واقع ہوتی ہے۔

لمافی فتح القدیر(۱۴۲/۲): واختلف فی اجلاس القارئین لیقرٔوا عند القبر والمختار عدم الکراهة۔

وفی البحر (۱۹۵/۲): ولا بأس بقراء ة القرآن عند القبور وربما تکون افضل من غیره، ویجوز أن یخفف الله عن اهل القبور شیأ من عذاب القبر او یقطعه عند دعآء القارئ وتلاوته۔

وفی البزازیة علی هامش الهندیة (۸۱/۴): مات فأجلس وارثه من یقرأ القرآن لابأس به أخذ بعض المشایخ۔

وفی الهندیة(۱۶۶/۱): قراء ة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لاتکره، ومشائخنا أخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع۔

وفی الشامية(٦/٥٧): ولو زار قبر صديق او قريب له وقرأ عنده شيأ من القرآن فهو حسن۔

(۵،۴)۔صدقہ، خیرات، تلاوتِ قرآن مقدس، ذکر اور کوئی بھی نیک عمل کرکے اس کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور مستحسن امر ہے اور ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا بھی ہے، لیکن سوال میں مذکورہ مروجہ طریقے میں تین خرابیاں پائی جاتی ہیں جن خرابیوں نے ان امور کو ناجائز بنادیا ہے۔ اول...... یہ کہ لوگ چار جمعے، سات جمعے اور سال کے بعد خیرات کرتے ہیں، اور ان چار جمعوں، سات جمعوں یا سال کے بعد خیرات کرنے کی تخصیص اور تعین قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ دوم...... لوگ ختم قرآن پر کھانا کھلاتے ہیں، اور یہ صورت بھی درست نہیں ہے۔ سوم...... ایک یا دو پارے پڑھنے پر پڑھنے والے کو دس، یا بیس روپے دیے جاتے ہیں، یہ صورت بھی ناجائز ہے، اور اس صورت میں نہ میت کو ثواب ملتا ہے اور نہ تلاوت کرنے والے کو، بلکہ پڑھنے والا اور پیسے دینے والا دونوں گنہگار ہوجاتے ہیں، اور علاوہ ازیں ان چار جمعوں، سات جمعوں کے بعد خیرات کرنا، ان میں عموماً، نام ونمود، ریا اور دکھلاوا اور رسم ورواج کا کرشمہ کارفرما ہوتا ہے، جیسا کہ سائل کے سوال سے بھی معلوم ہوتا ہے، ان امور میں رضاء الٰہی مقصود نہیں ہوا کرتی، اور لوگ یہ امور اس لئے سرانجام دیتے ہیں کہ نہ کرنے کی صورت میں برادری اور خاندان میں عزت نہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان امور سے احتراز کرنا چاہیئے اور دنوں کی تعین کیے بغیر میت کے ایصال ثواب کیلئے صدقہ، خیرات کرنا چاہیئے۔

لمافی الشامية(٢/٢٤٣): وفی البحر، من صام او صلّى او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند اهل السنة والجماعة۔

وفی البحر(٢/١٩٢): ان اتخذ ولی الميت طعاماً للفقراء كان حسناً اذا كانوا بالغين، وان كان فی الورثة صغير لم يتخذ ذلك من التركة۔

وفی الطحطاوی على المراقی(ص٥١٠): قال فی البزازية ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع... واتخاذ الدعوة بقراءة القرآن۔

وفی الشامية(٦/٥٧): ونقل العلامة الخلوتی... عن شيخ الاسلام تقی الدين ما نصه ولا يصح الاستئجار على القرائة واهدائها الى الميت... وقد قال العلماء ان القارى إذا قرألاجل المال فلا ثواب له فأیّ شئ يهديه الى الميت۔

وفی الشامية(٦/٥٦): ان القرآن بالاجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ وقال العينی فی شرح الهداية ويمنع القارى للدنيا، والآخذوالمعطی آثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرآئة الاجزآء بالاجرة لايجوز۔

وفی الشامية(٢/٢٤٠): ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الى القبر فی مواسم واتخ الدعوة لقراءة القران...وقال (ص٢٤١) وهذه الافعال كلها للسمعة

والرياء فيحترز عنها لانهم لا يريدون به وجه الله تعالىٰ۔

(٦)۔اولاد کا دینا یا نہ دینا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف اور قدرت میں ہے۔اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کو اولاد نہیں دے سکتا۔اللہ تعالیٰ جسے چاہیں نرینہ اولاد دے دیں اور جسے چاہیں لڑکی دے دیں اور جسے چاہیں بالکل ہی اولاد سے محروم کر دیں۔اس سلسلے میں نیک اور اللہ والے لوگوں سے دعا تو کرائی جاسکتی ہے۔لیکن اس طرح سے کہ عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو، اس مسئلہ میں لوگوں کو اپنا عقیدہ درست کرنا چاہیئے، آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے والدین کی ہدایت کی دعا کیا کریں اس معاملے میں آپ کیلئے ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عقیدہ میں کچھ فرق ہے تو اُن کا کہنا ماننا اس معاملے میں بالکل جائز نہیں ہے۔

لمافی القرآن الكريم(الشورى:٤٩،٥٠):لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ، يَهَبُ لِمَن يَّشَآءُ اِنَاثاً وَّيَهبُ لِمَن يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ، اَوْ يُزَوِّجُهم ذُكْرَاناً وَّ اِنَاثاً، وَيَجْعَلُ مَن يَّشَآءُ عَقِيْماً، اِنَّه عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ

وفى تفسير لابن كثير(١٠٨/٤): فجعل الناس اربعة اقسام: منهم من يعطيه البنات، ومنهم من يعطيه البنين ومنهم من يعطيه من النوعين ذكورا و اناثا ومنهم من يمنعه هذا وهذا فيجعله عقيماً لانسل له ولا ولدله۔

وفى كنز العمال(٦٧/٦):الحديث: لاطاعة لمخلوق فى معصية الخالق۔

(٤٤٦) نماز جنازہ میں تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کی رعایت نیز جنازہ کی آخری صف کا اجر

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں اگر صفیں تین سے زائد ہوں تو کیا اس وقت بھی طاق عدد کی رعایت ضروری ہے؟ پانچ یا سات ہوں نیز کیا نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر زیادہ ہوتا ہے۔جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... بلاشبہ نماز جنازہ میں طاق صفوں کی فضیلت روایات سے ثابت ہے لیکن فقہی کتابوں کی عام عبارتیں تین صفوں تک نشاندہی کرتی ہیں اس لئے اس کی رعایت بہتر ہے۔اور اسی طرح نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر زیادہ ہوتا ہے۔

لمافى جامع الترمذى(٢٠٠/١):عن مرثد بن عبدالله اليزنى قال كان مالك بن هبيرة اذا صلى على جنازة فتقال الناس عليها جزاهم ثلثة اجزاء ثم قال قال رسول الله ﷺ من صلى عليه ثلثة

صفوف فقد اوجب۔

وفی تحفة الاحوذی(۱۴۳/۲): واقل الصف ان یکون اثنین علی الاصح قاله القاری قلت ولا حد لاکثره۔

وفی المشکوٰة(ص۱۴۷): عن مالك بن هبیرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ما من مسلم یموت فیصلی علیه ثلثة صفوف من المسلمین الا اوجب۔

وفی المرقاة (۱۴۹/۴): قال ابن الملك فی شرح الوقایة: ذکر الکرمانی ان افضل الصفوف فی صلاة الجنازة آخرها وفی غیرها اولها اظهاراً للتواضع۔

وفی الدر المختار(۲۱۴/۲): وافضل صفوفها آخرها اظهاراً للتواضع۔

وفی الشامیة(۲۱۴/۲): فلو کان الصف الاول افضل فی الجنازة ایضاً لکان الافضل جعلهم صفاً واحداً ولکره قیام الواحد وحده۔

(۴۴۷) نمازِ جنازہ کی آخری صف میں کھڑے ہونے کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ میں سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہونے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جتنا میت سے دور ہوگا اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی علت کیا ہے؟ دلائل سے مسئلے کو مزین فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

الجواب بعون الملک الوھاب......نمازِ جنازہ میں آخری صف افضل ہے کیونکہ اقرب للتواضع ہے۔

لمافی حلبی کبیر(۵۸۸/۱): افضل صفوف الرجال فی الجنازة آخرها وفی غیرها أولها اظهارا للتواضع لتکون شفاعته أدعی للقبول۔

وفی الشامیة(۲۱۴/۲): وقوله: وافضل صفوفها آخرها الخ کذا فی القنیة وبحث فیه فی الحلیة باطلاق مافی صحیح مسلم عنه ﷺ خیر صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وبأن اظهار التواضع لایتوقف علی التاخر: اقول قد یقال ان الحدیث مخصوص بالصلاة المطلقة لأنها المتبادرة ولقوله ﷺ من صلی علیه ثلاثة صفوف غفرله رواه ابو داؤد وقال حدیث حسن والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم ولهذا قال فی المحیط یستحب أن یصف ثلاثة صفوف حتی لوکانوا سبعة یتقدم أحدهم للامامة ویقف وراءه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد فلو کان الصف الاول افضل فی الجنازة ایضا: لکان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولکره قیام الواحد وحده کما کره فی غیرها هذا

ما ظهر لی۔

(۴۴۸) کیا حاضرینِ جنازہ کیلئے نماز جنازہ فرض عین ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ جب مسجد یا جنازہ گاہ میں آجائے تو اس وقت وہاں موجود سب افراد پر اس کا پڑھنا فرض عین ہو جاتا ہے یا پھر صرف بعض لوگوں کا پڑھنا کافی ہے۔اگر کوئی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو تو کیا وہ گناہگار ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں جن میں سے ایک اس کی وفات پر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں اگرچہ بعض افراد کا نماز جنازہ ادا کرنے سے باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن حاضرین کیلئے ایک مسلمان کا حق ہونے کی وجہ سے جنازہ میں شریک نہ ہونا مناسب نہیں نیز بعض حضرات نے حاضرینِ جنازہ پر نماز جنازہ کو فرض عین کہا ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔

لمافی صحیح مسلم(۲/۲۱۳): عن ابی هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس تجب للمسلم على اخيه ردالسلام وتشميت العاطس واجابة الدعوة وعيادة المريض واتباع الجنائز۔

وفی الهندية(۱/۱۶۵): لا ينبغي ان يرجع من جنازة حتى يصلى عليه۔

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۴۲۸،۴۷۷): (فرض كفاية) بالاجماع... والاصل فيه قوله تعالىٰ ''وصل عليهم'' (التوبة:۱۰۳) وقوله عليه الصلوة والسلام صلوا على كل برٍ وفاجرٍ وانما كانت فرض كفاية لقوله عليه السلام ''صلوا على صاحبكم ولو كانت فرض عينٍ ماتركها ولان فى الايجاب اى العينى على الجميع استحالة وحرجاً فاكتفى بالبعض۔

وفی الدرالمختار(۲/۲۰۷): والصلاة عليه... فرض كفاية بالاجماع: الشامية (۱/۵۳۸): وفرض الكفاية معناه فرض ذوكفاية اى يكتفى بحصوله من اى فاعل كان۔

وفی تقريرات الرافعی على رد المحتار(۲/۱۱۹): (قول المصنف فرض كفاية) فى السندى ثم انه قيل كون صلاة الجنازة فرض كفاية مقيد بما اذا لم يكن الناس حاضرين فى مجلس الجنازة لانه ذكر فى فتاوىٰ قاضيخان وظهير الدين والمستصفى قال السيد الامام ناصر الدين واذا لم يكن الناس حاضرين فى مجلس الجنازة و لم يعاينوها فالصلاة عليها فرض كفاية واما عند حضورهم ومشاهدتهم فالصلاة واجبة على كل واحد من الناس باداء نفسه لانها حينئذ فرض عين ولا خلاف فيه اصلاً كذا رأيته بخط بعض الفضلاء ونقله الملا على قارى رحمه الله عن فتوى ابى المعالى

وهكذا وجدته بها مش المنح وقد طالعت فی مختار الفتاویٰ ومتانة الروایات وغیرهما من المعتبرات المتعددة فلم اجد احداً ذکر انها تصیر فرض عین علی الحاضرین فلتراجع المسئلة وقوله ﷺ ''صلّوا علی صاحبکم'' مع حضوره دلیل علی عدم افتراضها علی کل حاضر اھ۔ لکن الاولیٰ مراجعة الکتب التی نسب لها القول بالافتراض عند الحضور وقد راجعت فتاویٰ قاضیخان فلم اجد هذه المسئلة فیها۔

(۴۴۹) امام پر نمازِ جنازہ کے بعد تدفین تک شریک رہنے اور تقریر کرنے کی شرط لگانا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں خطباء جب نمازِ جنازہ پڑھا لیتے ہیں تو پھر اُن کے مقتدیوں کی طرف سے اس کو اجازت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ میت دفن ہوجاتی ہے پھر اس کے بعد قبر کے ایک طرف پر سورۃ بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری طرف آخری رکوع پڑھ لیتے ہیں پھر اس کے بعد تقریر کرتے ہیں اور پھر رخصتی ہوتی ہے اگر کوئی اس طرح نہیں کرتے تو وہ اُن کو امام نہیں رکھتے یہاں تک کہ یہ شرائط مان لے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کا امام پر یہ الزام صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ یہ مذکورہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اس طرح کی شرائط لگانا صحیح نہیں ہے، البتہ مذکورہ طریقہ کہ سورۃ بقرۃ کا پہلا رکوع اور آخری رکوع پڑھنا صحیح ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۲۳۷): (قوله وجلوس الخ) لمافی سنن ابی داؤد کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره وقال: استغفروا لأخیکم واسألوا الله له التثبیت فانه الآن یسأل وکان ابن عمررضی الله عنهما یستحب ان یقرا علی القبر بعد الدفن اوّل سورة البقرة وخاتمتها. اھ۔

(۴۵۰) جنازہ کے بعد صفیں بکھر جانے پر دعا و وعظ وغیرہ کا حکم

سوال......مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق پوچھنا تھا:

(۱)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ کے بعد اگر صفوں کو توڑا جائے تو دعا کرنا جائز ہے۔ کیا یہ مسئلہ ان لوگوں کا صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کی دلیل بیان فرمائیں، بڑی مہربانی ہوگی۔

(نوٹ)۔ہمارے علاقوں میں رواج ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲)۔میت کو دفن کرنے کے بعد بعض لوگ قبر پر وعظ اور دعا کرتے ہیں۔اگر ان کا ثبوت ہو، تو مع دلائل ارشاد فرمائیں بڑی نوازش ہوگی۔

(۳)۔قبر پر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کو سراً پڑھنا چاہیئے یا جہراً؟ اور اس وقت باقی لوگ بیٹھے ہوں گے یا کھڑے ہوں گے؟ نیز یہ بتائیں کہ اگر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کا التزام کسی جگہ شروع ہوجائے تو بدعت تو نہ بنے گی۔جبکہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

ان تمام صورتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ ارشاد فرمائیں، بڑے مشکور ہوں گے۔

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز نہیں، بلکہ بدعت ہے۔خواہ صفوں میں کھڑے کھڑے کی جائے یا صفیں توڑ کر کی جائے۔اور جو لوگ نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر دعا کرنے کو جائز کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔فقہاء کرام ومحدثین عظام نے نمازِ جنازہ کے بعد مطلقاً دعا کرنے کو منع فرمایا ہے۔

(۲)۔میت کو دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر قبر کے پاس بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور میت کیلئے دعا کرنا جائز ہے۔اور اسی طرح اس وقت میں ایسا وعظ کرنے کی بھی گنجائش ہے جو موت اور آخرت کی یاد دلانے کیلئے ہو، اور اس میں دوسرے منکرات اور بدعات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو۔

(۳)۔سب سے بہتر اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ دفن کرنے کے بعد کوئی میت کے سرہانے سورۃ البقرۃ کے اوائل پڑھے اور دوسرا میت کی پائنتی (پاؤں کی طرف) سورۃ البقرۃ کے اواخر پڑھے اور باقی لوگوں کو بھی اگر یہ یاد ہوں تو یہی پڑھیں ورنہ جو بھی سورۃ یا آیات ان کو یاد ہوں وہ پڑھیں۔انہیں سراً یا جہراً دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔نیز کھڑے ہونے یا بیٹھے ہونے دونوں حالتوں میں پڑھنا جائز ہے۔نیز دفن کرنے کے بعد اگرچہ قبر کے پاس بیٹھنا، دعا کرنا، سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر پڑھنا مستحب ہے لیکن ان امور کا التزام کرنا (یعنی ان کو ضروری سمجھنا) درست نہیں ہے۔دفن کرنے کے بعد اگر کوئی ان امور کے بغیر جانا چاہے تو اس کیلئے بغیر کراہت کے جانا درست ہے۔

لما مشكوة المصابيح مع مرقاة المفاتيح(۴/۸۰): وعن عمرو ابن العاص قال لابنه وهو فى سياق الموت اذا أنا مت فلا تصحبنى نائحة ولا نار فاذا دفنتمونى فشنوا على التراب شنا ثم اقيموا حول قبرى قدر ما ينحر جذور ويقسم لحمها حتى استأنس بكم واعلم ماذا أراجع به رسل ربى رواه مسلم۔

وفى المرقاة تحت قوله (ثم اقيموا حول قبرى) لعله للدعاء بالتثبيت وغيره وتحت قوله (حتى استأنس بكم) اى بدعائكم واذكاركم وقراءتكم واستغفاركم وقدورد فى خبر أبي داؤد انه عليه الصلاة والسلام كان اذا فرغ من دفن الرجل يقف عليه ويقول استغفروا لأخيكم واسألوا له التثبيت وفى رواية التثبت فانه الآن يسئل۔

وفيه ايضاً(ص۱۸۱): وعن عبدالله بن عمر (رضی الله عنهما) قال سمعت النبی ﷺ يقول اذا مات احدكم فلا تحبسوه واسرعوا به الى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليه بخاتمة البقرة رواه البيهقی فی شعب الايمان وقال والصحيح انه موقوف عليه۔

وفی الهندية (۱/۱۶۶): ويستحب اذا دفن الميت ان يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت كذا فی الجوهرة النيرة۔ قراء ة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لا تكره، ومشايخنا رحمهم الله اخذوا بقوله وهل ينتفع والمختار انه ينتفع هكذا فی المضمرات۔

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷،۲۳۶): ويستحب حثيه من قبل رأسه ثلاثا، وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء وقراء ة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه وفی الشامی تحت(قوله وجلوس الخ) لما فی سنن أبی داؤد ((كان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف علی قبره وقال: استغفروا لأخيكم واسألوا الله له التثبيت فإنه الآن يسأل)) وكان ابن عمر(رضی الله عنهما) يستحب ان يقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها ... وفی الشامية (۶/۳۸۱):وكذا قالوا بسنية قراء ة السور الثلاثة فی الوتر مع الترك احيانا لئلا يعتقد وجوبها۔

(۴۵۱) نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض ائمہ مساجد کو دیکھا گیا ہے کہ صلوۃ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں، کیا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......جنازہ کی نماز میت کیلئے دعا بھی ہے اس لئے نماز جنازہ کے بعد جنازہ کو روک کر سب کا مل کر دعا مانگنے کا التزام رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہے اور نہ یہ طریقہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور ہر وہ کام جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہ ہو، وہ مردود ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ: من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد۔(مسلم شريف ۲/۷۷)

لما فی خلاصة الفتاویٰ (۱/۲۲۵): لايقوم بالدعاء بعد صلوة الجنازة... الی ولا يقوم بالدعاء فی قرائة القرآن لاجل الميت بعد صلوة الجنازة وقبلها الخ۔

وفی فتاویٰ سراجيه(ص۲۳): ليس فی صلوة الجنازة دعاء موقت اذافرغ من الصلوة لايقوم بالدعاء۔

(۴۵۲) میت کو دفن کرنے کے بعد کی دعا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد کونسی دعا پڑھنی چاہیئے؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....میت کو دفن کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مندرجہ ذیل دعا ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْه وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نُقِيَتِ الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهٖ وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهٖ وَزَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ۔

لما فی المسلم (۱/۳۱۱): عن عوف بن مالك رضى الله عنه صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على جنازة فحفظت من دعائه ''اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس وابدله داراً خيراً من داره وأهلاً خيراً من أهله وزوجا خيرا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار''۔

(۴۵۳) تلقین جہراً کرنا چاہیئے یا سراً؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تلقین علی القبر جہراً کرنا چاہیئے یا سراً؟ جواب دیکر ثواب دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....یہ صراحت تو کہیں نہیں ملی، البتہ فقہاء کے کلام اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تلقین میں میت کو مخاطب کیا جاتا ہے لہٰذا اتنی اونچی آواز سے تلقین ہو کہ وہ سن سکے۔

لما فی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۶۵): ويقعد الملقن عند رأس القبر فيقال له: ياعبدالله ابن أمة الله اذكر ماخرجت عليه من دار الدنيا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله وان الجنة حق والنار حق وان البعث حق و ان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من فى القبور وانك رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا وبالقرآن إماما وبالكعبة قبلة و بالمؤمنين اخوانا۔انتهى۔رواه الطبرانى فى الكبير۔

(۴۵۴) جنازہ میں شرکت سے تعزیت کی ادائیگی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تعزیت کیلئے نماز جنازہ کے بعد میت کے اہل خانہ کے پاس جانا ضروری ہے یا صرف نماز جنازہ میں شرکت کر لینے سے تعزیت ادا ہو جاتی ہے۔ دوبارہ اہل میت کے پاس جانا ضروری نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نماز جنازہ اور تعزیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نماز جنازہ میت کا حق ہے جبکہ تعزیت میت کے اہل وعیال وعزیز واقارب سے کی جاتی ہے تعزیت کرنا مسنون ہے، تعزیت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل میت کو تسلی دے اور ان کو صبر کی ترغیب اور رضا بالقدر کی تلقین کرے، میت کے لئے مغفرت کی دعا کرے۔ تین دن تک تعزیت کر سکتا ہے اس کے بعد تعزیت نہ کرے ہاں اگر وہ غائب ہے یا اہل میت میں سے کوئی غائب ہے تو پھر تین دن کے بعد بھی تعزیت کر سکتا ہے۔ البتہ جنازہ سے قبل بھی تعزیت کر سکتا ہے مگر جنازہ کے بعد تعزیت کرنا زیادہ بہتر ہے لہٰذا صرف جنازہ میں شرکت سے تعزیت نہیں ہوگی بلکہ اہل میت کے پاس جا کر ان کو تسلی وغیرہ دینے سے تعزیت ہوگی۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(ص۱۵۱): عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من عزّی مصابا فله مثل اجره۔

وفی مصنف عبدالرزاق(۳/۳۹۶): ان الحسن مرّ بأهل المیت فوقف علیهم فقال اعظم الله اجرکم وغفرالله لصاحبکم ثم مضی ولم یقعد۔

وفی الشامیة (۲/۲۳۹): (قوله: وبتعزیة أهله) ای تصبیرهم والدعاء لهم به قال فی القاموس: العزاء الصبر أو حسنه وتعزی۔

(ص۲۴۰) وتستحب التعزیة للرجال والنساء اللاتی لایفتن (ص۲۴۱) (قوله: واولها افضل) وهی بعد الدفن افضل منها قبله. لأن اهل المیت مشغولون قبل الدفن بتجهیزه ولأن وحشتهم بعد الدفن لفراقه أکثر. وهذا اذا لم یرمنهم جزع شدید والاقدمت لتسکینهم۔

(۴۵۵) میت کی تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنے کے مروجہ طریقے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی تعزیت کے سلسلہ میں آج کل عموماً لوگ مسجدوں میں بیٹھتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح تعزیت کے لئے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنا بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۷): ولا بأس لاهل المصیبة ان یجلسوا فی البیت او فی مسجد ثلاثة ایام

والناس يأتونهم ويعزونهم...

وفى الدر المختار(۲/۲۴۱): وبالجلوس لهافى غير مسجد ثلاثة ايام...

وفى الشامية: قوله فى غير مسجد. امّا فيه فيكره كمافى البحر عن المجتبى، وجزم به فى شرح المنية والفتح لكن فى الظهيرية لا بأس به لاهل الميت فى البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم...

وفى الفقه الاسلامى(۲/۵۴۳،۵۴۴): لا بأس بالجلوس للتعزية فى غير المسجد ثلاثة ايام وقال فى الفتاوى الظهيرية لا بأس بها لاهل الميت فى البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم...

(۴۵۶) معمر عورت کا اپنے اقارب کی قبر پر جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت قبرستان میں اپنے شوہر، بھائی، باپ یا بیٹے کی قبر پر جائے اور اس کی عمر تقریباً پچاس (۵۰) سال ہو تو اس عورت کا قبرستان جانا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اس عورت کا قبرستان میں جانا جائز ہے بشرطیکہ مروجہ بدعات وغیرہ سے بچی رہے۔

لمافى الشامية(۲/۲۴۲): (قوله ولو للنساء) وقيل تحرم عليهن: والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم فى شرح المنية بالكراهة لما مرفى اتباعهن الجنازة. وقال الخير الرملى: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ماجرت به عادتهن فلاتجوز، وعليه حمل حديث ''لعن الله زائرات القبور'' وإن كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس اذا كن عجائز ويكره اذا كن شواب كحضور الجماعة فى المساجد اهـ وهو توفيق حسن۔

(۴۵۷) میت کے ایصال ثواب کیلئے دن مقرر کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقوں میں پہلے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ میت کے تیسرے دن خیرات وغیرہ کھانا تیار کرتے تھے اور پورے علاقے والوں کی ضیافت کرتے تھے ایصال ثواب کی نیت سے۔علماء کی بھرپور محنت کی وجہ سے لوگ اس سے باز آگئے۔لیکن ابھی تیسرے دن کی جگہ پانچویں دن خیرات کرتے ہیں۔تو پانچویں دن خیرات کرنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کا کھانا درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی امام کھالے تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان کا امام رہنا کیسا ہے؟ اور کیا

اس کو امامت سے دور کرنا جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......شریعت مطہرہ نے صدقہ وخیرات کرنے کی بہت رغبت دلائی ہے اور اس میں بہت ثواب بتلایا ہے، اور اعمال صالحہ کا ایصال ثواب کرنے سے میت کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔لیکن شریعت مطہرہ میں اس کیلئے نہ ہی کوئی خاص دن متعین ہے اور نہ ہی اجتماع وغیرہ کو متعین کیا ہے ہر شخص انفرادی طور پر بھی ایصال ثواب کرسکتا ہے۔اپنی طرف سے خاص دن متعین کرنا اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھنا بدعت ہے پس صورت مسئولہ میں خاص دن متعین کیا گیا ہے اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھا جاتا ہے علاوہ ازیں اس میں دوسرے مفاسد بھی ہیں مثلاً اہل بدعت سے مشابہت، بے جا اسراف، ریاونمود وغیرہ اس لئے یہ بدعت ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔ جو رسومات اُفعال غیر مشروعہ وبدعات پر مشتمل ہوں ان میں شریک ہونا جائز نہیں، لہٰذا جو امام ان رسومات میں ثواب سمجھ کر شریک ہوتا ہے وہ بدعتی ہے اس کو امام بنانا مکروہ ہے۔متبع سنت شخص کو امام بنایا جائے۔البتہ جو شخص کبھی کسی عذر یا لاعلمی کی وجہ سے شریک ہوا ہو، اس کو معذور سمجھا جائے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(ص۳۱):عن ابراهیم بن میسرة قال قال رسول الله ﷺ من وقّر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام۔ رواه البیهقی فی شعب الایمان مرسلا۔

وفی ابن ماجه(ص۱۱۶):باب ماجاء فی النهی عن الاجتماع الی اهل المیت وصنعة الطعام... عن جریر بن عبدالله قال کنانری الاجتماع الی اهل المیت وصنعة الطعام من النیاحة۔

وفی الدرالمختار(۵۵۹،۵۶۰/۱):(ویکره)... (إمامة عبد)... (ومبتدع) أی صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لا بمعاندة بل بنوع شبهة۔

وفی الشامیه(۲۴۰/۲): مطلب فی کراهة الضیافة من أهل المیت: وقال ایضاً، ویکره اتخاذ الضیافة من الطعام من أهل المیت لأنه شرع فی السرور لا فی الشرور، وهی بدعة مستقبحة۔ وروی الامام أحمد و ابن ماجه بإسناد صحیح عن جریر بن عبدالله قال ((کنا نعدّ الاجتماع الی أهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اهـ وفی البزازیة ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الأوّل والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلی القبرفی المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الاخلاص۔ والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل یكره۔ وفیها من كتاب الاستحسان : وإن اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اهـ وأطال فی ذلك فی المعراج۔ وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لأنهم لایریدون بها وجه الله تعالیٰ اهـ

(۴۵۸) اگرکسی کی زمین میں بنی قبر کے اوپر بدعات اور رسومات ہونے لگیں تو کیا کریں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گاؤں سے تھوڑی دور ایک بڑا درخت ہے جس کے نیچے عرصہ دراز سے ایک قبر نما ڈھیری بنی ہوئی ہے جس کو سب لوگ ''شہید'' کہتے ہیں اس ''شہید'' کے بارے میں پورے گاؤں میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اس کی تاریخ جانتا ہو بس ''شہید'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور مشہور ہے۔ اب اس کے اردگرد مٹی گارے کی چھوٹی سی چاردیواری بنی ہوئی ہے اس موجود درخت پر رنگ برنگے بالخصوص سبز رنگ کے کپڑوں کے ٹکڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ خشک سالی کے موسم میں لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس شہید پر مٹی کا لیپ کرو، چاول پکاؤ وغیرہ تو پھر بارش ہوگی۔ اب کچھ عرصہ سے اس شہید کے متصل ایک آدمی نے جگہ خریدی ہے اور رہائش رکھی ہے جو کہ بڑے اہتمام سے اس شہید کو سنبھال رہے ہیں۔

یہ جگہ میری نہیں ہے بلکہ ایک حاجی صاحب کی ہے جو کہ بفضل خدا صحیح العقیدہ ہیں تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں اور کافی سارا وقت لگا چکے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ اس شہید کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں ان حاجی صاحب کی اجازت سے اس درخت کو مزدوری پر جڑ سے اکھیڑ دوں، یا کسی پر جڑ سے اکھیڑنے کی شرط پر بیچ دوں اور وہ رقم کسی مسجد یا مدرسہ میں دے دوں تو کیسا ہے یہ کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ یا کوئی اور طریقہ آپ کے ذہن میں ہو تو مہربانی کر کے بتادیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اس طرح قبر کی تزئین وآرائش کا بندوبست کرنا اور قبر کے پاس جا کر صاحب قبر سے مانگنا، سب ناجائز وحرام ہیں۔ جس شخص کی یہ جگہ ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ایسی تمام شرکیہ رسومات کو اس جگہ سے ختم کرے ورنہ اس برائی کا گناہ اس شخص پر ہے جس کی یہ جگہ ہے۔ اور درخت کی مالیت کے متعلق درخت کے مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ اپنے تصرف میں لے آئے یا اس کو کسی مسجد ومدرسہ وغیرہ میں دے دے۔

لمافی عمدة القاری(۱۸۳/۸): ورأى ابن عمر رضى الله عنهما فسطاطاً على قبر عبدالرحمٰن فقال انزعه يا غلام فإنما يظله عمله۔ قوله فإنما يظله اى لا يظله الفسطاط بل يظله العمل الصالح فدلّ هذا على أن نصب الخيام على القبر مكروه ولا ينفع الميت ذلك ولا ينفعه الا عمله الصالح الذى قدمه۔

وفى مشكوٰة المصابيح(ص۴۳۶): عن أبي سعيد الخدرى عن رسول الله ﷺ قال من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الايمان۔

وفى الشامية(۲۳۷/۲): أما البناء عليه فلم أر من اختار جوازه... وعن أبي حنيفة يكره أن يبنى عليه بناء من بيت أو قبة او نحو ذلك لماروى جابر رضی اللہ عنہ نهى رسول الله ﷺ عن تجصيص القبور وان يكتب عليها وان يبنى عليها۔

(۴۵۹) مجالس تعزیت، اور ان میں رُلا دینے والے مضامین کا پڑھنا، نیز شخصیات کی تاریخ وفات پر اجتماع کا حکم

سوال...... مفتی صاحب درج ذیل امور سے متعلق پوچھنا تھا:

(۱)...... کسی کی وفات کے بعد تین دن تک مجلس تعزیت تو صراحۃً روایات میں ہے۔ تین دن کے بعد مجالس تعزیت کا انعقاد جائز ہے؟ اور کس دلیل سے، ۱۴ سو سال بعد بھی اگر کسی بزرگ کیلئے مجالس عزاء قائم کی جائیں تو کیا شرعاً کوئی ممانعت کی وجہ ہے؟

(۲)...... تعزیتی جلسوں میں میراثی اور مدحی قصائد اور اطراء مادح پر مشتمل بیانات سے رُلانا کیا یہ جاہلیت کی مجالس نوحہ کی نشاۃ ثانیہ تو نہیں ہے؟

(۳)...... وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین کا تکرار ہر سال کیا یہ برسی منانے کے حکم میں نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... شریعت مقدسہ میں کسی آدمی کے مرنے پر اس کے ورثاء کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ تین دن تک اپنے دکھ اور غم کا اظہار کریں اور تعزیت کیلئے آنے والے لوگوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ آنے والے لوگ بسہولت تعزیت کر کے لوٹ جائیں اور ان تین دنوں کے اندر بھی شریعت نے اعتدال کا حکم دیا ہے اور شامیانے لگانے اور دعوت وغیرہ کے اہتمام کو فقہاء نے اقبح القبائح میں شمار کیا ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے الا یہ کہ تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جارہی ہے وہ غائب ہو تو پھر اس کی اجازت ہے لہٰذا تین دن کے بعد تعزیتی مجالس قائم کرنا شریعت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(۲)...... جب اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تعزیتی جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی سے ثابت نہیں تو ان جلسوں میں مدحی قصائد پڑھنا یا بیانات کر کے لوگوں کو رُلانا ان کی شناعت وقباحت میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے رسومات جاہلیت کی یاد تازہ ہوتی ہے لہٰذا ایسے جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی کی رُو سے جائز نہیں۔

(۳)...... اگر کسی شخصیت کی وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین اور بیانات میں التزام اور کارِ ثواب سمجھے بغیر اس کی دینی خدمات کا ذکر کر دیا جائے اور مروجہ خرافات (مثلاً کھانے کا التزام، لوگوں کو اعلان کر کے جمع کرنا، اس کو دین کا حصہ اور کار ثواب سمجھنا، اور بعض مقامات پر مرد و زن کا اختلاط وغیرہ) نہ پائی جاتی ہوں تو یہ برسی کے حکم میں نہیں، تاہم اگر اس کو بھی کارِ ثواب سمجھا جائے اور ایام کا التزام کیا جائے تو یہ بدعت میں داخل ہوگا۔

لما فی تبیین الحقائق (۵۸۹/۱): (فصل) ولا بأس بتعزية اهل الميت وترغيبهم فى الصبر لقوله عليه الصلوة و السلام من عزا مصاباً فله مثل أجره ويقول له اعظم الله أجرك وأحسن عزاءك وغفرلميتك ولابأس بالجلوس لها الى ثلاثة ايام من غير ارتكاب محظور من فرش البسط

والاطعمة من أهل الميت لأنها تتخذ عند السرور وعن أنس أنه عليه الصلوة والسلام قال لاعقر في الاسلام وهو الذى كان يعقر عند القبر بقرة أوشاة۔

وفى الفقه الاسلامى (۱۵۷۲/۲): هى ان يسلى أهل الميت ويحملهم على الصبر بوعد الأجر ويرغبهم فى الرضا بالقضاء والقدر ويدعوللميت المسلم وتكون الى ثلاثة ليال بايامها وتكره بعدها الا لغائب حتى لايجدد له الحزن ولإذن الشارع فى الاحداد فى الثلاث بقوله ﷺ لايحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الاخر ان تحد على ميت فوق ثلاثة ايام الاعلى زوجها أربعة أشهر وعشراً... وقال الحنفية لابأس بالجلوس للتعزية فى غير المسجد ثلاثة أيام. واولها افضلها وقال فى الفتاوىٰ الظهيرية لابأس بها لأهل الميت فى البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم ويكره المبيت عند أهل الميت وتكون التعزية فى بيت المصاب... (وبعد صفحة قال) ولابأس كما ذكر الحنفية برثاء الميت بشعراوغيره لكن يكره الافراط فى مدحه لاسيما عند جنازته لحديث من تعزى بعزاء الجاهلية فأعضُّوه بِهَن أبيه ولا تكنوا وهذا أمرتأديب ومبالغة فى الزجر عن دعوى الجاهلية۔

(۴۶۰) خودکشی کرنے والے کی قیامت میں سزا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ جوخودکشی کرے تووہ جس طرح اپنے آپ کو مارتا ہے قیامت تک اسی طرح وہ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ کیا لوگوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب..... خودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور ایسے شخص کے متعلق احادیث مبارکہ کے اندر سخت وعیدیں آئی ہیں چنانچہ احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جس طریقے سے خودکشی کرتا ہے جب تک وہ جہنم میں رہے گا اسی حالت میں رہے گا، البتہ خودکشی کرنے والے شخص کو مفتی بہ قول کے مطابق غسل بھی دیا جائے گا اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، لیکن علماء، صلحاء اور مقتدا حضرات اس میں شرکت نہیں کریں گے تاکہ دوسرے لوگوں کو تنبیہ ہو، اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

لمافى البخارى(۱۸۲/۱): عن ثابت بن الضحاك عن النبى ﷺ قال من حلف بملة غير الاسلام كاذباً متعمداً فهو كما قال ومن قتل نفسه بحديدة عذب بها فى نار جهنم قال وقال حجاج بن منهال حدثنا جرير بن حازم عن الحسن قال حدثنا جندب فى هذا المسجد فما نسيناه وما نخاف ان يكذب جندبٌ على النبى ﷺ قال كان برجل جراح فقتل نفسه فقال الله بدرنى عبدى بنفسه

حرمت عليه الجنة۔

عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال النبی صلی الله علیه وسلم الذی يخنق نفسه يخنقها فی النار والذی يطعنها يطعنها فی النار۔

وفی الدر المختار (۲/۲۱۱): (من قتل نفسه) ولو (عمداً يغسل ويصلى عليه) به يفتى وان كان اعظم وزراً من قاتل غيره، ورجح الكمال قول الثانی بما فی مسلم ((أنه عليه الصلوة والسلام أتى برجل قتل نفسه فلم يصل عليه))

وفی الشامية تحته: (قوله به يفتى) لأنه فاسق غير ساع فی الارض بالفساد وان كان باغياً على نفسه كسائر فساق المسلمين زيلعی.........

أقول قد يقال لا دلالة فی الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى انه عليه الصلوة والسلام لم يصل عليه فالظاهر أنه امتنع زجراً لغيره عن مثل هذا الفعل كما امتنع عن الصلوة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلاة احد عليه من الصحابة اذلا مساواة بين صلاته وصلاة غيره قال تعالىٰ ان صلاتك سكن لهم ثم رأيت فی شرح المنية بحثاً كذلك۔

(۴۶۱) جانتے بوجھتے مرزائی کا جنازہ پڑھانے والے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معلوم ہونے کے باوجود ''مرزائی'' کا جنازہ پڑھانے والا امام شرعاً فاسق اور قابل معزول ہے یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... اس بات کے معلوم ہونے کے باوجود کہ ''مرزائی'' کا جنازہ ہے، پھر بھی اس کی نماز جنازہ پڑھاتا ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

لما فی الشامی(۱/۵۲۳): وقد علمت أن الصحيح خلافه، فالدعاء به كفر لعدم جوازه عقلا ولا شرعا ولتكذيبه النصوص القطعية بخلاف الدعاء للمؤمنين كما علمت، فالحق [illegible] الحنفية على الوجه الذی نقلناه عنها لاعلى مانقله ح فافهم۔

(۴۶۲) قبرستان پر چھت اور عمارت بنانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاندان کا ایک قبرستان ہے بس ، چھت بنا رہے ہیں تو قبرستان میں عمارت بنانا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مذکورہ میں اگر میت کے دفن کرنے کے بعد قبر کی مضبوطی کیلئے چھت بنائی جاتی ہوتو یہ مکروہ ہے، اور اگر تزیین کیلئے بنائے جاتی ہوتو یہ حرام ہے اور قبرستان میں عمارت چونکہ قبروں ہی کے اوپر بنائی جاتی ہے اس لئے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

وفی الهندية(۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر۔

وفی الشامية(۲/۲۳۷): (قوله ولا يرفع عليه بناء) ای يحرم لوللزينة ويكره لوللاحكام بعد الدفن۔

(۴۶۳) جنازہ گاہ میں وقتیہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبرستان میں ایک جگہ نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے تعمیر کی گئی ہے اس میں نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں پھر اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں اگر اس وقت نماز کا وقت داخل ہوجائے تو اسی جگہ فرض نماز باجماعت ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......وہ جگہ جو قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنے کیلئے مخصوص کی گئی ہو، یا وہ جگہ جو عید کی نماز کیلئے مخصوص کی گئی ہو، نماز پڑھنے کے واسطے مسجد ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اور اس میں ضرورتاً وقتیہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔

لمافی الطحطاوی علی المراقی(ص۲۹۰): وفی زاد الفقير وتكره الصلاة فی المقبرة الا ان يكون فيها موضع اعد للصلاة لانجاسة فيه ولا قذر فيه الخ۔

وفی الدر المختار(۱/۶۵۷): (و)اما (المتخذ لصلاة جنازة او عيد) فهو (مسجد فی حق جواز الاقتداء) وان انفصل الصفوف رفقا بالناس (لافی حق غيره) به يفتی الخ۔

وفی الشامية (قوله به يفتی نهاية) عبارة النهاية والمختار للفتوىٰ انه مسجد فی حق جواز الاقتداء۔

(۴۶۴) نمازِ جنازہ کی فرضیت کب ہوئی؟ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کب فرض ہوئی قبل ہجرت یا بعد ہجرت، حضرت

خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......نمازِ جنازہ ہجرت کے پہلے سال میں شروع ہوئی اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی تھی تو اس وجہ سے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی گئی تھی۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی (ص۴۷۸): قال الواقدی: لم تکن شرعت یوم موت خدیجة. وموتا رضی الله عنها بعد النبوة بعشر سنین علی الأصح۔

وفی أوجز المسالك (۱۹۱/۴): وفی الانوار الساطعة شرعت صلاة الجنازة بالمدینة المنورة فی السنة الاولیٰ من الهجرة فمن مات مکة المشرفة لم یصل علیه اهـ۔

وفی البدایة والنهایة (جزء۳، ۲/۱۲۵): قال عروة بن الزبیر وقد کانت خدیجةرضی الله عنها توفیت قبل ان تفرض الصلاة ثم روی من وجه آخر عن الزهری انه قال توفیت خدیجةرضی الله عنها بمکة قبل خروج رسول الله ﷺ الی المدینة وقبل ان تفرض الصلوٰة۔اهـ۔

(۴۶۵)خلفاءراشدین کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضرات خلفاءراشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی تھی؟ بحوالہ نقل کریں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......حضرات خلفاءراشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی نمازِ جنازہ جن حضرات نے پڑھائی تھی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱)۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(۲)۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے

(۳)۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے

(۴)۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔

وفی تاریخ الخلفاء: وأخرج ابن سعد عن سعید بن المسیب أن عمر رضی الله عنه صلی علی أبی بکر بین القبر والمنبر وکبّر علیه أربعا۔ (ص۶۵)

أصیب عمر رضی الله عنه یوم الأربعاء لأربع بقین من ذی الحجة ودفن یوم الأحد مستهل المحرم الحرام. وله ثلاث وستون سنة ... وصلی علیه صهیب رضی الله عنه فی المسجد۔(ص۱۰۸)

قال قتادة رضی الله عنه: صلی علیه الزبیر ودفنه، وکان أوصی بذلك إلیه۔(ص۱۲۹)

وأقام علیٰ الجمعة والسبت، وتوفى ليلة الأحد، وغسله الحسن والحسين، وعبدالله بن جعفر وصلى عليه الحسن۔ (ص۱۳۹)

(۴۶۶) ڈاکوؤں وغیرہ کے ہاتھوں مارے جانے والے کا حکم

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کومثلاً ڈاکو یا قطاع الطریق شہید کردے یا دوفریقین کی لڑائی میں یہ شخص غلطی سے مارا گیا ہوتو کیا اس پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے یعنی اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......صورت مسئولہ میں اگر زید کوڈاکو یا قطاع الطریق وغیرہ قتل کردیں۔ پھر وہ دنیاوی نفع حاصل نہ کر سکے یعنی کھانا پینا علاج کرنا وغیرہ تو زید پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے اگر یہ فریقین کی لڑائی میں غلطی سے مارا گیا تو وہ شہید اخروی ہوگا۔

لمافى البخارى (۱/۹۰): عن ابى هريرة ان رسول الله ﷺ قال بينما رجل يمشى بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخره فشكر الله له فغفرله۔ ثم قال الشهداء خمسة المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد فى سبيل الله۔

وفى الفقه الاسلاميه وادلته(۲/۱۵۸۳): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغى او قطاع الطريق او اللصوص فى منزله ليلا او نهاراً باى آلة: مثقل او محدد او وجد فى المعركة وبه اثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من اذن او عين او قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفاً (بالغا عاقلا) طاهرا (خالياً من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعد انقضاء الحرب اى لايموت عقب الاصابة۔

وفى الشامية(۲/۲۴۸): (قوله حتى لو وجب الخ) تفريع على مفهوم قوله بنفس القتل، فان المال لم يجب بنفس القتل العمد لان الواجب به القصاص، وانما سقط بعارض وهو الصلح او شبهة الابوة، فلا يغسل فى الرواية المختارة۔كمافى الفتح والحاصل انه اذا وجب بقتله القصاص وان سقط لعارض اولم يجب بقتله شئ اصلا فهو شهيد كما علمته اما اذا وجب به المال ابتداء فلا، وذلك بان كان قتله شبه العمد كضرب بعصا او خطا كرمى غرض فاصابه او ماجرى مجراه كسقوط نائم عليه۔

وفى ابى داؤد (۲/۴۴۳): جابر بن عتيك اخبره ان رسول الله ﷺ، جاء يعود عبدالله بن ثابت فوجده قد غلب فصاح به رسول الله ﷺ فلم يجبه فاسترجع رسول الله ﷺ وقال غلبنا عليك

يا ابا الربيع فصاح النسوة وبكين فجعل ابن عتيك يسكتهن فقال رسول الله ﷺ دعهن فاذا وجب فلا تبكين باكية قالوا وما الوجوب يا رسول الله قال الموت قالت ابنته والله ان كنت لارجوان تكون شهيدا فانك قد كنت قضيت جهازك قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل قد اوقع اجره على قدر نيته وما تعدون الشهادة قالوا القتل فى سبيل الله قال رسول الله ﷺ الشهادة سبع سوى القتل فى سبيل الله، المطعون شهيد والغرق شهيد وصاحب ذات الجنب شهيد والمبطون شهيد وصاحب الحريق شهيد والذى يموت تحت الهدم شهيد والمرأة تموت بجمع شهيد۔

(۴۶۷) سیاسی قائدین وکارکنان اور رافضی، بدعتی وغیرہ کا مارا جانا شہادت ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سیاسی جماعتوں کے کارکنان وقائدین جو کہ باہم سیاسی چپقلشوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے کچھ مارے جاتے ہیں۔ یا اسی طرح کسی کو نامعلوم افراد مار دیتے ہیں۔ تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ (۱)......ایسے مارے جانے والے کیا شہید ہوں گے؟ (۲)......ان میں جو بے گناہ مارا جائے کیا اس کو بغیر غسل دیئے دفنانا (شہادتِ دنیاوی کے اعتبار سے) جائز ہے؟۔ (۳)......ان میں جو (رافضی یا بدعتی یا کوئی اور فاسق یا قاتل) مارا جائے۔ کیا وہ بھی شہید ہوگا؟۔ (۴)......رافضی امامیہ کے جنازے میں یا قبر پر حاضر ہونا جائز ہے؟۔ (۵)......کیا ایسا شخص کہ جو سراسر (مسلمان مجاہدین کا مخالف اور کفار کا مسلمانوں کے مقابلے میں) ساتھی ہو۔ اس کو کوئی قتل کردے تو کیا وہ شہید ہوگا؟ اور اس کو قتل کرنے والا کیا گنہگار ہوگا؟

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱، ۲)......شریعت اسلامیہ میں شہیدِ کامل (دنیاوی واخروی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں چھ شرائط پائی جاتی ہوں، (۱) مکلف ہونا، (۲) مسلمان ہونا، (۳) ظلماً قتل ہونا، (۴) نفس قتل سے عوض مالی کا واجب نہ ہونا، (۵) طاہر ہونا، (۶) زخمی ہونے کے بعد کوئی دنیاوی فائدہ نہ اٹھانا۔ لہٰذا جس شخص میں مذکورہ بالا چھ شرائط بیک وقت موجود ہوں وہ شخص شہید کامل کہلائے گا اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے۔

البتہ شہید کی ایک دوسری قسم ہے شہید اخروی، جس کی فقہاء کرام نے ایک طویل فہرست ذکر کی ہے مثلاً مبطون یعنی پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہوکر مرنے والا، مطعون یعنی طاعون کی بیماری میں مبتلا ہوکر مرنے والا، غریق پانی میں ڈوب کر مرنے والا، غریب، حالتِ سفر میں مرنے والا طالبعلم، حالت جنابت میں مارا جانے والا وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ غسل بھی دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی البتہ آخرت میں یہ لوگ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

(۳)......چونکہ شہید کیلئے ایک شرط مسلمان ہونا ہے، لہٰذا جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں تو وہ اگر مارا جائے تو وہ شہید نہیں کہلائے گا البتہ مقتول کے بدعتی یا فاسق یا قاتل ہونے سے اس کی شہادت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اگرچہ اس معصیت کا الگ سے اس کو گناہ ہوگا۔

(۴)......جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں اس کی نماز جنازہ اور قبر پر حاضر ہونا ناجائز ہے۔

(۵)......مسلمانوں میں سے جو شخص مسلمانوں اور مجاہدین کا مخالف ہو اور دلی طور پر کفار کا ساتھی ہو، اگر چہ وہ مجرم تو ضرور ہے، امام وقت اگر مناسب سمجھے تو اس کو تعزیر کا حق ہے لیکن عام شہری کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کو قتل کردے اگر قتل کردیا تو اس پر دنیا میں شہید کے احکام جاری ہوں گے اور قاتل گناہگار ہوگا۔

لما فی الدرالمختار (۲/۲۴۷): (هوكل مكلف مسلم طاهر)... (ص۲۴۸) (قتل ظلماً) بغير حق (بجارحة) اى بما يوجب القصاص (ولم يجب بنفس القتل مال) بل قصاص ... (ص۲۴۹) (ولم يرتث) فلو ارتث غسل كما سيجئ(وكذا) يكون شهيداً (لوقتله باغ اوحربي اوقاطع طريق ولو) تسببا او (بغير آلة جارحة) فان مقتولهم شهيد باى الة قتلوه... (او وجد جريحاً ميتاً فى معركتهم) المراد بالجراحة علامة القتل ... (ص۲۵۰) (ويصلى عليه بلاغسل ويدفن بدمه وثيابه) ... (ويغسل من وجد قتيلاً فى مصر) او قرية (فيما) اى فى موضع(يجب فيه الدية)... (ولم يعلم قاتله) اوعلم ولم يجب القصاص فان وجب كان شهيداً كمن قتله اللصوص ليلاً فى المصر فانه لاقسامة ولادية فيه للعلم بان قاتله اللصوص غاية الامران عينه لم تعلم فيلحفظ فان الناس عنه غافلون (اوقتل بحد او قصاص) (ص۲۵۱) اى يغسل وكذا بتعزير او افتراس سبع (اوجرح وارتث) ... (ص ۲۵۲) وهذا كله اذا كان (بعد انقضاء الحرب ولوفيها) اى فى الحرب (لا) يصير مرتثا بشئ مما ذكر وكل ذلك فى الشهيد الكامل والا فالمرتث شهيد الاخرة وكذا الجنب ونحوه

وفى الفقه الاسلامى وادلته (۲/۱۵۸۸): فالشهداء ثلاثة، شهيد فى حكم الدنيا والآخرة: وهو شهيد المعركة اما حكم الدنيا فلا يغسل ولا يصلى عليه عند الجمهور كما ابنت واما حكم الاخرة فله ثواب خاص وهو الشهيد الكامل الشهادة۔ وشهيد فى حكم الدنيا فقط وهو عند الشافعية من قتل فى قتال الكفار بسببه وقدغل من الغنيمة اوقتل مدبراً او قاتل رياءً اونحوه اى لايغسل ولا يصلى عليه ولا ثواب له فى الاخرة۔ شهيد فى حكم الاخره فقط كالمقتول ظلماً من غير قتال والمبطون اذا مات بالبطن والمطعون... والغريق، والغريب، وطالب العلم ... وحكم هؤلاء الشهداء فى الدنيا اى شهداء الاخرة ان الواحد منهم يغسل ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتى اما فى الاخرة فله ثواب الاخرة فقط وله اجر الشهداء يوم القيامة۔

المعصية والشهادة: المعصية لاتمنع الاتصاف بالشهادة فيكون الميت شهيدا عاصياً لان الطاعة

لاتلغی المعصیة الا فی الصغائر قال تعالیٰ ان الحسنات یذھبن السیئات سورۃ ھود (۱۱/۱۱۴)۔

(۴۶۸) دہشتگردوں کی فائرنگ سے چوکی پر موجود پولیس ملازم قتل ہوگیا، کیا وہ شہید ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو پولیس یا حکومتی ملازم کسی حادثہ میں قتل ہوجاتا ہے جیسے عام طور پر دہشت گرد آ کر چوکی پر فائر کردیتے ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر پولیس والے مرجاتے ہیں تو کیا وہ شہید کے حکم میں داخل ہوں گے یا نہیں، اگر ہوں گے تو کیا حقیقی ہوں گے یا حکمی؟

الجواب بعون الملک الوھاب......یہ حقیقی شہید کے حکم میں ہوں گے۔

لما فی الھندیة(۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمین أو أھل الذمة بأی آلة قتل بحدید أو حجر أوخشب فھو شھید۔

وفی الدر المختار مع رد المحتار(۲/۲۴۹): (کذا) یکون شھیدا (لوقتله باغ أو حربی أو قاطع طریق ولو) تسببا الخ ... قال العلامة ابن العابدین تحت (قوله أو قاطع طریق) والمکابرون فی المصر لیلا بمنزلة قطاع الطریق کما فی البحر عن شرح المجمع. فمن قتلوه ولو بغیر محدد فھو شھید کما لو قتله القطاع، وکذا من قتله اللصوص لیلا کما سیأتی وذکر فی البحر أنه زاد فی المحیط سببا رابعا وھو من قتل مدافعا ولو عن ذمی فانه شھید بأی آلة قتل وان لم یکن واحداً من الثلاثة أی ممن قتله باغ أو حربی أو قاطع طریق وقال فی النھر: کونه شھیدا وان قتل بغیر محدد مشکل جدّا لوجوب الدیة بقتله۔ فتدبره ممعنا النظر فیه اھ قلت یمکن حمله علی ما اذا لم یعلم قاتله عینا، کما لو خرج علیه قطاع طریق أو لصوص أونحوھم۔

(۴۶۹) ہندوؤں کے میلوں وغیرہ میں کسی حادثہ کا شکار ہونے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی اپنے کو قتل کردے یعنی زہر کھا کر مرجائے یا پھانسی پر چڑھ جائے یا کافروں کی طرف سے منعقدہ کسی فنکشن میلہ اور ہندو تہوار وغیرہ میں شرکت کرکے ان کی تماشاؤں میں مشغول ہوکر کسی حادثہ کا شکار ہوگیا اور ان کے رسم ورواج کے مطابق کسی تقریب تہوار وغیرہ میں شامل ہوکر مرگیا اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اگر جمعیت علماء پہلے سے ان لوگوں کے متعلق یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی تاکہ دوسرے لوگ اس سے پرہیز کریں یعنی عبرت حاصل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر محلے کے امام مسجد نے اس شخص کا جنازہ پڑھادیا تو اس امام کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر امام کے علاوہ کسی اور نے اس کا جنازہ پڑھادیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب...... ہندوؤں اور غیر مسلموں کے تہواروں اور میلوں میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ان میلوں میں شرکت کرتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو کر مرجائے، اسی طرح اگر خودکشی کرے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ البتہ ان کی نماز جنازہ میں اگر جید علماء زجراً شرکت نہ کریں تو یہ درست ہوگا۔ جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن جمعیت علماء کا یہ فیصلہ کہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، درست نہیں۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہر نیک وبد پر نماز جنازہ پڑھا کرو، اور نماز جنازہ پڑھانے والے امام پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اس کو جنازہ پڑھانے کا ثواب ملے گا۔

وفی النسائی(۲۱۵/۱):عن جابربن سمرةرضي الله عنه أن رجلا قتل نفسه بمشاقص فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أما أنا فلا أصلّی علیه۔

وفی کنز العمال(۵۴/٦)(حدیث:۱۴۸۱۵): صلوا خلف کل بروفاجر وصلوا علی کل برّ وفاجر ... الخ۔

وفی اعلا السنن (۲۷۳/۸): قال النووی: أخذ بظاھره من قال: ''لا یصلی علی قاتل نفسه لعصیانه'' ''وهو مذهب الاوزاعی وأجاب الجمهور: بأنه صلى الله عليه وسلم لم یصلّ علیه بنفسه زجراً للناس عن مثل فعله وصلت علیه الصحابة وهذا کما ترك صلى الله عليه وسلم فی أوّل الامر الصلاة علی من علیه دین زجراً لهم عن التساهل فی الاستدانة وعن اهمال وفاء ها وأمر أصحابه بالصلاة علیه فقال'' صلّوا علی صاحبکم۔

وفی الدر المختار(۲۱۱/۲):(من قتل نفسه) ولو (عمداً یغسل ویصلی علیه) به یفتی وإن کان اعظم وزرا من قاتل غیره (وتحته فی الشامیة) أقول: قد یقال: لا دلالة فی الحدیث علی ذلك لأنه لیس فیه سوی أنه علیه الصلوة والسلام لم یصلّ علیه، فالظاهر أنه امتنع زجراً لغیره عن مثل هذا الفعل۔ کما امتنع عن الصلوة علی المدیون ولا یلزم من ذلك عدم صلوة أحد علیه من الصحابة رضی الله عنهم إذلا مساواة بین صلاته وصلاة غیره۔

(۴۷۰) جہاد میں اگر کوئی اپنے فعل کی وجہ سے قتل ہو جائے تو اس کے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی جہاد میں اپنے ہی اسلحہ وغیرہ سے مارا جائے تو اسے عام میت کی طرح غسل وغیرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......اسے غسل دیا جائے گا۔

لما فی التاتارخانیة(۲/۱۶۲): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو لیضربه فاخطأ واصاب نفسه ومات فانه یغسل ویکفن ویصلی علیه۔

وفی الهندیة (۱/۱۶۳): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو لیضربه بالسیف فاخطأ واصاب نفسه، ومات غسل وصلی علیه۔

(۴۷۱) میت کے سینے پر انگلی سے کلمہ وغیرہ لکھنے اور قبر میں آیات قرآنیہ رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے چہرے یا سینے پر انگلی سے کلمہ وآیات وغیرہ لکھنا یا کاغذ پر لکھی ہوئی آیتوں کا قبر میں رکھنا شرعاً کیسا ہے؟ اوراسی طرح جنازہ دفن کرنے کے بعد میت کے گھر پر کوئی پڑوسی یا اس کا رشتہ دار (کڑوی روٹی) کھانا کھلائے جسے کڑوی روٹی کہتے ہیں۔کیا یہ لوگوں کو کھلانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔میت کے چہرے یا سینے پر بغیر سیاہی کے انگلی کے ساتھ کوئی آیت یا کلمہ وغیرہ لکھنا جائز ہے لیکن اسے ضروری نہ سمجھا جائے۔

(۲)۔کاغذ پر لکھی ہوئی آیات کا میت کے ساتھ قبر میں رکھنا درست نہیں اس میں قرآن کریم کی بے حرمتی ہے۔

(۳)۔جب کسی گھر میں فوتگی ہوجائے تو میت کے پڑوسیوں کیلئے مستحب ہے کہ وہ اہل میت کے کھانے کا انتظام کریں اور خود اہل میت کے ساتھ بیٹھ کر انہیں کھلائیں، لیکن آجکل جو عام رواج بن گیا ہے کہ کسی شخص کے انتقال پر اس کا پڑوسی یا کوئی رشتہ دار تمام شرکاء جنازہ کیلئے کھانے کا انتظام کرتا ہے اور اسے لازمی سمجھا جاتا ہے۔اور سب شرکاء انتظام نہ ہونے کی صورت میں اسے برا سمجھتے ہیں اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں۔اور جہاں تک کڑوی روٹی کھلانے کا تعلق ہے تو یہ بدعت قبیحہ ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔البتہ میت کے وہ رشتہ دار جو دور سے آئے ہوں یا ایسے رشتہ دار جن کا اہل میت کے پاس رہنا ضروری ہو، ان کا اہل میت کے ہاں کھانا کھانا درست ہے۔

لمافی فتح القدیر(۲/۱۴۲): ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله ﷺ "اصنعوا لآل جعفر طعاماً فقد جاء هم ما یشغلهم... ولانه بر ومعروف ویلح علیهم فی الاکل لان الحزن یمنعهم من ذلك فیضعفون۔

وفی الشامیة (۲/۲۴۶):تکره کتابة القرآن وأسماء الله تعالیٰ علی الدراهم والمحاریب والجدران وما یفرش، وما ذاك الا لاحترامه وخشیة وطئه ونحوه مما فیه اهانة فالمنع هنا بالاولیٰ مالم یثبت عن المجتهد أو ینقل فیه حدیث ثابت۔ نعم نقل بعض المحشین عن فوائد الشرجی أن مما یکتب علی جبهة المیت بغیر مداد با لاصبع المسبحة۔ بسم الله الرحمٰن الرحیم۔ وعلی الصدرلا اله الا الله محمد رسول الله وذلك بعد الغسل قبل التکفین۔

وفی الشامیة(۲/۲۴۰): ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لافی الشرور وهی بدعة مستقبحةٌ۔

(۴۷۲) میت کوغسل دیتے وقت ذکرودعا کرنے کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی مُردوں کوغسل دیتا ہے۔وہ دورانِ غسل کبھی ذکر واذکار اور وضوء کی دعاؤں کا ورد کرتا ہے۔اور کبھی چھوڑ دیتا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میت کوغسل دیتے وقت غاسل اوراس کے معاونین ذکرواذکار اور دعائیں پڑھ سکتے ہیں یانہیں؟ نیز اگر میت غسل خانے میں ہوتو کیا حکم ہے؟ اوراگر غسل خانے کے علاوہ دوسری صاف جگہ میں غسل کا بندوبست ہوا ہوتو پھر وہاں کیا حکم ہوگا مذکورہ ذکرواذکار ودعاؤں کا؟ نیز اگر جائز ہوتو پھر غاسل دوسروں کواس کے پڑھنے کی ترغیب دے سکتا ہے یانہیں؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... شرعاً انسان نجاست کی جگہ میں اور ستر کھلا ہونے کی حالت میں بلندآواز سے ذکرواذکار نہیں پڑھ سکتا ہے مگر دل میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر موضع نجاست نہ ہو،اور کشف عورت بھی نہ ہوتو پھر بلندآواز سے ذکرواذکار پڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں میت کوجس جگہ غسل دیا جارہا ہے اگر وہ موضع نجاست نہیں ہے اور نہ میت کونجاست لگی ہوئی ہے اور نہ ستر کھلا ہوا ہے تواس صورت میں غاسل اوراس کے معاونین ذکرواذکار ودعاءِ وضو بلندآواز سے پڑھ سکتے ہیں ہاں اگر وہ موضع نجاست ہے یا کشف عورت پایا جارہا ہے تواس صورت میں دل میں ذکرواذکار ودعاءِ وضو پڑھیں گے اوراگر میت کوغسل خانہ میں غسل دیا جارہا ہے تو پھر بھی یہی حکم ہے کہ نجاست ہونے اور کشف عورت کی صورت میں دل میں ذکروغیرہ پڑھیں گے نہ ہونے کی صورت میں بلندآواز سے ذکر وغیرہ پڑھیں گے البتہ قرآن شریف کی تلاوت کرنا میت کے پاس بیٹھ کرغسل دینے سے پہلے مکروہ ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۵۶۴): وتکرہ قراء ۃ القرآن عندہ حتی یغسل تنزیہا للقرآن عن نجاسة الحدث بالموت والخبث فانه یزول عن المسلم بالغسل تکریماً له بخلاف الکافر قوله: (عن نجاسة الحدث) ... والحاصل انهم اختلفوا فی نجاسة المیت فقیل نجاسة خبث وقیل حدث ویشهد للثانی مارویناہ من تقبیله ﷺ عثمان بن مظعون وهو میت قبل الغسل اذلو کان نجسا وضع فاہ الشریف علی جسدہ ولا ینافی ذلك ماذکروہ من انه لو حمله انسان قبل الغسل فصلی به لا تصح صلاته وکذا کراهة القراء ۃ عندہ قبل الغسل لجواز ان یکون ذلك لعدم خلوہ عن نجاسة غالبا والغالب کالمحقق۔

وفی الهندیة(۱/۵۰): ویستحب له عند الدخول فی الخلاء ان یقول اللهم انی اعوذبك من الخبث والخبائث ... کذا فی التبیین ولا یتکلم ولا یذکر اللہ تعالیٰ ولا یشمت عاطسا ولا یرد السلام ولا

یجیب المؤذن فان عطس یحمد الله بقلبه ولا یحرك لسانه... كذا فی السراج الوهاج۔

وفی الدر المختار(۱/۱۰۹،۱۰۸): والبداءة بالتسمية قولا وتحصيل بكل ذكر... قبل الاستنجاء وبعده الاحال انكشاف وفی محل نجاسة فيسمی بقلبه۔

وفی الشامية(۲/۱۹۴): وذكر ط ان محل الكراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه بالقراءة فلا كراهة اهـ... وتكره قراءة القرآن فی موضع النجاسة كالمغتسل والمخرج والمسلخ وما اشبه ذلك واما فی الحمام فان لم يكن فيه احد مكشوف العورة وكان الحمام طاهرا لا باس بان يرفع صوته بالقرائة وان لم يكن كذلك فان قرأ فی نفسه ولا يرفع صوته فلا باس به ولا باس بالتسبيح والتهليل وان رفع صوته... فتحصيل من هذا ان الموضع ان كان معدا للنجاسة كالمخرج والمسلخ كرهت القرائة مطلقا والا فان لم يكن هناك نجاسة ولا احد مكشوف العورة فلا كراهة مطلقا وان كان فانه يكره رفع الصوت فقط ان كانت النجاسة قريبة فتامل۔

(۴۷۳) مسنون کفن اور عورت کے کفن میں تہبند کو شلوار کی طرح سینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کے کفن میں ستر کے اہتمام کیلئے شلوار کی صورت میں ہلکی سی سلائی کر کے کفن میں شامل کر سکتے ہیں جبکہ معروف شلوار نہیں بنائے بالکل معمولی سی سلائی کرتے ہیں جو دو تین منٹ میں پوری ہو جاتی ہے کسی بداعتقادی یا رسم کی وجہ سے بھی نہیں ہے صرف ستر کی بنا پر سلائی کرتے ہیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......مرد کا مسنون کفن تین کپڑے ہوتے ہیں، اور عورت کا مسنون کفن پانچ کپڑے ہوتے ہیں، ضرورت کے وقت اس میں کمی وبیشی ہوسکتی ہے، اور اسی طرح کفن میں سنت یہ بھی ہے کہ کفن کا عدد ''وتر'' طاق ہو، نہ کہ ''شفعاً'' جفت ہو، اور کفن میں یہ بات بھی مستحب اور افضل ہے کہ کفن زیادہ قیمتی نہ ہو، اور نہ اس میں اسراف ہو، بلکہ ضرورت کے مطابق ہو، اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میت کا کفن زندوں کے لباس کی طرح سلا ہوا نہ ہو، کیونکہ اس سے زینت لازم آتی ہے، البتہ اگر ضرورت ہو تو ضرورت کی وجہ سے سلانا جائز ہے۔صورت مسئولہ میں اگر یہ ''شلوار جیسا سلا ہوا کپڑا'' ان پانچ کپڑوں میں سے ہو، اور تستر کی خاطر ہو، اور ضرورت بھی ہو تو اس کپڑے کو کفن میں شامل کرنا جائز ہے، اور اگر ان پانچ کپڑوں کے علاوہ ہو، اور ضرورت بھی نہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ اسراف ہوگا۔

لمافی الشامية(۲/۲۰۲): (قوله ولا بأس بالزيادة على الثلاثة) كذا فی النهر عن غاية البيان ونقله قبله عن المجتبیٰ الكراهة لكن قال فی الحلية عن الذخيرة معزيا إلى عصام: إنه إلى خمسة ليس

بمكروه ولا بأس به اهـ: ثم قال: ووجه بأن ابن عمر رضی الله عنهما كفن ابنه واقدا فی خمسة اثواب قميص وعمامة وثلاث لفائف وأدار العمامة إلى تحت حنكه رواه سعيد بن منصور اهـ۔ قال فی البحر بعد نقل الكراهة عن المجتبیٰ واستثنیٰ فی روضة الزندوستی ما إذا وصی بأن يكفن فی أربعة أو خمسة فإنه يجوز بخلاف ما اذا اوصی ان يكفن فی ثوبين فإنه يكفن فی ثلاثة ولو أوصی أن يكفن بألف درهم كفن كفنا وسطا اهـ۔ قلت: الظاهر ان الإستثناء الذی فی الروضة منقطع إذ لو كره لم تنفذ وصيته كما لم تنفذ بالأقل تأمل... (قوله لحديث الخ) وفی صحيح مسلم عنه ﷺ "إذا كفن أحدكم اخاه فليحسن كفنه" وروی ابو داؤد عنه ﷺ "لا تغالوا فی الكفن فإنه يسلب سلبا سريعاً" الخ۔

وفی الشامية(۲/۱۹۸): (قوله ای يكره تحريما) لمافی القنية من أن التزيين بعد موتها والامتشاط وقطع الشعر لا يجوز نهر. فلو قطع ظفره أو شعره أدرج معه فی الكفن قهستانی عن العتابی... وايضاً (صـ۲۰۲) (قوله إزار الخ) هو من القرن إلى القدم والقميص من أصل العنق إلى القدمين بلاد خريص وكمين الی قول والدخريص: الشق الذی يفعل فی قميص الحی ليتسع للمشی(قوله وتكره العمامة الخ) هی بالكسر مايلف علی الرأس قاموس قال ط: وهی محل الخلاف واما ما يفعل علی الخشبة من العمامة والزينة ببعض حلی فهو من المكروه بلاخلاف لما تقدم انه يكره فيه كل ما كان للزينة اهـ۔

وفی المحيط البرهانی(۳/٦۳): وقيل معناه يزاد علی ما عليه من الثياب ثوب جديد تكرّماً له، وإن كان عليه يبلغ السنة. وينقصون ماشاؤوا، وإن كان ما عليه يبلغ السنة، ويخيطونه ان شاؤ واكمايفعل ذلك لغيره من الموتی، انما لا يزال عنه اثر الشهادة فأما فيما سوی ذلك فهو كغيره من الموتی... وايضاً (صـ٦٦) ولنا: حديث ابن عباس رضی الله عنه، أن النبی ﷺ كفن فی حلة وقميص، والحلة اسم الثوبين عند العرب، ازار ورداء، ولأن اشرف لباس الأحياء القميص، فوجب تقديمه، إلا انه لا يجعل قميصه علی هيئة قميص الاحياء فلا يجعل له دخريص، لأن ذلك انما يجعل فی حق الحی ليسع أسفله، فيتيسرله المشی. والميت لا يحتاج إلی ذلك، ولا يكف اطرافه، لأنه ذلك يفعل للحی. ولا حاجة للميت إليه، والأخذ بحديث ابن عباس رضی الله عنه اولیٰ من الأخذ بحديث عائشة رضی الله عنها . لان الرجال هم الذين حضروا رسول الله ﷺ۔

(۴۷۴) حرم میں جنازہ اندر ہونے کی وجہ اور حرم میں خواتین کا نماز پڑھنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دینی باتیں جو ہمارے یہاں منع ہوتی ہیں لیکن حرم شریف میں لوگ کر رہے ہوتے ہیں، اور علماء بھی اس کی اجازت دیتے ہیں یا منع نہیں کرتے، ایسی ہی ایک دو باتیں ہیں جو آپ سے معلوم کرنی تھیں۔ براہ کرم اگر آسانی اور سہولت ہو تو کرم نوازی فرمادیں۔

(۱)۔ہمارے یہاں مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی جبکہ حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲)۔ہمارے یہاں خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آنے سے روکا جاتا ہے جبکہ حرم میں خواتین نماز مسجد حرام میں ہی پڑھتی ہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب......(۱)۔مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ ابوداؤد (۲/ ۴۵۴) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مسجد میں جنازے پر نماز ادا کی تو اس کیلئے کوئی ثواب نہیں''۔ اور چونکہ اس میں مسجد کی ناپاکی کا بھی خطرہ رہتا ہے اس وجہ سے احناف نے مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ البتہ اگر جنازہ اور کچھ نمازی مسجد سے باہر ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو اس صورت میں جائز ہے اور حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر رکھنے میں حرج عظیم لازم آئے گا اور اس حرج کو دفع کرنے کیلئے جنازہ کو اندر رکھ کر نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۲)۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے ممانعت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ عورتوں کیلئے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے اور گھر میں بھی بالکل پوشیدہ جگہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عورتوں کے مسجد میں جانے سے متعلق شدت اختیار کی اور فتنے کے خوف سے عورتوں کو منع کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے کی عورتوں کا حال دیکھ لیتے تو ان کو مسجد میں آنے سے منع فرمادیتے۔ اسی وجہ سے متاخرین نے فتنہ کے خوف سے مطلقاً عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ لکھا ہے البتہ مسجد حرام کے متعلق علماء نے ضرورت کی وجہ سے گنجائش نکالی ہے کہ اگر مسجد حرام یا مسجد نبوی میں عورتیں نماز ادا کریں تو اس میں کراہت نہ ہوگی اور عام طور پر وہاں عورتوں کیلئے نماز پڑھنے کی الگ جگہ متعین ہوتی ہے جہاں عورتیں نماز ادا کرتی ہیں لہٰذا فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

لما فی سنن ابی داؤد (۲/۴۵۴) (کتاب الجنائز): ... عن أبي هريرة (رضی الله عنه) قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى على جنازة فی المسجد فلا شی له۔

وفیه ایضاً (۱/۸۴): باب ماجاء فی خروج النساء الی المسجد) عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تمنعوا نساء کم المساجد وبیوتھن خیر لھن۔

وفیه ایضاً (۱/۸۴): عن عبدالله عن النبی صلى الله عليه وسلم قال صلوۃ المرأۃ فی بیتها افضل من صلاتها فی

حجرتها، وصلاتها فى مخدعها افضل من صلاتها فى بيتها۔

وفى اعلاء السنن(۲۶۲/۴): ...فيه دلالة على جواز خروج النساء مطلقاً سواء كن شواب أو عجائز للصلاة فى مسجد الحرام أو مسجد النبى ﷺ وعليه عمل اهل الحرمين اليوم. ولكن ينبغى تقييده بوقت الضرورة كما اذا حضرت المسجد للطواف فى الحج والعمرة فلا بأس لها بأن تصلى فيه وحدها أو جماعة أو حضرت المسجد النبى للتسليم والصلوة على النبى ﷺ فلا بأس لصلاتها فى المسجد تحية أو مكتوبة واما ان تاتى المسجد الحرام أو المسجد النبوى لاجل الصلوة فحسب فينا فيه قوله ﷺ ''صلاتك فى بيتك خير من صلاتك فى حجرتك'' الى ان قال : ''ومن صلاتك فى مسجدى'' والله تعالىٰ اعلم۔

وفى الهداية(۸٦/۱): (ويكره لهن حضور الجماعات) يعنى الشواب منهن لمافيه من خوف الفتنة (ولا بأس للعجوز ان تخرج فى الفجر والمغرب والعشاء) وهذا عند ابى حنيفة رحمه الله (وقالا يخرجن فى الصلوات كلها) لانه لا فتنه لقلة الرغبة فلا يكره كما فى العيد وله ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنة غير ان الفساق انتشارهم فى الظهر والعصر والجمعة اما فى الفجر والعشاء هم نائمون وفى المغرب بالطعام مشغولون۔

وفى الدر المختار(۲۲۶،۲۲۵،۲۲۴/۲): (وكرهت تحريماً) وقيل (تنزيها فى مسجد جماعة هو) أى الميت (فيه) وحده أو مع القوم۔

(واختلف فى الخارجة) عن المسجد وحده او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة، بناءً على أن المسجد انما بنى للمكتوبة وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم وهو الموافق لا طلاق حديث أبى داؤد ''من صلى على ميت فى المسجد فلاصلاة له''۔

وفى الشامية(۲۲۵/۲): (قوله مطلقاً) اى فى جميع الصور المتقدمة كمافى الفتح عن الخلاصة وفى مختارات النوازل سواء كان الميت فيه او خارجه هو ظاهر الرواية وفى رواية لايكره اذا كان الميت خارج المسجد(قوله بناء على أن المسجد الخ) أما اذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد وحده او مع بعض القوم قال فى شرح المنية: واليه مال فى المبسوط والمحيط'' وعليه العمل وهو المختار اهـ قلت: بل ذكر غاية البيان والعناية انه لا كراهة فيها بالاتفاق۔

(۴۷۵) سیلاب، زلزلہ وغیرہ میں مرنے والوں کی شہادت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی چند دن پہلے بلوچستان میں ضلع زیارت پر جو خوفناک زلزلہ آیا اور اس میں کئی گاؤں تباہ ہوگئے اور بہت سے افراد مر گئے، زید کہتا ہے کہ یہ لوگ چونکہ زیادہ گنہگار تھے اس لئے ان پر یہ زلزلے آتے ہیں اور یہ ان کی سزا ہے جبکہ عمر کہتا ہے کہ ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل وکرم ہے کہ ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے اگر عام عذاب آجائے جیسے زلزلہ، سیلاب وغیرہ تو اس سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور اس میں مرنے والوں کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ سیلاب، زلزلہ یا دوسری ناگہانی آفات سے جو اموات واقع ہوتی ہیں ان کو شہادت کہنا درست ہے، نیز اس میں مرنے والوں کے غسل اور کفن دفن عام اموات کی طرح ہوگا یا کوئی فرق ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوهاب......شہید کی دو قسمیں ہیں:

شہید کی پہلی قسم یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں شہید ہو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہو جائے یا اس کو ظلماً قتل کیا جائے اور وہ کچھ دنیاوی نفع بھی حاصل نہ کر سکے، اس شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جائے گا اور اس کو اپنے خون آلود کپڑوں میں دفن کیا جائے گا البتہ اس سے زائد کپڑے، کوٹ، واسکٹ، اور اسلحہ وغیرہ نکال دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔

شہید کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف آخرت میں شہید کہلائے گا اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو دین کی فکر میں مر جائے یا کسی ناگہانی موت مر جائے ایسے شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو انشاء اللہ شہید کا ثواب ملے گا، لہٰذا صورت مسئولہ میں زلزلہ سیلاب، اور ناگہانی آفات میں مرنے والوں کو عام مردوں کی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا اور ان کو شہداء کہنا درست ہے۔ البتہ رہی زید کی بات کہ یہ لوگ گنہگار تھے اس لئے ان پر زلزلے آئے ہیں تو گناہ شہادت کے منافی نہیں اگر کسی آدمی پر گناہ کی حالت میں شہادت کے اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے موت واقع ہو جائے تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا البتہ اس پر اپنے ناجائز عمل کا گناہ ہوگا۔

لمافی تکملة فتح الملهم(۳/۴۶۲): قوله والشهيد فى سبيل الله! يعنى من قتل مجاهداً فى سبيل الله تعالىٰ، وهذا الأخير هو الشهيد فى احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن فى ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً فى معركتهم كما فى الدر المختار. فهؤلاء كلهم شهداء فى حكم الدنيا والاخرة. وأما الاربعة الاولى فهم شهداء فى أحكام

الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم فى الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخرى الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة فى احكام الاخرة وكونهم مأجورين أجر الشهداء وعدّهم الحافظ ابن حجر رحمه الله عشرين كما مرّ وعدّهم السيوطى نحو الثلاثين، وهى ''من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم. أو بالجنب... الخ۔

وفى الفقه الاسلامى (۱۵۹۰/۲): والخلاصة. إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيّاً او مات فى اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الاخرة وحكم هؤلاء الشهداء فى الدنيا، أى شهداء الآخرة. أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتى. أما فى الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجرا الشهداء يوم القيامة۔

وفى الشامية(۲۵۳/۲): (خاتمة) ذكر الأجهورى قال فى العارضة: من غرق فى قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات فى معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذالك لو قاتل على فرس مغصوب أو كان قوم فى معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية۔

(۴۷۶) گرمی کی شدت سے مرجانے والے کی شہادت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید اخروی کی بہت سی اقسام احادیث میں ذکر ہیں کیا وہ شخص جو گرمی کی شدت سے مرجائے وہ شہید اخروی ہے یا نہیں؟ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں شہر میں اتنے افراد گرمی کی شدت سے جاں بحق ہو گئے اور فلاں شہر میں اتنے۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب بعون الملک الوهاب......تتبع اور تلاش کے بعد تقریباً پچاس ایسے افراد ملے ہیں جن کو مختلف کتب میں شہداء اخروی کہا گیا ہے اور ان میں اکثر وہ شہداء ہیں جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور ان تمام شہداء کے مجموعے سے دو اصول سمجھ میں آتے ہیں، ایک اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی دینی فکر میں مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ وہ طالب علم جو کہ علم شرعی کی طلب میں مرجائے یا وہ شخص جو اللہ کے راستہ میں بستر پر مرجائے یا وہ شخص جو کہ امت کے فساد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھام لے وغیرہ وغیرہ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص ناگہانی موت مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ پانی میں غرق ہو کر مر گیا یا جس کو درندوں نے مار کر قتل کر دیا ہو یا وہ شخص کہ جس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور اس کی موت واقع ہوگئی ہو وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ شخص جو کہ گرمی کی شدت سے مرجائے وہ بھی ناگہانی موت میں داخل ہے اور ان شاء اللہ شہید اخروی ہے۔

لمافی فتح الباری(۶/۳۳،۳۴): ...ويحتمل أن يكون أراد التنبيه على ان الشهادة لا تنحصر فی القتل بل لها أسباب أخر وتلك الاسباب اختلفت الاحاديث فی عددها ففی بعضها خمسة وفی بعضها سبعة والذی وافق شرط البخاری الخمسة فنبه بالترجمة على أن العدد الوارد ليس على معنى التحديد انتهى... والذی يظهر انه ﷺ أعلم بالاقل ثم اعلم زيادة على ذالك فذكرها فی وقت آخر ولم يقصد الحصر فی شئ من ذالك وقد اجتمع لنا من الطرق الجيدة اكثر من عشرين خصلة فان مجموع ماقدمته مما اشتملت عليه الاحاديث التی ذكرتها أربع عشرة خصلة وتقدم فی باب من ينكب فی سبيل الله حديث أبی مالك الأشعری مرفوعا من وقصه فرسه أو بعيره أو لدغته هامة أو مات على فراشه على ای حتف شاء الله تعالیٰ فهو شهيد وصحح الدار قطنی من حديث ابن عمر رضی الله عنهما موت الغريب شهادة ولا بن حبان من حديث أبی هريرة رضی اللہ عنہ من مات مرابطا مات شهيداً الحديث وللطبرانی من حديث ابن عباس رضی الله عنهما مرفوعاً المرء يموت على فراشه فی سبيل الله شهيد وقال ذالك ايضاً فی المبطون واللديغ والغريق والشريق والذی يفترسه السبع والخار عن دابته وصاحب الهدم وذات الجنب ولابی داؤد من حديث ام حرام المائد فی البحر الذی يصيبه القئ له أجر شهيد وقد تقدمت احاديث فيمن طلب الشهادة بنية صادقة انه يكتب شهيداً فی باب تمنی الشهادة ويأتی فی كتاب الطب حديث فيمن صبر فی الطاعون انه شهيد وتقدم حديث عقبة بن عامر فيمن صرعته دابته وانه عند الطبرانی وعنده من حديث ابن مسعود باسناد صحيح ان من يتردی من رؤس الجبال وتأكله السباع ويغرق فی البحار لشهيد عند الله ووردت احاديث اخری فی أمور اخری لم أعرج عليها لضعفها قال ابن التين هذه كلها ميتات فيها شدة تفضل الله على أمة محمد ﷺ بان جعلها تمحيصا لذنوبهم وزيادة فی أجورهم يبلغهم بها مراتب الشهداء (قلت) والذی يظهر أن المذكورين ليسو فی المرتبة سواء... ويتحصل مما ذكر فی هذه الاحاديث ان الشهداء قسمان شهيد الدنيا وشهيد الآخرة وهو من يقتل فی حرب الكفار مقبلاً غير مدبر مخلصاً وشهيد الاخرة وهو من ذكر بمعنى انهم يعطون من جنس أجر الشهداء ولا تجری عليهم احكامهم فی الدنيا۔

وكمافی تكملة فتح الملهم: (۳/۲۶۳،۲۶۲)

وكمافی الشامية(۲/۲۵۲)

(۷۷۴) ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کی شہادت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی مدرسہ میں حفظ کررہا ہوں اور چند دن پہلے چھٹی کے موقع پر ہم گھر جارہے تھے کہ رات کو ایک جگہ پر ہماری بس دوسری گاڑی سے ٹکراگئی اور ایکسیڈنٹ ہوا جس کے نتیجہ میں کافی سارے لوگ زخمی ہوئے اور چند حضرات موقع ہی پر مرگئے اور دوتین آدمی چند دن زخم کے حالت میں رہ کر آخر کار زخموں کی تاب نہ لاسکے اور رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آیا یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ نیز ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب......صورت مسئولہ میں ایکسیڈنٹ میں فوت ہونے والے افراد صرف آخرت کے اعتبار سے شہید ہیں لہٰذا ان کو غسل دیا جائے گا اسی طرح عام مُردوں کی طرح کفن اور دفن کا انتظام کیا جائے گا۔

لمافی تكملة فتح الملهم (۳/۴۶۲): قوله والشهيد فی سبيل الله! يعنی من قتل مجاهداً فی سبيل الله تعالیٰ، وهذا الأخير هو الشهيد فی احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن فی ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً فی معركتهم كما فی الدر المختار. فهؤلاء كلهم شهداء فی حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولی فهم شهداء فی أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم فی الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخری الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة فی احكام الاخرة وكونهم مأجورين أجر الشهداء وعدّهم الحافظ ابن حجر عشرين كما مرّ وعدّهم السيوطی نحو الثلاثين. وهی "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب... الخ۔

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۹۰): والخلاصة، إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيّاً أو مات فی اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الاخرة وحكم هؤلاء الشهداء فی الدنيا، أی شهداء الاخرة، أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلی عليه اتفاقاً كغيره من الموتی، أما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجر الشهداء يوم القيامة۔

وفی الشامية (۲/۲۵۳): (خاتمة) ذكر الأجهوری قال فی العارضة: من غرق فی قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات فی معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذالك لو قاتل علی فرس مغصوب أو كان

قوم فی معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية۔

(۴۷۸)جو شخص اپنی یا مسلمانوں کی جان ومال کا دفاع کرتے ہوئے مرجائے وہ شہید ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہوئی زمین کے سلسلے میں، جن میں ایک جماعت برحق اور مظلوم تھی اور دوسری جماعت بالکل ظالم تھی مظلوم جماعت سے دو آدمیوں کو پتھروں سے قتل کیا گیا اور دونوں جنگ کے موقع پر ہی وفات پاگئے اور نہ کوئی بات کی اور نہ کچھ کیا اور ان میں ایک کا قاتل بھی معلوم ہوا، اور دوسرے کا قاتل معلوم نہیں ہوا بلکہ جماعت کے ہر فرد پر شبہ قتل کیا جاسکتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان ہلاک شدگان میں سے کس کو غسل دیا جائے اور کس کو غسل نہ دیا جائے، تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......جو آدمی اپنی جان، مال، اہل یا مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے، چاہے کسی بھی آلہ سے ہو، شرعاً شہید ہے۔جس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شہید کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے گا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی غسل نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بای آلة قتل بحديد أو حجر أو خشب فهو شهيد كذا فی محيط السرخسی۔

وفيه ايضاً(۱/۱۶۸): وحكمه ان لا يغسل ويصلی عليه كذا فی محيط السرخسی ويدفن بدمه وثيابه كذا فی الكافی۔

وفی الشامية(۲/۲۴۹): ومفاده أنه لو كانت إحدى الفرقتين ظالمة للأخرى بأن علموا حالهم لايغسل من قتل من الأخرى وإن جهل قاتله عينا لكونه مدافعا عن نفسه وجماعته تأمل۔

(۴۷۹)عدالت کی طرف سے کسی کو ظلماً قتل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد اکرم ایک دیندار آدمی ہے پچھلے سال انہوں نے چار مہینے بھی لگائے لیکن اس کا بھائی محمد انور ایک شریر آدمی ہے اور اس نے ایک آدمی کو قتل کیا اور فرار ہوگیا جس کی وجہ سے محمد اکرم کو پولیس نے گرفتار کیا اور جھوٹے گواہوں کی گواہی کی وجہ سے عدالت نے ان کو سزائے موت سنائی جو کہ دو تین دن میں ہونے والی ہے۔حالانکہ وہ اس قتل میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ عدالت اگر کسی شخص کو ناحق سزا دے جس کی وجہ سے وہ مرجائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں؟ اور اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب بعون الملک الوھاب......شہید کی تعریف میں وہ شخص داخل ہے جس کو بغیر گناہ اور ناحق قتل کیا گیا ہو، اور جس کا بدلہ اصلاً

قصاص ہونہ کہ دیت ۔صورت مسئولہ میں اگر گواہوں کے ذریعہ ثابت ہوجائے کہ یہ گواہ جھوٹے تھے تو قصاص نہ قاضی پرلازم ہوتا ہے اورنہ ورثاء پر، بلکہ اس صورت میں ورثاء پردیت لازم ہوگی۔اوردوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کو حاکم یا قاضی ظلماً قتل کروالے تو اس مظلوم مقتول کوشرعاً شہید اخروی قرار دیا جاتا ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص محمد اکرم کوغسل اورکفن دے کر دفن کیا جائے۔

لمافی الهندية(۱/۱٦۷): وهو فی الشرع من قتله أهل الحرب والبغی وقطاع الطريق او وجد فی معركة وبه جرح او يخرج الدم من عينه أو اذنه او جوفه... او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية وكذا ان قتله أهل الذمة او المستأمنون۔

ولو وجبت الدية بصلح او بقتل الاب ابنه لا تسقط الشهادة لأن الواجب القصاص لكنه سقط بالصلح او الشبهة

ومن قتل مدافعاً عن نفسه او ماله او عن المسلمين او أهل الذمة بأی آلة قتل بحديد او حجر او خشب فهو شهيد۔

وفی الشامية(٦/): وفی المعراج عن المجتبی: يشترط عند ابی حنيفة ای فی شبه العمد أن يقصد التأديب دون الاتلاف۔

(۴۸۰)میت کو ایصال ثواب کا مسنون طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی وفات کے بعد ایصال ثواب کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔میت کی وفات کے بعد برائے ایصال ثواب جانوروغیرہ ذبح کرنا کیسا ہے؟

(۳)۔بعض جگہوں میں میت کی وفات کے بعد تیجہ،ساتواں، چالیسواں وغیرہ مناتے ہیں،اس کی کیا حیثیت ہے؟

(۴)۔بعض جگہوں میں نماز جنازہ کے بعد پیسے وغیرہ تقسیم کیے جاتے ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟واضح رہے کہ یہ پیسے وغیرہ رشتہ دار اپنے مال سے ایصال ثواب کے طور پر تقسیم کرتے ہیں اوراس کولازم بھی نہیں سمجھتے۔

(۵)۔اورنمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا کیسا ہے؟

الجواب بعون الملک الوهاب......(۱)۔ہرقسم کی بدنی ومالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اورصحیح ہے بلکہ ایک مستحسن امر ہے جس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کوئی بدنی عبادت یا مالی عبادت کر کے اللہ سے دعا مانگے کہ اے اللہ!میری اس عبادت کا ثواب فلاں کو پہنچا دے۔اس طرح دعا مانگنا زبان سے ضروری نہیں۔اگر دل میں نیت کرے تو بھی کافی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ امر مباح یا مندوب کوواجب کا درجہ دے کر اس کو لازم سمجھنا یا اس کو کسی خاص وقت یا خاص مکان کے ساتھ مقید کرنا

اور اسی کو دین سمجھنا اور نہ کرنے والے پر طعن وتشنیع کرنا، درست نہیں۔اس میں بدعت کی صورت پیدا ہوتی ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲)۔برائے ایصال ثواب جانور ذبح کرنا بھی درست ہے جبکہ ذبح کرنے والا اپنے مال سے کرے۔اور اگر یہ میت کے ترکہ سے ہو جس میں غائب اور یتیم ورثاء کا حق ہوتا ہے تو پھر جائز نہیں۔البتہ اگر تمام ورثاء بالغ ہوں اور ان میں کوئی غائب نہ ہو، اور وہ خوشی سے ذبح کریں تو پھر درست ہے تاہم کسی مروجہ خاص وقت یا خاص جگہ میں ذبح کرنا بوجہ التزام وغیرہ کے درست نہ ہوگا اس سے احتراز کیا جائے۔

(۳)۔میت کی وفات کے بعد تیجہ، ساتواں، چالیسواں وغیرہ کرنا بدعت ہے جس کا ترک کرنا لازم ہے البتہ بلاقید کسی دن اور تاریخ کے جب چاہے برائے ایصال ثواب فقراء کو پیسے دینا یا کھانا کھلانا درست ہے۔

(۴)۔نماز جنازہ کے بعد میت کے رشتہ دار کا اپنے مال سے بطور ایصال ثواب کے پیسے یا چھوارے وغیرہ تقسیم کرنا اور بقول مستفتی اس کو لازم نہ سمجھنا، اگرچہ درست ہے لیکن "نماز جنازہ کے بعد" کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے جاکر یہ بدعت کی صورت اختیار کرسکتا ہے جس کو لازم سمجھا جاسکتا ہے۔اس لئے یہ تخصیص ختم کرنا چاہیے بلکہ اس کے علاوہ جب چاہے بطور ایصال ثواب کے پیسے وغیرہ دے سکتا ہے۔

(۵)۔نماز جنازہ خود دعا ہے اور نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا کرتا ہے اس لئے فقہاء کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا ممنوع لکھا ہے۔لہٰذا نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بدعت ہے۔جس کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں۔

لمافی صحیح مسلم(۲/۴۱): عن ابي هريرة ان رجلا قال للنبي صلى الله عليه وسلم ان ابي مات وترك مالا ولم يوص فهل يكفر عنه أتصدق عنه قال نعم۔

وفی شرح المسلم للنواوی(۱/۱۳،۱۲): فان الصدقة تصل الى الميت وينتفع بها بلا خلاف بين المسلمين وهذا هو الصواب... وذهب جماعة من العلماء الى انه يصل الى الميت ثواب جميع العبادات من الصلاة والصوم والقراء ة و غير ذلك وفى صحيح البخارى فى باب من مات وعليه نذران ابن عمر رضي الله عنهما امر من ماتت امها وعليها صلوة ان تصلى عنها الخ۔

وفی شرح العقائد(صـ۱۷۲): وفى دعاء الاحياء للاموات وصدقتهم اى صدقة الاحياء عنهم اى عن الاموات نفع لهم اى للاموات . . . ولنا ما ورد فى الاحاديث الصحاح من الدعا للاموات خصوصا فى صلاة الجنازة وقد توارثه السلف فلو لم يكن للاموات نفع فيه لما كان له معنى وقال عليه السلام مامن ميت تصلى عليه امة من المسلمين يبلغون مائة كلهم يشفعون الا شفعوا فيه وعن سعد بن عبادة انه قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فاى الصدقة افضل قال الماء فحفر

بیر وقال ھذا لام سعد۔

وفی الشامیۃ(۲/۲۴۳): مطلب فی القراء ۃ للمیت واھداء ثوابھا لہ۔ (تنبیہ) صرح علماء نا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلاۃ او صوما او صدقۃ او غیرھا کذا فی الھدایۃ. بل فی زکاۃ التتارخانیۃ عن المحیط: الافضل لمن یتصدق نفلا ان ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لانھا تصل الیھم ولا ینقص من اجرہ شئ اھ ھو مذھب اھل السنۃ والجماعۃ... ولھذا اختاروا فی الدعاء: اللھم اوصل مثل ثواب ما قرأتہ الی فلان، واما عندنا فالواصل الیہ نفس الثواب وفی البحر: من صام اوصلی او تصدق وجعل ثوابہ لغیرہ من الاموات والاحیاء جاز. ویصل ثوابھا الیھم عند اھل السنۃ والجماعۃ کذا فی البدائع۔

وفی الشامیۃ(۲/۲۴۱،۲۴۰): ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من اھل المیت لانہ شرع فی السرور لافی الشرور، وھی بدعۃ مستقبحۃ، وروی الامام احمد وابن ماجۃ باسناد صحیح عن جریر بن عبداللہ قال ((کنا نعد الاجتماع الی اھل المیت وصنعھم الطعام من النیاحۃ)) اھ۔ وفی البزازیۃ: ویکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبرفی المواسم، و اتخاذ الدعوۃ لقرائۃ القران وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراء ۃ سورۃ الانعام او الاخلاص۔ والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراء ۃ القران لاجل الاکل یکرہ... واطال ذلک فی المعراج۔ وقال: وھذہ الافعال کلھا للسمعۃ والریاء فیحترز عنھا لانھم لا یریدون بھا وجہ اللہ تعالیٰ اھ۔

وفی المرقاۃ شرح المشکوۃ(۴/۱۴۹): ولا یدعوا للمیت بعد صلاۃ الجنازۃ لانہ یشبہ الزیادۃ فی صلاۃ الجنازۃ۔

وفی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ(۴/۸۰):لایقوم بالدعاء بعد صلاۃ الجنائز لانہ دعا مرۃ لان اکثرھا دعاء۔

وفی الدر المختار (۲/۱۲۰): ...لان الجھلۃ یعتقدونھا سنۃ او واجبۃ وکل مباح یؤدی الیہ فمکروہ۔

(۴۸۱) مظاہروں اور ہڑتالوں وغیرہ کے موقع پر مرنے والے پولیس اہلکاروں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے زمیندار ایکشن

کمیٹی کی کال پر مظاہرہ ہوا۔ شروع میں مظاہرہ پُرامن طریقہ سے جاری رہا۔ تھوڑی دیر بعد مظاہرہ والوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور فائرنگ شروع ہوئی اور پولیس نے حالات کنٹرول کرنے کیلئے ہوائی فائرنگ کی جس میں چار، پانچ آدمی مر گئے جن میں دو پولیس والے بھی شامل تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ اور ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ نیز اس طرح مظاہروں ہڑتالوں، انتخابات کے موقع پر یا ڈاکوؤں وغیرہ سے مقابلہ کے دوران جو پولیس والے مرتے ہیں ان کو شہادت نصیب ہوگی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں اور عند الناس مشکور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... شہادت کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور اخروی، شہادتِ اخروی ایسی شہادت کو کہتے ہیں جس میں آخرت میں تو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اور انہیں دنیاوی شہید جیسا اعزاز واکرام کیا جاتا ہے لیکن ان پر شہیدوں کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوتے ایسی شہادت پانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، آگ میں جل کر مرنے والا، مکان کے نیچے دب کر مرنے والا اور اتفاقی حادثے میں مرنے والا انہیں میں داخل ہے۔ شہادت دنیوی جس میں دنیا میں بھی شہیدوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس سے مراد ہر وہ مکلف مسلمان ہے جس کو ظلماً آلہ جارحہ سے قتل کیا گیا ہو، اور وہ قتل موجب قصاص ہو، اور وہ مقتول حدث اکبر سے پاک ہو، اور زخمی ہونے سے لے کر وفات تک زندگی کا کوئی فائدہ مثلاً کھانا پینا دوا کرنا وغیرہ نہ پایا جائے اور جو باغیوں، ڈاکوؤں اور میدان جنگ میں کافروں سے لڑتے ہوئے مارا جائے وہ بھی اسی شہادت دنیوی میں داخل ہے خواہ وہ کسی طرح بھی قتل کریں، اسی طرح وہ شخص بھی اسی شہید کے حکم میں ہے جو کہ اپنی جان مال یا مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، ایسے شہید کا حکم یہ ہے کہ اسے غسل نہ دیا جائے بلکہ ان ہی کپڑوں سمیت نماز پڑھ کر دفن کر دیا جائے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جو پولیس والے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں وہ تو دنیاوی احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ باقی ہڑتال ومظاہرے وغیرہ اگر جائز حق کیلئے اور ظالم حکومت کو ظلم سے روکنے کیلئے ہوں اور پُرامن مظاہرہ ہو، اس میں کسی کی جان ومال کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو چونکہ یہ جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہوتا ہے اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکے تو وہ ظلم کرنے والے ہوں گے اب جو عوام مر جائیں وہ شہید دنیوی ہوں گے اور پولیس والے چونکہ ظالم ہیں اس لئے وہ شہید نہ ہوں گے۔ اور اگر ہڑتال والے شر وفساد کریں لوگوں کی جان ومال کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ چونکہ جائز نہیں اگرچہ ہڑتال کسی جائز حق کیلئے ہو، اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکنے کیلئے لڑائی کرے اور دوران لڑائی پولیس والے مر جائیں تو وہ شہید ہوں گے کیونکہ یہ ظلماً قتل کئے گئے اور مدافع عن نفسہ وعن المسلمین بھی ہیں۔

لمافی تکملة فتح الملهم (۳/۳۲۵،۳۲۴): وهذا هو الطريق المشروع للضغط على الحكومات فى سبيل إقامة شرع الله وتطبيق احكامه واما ما تعلمه الناس من الغرب من الوسائل الضغط على الحكومات كالاضطرابات والمظاهرات وسد الشوارع وسفك الدماء وتخريب العمران ليس من الاسلام فى شئ۔

وفی الهندية (۱/۱۶۷): وهو فى الشرع من قتله اهل الحرب والبغى وقطاع الطريق اووجد فى معركةٍ

وبه جرح او يخرج الدم من عينه او اذنه اوجوفه او به اثر الحرق او وطئته دابة العدو وهو راكبها او سائقها و كدمته او صدمته بيدها او برجلها او نفروا دابته بضرب او زجر فقتلته او طعنوه فالقوه في ماء اونار او رموه من سور او اسقطوا عليه حائطاً او رموا ناراً فينا او هبت بها ريح الينا او جعلوها في طرف خشب راسها عندنا او ارسلوا الينا ماء فاحترق او غرق مسلم، او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية۔

وفي ... المختار(۲۴۷/۲): باب الشهيد (هو كل مكلف مسلم طاهر)... (قتل ظلماً) بغير حق (بجارحة) اى بما يوجب القصاص (ولم يجب بنفس القتل مال) بل قصاص، وكذا يكون شهيدا لو قتله باغ اوحربي اوقاطع طريق ولوتسببا اوبغير آلة جارحة فان مقتولهم شهيد بأى آلة قتلوه......

(۴۸۲) شہید دنیوی میں عدم ارتثاث کی قید کا حدیث سے ثبوت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید دنیوی کی تعریف میں جوعدم ارتثاث کی قید لگائی جاتی ہے کہ اس شخص نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، آیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ شہید دنیوی نہ ہوں گے؟ نیز کسی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کو غسل دیا گیا تھا یا نہیں؟

الجواب بعون الملک الوھاب.....شہید دنیوی کی تعریف میں فقہاء کرام جوعدم ارتثاث کی قید لگاتے ہیں یعنی اس نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، یہ احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے اور انہوں نے دنیا کا کوئی نفع نہیں اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بغیر غسل کے دفن کرنے کا حکم فرمایا جیسے شہدائے احد (صحیح البخاری ۲ / ۵۸۴)۔ اور جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شہادت کے بعد دنیا کا کوئی نفع اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو غسل دینے کا حکم فرمایا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (کتاب المغازی للواقدی ۲ / ۵۲۵) اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں جو شہداء دنیا کا کوئی نفع حاصل کرتے ان کو غسل دیا جاتا جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔

پس یہ احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ غسل دینے اور نہ دینے میں ارتثاث اور عدم ارتثاث کی قید ملحوظ ہے۔ یعنی شہید مرتث کو غسل دیا جائے گا اور شہید غیر مرتث کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا ہے وہ شہید دنیوی نہ تھے بلکہ ان کو غسل دیا گیا تھا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ۔ اور روایات سے ان کو غسل دینا ثابت ہے۔ (جیسے مؤطا للإمام مالک رحمہ اللہ (ص ۴۷۸) مطبع نور محمد، الطبقات الکبری

لابن سعد ۲/۶۷ مکتبہ دار الفکر، کتاب المغازی للواقدی ۵۲۵/۲ مؤسسۃ الاعلمی)

لما فی صحیح البخاری (۵۸۴/۲): عن ابن شهاب عن عبدالرحمن بن كعب بن مالك ان جابر بن عبدالله اخبره ان رسول الله ﷺ كان يجمع بين الرجلين فی قتلى احد فی ثوب واحد ثم يقول ايهم اكثر اخذا للقرآن فاذا اشيرله الى احد قدمه فی اللحد وقال انا شهيد على هؤلاء يوم القيامة وامر بدفنهم بدمائهم ولم يصل عليهم ولم يغسلوا۔

وفی سنن ابی داؤد(۴۴۷/۲): عن ابن عباس قال امر رسول الله ﷺ بقتلى احد ان ينزع عنهم الحديد والجلود وان يدفنوا بدمائهم وثيابهم۔

وفی المؤطا للامام مالك رحمه الله (ص۴۷۸): مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر رضى الله عنهما ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ غسل وكفن وصلى عليه وكان شهيدا يرحمه الله۔

وفی الطبقات الكبرى لابن سعد (۶۷/۲): وبعث الاشعث بن قيس ابنه قيس بن الاشعث صبيحة ضرب علیّ عليه السلام فقال: ای بنیّ انظر كيف اصبح امير المؤمنين۔ فذهب فنظر اليه ثم رجع فقال: رايت عينيه داخلتين فی راسه، فقال الاشعث: عينی دميغ ورب الكعبة، قال ومكث علیّ يوم الجمعة وليلة السبت وتوفى، رحمة الله عليه وبركاته، ليلة الاحد لاحدى عشرة ليلة بقيت من شهر رمضان سنة اربعين، وغسله الحسن والحسين وعبدالله بن جعفر، وكفن فی ثلثه اثواب ليس فيها قميص۔

وفی كتاب المغازی للواقدی (۵۲۷/۲): قالوا: ثم امر رسول الله ﷺ ان يغسل، فغسله الحارث بن اوس بن معاذ، واسيد بن حضير، وسلمة بن سلامة بن وقش يصب الماء، ورسول الله ﷺ حاضر، فغسل بالماء الاولى، والثانية بالماء والسدر، والثالثة بالماء والكافور، ثم كفن فی ثلاثة اثواب صحارية وادرج فيها ادراجا، واتى بسرير كان عند آل سبط، يحمل عليه الموتى، فوضع على السرير۔

(۴۸۳) بیٹھی ہوئی قبر کی مرمت کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں کراچی میں میت کو قبر میں دفنانے کیلئے شق کا طریقہ رائج ہے، قبر کو بند کرنے کیلئے ٹائلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی قبر عرصہ تقریباً ایک سال کے بعد بوجہ بارش کے مکمل طور پر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ قبر کے اوپر جو ٹائلیں رکھی گئی تھیں وہ بھی قبر کے اندرونی شق میں چلی جائیں، اب اس صورت میں قبر کی مرمت کی کیفیت کیا

ہوگی؟ آیا جومٹی قبر کے اندر چلی گئی اور قبر کا گڑھا تقریباً مٹی سے بھر چکا ہے اس مٹی کو نکال کر قبر کی مرمت کی جائے گی یا مزید مٹی ڈال کر اسے قبر کی صورت دے دیجائے؟ جبکہ یہ ساری مٹی میت کے اوپر ہی گری ہوئی ہے۔ شرعاً جو بھی صحیح طریقہ اور کیفیت ہو بیان فرما کر ممنون ومشکور ہوں۔

الجواب بعون الملک الوھاب...... میت کو دفنانے کے بعد دوبارہ اس کو نکالنا حرام ہے۔ لہٰذا مزید مٹی ڈال کر قبر کی مرمت کی جائے۔

لمافی الفتاویٰ الولوالجية(١/١٦٨): واذا دفن الميت لغير القبلة ورأسه فى أسفله ونصب اللبن ولم يهل التراب عليه نزع اللبن وسوى، وإن هالوا عليه التراب لم ينبش لان النبش حرام لمكان هذه الأفعال۔ والنبش إنما يكون بعد تمام الدفن وتمام الدفن إنما يكون بعد إهالة التراب عليه۔

وفى كتاب التجنيس والمزيد (٢/٢٧٩): الميت بعد ما دفن مدة طويلة أو قليلة لايسع إخراجه من غير عذر. ويجوز إخراجه بالعذر. والعذر أن يظهر أن الأرض مغصوبة أو أخذها الشفيع بالشفعة۔

وفى الدر المختار (٢/٢٣٨،٢٣٧): (ولايخرج منه) بعد إهالة التراب (إلا) لحق آدمى

وفى الشامية تحته:(قوله الا لحق آدمى) احتراز عن حق الله تعالىٰ كما إذا دفن بلا غسل أ وصلاة أو وضع على غير يمينه أو إلى غير القبلة لاينبش عليه بعد اهالة التراب۔

وفى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح(ص٦١٥): وأما الثالث إذا غلب الماء على القبر فقيل يجوز تحويله لما، روى أن صالح بن عبيد الله رؤى فى المنام وهو يقول: حولونى عن قبرى فقد آذانى الماء ثلاثا. فنظروا فإذا شقه الذى يلى الماء قد اصابه الماء فأفتى ابن عباس رضى الله عنهما بتحويله، وقال الفقيه أبو جعفر يجوز ذلك أيضاً ثم رجع ومنع۔

نجم الفتاوی جلد ثانی [طبع جدید] میں موجود مدلل ومفصل فتاوی کے نام

نجم الفتاوی کی یہ طبع جدید جہاں اور خصوصیات کی حامل ہے وہاں اس کی زینت وہ تحقیقی اور تفصیلی فتاوی بھی ہیں جو ان چھ جلدوں میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف عنوانات کی ان تحقیقات کو [جو کہ فتاوی کا حسن ہوتی ہیں] متعلقہ ابواب میں درج کر دیا گیا ہے۔ اہل علم، صاحب نظر، فقہ وتفقہ کا ذوق رکھنے والوں اور تحقیق کے شناوروں کیلئے ان فتاوی میں انتہائی قابلِ قدر مواد موجود ہے۔

ہر جلد کی تفصیلی فہرست میں ان فتاوی کو نمایاں کر دیا گیا ہے نیز ''نجم الفتاوی جلد اول'' کے آخر میں مکمل چھ جلدوں میں موجود ان تمام محقق فتاوی کی فہرست مع مختصر تعارف کے موجود ہے۔ ہر جلد کے آخر میں صرف اس جلد میں موجود فتاوی کے نام مع صفحات نمبر درج کئے جا رہے ہیں۔ درج ذیل نام اس دوسری جلد میں موجود تفصیلی فتاوی کے ہیں۔ از مرتب فرحان حسن عفی عنہ